نقوشِ عصمت

چہاردہ معصومینؑ کی مکمل سوانح حیات

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر



محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ کراچی

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk



علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

نام کتاب: نقوش عصمت
مصنف: علامہ السید ذیشان حیدر جوادی
کتابت: جلال الدین احمد
پہلا ایڈیشن (ہندوستان): اکتوبر ۱۹۹۲ء
دوسرا ایڈیشن (پاکستان): جون ۲۰۰۰ء
تعداد: ۱۰۰۰
بہ تعاون: تنظیم المکاتب، لکھنؤ، انڈیا
قیمت: -/۱۷۵

ناشر

محفوظ بک ایجنسی ❁ مارٹن روڈ کراچی
Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk

قطعہ تاریخ وفات

از شاعر آلِ محمدؐ ریحان اعظمی



نقوشِ عصمتِ ذیشان جوادی سے ظاہر ہے
اگر انسان سچا ہو تو سچ کہتی ہیں تحریریں
قلم معصوم کی تعریف میں جس وقت چلتا ہے
تو مٹ جاتی ہیں فکر خام سے باطل کی تصویریں

سنہ ۲۰۰۰ء



منبر سے جس نے منزلِ عقبیٰ کو پالیا
مجلس سے جس نے خلد کا رستہ بنالیا
نقوش عصمت کامل و ذیشان مرتبت
جس نے اجل کو قدموں پہ اپنے جھکالیا

سنہ ۲۰۰۰ء



خطاب شامِ غریباں میں کرنے آئے تھے
نظر کے سامنے جلتے گھروں کا منظر تھا
دیارِ فانی سے ذیشان اس ادا سے گئے
غمِ حسینؑ تھا فرشِ عزا تھا منبر تھا

سنہ ۲۰۰۰ء

پیش گفتار

حجۃ الاسلام علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کی معرکتہ الآرا کتاب "نقوش عصمت" اپنے موضوع پر ایک جامع، مستند، مفید اور مربوط تحریر ہے، علمی حلقوں میں اس کی پذیرائی اور اس کی قبولیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اور میں ابھی دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا عزم کر ہی رہا تھا کہ یہ روح فرسا خبر ملی کہ سرکار علامہ ۱۰ محرم کو اعمال عاشورہ بجالانے کے بعد مجلس عزا سے خطاب فرما کر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

علامہ جیسے مجاہد راہ حق کی جدائی اور ان کی اچانک دارالبقا کی طرف روانگی کے حادثے اور جانکاہ صدمے نے دل و دماغ کو معطل کر کے رکھ دیا۔ سرکار علامہ میرے بزرگ، میرے مشفق، میرے محسن اور میرے ہمدرد و بہی خواہ تھے، ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں انہوں نے مذہبی، قومی، علمی اور ادبی دائرے میں جو وسیع خدمات انجام دی ہیں اس سے ہر علم دوست اور قوم کا ہر باشعور و دیندار فرد آشنا ہے۔ وہ اپنے اخلاص، دینی بصیرت، تبحر علمی، تحریر خطابت، داعی دینداری کے حوالے سے ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور زندہ ہیں۔

علامہ جیسی علمی شخصیت، خلیق و ملنسار و مشفق ہستیاں کبھی نہیں مرا کرتیں وہ اپنے کردار و کارناموں کی وجہ سے ہمارے دلوں اور ذہنوں میں علم کی نور و ضیا بن کر زندہ رہیں گے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے ہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں، ان کی مسکراہٹ، ان کا انداز اور ان کی آواز بڑی قریب سے سنائی دے رہی ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو
میں تو جب جانوں مرے بعد میرا دھیان رہے

میں نے شاید زندگی میں کبھی اتنی توجہ سے انہیں نہیں سنا اور پڑھا جتنی توجہ سے ان

کی وفات کے بعد، انہیں سن کر اور انہیں پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے جینے کے ڈھنگ اور مرنے کی تیاری کے لئے نشان راہ مل گئے ہوں۔ پروردگار عالم ان کی قبر کو منور فرمائے۔ ان کی لحد پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے، انہیں جوار سید الشہدا علیہ السلام نصیب فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور علامہ جیسی باعمل و متوازن زندگی گزارنے کی توفیق دے۔

کچھ "نقوش عصمت" کی عظمت کے بارے میں

حجۃ الاسلام علامہ سید ذیشان حیدر جوادی نے اپنی معروف ایمان افروز اور فکر انگیز کتاب میں نقوش عصمت کو انتہائی فکر و ذہانت کے ساتھ ابھارا ہے اور سیرت معصومینؑ میں تاریخ کے بعض ایسے واقعات و حوادث کی طرف متوجہ کیا ہے جن کی طرف عام مورخین کی نظر نہیں جاتی یا وہ انہیں قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ علامہ جوادی نے معصومینؑ کی حیات طیبّہ و اسوۂ حسنہ کے تمام اہم ابواب کو نہایت اختصار کے ساتھ اور آسان زبان میں پیش کرنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے اور اس بات کا خاص لحاظ و اہتمام رکھا ہے کہ سیرت معصومینؑ کے واقعات اور ان کے اوصاف و فضائل کو انتہائی صحت کے ساتھ سیدھے سادے اسلوب میں اہل نظر تک منتقل کیا جائے۔

علامہ کا مطالعہ برسوں سے ان ذوات مقدسہ کی سیرت یعنی سیرۃ المعصومینؑ کے سلسلے میں بہت گہرا ہے اور ان کی نظر تمام مآخذ پر ہے اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب مستند حیثیت رکھتی ہے نقش ثانی میں ہم نے معروف ریسرچ اسکالر آل محمد رزمی صاحب کا مقدمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اہل دانش اور معیاری مطالعہ کا ذوق رکھنے والے ہماری اس سعی پیہم و مساعی جمیلہ کو پسند فرمائیں گے۔ میں، میرے اہل خانہ اور اراکین محفوظ بک ایجنسی سرکار علامہ کے اہل خانہ کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کرتے ہیں ذات واجب ان کے تمام پسماندگان و متعلقین و لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

سید عنایت حسین رضوی

نقوش عصمت اور علامہ جوادیؔ

تحریر:۔ آل محمد رزمیؔ۔ ایڈیٹر ماہنامہ اصلاح کراچی

حیات انسانی قطعی عارضی وفانی ہے مگر اس کا ایک ایک لحہ کائنات کی سب سے قیمتی متاع کی حیثیت رکھتا ہے۔ حجتہ الاسلام علامہ سید ذیشان حیدر جوادی مرحوم بساط بھر زندگی اور وقت کے بہترین استعمال THE BEST USE OF کیلئے کوشاں رہے۔ اس کا ثبوت "نقوش عصمت حیات چہاردہ معصومین" ہے۔

یہ کتاب حیات چہارہ معصومینؑ کا ایک موضوعاتی اشاریہ SUBJECT WISE INDEX ہے۔ جس میں معصومین کی شخصیت، مرتبہ و منزلت، علم و حلم، عظمت کردار، تہذیب نفس، خصائص، امتیازات معنوی کمالات، خطبات، اخلاق واوصاف حمیدہ، صفات جلیلہ، ان کی گرانقدر و جامع تعلیمات، وقیع ملفوظات اطوار وعادات، عبادت وریاضت، شجاعت وشہامت، سیرت، معصومین کا مقصد حیات، انکے عبادی معاشرتی، معاشی، معاملاتی اور ذاتی ضوابط اخلاق، معصومین کے دور کے سیاسی حالات اموی وعباسی حکمرانوں کے مظالم مشکلات کا اجمالی و تحقیقی جائزہ ہے۔

حیات معصومینؑ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بظاہر اس سلسلے میں مزید کسی کام کی گنجائش کم ہی دکھائی دیتی تھی مگر علامہ جوادی نے اپنے تبحر علمی اپنی بصیرت وذکاوت، اپنی تحقیق و جستجو کی روشنی میں بڑی عمدگی وژرف بینی سے موضوع کا احاکاطہ کیا ہے، تحقیق، تطبیق، تدقیق اور تخلیق سے آمیخت نقوش عصمت کو دل نشیں بنادیا ہے۔

علامہ جوادی کی یہ تصنیف ان کے گہرے دینی شعور، اخلاص وللہیت، جذبہ ایمانی ومحبت اہلبیت اور موثر داعیانہ اسلوب کی شاہد ہیں ان کا قلم محض ایک بلندپایۂ عالم وادیب ہی کا قلم نہیں ایک داعی ومربی کا قلم بھی ہے۔ اس لئے انکی تحریر میں تحقیق کے ساتھ

ساتھ خلوص ودردمندی کی وجہ سے گہری تاثیر بھی پائی جاتی ہے۔ قدرت نے انہیں صلاحیت وحکمت تبلیغ سے بہرۂ وافر عطا کیا ہے اور وہ سادہ مگر دلچسپ اور مؤثر انداز سے بات کہنے کی قابل رشک صلاحیت سے مالا مال ہیں۔

انہوں نے اس کتاب کے لوازمے کی تلاش میں بڑی جگر کاوی سے کام لیا ہے اور عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر لکھا ہے۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ علمی ثقاہت کے بوجھ تلے شاعری اور تحریر کی شگفتگی دم توڑ جاتی ہے۔ مگر علامہ جوادی کی نثر کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ خالص علمی موضوع کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے بھی ان کی تحریر میں سلاست وروانی سادگی و شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کا اسلوب سہل اور رواں دواں ہے۔

آج "جب نقوش عصمت" دوبارہ زیر طباعت ہے تو وہ علم نبیل وفاضل جلیل اس دار فانی سے رخصت ہو کر خالق حقیقی سے جاملا ہے لہٰذا انکی محبت کی قرض کی ادائیگی اور عقیدت کے طور پر انکی رشحات کے ساتھ ساتھ انکی ذات وبامقصد حیات کے بھی کچھ نقوش اس کتاب کے مقدمہ میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

نقوش علامہ جوادی علیہ الرحمہ

نام:۔ ذیشان حیدر

لقب:۔ جوادی

تخلص:۔ کلیم

والد گرامی کا نام:۔ مولانا سید محمد جواد

مقام ولادت:۔ کراری ضلع الہ آباد (ہندوستان)

سن پیدائش:۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء مطابق ۲۲ رجب ۱۳۵۷ھ

ابتدائی تعلیم:۔	کراری میں اپنے والد گرامی اور دیگر علماء سے حاصل کی
ثانوی تعلیم:۔	جامعہ ناظمیہ لکھنؤ
اعلیٰ دینی تعلیم:۔	درجۂ اجتہاد نجف اشرف
تالیف و تصانیف کی تعداد	تقریباً دو سو (۲۰۰)
علمی آثار:۔	دو سو کتابوں کے علاوہ مجالس، تقاریر و دروس کے تقریباً دس ہزار آڈیو / ویڈیو کیسٹس وسی ڈیز۔
اولادیں:۔	تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ آپ کے دو فرزند ثقۃ الاسلام مولانا جودی اور ثقۃ الاسلام مولانا احسان حیدر عالم دین ہیں۔
قومی خدمت و مسئولیت:	صدر تنظیم المکاتب ہندوستان، بانی حوزہ علمیہ انوار العلوم الہٰ آباد۔ نگران پندرہ روزہ تنظیم المکاتب لکھنؤ، نمائندہ ولی امور مسلمین حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای
وفات:۔	روز عاشورہ ۱۴۲۱ھ ہجری بمقام ابو ظہبی
جائے مدفن:	الہٰ آباد
اوصاف حمیدہ:۔	علامہ ایک باعمل عالم ہونے کے ساتھ ساتھ قادر الکلام اور پختہ شاعر تھے آپ کے چار دیوان، کلام کلیم، پیام کلیم، سلام کلیم اور بیاض کلیم طبع شدہ موجود ہیں۔

☆ علامہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خطابت فرماتے تھے۔

☆ علامہ مرحوم ۱۶ سال کی عمر میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے نجف اشرف تشریف لے گئے۔

☆ علامہ مرحوم نے ۱۷ سال کی عمر میں کتاب ''نص واجتہاد'' تحریر کی۔

☆ ۱۸ سال کی عمر میں آیت اللہ باقر الصدر کی کتاب ''فدک فی التاریخ'' اور ۲۰ سال کی عمر میں ''اقتصادنا''۔ ۲۱ سال کی عمر میں علامہ عبداللہ الخنیزی کی کتاب ''ابو طالب

مومن قریش'' کا ترجمہ فرمایا۔

☆ علامہ مرحوم صرف ۲۷ سال کی عمر میں درجۂ اجتہاد کے قریب پہنچ چکے تھے۔

☆ علامہ مرحوم نے ۳۸ مختلف ممالک میں تبلیغی خدمات انجام دیں۔

علامہ ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ کی زندگی مشکلات وجد وجہد سے عبارت تھی انہوں نے ایک مصروف وپاکیزہ زندگی گزاری وہ بیک وقت محراب و منبر اور تحریر و تقریر کے آدمی تھے، انہوں نے قوم کے شعور فردا یعنی قوم کے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔ انہیں قوم کے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا خیال تھا انہیں قوم کے بزرگوں کی علمی وفقہی استعداد میں اضافہ کی فکر تھی۔

انہیں شریعت کی برتری، غیر اسلامی رسوم ورواج سے گلوخلاصی اور منبر کے تقدس کو بحال وبرقرار رکھنے کی فکر تھی وہ کہیں بھی جاتے مجلس ہو یا محفل، نجی نشستیں ہوں یا سفر وہ تبلیغ کی کوئی نہ کوئی راہ اور کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ دعوتوں میں کوئی نہ کوئی قصہ ایسا چھیڑ دیتے جسمیں وعظ و نصیحت کا کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور پوشیدہ ہوتا تھا وہ تحریک دینداری کے پرجوش علمبردار ہونے کی وجہ سے اپنی مسئولیت وذمہ داری کو خوب سمجھتے تھے۔

شاید یہ ہماری ناقدری وبے مہری کا نتیجہ ہے کہ ذات واجب نے ہم سے علم و عمل کی اس دولت کو چھین لیا ہے اور موت کی تند و تیز آندھی مسلسل ہمارے علمی چراغوں کو بجھائے جا رہی ہے۔ حجۃ الاسلام استاد الاساتذہ مولانا محمد حسین نجفی، رئیس المناظرین سرتاج تحریر مولانا سید کرار حسین واعظ، حجۃ الاسلام مولانا سید محمد محسن گوپالپوری پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ ابن مولانا سید راحت حسین گوپالپوری طاب ثراہ مولانا مجتبیٰ علی خان ادیب الہندی کے بعد حجۃ الاسلام علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کا اچانک ہم سے رخصت ہو جانا کسی عظیم سانحہ اور کڑی آزمائش سے کم نہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب مذہب کو ازکار رفتہ قرار دیا جارہا ہو دین کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جارہا ہو، قوم کی علمی استعداد عبرتناک سطح تک گر چکی ہو رسومات کو مذہب کا نام دیا جارہا ہو، لادینیت کا سیلاب اپنے پورے باڑھ پر ہو بے علمی بام عروج پر ہو، قوم عقائد کے نام پر بٹ چکی ہو اور باعمل و دیندار علماء بے عمل عوام کے سنگ ملامت کی زد میں ہوں تو علماء پر فرض ہے کہ وہ مصلحت کوشی کا دامن چھوڑ کر اعلائے کلمۃ الحق کریں۔

علامہ جوادی ساری زندگی تمام مصلحتوں اور مفادات سے بالاتر ہو کر اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہے، اور امر بالمعروف ان کی زندگی کا منشور، نصب العین اور ہدف تھا، قحط الرجال کے اس دور میں علامہ جوادی جیسی معقول شخصیت "SUBSTANTIAL PERSON" صائب الرائے دیندار، خلیق وملنسار، متوازن، معتدل اور جید عالم Polyhistor کا سانحۂ ارتحال عامۃ المومنین اور خصوصاً شیعان ہند و تنظیم المکاتب ہندوستان کے لئے ایک عظیم نقصان ہے جس کا جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

وہ ایک معروف مذہبی اسکالر، شیعہ قوم کا تشخص، بذلہ سنج، ذی علم، نیک نفس، متقی و پرہیز گار انسان، تھے مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن وایک ادارہ تھے وہ گذشتہ ۴۰ سال سے کشت علم وادب کی آبیاری کررہے تھے انہوں نے اپنے علم کو عمل اور فن کو زندگی اور شخصیت کا جزو لاینفک بنادیا تھا۔

مرحوم نے سالہا سال باب مدینۂ علم پر جبیں سائی کی اور در اہل بیتؑ پر گدائی کی، اپنی فکر کو دجلۂ فن اور فرات علم میں غوطہ دیا اور اپنے قلم کو خاک نجف سے صیقل کیا، ان کی زندگی جدوجہد سے عبارت تھی سالہا سال ابوظہبی میں محراب کی ذمہ داری پوری کرتے رہے، برسہا برس اپنی خطابت سے اطراف واکناف میں بسنے والے شیعوں کو جگاتے رہے، تنظیم المکاتب ہندوستان کی ذمہ داری ہو یا جامعہ انوار العلوم کی مسئولیت یا ولی امیر مسلمین مقام معظم رہبری کی نمائندگی کے فرائض ہوں، علامہ ہر محاذ، ہر میدان میں پیش

پیش رہے۔ شعر و سخن کی محفل ہو یا مجلس سید الشہداء، علمی و تعلیمی کانفرنسیں ہوں یا قومی و فکری موضوع پر سیمینار، قومی و سماجی معاملات ہوں یا گوشہ نشین علماء و اہل علم کی خدمات ہر جگہ علامہ ہراول دستے کے سپاہی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

علامہ جوادی کی تحریک دینداری

علامہ جوادی قومی درد رکھتے تھے، وہ قوم کے علمی و فکری انحطاط کو دیکھتے تو ان کا دل کڑھتا، کتنی ہی راتیں قوم کے مسائل پر غور و فکر میں گزار دیں ان کا خیال تھا کہ قوم قرآن و تعلیمات محمدؐ و آل محمدؑ سے دور ہو گئی ہے اور قرآن و اہلبیتؑ نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اسے ہم صحیح طور پر سمجھنے میں کوتاہی کررہے ہیں، چنانچہ انہوں نے اصلاحی کام کا آغاز کیا اور شیعوں کو یہ سمجھانے کی کوشش شروع کر دی کہ اسلام دین اور دنیا دونوں کا جامع ہے، انہوں نے تبلیغی مقصد کے لیے مجلس، نجی نشستوں، سفر، کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انتخاب کیا، وہ ہر محفل و ہر مجلس میں تبلیغ کرتے، کہیں دعوت میں ہوں یا کوئی ان سے ملنے کے لیے آئے، سفر پر ہوں تو ہمسفروں میں اگر قوم کا کوئی فرد نکل آتا تو علامہ موقع غنیمت جان کر اس کی فکری تربیت شروع کر دیتے، زندگی کے آخری دنوں میں علامہ ہمہ وقت اپنے مشن پر کام کررہے تھے۔ شاید انہیں اندازہ تھا کہ وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے، وہ مشکلات کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتے، مسائل کا چیلنج قبول کرنے اور آگے بڑھ کر قربانیاں دینے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔

علامہ جوادی کا زہد و ورع

علامہ ذیشان حیدر جوادی ایک زاہد حقیقی تھے، عبادت و بندگی کو ان کی زندگی میں اولیت حاصل تھی۔ وہ نماز کے اوقات کی بڑی پابندی فرماتے تھے، نماز شب کے پابند تھے اور ہمیشہ اپنے ملنے والوں سے نماز شب کی تاکید کرتے تھے، ابوظہبی کے مومنین جنہوں

نے بیس سال علامہ کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے یا اعمال ماہ شعبان ور مضان کیے ہیں۔ وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ مولانا کس مخضوع و مُخشوع سے اعمال بجالاتے تھے کس قدر ڈوب کر دعا کرتے اور مناجات پڑھتے۔ انہیں عبادت سے عشق تھا۔

علامہ جوادی ایک عظیم مُصلح اور داعی

علامہ جوادی کی شخصیت اپنی گوناگوں خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے بڑی ہی پرکشش تھی مگر ان کا نمایاں ترین وصف یہ تھا کہ وہ نماز سے غفلت برتنے والوں کو پسند نہ کرتے تھے، خمس و زکوۃ کی پابندی نہ کرنے والوں پر تنقید کرتے تھے۔ داڑھی منڈانے والوں کو نصیحت کرتے تھے اور بے حیائی، فسق و فجور اور باطل کے خلاف احتجاج کی ایک چنگاری تھے...... ایسی چنگاری جو ایک لمحے کے لیے بھی سرد نہ ہو ان کو وہ بجھا ہوا ایمان کبھی راس نہ آیا جو صاحب ایمان کو متحرک اور بے تاب نہ کر دے، چنانچہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اپنا کرب و درد اور اپنا سوز و تپش دوسروں میں منتقل کرتے اور مومنین کے دلوں کو گرماتے رہے۔

ہمارے لیے سبق

علامہ جوادی کی زندگی میں ہمارے لیے کئی سبق ہیں، وہ دین کی ذمہ داری، اطاعت خداوندی، عبادت و بندگی، واجبات کی ادائیگی اور تقلید کا ہمیں مسلسل احساس دلاتے رہے ہمیں چاہیے کہ ہم اس کا احساس کریں اور دوسروں میں بھی معرفت دین کا شعور و احساس پیدا کریں، انہوں نے تجدید و احیائے دین کی تحریک چلائی اور محمدؐ و آل محمدؑ کی تعلیمات پر عمل کی دعوت دی، اس راہ میں طرح طرح کی پریشانیاں اٹھائی، سختیاں سہیں، اذیتیں برداشت کیں اور ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ مگر کبھی مصلحت پسندی و مصلحت بینی سے کام

نہیں لیا خطرات و اندیشوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے بلکہ تحریک دینداری کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔ اگر اقامت دین کا کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی اسی جذبہ و ذمہ داری کا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔

ان کی بے وقت موت سے تفقہ و تدین کی مسند ویران ہوگئی، قافلۂ تحریک دینداری کی رفتار تھم گئی، ذمہ دارانہ خطابت کا گلشن اجڑ گیا، کردار و عمل کی شمع بجھ گئی۔ بوذر صفاتی و درویشی کا سورج غروب ہو گیا جب دکھ بیدار ہوں اور ذہن و دل دریا ہوں تو احساسات و جذبات کی عکاسی و صورت گری مشکل ہو جاتی ہے۔ خالق ارض و سماء علامہ مرحوم کو جوار سید الشہداؑ عطا فرمائے اور ان کی لحد پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے۔

برادر عزیز سید عنایت حسین علامہ جوادی مرحوم کی شہرہ آفاق کتاب "نقوش عصمت" دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ علامہ سے قربت و قرابت داری کا یہی تقاضہ ہے کہ ان کے آثار کو نہ صرف باقی رکھا جائے بلکہ ان کی روشن تحریروں سے اہل فکر و نظر اور مومنین کو زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا جائے۔

مذہبی، دینی، علمی، تاریخی، تدریسی اور معیاری کتب کی اشاعت کے حوالہ سے محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ اور اسکے روحِ رواں عنایت حسین کا نام تعارف سے بے نیاز ہے۔

عنایت صاحب نہ صرف کتاب کی اہمیت، افادیت، وقعت، ضرورت اور عظمت کو پیش نظر رکھتے ہیں بلکہ کتابت و طباعت میں عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوشگوار تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔

سرورق ہو کہ کتابت و کمپوزنگ یا طباعت، وہ دل کشی کو ماند نہیں پڑنے دیتے نہ معیار کو گرنے دیتے ہیں مجھے اُمید ہے کہ وہ علامہ کی دیگر کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے اور انکی محبت کا قرض ادا کرتے ہوئے ان کتابوں کو بھی شائع کریں گے جو ابھی تک پاکستان میں متعارف یا شائع نہیں ہوئی ہیں۔

کلیم الہ آبادی (علامہ جوادی)

شعر و سخن کے آئینہ میں

تحریر:۔ آلِ محمد رزمی

شاعر جذبات و احساسات کا آئنہ دار ہوتا ہے وہ اپنے خیالات و افکار، واردات و مشاہدات نظریات و عقائد کو لفظوں کے خوبصورت پیکر میں ڈھالتا ہے۔ لیکن لفظوں کی اس اصنام گری سے وہ سچا شاعر نہیں بن جاتا۔ سچی شاعری جذبوں کی سچائی، بے لاگ مشاہدے، احساسات کی پاکیزگی، روح کی بالیدگی، فکر کی طہارت اور دُرون بینی سے حاصل ہوتی ہے، یہ کام ایک عام آدمی کے مقابلے میں شاعر زیادہ سلیقے سے کرتا ہے۔

کیونکہ شاعر کو اظہار کا سلیقہ آتا ہے وہ اپنے دل پر گزری ہوئی کیفیت بھی بیان کر سکتا ہے، دوسروں کے جذبات کی ترجمانی اور ماحول کی عکاسی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی شاعر کی شخصیت سے کماحقہ یا کسی حد تک آشنائی کے بغیر اس کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کلیم الٰہ آبادی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ ایک مفسّر بھی ہیں ایک مفکر بھی، فقیہ بھی ہیں مؤرخ بھی، ادیب بھی ہیں شاعر بھی، صاحب محراب بھی ہیں اور صاحب منبر بھی لہٰذا ان کے شعور کا دھارا کسی ایک خصوصی سمت نہیں بہتا وہ سلام بھی کہتے ہیں قصیدے بھی۔ غزل بھی کہی ہیں نظم بھی اس کے علاوہ نعت، رباعی اور مناقب نگاری پر بھی پوری دست گاہ رکھتے ہیں۔

کلیم الٰہ آبادی کے سلام کے چند اشعار سے ہی ان کی شاعری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

علم کے ساتھ ہے مشک، سکینہؑ یوں جیسے
چچا گلے سے بھتیجی کو ہو لگائے ہوئے

تمام ظلم کے طوفاں تھے غرق حیرت میں
بفیض تشنہ لبی پار اتر گئے عباسؑ

ہر ایک قوم کے لب پر ہے اب حسینؑ حسینؑ
حسینؑ سارے جہاں کو جگا کے سوئے ہیں

کربلا تیرے سوا کس نے کبھی دیکھا ہے
ایک کردار کے ٹکڑوں کا بہتّر (۷۲) ہونا

چشم ایماں میں، نصیری ہیں الگ، ہم ہیں الگ
وہ خدا کہتے ہیں ہم شیر خدا کہتے ہیں

حشر تک سوئے گی زنداں میں سکینہؑ چین سے
کہیے گا بابا سے اب تڑپیں نہ دختر کے لیے

کلیم الٰہ آبادی نے واقعات کربلا کے مقاصد اور درسگاہ کربلا کو سمجھنے کے لیے اپنی آنکھ کو بطور حوالہ استعمال کیا ہے اور عقل و آنکھ کے اندھوں پر بھی تنقید کی ہے۔

آنکھ اندھی ہو تو پتھر نظر آتے ہیں خدا
عقل اندھی ہو تو پھر نور خدا بھی ہے بشر

کلیم الٰہ آبادی کے کلام کی انفرادیت، ان کی سادگی و سلجھی ہوئی زبان اور شائستہ لہجے میں ہی نہیں ان کے انداز نظر میں بھی ہے۔ وہ ایک سلیم الطبع، مہذب اور باضمیر انسان ہیں، خوش اخلاق، خوش فکری اور تہذیب نفس کے امتزاج سے ان کے کلام میں موضوعی اور معروضی دونوں سطحوں پر ایک ایسا توازن جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ جس سے فنکار کی دیانت داری اور جذبات کے خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

اب فقط تذکرۂ خاک شفا باقی ہے
ہوگئی ختم ہر اک مرہم و اکسیر کی بات

طعنہ ابتر کو سنکر احمد مختار نے
جو خلوص دل سے مانگی وہ دعا ہیں فاطمہؑ

روٹیاں لے کر فلک والوں نے ثابت کر دیا
جو در حیدرؑ سے ملتا ہے وہ صدقہ اور ہے

نشان سجدہ کے ساتھ یارو نشان ماتم بھی ہے ضروری
وہ مال محشر میں ہوگا جعلی کہ جس پر ان کا نشاں نہیں ہے

دیکھ لیں ہم بھی کہ محشر کی حقیقت کیا ہے
پردہ اٹھنے سے اگر حشر نمایاں ہوجائے

کلیم اللہ آبادی کی مشق وریاضت، خلوص وتوجہ، شعور و آگہی کی مرہون منت ہے سلام کلیم سے بیاض کلیم تک انہوں نے فکر کی بہت سی منزلوں کو طے کیا ہے کہ چاروں دیوان میں کوئی چونکا دینے والا شعر نہیں ہے لیکن ان کی شاعری میں پیغام ضرور پایا جاتا ہے۔

یہ وہ دن ہیں کہ مذہب آدمی کا طاقت و زر ہے
کسی کا دین درہم ہے کسی کا دین ڈالر ہے

صحابہ ہم سے ہیں بہتر، پیمبر ہیں ہمیں جیسے
تو گویا یہ صحابہ، اب پیمبر سے بھی بہتر ہیں

ذکر علیؑ عبادت پروردگار ہے
مثل نماز اس کی بھی تکرار چاہیئے

دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ کلیم اللہ آبادی نے سلام بھی کہے ہیں۔ سلام عربی زبان کا لفظ ہے اور اسم مذکر ہے اس کے مختلف مضمرات و تعبیرات ہیں یہاں پر سلام فن نگاری پر بحث مقصود ہے نہ سلام کلیم پر نقد و نظر بر سبیل تذکرہ عرض ہے کہ سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبی اور معاملات فکری وذہنی نظم کیے جاتے ہیں۔ مگر اس میں غزل کا رنگ پیدا نہیں ہونے دیا جاتا۔ عموماً سلام میں واقعہ کربلا و شہادت حضرت علیؑ و حضرت فاطمہؑ اور شہادت حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کے مصائب بیان کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے اخلاقی، تمدنی، تہذیبی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت میں اضافہ ہوسکے منظوم کیے جاتے ہیں۔

کلیم اللہ آبادی کے سلام کے چند شعر کے مطالعہ سے ان کی سلام نگاری کی عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حوصلہ شبیرؑ کا سر نامہ عزم و جہاد
صبر زینبؑ صبر کی تاریخ کا عنوان ہے

کتنے پرچم جھک گئے اور کتنے جھنڈے گر گئے
اک علم اور ہر دور میں اونچا رہا عباسؑ کا

ہر جگہ شمع حسینی کو فروزاں کر دو
کون جانے کے ستمگر ہوں کہاں سے پیدا

عکس کردار نبیؐ صلح حسنؑ جنگ حسینؑ
اک جمالی ہے تو ہے ایک جلالی تصویر

جو آل محمدؐ کا پرستار نہیں ہے
اس کا کوئی مذہب کوئی کردار نہیں ہے

ان کا آخری شعر جو آپ نے اپنی رحلت سے ایک دن قبل ۹ محرم الحرام کو کہا تھا۔

مدحت آل کی توقیر تو رہ جائے گی
میں نہ رہ جاؤں گا تحریر تو رہ جائے گی

کلیم اللہ آبادی اپنے سلام میں ہمیشہ روایت کا خیال رکھتے تھے اور جِدّت و جدیدیت کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔

کلیم آبادی نے غزل بہت کم کہی ہیں لیکن ان کے سلام میں غزل کا رنگ صاف جھلکتا ہے اہل فن جانتے ہیں کہ غزل کا فن ریزہ خیالی کا فن ہے اس کا ہر شعر ایک اکائی ایک حادثے، ایک تجربے یا ایک فرد سے مماثلت دی جاسکتی ہے، اکائیوں، حادثوں، تجربوں اور افراد کی یہ دنیا بوقلموں رنگارنگ اور وسیع ہے۔ کہ اس صنف سخن میں زندگی بھر کے سرمایہ کو اس طور سے سمیٹا کہ اس سے شاعر کی شاعری اور شخصیت کی ایک داستاں مرتب ہوجائے۔

بہت حسین تھا ماحول خود کشی کے لیے
مگر یہ میں تھا کہ جیتا رہا کسی کے لیے

انیس غم نبی ہیں یوں مری تنہائیاں اکثر
کہی ہے میں نے اپنے دل سے دل کی داستاں اکثر

ساقیا چشم عنایت کا سہارا چاہیے
کاسہ سر منقلب ہے شیشۂ دل چور ہے

یہ فقط جذب محبت کا اثر ہے ورنہ
کاغذی ناؤ کہیں چلتی ہے طوفانوں میں

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ السید ذیشان حیدر صاحب قبلہ جوادی مدظلہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں یہ ہماری قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ علامہ موصوف نے ترجمہ و تفسیر قرآن کے بعد "نقوشِ عصمت" کو ضبطِ تحریر میں لاکر گویا عالم اردو کے لیے نصاب ہدایت مکمل کر دیا یعنی! قرآن مقدس کا ترجمہ بھی اور حیات معصومین کی ترجمانی بھی۔

علامہ جوادی مدظلہ کی قلمی خدمات کی فہرست بفضلہ بہت طویل ہو چکی ہے۔ مستند تاریخی ماخذوں سے واقعات کا انتخاب اور صحیح تاریخی پس منظر میں ان کا تجزیہ کرکے حیات معصوم کی معنویت کو قاری کے لیے قابل ادراک بنادیا ہے۔

ہم نصف صدی سے ترویجِ علومِ آلِ محمد علیہم السلام میں مصروف سفر ہیں۔ محمد باقر مجلسی رحمہ اللہ کی شہرہ آفاق کتاب "بحار الانوار" کی بارہ جلدیں آسان اردو ترجمہ ہدیۂ قارئین کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کی اس گراں قدر تصنیف "نقوش عصمت" کے بعد ہم آپ حضرات کی خدمت میں علاّمہ کی دیگر تصانیف بھی جلد پیش کر رہے ہیں۔

ہم علاّمہ صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے ادارہ محفوظ بک ایجنسی کو پاکستان میں اپنی کتابوں کی طباعت کی اجازت عنایت فرمائی ہے۔

امید ہے کہ پیروان اہل بیت علیہم السلام خصوصی طور سے نوجوان نسل اس چشمہ ہدایت سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

اللّٰھم صل علیٰ محمدٍ و آل محمدٍ و اجعلنا من اتباعھم
وسلّمھم و اولیائھم والحمدللہ اوّلاً و آخراً۔

السید عنایت حسین رضوی

اجازت نامہ طباعت

بسمہ سبحانہ

Syed Zeeshan Haider Jawadi
P. O. Box · 5318
ABU DHABI - U. A. E.

خادم الشريعة
السيد ذيشان حيدر الجوادي
ص ب ٥٣١٨
ابوظبی - الامارات العربية المتحدة

بسمہ

جناب محترم عنایت حسین صاحب دام توفیقہ

[illegible]

فہرست مضامین

بسمہ سبحانہ

عرض تنظیم

جادۂ حیات میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے دو ہی مرکز ہیں: ایک اللہ کی مقدس کتاب، دوسرے معصومینؑ کی پاکیزہ سیرت۔ اور ان دونوں سے وابستگی کے بغیر زندگی کا سفر صحیح سمت میں جاری رکھنا ممکن نہیں۔ جس طرح قرآنی آیات میں غور و فکر معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے اسی طرح حیاتِ معصومینؑ میں گذرنے والے واقعات کی معنویت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی رضائے الٰہی کا سبب ہے۔ اور جس طرح آیاتِ قرآنی کے دامن میں "مفاہیم" کا "بحرِ بے کراں" موجزن ہے اسی طرح معصومینؑ کے کارناموں کے دامن میں بھی تہ در تہ معنویت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے "تشنگانِ علم و معرفت" بقدر ظرف ان دونوں سرچشموں سے ہر دور میں سیراب ہوتے رہے ہیں اور سیراب ہوتے رہیں گے۔

علامہ سید ذیشان حیدر صاحب قبلہ جوادی مدظلہ نے ترجمہ و تفسیر قرآن کے بعد "نقوشِ عصمت" لکھ کر گویا عالم اردو کے لیے نصاب ہدایت مکمل کر دیا، یعنی قرآن کا ترجمہ بھی اور حیاتِ معصومینؑ کی ترجمانی بھی۔ مگر قرآن کے ترجمہ کے مقابلہ میں یہ کام زیادہ مشکل ہے، اس لیے کہ قرآن "بسم اللہ" سے لے کر "الناس" تک سب کا سب ہمارے سامنے ہے اور اللہ نے اسے ہر طرح کے "ریب و عیب" سے پاک رکھا ہے اور اس کی اس طرح حفاظت کی ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں اور زمانے کے کسی وقفہ میں کوئی فرق نہ آیا۔

"نقوشِ عصمت" یعنی معصومینؑ کی سیرت کا معاملہ دوسرا ہے۔ دشمن حکومتوں کے زیرِ سایہ لکھی جانے والی تاریخ اپنے دامن میں معصومینؑ کے کارناموں کو جگہ دینا کیسے گوارہ کرتی۔ یہ تو عظمت کردار کی ہیبت تھی کہ اس نے "زبان خلق" بن کر تاریخ کے دامن میں اپنی جگہ خود بنا لی۔ جو واقعات محفوظ رہ گئے وہ بھی اس تاریخ کی پُر پیچ وادیوں میں بکھرے ہوئے ہیں جہاں حقائق کے ساتھ خود ساختہ روایتیں، اسرائیلی افسانے، دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہیں، بے معرفت انسانوں کی داستان گوئی اور برسرِ اقتدار حکومتوں کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے مفروضے بنام تاریخ

جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس لیے سیرت نگاری "خذف ریزوں" کے انبار سے گوہر آبدار چن کر الگ کر دینے کا نام ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علامہ جوادی مدظلہ نے "نقوش عصمت" لکھ کر جو علمی کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لیے بے پناہ علمی بصیرت کے ساتھ "تائید مولا" بھی درکار ہے۔

علامہ جوادی مدظلہ کے قلمی خدمات کی فہرست بفضلہ بہت طویل ہو چکی ہے اور تاریخ، تحقیق، اقتصادیات و سماجیات، فقہ و تفسیر، شعر و ادب، تقریباً ہر علمی اور دینی موضوع پر ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ ملک و بیرون ملک گوناگوں مصروفیات کے باوجود ایک سال کے اندر ترجمہ و تفسیر قرآن، اور "کلام کلیم" کے بعد "نقوش عصمت" کی تکمیل تائید مولا نہیں تو اور کیا ہے۔ انھوں نے کبھی گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ "کثرت کار" "نشاط کار" کو ختم کر دیتی ہے۔ مگر "نقوش عصمت" جیسی تصنیف ان کے اس قول کی خود ان کے بارے میں تردید کر رہی ہے۔ نہ کہیں نشاطِ تحریر کی کمی پیدا ہوئی نہ کیفی، اور نہ آورد کا احساس ہوتا ہے۔ روانی کے ساتھ دلآویز طرزِ تحریر جو "روایتی" نہ ہونے کے باوجود نامانوس" نہیں ہے۔ مستند تاریخی ماخذوں سے واقعات کا انتخاب کر کے اور صحیح تاریخی پس منظر میں ان کا تجزیہ کر کے حیات معصومؑ کی معنویت کو قاری کے لیے قابل ادراک بنا دیا ہے۔ اکثر جگہوں پر معصومینؑ کی زندگی کے الگ الگ واقعات میں معنوی ربط کی نشان دہی یوں کر دی ہے کہ "ارباب عصمت" کی معرفت بآسانی حاصل ہو جاتی ہے۔

اردو کتابیات کی دنیا میں "نقوشِ عصمت" ایک گراں قدر اضافہ ہے قوم کی ایک بڑی ضرورت تھی جو پوری ہو گئی۔ ہمیں امید ہے کہ پیروانِ اہلبیتؑ اس چشمۂ ہدایت سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے اور سنی سنائی پر اکتفا کرنے کے بجائے پڑھ کر سمجھنے کا جذبہ بڑھے گا۔

ہم اس قابل فخر پیش کش پر بارگاہِ الٰہی میں شکر گذار ہیں کہ اس نے ایسی عظیم خدمت کی توفیق عنایت فرمائی۔

والسّلام

صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب۔ ہندوستان

بسمہ سبحانہ

حرفِ آغاز

بزرگانِ دین اور اولیاء خدا کی تاریخ حیات کا دریافت کرنا معرفت کے اعتبار سے عظیم ترین فریضہ ہے تو کردار سازی کے اعتبار سے اہم ترین وسیلہ۔ وہ انسان کسی طرح بھی دیانت دار نہیں کہا جا سکتا ہے جو اپنے پیشوا اور مقتدا کی تاریخ حیات یا اس کی سیرت کے نقوش و خطوط سے بے خبر ہو، اور وہ انسان کسی عنوان بھی صاحب کردار نہیں بن سکتا ہے جس کے سامنے کردار کے نمونے اور سیرت کے آئیڈیل موجود نہ ہوں۔ اندھیرے میں سفر کرنے والا منزل رسا نہیں ہوتا ہے اور اپنی پسند پر کردار کی عمارت کھڑی کرنے والا مجبوراً گمراہ نہیں ہو سکتا ہے۔

علماء اسلام نے اسی نکتہ کی اہمیت کے پیش نظر ہر دور میں اولیاء خدا کی تاریخ حیات مرتب کی ہے اور اس کے مخصوص امتیازات و خصوصیات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ "تاریخ انبیاء" کے نام سے کتابیں لکھی گئیں۔ "سیرت مرسلؐ اعظم" اور "سوانح حیات ائمہ معصومینؑ" کے عنوان سے کتابیں تالیف کی گئیں، بلکہ "تذکرۃ العلماء" جیسی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں اور ان سب کا مقصد ماضی کے حالات کی نشاندہی کرنا یا زیر زمین دفن ہو جانے والے انسانوں کا بزور قلم زندہ کرنا نہیں تھا بلکہ ان سب کا واحد مقصد ان کی زندگی کے امتیازات کا نمایاں کرنا اور ان کی روشنی میں نئے کردار کی تعمیر کرنا تھا اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ حیات میں صرف ان واقعات پر زور دیا گیا ہے جو اس مقصد کے لیے مفید تھے اور باقی حالات اور واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ورنہ ایک انسان کی ۲۰ سالہ زندگی کے جملہ جزئیات بھی درجنوں مجلدات میں جمع نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ چہ جائیکہ سیکڑوں یا ہزاروں خاصان خدا کی زندگی کے جملہ حالات

کہ وہ چند کتابوں میں کس طرح درج کیے جا سکتے ہیں۔؟

ادھر تاریخ کی ستم ظریفی یہ رہی کہ مورخ نے خود اپنے ذوق کو بھی استعمال کیا ہے اور ذوق کے ساتھ مصالح وقت کو بھی نظر میں رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بے شمار زندگیاں ناقابلِ تذکرہ قرار پاگئی ہیں اور بیشمار واقعات تاریخ کے قبرستان میں زندہ دفن کر دیے گئے ہیں کہ ان واقعات سے بہت سے افراد کے نقائص اور عیوب کا اظہار ہوتا تھا، یا یہ واقعات ان سلاطین اور حکام کے مزاج پر بار تھے جن کی تحریک یا امداد پر مورخ نے قلم اٹھایا تھا، اور جن کی دولت کی فراوانی ہی مورخ کے قلم میں روشنائی کا کام کر رہی تھی۔

تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کا المیہ بہت دردناک ہے اور اس سلسلہ میں ہونے والے مظالم کی خود اپنی بھی ایک تاریخ ہے اور اس کے درج کرنے یا اس پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جملہ اہلِ نظر جانتے اور پہچانتے ہیں اور اس پر مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت جو موضوع اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کے مورخین نے جس قدر بھی واقعات محفوظ کیے ہیں اور بعد کے اہلِ قلم نے ان واقعات سے جس قدر بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی روشنی میں جس قدر بھی کتابیں اور تالیفات منظرِ عام پر آئی ہیں سب میں یہی ایک خاص عنصر نمایاں رہا ہے کہ سیرت نگار نے اپنے مخصوص ذوق کے مطابق واقعات کا انتخاب کیا ہے اور پھر مخصوص نظریات کے تحت ان سے نتیجہ اخذ کیا ہے اور اس طرح کتابِ سیرت بھی ایک مخصوص بصیرت کی محتاج ہو گئی ہے اور اس سے واقعی استفادہ کرنا بھی ایک مخصوص شعور کا محتاج ہو گیا ہے۔

میں اس واضح حقیقت کی مثالیں پیش کر کے "خطائے بزرگان گرفتن" کا مجرم نہیں بننا چاہتا اور نہ میرا مقصد بزرگوں کی توہین کرنا ہے۔ میرا مقصد صرف اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا تھا جس کی بنا پر واقعات سے استفادہ میں تفاوت پیدا ہو گیا ہے اور جس نے ایک ہی سیرت کو مختلف کرداروں میں تقسیم کر دیا ہے اور ضمناً اس کتاب کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ سیرت و کردار معصومین پر مختلف زبانوں میں اس قدر کتابوں کے ہوتے ہوئے جدید کتاب کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے اور اس میں کون سی خصوصیت پائی جاتی ہے جو دیگر کتابوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

اولاً تو اس قسم کے سوالات ہی انتہائی بچکانہ اور احمقانہ ہوتے ہیں اور ان سے انسان کی مذہبی بدذوقی کے علاوہ اور کسی بات کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی موضوع پر کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا جاتا ہے کہ اس قدر گاڑیوں کے ہوتے ہوئے نئی گاڑی کیوں بنائی گئی ہے، یا اس قدر مشینوں کے ہوتے ہوئے نئی مشین کیوں ایجاد ہوئی ہے؟ یا اس قدر سامانِ حیات کے ہوتے ہوئے روزانہ نئے سامانِ حیات کیوں ایجاد کیے جا رہے ہیں؟ بلکہ وہاں ذوق کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ نئے سال کا ماڈل خریدا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس سال میں سامان ایجاد کرنے والے نے کون سی تکنیک اختیار کی ہے اور کس طرح اسے سال کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا ہے لیکن مذہب میں ایک رسالۂ عملیہ کو بھی سیکڑوں سال چلانے کی آرزو ہوتی ہے اور ایک ایک کتاب کو "ابدیت نشان" بنا دینے کی تمنا ہوتی ہے اور اس کا عمومی راز کتاب کی عظمت و اہمیت نہیں ہوتی ہے بلکہ مذہب میں بدذوقی اور بخل کی کارفرمائی ہوتی ہے کہ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب کس طرح خریدی جا سکتی ہے۔

حقیر نے ترجمہ و تفسیر قرآن مجید کا کام شروع کیا تھا تو اس وقت بھی یہ بات بار بار سننے میں آئی تھی کہ اس قدر تراجم و تفاسیر کے ہوتے ہوئے نئے ترجمہ اور تفسیر کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کسی دوسرے موضوع پر کام کیا جائے۔ اور آج "نقوشِ عصمت" کے اعلان کے ساتھ بھی یہی صدائے بازگشت سننے میں آ رہی ہے کہ فلاں فلاں جید علماء اور اہلِ قلم کی مختصر اور مفصل کتابوں کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ترجمہ و تفسیر قرآن مجید کی اشاعت کے بعد بے شمار اہلِ علم و ہنر اور اربابِ فکر و نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور مروتاً ہی سہی مگر یہ ضرور فرمایا ہے کہ اس دور میں اس طرح کے ترجمہ و تفسیر کی یقیناً ضرورت تھی اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ چند ماہ کے اندر دو ہزار نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے (اگرچہ اس کی طباعت و کاغذ وغیرہ میں بے شمار نقائص تھے اور اسے مادی اعتبار سے ہرگز دیدہ زیب نہیں کہا جا سکتا تھا جس کا حساب روزِ قیامت پریس والوں کو مالکِ کائنات کی بارگاہ میں دینا ہو گا)۔

زیرِ نظر کتاب کے بارے میں بھی میری توقع یہی ہے کہ انشاء اللہ اس کی اشاعت کے

بعد اس کے قدرداں پیدا ہو جائیں گے اور انھیں اس کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ہو جائے گا۔
حقیر نے اس کتاب کی تالیف میں وہی ذوق استعمال کیا ہے جو ذوق تفسیر قرآن میں کام کر رہا تھا اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے بندوں کے لیے ایک کتاب تربیت ہے تو اس میں قدم قدم پر تربیت کے نقوش تلاش کرنا چاہئیں اور اس کی ہر آیت کو تربیت فکر و نظر کا ذریعہ بنانا چاہیے اور اسی طرح اگر پیغمبر اسلامؐ نے عترت طاہرہ کو قرآن مجید کی علمی تفسیر اور عملی تعبیر کے لیے چھوڑا ہے تو ان کے کردار میں بھی تربیت بشر کے پہلوؤں کو نمایاں ہونا چاہیے۔ میری نظر میں ائمہ طاہرینؑ کا مقصد اپنے فضائل و کمالات کا اظہار ہرگز نہیں تھا وہ فضائل کا اظہار بھی دین خدا اور تربیت بشر ہی کے لیے کیا کرتے تھے اور انھوں نے مصائب کے سنگین ترین لمحات میں بھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے واقعات حیات کو صرف بطور فضل و کمال پیش کرنا اور ان کے افادی اور عملی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینا سیرت نگاری نہیں ہے بلکہ سیرت سے خیانت ہے۔ مثال کے طور پر ایک نامور خطیب نے مولائے کائناتؑ کی زندگی کے اس واقعہ کو بیان کیا کہ آپ کے سامنے ایک چور لایا گیا جس کا جرم ثابت تھا۔ اصحاب نے سفارش کی اور اس کے محب علیؑ ہونے کا حوالہ دیا لیکن آپؑ نے ہاتھ کاٹ دیے اور جب وہ بازار میں جا کر علیؑ کی مدح میں قصیدہ پڑھنے لگا تو آپ نے اسے واپس بلا کر اس کی انگلیوں کو ہاتھ سے ملا کر زیر لب دعا کی اور اس کا ہاتھ دوبارہ درست ہو گیا، اور اس واقعہ سے یہ استنتاج کیا کہ محبت علیؑ ایک ایسی شے ہے جو چوروں کے بھی کام آتی ہے اور ان کے کٹے ہوئے ہاتھوں کو بھی جوڑ دیتی ہے۔
تو میں نے بعد مجلس گذارش کی کہ سرکار واقعات گذر چکے ہیں، انھیں بدلا نہیں جا سکتا ہے لیکن کم از کم استنتاج میں تو دیانت داری برتی جا سکتی ہے۔ آپ کا استفادہ بالکل صحیح ہے لیکن اس کا ماحصل قوم میں بدعملی اور بدکرداری پیدا کرنے کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ کاش آپ نے دو باتوں کو اور بھی بیان کر دیا ہوتا کہ حکم شریعت اس قدر عظیم ہے کہ مولائے کائنات نے اس کے محب ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ کاٹ دیے اور شریعت کے نفاذ میں کسی طرح کی رو و رعایت سے کام نہیں لیا، اور محبت کو شریعت کی پامالی کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اس کے بعد جب محبت کی تاثیر کا وقت آیا تو پھر اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ دوبارہ ہاتھوں کا علاج اُس سچی محبت کی بنا پر کیا جا رہا ہے جہاں ہاتھ

کٹنے کے بعد بھی تعریف کی جاتی ہے اور بددلی کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کا ان مومنین کرام اور محبان علیؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ادنیٰ سی تکلیف پر مولاؑ ہی پر تنقید کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کا خیال ہوتا ہے کہ مولاؑ کو بھی احکام شریعت کے نفاذ میں ان سے مشورہ کرنا چاہیے تھا جس طرح کہ مراجع تقلید کو ہر فتویٰ سے پہلے ان سے استمزاج کر لینا چاہیے۔
مذکورہ بالا واقعہ سے اس کتاب کی وجہ تالیف کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس کا مقصد واقعات حیات کا جمع کرنا یا ان کے بیان سے مومنین کرام کو خوش کرنا نہیں ہے۔ اس کا مقصد واقعات کی اصلی بنیادوں کو تلاش کرنا اور ان سے ناظرین کرام کو روشناس کرانا ہے تاکہ ان کی روشنی میں اپنے کردار کی اصلاح کر سکیں اور اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکیں۔
بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس قوم کے پاس چودہ ایسے کردار ہوں جن میں گناہ اور جرم کا کیا ذکر ہے۔ سہو و نسیان اور ترک اولیٰ کا بھی گذر نہ ہو اور جن کا تذکرہ صبح و شام کیا جاتا ہو، اس قوم میں بے عمل یا بدعمل افراد پیدا ہو جائیں، یا ایسے خطیب اور مقرر پیدا ہو جائیں جو بے عملی اور بدعملی ہی کو مذہب کا امتیاز یا کردار کا شاہکار قرار دیتے ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
حقیر نے اس کتاب میں پہلی کوشش یہ کی ہے کہ ہر معصومؑ کی زندگی کا نقشہ اُس ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے جس ترتیب کے ساتھ زندگی آگے بڑھی ہے اور اس کے بعد اس کے بارے میں دیگر مذاہب کے افراد کے اعترافات اور خود اس معصوم کے فضائل و کمالات یا گرانقدر بیانات و تعلیمات کا ذکر کیا جائے اور آخر میں ان افراد کا تذکرہ کیا جائے جنھوں نے ان کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور جو درحقیقت ہم جیسے انسانوں کے لیے کردار کا آئیڈیل اور نمونہ ہیں۔
ان تمام باتوں کے علاوہ ہر معصوم کی زندگی سے متعلق کوئی خاص موضوع رہا ہے تو اس پر الگ سے بحث کی گئی ہے اور درمیان میں اس کے تفصیلی تذکرہ سے واقعات کے مسلسل بیان کو مجروح نہیں بنایا گیا ہے۔
میں اپنی اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو اہل نظر ہی کریں گے

البتہ یہ ضرور کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ یہ سیرت نگاری کا ایک نیا رخ ہے جس پر بہت کچھ کام کیا جاسکتا ہے۔ خدا کرے کوئی ایسا باہمّت پیدا ہو جائے جسے حالاتِ زمانہ بھی کام کرنے کی اجازت دیں اور وہ اس رُخ پر سیر حاصل بحث کر کے قوم کو کردار سازی کے سلیقہ سے آگاہ کرے اور معصومینؑ کی قوم کو اتنا بلند کردار بنا دے جہاں "کونوا لنا زیناً ولا تکونوا علینا شیناً" کی جلوہ گری ہو اور کردار سے خود محبّت کا اعلان ہو جائے اور محبوب کی عظمت کی نشانی بن جائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

والسّلام علی من اتبع الہُدیٰ۔

السیّد ذیشان حیدر جوادی

ابوظبی

۲۳ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ، روز چہار شنبہ

نقشِ

حیاتِ حضرت مرسلِ اعظمؐ

ولادت: ۱۷ ربیع الاول سنہ عام الفیل

وفات: ۲۸ صفر سنہ ۱۱ھ

نقشِ زندگانی مرسلِ اعظمؐ

ماضی

عربستان کا علاقہ جو تقریباً ۱۳۰۰ سے ۱۶۰۰ میل لمبا اور ۶۰۰ میل چوڑا علاقہ ہے اور جس کا کل رقبہ ۱۲ لاکھ ۳۰ ہزار مربع میل ہوتا ہے یعنی متحدہ جرمنی اور فرانس سے چار گنا زیادہ اور متحدہ ہندوستان سے ایک تہائی کم۔

یہ علاقہ روزِ اول سے ادیان و مذاہب کا گہوارہ کہا گیا ہے اور دنیا کے بیشمار مذاہب نے اسی علاقہ میں جنم لیا ہے اور اکثر کا مدفن بھی اسی خطہ میں بنا ہے۔

اس علاقہ کی نمایاں تاریخ کا دور جناب ابراہیمؑ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جن کی مختصر تاریخ حیات یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے انھیں مختلف فضائل وکمالات سے آراستہ کرکے توحید کا علمبردار بناکر اس علاقہ میں خلق فرمایا اور نمرود جیسے باغی اور طاغی کے مقابلہ میں کھڑا کردیا۔ جناب ابراہیمؑ نے قولاً اور عملاً توحید کی تبلیغ شروع کی اور ایک دن موقع پاکر تمام بتوں کا صفایا کردیا جس کے نتیجہ میں انھیں آگ میں ڈال دیا گیا۔ رب کریم نے انھیں آگ میں جلنے سے بچالیا اور بَرداً وسلاماً کے چھینٹے دے کر آگ کو گلزار بنادیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہوکر جناب سارہ بنت حاران نے آپ سے عقد کرلیا اور نبوت کی تاریخ میں کمالات کو دیکھ کر پیغام عقد دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

جناب ابراہیمؑ ابتدائی طور پر بابل میں رہے، پھر وہاں سے کنعان چلے گئے، کنعان میں قحط پڑا تو مصر منتقل ہوگئے۔ وہاں اُس دور کے فرعون کے دربار میں پہونچے تو اسنے جناب سارہ کے حسن وجمال کا احساس کرکے بار بار ان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا، لیکن ہر مرتبہ ہاتھ خشک ہوگیا۔ اسنے جناب ابراہیمؑ سے وعدہ کیا کہ اگر ان کی دعا سے ہاتھ ٹھیک ہوجائے گا تو آئندہ ایسی جسارت نہیں کرے گا خلیلؑ نے

بارگاہِ الٰہی میں التماس کی، دعا قبول ہوئی۔ ہاتھ درست ہوا تو اس نے عظمت کردار سے متاثر ہوکر اپنی بیٹی ہاجرہ کو آپ کی خدمت کے لیے دے دیا۔ اس کے بعد آپ کا قیام مقام جرون میں رہا اور وہیں انتقال فرمایا جو آج خلیل الرحمٰن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جناب سارہ کے ساتھ ایک مدت تک ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جب جناب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ ان سے اولاد کا ظاہری امکان نہیں ہے تو جناب ہاجرہ سے عقد کرلیا جس کے بعد جناب اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی اور جب جناب سارہ ۹۰ سال کی ہوئیں تو مالک کائنات نے اپنی قدرت کاملہ سے انھیں بھی صاحب اولاد بنادیا اور جناب اسحاق کی ولادت ہوئی۔

ہاجرہ کے یہاں ولادت کے بعد فطری طور پر سارہ کو کشمکش کا شکار ہونا چاہیے تھا اس لیے جناب ابراہیمؑ نے اشارہ قدرت سے اس صورت حال کا یہ حل نکالا کہ جناب اسماعیل اور جناب ہاجرہ کو مکہ میں بنیاد خانہ کعبہ کے قریب ڈال دیا۔ جہاں بے آب وگیاہ ہونے کی بنا پر سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ایک گھونٹ پانی کی تلاش میں جناب ہاجرہ کو سعی کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں قدرت نے چشمۂ زمزم جاری کردیا، اور اس طرح کرم پروردگار کا بھی مظاہرہ ہوگیا اور نبی خدا کے تحفظ کی راہ میں سعی کی عظمت کا بھی اظہار ہوگیا۔

اُدھر قبیلہ جرہم کے افراد کا اس علاقہ سے گذر ہوا اور انھوں نے چشمۂ زمزم کی روانی کو دیکھا تو وہاں پڑاؤ ڈال دیا اور اس طرح ارض حرم کی آبادی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

کچھ عرصہ کے بعد جناب ابراہیمؑ اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے آئے تو جناب اسماعیلؑ موجود نہ تھے، ان کی زوجہ نے اخلاق ومدارات کا مظاہرہ نہ کیا تو جناب ابراہیمؑ نے طلاق کا اشارہ دے دیا اور اس طرح دوسری شادی قبیلہ جرہم میں ہوئی جس سے اسماعیلؑ کو سکون زندگی نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد ہی قدرت نے اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم دے دیا اور جناب ابراہیمؑ نے پورے حوصلہ کے ساتھ بیٹے کو راہ خدا میں قربانی کے لیے پیش کردیا۔ اسماعیلؑ نے بھی اپنے کو مرضی مولا کے حوالہ کردیا اور اس طرح ابراہیمؑ خلیل اللہ قرار پائے اور اسماعیلؑ ذبیح اللہ۔

ایثار اور فداکاری کا یہ سلسلہ نسل ابراہیمؑ واسماعیلؑ میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ جناب عبد مناف پیدا ہوئے جن کا نام عمرالعلاء تھا۔ ان کے فرزند جناب ہاشم تھے، اور جناب ہاشم کے ایک فرزند عبدالمطلب تھے اور ایک اسد۔۔۔ اسد کے گھر میں جناب فاطمہ بنت اسد کی ولادت ہوئی۔ اور عبدالمطلب کے یہاں

متعدد اولاد پیدا ہوئی جن میں سے ایک جناب عبداللہ تھے اور ایک جناب ابوطالب۔
عبدالمطلب کی نذر تھی کہ اگر خدا دس فرزند دیے گا تو ایک کو راہِ خدا میں قربان کر دیں گے چنانچہ جب
قربانی کا وقت آیا تو قرعہ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ عبداللہ کے حسن و جمال و کمال کی بنا پر دوبارہ قرعہ ڈالا گیا
اور پھر انھیں کا نام نکلا۔ یہاں تک کہ فدیہ طے کیا گیا اور سو اونٹ کی قربانی دے کر جناب عبداللہ کو قربانی
سے بچالیا گیا اور اس طرح عبداللہ بھی ذبیح قرار پائے اور رسول اکرمؐ ابن الذبیحین کے مصداق قرار پائے۔
عبدالمطلب کا نام عامر تھا اور کنیت ابوالحارث۔ لقب شیبۃ الحمد تھا اس لیے کہ سر کے بال سفید
تھے اور انتہائی خوب صورت۔ باپ کے انتقال کے بعد ننیہال میں رہے۔ آخر کار مطلب جا کر وہاں سے
لے آئے تو لوگوں نے بھتیجا کہنے کے بجائے ان کا غلام کہنا شروع کر دیا اور اس طرح عامر کے بجائے عبدالمطلب
قرار پا گئے۔

رسول اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق جناب عبدالمطلب پانچ خصوصیات کے حامل تھے؛

۱۔ انھوں نے سب سے پہلے باپ کی زوجہ سے عقد کو ممنوع قرار دیا۔

۲۔ خزانہ پر خمس عائد کیا۔

۳۔ حاجیوں کی سقایت اور سیرابی کا انتظام شروع کیا۔

۴۔ ایک انسان کے بدلے سو اونٹ کی دیت مقرر کی۔

۵۔ طواف کعبہ کے سات چکر معین کیے ـــــــــ اور قدرت نے ان کے اخلاص کی بنا
پر ان تمام اقدامات کو جزءِ مذہب بنا دیا اور انھیں فرزند کی قربانی کے ارادہ کی بنا پر ابراہیم ثانی کے
لقب سے نواز دیا۔

سخاوت کی بنیاد پر عبدالمطلب مُطعم الطیر کے لقب سے مشہور تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ
اس حوصلہ اور ہمت کا اظہار ہے جو ابرہۃ الاشرم کے مقابلہ میں پیش کیا، جب وہ ہاتھیوں کا لشکر لے کر
خانۂ خدا کو منہدم کرنے کے لیے آیا اور سارے مکہ والے آبادی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جناب عبدالمطلب
ابرہہ کے پاس گئے اور اس نے احترام کرنے کے بعد سبب پوچھا تو فرمایا کہ تیرے لشکر والوں نے میرے
اونٹ پکڑ لیے ہیں۔ میں انھیں واپس لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمھیں اونٹوں
کی فکر ہے اور اس گھر کی فکر نہیں ہے جسے ڈھانے کے لیے میرا لشکر آیا ہے۔

جناب عبدالمطلب نے فرمایا کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک
ہے جو عنقریب اسے بچالے گا۔ ابرہہ اس اشارہ کو نہ سمجھ سکا جو ہر مغرور و متکبر انسان کا عالم ہوتا ہے
لیکن رب العالمین نے عبدالمطلب کے بیان کی لاج رکھ لی اور ابابیل کا لشکر بھیج کر ابرہہ کے لشکر کا خاتمہ
کرا دیا اور اس طرح چھوٹی طاقت سے سپر پاور کے ہارنے کا قدرتی نظام سامنے آگیا اور ابرہہ کو باعزت
طریقے سے مرنا بھی نصیب نہ ہوا۔

ابرہہ کی فوج میں ساٹھ ہزار افراد تھے جن میں نو یا تیرہ بڑے بڑے ہاتھی تھے اور سب سے
بڑے ہاتھی کا نام "محمود" تھا جس سے خانۂ کعبہ کے انہدام کا کام لینا تھا جو قدرت کی تدبیر خاص سے ناکامی
میں تبدیل ہو گیا۔

یہ عبدالمطلب کا کمال ایمان تھا کہ انھوں نے گھر کی حفاظت میں بتوں کا حوالہ نہیں دیا ـــ بلکہ
ایک غیبی طاقت کا حوالہ دے کر یہ واضح کر دیا کہ مالک اصلی یہ بت نہیں ہیں خدا ہے ـــ اور اطمینان قلب
کا راز ظاہر پر ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان بالغیب ہے۔

ولادت با سعادت

جس سال ابرہہ کی تباہی اور خانۂ خدا کی حفاظت خاص کا واقعہ پیش آیا، اس سال کو عام الفیل
کہا جاتا ہے اور اسی سال رسول اکرمؐ کی ولادت ہوئی ـــ عام شیعہ روایات کی بنا پر، ۱۷ ربیع الاول
کو اور عام سنی روایات کی بنا پر ۱۲ ربیع الاول کو۔ مصر کے مشہور عالم فلکیات کی تحقیق کی بنیاد پر بقول
مولانا شبلی ۹ ربیع الاول کو۔ انگریزی سال کے اعتبار سے مشہور مسلک ۲۹ اگست ۵۷۰ء ہے اور
مولانا شبلی کا مسلک ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ہے۔

مقام ولادت شعب ابی طالب تھا۔ جس مکان کو رسول اکرمؐ نے عقیل کو ہبہ کر دیا تھا اور
انھوں نے محمد بن یوسف ثقفی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جس کے بعد ہارون رشید نے اسے خرید کر مولد النبی
قرار دے دیا۔ بقولے

زمانۂ حمل میں جناب آمنہ کو خواب میں بشارت ہوئی کہ بچہ کا نام 'احمد' رکھا جائے (ابن سعد)۔ اور
بروایتے اہل خاندان کے مشورہ سے عبدالمطلب نے 'محمد' طے کیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ کام بھی بذریعہ الہام

انجام پایا ہے اس لیے کہ جب آلِ رسولؐ کے اسمائے گرامی قدرت کی طرف سے نازل ہوئے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ خود رسول اکرمؐ کا اسم گرامی اہلِ خاندان کے مشورہ کا ممنون کرم ہوجائے۔

آپ شکم مادر میں تھے کہ آپ کے والد بزرگوار جناب عبد اللہ کا انتقال ہوگیا اور بروایت سیرۃ النبیؐ شبلی بحوالہ طبقات ابن سعد۔ آپ کو اپنے والد محترم کی طرف سے میراث میں ایک ام ایمن کنیز، پانچ اونٹ اور چند دنبیاں ملیں۔ اور اس طرح انبیاء کے یہاں میراث نہ ہونے کا مفروضہ روز اول ہی باطل ہوگیا۔

رضاعت

مورخین کے قول کی بنا پر تین دن یا سات دن یا نو دن جناب آمنہ کا دودھ پیا۔ اس کے بعد مستقل رضاعت کے لیے حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیے گئے جہاں دو برس کی عمر تک رہے اور صحرا کی کھلی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے اور اپنے تبلیغی ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو دو برس کے بعد مادر گرامی کا انتقال ہوگیا، اور اب مستقل طور پر اپنے دادا جناب عبد المطلب کے ساتھ رہنے لگے۔ ۸ برس کی عمر تھی کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا اور انھوں نے اپنی خداداد فراست کی بنیاد پر کفالت و حفاظت کا سارا کام جناب ابو طالب کے سپرد کر دیا جو آخر دم تک اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، اور اس طرح کفالت و حفاظت کی کہ ان کے انتقال کے بعد رسول اکرمؐ نے انھیں احسانات کو یاد کر کے ان کا مرثیہ پڑھا۔

شغل زندگانی

دس برس کی عمر سے اپنی اصلاحی صلاحیت کے اظہار کے لیے گلہ بانی کا کام شروع کیا اور اس طرح قوم پر واضح کرتے رہے کہ میں جانوروں کی بھی اصلاح کر سکتا ہوں اور مجھ میں یہ صلاحیت دوسرے افراد سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ آپ کے جانوروں کی چراگاہ مقام اجیاد کے پاس قراریط میں تھی جسے امام بخاری نے اپنی کتاب میں قیراط کی جمع اور سکہ بنا کر حضورؐ کو مزدوری پر جانور چرانے والا بنا دیا جب کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دوسرے افراد کا کاروبار تھا جسے رسول اکرمؐ کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

۱۲ برس کی عمر میں پہلا تجارتی سفر شام کی طرف اپنے چچا جناب ابو طالب کے ساتھ کیا۔ جہاں چند لمحوں کے لیے بحیرا راہب کا سامنا ہوگیا جس نے سر پر ابر کو سایہ فگن دیکھ کر ابو طالب کو نصیحت کی کہ اس بچہ کو وطن واپس کر دیں یا اس کی خصوصی نگرانی کریں کہ یہ مستقبل میں ایک بڑی شان والا ہے اور یہودیوں کو اس بات کی اطلاع ہوگئی تو وہ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اس ادنیٰ ملاقات کا اثر یہ ہوا کہ عیسائیوں نے بحیرا کو آپ کا معلم بنا دیا اور قرآن کے تمام قدیم روایات و معلومات کو اس کی تعلیم کا ممنون کرم بنا دیا اور یہ ان نو مسلم افراد کی سازش سے ہوا جو خاص مقاصد کے تحت حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔

اس کے بعد آپ نے اپنے اعمام کے ساتھ حرب فجار میں حصہ لیا۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ ماضی کے خون ناحق کا بدلہ لیا جائے اور اسی انتقام کے جواز کی بنیاد پر آپ نے اس میں شرکت کی منظوری دے دی تھی ورنہ اسلام کا مقصد یہی تھا کہ گزشتہ تمام معاملات کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔

حرب الفجار ہی کی طرح حلف الفضول کا معاہدہ تھا جس میں متعدد فضل نامی افراد نے مظلوم کی اعانت کا معاہدہ کیا تھا اور آپ نے اسی جذبہ کے تحت اس میں بھی شرکت فرمائی تھی اور آخر تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔

اس کے بعد کعبہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو مختلف قبائل نے ایک ایک طرف کی دیوار کی تعمیر کا کام لے لیا۔ جب حجر اسود کے نصب کرنے کی باری آئی تو ایک قیامت خیز ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور آخر میں یہ طے پایا کہ جو شخص سب سے پہلے باب بنی شیبہ سے داخل ہو اسے حکم بنا دیا جائے۔ تھوڑی دیر میں رسول اکرمؐ داخل ہوئے اور آپؐ نے ایک چادر یا اپنی عبا میں پتھر کو رکھ کر سارے قبائل کو اٹھانے کا حکم دیا اور جب سب نے بلند کر دیا تو آپ نے چادر سے اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا اور اس طرح واضح ہوگیا کہ کسی کو اس کی صحیح جگہ پر بٹھانے کا کام رسول اکرمؐ کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا چاہے وہ افراد ہوں یا قبائل۔

۲۵ سال کی عمر میں دوسرا سفر تجارت کیا جس میں خدیجہ کے مال کو مضاربہ اور کمیشن کے طور پر بیچنے کے لیے لے گئے اور جناب خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو ساتھ کر دیا، جس نے واپس آکر اس قدر فضائل و کمالات کا تذکرہ کیا، اور خود خدیجہ نے بھی اس قدر برکت اور منفعت کا مشاہدہ

کیا کہ اب اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا کہ خدیجہ عقد کا پیغام دے دیں۔ چنانچہ ایک محترم خاتون نفیسہ کو بھیج کر پیغام دیا اور حضور نے اس پیغام کو منظور کر لیا اور عقد کی تاریخ طے ہو گئی۔

حضور اکرمؐ کی طرف سے جناب ابوطالب نے اور خدیجہ کی طرف سے ورقہ بن نوفل نے عقد پڑھا جس وقت تک شیخ طوسیؒ، سید مرتضیٰؒ وغیرہ کے ارشاد کے مطابق جناب خدیجہ باکرہ تھیں اور آپ نے تمام اشراف قریش کے پیغامات کو رد کر دیا تھا۔

عقد کے موقع پر جناب ابوطالب نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا۔ جو مطالب کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے اور اخلاص عمل کے اعتبار سے بھی اسلام میں عقد کا ایک حصہ قرار پا گیا ہے۔

اس واقعہ کے تقریباً پانچ سال بعد اور ہبوط آدمؑ سے ۶۱۹۳ برس بعد سنہ ۶۰۰ء اور سنہ ۳۰ عام الفیل میں جناب ابوطالب کے یہاں حضرت علیؑ کی ولادت ہوئی۔ جن کی ولادت کے لیے رب کریم نے خاص اپنے گھر کا انتخاب کیا اور اس طرح ابوطالب کو ان کے خدمات کا پہلا انعام عطا کیا گیا کہ رسول اکرمؐ کی ولادت ان کے گھر میں ہوئی اور ان کے فرزند کی ولادت رب العالمین کے گھر میں ہوئی۔

اس کے دس سال کے بعد جب آپ کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی تو آپ پر سورۂ اِقْرَأْ کی شکل میں پہلی وحی نازل ہوئی۔ جس نے قرأت، تعلیم، قلم وغیرہ کا ذکر کر کے اسلام کے مزاج قانون کی نشان دہی کی اور اس طرح اعلان دین خدا کی راہ ہموار ہونے لگی۔ سنہ ۶۱۰ء میں اس وحی اول کے نزول کو بعثت رسولؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا واقعہ ۲۷ رجب کو پیش آیا۔

بعثت کے بعد تین سال تک خفیہ تبلیغات کا سلسلہ جاری رہا اور آپ مختلف افراد کو اس وحی اول کے مضمون اور مفاد سے باخبر کرتے رہے۔

تین سال کے بعد اعلان کا حکم ہوا تو آپ نے کوہِ صفا کے پاس تمام قریش کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر حملہ کرنے والا ہے تو تم بغیر دیکھے اعتبار کر دگے یا نہیں؟ سب نے اقرار کیا کہ ہم نے آپ سے سچ کے علاوہ کچھ نہیں سنا ہے تو فرمایا کہ میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈرا رہا ہوں جو اس بُت پرستی کے نتیجہ میں پیش آنے والا ہے۔ سماج میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا لیکن آپ نے اسلام کی پیشکش کا سلسلہ ایمان بالغیب سے شروع کیا جس کے بغیر مذہب کی کوئی افادیت نہیں ہے۔

اُدھر اہل خاندان کو باقاعدہ دعوت دینے کا حکم آ گیا تو آپ نے حضرت علیؑ کے ذریعہ تمام خاندان کو مدعو بھی کیا اور سب کے کھانے کا انتظام بھی کیا۔ جس کے بعد پہلے دن لوگوں نے بات سننے سے انکار کر دیا تو دوسرے دن پھر دعوت کی اور بشکل تمام اپنا پیغام پیش کر دیا اور قوم سے نصرت و امداد کی درخواست کی جس کے معاوضہ میں وصایت، وزارت اور خلافت کا وعدہ بھی کیا جو اپنے مشن کی کامیابی کے یقین کا کھلا ہوا اعلان تھا — لیکن حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے اس مطالبہ پر توجہ نہ دی تو بالآخر اتمام حجت کے بعد ان کی وصایت و وزارت و خلافت کا اعلان کر دیا اور اسلام کی پہلی دعوت تینوں عقائد کی حامل قرار پا گئی۔ توحید خدا کا بھی اعلان ہو گیا۔ رسالت سرکار دو عالمؐ کا بھی اعلان ہو گیا اور وصایت و وزارت علیؑ کا بھی اعلان ہو گیا۔

اس اعلان عام کے بعد قریش کی طرف سے مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے حارث بن ابی ہالہ کو شہید کیا گیا جو اعلان رسالت کے چوتھے سال اسلام کے پہلے شہید ہیں۔

حارث کی شہادت کے بعد شہادتوں اور اذیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس میں مرد عورت آزاد غلام سب شریک رہے اور کسی ایک کو معاف نہیں کیا گیا۔

مَردوں میں جناب یاسر کو بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ خباب بن الارت کو انگاروں پر لٹایا گیا۔ بلال کو گرم ریت پر لٹایا گیا۔ یہ اگرچہ قتل نہیں کیے گئے مگر یہ اذیت کسی قتل سے کم نہیں تھی۔ افلح ابو فکیہ کو رسیوں میں باندھ کر کھینچا گیا۔ صہیب رومی کو سارا سامان چھین کر مکہ سے باہر نکال دیا گیا۔ عورتوں میں جناب یاسر کی اہلیہ سمیہ، حضرت عمر کی بہن فاطمہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس جیسی خواتین کو بے حد اذیت دی گئی اور بعض کو قتل ہی کر دیا گیا۔

ادھر دو برس کی عمر میں قاسم بن پیغمبرؐ کا انتقال ہو گیا تو دشمنوں نے ایک روحانی اذیت کا سامان فراہم کر دیا اور حضور اکرمؐ کو ابتر کہہ کر پکارنے لگے۔ گویا ان کی نسل کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور جس کی نسل باقی نہ رہ سکے اس کا دین اور مذہب کیا باقی رہے گا۔ قدرت نے اس طعنہ ابتر کے جواب میں ۲۰ جمادی الثانی ۵ بعثت کو سرچشمہ کوثر جناب فاطمہؑ کی مقدس ہستی کا تحفہ رسول اکرمؐ کو عنایت فرمایا اور دشمن کے ابتر ہونے کا اعلان کر دیا۔ جو وجود فاطمہؑ کا پہلا سکون تھا جو رسول اکرمؐ کو سخت ترین حالات میں نصیب ہوا۔

حالات اس قدر ابتر تھے کہ ایک ماہ کے بعد جب ۵ بعثت میں رسول اکرمؐ کو مسلمانوں کو حکم ہجرت دینا پڑا اور پہلا قافلہ حبشہ کی طرف ۱۱ افراد پر مشتمل روانہ ہو گیا جس میں جعفر طیار شامل

نہ تھے۔ چند دنوں کے بعد دوسرا قافلہ حضرت جعفر بن ابو طالب کی قیادت میں روانہ ہوا جس میں ۸۶ مرد اور ۱۸ عورتیں تھیں یعنی کُل ۱۰۴ افراد۔

مسلمانوں کی اس تعداد کے شہر سے باہر نکل جانے پر باقی افراد مزید ظلم وستم کا نشانہ بننے لگے چنانچہ ابو جہل نے خصوصیت کے ساتھ حضورؐ کو ستانا شروع کر دیا جس کی خبر سن کر جناب حمزہ کو جوش آگیا اور انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا جس کے بعد رسول اکرمؐ کو واقعی ایک قسم کا سکون نصیب ہو گیا اور اسلام ایک بڑے سپاہی اور مجاہد کا مالک ہو گیا۔

اُدھر قرآن کریم کی بلاغت اور اہل ایمان کے استقلال نے ایک نئی کرامت کا مظاہرہ کیا کہ حضرت عمر بن الخطاب کی بہن نے اسلام کا اعلان کر دیا اور انھیں اطلاع ملی تو بہن کے گھر پہونچ گئے اور اپنے امکان بھر مار پیٹ کر دوبارہ کفر کی طرف واپس لانے کی کوشش کی، لیکن بہن نے انکار کر دیا اور اس کے بعد جب آیات قرآنیہ کی تلاوت سُنی تو خود بھی اسلام قبول کر لیا اور بظاہر اسلام ایک بڑے خطرہ سے محفوظ ہو گیا۔

اذیتوں کے باوجود اسلام کی بڑھتی ہوئی شوکت اور مقبولیت کو دیکھ کر کفار نے مصالحت آمیز رویہ اختیار کرنا شروع کیا اور پہلے جناب ابو طالبؑ کے ذریعہ ترک تبلیغ کا پیغام دیا جسے ابو طالبؑ نے ان لفظوں میں پہونچایا کہ فرزند تمھارے بنی عم کا خیال ہے کہ تم انھیں اذیت دے رہے ہو، اور وہ تم سے ترک تبلیغ کا مطالبہ کر رہے ہیں، تو آپ نے ان تاریخی لفظوں میں جواب دے دیا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور ایک ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے کہ میں تبلیغ اسلام کو ترک کر دوں تو یہ ممکن نہیں ہے اور اس طرح اپنی عظیم ہمّت اور کفر کی بے بسی کا اعلان کر دیا۔

اس جواب کے بعد کفار نے براہ راست جناب ابو طالب سے سودا کرنا چاہا کہ ہم محمدؐ کے بدلے اپنے ایک فرزند عمارہ کو تمھارے حوالے کیے دیتے ہیں اور تم محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم ان کا خاتمہ کر کے اس نئے دین سے نجات حاصل کر لیں۔ جناب ابو طالبؑ نے فرمایا کہ کیسقدر احمقانہ فیصلہ ہے کہ میں تمھارے فرزند کی پرورش کروں اور تم ہمارے فرزند کو قتل کر دو، اور اس طرح کفار کی سودے بازی کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنے کمال ایمان و دیانت اور ارتقائے عقل و فراست کا اعلان کر دیا۔

کفار نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے بائیکاٹ کا منصوبہ بنایا کہ بنی ہاشم پر اس قدر

اقتصادی اور سماجی دباؤ ڈالا جائے کہ محمدؐ کو ہمارے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں جو ہر دور کے ظالم کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ منصور بن عکرمہ نے معاہدہ لکھا اور چالیسؔ افراد نے اس پر دستخط کیے اور اس طرح بنی ہاشم کی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کا آخری منصوبہ تشکیل پا گیا۔

اُدھر جناب ابو طالبؑ نے یکم محرم ۷ بعثت (۶۱۷ء) کو سارے گھرانے کو لے کر شعب میں قیام اختیار فرمایا اور اس طرح آغاز محرم سے مسلمانوں کی مصیبت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا خاتمہ اس فتح مبین پر ہوا کہ مظلومیت نے ظلم پر فتح پائی اور تین سال کے بعد ہشام مخزومی کو بنی ہاشم کے حال پر رحم آگیا اور اس نے معاہدہ کے خلاف آواز اٹھانا شروع کر دی، اُدھر رسول اکرمؐ نے جناب ابو طالبؑ کے ذریعہ یہ خبر پہونچائی کہ عہد نامہ کو دیمک نے کھا لیا ہے اور سوائے نام خدا کے کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کفار نے صداقت کا امتحان لینے کے لیے عہد نامہ کو کھولا تو بات بالکل صحیح نکلی اور اس طرح کفار اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے اور رسول اکرمؐ کو ظلم کے مقابلہ میں ایک نئی فتح حاصل ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سب ایک دن فنا ہو جانے والے ہیں، صرف نام خدا باقی رہنے والا ہے۔ منصور بن عکرمہ کے ہاتھ شل ہو گئے اور محرم ۱۰ بعثت میں مسلمانوں کو اس قید سے نجات مل گئی۔

واضح رہے کہ اسلام کے اس سخت ترین دور میں بنی ہاشم کے علاوہ کسی شخص کا بھی ذکر تاریخ اسلام میں نہیں ہے اور نہ کوئی سابق الاسلام اسلام کے اس درد و غم میں شریک رہا اور نہ اسلام کی خاطر کسی طرح کی قربانی دی۔

شعب ابی طالبؑ کے ان مصائب نے بنی ہاشم کو اس قدر متاثر کیا اور تین سال کے فاقوں اور درختوں کے پتّوں پر گذارہ کرنے کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے عرصے کے بعد جناب ابو طالبؑ کا انتقال ہو گیا اور ماہ مبارک میں جناب خدیجہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں اور اسلام اپنے دونوں پشت پناہوں سے محروم ہو گیا۔ اب نہ ابو طالب جیسا مرد آہن اور باوقار بزرگ رہ گیا نہ خدیجہ جیسی صاحب دولت اور با اخلاص خاتون ــ رسول اکرمؐ پر ان حادثات کا اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے پورے سال کو عام الحزن کا نام دے دیا اور اسلام کے مصائب کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

مستقبل اسلام

حضرت ابو طالبؑ کے انتقال کے بعد جب مکہ میں پناہ کا مکمل انتظام نہ رہ گیا تو قدرت نے آپ نے

حبیب خاص کو ہجرت کا حکم دے دیا اور اس طرح ۱۳ بعثت میں رسول اکرمؐ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے اور حضرت علیؑ نے یہ معلوم کرکے کہ اس طرح رسول اکرمؐ کی جان محفوظ رہے گی۔ تاریخ اسلام کا پہلا سجدۂ شکر انجام دیا۔

یہ واقعہ ۲ ربیع الاول کو پیش آیا یعنی ستمبر ۶۲۲ء میں۔ جب رسول اکرمؐ کی عمر تقریباً ۵۳ سال تھی اور حضرت علیؑ کی عمر تقریباً ۲۲ سال۔

تھوڑے وقفہ تک غار ثور میں قیام رہا جہاں بروایت درمنثور ج ۲ ص ۲۴۰، طبری ج ۲ ص ۲۴۳ رسول اکرمؐ کی نصیحت کے مطابق کھانے پینے کا انتظام حضرت علیؑ ہی کرتے رہے جس طرح کہ رسول اکرمؐ کے پاس جمع شدہ امانتوں کی واپسی اور بنی ہاشم کی خواتین کے مدینہ پہونچانے کی ذمہ داری بھی حضرت علیؑ ہی کے سپرد تھی۔

غار ثور سے نکل کر خیمۂ ام معبد میں قیام فرمایا جہاں اس کی بکری کا دودھ نکالا اور دست مبارک کی اس قدر برکت سامنے آئی کہ ام معبد اور اس کا شوہر دونوں مسلمان ہو گئے۔ اُدھر آپ نے کُلّی کرکے پانی درخت کی جڑ میں ڈال دیا جس سے درخت شاداب ہو گیا اور پھر جب اچانک ایک دن اس کے پتے جھڑ گئے تو انکشاف ہوا کہ یہ سرکار دو عالمؐ کی وفات کا دن تھا۔ دوبارہ پھر یہی حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ روزِ شہادت حضرت علیؑ تھا۔ اس کے بعد روز عاشور اس کی جڑ سے خون اُبلنے لگا اور اس طرح رسولؐ و آلِ رسولؐ کے غم میں کل کائنات کی شرکت کا فطری ثبوت فراہم ہو گیا۔ (ربیع الابرار زمخشری)

ادھر سراقہ بن جعشم آپ کے تعاقب میں چلا تو اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ دوبارہ پھر ۱۰۰ اونٹ کے انعام کی لالچ میں آگے بڑھا تو پھر یہی واقعہ پیش آیا اور آخر کار آپؐ نے سہارا دے کر نکال دیا تو مسلمان ہو گیا۔ ابو بریدہ اسلمی نے بھی تعاقب کیا تو آپ نے برداً و سلاماً کا حوالہ دیا اور وہ بھی مسلمان ہو گیا۔

مکہ و مدینہ کے درمیان ۲۰ منزلوں پر قیام کرکے قریب مدینہ پہونچے تو مقام قبا میں قیام فرمایا۔ یہ تاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۳ بعثت کی تھی۔ چار روز یہاں قیام رہا۔

تین روز کے بعد حضرت علیؑ آ گئے اور مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اس لیے کہ تبلیغ اسلام کا کوئی کام حضرت علیؑ کی شرکت کے بغیر شروع ہونے والا نہ تھا۔

۲۲ ربیع الاول کو مدینہ میں داخلہ کا پروگرام بنا۔ قبیلہ بنی سالم میں جمعہ کا دن آ گیا تو اسلام کی پہلی نماز جمعہ ادا ہوئی جس میں سو افراد نے شرکت کی۔

مدینہ میں داخل ہونے پر انصار کی عورتوں اور بنی نجار کی لڑکیوں نے استقبالیہ ترانہ پڑھا۔ اس وقت حضور ناقہ قصویٰ پر سوار تھے اور آپ کا اعلان تھا کہ جہاں یہ اونٹ بیٹھ جائے گا وہی میری قیام گاہ ہوگی۔ یہ امر پروردگار کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔ ناقہ حضرت ابوایوب کے دروازہ پر ٹھہرا تو آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ ان کا مکان دو منزلہ تھا۔ آپ نے نیچے کے حصہ میں قیام فرمایا کہ اس طرح لوگوں کی ملاقات میں سہولت ہوگی اور کار تبلیغ بآسانی انجام پا سکے گا۔

مدینہ کا اصلی نام یثرب تھا۔ اس کی بنیاد سام بن نوح یا یوشع بن نون نے رکھی تھی۔ یہاں یہودیوں کا کاروبار تجارت تھا اور اوس و خزرج کے قبائل زراعت کا کام کرتے تھے۔ کل ۲۰ قبائل آباد تھے۔ جغرافیائی اعتبار سے ایک طرف کوہ عیر، دوسری طرف کوہ سلع، شمال میں کوہ احد اور باقی مختلف پہاڑیاں۔

مدینہ میں سات ماہ قیام کے بعد اسعد بن زرارہ کے دو یتیم بچے سہل اور سہیل کی زمین دس دینار میں خرید لی تاکہ اس پر مسجد کی تعمیر کی جائے اور حضور اکرمؐ نے مسجد نبوی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس تاریخی مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔

اس کے بعد حکم پروردگار سے نماز پنجگانہ کی ۱۷ رکعتوں کا تعین ہوا اور جماعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اعلان کے لیے ایک وسیلہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور حضور نے دوسرے احکام کی طرح وحی پروردگار کے مطابق اذان کا حکم دیا اور بلال پہلے موذن قرار پائے۔ (واضح رہے کہ احکام الٰہیہ میں کسی شخص کی رائے یا کسی کے خواب کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اذان کی تشریع کا عبداللہ بن زید یا عمر بن الخطاب کے خواب کی طرف منسوب کرنا ایک تاریخی افسانہ ہے جس کی اسلام میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔)

مسلمانوں کی عبادت کا انتظام کرنے کے بعد حضور نے سیاسی اور اجتماعی معاملات پر توجہ دی اور انس بن مالک کے گھر میں انصار اور مہاجرین کے درمیان برادری کا رشتہ قائم کیا گیا۔ ابوبکر خارجہ بن زید کے بھائی قرار پائے اور عمر عتبان بن مالک کے، عثمان کو اوس بن ثابت کا

بھائی قرار دیا گیا اور ابوعبیدہ کو سعد بن معاذ کا، عمار حذیفہ کے بھائی قرار پائے، اور سلمان ابو درداء کے۔ مصعب بن عمیر کی برادری ابو ایوب سے طے ہوئی اور ابوذر کی برادری منذر بن عمر سے، بلال کی اخوت ابورویحہ سے طے پائی اور حمزہ کی اخوت زید بن حارثہ سے ـــ ایک حضرت علیؑ تھے جنھیں رسول اکرمؐ نے دنیا اور آخرت میں اپنا بھائی قرار دیدیا اور اس کے علاوہ اصحاب میں کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا۔

انصار نے مواخات کا حق ادا کیا اور اپنے جملہ اموال میں مہاجرین کو شریک بنا لیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مہاجرین کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا خیال پیدا ہوا اور مختلف کاروبار شروع ہو گئے۔ ابوبکرؓ بزاز بنے، عمرؓ نے دلالی کا کام شروع کیا اور عثمانؓ . . . بیچنے لگے۔

مدینہ آبادی کے اعتبار سے ابتدا میں یہودیوں کا مرکز تھا۔ اس کے بعد یمن سے اوس اور خزرج نام کے دو شخص آکر آباد ہو گئے اور انھوں نے یہودیوں سے معاہدہ کر لیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد دونوں فریقوں میں اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف برقرار رہا۔ رسول اکرمؐ نے اس صورت حال کے پیش نظر مدینہ پہونچ کر ایک عام عہد نامہ تیار کیا جس میں مسلمان، یہود اور مدینہ کے تمام قبائل شامل تھے۔ مشہور روایات کی بنا پر اس معاہدہ میں ۴۷ دفعات تھیں جو ایک عام اجتماعی زندگی کے لیے مکمل دستور العمل کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اب ہجری سال کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی بنیاد طبری وغیرہ کے اشارہ کی بنیاد پر رسول اکرمؐ ہی نے قائم کی تھی اور بعد میں حضرت علیؑ نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کا تعلق کسی دوسرے صحابی یا مورخ سے نہیں ہے۔ ہجرت اسلامی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے جس میں ایثار، قربانی اور فداکاری کے بے مثال مرقع پائے جاتے ہیں اور یہی اسلامی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے۔

سنہ ۱ھ میں ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل کا انتقال ہوا اور عبداللہ بن زبیر اور مختار بن ابوعبیدہ ثقفی کی ولادت ہوئی۔

سنہ ۲ھ میں ہجرت کے ۱۷ یا ۱۹ مہینے کے بعد عین نماز کی حالت میں قبلہ کی تبدیلی کا حکم آگیا جب حضور برار بن معرور کے مکان یا مسجد بنی سالم میں نماز ظہر میں مشغول تھے اور اس طرح اس مقام پر مسجد قبلتین کی تعمیر ہو گئی اور مسلمانوں کو یہودیوں کے طعنوں سے نجات مل گئی کہ انھوں نے نیا دین تو ایجاد کر لیا ہے لیکن انھیں ہمارے قبلہ کے علاوہ دوسرا قبلہ بھی نصیب نہیں ہے۔

ہجرت کے تقریباً ایک ماہ کے بعد ربیع الثانی میں حضر میں بعض نماز کی دو رکعتوں پر دو رکعتوں

کا اضافہ کر دیا گیا اور ظہر و عصر و عشاء کی چار رکعتیں ہو گئیں جو حضر میں باقی رہتی ہیں اور سفر میں ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد کفار کی طرف سے مزاحمتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سرکار دو عالمؐ کو مسلح طور پر مقابلہ کرنا پڑا۔ بعض معرکوں میں آپ نے خود شرکت فرمائی جسے غزوہ کہا جاتا ہے اور اس کی تعداد تقریباً ۲۶ ہے۔ اور بعض میں دوسرے مسلمانوں کو سردار بنا کر بھیج دیا جسے سریہ کہا جاتا ہے اور جس کی تعداد تقریباً ۳۶ ہے۔ اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق غزوات کی تعداد ۲۸ ہے۔ بہرحال حضور اکرمؐ کو دس سال کے عرصہ میں تمام ذمہ داریوں کے علاوہ ان معرکوں کو بھی برداشت کرنا پڑا جو آپ کی عظمت کردار کی سب سے عظیم دلیل ہے۔

ابتدائی طور پر صفر سنہ ۲ھ میں ودآن یا ابواء کی مزاحمت ہوئی۔ اس کے بعد ربیع الاول میں عکرمہ بن ابی جہل سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ربیع الثانی میں مقام بُواط تک حضور خود تشریف لے گئے۔ جمادی الاولیٰ میں عشیرہ تک جانا پڑا۔ دس دن کے بعد کرز بن جابر فہری نے جانور پکڑ لیے تو اس کا تعاقب کیا گیا جسے بدر اولیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جمادی الثانیہ، رجب اور شعبان میں قدرے سکون رہا۔ اس کے بعد ماہ رمضان میں بدر کبریٰ کا معرکہ پیش آیا جو اسلام کا سب سے پہلا مشہور ترین معرکہ ہے۔

بدر میں مسلمانوں کا کل سامان جنگ تین گھوڑے، ستر اونٹ، آٹھ تلواریں اور ۶ زرہیں تھیں، افراد کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ اور اُدھر فوج دشمن مسلح اور ۹۵۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ۳۱۳ افراد میں ۷۳ مہاجرین تھے اور ۲۳۶ انصار۔ علم لشکر حضرت علیؑ کے ہاتھ میں تھا اگرچہ آپ کے لیے یہ پہلا جنگی تجربہ تھا اور حضرت حمزہ جیسے آزمودہ کار موجود تھے لیکن جس کے پاس وہبی صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ تجربات کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔

بدر کا معرکہ اگرچہ پہلا معرکہ تھا اور لشکر اسلام انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں تھا ـــ لیکن نصرت خداوندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر کفار کے اکثر سردار عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، ابوجہل بن ہشام، رفعہ بن اسود، ابوالبختری بن ہشام، امیہ بن خلف، نبیہ اور منبہ بن الحجاج سب ہی کام آگئے اور اس طرح کفر کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو گئے، اور شاید اس نصرت خداوندی کا راز یہی تھا کہ مسلمانوں کا اعتماد نہ لشکر پر تھا اور نہ اسلحہ پر بلکہ تمام تر اعتماد نصرت الٰہی پر تھا اور ایسے حالات میں نصرت الٰہی

کام آتی ہے ورنہ جب اعتماد غیر خدا پر شروع ہو جاتا ہے تو لاکھوں کی تعداد کے ہونے کے باوجود شکست کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا جیسا کہ دورِ حاضر میں برابر دیکھنے میں آرہا ہے۔

بدر کے واقعی مجاہد تو صرف جناب حمزہ، جناب عبیدہ اور جناب علی مرتضٰیؑ، یعنی کل اولاد عبدالمطلب تھی۔ لیکن جب مالِ غنیمت ہاتھ آگیا تو سب دعویدار ہو گئے اور اس اخلاصِ جہاد کے باوجود طمعِ دنیا نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں سورۂ انفال نے سارا مال ملکِ رسولؐ بنا دیا اور آپ نے تمام مسلمانوں پر برابر برابر تقسیم کر دیا کہ واقعی مجاہدین اس قدر مخلص ہیں کہ انھیں نہ مال کی پرواہ ہے اور نہ وہ اس قسم کی تقسیم پر اعتراض کرنے والے ہیں۔

جنگ بدر میں اسیروں کے بارے میں رسول اکرمؐ کو اختیار تھا کہ چاہے یوں ہی آزاد کر دیں یا فدیہ لے کر آزاد کریں۔ چنانچہ آپ نے دونوں طریقۂ کار اختیار فرمائے۔ عباس بن عبدالمطلب کو فدیہ لیکر آزاد کیا، عمرو بن ابوسفیان کو ایک مرد انصاری سعد بن نعمان کے بدلے آزاد کیا۔ سہیل بن عمرو کو فدیہ لے کر آزاد کیا اگرچہ اس کی مشہور خطابت کی بنا پر عمر بن الخطاب کی رائے تھی کہ اس کے دانت اکھاڑ دیے جائیں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اسلام مُثلہ کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ نادار قیدیوں کی سزا یہ قرار پائی کہ ہر شخص دس مسلمانوں کی تعلیم کی ذمہ داری لے اور اس طرح یہ واضح ہو گیا کہ اسلام مال سے زیادہ علم کو اہمیت دیتا ہے، اور علم جس کے پاس بھی ہو اس سے حاصل کر لینا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی تعصب کا شکار نہیں ہونا چاہتا ہے۔

جنگ بدر کے نتیجہ میں ۱۴ مسلمان شہید ہوئے جن میں ۶ مہاجر تھے اور آٹھ انصار، اور اُدھر لشکرِ کفار میں ستّر افراد ہلاک ہوئے اور ستّر قیدی بنائے گئے اور ہلاک ہونے والوں میں ۳۵ تنہا حضرت علیؑ کی تلوار کے مارے ہوئے تھے اور باقی کے قتل میں بھی آپ کی شرکت ثابت ہے۔

رسول اکرمؐ نے کفار کے مقتولین کو ایک کنویں میں دفن کر کے قرآن مجید کی آیت کی تلاوت کی کہ جو خدا نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ تو ہم نے پا لیا اب تم بتاؤ کہ جو وعدہ تم سے کیا گیا تھا وہ تمھیں حاصل ہوا کہ نہیں؟ جس واقعہ میں ارواحِ کفار تک کی زندگی کا اشارہ پایا جاتا ہے چہ جائیکہ اولیاءِ خدا اور شہدائے راہِ خدا۔ ان کی حیات میں شک کرنا تو اسلام سے انحراف کی علامت ہے۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں یہ نکتہ انتہائی اہم ہے کہ اس میں حضرت علیؑ کے مقتولین میں ایک عتبہ

تھا جو ہندہ جگر خوارہ کا باپ، معاویہ کا نانا اور ابوسفیان کا خسر تھا اور ایک ولید تھا جو معاویہ کا ماموں تھا اور ایک حنظلہ بن ابوسفیان تھا جو معاویہ کا بھائی تھا اور دیگر بنی امیہ کے سرکردہ افراد بھی تھے جس کے بعد معاویہ اور پھر یزید کے دل میں جذبۂ انتقام کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کہ دین و مذہب نہ ہو تو رشتہ و قرابت سے زیادہ اہم کوئی شے نہیں ہے۔ ان افراد کے علاوہ زبیر کے چچا نوفل بن خویلد اور طلحہ کے چچا عمیر بن عثمان بھی تھے جن کے قتل نے مستقبل میں جنگ جمل کی زمین ہموار کی اور اس طرح حضرت علیؑ سے ان کے اسلامی مجاہدات کا بدلہ لے لیا گیا۔

چند دنوں کے بعد ماہ شوال ۲ھ میں غزوہ بنی قینُقاع پیش آیا۔ یہ ان یہودیوں کی سرکوبی کا معرکہ تھا جنھوں نے ہجرت رسولؐ کے بعد مدینہ کے تحفظ کا معاہدہ کیا تھا اور جب مشرکین نے حملہ کا ارادہ کیا تو ان کے ساتھ ہو گئے اور پھر مشرکین کی شکست کے باوجود معذرت کرنے اور معافی مانگنے کے بدلے قلعہ بند ہو گئے۔ حضور اکرمؐ نے بھی قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اس طرح پندرہ روز کے بعد ذلّت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے جو ہر عہد شکن اور غدّار کا انجام ہوتا ہے۔

اس کے بعد ماہ ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۲ھ میں صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ زہراؑ کا عقد مولائے کائنات علی بن ابی طالبؑ سے ہوا، جن کی خواستگاری کا تقاضا اسلام کی ہر بڑی شخصیت کی طرف سے ہوا تھا لیکن قدرت نے سب کے پیغامات رد کر کے نور کا رشتہ نور سے کرنے کا حکم دے دیا اور تاریخ اسلام کا پہلا اور آخری عصمتی رشتہ انجام پا گیا۔

اسی ۲ھ کے ذی الحجہ میں حضرت عثمان بن مظعون کا انتقال ہوا جنھیں رسول اکرمؐ نے یہ شرف بخشا کہ پہلے ان کی لاش کا بوسہ دیا۔ اس کے بعد قبر کے سرہانے پتھر نصب کیا اور پھر برابر ان کی زیارت کو جاتے رہے یہاں تک کہ اپنے فرزند ابراہیم کو ان کے جوار میں دفن کیا۔ جس سے اسلام کے چار مسئلے حل ہو گئے۔ لاش کا بوسہ دینا، قبر کا نشان بنانا، قبر کی زیارت کرنا اور قبر کے ہمسایہ میں دوسروں کو دفن کرنا۔ جس کے بعد مسلمان توجہ نہ دے تو بریں عقل و دانش بباید گریست۔

۲۲ ذی الحجہ کو غزوۂ سویق پیش آیا جس میں ابوسفیان نے شکست بدر کے انتقام کی نذر پوری کرنے کے لیے خفیہ طور پر ۲۰۰ سپاہیوں کے ساتھ مدینہ پر یلغار کر کے دو انصار کو قتل کر دیا

اور حضور نے تعاقب کا حکم دیدیا تو اپنا ستّو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا جس کی وجہ سے اسے غزوۂ سویق کہا جاتا ہے۔ (سویق۔ ستّو)

۳ھ

۱۹ر محرم کو غزوۂ قرقرۃ الکدر پیش آیا جو ابوسفیان کی سرکوبی کے لیے ہوا تھا، اور اس میں حامل لوائے اسلام حضرت علیؑ تھے اور درحقیقت غزوۂ سویق میں بھی اسی مقام تک تعاقب کیا گیا تھا۔

صفر ۳ھ میں قبیلۂ غطفان نے حملہ کا ارادہ کیا تو آپ نے ان کی سرکوبی کا پروگرام بنایا جسے غزوہ ذی امر کہتے ہیں۔ یہاں حضور درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے جب ایک کافر دعثور بن حارث نے تلوار لے کر آپ پر حملہ کرنا چاہا اور آپ سے پوچھا کہ اس وقت آپ کو کون بچا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرا خدا! جس کے زیر اثر وہ ڈر گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور آپ نے تلوار لے کر پوچھا کہ اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کا رحم و کرم۔ اور یہ کہہ کر مسلمان ہو گیا۔

۱۵ر رمضان ۳ھ کو جناب علیؑ و فاطمہؑ کے یہاں پہلے فرزند کی ولادت ہوئی جس کا نام وحی الٰہی کی بنیاد پر حسنؑ رکھا گیا جو گویا شبر کا ترجمہ تھا جو جناب ہارون کے فرزند کا نام نامی تھا۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد احد کا معرکہ پیش آیا جس میں کفار کی پیش قدمی کا حال سُن کر رسول اکرمؐ نے اصحاب کا امتحان لیا کہ جنگ کہاں ہونی چاہیے؟ — بعض اصحاب نے کہا کہ داخل مدینہ اور بعض نے کہا خارج مدینہ۔ خارج مدینہ کی اکثریت کو دیکھ کر مصلحت پروردگار کے مطابق آپ سلاح جنگ سے سج کر بیت الشرف سے برآمد ہوئے تو اصحاب نے کہا کہ داخل مدینہ جنگ بہتر رہے گی۔ آپ نے فرمایا کہ انبیا جب سلاح جنگ پہن لیتے ہیں تو جنگ کے خاتمہ سے پہلے نہیں اُتارا کرتے ہیں۔ یہ تمہارا صرف ایک امتحان تھا ورنہ نبی کسی کے مشورہ کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے بعد بیرون شہر مقام احد میں جنگ ہوئی۔ کفار کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی اور مسلمان صرف ایک ہزار تھے جن میں تین سو افراد عبداللہ بن اُبَی منافق کے ساتھ تھے جو درمیان راہ سے واپس ہو گئے تا کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو جائے لیکن بہرحال جنگ ہوئی۔ مسلمان اگرچہ یہاں بھی بے سروسامان تھے۔ اُدھر ۷۰۰ زرہیں تھیں اور اِدھر صرف ستّو۔ اُدھر دو سو گھوڑے تھے اور اِدھر صرف دو۔ اُدھر مشرکین میں میمنہ کا سردار خالد بن ولید، میسرہ کا سردار عکرمہ بن ابی جہل۔ علمبردار لشکر طلحہ بن ابی طلحہ اور اِدھر انصار کے سردار سعد بن عبادہ اور مہاجرین کے علمبردار حضرت علیؑ بن ابی طالب تھے۔

میدان کا پہلا مقابلہ حضرت علیؑ اور طلحہ بن ابی طلحہ کے درمیان ہوا جس کے سر پر تلوار لگی تو گر کر برہنہ ہو گیا اور آپ نے منھ پھیر لیا تو دوسرے وار سے بچ کر نکل گیا اور لشکر کفر میں علیؑ کے مقابلہ میں یہ ایک مستقل حربہ بن گیا جو جنگ صفین تک استعمال ہوتا رہا۔ طلحہ پہلے ہی وار کی تاب نہ لا کر چل بسا تو عمومی جنگ شروع ہو گئی۔ لشکر اسلام کے مجاہد علیؑ، حمزہ، مقداد اور ابودجانہ انصاری تھے جن کو رسول اکرمؐ نے تلوار اس شرط سے دی تھی کہ اس کا حق ادا کریں گے یعنی جہاد کریں گے اور فرار نہ کریں گے جب کہ زبیر بن عوام کو تلوار نہیں عنایت فرمائی تھی۔

میدان فتح ہو گیا تھا اور مال غنیمت جمع کرنے کا وقت آ گیا تھا کہ بعض صحابۂ کرامؓ نے غنیمت کی لالچ میں رسول اکرمؐ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے حکم کے باوجود درّہ کو چھوڑ دیا اور میدان میں آ گئے جس کے نتیجہ میں خالد بن ولید نے دوبارہ حملہ کر دیا اور مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھاگنے والوں میں تمام سربرآوردہ شخصیتوں کے نام ملتے ہیں۔ درمنثور اور تفسیر کبیر نے حضرت عمرؓ کے نام کی صراحت کی ہے، طبری نے حضرت عثمانؓ کی نشان دہی کی ہے اور مستدرک نے حضرت ابوبکرؓ کا تعارف کرایا ہے۔

بھگدڑ کا یہ عالم تھا کہ ابتدا میں ڈیڑھ سو مسلمانوں نے جنگ شروع کی اور آخر میں حضرت علیؑ لشکر کفر کے علمبرداروں کے قتل میں مصروف ہو گئے، جس کے نتیجہ میں رسول اکرمؐ زخمی ہو گئے تو آپ ان کی حفاظت میں مصروف ہو گئے جس کے زیر اثر سولہ ایسے زخم کھائے کہ بار بار گر پڑتے تھے لیکن رسول اکرمؐ سے دفاع کرتے رہے اور میدان سے فرار کو ایمان کے بعد کفر کا درجہ دیتے رہے۔

اُدھر جناب حمزہ کی شہادت واقع ہو گئی اور وحشی ملعون نے ان کا کلیجہ ہندہ کے حوالے کر دیا جس نے چبانے کی کوشش کی اور جب ناکام ہو گئی تو ناک، کان کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لیا اور اس طرح کفر نے اسلام سے اپنی شکست کا پورا بدلہ لے لیا اور کوئی معروف صحابی اسلام کے کام نہ آیا۔

رسول اکرمؐ نے جناب حمزہ کے جنازہ پر سات تکبیریں کہیں اور پھر دوسرے شہدار کے جنازہ کی نماز کے ساتھ بھی حمزہ کو شامل رکھا یہاں تک کہ ۷۰ مرتبہ نماز جنازہ ہوئی۔ پھر حمزہ کو الگ دفن کیا گیا۔ عمرو بن الجموح اور عبداللہ بن عمرو کو ایک قبر میں اور باقی تمام شہدار کو ایک مقام پر دفن کر دیا گیا اور اس طرح ۵ر شوال ۳ھ کا یہ معرکہ بھی ختم ہو گیا۔

رسول اکرمؐ کے زخمی ہونے کے بعد جناب فاطمہؑ باپ کی خبرگیری کے لیے آئیں اور انھوں نے

زخموں کے دھلانے اور علاج کرنے میں حضرت علیؑ کا مکمل ساتھ دیا۔ اور ان کے علاوہ کوئی ہمدرد یا رغار نظر نہیں آیا۔

سنہ ۴ھ

بعض قبائل عرب نے سرکار دو عالمؐ سے معلم کا مطالبہ کیا تو آپ نے ۶ افراد کو بھیج دیا اور کفار نے مقام رجیع پر سب کو گھیر کر قتل کر دیا۔

صفر سنہ ۴ھ میں نجد والوں نے ایسا ہی مطالبہ کیا اور آپ نے چالیس افراد کو روانہ کیا اور ابوالبراء عامر بن مالک ملاعب الاسنہ نے ضمانت بھی دی لیکن کفار نے بئر معونہ پر سب کو تہ تیغ کر دیا۔

ربیع الاول سنہ ۴ھ میں رسول اکرمؐ سردار بنی نضیر کعب بن اشرف کے پاس گئے تو یہودیوں نے عہد شکنی کر کے ایک پتھر گرا کر آپ کو شہید کرنا چاہا۔ جس سے رب العالمین نے بچا لیا تو آپ نے مدینہ سے لشکر بھیج کر ان لوگوں کا محاصرہ کرا لیا اور تین دن کے اندر مدینہ خالی کرا لیا۔ یہ سب بھاگ کر خیبر چلے گئے اور وہاں ریشہ دوانیوں میں لگ گئے۔ یہ خیبری افراد مدینہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے عہد شکنی کی تھی لہذا ان کی سرکوبی کا جواز موجود تھا چاہے جہاں بھی چلے جائیں، اور ان کی سرکوبی کو حملہ کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۳ شعبان سنہ ۴ھ کو صدیقہ طاہرہؑ کے دوسرے فرزند امام حسینؑ کی ولادت ہوئی جسے رب العالمین نے روز اول ہی اسلام کا فدیہ اور ذبح عظیم قرار دے دیا تھا۔

اسی شعبان یا ذی قعدہ میں کفار احد کی ابتدائی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے اور ابوسفیان کی بات کی لاج رکھنے کے لیے برائے انتقام دوبارہ بدر کی طرف چلے اور ادھر رسول اکرمؐ بھی پہونچ گئے تو ابوسفیان فرار کر گیا اور آپ ۱۶ دن قیام کر کے واپس آ گئے۔

سنہ ۵ھ

۲ شعبان سنہ ۵ھ کو قبیلہ خزاعہ نے مدینہ پر حملہ کر دیا اور آپ نے باقاعدہ مقابلہ کر کے دس کو قتل کر دیا اور باقی سب کو قیدی بنا لیا جسے غزوہ بنی المصطلق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

کفار مکہ نے دیکھ لیا کہ تنہا اسلام سے مقابلہ آسان نہیں ہے اور پے در پے شکست ہو رہی ہے تو یہ طے کیا کہ مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کر کے مشترک حملہ کر دیا جائے اور اس طرح اسلام مقابلہ کے قابل نہ رہ جائے گا۔ چنانچہ اس خبر کے پاتے ہی یہودی خود مکہ پہونچ گئے اور کفار کو مدینہ

پر حملہ کرنے کی دعوت دیدی۔ رسول اکرمؐ نے اس صورت حال کو دیکھ حفاظت کی تیاریاں شروع کر دیں اور جناب سلمان کے مشورہ سے مدینہ کے اطراف میں خندق کھدوانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ طے یہ پایا کہ ہر دس آدمی مل کر ۴۰ گز زمین کھود دیں گے۔ اور سلمان نے تن تنہا یہ طے کیا کہ سب کے برابر زمین کھود دیں گے۔ چنانچہ ایسی صورت حال کو دیکھ کر انصار و مہاجرین دونوں نے چاہا کہ سلمان کے کارنامہ کو اپنے حساب میں درج کر لیا جائے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ سلمان کا شمار ہم اہلبیتؑ کے ساتھ ہے، اور اہلبیتؑ میں وہی شخص شامل ہو سکتا ہے جس کا کارنمایاں تمام انصار و مہاجرین کے برابر ہو اور وہ تنہا سارے کمالات کا حامل ہو۔

ماہ رمضان میں خندق کھودنے کا کام شروع ہوا اور روزہ رکھے ہوئے مسلمان راہ خدا میں جہاد کرتے رہے۔ شوال میں معرکہ پیش آیا۔ ادھر بنی نضیر مدینہ سے نکالے جا چکے تھے اور انھوں نے انتہائی سازش کر کے بنی قریظہ کو بھی عہد شکنی پر آمادہ کر لیا اور اس طرح مسلمانوں پر شدید ہراس طاری ہو گیا۔ مغازی واقدی کے مطابق حضرت عمرؓ نے کفار کی تیاری کی خبر پہونچائی اور حضرت ابوبکرؓ شدید طور پر خوفزدہ ہو گئے، باقی مسلمانوں کا کیا ذکر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے ۲۰ دن تک مدینہ کا محاصرہ جاری رکھا اور صرف تیراندازی کا تبادلہ ہوتا رہا یہاں تک کہ دشمن کے حوصلے بلند ہو گئے اور عمرو بن عبدود، ضرار بن الخطاب، ہبیرہ بن وہب جیسے افراد خندق پار کر کے اس طرف آ گئے جو بظاہر انتہائی احمقانہ اقدام تھا کہ چند افراد اپنے لشکر سے کٹ کر رہ گئے لیکن مسلمانوں میں مقابلہ کی ہمت نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ حضور کے للکارنے پر بھی کسی کے سر سے طائر نہ اُڑا اور سب سر جھکائے بیٹھے رہے۔ بالآخر رسول اکرمؐ کے مطالبہ پر حضرت علیؑ نے جنگ کی اور تا دیر مقابلہ کے بعد خود بھی زخمی ہوئے اور عمرو کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر خندق میں اتر کر منبہ کو بھی تمام کیا۔ ادھر فوج دشمن میں بھگدڑ مچ گئی تو ضرار نے تعاقب کا احساس کر کے فرار اختیار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ علیؑ بھاگنے والوں کا تعاقب نہیں کرتے ہیں تو مڑ کر دیکھا کہ حضرت عمرؓ ہیں تو اس نے حملہ کر دیا اور اب انھوں نے بھاگنا شروع کر دیا یہاں تک کہ جب قریب پہونچ گیا تو ان پر جان بخشی کا احسان جتا کر چھوڑ دیا۔

عمرو کو قتل کرنے کے بعد حضرت علیؑ نے اس کی قیمتی زرہ بھی حاصل نہ کی جس پر اس کی بہن نے آپ کی شرافت و نجابت کا قصیدہ پڑھا اور اس طرح اسلام تلوار اور کردار دونوں کا

فاتح قرار پایا۔

بنی قریظہ کی عہد شکنی کی سزا کے طور پر جنگ خندق کے دوسرے دن حضور نے بنی قریظہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیدیا۔ حضرت علیؑ علمبردار لشکر تھے۔ ان لوگوں نے پہلے گالیوں سے مقابلہ کیا، اس کے بعد قلعہ بند ہوگئے۔ ۲۵ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ آخرکار ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے اور قبیلہ اوس نے ان کی سفارش کی تو وہ لوگ سردار قبیلہ سعد بن معاذ کے فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ اور انھوں نے یہ فیصلہ سُنا دیا کہ تمام مَردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں اور بچّوں کو غلام و کنیز بنا لیا جائے۔ جس پر یہ بات مشہور ہوگئی کہ کاش سعد کے بجائے معاملہ کو خود حضورؐ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہوتا۔

بنی قریظہ سے غنیمت کے طور پر ملنے والا مال ۱۵۰۰ تلواریں، ۳۰۰ زرہیں، دو ہزار نیزے، ۵۰۰ سپریں اور بے تحاشہ شراب وغیرہ کے ذخائر تھے جنھیں ضائع کر دیا گیا۔

قتل کرنے کی نوبت آگئی تو تمام افراد کو حضرت علیؑ اور زبیر نے قتل کیا اور آخر میں بنی نضیر کے سردار حی بن اخطب کو بھی قتل کیا گیا اور اس طرح ۵۰۰ افراد قتل کیے گئے اور ایک ہزار عورتوں اور بچوں کو غلام اور کنیز بنا لیا گیا۔

سنہ ۶ھ

ربیع الاول سنہ ۶ھ میں غزوہ ذی قرد پیش آیا جو شام کے راستہ میں ایک چشمہ کے پاس کا واقعہ ہے۔

مکہ چھوڑنے کے بعد سے مسلمان حج بیت اللہ کے لیے بے چین تھے اور رسولِ اکرمؐ برابر تسکین دے رہے تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے خواب دیکھا کہ خانۂ خدا کا طواف کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو خبر سُنائی تو مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور آپ یکم ذی قعدہ کو حج سے پہلے عمرہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

مکہ کے قریب پہونچ کر آپ نے چاہا کہ مکہ میں یہ اطلاع پہونچائیں کہ ہم لوگ صرف طواف کے لیے آئے ہیں اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن حضرت عمرؓ نے خوف کے مارے جانے سے انکار کر دیا اور حضرت عثمانؓ کو بھیجا گیا تو وہ گرفتار ہوگئے، اور یہاں ان کے قتل کی خبر مشہور ہوگئی تو مسلمانوں نے مکہ پر حملہ کرنے کا تقاضا کر دیا اور آپ نے احد کے تجربہ کی بنا پر موت کے بجائے میدان سے فرار نہ کرنے کے نام پر بیعت کا مطالبہ کیا۔ (ابو الفداء، مغازی واقدی، تاریخ ابن الوردی)

بقول طبرسی (اعلام الوریٰ) سب نے اس بات پر بیعت کی کہ مقابلہ کے میدان سے ہرگز فرار نہیں کریں گے۔

اور سہیل بن عمرو کفار کا نمائندہ بن کر صلح کا پیغام لے کر آگیا۔ اور جب یہ محسوس کر لیا کہ حضور جنگ نہیں کریں گے تو ہر طرح سے دبانا شروع کیا۔ آپ نے بھی بظاہر اس کی تمام شرطیں تسلیم کر لیں اور نہ اصحاب سے مشورہ کیا اور نہ ان کی ناراضگی کی کوئی پرواہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر کو نبوت میں شک ہوگیا اور مسلمانوں میں ایک خلفشار برپا ہوگیا۔

اُدھر سہیل کا بیٹا جو مسلمان ہو چکا تھا اور باپ کے ہاتھوں مسلسل اذیتیں برداشت کر رہا تھا۔ رسول اکرمؐ کی خبر پا کر زنجیروں سمیت حاضر ہوگیا اور پناہ کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا تمھاری مدد کرے۔ میں معاہدہ کر چکا ہوں کہ اپنے آدمیوں کو واپس نہیں لوں گا لہذا عہد شکنی نہیں کر سکتا۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ابوجندل کو تلوار دے دیں کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر دے، لیکن اُس نے انکار کر دیا کہ میں عہدِ رسولؐ کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپؐ نے اسے دعائیں دیں اور حسب معاہدہ اسے واپس کر دیا۔

سنہ ۷ھ

بنی نضیر اپنی عہد شکنی کی بنیاد پر پہلے ہی مدینہ سے نکالے جا چکے تھے۔ بنی قریظہ کو بھی جنگ احزاب میں مشرکین کی مدد کرنے کی سزا میں شہر بدر ہونا پڑا جس کے بعد تمام یہودیوں میں اسلام سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوگیا اور میثاق مدینہ بالکل بے معنی قرار پا گیا۔ رسول اکرمؐ کو اصولی طور پر حق حاصل تھا کہ میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سرکوبی کریں چاہے وہ جس مقام پر قلعہ بند ہو جائیں۔ اس بنا پر آپ نے خیبر کا رُخ فرمایا ورنہ اسلام اپنی پالیسی کے اعتبار سے بظاہر علاقۂ غیر میں جا کر جنگ کرنے کا قائل نہیں ہے اگرچہ قانونی طور پر اسے دین خدا کے لیے ہر علاقہ میں جنگ چھیڑنے کا اختیار حاصل ہے کہ اُس کے خدا کے لیے کوئی علاقہ علاقۂ غیر نہیں ہے۔

خیبر میں ۱۴ ہزار یہودی قلعہ بند ہو چکے تھے۔ حضور اکرمؐ نے رجب سنہ ۷ھ میں خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا لیکن مدینہ سے خیبر کا فاصلہ طے کرنے میں اس قدر زحمت سفر کا سامنا پڑا کہ حضور درد شقیقہ

میں مبتلا ہوگئے اور حضرت علیؑ کو آشوبِ چشم کی تکلیف ہوگئی جس کی بنا پر مسلمانوں کو موقع مل گیا کہ اپنے طور پر سردارِ لشکر طے کر کے حملہ کردیں یا بعض افراد کو خود ہی سرداری کا خیال پیدا ہوگیا اور وہ علم اسلام لے کر خیبر کے قلعوں تک پہونچ گئے لیکن جب خیبر کے بہادروں نے للکارا تو صحت و سلامتی کے ساتھ واپس آگئے جس کی تصویر کشی مدارج النبوۃ وغیرہ نے اس طرح کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے قتال شدید کا سامنا کیا لیکن قلعہ فتح نہ ہوسکا تو مجبوراً واپس آگئے جس کے بعد رسول اکرمؐ نے اعلان کیا کہ تمھاری پیش قدمی یا تمھارے انتخاب کا حشر معلوم ہوگیا۔ اب کل میں علم دوں گا اور اسے دوں گا جو مرد میدان، کرار غیر فرار، خدا و رسولؐ کا دوست اور خدا و رسولؐ کا محبوب ہوگا اور اس وقت تک واپس نہ آئے گا جب تک خیبر فتح نہ ہوجائے۔ چنانچہ دوسرے دن شکست خوردہ افراد نے بھی اپنے قد شجاعت کو مزید اونچا کرنا چاہا، لیکن رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو طلب کر کے رایت لشکر ان کے حوالے کردیا اور انھوں نے ۲۴ رجب ۷ھ کو مرحب، عنتر، حارث جیسے پہلوانوں کا خاتمہ کر کے خیبر کے تمام قلعوں کو فتح کرلیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فاتح خیبر کے لقب سے ملقب ہوگئے۔

خیبر کی فتح کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اہل فدک نے جنگ سے بچتے ہوئے اپنے علاقہ کو رسول اکرمؐ کے حوالے کردیا اور یہ علاقہ رسولؐ کا خالصہ قرار پاگیا جسے آپ نے بحکم خدا اپنی دختر نیک اختر جناب فاطمہ زہراؑ کے حوالے کردیا اور اسلام بڑی حد تک خدیجہ کے احسانات کا بدلہ دینے میں کامیاب ہوگیا۔

فدک مدینہ سے دو دن کے فاصلہ پر سات قطعات اراضی کا مجموعہ تھا جس کی آمدنی لاکھوں میں تھی۔ اسے چند درختوں کا مجموعہ کہنا اس علاقہ کی توہین نہیں ہے۔ بلکہ ان افراد کی توہین ہے جنھوں نے اپنے شفیق ترین پیغمبرؐ کی دختر نیک اختر کو ان کے مطالبہ کے باوجود یہ چند درخت دینے سے انکار کردیا اور اس طرح تنقید و تبصرہ کا نیا دروازہ کھول دیا۔

فدک کا علاقہ مال غنیمت نہیں تھا لہٰذا اس سے مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں تھا اور رسول اکرمؐ بھی کسی کو بخشی ہوئی جائداد کو صدقہ مسلمین بنا کر دنیا سے نہیں جاسکتے ہیں۔

اسی ۷ھ میں منبر رسولؐ کی تشکیل ہوئی جس میں ابتدائی طور پر تین زینے تھے، بعد میں بڑھا کر سات کردیے گئے۔

اسی ۷ھ کے اواخر یعنی ذی قعدہ میں وہ عمرہ بجالایا گیا جو صلح حدیبیہ کی بنا پر ترک کردیا گیا تھا

اور جسے تاریخ میں عمرۃ القضا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عمرہ کے موقع پر پہلے حضرت علیؑ نے کفار سے مکہ کو خالی کرایا، اس کے بعد رسول اکرمؐ عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہوئے اور اس طرح قدرت نے اس موقع پر بھی حضرت علیؑ کے کردار کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

اُدھر ۷ھ ہی میں سرکار دو عالمؐ نے دنیا کے مختلف سلاطین کو اسلام کا پیغام بھیجا۔ ایران کے کسریٰ روم کے قیصر، حبش کے نجاشی، عمان کے حاکم، مصر کے مقوقس، بحرین کے سلطان، یمامہ کے بادشاہ اور بصریٰ کے حکمراں کے علاوہ حاکم شام منذر بن حارث۔

ان تمام خطوط میں اجمالی طور پر اَسْلِمْ تَسْلَمْ کا پیغام تھا کہ اسلام لے آؤ اسی میں سلامتی ہے یا پھر اسلام نہ لانے کی صورت میں عذاب آخرت کا ذکر تھا۔ دنیا میں حملہ کر کے بزور شمشیر اسلام پھیلانے کا کوئی تذکرہ نہیں تھا اور نہ یہ اسلام کی تبلیغی پالیسی رہی ہے۔ اسلام لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا مذہب ہے اور اسی اصول کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔

۸ھ

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں جنگ مؤتہ ہوئی جسے غزوات میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ حضور اکرمؐ کی شرکت نہیں تھی بلکہ آپ نے تین ہزار مسلمانوں کا لشکر روانہ کردیا تھا جب کہ مقابلہ پر شرجیل کی کمک کی بنا پر ایک لاکھ رومی فوج تھی۔ لشکر اسلام کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے سردار لشکر زید بن حارثہ ہوں گے ان کی شہادت کے بعد جعفر بن ابی طالبؑ اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ۔

سرداران لشکر ایک کے بعد ایک کام آگئے۔ اس طرح کہ جعفر طیارؑ کے جسم پر کل ۵۰ یا ۹۰ زخم تھے جس میں سے ۳۰ صرف چہرہ پر تھے۔ آپ کا دست مبارک بھی قطع ہوگیا تھا جب کہ آپ کی عمر صرف ۳۳ یا ۳۴ سال تھی اور اسلام اپنے پہلے ۳۴ سالہ سپاہی کی ایسی قربانی پیش کر رہا تھا جس میں شانے بھی قلم ہوجائیں اور قدرت کی طرف سے طیار کا لقب بھی حاصل ہوجائے۔

سرداروں کی شہادت کے بعد خالد بن ولید نے کمان سنبھال لی اور حالات کے خطرات کو دیکھ کر لشکر کو لے کر بھاگ آیا جس پر مدینہ میں اس قدر ملامت کی گئی کہ سپاہیوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا لیکن بے گناہ صحابی رسولؐ مالک بن نویرہ کے قتل اور ان کی زوجہ محترمہ سے بدکاری کی بنا پر خالد کو سیف اللہ کے لقب سے نواز دیا گیا اور یہ تلوار پھر ہمیشہ برہنہ ہی رہی۔

اس کے بعد فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا، جس کی مختصر داستان یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہر قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے معاہدہ کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا جس کی بنا پر بنی خزاعہ نے رسول اکرمؐ سے معاہدہ کیا اور بنی بکر قریش کے حلیف بنے۔ لیکن ایک دن موقع پا کر بنی بکر کے آدمی نے بنی خزاعہ کے آدمی کو ٹھیک حرم کے اندر قتل کر دیا اور انھوں نے رسول اکرمؐ سے فریاد کی تو آپ نے بھی دس ہزار مسلمانوں کو لے کر ماہ مبارک میں مکہ کا ارادہ کر لیا۔

مدینہ سے باہر نکل کر آپ نے روزہ توڑ دیا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا بلکہ نہ توڑنے والوں کی مذمت بھی کی جو قصر کے ضروری ہونے کی بہترین دلیل ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۸۶)

ابھی لشکر مکہ کے باہر ہی تھا کہ ابوسفیان دریافت حال کے لیے آ گیا اور مسلمانوں کے نرغہ میں گھر گیا، عباس نے اسے پناہ دی اور اسلام لانے کا مشورہ دیا تو مجبوراً اظہار اسلام پر آمادہ ہو گیا اور رسول اکرمؐ نے اسے پناہ دے دی اور پھر اعلان کر دیا کہ جو شخص ابوسفیان، حکیم بن حزام، خانۂ کعبہ یا بیت نبیؐ میں پناہ لے لے اس کے لیے پناہ ہے تاکہ اس طرح واضح ہو جائے کہ کون کس جگہ کو اپنی پناہ گاہ قرار دیتا ہے اور کس کا اسلام کس نوعیت کا ہے۔

اس کے بعد آپ نے عباس سے کہا کہ ذرا ابوسفیان کو ہمارے لشکر کا معائنہ تو کراؤ۔ عباس نے لشکر کا معائنہ کرایا تو ابوسفیان بول اٹھا تمھارے بھتیجے کی حکومت کافی ترقی کر گئی ہے۔ عباس نے ٹوک کر کہا کہ یہ حکومت نہیں ہے بلکہ نبوت ہے جس کے بعد اسلام اور استسلام کا فرق بھی واضح ہو گیا کہ استسلام کی بنیاد نبوت نہیں ہے بلکہ حکومت اور اس کا خوف ہے اور بس۔!

مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے انصار کے ساتھ داخلہ پسند فرمایا جن کے علمبردار سعد بن عبادہ تھے۔ انھوں نے جذبات میں آ کر اعلان کر دیا کہ آج بدلے کا دن ہے اور آج ہر طرح کا انتقام جائز ہے۔ حضور اکرمؐ کو یہ اعلان اس قدر ناگوار گذرا کہ آپ نے علم لشکر سعد سے لے کر حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا کہ اسلام جذباتی علمداری کا حامی نہیں ہے۔ اسلام جوش کے بجائے ہوش کا طلبگار ہے۔

کعبہ میں داخل ہو کر نماز ادا فرمائی۔ پھر مشرکین کو ان کے جرائم اور مظالم یاد دلا کر طلقاء کہہ کر آزاد کر دیا اور پھر ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ نے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد یہ سوال بھی کیا کہ تم لوگ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو تو سہیل بن عمر نے کہا کہ آپ خود کریم ہیں اور ایک کریم

خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تم سب کو آزاد کر دیا تاکہ مشرکین پر بھی یہ بات واضح رہے کہ آزاد اور ہوتے ہیں اور آزاد کردہ اور۔ آزاد کردہ افراد کو شرفاء سے مقابلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

نماز ادا کرنے کے بعد حضرت علیؑ کو اپنے کاندھوں پر بلند کر کے طاقہائے کعبہ سے بت گروائے اور بقول محدث دہلوی اس بات پر ناز فرمایا کہ علیؑ کار حق انجام دے رہے ہیں اور میں بار حق اٹھائے ہوئے ہوں۔

مکہ میں ۱۰ یا ۱۵ یا ۱۷ یا ۱۸ دن قیام فرمانے کے بعد واپسی ہوئی۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا دس دن کا قیام طے نہیں ہوا تھا اس لیے نماز قصر ہی ہوتی رہی۔

ماہ رمضان میں مکہ فتح ہو جانے کے بعد ۱۰ شوال ۸ھ کو جنگ حنین ہوئی جس کا میدان مکہ اور طائف کے درمیان تھا۔ مسلمان تیرہ ہزار کی تعداد میں تھے اور انھیں فتح کا غرور بھی تھا۔ لیکن دشمن کے حملے کو دیکھ کر سب نے فرار اختیار کیا۔ اور جب آپ نے مسلسل آواز دی اور غیرت دلائی تو واپس آئے اور ایسا معرکہ ہوا کہ ۷۰ کفار مارے گئے جب کہ مسلمانوں میں صرف چار افراد شہید ہوئے۔ مال غنیمت میں چار ہزار قیدی، ۲۴ ہزار اونٹ اور ۴۰ ہزار بھیڑ بکریاں ہاتھ آئیں اور ایک من کے قریب چاندی بھی حاصل ہوئی۔

اُدھر جنگ مُوتہ کے بعد رومیوں کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور ہرقل روم نے اسلام کو فنا کر دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ حضور اکرمؐ نے بھی عام نفیر کا اعلان کر دیا کہ سارے مسلمان جہاد کے لیے آمادہ ہو جائیں اور تبوک تک جا کر وہاں شعبان اور ابتدائے رمضان میں قیام فرمایا لیکن کسی مزاحمت کی نوبت نہیں آئی اور آپ نے واپسی کا قصد کر لیا۔ دشمن شوکت اسلام کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے، لہذا انھوں نے نیا پروگرام یہ بنایا کہ واپسی میں گھاٹی میں حضور کے اونٹ کو بھڑکا کر گھاٹی میں گرا دیا جائے اور آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن عین موقع پر قدرت کی طرف سے ایسی بجلی چمکی کہ سب کے چہرے پہچان لیے گئے اور آپ نے حذیفہ اور عمار کو اس راز کا رازدار بنا دیا جو اس قدر سنگین مسئلہ بن گیا کہ اکثر حضرت عمرؓ حذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ کہیں منافقین میں میرا نام تو نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر رسول اکرمؐ کے ہمراہ حضرت علیؑ نہیں تھے اس لیے کہ آپؐ کو معلوم تھا کہ جنگ ہونے والی نہیں ہے اور آپؐ نے انھیں یہ کہہ کر مدینہ میں روک دیا تھا کہ مدینہ میں میرا یا تمھارا

رہنا ضروری ہے کہ میرا اور تمہارا رشتہ موسیٰ اور ہارون کا رشتہ ہے، صرف میرے بعد نبوت کا سلسلہ نہیں رہے گا۔

سنہ ۹ھ

فتح مکہ کے دوسرے سال قدرت نے مشرکین سے برأت کا اعلان کیا اور سورۂ توبہ کی آیتیں نازل ہوئیں جسے لے کر ابتداءً حضرت ابوبکرؓ گئے لیکن بعد میں وحی خدا نے انھیں واپس کر کے حضرت علیؑ کے ذریعہ اعلان کا حکم دے دیا اور آپ نے حج اکبر کے موقع پر مشرکین سے بیزاری کا اعلان کر دیا جو اصولی طور پر پیروانِ علیؑ ابن ابی طالب کا ایک ابدی مسلک ہے۔

اعلان برأت کے چار اہم نکات تھے:

۱۔ مشرکین نجس ہیں لہٰذا مسجد الحرام کے قریب نہ آئیں۔

۲۔ برہنہ ہو کر خانۂ خدا کا طواف نہ کیا جائے۔

۳۔ کافر جنت کی طرف سے مایوس ہو جائے۔

۴۔ جملہ معاہدوں پر عمل درآمد صرف چار ماہ تک ہوگا۔ اس کے بعد اسلام اپنے تصرفات میں آزاد رہے گا۔

اعلان برأت کے بعد ۲۴ ذی الحجہ ۹ھ کو نصاریٰ نجران سے مقابلہ ہوا جو حضرت عیسیٰؑ کی خدائی کو منوانے کے لیے آئے تھے۔ اور جب قرآنی آیات پر ایمان نہ لائے تو رسول اکرمؐ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور حضرات حسنؑ و حسینؑ کو لے کر مباہلہ کے میدان میں آگئے، جس کے بعد عیسائیوں نے شکست تسلیم کر لی اور جزیہ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

اسلام کے سارے معرکوں کے سر ہو جانے کے بعد رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو یمن کی تبلیغی مہم پر روانہ کر دیا جس کے نتیجہ میں پورا قبیلۂ ہمدان مسلمان ہو گیا۔

سنہ ۱۰ھ

اُدھر رسول اکرمؐ ۲۵ ذی قعدہ ۱۰ھ کو آخری حج کے ارادہ سے نکل پڑے جس قافلہ میں آپ کے ہمراہ لاکھوں مسلمان تھے۔ حضرت علیؑ جانورانِ قربانی لے کر یمن سے سیدھے مکہ آگئے اور آپ کے ساتھ حج میں شامل ہو گئے۔ واپسی میں غدیر کے میدان میں بحکم خدا قافلہ روکا

گیا اور آپؐ نے ایک لاکھ بیس ہزار اصحاب کے مجمع میں اعلان فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے، اور اس طرح اسلام کا آخری منصوبہ بھی مکمل ہو گیا اور آیت نے الیوم اکملت لکم دینکم کی سند دے دی۔

حج سے واپسی پر جنگ مُوتہ کے زیر اثر آپ نے ایک لشکر اسامہ بن زید کی سرکردگی میں روم کی طرف روانہ کر دیا جس میں حضرات شیخین کو بھی شامل کر دیا جو بعد میں واپس آگئے اور نہیں گئے، اس سریہ سے آپ نے صرف حضرت علیؑ کو الگ رکھا تھا۔

لشکر کی روانگی کے بعد آپ کے مرض کی شدت میں اضافہ ہونے لگا جس کے بعد آپ نے نوشتۂ نجات لکھنے کے لیے قلم اور دوات کا مطالبہ کیا اور حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان پر بخار کا غلبہ ہے اور یہ ہذیان بک رہے ہیں جس کا صدمہ اور شدید ہو گیا اور آپ اس تکلیف سے جانبر نہ ہو سکے۔

رسول اکرمؐ کی بیماری سے فائدہ اُٹھا کر حضرت ابوبکرؓ کو امامت جماعت کے لیے آگے بڑھا دیا گیا آپ نے آواز سنی تو اسی عالم میں مسجد میں آکر انھیں ہٹا کر خود نماز پڑھائی اور بقدر نماز جماعت بھی کسی کی امامت گوارا نہ فرمائی۔

مرض الموت سے حالت غیر ہوئی تو اپنے بھائی اور وصی کو طلب کیا۔ حضرت عائشہ نے ابوبکرؓ اور حفصہ نے عمرؓ کو طلب کر لیا تو آپ نے دونوں کو ہٹا دیا اور ام سلمہ سے علیؑ کو طلب کیا۔ حضرت علیؑ آئے تو ان سے وصیتیں کیں اور پھر انھیں کی آغوش میں سر رکھ کر دنیائے فانی سے انتقال فرمایا۔ بنی ہاشم کے چند افراد نے غسل و کفن کا اہتمام کیا۔ حضرت علیؑ نے تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کر دیا۔

بہت سے مسلمانوں نے اور بقول ابو الفدا، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی جنازہ میں شرکت نہیں کی اور اس طرح اسلام کی تاریخ میں "وفاداری" کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا اور آل رسولؐ کو نسلوں میں قتل و خون اور اذیت و آزار کی شکل میں اجر رسالت ملتا رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی وفات کے بارے میں صفار نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ بدرجۂ شہادت دنیا سے رخصت ہوئے ہیں اور خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے آپ کو بکری کی ران میں زہر ملا کر دے دیا تھا جس کے کھانے کے بعد سے برابر آپ زہر کے اثر کی شکایت فرمایا کرتے تھے اور خود اس گوشت نے بھی باشارۂ قدرت آواز دی تھی کہ مجھے زہر میں بجھایا گیا ہے۔

اس روایت سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ آپ کو زہر دینے والی عورت یہودی تھی چاہے وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتی ہو، ورنہ مسلمان کے زہر دینے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ زہر دینے میں عورت کا ہاتھ تھا ورنہ مرد اس طرح کے کاموں کی براہ راست جرأت نہیں کرتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے عورت ہی کو ذریعہ بنایا جاتا ہے جیسا کہ بعد کی تاریخ عصمت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ازواج

رشتۂ زوجیت کے بارے میں ایک عام تصور یہ پایا جاتا ہے کہ یہ جنسی خواہش کی تسکین کا بہترین ذریعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی شادی کا تذکرہ آتا ہے ہر انسان شرم سے سر جھکا لیتا ہے اور جب تعدد ازواج کا ذکر آتا ہے تو انسان کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ شائد یہ کوئی ہوس پرست اور خواہش زدہ انسان ہے کہ اس نے ایک زوجہ پر اکتفا نہیں کی اور متعدد ازواج کو اپنی تسکین نفس کا ذریعہ بنایا ہے، حالانکہ اسلامی قوانین کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں شادی کا تصور وسیع ترین مفادات کا حامل ہے اور اس میں تسکین نفس اور ایجاد نسل کے علاوہ بے شمار نفسیاتی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی مسائل کا حل پایا جاتا ہے۔ عورت کو وجہ سکونِ نفس قرار دینے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ صرف جنسی سکون کا ذریعہ ہے بلکہ اس کا دائرہ بھی بڑا وسیع تر ہے اور اسی لیے روایات میں عورت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ موجودگی میں شوہر کی تسکین نفس کا ذریعہ بنے اور غیبت میں اس کے گھربار کی حفاظت کرے بلکہ اس کے دین کے تحفظ کا بھی ذریعہ بنے۔

اس اعتبار سے اسلام میں تعدد ازواج اس انداز کا تصور نہیں رکھتا ہے جو تصور عام مادیت پرست ذہنوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عقد جنسی خواہشات کی بنا پر ہوتا ہے تو عورت میں سن و سال اور حسن و جمال وغیرہ کا لحاظ کیا جاتا ہے اور وسیع تر مصالح اور مفادات کے لیے ہوتا ہے تو ان مفادات کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے اور سن و سال اور حسن و جمال جیسے تصورات کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ جو بات سرکار دو عالمؐ کے تعدد ازواج میں واضح طور پر نظر آتی ہے اور اس کا ایک اشارہ اس حکم الٰہی میں بھی پایا جاتا ہے کہ اسلام نے ساری دنیائے انسانیت کے لیے نماز شب کو مستحب قرار دیا ہے اور حضور اکرمؐ کے لیے واجب قرار دے دیا ہے تاکہ ہر انسان کو اس حقیقت کا اندازہ ہو جائے کہ

بیتِ رسالت میں ازواج کا وجود نماز شب کی ادائیگی سے بھی مانع نہیں ہو سکتا ہے تو دیگر فرائض کا کیا ذکر ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے اپنی پوری زندگی میں حسب ذیل عقد فرمائے ہیں، اور ان میں ازواج کی صورت حال یہ تھی:

۱۔ جناب خدیجہؓ: عام روایات کی بنا پر ان کا سن مبارک وقت عقد ۴۰ سال تھا اور حضور اکرمؐ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ ظاہر ہے کہ عام حالات میں ۲۵ سال کا جوان انسان زندگی کی پہلی شادی ۴۰ سال کی خاتون سے نہیں کر سکتا ہے جب کہ اس کے لیے قوم اور قبیلہ کے اندر بے شمار امکانات موجود ہوں۔ عقد کی یہ نوعیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ سرور دو عالمؐ کی شادی کا مقصد اسلام کی وسیع تر مصلحت تھی اور اس کا جنسی تسکین سے کوئی بنیادی تعلق نہیں تھا۔

اس عقد کے سلسلہ میں دو مزید باتیں بھی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں:

۱۔ اس عقد کا پیغام خود جناب خدیجہ نے دیا تھا اور مہر کی پیش کش بھی انھوں نے کی تھی جب کہ وہ اس سے بڑے بڑے رشتوں سے انکار کر چکی تھیں اور اتنی عمر تک شادی کا کوئی قصد نہیں کیا تھا۔

۲۔ جناب خدیجہ کے پیغام کی بنیاد بھی سرکار کا حسن و جمال یا شباب و سن و سال نہیں تھا بلکہ انھوں نے بھی یہ پیغام آپ کی دیانت داری اور آپ کے دست مبارک سے ظاہر ہونے والے برکات کی بنا پر دیا تھا۔

۲۔ سودہ بنت زمعہ: یہ خاتون سکران بن عمرو بن عبد شمس کی زوجہ تھیں اور ابتدائی دور میں اسلام لائی تھیں۔ مکہ کے حالات کی بنا پر شوہر کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں شوہر کا انتقال ہو گیا، اب زحمت یہ تھی کہ قبیلہ میں واپس جائیں تو وہاں سب مشرک ہیں اور اپنا اسلام بھی خطرہ میں پڑ جائے گا لہذا حضور اکرمؐ نے ان سے عقد کر کے ان کے اسلام کا تحفظ بھی کیا اور مسلمانوں میں یہ شعور بھی بیدار کیا کہ شوہر کے فدیۂ اسلام بن جانے کے بعد زوجہ لاوارث نہیں رہ سکتی ہے بلکہ اسے پیغمبر اسلامؐ جیسا شریکِ حیات مل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ میں نہ سودہ کے کسی حسن و جمال کا تذکرہ ہے اور نہ مال و منال کا بلکہ شوہر کے بعد ان کی لاوارثی کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔

۳۔ زینب بنت خزیمہ: ان کا لقب ام المساکین تھا، غربا پروری میں خاصی شہرت

رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر عبداللہ بن جحش جنگ احد میں مارے گئے تو حضورؐ نے ازراہ ترحم ان سے عقد کرلیا تاکہ مسلمان عورتوں میں بے کسی اور لاوارثی کا احساس نہ پیدا ہونے پائے۔

۴۔ ام سلمہ ہند : یہ عبداللہ ابوسلمہ کی زوجہ تھیں اور کافی مسن بھی تھیں اور صاحب اولاد بھی تھیں، لیکن بیوہ ہوجانے کے بعد سرکار دوعالمؐ نے ان سے عقد کرلیا تاکہ ان کے شوہر کی قربانیوں کی قدردانی کی جاسکے اور ان کی اولاد کو یتیمی کے احساس سے بچایا جاسکے۔

۵۔ صفیہ بنت حُیّی بن اخطب : ان کا شوہر روز خیبر قتل ہوگیا تھا، اور یہ گرفتار ہوکر آئی تھیں تو آپ نے انھیں آزاد کرکے ان سے عقد کرلیا تھا اور اس طرح کنیزوں کے ساتھ بہترین برتاؤ کی ایک مثال قائم کردی تھی۔

۶۔ جویریہ بنت الحارث : یہ جنگ بنی المصطلق کے گرفتار شدگان میں تھیں اور ان کے ساتھ قبیلہ کے دوسو قیدی اور بھی تھے۔ لیکن جب حضورؐ نے انھیں آزاد کرکے ان سے عقد کرلیا تو سارے مسلمانوں نے تمام قیدیوں کو آزاد کردیا اور ان کے قبیلہ کے بے شمار لوگ مسلمان ہوگئے، حارث بنی المصطلق کے سردار قبیلہ کا نام تھا۔

۷۔ میمونہ بنت الحارث الہلالیہ : انھوں نے شوہر کے مرنے کے بعد اپنے کو سرکار دوعالمؐ کے حوالے کردیا تھا اور حضورؐ نے اس ہبۂ نفس کو قبول فرمالیا تھا۔

۸۔ ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان : یہ عبیداللہ بن جحش کی زوجہ تھیں، اس کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ وہ وہاں کے حالات کو دیکھ کر عیسائی ہوگیا۔ تو آپ نے انھیں واپس بلاکر ان سے عقد کرلیا کہ ان کے لیے ابوسفیان جیسے باپ کے گھر واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔

۹۔ حفصہ بنت عمر : ان کا شوہر خنیس بن حذافہ جنگ بدر میں مارا گیا تو آپ نے ان سے عقد کرلیا۔

۱۰۔ عائشہ بنت ابی بکر : مشہور روایات کی بنا پر باکرہ تھیں، اور شائد سرکار دوعالمؐ کی جملہ ازواج میں اس طرح کی کمسن اور کنواری خاتون یہ تنہا خاتون تھیں جن سے حضورؐ نے عقد نہ کیا ہوتا تو آپ پر کسی طرح کی حسن پرستی یا جنسیت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ مسلمان مورخین نے ازراہ حماقت ونادان دوستی مسئلہ کو اور بھی سنگین بنادیا اور جناب عائشہ کے حسن وجمال کی اس قدر تعریف کی کہ دشمنان اسلام کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ ۵۳ سال کا انسان اگر ۶۔۷ سال کی خوب صورت لڑکی سے عقد کرے گا تو

اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ کاش مورخینِ اسلام نے ان نازک پہلوؤں کا احساس کیا ہوتا اور جوشِ عقیدت میں اس طرح کی بے بنیاد باتیں نہ بیان کی ہوتیں اور موصوفہ کے صحیح سن وسال اور خدوخال کا ذکر کردیا ہوتا تو کم سے کم دشمنانِ اسلام کو سرکار دوعالمؐ کے کردار پر اعتراض کرنے کا موقع تو نہ ملتا۔ لیکن خدا برا کرے محبت کا کہ یہ اکثر انسان کو اندھا اور بہرا بنادیتی ہے۔

اولاد

مشہور روایات کی بنا پر آپ کے تین فرزند تھے۔ (۱) قاسم (جن کی وجہ سے آپؐ کو ابوالقاسم کہا جاتا ہے)۔ (۲) عبداللہ جن کا لقب طیب وطاہر تھا (۳) ابراہیم جو جناب ماریہ قبطیہ کے فرزند تھے ـــــ بعض مورخین نے طیب اور طاہر کو دو شمار کیا ہے۔

دختران میں ایک آپ کی اپنی دختر تھیں یعنی فاطمہ زہراؑ، اور تین لڑکیاں آپ کی پروردہ تھیں۔ جن کے بارے میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ جناب خدیجہ کی بیٹیاں تھیں اور بعض کا خیال ہے کہ ان کی بہن ہالہ کی بیٹیاں تھیں۔ ام کلثوم، رقیہ، زینب۔

زینب کا عقد قبل بعثت ابوالعاص بن ربیع اموی سے ہوا تھا جن سے جناب امامہ کی ولادت ہوئی تھی جو بعد میں حسب وصیت جناب فاطمہ زہراؑ مولائے کائنات کی زوجہ قرار پائیں۔

ام کلثوم اور رقیہ کا عقد عثمان بن عفان سے یکے بعد دیگرے ہوا، اور سب کا انتقال حضورؐ کی زندگی میں ہوگیا۔ رقیہ کا انتقال سنہ ۲ھ میں ہوا اور زینب کا انتقال سنہ ۸ھ میں ہوا، ام کلثوم کا انتقال بھی رقیہ کے قبل یا بعد ہوگیا تھا۔

جناب فاطمہؑ کا عقد سنہ ۲ھ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ بن ابی طالب سے ہوا اور انھیں کی نسل میں امامت آج تک قائم ہے۔

ابراہیم سنہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸ رجب سنہ ۱۰ھ کو ایک سال دس ماہ آٹھ روز کی عمر میں انتقال کرگئے۔ ان کی قبر جنت البقیع میں موجود اور مشہور ہے۔

ابراہیم کو رسول اکرمؐ نے اپنے نواسے امام حسینؑ کا فدیہ بنادیا تھا جب جبرئیل امین نے یہ پیغام الٰہی پہونچایا کہ آپ اپنے پاس یا حسین کو رکھیں یا ابراہیم کو، اور آپؐ نے فرمایا کہ ابراہیم کا صدمہ میری ذات

تک محدود رہے گا اور حسینؑ کا صدمہ علیؑ و فاطمہؑ کو بھی ہوگا لہٰذا میں ابراہیم کو حسینؑ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں اور یہ بھی ایک راز تھا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے فرزند کو فرزند زہراؑ و علیؑ پر قربان کر دیا اور زہراؑ و علیؑ نے اپنے پورے گھرانے کو دین پیغمبرؐ پر قربان کر دیا اور تاریخ میں یہ قربانی ابدی اور سرمدی حیثیت اختیار کر گئی۔

اقرباء

شیخ طبرسیؒ وغیرہ کی روایت کی بنا پر جناب عبدالمطلب کی اولاد میں آپ کے نو چچا تھے۔ حارث، زبیر، ابوطالب، حمزہ، غیذاق، ضرار، مقوم، ابولہب، عباس۔

حارث ان میں سب سے بڑے تھے اور اسی لیے آپ کو ابوالحارث کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

حارث کی اولاد میں ابوسفیان، مغیرہ، نوفل، ربیعہ اور عبدشمس تھے۔

نوفل کے فرزند مغیرہ بن نوفل تھے جنھوں نے ابن ملجم کو فرار کرتے ہوئے کوفہ میں گرفتار کیا تھا اور امیرالمومنینؑ کے بعد امامہ بنت العاص سے عقد بھی کیا تھا۔

ربیعہ کے فرزند عباس بن ربیعہ تھے جن کی شجاعت میدانِ صفین میں دیکھنے میں آئی تھی۔

جناب ابوطالب اور عبداللہ و زبیر آپس میں حقیقی بھائی تھے اور ان سب کی والدہ گرامی جناب فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھیں۔ ابوطالب کا نام عبدمناف بھی تھا، اور ان کے چار فرزند تھے۔ عقیل، طالب، جعفر، علیؑ۔ اور ہر ایک کے درمیان دس سال کا فاصلہ تھا۔ آپ کی دو بیٹیاں بھی تھیں، ام ہانی فاختہ اور جمانہ اور ان سب کی والدہ گرامی جناب فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبدمناف تھیں۔ جناب ابوطالب کا مشہور نام عمران ہے جس کی بنا پر آل ابوطالب کو آل عمران بھی کہا جاتا ہے۔

جمانہ ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب کی زوجہ تھیں اور ام ہانی ابو وہب ہبیرہ بن عمرو مخزومی کی زوجہ تھیں جن کے فرزند جعدہ بن ہبیرہ خراسان میں حضرت علیؑ کی طرف سے حاکم تھے۔

عباس کی کنیت ابوالفضل تھی اور ان کی ماں کا نام ضرار تھا۔ ان کے ۹ فرزند اور تین دختر تھیں۔ عبداللہ، عبیداللہ، فضل، قثم، معبد، عبدالرحمان، تمام، کثیر، حارث، ام حبیب، آمنہ، صفیہ۔ ام حبیب اور ابتدائی ۶ بھائیوں کی ماں ام الفضل لبابہ بنت الحارث تھیں جو میمونہ بنت الحارث زوجہ پیغمبر کی بہن تھیں۔

ابولہب کے فرزند عتبہ، عتیبہ، معتب اور دُرّہ تھے جن کی ماں ام جمیل خواہر ابوسفیان تھی جسے قرآن مجید نے حمالۃ الحطب کے نام سے یاد کیا ہے۔

عماتِ رسولؐ

اعمام کے علاوہ رسول اکرمؐ کی چھ عمات بھی تھیں جن کی مائیں مختلف تھیں۔ اُمیمہ، ام حکیم، بَرّہ، عاتکہ، صفیہ، اروٰی۔

اُمیمہ جنھیں فاطمہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک دختر زینب تھی جس کا عقد زید بن حارثہ سے ہوا تھا، اور ان کے طلاق دے دینے کے بعد حضور نے عقد کر لیا تھا۔

برہ بنت عبدالمطلب کا دوسرا عقد عبداللہ سلمہ بن ہلال سے ہوا تھا، جن سے ابوسلمہ کی ولادت ہوئی جو جناب ام سلمہ کے شوہر قرار پائے اور ان کے انتقال کے بعد رسول اکرمؐ نے اُن سے عقد فرمایا۔

عاتکہ بنت عبدالمطلب عمیر بن وہب کی زوجہ تھیں، اور ان کے بعد کلدہ بن عبدمناف سے عقد کر لیا تھا۔

صفیہ حارث بن حرب بن امیہ کی زوجہ تھیں۔ حارث کے بعد عوام بن خویلد (جناب خدیجہ کے بھائی) سے عقد کیا جس سے زبیر کی ولادت ہوئی۔

روایات میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے وقت تمام بیٹیاں زندہ تھیں اور آپ نے سب سے لاش پر گریہ کرنے کی وصیت کی تھی بلکہ اپنے سامنے سب سے مرثیہ بھی سن لیا تھا کہ کون بیٹی کس طرح گریہ کرے گی اور اس کا مرثیہ کن مضامین کا حامل ہوگا۔

اعمام پیغمبرؐ میں سب سے اہم مرتبہ جناب ابوطالب اور جناب حمزہ کا ہے جن کے ایمان و کردار اور مجاہدات کے واقعات سے تاریخ اسلام بھری ہوئی ہے۔

جناب ابوطالبؑ محافظ پیغمبرؐ، صاحب فضائل و کمالات، محافظ حرم، امانت دار آثار انبیاء و اولیاء تھے اور جناب حمزہ بہترین شجاع و بہادر تھے۔ جنگ احد میں شہید ہوئے تو رسول اکرمؐ نے ان کے جنازہ پر ستّر تکبیریں کہیں۔

اولاد جناب ابوطالبؑ میں مولائے کائنات کے علاوہ جناب جعفر بھی عظیم مرتبہ کے مالک تھے۔

ہجرت حبشہ میں سربراہ قافلہ کی حیثیت سے گئے اور فتح خیبر کے موقع پر واپس آئے تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میں کس چیز کی زیادہ خوشی مناؤں، جعفر کے واپس آنے کی یا خیبر کے فتح ہوجانے کی۔ جناب جعفر جنگ موتہ میں شریک ہوئے اور دونوں ہاتھ کٹا کر شہید ہوگئے جس کے عوض میں پروردگار عالم نے جنت میں بال و پر عنایت کردیے اور ملائکہ مقربین کے ساتھ سایۂ رحمت الٰہی میں پرواز کررہے ہیں۔

جناب عقیل بھی ایک عظیم مرتبہ کے مالک تھے اور رسول اکرم ان سے بے پناہ محبت فرماتے تھے، یہاں تک کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عقیل سے دُہری محبت ہے، ایک ان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر، اور ایک جناب ابطالب کے ان سے غیر معمولی طور پر محبت کرنے کی بنا پر!

اصحاب رسول اکرمؐ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مالک کائنات نے سرکار دو عالمؐ کو ایسے اہلبیتؑ عنایت فرمائے تھے جس کی نظیر انبیاء و مرسلین کی تاریخ میں بھی کہیں نظر نہیں آتی ہے اور ان سب کو زیورِ عصمت سے آراستہ کرکے آیۂ تطہیر کا مصداق قرار دے دیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے کردار کو تربیتِ رسولؐ کا شاہکار نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات اپنی عصمت و طہارت کی بنا پر اُس طرح کی تربیت کے محتاج نہیں تھے جس طرح کی تربیت ایک مربی کا شاہکار شمار کی جاتی ہے۔ ضرورت تھی کہ کچھ ایسے افراد بھی ہوتے جو خانوادۂ عصمت و طہارت سے الگ عام انسانوں جیسے ہوتے اور سرکار دو عالمؐ ان کی علمی اور عملی تربیت کرکے انھیں اپنے خدمات کا شاہکار قرار دیدیتے۔ صحابۂ کرام انھیں افراد اور انھیں ہستیوں کا نام ہے جنھیں سرکار دو عالمؐ نے خاک سے پاک بنایا ہے اور جن کے کردار پر سرکار کی مکمل تربیت کی چھاپ پائی جاتی ہے۔ ان کے تذکرہ کے بغیر سرکار کے خدمات کا تذکرہ نامکمل رہ جاتا ہے اور ان کی فہرست میں بھی صرف انھیں افراد کا نام شامل کیا جاسکتا ہے جن کا کردار سرکار کا شاہکار بننے کے قابل ہو ورنہ جن افراد نے اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لیے اسلام قبول کرلیا تھا یا سرکار کی خدمت میں حاضر ہوگئے تھے ان کا نام اس فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے چاہے انھیں صحابیت کے خطاب سے سرفراز کردیا جائے۔ ذیل میں قابلِ ذکر شخصیتوں میں سے صرف چند افراد کا ذکر کیا جارہا ہے۔ جن کے علاوہ دیگر افراد بھی اس فہرست میں شامل ہوسکتے

ہیں لیکن وہ ایک لاکھ چودہ ہزار افراد بہرحال شامل نہیں ہوسکتے ہیں جنھیں صحابہ کرام میں شامل کیا جاتا ہے ___ اور جن میں سے بعض کا کردار ننگِ اسلام بلکہ ننگِ انسانیت تھا اور ان کا تذکرہ بھی رسول اکرمؐ کے ساتھ مناسب نہیں ہے، سرکار کے نیک کردار اصحاب کرام میں نمایاں کردار کے مالک درج ذیل حضرات ہیں:

سلمانؓ

یہ اصلاً فارس کے رہنے والے تھے اور فارسی کہے جاتے تھے لیکن رسول اکرمؐ نے انھیں اپنے اہلبیت میں شامل کرکے انھیں سلمان محمدی بنادیا اور ان کے بارے میں حضرتؐ کا ارشاد تھا کہ "سلمان ایک خشک نہ ہونے والا سمندر اور ختم نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ یہ ہم اہلبیت میں سے ہے، اسے برہان عطا کیا گیا ہے اور یہ نور حکمت کا عطا کرنے والا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے انھیں مثیل جناب لقمان حکیم اور صادق آل محمدؐ نے انھیں لقمان حکیم سے افضل قرار دیا ہے بلکہ بعض روایات میں انھیں صاحب اسم اعظم اور محدَّث قرار دیا گیا جنھیں ملائکہ سے بات کرنے کا بھی شرف حاصل تھا۔ رسول اکرمؐ کو جن چار افراد سے محبت کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور جنت جن چار افراد کی مشتاق تھی ان میں سلمان کا نام بھی شامل تھا۔ ایک مرتبہ عمر بن الخطاب نے سلمان سے ان کا حسب و نسب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں گمراہ تھا رسول اکرمؐ نے مجھے ہدایت دی، نادار تھا پروردگار نے ان کے ذریعہ غنی بنادیا، غلام تھا معبود نے ان کے ذریعہ آزاد کرادیا، یہی ہے میرا حسب و نسب۔ یعنی اب میرا کوئی رشتہ سرکار دو عالمؐ کے علاوہ کسی شخص سے نہیں ہے۔

جنگ خندق میں خندق کھودنے کا مشورہ سلمان ہی نے دیا تھا۔

۳۶ھ میں مدائن میں انتقال فرمایا۔ امیرالمومنینؑ نے راتوں رات مدینہ سے مدائن تشریف لاکر غسل و کفن دیا۔ نماز جنازہ میں جعفر طیار اور جناب خضر بھی شریک ہوئے اور ہزاروں ملائکہ نے نماز جنازہ ادا کی۔

ابوذر

جُندب بن جُنادہ نام تھا۔ ابوذر کنیت تھی۔ تیسرے، چوتھے یا پانچویں مسلمان تھے۔ اسلام لانے کے بعد اپنے علاقہ میں واپس چلے گئے تھے اور اسی لیے بدر و احد و خندق میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ سلمان محمدی کے بعد دوسرے درجہ کے صاحب ایمان تھے۔ رسول اکرمؐ نے انھیں اپنی امت میں شبیہ عیسیٰ بن مریم قرار دیا تھا اور زیر آسمان بالائے زمین ہر شخص سے زیادہ سچا قرار دیا تھا۔ علیؑ، سلمان، مقداد، ابوذر جن افراد کی محبت کا رسول اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا اور جن کی جنت مشتاق تھی۔ ان میں ابوذر کا بھی شمار تھا۔ خلافت دوم کے دَور میں شام چلے گئے تھے۔ خلافت سوم تک وہیں رہے اور مسلسل معاویہ کی قیصریت اور کسرویت پر تنقید کرتے رہے، یہاں تک کہ اس نے عثمانؓ کے پاس شکایت لکھ بھیجی اور انھوں نے مدینہ طلب کرلیا۔ معاویہ نے حسب الحکم ایسے اونٹ پر اور ایسے رہنما کے ساتھ مدینہ روانہ کیا کہ مدینہ پہونچتے پہونچتے پنڈلیوں کا گوشت تک جُدا ہوگیا۔ یہاں آکر عثمانؓ کے طرزِ عمل پر بھی تنقید کی جس کے نتیجہ میں ربذہ کی طرف شہر بدر کردیے گئے اور اعلان ہوگیا کہ کوئی رُخصت کرنے کے لیے بھی نہ جائے۔ لیکن امیر المومنینؑ نے اپنے فرزندوں کے ساتھ ابوذر کے الوداع میں شرکت کی اور ابوذر اس عالم میں ربذہ پہونچے کہ راستہ میں فرزند ذر کا انتقال ہوگیا۔ ربذہ پہونچکر زوجہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور بالآخر خود بھی انتقال فرما گئے۔ ایک دختر ساتھ تھی اس نے سرِ راہ کھڑے ہوکر آنے والے قافلہ کو باخبر کیا۔ سردار قافلہ مالک اشتر نے تجہیز و تکفین کی۔ عبداللہ بن مسعود نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۳۱ھ یا ۳۲ھ میں رسول اکرمؐ کا یہ محترم اور صادق اللہجہ صحابی سپرد خاک کردیا گیا۔ مالک اشتر کے بیان کے مطابق ابوذر کو چار ہزار درہم کا قیمتی کفن دیا گیا اور اس طرح رسول اکرمؐ کی یہ پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی۔

مقداد بن الاسود

ابومَعبَد کنیت تھی۔ باپ کا اصلی نام عمرو تھا لیکن چونکہ اسود بن عبد یغوث نے فرزند بنالیا تھا اس لیے ابن الاسود کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ان کا شمار بھی ان افراد میں ہوتا ہے جن کی محبت کا رسول اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا اور جن کے اشتیاق میں جنت تڑپ رہی تھی۔ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب آپ کی زوجہ تھیں اور رسول اکرمؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی ہے۔

۳۳ھ میں مدینہ سے ایک فرسخ دور جرف میں انتقال کیا اور جنازہ جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کا فرزند معبد مثل پسر نوح ثابت ہوا اور جنگ جمل میں امیر المومنینؑ کے مقابلہ میں لشکر عائشہ میں شامل ہوگیا اور بالآخر قتل کیا گیا جب کہ مقداد نے امیر المومنینؑ کی حقانیت اور عظمت میں کبھی شک بھی نہیں کیا تھا۔

بلال بن رباح

ان کی کنیت ابوعبداللہ اور ابوعمرو تھی۔ ماں کا نام حُمامہ تھا۔ بدر و احد و خندق وغیرہ میں شرکت کی ہے۔ رسول اکرمؐ نے موذن قرار دیا تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ شین کو سین کہتے ہیں، تو ارشاد قدرت ہوا کہ ہماری نظر میں بلال کی سین بھی شین ہی ہے۔ رسول اکرمؐ کے بعد کسی کی نماز کے لیے اذان نہ کہنے کا عہد کرلیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حی علیٰ خیر العمل متروک ہوگیا۔ شام میں ۱۸ھ یا ۲۰ھ میں انتقال کیا اور باب الصغیر میں دفن ہوئے۔

جابر بن عبداللہ الانصاری

اصحاب بدر میں شمار ہوتے تھے۔ رسول اکرمؐ نے ان کے ذریعہ امام باقرؑ تک سلام پہونچایا تھا۔ اکثر غزوات میں رسول اکرمؐ کے ساتھ شرکت کی اور صفین میں امیر المومنینؑ کی رکاب میں رہے۔ مدینہ کی گلیوں میں اس حدیث مبارک کا اعلان کرتے رہتے تھے کہ،

"عَلِیٌّ خَیْرُ الْبَشَرِ مَنْ أَبٰی فَقَدْ کَفَرَ"

(علی خیر البشر ہیں، جو اس کا منکر ہو جائے وہ کافر ہے)

نیز یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "اپنے بچّوں کو محبت علیؑ کے ذریعہ آزماؤ اور انکار کردیں تو ان کی ماں کے کردار کا جائزہ لو"۔

۷۸ھ میں ۹۰ سال سے زیادہ کی عمر میں انتقال فرمایا، اور یہ مدینہ کے آخری صحابی تھے

جنھوں نے سب سے آخر میں دار دنیا سے رحلت کی ہے۔

حذیفہ بن الیمان العنسی

رسول اکرمؐ اور امیرالمومنینؑ کے مخلص اصحاب میں شمار ہوتے تھے۔ جنگ احد میں اپنے والد اور بھائی کے ساتھ شریک ہوئے اور ان کے والد وہیں شہید ہو گئے۔ رسول اکرمؐ نے انھیں منافقین کے نام بتا دیے تھے لہذا جس کے جنازہ میں شرکت نہیں کرتے تھے لوگ اس کے منافق ہونے کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ جناب سلمان کے بعد مدائن کے والی قرار پائے اور جنگ جمل سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ حذیفہ کا شمار ان سات افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے صدیقہ طاہرہؑ کی نماز جنازہ میں شرکت کی ہے۔

ابوایوب انصاری

خالد بن زید نام تھا۔ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک رہے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے بعد امیرالمومنینؑ کے ساتھ جمل و صفین و نہروان میں شرکت کی ہے۔ رسول اکرمؐ نے ہجرت کے بعد انھیں کے مکان میں قیام فرمایا تھا اور انھوں نے بہترین خدمات انجام دی تھیں۔ صفین میں معاویہ کے خیمہ پر حملہ کر دیا تھا لیکن وہ فرار ہو گیا۔ اس کے بعد معاویہ کی طرف سے مترفع بن منصور نے حضرت علیؑ کے خیمہ پر حملہ کیا تو ابوایوب نے ایسا وار کیا کہ سر کٹ گیا۔ لیکن ظالم پشت فرس پر باقی رہا یہاں تک کہ جب گھوڑے نے سکندری کھائی تو سر الگ دکھائی دیا اور جسم الگ۔

معاویہ ہی کے زمانے میں روم کی جنگ میں شرکت کے لیے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ وقت آخر وصیت کی کہ میدان کارزار ہی میں دفن کیا جائے، چنانچہ استنبول کے قریب دفن کیے گئے لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد رومیوں نے قبر کو کھودنے کا ارادہ کیا تو اس قدر بارش ہوئی کہ اسے حضرت ابوایوب کی کرامت قرار دے کر اس ارادہ سے باز آ گئے اور ان کی قبر مرجع خلائق بن گئی۔ رسول اکرمؐ نے بھی اپنے اصحاب میں ایک مرد صالح کے قسطنطنیہ کے قریب

دفن ہونے کی خبر دی تھی۔

خزیمہ بن ثابت انصاری

رسول اکرمؐ نے ان کی گواہی کو دو آدمیوں کے برابر قرار دیا تھا اس لیے انھیں ذوالشہادتین کہا جاتا تھا۔ بدر اور دیگر معرکوں میں شرکت کی ہے اور اس کے بعد مولائے کائنات کی رکاب میں رہے یہاں تک کہ صفین میں عمار یاسر کی شہادت کے بعد فوج دشمن پر زبردست حملہ کیا اور اس کے نتیجہ میں شہید کر دیے گئے۔ امیرالمومنینؑ نے زندگی کے آخری دور کے خطبہ میں جن اصحاب کو یاد فرمایا تھا ان میں عمار، ابن التیہان اور ذوالشہادتین کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے۔

زید بن حارثہ بن شراحیل الکلبی

حکیم بن حزام نے بازار عکاظ سے جناب خدیجہ کے لیے خریدا اور انھوں نے رسول اکرمؐ کو بخش دیا۔ حارثہ آزاد کرانے کے لیے آیا تو ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور رسول اکرمؐ کی غلامی کو آزادی پر ترجیح دی جس پر حارثہ نے اپنی ولدیت سے خارج کر دیا اور رسول اکرمؐ نے انھیں اپنا فرزند قرار دے دیا۔ اور پھر اپنی رشتہ کی بہن زینب بنت جحش سے عقد بھی کر دیا۔

جناب جعفر طیار کے ساتھ جنگ موتہ میں بحیثیت علمدار لشکر شرکت کی اور وہیں شہید ہو گئے۔ آپ کے فرزند کا نام اُسامہ تھا اسی لیے آپ کو ابواسامہ کہتے ہیں۔

سعد بن عبادہ بن دُلیم بن حارثۃ الخزرجی الانصاری

بیعت عقبہ اور جنگ بدر میں شرکت کی ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر انصار کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں تھا۔ باپ دادا سے عرب کے مشہور سخی افراد میں شمار ہوتا تھا۔ سقیفہ کے موقعہ پر انصار نے انھیں کو امیر بنانا چاہا تھا لیکن اتنا ہنگامہ ہوا کہ غریب پامال ہوتے ہوتے بچے اور عمر نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، جس پر ان کے فرزند قیس نے عمر کا گریبان پکڑ لیا اور سعد زندہ واپس آ گئے۔ لیکن بیعت ابوبکر سے برابر انکار کرتے رہے یہاں تک کہ عمر کے دور خلافت میں شام چلے گئے۔ اور وہاں

برابر ہر ہفتہ اپنے قبائل سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ سرکاری ایجنٹوں نے راستہ میں تیر مار کر شہید کر دیا اور یہ مشہور کر دیا گیا کہ انھیں جنّات نے قتل کیا ہے۔

ابو دجانہ انصاری

بزرگ اور بہادر اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا حرز مشہور ہے۔ جنگ یمامہ میں شریک ہوئے اور جب مسیلمہ کذاب کے ساتھیوں نے حدیقۃ الرحمان میں پناہ لی تو مخصوص فنّی طریقہ سے باغ میں داخل ہو گئے اور بہت سے لوگوں کو تہ تیغ کر دیا یہاں تک کہ خود بھی شہید کر دیے گئے اور بروایتے جنگ صفین تک زندہ رہے اور امیر المومنینؑ کے ساتھ شریک معرکہ رہے۔ بہر حال ظہر کوفہ سے جن ۲۷ افراد کے اصحاب امام عصرؑ میں ہونے کا تذکرہ ہے۔ ان میں ابو دُجانہ کا نام بھی پایا جاتا ہے کہ انھوں نے سخت ترین اوقات میں رسول اکرمؐ کا ساتھ دیا ہے جب صحابہ کی اکثریت ساتھ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

عمار بن یاسر

رسول اکرمؐ کے عظیم ترین صحابی اور مولائے کائنات کے فدائیوں میں تھے۔ بنی مخزوم کے حلیف تھے اور ابوالیقظان کنیت تھی۔ باپ کا نام یاسر اور ماں کا نام سُمیّہ تھا۔ ابتدائی دَور میں اسلام لائے اور اسلام کی خاطر بے حد مصائب کا سامنا کیا، یہاں تک کہ کفار ان تمام حضرات کو دوپہر کے وقت گرم ریت پر لٹا دیا کرتے تھے اور اسلام سے انحراف کی دعوت دیا کرتے تھے لیکن ان حضرات نے استقامت و استقلال کا مظاہرہ کیا اور حضور اکرمؐ نے آلِ یاسر کو جنت کی بشارت دی۔ ماں باپ انھیں اذیتوں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گئے اور عمّار نے مجبوراً کفار کی مرضی کے مطابق الفاظ زبان پر جاری کر دیے جس کی بنا پر آیت تقیہ نازل ہو گئی اور پروردگار عالم نے ان کے ایمان اور اطمینانِ قلب کا اعلان فرما دیا۔ جناب عمّار کی والدہ سُمیّہ اسلام کی پہلی شہید خاتون ہیں۔ عمّار کے بارے میں رسول اکرمؐ کی پیشین گوئی تھی کہ انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور زندگی کی آخری غذا کاسۂ شیر ہو گی۔ چنانچہ ۹ صفر ۳۷ھ کو جنگ صفین میں ۹۰ سال کی عمر میں شہید کیے گئے اور آخری وقت میں کاسۂ شیر نوش فرما کر سرکار دو عالمؐ کی پیشین گوئی کا حوالہ دیا اور جان راہِ خدا میں قربان کر کے باغی گروہ کا راز فاش کر دیا۔

مالک بن نُویرہ الحنفی الیربوعی

سرکار دو عالمؐ کے مخلص ترین اصحاب میں تھے۔ اپنے قبیلہ کے ساتھ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہم لوگوں کو ایمان کی تعلیم دیجیے تو آپؐ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرو، نماز قائم کرو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج بیت اللہ بجا لاؤ اور میرے وصی علی بن ابی طالب سے محبت رکھو، اس کے علاوہ محرمات سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے۔ حضرت کے اس ارشاد کے بعد مالک بزم سے باہر آئے تو نہایت ہی مسرت کے عالم میں اعلان کر رہے تھے کہ میں نے ایمان رسولِ اکرمؐ سے حاصل کیا ہے اور حضرت نے فرمایا کہ جو اہلِ جنت میں سے کسی شخص کو دیکھنا چاہے وہ مالک کو دیکھے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مالک کا تعاقب کیا اور ان سے استغفار کی خواہش کی کہ رسولِ اکرمؐ نے آپ کو اہلِ جنّت میں قرار دیا ہے تو مالک نے کہا کہ خدا تمھیں نیک ہدایت دے۔ رسول اکرمؐ کو چھوڑ کر میرے پاس استغفار کے لیے آئے ہو جب کہ وہ مالک و مختار جنت ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد مدینہ آئے اور ابوبکرؓ کو منبر پر دیکھا تو ٹوک دیا کہ علیؑ کے ہوتے ہوئے تمھیں یہ حق کس نے دیا ہے؟۔ انھوں نے حکم دے دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے، اور خالد بن ولید اور قنفذ جیسے افراد نے مار کر باہر نکال دیا۔ مالک نے طے کر لیا کہ ابوبکرؓ کو مالِ زکوٰۃ نہ دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مُرتد قرار دے دیا گیا اور خالد بن ولید کے ذریعہ انھیں اور ان کی قوم کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ خالد نے تمام عورتوں کو قیدی بنا لیا اور مالک کی زوجہ سے اسی شب ہم بستری بھی کی جس کے طفیل میں سیف اللہ کا لقب حاصل کر لیا اور یہ طے پا گیا کہ یہ "شمشیر برہنہ" غلاف میں نہیں رکھی جا سکتی ہے۔

وعلی الاسلام بعدہ السلام۔

حیاتِ مرسلِ اعظمؐ کے امتیازی خطوط

ایک شب کا ذکر کیا اے جانے والے عرش پر
تیری ساری زندگی معراج ہی معراج ہے

یوں تو سرکار دو عالمؐ کی حیاتِ طیبہ کے حالات و اطوار کا قیاس دوسرے بنی نوعِ انسان کے عادات و اطوار پر کیا جائے تو سرکار کا ہر عمل ایک امتیازی صفت کا حامل ہوگا اور آپ کی زندگی میں کھانے پینے اور سونے جاگنے سے لے کر تبلیغ اسلام و قرآن تک ہر نکتہ قابلِ توجہ اور جاذبِ نظر ہوگا لیکن خصوصیت کے ساتھ مالک کائنات نے آپ کو چند ایسے خصوصیات کا حامل بنایا ہے جن میں آپ کا قیاس انبیاء و مرسلین اور شہداء و صدیقین پر بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اور انھیں خصوصیات و امتیازات کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کے اصول کے مطابق رب العالمین نے آپ کو کائنات کے عظیم ترین مقصد کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا اور ایسے مقصد کی تکمیل کے لیے بعثت و ارسال کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان تمام اسلحوں سے مسلح کر کے بھیجا جائے جو علمی یا عملی میدان میں دفاعِ دین و مذہب کے لیے ضروری ہوں اور ان تمام فضائل و کمالات سے مزین کر دیا جائے جن کے بغیر شخصیت کا اعتراف اور کمالات سے استفادہ ممکن نہیں ہوتا ہے اور شخصیت ہزار شکوک و شبہات کا ہدف بن جاتی ہے۔

مرسلِ اعظمؐ کے ان امتیازی نشانات کی دو قسمیں ہیں، بعض کا تعلق آپ کی ذاتِ اقدس اور اس کے کردار و اطوار اور رفتار و گفتار سے ہے اور بعض کا تعلق آپ کے وجود مقدس اور اس کے ماحول یا اضافی حالات سے ہے جو شخصیت کے علمی امتیاز کا نتیجہ نہیں ہیں۔ لیکن شخصیت کی عظمت کا ذریعہ ضرور ہیں اور ان سے کمالات کی جامعیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کسی ایک کتاب میں آپ کے جملہ امتیازات کا جمع کر دینا تقریباً ناممکنات میں ہے اور پھر جس نے اپنی زندگی میں ۴۴۴۴ معجزات پیش کیے ہوں اور ہزاروں خارق عادات امور کا مظاہرہ کیا ہو اس کے امتیازات کی فہرست کے لیے بھی مفصل کتاب کی ضرورت ہے۔ تشریح و توضیح کا مرحلہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے۔ ذیل میں صرف چند امتیازات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ ایک اجمالی خاکہ نظر میں آجائے اور تفصیلات و تشریحات کے بارے میں غور کرنا یا لکھنا پڑھنا آسان ہو جائے۔

ولادت

مشہور و معروف بات ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی ولادت باسعادت ۱۷ ربیع الاول ۱ھ عام الفیل میں ہوئی ہے اور عام الفیل اسلامی تاریخ میں اس سال کو کہا جاتا ہے جب ابرہۃ الاشرم نے خانۂ خدا کو منہدم کر کے اپنے خود ساختہ "قبلہ و کعبہ" کو واقعی کعبہ بنانے کا عہد کر لیا تھا اور اس عظیم کام کے لیے ایک شہر پار اور ہاتھیوں کے لشکر کا بھی انتظام کر لیا تھا جس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ اہل مکہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے اور خانۂ خدا کا جوار بھی انھیں وحشت و دہشت سے محفوظ نہ رکھ سکا، صرف ایک حضرت عبدالمطلبؑ (رسول اکرمؐ کے جد بزرگوار) تھے جنھوں نے اس سنگین ترین صورت حال میں بھی خانۂ کعبہ کا دفاع کیا اور بھاگنے کے بجائے ابرہہ کے سامنے پہونچ گئے۔ ابرہہ ان کی اس جرأت و ہمت اور عزم و حوصلہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور مصالحت کی پالیسی پر اُتر آیا۔ عبدالمطلب کا احترام کیا اور انھیں عزت کے ساتھ بٹھاتے ہوئے آنے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ تیرے لشکر والوں نے میرے اونٹ پکڑ لیے ہیں، میں ان کا مطالبہ کرنے آیا ہوں۔

عبدالمطلبؑ کے مقابلہ کا انداز اتنا عجیب و غریب تھا کہ ابرہہ نے گھبرا کر اس حقیقت کو زبان پر جاری کر دیا جس کے بغیر عبدالمطلبؑ کا استدلال آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمھیں اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور جس گھر کے متولی اور محافظ ہو اس کی فکر نہیں ہے۔

عبدالمطلبؑ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ فرمایا بلکہ چیلنج کیا کہ جس طرح میں ان اونٹوں کا مالک ہوں اس گھر کا بھی کوئی مالک ہے جو اسے بچالے گا، اور اس طرح ایک بہترین مبلغ کی حیثیت سے ابرہہ کو عظمت الٰہی کی طرف بھی متوجہ کیا اور انجام کار سے بھی آگاہ کر دیا جو ہر مبلغ کا مرتبِ طریقہ کار

ہونا چاہیے کہ قوم کو ابتداء اور انتہا، مبدا اور معاد سے باخبر رکھے کہ باقی مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔

ابرہہ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکا اور بالآخر حملہ کا قصد کرلیا۔ رب العزت نے اس قدر سپر پاور کے مقابلہ میں ایک ابابیل کا لشکر بھیج دیا جس نے ابرہہ کے سارے لشکر کا خاتمہ کر دیا اور اس کا اعلان اس انداز سے کیا کہ:

۱۔ ہمارے پاس ایک غیبی لشکر بھی رہتا ہے۔
۲۔ ہم سپر پاور (SUPER POWER) کا مقابلہ لشکروں سے نہیں بلکہ کنکریوں سے کیا کرتے ہیں۔
۳۔ ہمارا کام آخری مرحلہ تک اتمام حجت ہوتا ہے اور اس کے بعد عذاب نازل کرتے ہیں۔
۴۔ ہمارے بھیجے ہوئے ابابیل اور پرندہ بھی خطاکار نہیں ہوسکتے ہیں کہ کسی بے گناہ پر کنکر پھینک کر چلے آئیں۔
۵۔ ہمارے مخلصین کا فرض ہے کہ ہماری امداد پر اعتماد رکھیں اور فرار کے بجائے مقابلہ کا راستہ اختیار کریں۔

تاریخ عرب میں اس واقعہ کو 'واقعہ اصحاب الفیل' اور اس سال کو عام الفیل کہا جاتا ہے جس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ خانۂ خدا پر وارد ہونے والے لمحاتی مصائب نے سال کو عام الفیل بنادیا جس طرح کہ اسلام میں وفات خدیجہؓ و ابوطالبؑ سے مرسل اعظمؐ پر وارد ہونے والے صدمے نے اس سال کو عام الحزن بنادیا۔ اور تاریخ میں ایک مثال قائم ہوگئی کہ محدود مدت کا غم بھی پورے سال کو عام الحزن بنا سکتا ہے اگر غم اسی قدر اہمیت کا حامل ہو، دس پانچ دن کے ایام غم بن جانے میں کیا تامل ہوسکتا ہے۔

عام الفیل میں سرکار دو عالمؐ کی ولادت اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ اب کسی لشکر ابابیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اب خانۂ خدا کا مستقل محافظ آرہا ہے جس طرح کہ علیؑ کی ولادت کے بعد عرب کو کسی "معیار الولد" کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جس طرح تم نے کل دیکھ لیا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا مختصر پرندہ بھی غلطی نہیں کرسکتا ہے ویسے ہی آج بھی اندازہ کرلینا کہ اسے بھی میں ہی بھیج رہا ہوں، لہٰذا اس کی زندگی میں بھی کسی خطا کا امکان نہیں ہے اور اس کی زندگی میں بھی خطا کا احتمال دینا ابرہہ پرستی ہے خدا پرستی نہیں ہے۔

اسلام میں واقعات کے تعارف میں عام الفیل کا استعمال دو مقامات پر ہوتا ہے۔ ولادت سرکار دو عالمؐ اور ولادت مولائے کائناتؑ (۳۰ عام الفیل)۔ اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ دونوں خدائی نمائندے ہیں اور دونوں کے کردار کا خدا ضامن ہے اور دونوں کے آنے کے بعد دین خدا اور خانۂ خدا کو کسی غیبی لشکر کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔

رب العالمین نے اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے سورۂ قریش میں اپنے اس احسان کو یاد دلایا ہے کہ ہم نے ابرہہ کے لشکر کو فنا کرکے سردی و گرمی کے سفروں کو محفوظ کر دیا اور بھوکوں کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا جس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ بظاہر تو آمد ابابیل ایک منفی مقصد کے لیے تھی لیکن واقعاً اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے اور وہ بھوکوں کا سیر کرنا اور خوف زدہ افراد کو اطمینان فراہم کرنا ہے۔

سنہ عام الفیل میں سرکار دو عالمؐ کی ولادت بھی انہی دونوں نکتوں کی طرف اشارہ ہے اور شاید اسی لیے آپ کی آمد کے لیے جناب عبداللہؑ کے صلب اور جناب آمنہ کے بطن مبارک کا انتخاب کیا گیا تاکہ عالم انسانیت پر یہ بات واضح ہوجائے کہ دنیا کو عبدیت و بندگی کا درس دینے والا اور خوف زدہ دنیا کو امن فراہم کرنے والا آرہا ہے اور اس کے آجانے کے بعد نہ بندگی کو کوئی خطرہ رہ جائے گا اور نہ امن عالم کو۔ یہ عبداللہؑ کا لال ہوکر درس عبدیت دے گا اور آمنہ کا فرزند بن کر امن و سکون فراہم کرے گا اور مطعم الطیر کا چشم و چراغ بن کر بھوکوں اور پیاسوں کے سیر و سیراب کرنے کا انتظام کرے گا۔

محلِّ ولادت

سالِ ولادت کی طرح رب العالمین نے آپ کے محل ولادت کو بھی ایک امتیاز عطا فرمایا ہے اور اس کے لیے ابوطالب جیسے شریف، غیرت مند، مربّی، محافظ اور صاحب جرأت و ہمت کے گھر کا انتخاب کیا ہے تاکہ ان کے ایمان کی وضاحت کے ساتھ ساتھ سرکار دو عالمؐ کی عظمت و جلالت کا بھی اندازہ ہوجائے اور دنیا پر یہ واضح ہوجائے کہ ہماری مصلحتوں کا انداز بالکل جداگانہ ہے، ہم اپنے حبیب خاص کو ابوطالب کے گھر میں پیدا کرتے ہیں اور ابوطالب

کے فرزند کو اپنے گھر میں پیدا کرتے ہیں اور دونوں کی ولادت کا تعارف قصہ اصحاب الفیل سے کراتے ہیں تاکہ عالم عقل و شعور پر واضح ہو جائے کہ یہ دونوں میرے گھر کے مستقل محافظ ہیں اور یہ ابوطالب کی خدمتوں کا ایک صلہ ہے جو ولادتِ علیؑ کی شکل میں دیا جا رہا ہے۔

ابتدائی زندگی

پدر بزرگوار کا انتقال دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہو گیا۔ ماں نے بھی بچپنے ہی میں ساتھ چھوڑ دیا۔ حضرت عبدالمطلب کی کفالت میں رہے اور خانۂ خدا کا محافظ بندۂ خدا کا محافظ قرار پایا، اور جب وہ دنیا سے جانے لگے تو انھوں نے اپنی تمام اولاد میں ابوطالبؑ کا انتخاب کر کے تحفظ رسالت کا کام ان کے حوالے کر دیا اور انھوں نے مکمل علم و ایقان اور شناخت و عرفان کے ساتھ سرکار کی تربیت و نگہداشت کا انتظام کیا۔

مکہ کے کاہنوں نے بتایا کہ یہ فرزند عظیم الشان ہے۔ سفر تجارت میں راہب نے آگاہ کیا کہ اس کا مستقبل درخشاں ہے اور دیگر وسائل و ذرائع سے حیثیت نبوت کا اندازہ ہوتا رہا، لیکن ابوطالبؑ نے زندگی کا خاتمہ کر دینے کے بجائے اس کا تحفظ کر کے واضح کر دیا کہ اختلافِ عقائد و کردار میں زندگی کا خاتمہ کیا جاتا ہے تحفظ نہیں کیا جاتا ہے پھر میرے کردار کو واقعہ عقبہ سے ملا کر دیکھو گے تو اندازہ ہوگا کہ صحابیت کسی مقام پر بھی ہو لیکن جگر جگر ہے دگر دگر ہے۔"

کمسنی کے عالم میں کاہنوں اور راہبوں کا مستقبل کے بارے میں بیان دینا علامت ہے کہ سرکارِ دو عالم کی ابتدائی زندگی بھی بڑی امتیازی حیثیت کی مالک تھی اور آپ کے بچپنے کا قیاس بھی دنیا کے دوسرے انسانوں پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ راہب اور کاہن نے آپ کے چہرۂ اقدس میں اسی طرح کمالات کا مشاہدہ کر لیا تھا جس طرح آپ نے اُمت کو متوجہ کیا تھا کہ آدمؑ کا علم، نوحؑ کا زہد، ابراہیمؑ کی خلت، موسیٰؑ کی ہیبت، عیسیٰؑ کا تقویٰ یوسفؑ کا حسن و جمال اور دیگر انبیاء کرام کا فضل و کمال دیکھنا ہو تو علیؑ کے چہرے پر نظر کرو۔ اس ایک آئینہ میں سارے جلوے نظر آ جائیں گے، جس طرح راہب و کاہن نے میرے چہرے میں سارے کمالات کا مشاہدہ کر لیا تھا۔

ازدواج

ایک سفر تجارت سے واپسی پر جہاں آپ جناب خدیجہؓ کے مال سے بطور نمائندہ تجارت کر رہے تھے جب خدیجہؓ کے غلام نے آپ کے فضائل و کمالات اور مناقب و کرامات کا تذکرہ کیا تو خدیجہؓ نے موقع کو نہایت درجہ مناسب دیکھتے ہوئے سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر آپ کے پاس عقد کا پیغام بھیج دیا اور اس طرح ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ایک ۲۵ سال کے جوان کا عقد بظاہر ۴۰ سال کی خاتون سے ہو گیا۔ اور سماج کے تمام مفروضہ اصول خاک میں مل گئے، مال و دولت تجارت و مزدوری، طبقات، فرضی حیا و غیرت، سماجی رسم و رواج سب پیروں تلے روند دیے گئے اور صاحبِ معراج کے قدم خدیجہؓ کے دوش کمالات پر آ گئے۔

جناب ابوطالبؑ نے خطبۂ عقد پڑھا اور کمالات کے مقابلہ میں مال کی بے وقعتی کا اظہار کیا اور عالمِ انسانیت کو نئے اقدار سے روشناس کراتے ہوئے صاحبانِ کمال کو دولت و ثروت کے مقابلہ میں احساس کمتری سے نجات دلانے کا انتظام کر دیا۔

بعثت

تقریباً ۱۵ سال کی ایثار بھری گھریلو زندگی گزارنے کے بعد رب العالمین نے ایک نئی ذمہ داری کا بوجھ کاندھوں پر رکھ دیا اور سورۂ اقرأ کے ذریعہ پیغام الٰہی پڑھ کر لوگوں کو دعوت علم و فضل دینے کا حکم دے دیا۔ غارِ حرا کی منزل ذکر و فکر تمام ہوئی اور رسالت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا وقت آ گیا۔

ابتدائی خفیہ دعوت کے بعد عشیرہ و قبیلہ کے سامنے پیغام پیش کرنے کا حکم آ گیا اور آپ نے خشک دعوت کے بجائے بحکم رب العالمین کھانے کا انتظام شروع کر دیا۔ حضرت علیؑ مہتمم قرار پائے اور چالیس افراد خاندان کو مدعو کر لیا گیا۔

مختصر سے کھانے سے چالیس آدمیوں کو سیر کرنے کے بعد رسول اکرمؐ نے پیغام سنانے کا ارادہ کیا تو ابولہب نے قوم کو بھڑکا دیا اور کہا کہ یہ جادوگر ہیں۔ لوگوں نے فرار اختیار کیا اور آپؐ نے

مجبورًا دوسرے دن پھر دعوت کی اور آخرکار اپنا پیغام پیش کردیا جس میں توحید الٰہی، اپنی رسالت اور خیر دنیا و آخرت کا ذکر تھا۔ جس کے بعد آپ نے نصرت کا مطالبہ کیا اور خلافت کا وعدہ کیا۔ ساری قوم میں تنہا حضرت علیؑ نے نصرت کا وعدہ کیا اس لیے کہ ان کی رگوں میں ابوطالبؑ کا خون دوڑ رہا تھا جو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ میرے سردار آپ اعلان کریں کس کی مجال ہے جو میرے ہوتے ہوئے آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔ علیؑ کے وعدۂ نصرت پر رسول اکرمؐ نے ان کی وصایت و وزارت و خلافت کا اعلان کردیا اور اس طرح اسلام کے جملہ بنیادی اصول توحید، عدالت، رسالت، آخرت اور خلافت کا اعلان ہوگیا اور حضرت ابوطالبؑ نے بھی اپنی محکومیت اور مرسل اعظمؐ کی سیادت و حاکمیت کا اعلان کردیا تاکہ اسلام روزِ اوّل سے مکمل شکل میں سامنے آجائے اور اس میں کسی طرح کی کوئی کسر نہ رہ جائے نہ اصول میں کوئی کمی رہ جائے اور نہ سن و سال اور رشتہ و قرابت معیارِ بزرگی بننے پائیں۔

ردِ عمل

اس اعلان کا ردِ عمل یہ ہوا کہ چاروں طرف سے ہجوم مصائب شروع ہوگیا۔ ایک طرف رسول اکرمؐ قُوْلُوْا لا الٰہ الا اللہ کی تبلیغ کر رہے ہیں اور دوسری طرف کفار ان کے ساتھ تمام حلقہ بگوش ہوجانے والوں کو طرح طرح کی اذیت دے رہے ہیں۔ جناب یاسر و سمیہ کی شہادت اور جناب عمار کا تقیہ اسی دور کی یادگار سیرتیں ہیں۔

حالات کے انتہائی نازک ہوجانے کی بنا پر مرسل اعظمؐ نے ہجرت کا حکم دے دیا اور جناب جعفر طیار کی سرکردگی میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبشہ روانہ کردیا جو بظاہر مسلمانوں کی جان بچانے کی تدبیر تھی لیکن واقعًا اسلام کے پیغام کی اشاعت کا ایک راستہ تھا، اور اسی لیے اس کام کے لیے بھی ابوطالبؑ ہی کے ایک فرزند کا انتخاب کیا گیا۔ جنھوں نے نجاشی کے دربار میں ایسا خطبہ پڑھا اور سورۂ مریم کی آیات کی اس شان سے تلاوت کی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اس نے مکہ کے مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے وفد کو نہایت ذلت کے ساتھ باہر نکال دیا اور اسلام ملک حبش تک پہونچ گیا اور ہجرت کا پہلا فائدہ یا فلسفہ منظرِ عام پر آگیا۔

ہجرت

تھوڑے عرصہ کے بعد شعب ابی طالب کی سہ سالہ مشقت آفریں زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور

کفار نے اپنے معاہدہ کو توڑ کر قدرے مہلت دی تو رسول اکرمؐ نے کارِ تبلیغ کو تیز تر کردیا لیکن اسلام کے دونوں محافظ ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ادھر محاذِ شجاعت کا سپاہی ابوطالبؑ دنیا سے رخصت ہوا اور اِدھر محاذِ ایثار کی مجاہدہ خدیجہؑ نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا اور رسولِ اکرمؐ کی تنہائی اور پریشانی کو دیکھ کر رب العالمین نے انھیں بہ نفسِ نفیس ہجرت کا حکم دے دیا۔

مسلمان بڑی تعداد میں پہلے ہی ہجرت کرچکے تھے۔ اب آپ بھی تیار ہوگئے اور بستر پر حضرت علیؑ کو چھوڑ کر امانتوں کی واپسی کی ہدایت دے کر روانہ ہوگئے۔ اب زغۂ کفار میں مولائے کائنات ہیں اور جناب فاطمہ بنت اسد اور جناب فاطمہ بنت محمدؐ۔ جن کے صبر و استقلال کی تعریف و توصیف ناممکن ہے کہ ایسے سنگین ترین حالات میں بھی گھر میں رہ کر صبر و سکون کا مظاہرہ کیا اور کسی طرح کے نالہ و شیون کی آواز بلند نہیں کی جب کہ ایسے موقع پر بڑے بڑے بہادر بھی رو دیا کرتے ہیں۔

صبح ہوئی ـــ کفار کو حضرت علیؑ کو دیکھ کر مایوسی ہوئی، انتقام کا جذبہ اُبھرا اور جب حضرت علیؑ فواطم کا قافلہ لے کر چلے تو کفار سدِّ راہ ہوگئے حالانکہ ان کی امانتیں انھیں واپس مل چکی تھیں اور حضرت علیؑ کے ذمہ کسی کا کوئی حق باقی نہ تھا۔

مزاحمت ہوئی اور شدید انداز سے ہوئی۔ لیکن حضرت علیؑ کامیابی کے ساتھ قافلہ کو لے کر آگے بڑھ گئے اور مدینہ کے باہر سرکارِ دو عالمؐ سے مل گئے جہاں آپ حضرت علیؑ کا انتظار کر رہے تھے۔ ہجرت کے دوسرے دور میں مدینہ میں تبلیغ کا کام شروع ہوا اور رسولِ اکرمؐ نے ایک مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا جس کا مقصد بھی یہ واضح کرنا تھا کہ اسلام کا مرکزی مقام اور تبلیغ کا بنیادی سینٹر یہی خانۂ خدا ہے جہاں سے اسلام کی آواز پھیل سکتی ہے اس کے بعد اسلام دار الامارہ اور گورنمنٹ ہاؤس کی نذر ہوگیا تو اس کی صورت مسخ ہوجائے گی اور وہ اپنی اصالت اور واقعیت کو کھو بیٹھے گا۔

واضح رہے کہ ہجرت انسان کا ایک فطری عمل ہے جس کا ردِ عمل خارجی حالات میں بھی ظاہر ہوتا ہے ورنہ انسان ابتدائے پیدائش سے مشغولِ سفر اور مصروفِ ہجرت رہتا ہے۔ بچپنے سے جوانی، جوانی سے ضعیفی، ناتوانی سے طاقت اور جہالت سے علم کی طرف کا سفر ایک طرح کی ہجرت ہی ہے، جس میں بہتر حالات کی طرف آگے بڑھنے کی مہم ہوتی ہے۔ اب جن کی نظر میں بہتر حالات سے مراد مال و دولت و اقتدار ہے وہ ان مراکز کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور جن کی نگاہ میں بہترین حالات

سے مراد خدمتِ دین و مذہب ہے وہ ان مراکز کی طرف ہجرت کرتے ہیں جہاں خدمتِ دین کے بہترین مواقع ہوں اور اصلاحِ امت کا کام بہترین طریقہ سے انجام دیا جاسکے۔

ہجرت کے بعد

مدینہ آنے کے بعد بھی کفار کو سکون نہ ملا اور انھیں یہ خیال رہا کہ جب ہم ان کو ان کے وطن سے باہر نکال سکتے ہیں تو انھیں عالمِ غربت اور دیارِ غیر میں فنا کر دینا کیا مشکل کام ہے اور اُدھر ہجرت کی شرمندگی کا علاج کرنا بھی مقصود تھا، چنانچہ مدینہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ حضور اکرمؐ نے کفار کے قافلہ تجارت کو روک کر اپنی طاقت کا بھی مظاہرہ کرنا چاہا اور کفار کے ہاتھوں غصب ہوجانے والے اموالِ مسلمین کو بھی واپس لینا چاہا اور اس کے نتیجہ میں بدر میں اسلام کا پہلا معرکہ پیش آگیا۔ ۳۱۳ خالی ہاتھ مسلمان اور ۹۵۰ مسلح کفار۔ لیکن رب العالمین نے مادی اور معنوی کمک کے غیبی اسباب فراہم کر دیے اور بالآخر اسلام غالب آگیا اور کفار کے ستر آدمی قتل ہوگئے جن میں سے ۳۵ کو تنہا فرزند ابوطالبؑ حضرت علیؑ نے قتل کیا تھا اور باقی ۳۵ کے قتل میں مجاہدین کی کمک کی تھی۔ اُدھر ستر مشرکین گرفتار بھی ہوگئے اور مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی حاصل ہوگیا۔

عقد جناب فاطمہؑ

جنگ بدر کے بعد رسول اکرمؐ نے حکمِ خدا کے مطابق تمام مسلمانوں کے پیغامات کو ٹھکرا کر حضرت علیؑ سے اپنی بیٹی فاطمہؑ کا عقد کر دیا۔ لیکن سامانِ عقد میں نہ دولتِ خدیجہ کام آئی اور نہ مسلمانوں کا مالِ غنیمت۔ بلکہ آپ نے حضرت علیؑ کی زرہ کو فروخت کر کے ان سے ۵۰۰ درہم مہر لیا اور اس میں سے ۶۳ درہم کا سامان خرید کر بطور جہیز دے دیا اور باقی حضرت علیؑ کو انتظامِ خانہ داری اور اہتمامِ ولیمہ کے لیے دے دیا۔ رقمِ مہر کا ایک اچھا حصّہ خوشبو پر صَرف کیا کہ یہ اسلام میں مال کا بہترین مصرف ہے اور اسلام صفائی، پاکیزگی اور خوشبو پر کافی زور دیتا ہے۔

یہ اسلام میں ایک تاریخی اور مثالی شادی تھی جس کا عقد آسمان پر بھی ہوا اور زمین پر بھی جس کا مہر معنوی بھی تھا اور مادی بھی۔ لیکن اس کا مصرف ایک عام معمولی شادی سے بھی کمتر تھا جس نے امت کے غریبوں

کا بھرم رکھ لیا، اور قیامت تک ہونے والی شادیوں کے لیے ایک راستہ قائم کر دیا جس کے بعد پریشانی "خود کردہ را علاجے نیست" کی مصداق ہے، جس کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے۔

معرکے

بدر کی شکست کے بعد کفار میں جذبۂ انتقام پیدا ہوگیا اور ۳ھ میں احد کا معرکہ پیش آگیا۔ یہ معرکہ خاص مدینہ کے اطراف میں ہوا اور اسے حضرت علیؑ نے چند مجاہدین کے ساتھ سر کر لیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے حکمِ رسولؐ کی مخالفت میں دُرّہ کو چھوڑ دیا اور خالد بن ولید نے دوبارہ حملہ کر کے جنگ کا نقشہ بدل دیا اور مسلمان میدان سے فرار کر گئے۔ اور اس طرح یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ رسولِ اکرمؐ کے حکم کی خلاف ورزی، مالِ غنیمت کی لالچ، اور رسولؐ کے تقسیمِ غنائم پر عدمِ اعتماد کا انجام کیا ہوتا ہے اور واضح ترین کامیابی کس طرح شکست میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اس کامیابی نے کفار کے حوصلے بڑھا دیے اور انھوں نے تمام احزاب کو جمع کر کے قلبِ مدینہ پر حملہ کر دیا اور ان کا سربراہ عمرو بن عبدود خیمۂ رسولؐ تک آگیا اور معرکہ، کفار و مسلمین کے بجائے کل اسلام اور کل کفر کا ہوگیا۔ لیکن حضرت علیؑ کی ایک ضربت نے جنگ کا فیصلہ کر دیا اور رسول اکرمؐ نے اس ضربت کو عبادتِ ثقلین پر بھاری قرار دے دیا۔

جنگِ خندق نے کفار کے حوصلے اس حد تک تو پست کر دیے کہ باہر جا کر لڑنے کی ہمت نہیں رہ گئی لیکن جب ۶ھ میں رسول اکرمؐ عمرہ کے لیے مکہ گئے تو انھیں بیرونِ آبادی روک دیا اور شہر میں داخلہ سے منع کر دیا۔ متعدد بحثوں کے بعد صلح حدیبیہ کی نوبت آئی اور حضرت علیؑ نے حکمِ رسولؐ سے صلح نامہ مرتب کر دیا۔ بعض مسلمانوں کو رسالت میں شک بھی ہوگیا لیکن خدا نے اس صلح کو فتح مبین قرار دے دیا جس کے بعد دوسرے سال مکہ خالی ہوگیا اور مسلمانوں نے باقاعدہ عمرہ کر لیا اور یہ سرد و گرم دونوں طرح کی جنگ کی کھلی ہوئی فتح تھی۔ سرد جنگ کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ کفار نے اسلام کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کر کے مسلمانوں کو عمرہ کا موقع دے دیا اور گرم جنگ کی فتح یہ تھی کہ طاقت کے مقابلہ کا ذکر نہیں آیا اور از خود مکہ خالی ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں ۸ھ میں مکہ بھی فتح ہوگیا اور کعبہ کو بتوں سے خالی بھی کرا دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام فتح کے بعد انتقامی کارروائی نہیں کرتا ہے بلکہ سرکاری مجرمین کو معاف کر دیتا ہے اور صرف عوامی مجرمین سے

محاسبہ کرتا ہے۔

خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد کفارِ مکہ تو بظاہر خاموش ہو گئے لیکن خیبر کے یہودیوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور کفار کو ورغلانے لگے اور ان سے کمک کا بھی معاہدہ شروع ہو گیا تو رسولِ اکرمؐ نے خیبر کا رُخ کیا اور ۳۹ دن محاصرہ کے بعد خیبر کے جملہ قلعے فتح کر لیے اور حضرت علیؑ نے عمرو ہی کی طرح مرحب و عنتر و حارث کا بھی خاتمہ کر دیا اور اسلام نے یہودیت کا قلعہ بھی فتح کر لیا جس کے بعد اہلِ فدک از خود تسلیم ہونے پر تیار ہو گئے اور یہ علاقہ رسولِ اکرمؐ کو بغیر جنگ کے ہاتھ آ گیا جو رسولِ اکرمؐ کی ذاتی ملکیت قرار پایا اور آپ نے اسے اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ کے حوالے کر دیا جس کی ایک داستان تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور جس نے امت کی پیشانی کو عرقِ شرم سے تر کر دیا ہے کہ امت اپنے پاس سے دخترِ رسولؐ کی کفالت کرنے کے بجائے خود اس کا حق بھی نہ دے سکی یا نہ دلوا سکی اور رسولِ اکرمؐ کی بیٹی کو یہ وصیت کرنا پڑی کہ میرے جنازہ کو رات کی تاریکی میں دفن کیا جائے اور میرے جنازہ میں ظالموں کو شرکت کا موقع نہ دیا جائے۔

واضح رہے کہ جناب جعفر طیار کی ہجرت حبشہ سے آخری واپسی اس وقت ہوئی جب حضرت علیؑ خیبر کے قلعہ کو فتح کر کے واپس آئے اور رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ میں کس چیز کی زیادہ خوشی مناؤں، خیبر کی فتح کی یا جعفر کی واپسی کی — اور اس طرح روحِ ابوطالبؑ خوشی سے وجد کرنے لگی کہ ایک فرزند نے سرِ جنگ کو سر کیا ہے تو دوسرے نے صلح مقابلہ کے میدان کو فتح کر لیا ہے۔

حُنین

خیبر کے بعد حنین کا معرکہ بھی سر ہو گیا اور مکہ بھی فتح ہو گیا۔ بلکہ سنہ ۹ھ میں اسلام کا عیسائیت کے ساتھ معرکہ بھی مباہلہ کے میدان میں فتح ہو گیا اور رسولِ اکرمؐ نے اپنے اہلبیتؑ کے سہارے عیسائیت کو مکمل شکست دے کر نصاریٰ کو جزیہ دینے پر مجبور کر دیا اور اسلام آخری فتح سے بھی ہمکنار ہو گیا جس کی ہر فتح میں کسی نہ کسی فرزندِ ابوطالبؑ کا حصہ رہا جس نے روزِ اول کہا تھا:

"قُمْ یَا سَیِّدِیْ"

حجۃ الوداع

رسولِ اکرمؐ کی راہ نمائی اور حضرت علیؑ کے مجاہدات کے نتیجہ میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی جملہ طاقتوں کے شکست خوردہ ہو جانے کے بعد قدرت نے چاہا کہ حضرت علیؑ کے ان مجاہدات کی حیثیت اور ان کی قدر و قیمت کا اعلان کر دیا جائے، چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے آخری حج کا اعلان کر دیا اور لاکھوں مسلمان مختلف اطرافِ عالم سے حجِ بیت اللہ کے لیے جمع ہو گئے۔ حجۃ الوداع کی واپسی پر مقامِ غدیرِ خم میں قدرت نے اس آخری امر کی تبلیغ کا حکم دیا اور رسولِ اکرمؐ نے سوا لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں حضرت علیؑ کی ولایت اور مولائیت کا اعلان کر دیا اور اس طرح بعثت سے شروع ہونے والا کام غدیر میں مکمل ہو گیا اور اسلام کو ایک مستقل محافظ اور امت کو ایک بہترین مولا مل گیا جو ہر اعتبار سے رسولِ اکرمؐ کا مثیل اور ان کے کردار کا امتداد اور استمرار تھا۔

حجۃ الوداع کی واپسی پر قدرت نے اپنے محبوب کو اپنی بارگاہ میں طلب کرنے کا اعلان فرما دیا اور ۲۸ صفر سنہ ۱۱ھ کو رسولِ اکرمؐ اپنے خالق کی بارگاہ میں پہونچ گئے۔ وحیِ الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ امت اپنے بہترین مہربان باپ کی سرپرستی سے محروم ہو گئی اور دشمنانِ اسلام کو طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا جس کے نتیجہ میں رسولِ اکرمؐ کی دختر اور ان کے اہلبیتؑ کو بے پناہ مصائب کا نشانہ بننا پڑا اور باپ کے تقریباً ۹۵ دن کے بعد بیٹی بھی شکستہ پہلو ستم رسیدہ اپنے باپ کی خدمت میں پہونچ گئی۔ جب ہجومِ مصائب نے جائداد پر قبضہ کر لیا، محسن کو شہید کر دیا، پہلو کو شکستہ بنا دیا، وارث کے گلے میں رسی ڈال دی اور امت یا اصحاب نے ایک نئے انداز سے اجرِ رسالت پیش کر دیا۔

تبلیغی راہ کی رکاوٹیں

یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے ۲۳ سال کے مختصر وقفہ میں اس شاندار طریقہ سے دین الٰہی کی تبلیغ کی ہے کہ آج جب مسلمان "صحابہ کرام" کی فہرست تیار کرتے ہیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہونچا دیتے ہیں۔ جن مسلمانوں کو شرف صحابیت حاصل نہیں ہو سکا اور حضورؐ کے دیکھے بغیر غیب پر ایمان لائے ان کا سلسلہ اور طولانی ہے۔ لیکن اس بات سے اکثر افراد بے خبر ہیں کہ اس قدر کامیاب تحریک کس طرح کامیاب ہوئی ہے اور اس راہ میں سرکار نے کن مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا ہے۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ سرکار پر کوڑا پھینکا گیا، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر مارے گئے، اور طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں یہاں تک کہ حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ جس قدر مجھے ستایا گیا ہے اس قدر کسی نبی کو اذیت نہیں دی گئی ہے۔ لیکن اس کے مفاد اور مفہوم کو وہی انسان سمجھ سکتا ہے جو اس راہ میں قدم رکھے اور ان مشکلات کا سامنا کرے۔

آج تبلیغِ دین بے حد آسان ہے، زمانہ روشن فکر ہو چکا ہے، جاہلیت کا دور تمام ہو چکا ہے، تبلیغ کا بیشتر حصہ ان افراد سے متعلق ہے جو پشتینی مسلمان ہیں اور جنھوں نے مسلمانوں کی آغوش یا ان کے ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں۔ آج ماحول کے ذہن میں وہ تاثرات اور تعصبات نہیں ہیں جن کی بنا پر کلمۂ حق کہنا مشکل اور سننا اس سے زیادہ مشکل تھا لیکن اس کے باوجود۔ بڑے بڑے صاحبان علم و ہنر ہمت ہار جاتے ہیں اور یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ اس زمانے کی اصلاح ممکن نہیں ہے اور دنیا تباہی کے اس موڑ پر پہونچ چکی ہے جس سے واپس آنا ناممکن ہے۔

لیکن سرکار دو عالمؐ نے اس سے کہیں زیادہ بدتر ماحول میں کام شروع کیا، جسے قرآن مجید نے ضلال مبین اور کھلی گمراہی سے تعبیر کیا ہے اور اس قدر کامیابی سے کام تمام کیا کہ پروردگار نے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ حالات اور مشکلات کیا تھے جن سے سرکار دو عالمؐ کو گذرنا پڑا اور جن کا مقابلہ کرنا ہر مسلمان بلکہ ہر ذمہ دار مسلمان کا فرض ہے جس کے بغیر نہ اسلام کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ انسان مکمل طور پر مسلمان ہو سکتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ کرنا آسان ہے اور اسلام کی راہوں سے گذرنا بہت مشکل ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سرکار دو عالمؐ نے جس عالم میں تبلیغ کا آغاز کیا ہے وہ ایسی بے سر و سامانی کا عالم تھا کہ اپنے خاندان کے چند افراد کے علاوہ کوئی ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ خاندان میں بھی عباس جیسے افراد نے معذرت کر لی تھی کہ میں اتنے بڑے طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن حکم خدا کی عظمت اور کام کی اہمیت نے حوصلے اتنے بلند کر رکھے تھے کہ ساز و سامان کی پرواہ کیے بغیر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کام کا آغاز دعوت سے کیا تاکہ کسی بدگمان کو بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اسلام کوئی کھانے پینے کا ذریعہ ہے۔ سرکار نے پہلے ہی دن واضح کر دیا کہ میں قوم کو کچھ دینے کے لیے آیا ہوں قوم سے کچھ لینے کے لیے نہیں آیا ہوں اور اپنی امت کے سربراہوں کو بھی ہوشیار کر دیا کہ میرا کلمہ پڑھنا ہے اور میرے مذہب کی تبلیغ کرنا ہے تو قوم سے کچھ لینے کو مقصد نہ بناؤ ـــــ قوم کو کچھ دینے کا حوصلہ پیدا کرو۔

دعوت میں کھلانے پلانے کے بعد جس زحمت کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ جن کو کھلایا پلایا انھیں نے جادوگر اور مجنون کہنا شروع کر دیا ـــــ اور تاریخ نے یہ نکتہ محفوظ کر لیا کہ کسی تحریک سے پہلے کے تعلقات اور ہوتے ہیں اور تحریک کے بعد کے حالات اور ہوتے ہیں ـــــ تحریک سے پہلے صادق و امین کہنے والے ہی تحریک کے بعد جادوگر اور دیوانہ کہنے لگتے ہیں کہ ان کے سامنے وہ خطرہ آجاتا ہے جس سے ان کے سارے بدن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خیال دل و دماغ میں گردش کرنے لگتا ہے کہ اب رسوم و عادات کا قلعہ مسمار ہونے والا ہے، اور آبا و اجداد کے بنائے ہوئے اصول تباہی کے گھاٹ اُترنے والے ہیں۔ اب دینِ خدا کی حکومت ہوگی اور خود ساختہ مذہب کے بجائے الٰہی قانون زندگانی بشر پر حکمرانی کرے گا۔

جادوگر اور مجنون کہنے ہی پر اکتفا نہیں کی گئی کہ سرکار دو عالمؐ انھیں مجنون و بے عقل قرار دے کر

اپنا کام جاری رکھتے اور ایسے احمقانہ الزامات کی پرواہ نہ کرتے بلکہ کفار نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ یہ تحریک صرف الزامات سے رکنے والی نہیں ہے لہذا سڑکوں پر گھراؤ کا پروگرام بنایا گیا اور اس میں حسب حصہ ساری قوم کو شریک کیا گیا۔ بچّوں کو پتھر مارنے کا کام دیا گیا، عورتوں کو کوڑا پھینکنے کا کام ملا، بزرگوں کو ہر محفل و اجتماع میں نئے نئے الزامات تراشنے اور ان کا اشتہار کرنے کا کام سپرد کیا گیا اور یہ رکاوٹ لفظی رکاوٹ سے کہیں زیادہ مشکل تھی لیکن سرکار نے اس کی پرواہ بھی نہیں کی اور اپنا کام جاری رکھا۔

یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہوا تو اس سے زیادہ کامیاب منصوبہ تیار کیا گیا کہ روز روز کے پتھراؤ اور گھراؤ سے بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راحت حاصل کرلی جائے۔

اور یہ منصوبہ بھی رات کے وقت تیار کیا گیا جو دشمن کی کمزوری اور تحریک کی طاقت کی سب سے بڑی دلیل تھی۔ سرکار دو عالمؐ نے اس منصوبہ کا بھی مقابلہ کیا اور اپنے عزیز بھائیؑ کو اپنا جانشین بنا کر حکم خدا سے ہجرت کر گئے کہ وقتی طور پر محاذ عمل تبدیل کر دیا جائے گا یا وسیع تر بنا دیا جائے گا لیکن کام نہیں روکا جائے گا ـــــ دشمن مطمئن ہو گیا کہ ہم نے وطن سے باہر نکال دیا ہے اور اپنے علاقہ میں داخلہ بند کر دیا ہے اور جسے ذمہ داری سپرد کر گئے تھے وہ بھی دو ایک روز بعد ہجرت کر گیا ہے تو اب سارے خطرات ختم ہو چکے ہیں لیکن چند دنوں کے بعد تحریک کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں اور یہ اطلاع ملی کہ محاذ عمل بدل دینے میں پیغمبر اسلامؐ ہی کو کامیابی ہو رہی ہے لہذا بوکھلاہٹ میں یہ طے کیا گیا کہ مدینہ پر حملہ کیا جائے چنانچہ کبھی تنہا اپنی طاقت کے سہارے، کبھی یہودیوں کو ساتھ لے کر، کبھی منافقین کو بھی سازش میں شریک کر کے متعدد حملے کیے گئے ـــــ لیکن سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھ سال کے بعد پیغمبرؐ فاتحانہ انداز سے اسی علاقہ میں داخل ہوئے جہاں سے کل بظاہر نکال دیے گئے تھے اور دشمن خوش ہو رہا تھا کہ ہم نے نکال دیا ہے، اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ان کے سارے کام حکم خدا سے ہوتے ہیں اور یہ کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔

پیغمبرؐ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور صورت حال اس قدر تبدیل ہو گئی کہ جس نے کل سرکار کو پناہ نہ لینے دی تھی وہ آج سرکار سے پناہ مانگ رہا ہے اور کفر اپنی بے سرو سامانی

پر آنسو بہا رہا ہے۔

حیات پیغمبرؐ کے یہ لمحات عبرت انگیز بھی ہیں اور زندگی ساز بھی ـــــ کہ راہ اسلام میں تبلیغی فرض انجام دینا ہر با صلاحیت مسلمان کا فرض ہے اور تبلیغ کی راہ میں مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے ـــــ اس کے بعد کامیابی دینا خداوند عالم کا کام ہے اور وہ اپنے نیک بندوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔

مسلمانو! اٹھو، سرکارؐ کے نقش قدم پر چل کر قوموں کی اصلاح کرو اور دنیا کو حقیقتاً سرکارؐ کے اصول و آئین کا گرویدہ بنا دو!۔

جہاد

جہاد کے معنی بے پناہ جد و جہد اور کوشش کرنے کے ہیں۔ یہ کوشش غلط راہ میں بھی ہو سکتی ہے اور صحیح راہ میں بھی۔ اور اسی لیے قرآن مجید نے بار بار "جہاد فی سبیل اللہ" کا تذکرہ کیا ہے کہ مسلمان اور مومن کا کام راہ خدا میں سعی اور کوشش بلیغ کرنا ہے کسی دوسری راہ میں نہیں۔

یہ جہاد مختلف انداز سے ہو سکتا ہے، قلم سے بھی ممکن ہے اور زبان سے بھی، اسلحہ سے بھی ہو سکتا ہے اور افرادی قوت سے بھی۔

اسلام نے بوقت ضرورت ہر قسم کے جہاد کا مطالبہ کیا ہے اور صاحبانِ قلم سے حق کی راہ میں قلم چلانے کا مطالبہ کیا ہے تو صاحبانِ خطابت سے زبان چلانے کا، اسلحہ چلانے والوں سے اسلحہ استعمال کرنے کا تقاضا کیا ہے تو افرادی قوت رکھنے والوں سے اسی طاقت کے استعمال کا مطالبہ کیا ہے۔

جہاد کی تمام قسموں میں سے ایک قسم میدانِ جنگ میں دشمن سے مسلح مقابلہ کرنا ہے۔ جسے اصطلاحی طور پر قتال کہا جاتا ہے، ورنہ جہاد مختلف اعتبارات سے ہمہ وقت ممکن ہوتا ہے، بلکہ بقدر طاقت واجب بھی ہوتا ہے۔

جب تک دنیا میں دشمنانِ حق و حقیقت زندہ رہیں گے، اور شیطان رجیم کا وجود باقی رہے گا، حق پر طرح طرح کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، ادبی، اخلاقی حملے ہوتے رہیں گے، مسلمان پر بہر حال جہاد واجب رہے گا۔

یہ جہاد صرف مَردوں کا کام نہیں ہے بلکہ عورت پر بھی بقدر امکان جہاد واجب ہے کہ اگر مسلح مقابلہ میں اس کی ضرورت نہیں ہے تو نہ ہو لیکن دیگر مجاہدات میں اس کی شرکت بہر حال لازم ہے۔

اس کے علاوہ جہاد کی ایک قسم داخلی جہاد بھی ہے جہاں انسان کو خارجی دشمن سے نہیں اپنے نفس سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس جہاد کے لیے میدانِ جنگ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی وقت اور زمانہ معین ہے۔ یہ ہر وقت ہے اور ہمیشہ رہے گا اور انسان کے داخل میں عقل اور نفس کی یہ جنگ جاری رہے گی اور مسلمان ہمہ وقت میدانِ جہاد میں رہے گا۔

اور شائد اسی جہاد کے اعتبار سے مسجد کے مرکزی مقام کو محراب کہا جاتا ہے کہ وہاں انسان اور شیطان یا عقل اور نفس کی جنگ برابر جاری رہتی ہے اور نمازی ہر آن شیطان پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر اوقات شکست کھا جاتا ہے اور اخلاص عمل یا توجہ نفس میں فرق آجاتا ہے اور کبھی کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

کامیابی کی بھی دو قسمیں ہیں، کبھی انسان اپنے خیال اور اندازہ میں کامیاب ہوتا ہے اور دشمن اس کامیابی کا اقرار نہیں کرتا ہے اور کبھی دشمن بھی اس کامیابی کا اقرار کر لیتا ہے اور ندائے غیب بھی اس فتح مبین کی تائید کر دیتی ہے جیسا کہ امام زین العابدینؑ کے واقعہ میں ملتا ہے کہ جب سانپ انگوٹھا چبانے کے باوجود آپ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کر سکا تو ندائے غیب نے ان الفاظ میں شیطان کے مقابلہ میں آپ کی فتح مبین کا اعلان کیا کہ "انت زین العابدین" (بے شک تم بزم عابدین کی زیب و زینت ہو)۔

جہاد کی اسی داخلی شکل کی تعبیر مختلف انداز سے کی گئی ہے کہ کبھی عورت کے لیے شوہر کی بہترین خدمت کو جہاد کہا گیا ہے کہ اس خدمت کی راہ میں اکثر اوقات اپنے جذبات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور دوسرے کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم کرنا پڑتا ہے جو جہاد نفس کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور کبھی اسی جہاد نفس کے اعتبار سے وضع حمل کی زحمتوں کو شہادت اور بدلِ جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ مرحلہ بھی میدانِ جنگ میں موت و حیات کی کشمکش سے کمتر نہیں ہے اور اس مرحلہ پر بھی عورت کو اسی منزل کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے جس سے ایک سپاہی میدانِ جہاد میں گزرتا ہے اور اسی جہاد کے ذریعہ عورت مسلح مقابلہ کے لیے مجاہدین فراہم کرتی ہے ورنہ یہ جہاد ختم ہو جائے تو میدانِ جنگ کے لیے مجاہدین کی سپلائی کا راستہ ہی بند ہو جائے۔

مسلح جہاد کی دو قسمیں ہیں: ابتدائی جہاد اور دفاعی جہاد۔

ابتدائی جہاد وہ خطرناک کام ہے جسے عرف عام میں جارحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اسی لیے کوئی جارح اپنی جارحیت کو جہاد کا نام دینے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ سب اپنے حملے کو دفاع کا نام دیتے ہیں اور اس طرح ایک تلخ حقیقت پر شیریں کیپسول چڑھا دیتے ہیں۔

دنیا کے جس ملک کو دیکھا جائے، بڑے سے بڑا جارح اور حملہ آور اور مفسد ملک بھی اپنے ملک میں وزارت جنگ قائم نہیں کرتا ہے بلکہ وزارت دفاع ہی قائم کرتا ہے اور جب ملکی بجٹ تیار کرتا ہے تو جنگی اخراجات کا نام نہیں لیتا بلکہ دفاعی اخراجات کا ذکر کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی جنگ یعنی جہاد انتہائی خطرناک اور انتہائی بدنام مرحلہ ہے جس سے گزرنے کے لیے کوئی فرد یا جماعت یا ملک تیار نہیں ہوتا ہے ــــ لیکن نگاہ انصاف سے دیکھا جائے تو ابتدائی جہاد اتنا غلط کام نہیں ہے جتنا غلط سمجھا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس کا استحقاق ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ خصوصیات ہیں جن کا فراہم ہونا بہر حال ضروری ہے۔

ابتدائی جہاد کی یہی خطرناک منزل تھی جس سے بچنے کے لیے مسلمان مورخین نے سارا زور تحقیق اس بات پر صرف کر دیا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے سارے اقدامات کو دفاعی ثابت کیا جائے اور کسی طرف سے ابتدائی اقدام کا احساس نہ ہونے پائے۔

یہ بات واقعات کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ سرکارؐ نے حتی الامکان دفاعی راستہ ہی اختیار کیا ہے اور ابتدائی جہاد کے راستہ کو ترک کر دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ کو یہ حق بھی حاصل تھا اور آپ اس راستہ کو بھی اختیار کر سکتے تھے جس کا اختیار کرنا دوسرے افراد یا ممالک کے لیے ناجائز اور حرام ہے ــــ اور اس کا راز یہ ہے کہ اسلام اس ایک واقعیت پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ کائنات از خود نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ اسے ایک خالق و مالک اور قادر مطلق خدا نے خلق فرمایا ہے اور جو کسی کا خالق و مالک اور وجود دینے والا ہوتا ہے اس کا کم سے کم حق یہ ہوتا ہے کہ اس کا اقرار و اعتراف کیا جائے اور زندگی کو اس کی ملکیت تصوّر کرتے ہوئے ہر قدم پر اس کی اطاعت کی جائے بلکہ ضرورت پڑ جائے تو جان عزیز کو اس کی راہ میں قربان کر دیا جائے، اور اگر کوئی از راہ نالائقی و بغاوت اس کی اطاعت سے سرکشی کرے یا اس کے وجود ہی سے انکار کر دے تو دینے والے کو مکمل اختیار ہے کہ اپنی نعمت حیات کو واپس لے لے،

اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ یہ حق دوسرے کسی پیدا ہونے والے کو حاصل نہیں ہے۔ اس نے نہ وجود دیا ہے اور نہ اسے لینے کا حق ہی ہے۔ وہ زندگی کا خاتمہ کرنا بھی چاہے تو اس کے لیے جواز درکار ہے کہ اس کا کوئی احسان نہیں ہے اور سب اپنے اپنے گھر میں اپنے خالق کا احسان لے کر دنیا میں آئے ہیں۔

اسلام اور کفر یا دنیاوی نظاموں میں یہی فرق ہے کہ اسلام کا واضع ایک خالق و مالک ہے، اور کسی نظام کا وضع کرنے والا کائنات کا خالق و مالک نہیں ہے اور اسے بنیادی طور پر نہ کسی پر حق اطاعت حاصل ہے اور نہ کسی بغاوت کرنے والے سے زندگی سلب کر لینے کا حق ہے۔

رسولؐ اور امامؑ خدائے مالک و مختار کا نمائندہ ہوتا ہے لہذا اسے خدا کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جب تک انسان خدا کا اعتراف اور اس کی اطاعت کرتا رہے اسے زندہ رہنے کا حق دے اور جب انسان مالک کی بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے، اور اسی لیے اسلام نے ابتدائی جہاد کے لیے نبی اور امام کی شرط لگائی ہے اور جہاد کے آغاز کے لیے دعوت الی اللہ کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ مکمل طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ انسان باغی ہے یا نہیں، اور اس کو مالک کے وجود کا اقرار ہے یا نہیں۔ اگر مالک کے وجود کا اقرار ہے اور اطاعت میں کوتاہی کی ہے تو سزا دے، تنبیہ کرے، راہ راست پر لے آئے اور اطاعت کا پابند بنائے اور اگر اصل وجود کا انکار کر دے تو جس کا خالق نہ رہے اس مخلوق کو رہنے کا کیا حق ہے کہ مخلوق کا وجود خالق کے کرم ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ایسی صورت حال میں ہمیں سرکار دو عالمؐ کے مجاہدات کو دفاعی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور آپ کو ابتدائی جہاد کا مکمل حق حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ نے حالات کے پیش نظر اس حق کو استعمال نہیں کیا اور ہمیشہ مدافعانہ کارروائی کرتے رہے۔ اس کا واحد راز یہ تھا کہ آپ کے پیش نظر یہ نکتہ بھی تھا کہ دنیا کا ہر انسان نہ خالق و مالک کا قائل ہے اور نہ اس کے حق کو پہچانتا ہے خصوصاً کافر و مشرک جس سے جہاد کرنا ہے وہ تو یکسر اس حقیقت سے غافل یا متجاہل ہے۔ اس کے سامنے ایسے حقوق کو استعمال کیا گیا تو وہ الزام تراشی اور جارحیت کے پروپیگنڈہ کا بہترین موقع تلاش کر لے گا اور کوئی غیر جانبدار اس نکتہ پر غور کرنے کی زحمت بھی نہ کرے گا کہ مجھے وہ حقوق بھی حاصل ہیں جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں ہیں کہ سب قومی اور سیاسی لیڈر ہیں اور میں خدائے قادر و قاہر کا نمائندہ ہوں۔

قومی لیڈروں کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو قوم ان کے حوالے کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ سلبِ حیات کا اختیار صرف خدائے قادر و مختار کو حاصل ہے اور کسی قوم اور ملّت کو حاصل نہیں ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض مسلم مورخین کا یہ خوف کہ سرکار دو عالمؐ کے کسی اقدام میں ابتدائی جہاد کی جھلک پیدا ہو گئی تو ظلم کا الزام لگ جائے گا یا ان کا یہ اندازِ تحریر کہ اپنے کو ملزم سمجھ کر ہر غزوہ اور جنگ کی صفائی دیں اور اس میں کسی نہ کسی شکل میں مدافعانہ انداز پیدا کیا جائے۔ حقائق سے ایک قسم کی ناواقفیت ہے یا ذہنی احساس کمتری ہے کہ دنیا کے نادان اربابِ عقل راضی ہو جائیں اور وہ سرکار کے عمل کو صحیح اور جائز قرار دینے لگیں۔ حالانکہ ہر مسلمان مورخ، اور سیرت نگار کا فرض تھا کہ پہلے اس نکتہ کی وضاحت کرتا کہ سرکار کو خدائی نمائندہ ہونے کے اعتبار سے ابتدائی حملہ کا حق حاصل تھا اور آپ جس وقت بھی یہ حق استعمال کرتے حق بجانب ہوتے لیکن آپ نے مصالح اور حالات کے پیشِ نظر اپنے حق کو استعمال نہیں کیا اور آخر امکان تک صبر کرتے رہے اور جب صبر سے کام بگڑتا ہوا دکھائی دیا تو میدانِ دفاع میں قدم رکھ دیا۔

جہاد اور دفاع کا فرق

اصطلاحی اعتبار سے ابتدائی حملے کا نام جہاد ہے اور جوابی کارروائی کا نام دفاع ـــ لیکن حقیقت کے اعتبار سے جہاد بھی حق سے دفاع اور دفاع بھی حق کی راہ میں ایک جہاد کا نام ہے۔

جہاد کرنے والا اس وقت جہاد شروع کرتا ہے جب ظالمین رب العالمین کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے اصول حیات کو باطل و بیکار قرار دینا چاہتے ہیں اور اس کے نظام کو لا طائل قرار دے کر اس کے مقابلہ میں دوسرے نظام کو قابل عمل تصور کر لیتے ہیں، اور دفاع کرنے والا بھی ساری جد و جہد اسی راہ میں صرف کرتا ہے کہ کسی صورت سے حق کا بول بالا رہے اور اسلام خطرات کا شکار نہ ہونے پائے۔

جہاد کے لیے نبی یا امام کی رہبری ضروری ہے۔ ان کے علاوہ کسی کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اس صحیح وقت کی تعیین کر سکے جب اس طرح کا میجر آپریشن جائز ہو جائے اور انسانی خون کا بہانا قانون کے حدود کے اندر آ جائے اور بغاوت کا پیمانہ اس طرح لبریز ہو جائے کہ اس کا

علاج اس آپریشن کے علاوہ کچھ اور نہ رہ جائے۔

دفاع کے لیے کسی کی رہبری یا موجودگی کی شرط نہیں ہے۔ جس پر وقت پڑے گا اس پر دفاع واجب ہو جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ دفاع کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: شخصی دفاع اور مذہبی دفاع۔

شخصی دفاع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذاتی طور سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، چور گھر میں گھس آئے، ڈاکو گھیر لے، قاتل حملہ آور ہو جائے اور جان، مال یا آبرو خطرہ میں پڑ جائے تو ہر شخص کا ذاتی فریضہ ہے کہ ذلّت کے راستہ کو ترک کر کے مقابلہ کرے اور حتی الامکان اپنے جان، مال، آبرو کا تحفظ کرے چاہے اس راہ میں ظالم کی زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ البتہ اگر اپنی زندگی خطرہ میں پڑ جائے تو دفاع میں حکمت عملی کا استعمال کرے کہ اسلام مال کی راہ میں جان قربان کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اور یہ فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ جان سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہے اور جان ہی باقی نہ رہ گئی تو مال رہ کر کیا کرے گا۔

اس سلسلہ میں چند مسائل بھی قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ ہر انسان پر اپنے جان، مال اور آبرو کی طرف سے دفاع کرنا واجب ہے چاہے اس میں حملہ آور کا قتل ہی کیوں نہ ہو جائے۔

۲۔ خطرہ کا تعلق اپنی جان کے علاوہ اولاد، متعلقین، بلکہ خادم اور خادمہ سے ہو تو بھی دفاع ضروری ہے، چاہے حملہ آور کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

۳۔ اگر کوئی شخص زوجہ پر حملہ کرے تو اس کی عفت کا تحفظ بھی ضروری ہے چاہے حملہ آور کے قتل ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔

۴۔ مال پر حملہ بھی واجب الدفاع ہے چاہے جس قیمت پر ہو۔

۵۔ اگر دفاع میں اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو جائے تو جان اور آبرو کی راہ میں دفاع واجب رہے گا۔ مال پر جان قربان نہیں کی جا سکتی ہے

۶۔ دفاع میں یکبارگی حملہ آور کے قتل تک نہیں پہونچ جانا چاہیے بلکہ تدریجی راستہ اختیار کرنا چاہیے، اور جب کوئی امکان نہ رہ جائے تو قتل کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۷۔ احتیاط کے باوجود اگر حملہ آور کے قتل کی نوبت آ جائے تو کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن

بداحتیاطی کی صورت میں اس کی زندگی کے خاتمہ کا ضامن تصور کیا جائے گا۔

۸۔ دفاع کی صورت میں اگر فرار کرنے سے جان اور آبرو کا تحفظ ہو سکتا ہے تو قتل کا راستہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ میدان جہاد سے فرار حرام ہے۔ گھر سے فرار حرام نہیں ہے۔

۹۔ دفاع بہر حال واجب ہے چاہے انسان یہ جانتا ہو کہ اس دفاع کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ذلت کے ساتھ سپردگی خودکشی یا زنا کاری کے مترادف ہے۔

۱۰۔ اگر چور ڈاکو حملہ کرنا چاہیں اور انسان کو اطمینان ہو کہ کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے تو دفاعی اقدام صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں اقدام کرنے پر اگر چور یا ڈاکو قتل ہو گیا یا اس کے جسم میں نقص پیدا ہو گیا تو حملہ کرنے والا اس نقص کا ذمہ دار ہوگا۔ اسلام چور اور ڈاکو کے مقابلہ میں بھی احتیاط اور دیانت داری کی دعوت دیتا ہے۔

۱۱۔ اگر چور نے حملہ کیا اور انسان نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ پھر جب وہ بھاگنے لگا تو دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا تو ایک ہاتھ کے قصاص کا ذمہ دار ہوگا کہ وہ حملہ کے خاتمہ کے بعد کاٹا گیا ہے۔

۱۲۔ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ یا اولاد پر تجاوز کرتے دیکھے تو اسے ہر طرح کا دفاع کرنے کا حق ہے چاہے بدمعاش کا قتل ہی کیوں نہ واقع ہو جائے بلکہ اجنبی مومن اور مومنہ کی آبرو کی طرف سے بھی دفاع جائز ہے اور اس کے نتائج کی بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۱۳۔ اگر کسی نے اجنبی کو زوجہ کے ساتھ جماع کرتے دیکھا اور یہ اندازہ کیا کہ زوجہ بھی اس عمل سے راضی ہے تو وہ دونوں کو قتل کر سکتا ہے اور کسی کے قتل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے چاہے زوجہ دائمی ہو یا متوعہ، مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ۔

۱۴۔ واضح رہے کہ یہ سارے حقوق انسان اور اس کے ظالم کے درمیان ہیں کہ دفاع کرنے والے پر شرعاً کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اگر ظالم نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تو قاضی کو شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا اور واقعی مظلوم اگر اپنے مقدمہ کو ثابت نہ کر سکا تو قاضی سزا دینے میں بہر حال حق بجانب ہوگا چاہے سزا برداشت کرنے والا واقعاً مظلوم ہو لہٰذا دفاع کرتے وقت اس نکتہ کی طرف بھی متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔

۱۵۔ اگر کوئی شخص کسی گھر میں جھانک رہا ہے تو صاحب خانہ کو حق ہے کہ اسے تنبیہ کرے بلکہ

بسا اوقات واجب بھی ہے اور اس کے بعد باز نہ آئے تو اسے سزا بھی دے سکتا ہے چاہے اس راہ میں بے دین کا قتل ہی کیوں نہ واقع ہو جائے لیکن دفاع کا تدریجی ہونا ضروری ہے۔ حد سے تجاوز کرنے میں دفاع کرنے والا بھی سزا کا حق دار ہو سکتا ہے۔ مظلومیت گناہوں کا سارٹیفکٹ نہیں ہے۔

۱۶۔ اگر جھانکنے والا عورتوں کا محرم ہے اور حدود شریعت کے اندر نگاہ کر رہا ہے تو صاحب خانہ کو مارنے کا حق نہیں ہے اور اگر کوئی پتھر وغیرہ مار کر زخمی کر دیا تو اس کا تاوان بھی دینا ہوگا۔۔۔ البتہ اگر حدود شریعت سے تجاوز کر کے عورت کو برہنہ یا مخصوص حالات میں دیکھنا چاہتا ہے تو تدریجاً ہر طرح کی تنبیہ کرنے کا حق ہے۔

۱۷۔ اگر جھانکنے والا نابینا ہے یا اتنی دور سے دیکھ رہا ہے جہاں سے کوئی شخص نظر نہیں آرہا ہے تو بلاوجہ تنبیہ کرنے یا پتھر وغیرہ مارنے کا حق نہیں ہے۔

۱۸۔ اگر کوئی شخص انتہائی دور سے دیکھ رہا ہے لیکن دوربین کے ذریعہ دیکھ رہا ہے تو اس کا حکم بھی قریب سے دیکھنے کا ہے اور صاحب خانہ کو ہر طرح تنبیہ کرنے کا حق ہے اور اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۱۹۔ اگر کوئی شخص آئینہ کے ذریعہ عورت کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کا حکم بھی براہ راست دیکھنے والے کا ہے۔ البتہ احتیاط یہ ہے کہ اسے مارنے کے بجائے خود آئینہ کے سامنے سے ہٹ جائے یا کوئی اور وسیلہ اختیار کر لے۔

۲۰۔ اگر کسی انسان پر کوئی جانور حملہ کر دے تو اُسے ہر طرح سے دفاع کرنے کا حق ہے، اور اس کی کوئی ذمہ داری بھی نہ ہوگی۔ البتہ اگر بھاگنے سے جان بچ سکتی ہے تو بھاگ کر اپنا تحفظ کر لے گا اور جانور کو نقصان نہیں پہونچائے گا ورنہ اس کا بھی ذمہ دار ہوگا۔

مذہبی دفاع

مذہبی دفاع کی دو قسمیں ہیں: ایک دفاع میدان جنگ میں دشمن کے حملہ کے بعد ہوتا ہے جہاں پر مرد و عورت دونوں پر دفاع واجب ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنے دین و مذہب سے دفاع کرے اور اس پر ہونے والے ہر حملہ کا منہ توڑ جواب دے کر دین و مذہب سے

بالآخر کوئی شے نہیں ہے نہ زندگی اور نہ سامانِ زندگی۔

دوسرا دفاع میدانِ جنگ کے علاوہ دیگر میدانوں میں ہوتا ہے جہاں دشمن بظاہر مسلح جنگ کا آغاز نہیں کرتا ہے اور نہ کسی طرح کا حملہ کرتا ہے لیکن دھیرے دھیرے حملہ کی تیاری کرتا ہے یا بلادِ اسلامیہ پر سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی حملے کر کے اس کے وجود یا تشخص کو تباہ کر دینا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں بھی مسلمان پر دفاع واجب ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان اس وقت کا انتظار کرے جب مسلح حملہ ہو جائے اور دفاع کے امکانات ختم ہو جائیں یا مشکل ہو جائیں۔

اسلام پر ہونے والے کسی بھی حملے یا حملہ کی تیاری کا جواب دینا ہر مسلمان کا فرض ہے جس طرح کا حملہ ہوگا اسی طرح کا جواب دیا جائے گا، اور جس طرح کے جواب کی ضرورت ہوگی اسی طرح کے انسان پر جواب واجب ہوگا۔ کبھی جواب ہر انسان پر واجب ہوگا، کبھی صرف صاحبانِ صلاحیت واستعداد پر واجب ہوگا، کبھی نوکِ زبان سے جواب دیا جائے گا کبھی نوکِ قلم سے کام لیا جائے گا اور کبھی جان و مال کی قربانی کے ذریعہ مقدساتِ اسلام کا تحفظ کیا جائے گا۔

مذہب کے خطرات سے آنکھ بند کر لینا اور اسے ظالمین کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا، دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے جو کسی قیمت پر قابلِ معافی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل مسائل قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ اگر اسلامی ممالک یا سرحدوں پر ایسے دشمنوں کا حملہ ہو جائے جن سے اصل اسلام یا اس کی حیثیت واقعی کو خطرہ ہو تو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ جان و مال کی قربانی دے کر اسلام سے دفاع کریں اور اس سلسلہ میں امامؑ یا نائبِ امامؑ کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ہنگامی فریضہ ہے جو ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے اور اس کی راہ میں ہر قربانی جائز ہے۔

۲۔ اگر ممالکِ اسلامیہ پر کفار کے زیادہ تسلط اور بالآخر ان پر قابض ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس سے بھی بہرصورت دفاع واجب ہے۔

۳۔ اگر اسلامی معاشرہ پر سیاسی یا اقتصادی غلبہ کا سلسلہ شروع ہو اور نتیجہ میں سیاسی سپردگی کا خطرہ ہو تو اسی طرح کے اسباب و عوامل کے ذریعہ مقابلہ ضروری ہے اور کم سے کم قطعِ تعلقات تو بہرحال لازم ہے۔

۴۔ اگر تجارتی تعلقات میں کفار کے ممالکِ اسلامیہ پر غلبہ کا خطرہ پیدا ہو جائے اور اس راہ سے

استعمار ملک میں داخل ہو رہا ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس تجارت کا بائیکاٹ کریں اور دشمنوں کے ہاتھ کاٹ دیں۔

۵۔ اگر مسلمان اور غیر مسلمان ممالک کے سیاسی تعلقات سے غیر مسلمین کے تسلط کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو حکام کا فرض ہے کہ ان تعلقات کو فی الفور ختم کر دیں اور کفار کے سیاسی نفوذ کو آگے نہ بڑھنے دیں اور عوام کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے حکام کو ان خطرات کی طرف متوجہ کریں اور وہ متوجہ نہ ہوں تو ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیں تاکہ کفار کا اثر و رسوخ بڑھنے نہ پائے اور ممالکِ اسلامیہ مزید خطرات سے دوچار نہ ہوں۔

۶۔ عالمِ اسلامی ایک عالم ہے، اسے ممالک اور شہروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ایک ملک پر حملہ سارے عالمِ اسلام پر حملہ تصور کیا جائے گا اور تمام ممالک کا فرض ہوگا کہ سب مل کر اس ملک سے دفاع کریں۔

۷۔ اگر ایک مسلمان ملک غیر مسلم طاقتوں سے ساز باز کر کے اسلام کو نقصان پہونچانا چاہے تو مسلمانوں کو حق نہیں ہے کہ اسے ملک کا داخلی معاملہ قرار دے کر سکوت اختیار کریں بلکہ سب کا فرض ہے کہ اس سازش کا سدِباب کریں اور حکومت کو ان تعلقات کے توڑنے پر مجبور کریں تاکہ عالمِ اسلام کسی عظیم خطرہ سے دوچار نہ ہو۔

۸۔ اگر کسی مسلمان ملک کا حاکم یا ممبر پارلیمنٹ کفار کے سیاسی یا اقتصادی غلبہ کا سبب بن رہا ہو تو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسے فی الفور معزول کر دیں اور اسے قرار واقعی سزا دیں اور کم از کم اس کا سماجی بائیکاٹ کریں تاکہ دوسرے افراد میں اس طرح کی سازش کا حوصلہ نہ پیدا ہو۔

۹۔ اگر کسی ملک یا فرد کے کافر ممالک یا افراد سے تجارتی تعلقات سے اسلامی بازار اور مسلمان اقتصاد کو خطرہ لاحق ہو تو تمام علماءِ اسلام کا فرض ہے کہ اس اقدام کے خلاف صف آرا ہوں۔ ان معاملات کو حرام قرار دیں اور امتِ اسلامیہ کو مقاومت پر آمادہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اسلامی مملکت خطرہ میں پڑ جائے اور کفار اسلام پر غالب آ جائیں۔

۱۰۔ تجارتی، سیاسی تعلقات و روابط کی طرح تہذیبی اور کلچرل تعلقات بھی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ذی اثر فرد یا حاکم کفار کی تہذیب اور ان کے کلچر کو رواج دینا چاہے اور اس طرح اسلامی اقدار خطرہ میں

پڑجائیں تو اس تہذیب اور کلچر کا مقابلہ کرنا ضروری ہے اور اس کی راہ میں سدِ سکندری بن کر کھڑا ہو جانا لازم ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی تہذیب، اس کا کلچر اور اس کے اپنے اقدار ہیں، ان اقدار پر کسی طرح کا حملہ برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جو اہمیت ایک مسجد، ایک بارگاہ یا ایک مقدس مقام کی ہے، وہی اہمیت اسلامی تہذیب اور اقدار کی ہے۔ بلکہ تہذیب و اقدار پر حملہ مسجد و بارگاہ پر حملے سے زیادہ شدید ہے کہ مسجد سے فقط ایک عمارت خطرہ میں پڑتی ہے اور تہذیب کے فنا ہو جانے سے سارا مذہب خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ مذہب ہوا میں معلق ہونے اور کتابوں میں درج ہونے کے لیے نہیں آیا ہے۔ مذہب سماج میں رائج ہونے کے لیے آیا ہے۔ جب رواج ہی کے راستے بند ہو جائیں گے تو پھر کیا باقی رہ جائے گا اور اس کے کتابی وجود کا کیا ماحصل ہوگا؟

یہودیوں سے مقابلہ

ذی قعدہ ۶ھ میں حدیبیہ میں فتح مبین حاصل کرنے کے بعد سرکار دو عالمؐ مدینہ واپس آئے اور صرف ۲۰ دن قیام کرنے کے بعد خیبر کے لیے نکل پڑے۔ مسلمانوں کی زندگی مسلسل جہاد تھی اور سرکار دو عالمؐ اسلام کے تحفظ کا کوئی لمحہ فروگزاشت نہ کر سکتے تھے۔ مدینہ کی دس سال کی زندگی میں ۸۰ سے زیادہ مجاہدات اس بات کی دلیل ہیں کہ سرکار دو عالمؐ کو ایک لمحہ بھی چین نہیں مل سکا اور مسلمان مسلسل کمربستہ جہاد رہے کہ جیسے ہی اشارہ ملا میدان جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔ انجام کار سب کا مختلف رہا لیکن میدانِ جہاد تک جانے میں سب کے حوصلے بلند رہے، اور سب نے میدان تک جانے کے لیے اپنے کو آمادہ کر لیا۔ یہ تو صرف دورِ حاضر کی خصوصیت ہے کہ اسلامی فتوحات کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مسلمان اپنے بزرگوں کی سیرت کا اس حد تک بھی اتباع نہیں کرتے کہ کم سے کم میدان جہاد تک ہی چلے جائیں بلکہ صرف فوجوں کو بھیج کر جہاد کا مقدس فریضہ ادا کر دیتے ہیں اور خود قصرِ حکومت کے اندر سنہرے اور روپہلے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

خیبر کے علاقہ کے قریب پہونچنے کے بعد سرکار دو عالمؐ نے توقف کیا اور بارگاہ احدیت میں دعا کی کہ "پروردگار! اس علاقہ کے ہر خیر سے بہرور فرمانا اور ہر شر سے محفوظ رکھنا"۔ اس کے بعد آپ نے علاقہ میں قدم رکھا اور پہلا مقابلہ مرحب اور عامر کے درمیان ہوا جس میں مورخین کے قول کے مطابق عامر کام آگئے، اور بعض مسلمانوں نے اسے خودکشی کا درجہ دے دیا کہ طاقت کا اندازہ کیے بغیر اور اسلحہ کا مکمل انتظام کیے بغیر مقابلہ پر کیوں گئے۔ سرکار دو عالمؐ نے ٹوک کر فرمایا، "خبردار یہ نہ کہنا، عامر نے دوہرا ثواب حاصل کیا ہے"۔

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان روزِ اوّل سے یہودیوں کے مقابلہ میں اسلحہ کی فراہمی کو اہمیت دیتے تھے اور مقابلہ سے گریز کرتے تھے جس کے نتیجہ میں کوئی مقابلہ پر آگیا بھی تو

اسے خودکشی کا طعنہ دیتے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ چودہ صدیوں میں ایک انچ بھی اپنے مرکز سے نہیں ہٹی ہے اور صورت حال آج بھی بدستور برقرار ہے کہ کوئی جہاد کے لیے تیار نہیں ہے اور سارے حکام جہاد کرنے والوں کو کمزور خیال کر رہے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد سرکارؐ نے خیبر کا محاصرہ فرمالیا اور محاصرہ کے بعد پہلے حضرت عمر بن الخطاب فتح کے لیے برآمد ہوئے اور ان کے ناکام واپس آنے کے بعد اور ایسے حالات میں کہ قوم انھیں بزدل قرار دے رہی تھی اور وہ قوم کو بزدل بنا رہے تھے۔ سرکار دو عالمؐ نے یہ اعلان عام کر دیا کہ اب میں اسے علم دوں گا جو مرد میدان، خدا و رسولؐ کا دوست، خدا و رسولؐ کا محبوب، کرار غیر فرار ہوگا، اور فتح کے بغیر واپس نہ آئے گا۔

جس کے بعد بروایت امام بخاری رات بھر مسلمان پرچم اسلام کی تمنا میں بےچین رہے اور صبح کو جب سرکارؐ نے سوال کیا کہ علیؑ کہاں ہیں ؟ تو لوگوں نے جواب دیا کہ ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ آپ نے انھیں بلا کر آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا اور مکمل شفایاب بنا کر پرچم اسلام دے کر روانہ کر دیا۔

فرمایا، پہلے اسلام کی دعوت دینا اور حقوق الٰہیہ یاد دلانا کہ ایک شخص کو بھی راستہ پر لگا دینا، بہترین سُرخ اونٹوں سے بہتر نعمت پروردگار ہے، اس کے بعد جہاد شروع کرنا۔ حیدر کرار کے میدان میں آنے کے بعد پھر مرحب میدان میں آیا اور رجز خوانی شروع کی۔ آپ نے رجز کا جواب دیتے ہوئے ایک حملہ کیا اور مرحب کے دو ٹکڑے کر دیے جس کے بعد خیبر آپ کے ہاتھوں پر فتح ہوگیا۔

امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں اس واقعہ کا اندراج کیا ہے۔

حافظ ابو عبد اللہ نے ابو رافع سے روایت کی ہے کہ مقابلہ کے دوران علیؑ کے ہاتھ سے سپر گر گئی تو آپ نے خیبر کے دروازے کو سپر بنا لیا اور برابر جہاد کرتے رہے اور فتح کے بعد اس دروازہ کو پھینک دیا تو ہم آٹھ آدمیوں نے اسے حرکت دینا چاہا اور نہ دے سکے۔

جابر بن عبد اللہ انصاری کی روایت ہے کہ ۴۰ آدمی بھی اسے نہ اٹھا سکے۔ دوسری روایت میں ۷۰ آدمیوں کا ذکر ہے۔

عبدالرحمٰن بن ابی عیسیٰ کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ گرمی میں گرم اور سردی میں سرد لباس پہنا کرتے تھے اور موسم کی پرواہ نہ کرتے تھے تو میرے بعض ساتھیوں نے مجھ سے اس راز کو دریافت کیا۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ خیبر کے میدان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے

شکست کھا جانے کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے اعلان کیا کہ اب علم کرار غیر فرار کو دوں گا، اور اس کے بعد علم علیؑ کو دے کر روانہ کیا تو یہ دعا دی کہ "خدایا انھیں سرد و گرم زمانہ سے محفوظ رکھنا" اس دعا کا اثر ہے کہ ان کے اوپر موسم کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ (یہ تمام تفصیلات دلائل النبوۃ علامہ بیہقی میں موجود ہیں۔

خیبر کا آخری قلعہ "قلعہ قموص" تھا جس کا سردار ابوالحقیق تھا۔ اس کے فتح ہونے کے ساتھ ابوالحقیق کے فرزند نے سرکار دو عالمؐ سے معاہدہ کر لیا اور اس کے بعد اہلِ فدک بھی معاہدہ پر تیار ہوگئے اور اسلام نے جن ہاتھوں سے حدیبیہ میں فتح حاصل کی تھی، انھیں ہاتھوں سے خیبر بھی فتح کر لیا۔

اس واقعہ کے بعض حساس پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کے بعد بھی حسب ذیل مسائل سامنے آتے ہیں :

۱۔ یہودیوں کا مقابلہ اتنا سخت مقابلہ تھا کہ کسی ایک شخص کا ذکر نہیں ہے پورا لشکر اسلام کم از کم دو مرتبہ زور آزمائی کر کے واپس آگیا تھا اور قلعہ کو فتح نہ کر سکا تھا بلکہ ایسی شان سے واپس آیا کہ لشکر سردار کو کمزور کہہ رہا تھا اور سردار لشکر کو بزدل قرار دے رہا تھا، اور یہ صدر اسلام کی حقیقت پسندی کا ایک نمونہ تھا کہ سارے مسلمان بزدل کو بزدل کہہ رہے تھے اور اسے کسی طرح کی توہین یا دل آزاری نہیں سمجھ رہے تھے۔ آج کے مسلمان تو اس حقیقت پسندی سے بھی محروم ہوگئے ہیں کہ یہودیوں کے مقابلہ میں اپنا علاقہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے ہیں اور پھر " ✓ " کامیابی کا نشان بنا کر نکلتے ہیں۔ گویا ان کی نگاہ میں میدانِ جہاد سے فرار بھی ایک طرح کی کامیابی ہے، جب کہ سرکار دو عالمؐ کا اعلان آج بھی فضا میں گونج رہا ہے کہ یہودیوں کے مقابلہ میں ایسے مجاہدین کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مقابلہ کے لیے "کرار غیر فرار" درکار ہے، اور جب تک ایسا مجاہد فراہم نہیں ہوگا یہودیوں کا قلعہ فتح نہیں ہو سکتا۔

۲۔ سرکار دو عالمؐ نے اسلام و کفر کے ہر مقابلہ میں دفاعی انداز اختیار کیا ہے کہ دشمن اپنے علاقہ کے قریب آجائے تو میدانِ جہاد میں قدم رکھیں۔ لیکن یہودیوں کے مقابلہ میں خیبر تک جانے کا ارادہ کر لیا اور تشریف لے گئے اور سارے مسلمان ساتھ گئے کہ سب کو احساس تھا کہ جنگی اقدامات کے لیے حالات پر نگاہ رکھنا ضروری ہے اور یہودی سازش

کا جواب اپنے علاقہ میں ان کا انتظار کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے علاقہ میں ان سے مقابلہ کرنا اور وہیں ان کی کمر کو توڑ دینا ہے۔

آج کے مسلمان اس طرزِ عمل سے بھی سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جہاد کے بجائے یہودیوں سے ذلت آمیز صلح کی تدبیریں نکال رہے ہیں بلکہ ان کے لیے علاقہ خالی کر کے اپنے علاقہ کو ان کے تسلط میں دے دینا چاہتے ہیں جو سرکار دو عالمؐ کے طرزِ عمل اور سنت و سیرت کی صریحی خلاف ورزی ہے۔

۳۔ قرآن مجید نے صریحی طور پر اعلان کیا ہے کہ یہودی تمنائے موت نہیں کر سکتے۔ ان کا کام موت سے فرار کرنا ہے موت کی آرزو کرنا نہیں ہے اور مسلمان ان یہودیوں سے بھی فرار کر رہے ہیں جن کی شان فرار کرنا ہے تو گویا یہ بھی قرآن مجید کے ارشادات سے کھلی ہوئی غفلت اور قرآن کی کھوکھلی اور بے جان تلاوت کا نتیجہ ہے۔

۴۔ استعمار کی قدیم ترین سازش یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلحوں میں اُلجھا دیا جائے، اور جہاد کی حقیقی روح 'ایمان واعتماد' سے محروم بنا دیا جائے۔ اسی لیے جب ایک مسلمان اسلحہ سے بے نیاز ہو کر میدانِ جہاد میں آگیا تو سب اس پر اعتراض کرنے لگے اور اس کی موت کو بھی گویا خودکشی کا درجہ دینے لگے۔ کفار کو اس سازش کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح ان کے اسلحے بکتے رہیں گے اور مسلمانوں کو یہ احساس رہے گا کہ ہمارے پاس اسلحے انھیں سے خریدے ہوئے ہیں اور اُن کے پاس خود اپنے بنائے ہوئے ہیں لہٰذا ان سے مقابلہ ممکن نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خریدا ہوا مال، صاحبِ مال کے مال کے برابر نہیں ہو سکتا اور مقابلہ ممکن نہیں ہے تو مسلمانوں کا سرمایہ ضائع و برباد کرنے اور اسے کفار کی جیب میں ڈالنے کا کیا فائدہ ہے؟ اور یہ خریداری کی دوڑ کیوں نہیں ختم ہو رہی ہے۔ صلح یا بیعت یا ضمیر فروشی کسی کام کے لیے اسلحہ کی خریداری کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر حال میں ہو سکتی ہے اس کے لیے صرف ایمان کی کمزوری کی ضرورت ہے اور وہ مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ سرکار دو عالمؐ نے انھیں حالات کو نگاہ میں رکھنے کے بعد فاتح خیبر کے صفات میں کرّاریت اور محبت خدا و رسولؐ جیسے اوصاف کا ذکر کیا تھا اور اسلحہ و فوج کا ذکر نہیں آنے دیا تھا کہ اس طرح روح اسلام کمزور نہ ہو جائے

اور مسلمان ایمان کے بجائے اسلحہ پر اعتماد نہ کرنے لگیں۔

۵۔ یہودیوں کا طریقہ کار یہ بھی رہا ہے کہ وہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتے ہیں اور اسلام اپنے علاقہ سے سیکڑوں میل دور جا کر مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے حوصلے کا اندازہ بھی ہو جائے اور دشمن کے حوصلے پست بھی ہو جائیں۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرزِ عمل سے بھی فائدہ نہیں اُٹھایا اور یہودیوں کا محاصرہ کرنے کے بجائے انھیں مزید قلعہ بنانے کے لیے زمین فراہم کرنے لگے۔ خدا اس اسلام اور اس امت اسلامیہ پر رحم کرے۔

ضرورت ہے آج اسلام کے احیاء اور روح اسلام کی تازگی کی کہ یہودیوں سے صحیح طریقہ سے مقابلہ کیا جائے، اس میں "کرار غیر فرار" کے پیرو لائے جائیں کہ اس کے بغیر یہ مقابلہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارا سلام ان مجاہدینِ اسلام پر جو اسلحہ سے بے نیاز ایمان کی طاقت سے یہودیوں کو پسپا کر رہے ہیں اور جن یہودیوں کے خوف سے "آہنی مردوں" نے اپنا علاقہ چھوڑ دیا تھا انھیں اپنے علاقہ سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مجاہدین اسلام زندہ باد، فاتح خیبر زندہ باد، یہودیت مردہ باد۔۔۔!

معراجِ رسولِ اکرمؐ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیؐ سے ہمیں
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

۲۷ رجب کی شب عالم اسلام میں وہ عظیم رات ہے جسے "شب معراج پیغمبرؐ" کہا جاتا ہے۔ معراج کی داستان قرآن مجید میں دو مقام پر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ سورۂ اسرا میں اور دوسری مرتبہ سورۂ والنجم میں ــــ بعض علمار کرام نے انھیں خصوصیات کے پیش نظر یہ راستہ اختیار کیا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کو کم از کم دو مرتبہ معراج ہوئی ہے۔ ایک کا حال سورۂ اسرا میں بیان ہوا ہے جس کا ظاہری سفر مسجد اقصیٰ پر تمام ہو گیا تھا اور دوسری کا تذکرہ سورۂ والنجم میں ہے جہاں سدرۃ المنتہیٰ اور قاب قوسین تک کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ یہ دو سفر ہوں اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک ہی سفر کے دو مرحلہ ہوں۔ ایک مرحلہ مسجد اقصیٰ پر تمام ہوا ہو، اور دوسرا مرحلہ مسجد اقصیٰ سے شروع ہوا ہو اور عرش اعظم پر تمام ہوا ہو۔ بہر حال صورت واقعہ کچھ بھی ہو، نہ سرکارؐ کی معراج میں کوئی شک ہو سکتا ہے اور نہ روایات کے پیش نظر تعدد معراج میں کوئی شک کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس معراج کا مقصد کیا تھا اور اس کے تذکرہ کی ضرورت کیا تھی!

" عرش نشین "پیغمبرؐ آسمان پر چلا گیا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور رب کریم نے اسے اپنی بارگاہ میں بلا لیا تو یہ کوئی جائے حیرت نہیں ہے اور اسے کچھ آیات اور نشانیاں بھی دکھلا دی گئیں تو یہ بھی بظاہر کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ حبیب اور محبوب کے درمیان کا مسئلہ ہے۔ وہ زندگی بھر وحی کے ذریعہ مخفی گفتگو کرتا رہا اور اس کے درمیان راز و نیاز کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا تو یہ اس کی محبت اور عنایت کا

تقاضا ہی تھا، اس سے امت کا کیا تعلق ہے؟ لیکن قرآن مجید میں اس تذکرۂ معراج کا محفوظ ہونا اور پھر مختلف مقامات پر محفوظ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ قدرت اس تذکرہ کو اہل دنیا تک پہونچانا چاہتی ہے اور اس کے ذریعہ عالم انسانیت کو درس زندگی دینا چاہتی ہے۔

علامہ اقبال نے تذکرۂ معراج سے یہ سبق لیا ہے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں ــــ لیکن اس زد میں آنے کا مقصد کیا ہے اور اس کا ماحصل کیا ہے اس کی وضاحت نہیں کی ہے اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے دور میں مسلمانوں کا جمود توڑنا چاہتے تھے اور ان میں خود اعتمادی اور خودی کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ذکر معراج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امت اسلامیہ کو ہوشیار کر دیا کہ بشر کا کام خاک سے وابستہ رہنا نہیں ہے۔ اس کا کام ارتقا ہے اور اس کی منزل بلند ہے۔ اس کا فرض اپنے کو اس طرح اونچا کرنا ہے جس طرح معراج مصطفیٰؐ نے اونچا ہونا سکھایا ہے۔

لیکن علامہ اقبال نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا کہ قرآن مجید نے بشریت کی معراج کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ قدرت نے ملائکہ کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ تم ایک مقام پر ٹھہر جاتے ہو اور بشر آگے نکل جاتا ہے ــــ بلکہ قدرت نے مقام محبت و محبوبیت کا بھی ذکر نہیں کیا ہے کہ یہ سب آثار محبت اور آثار محبوبیت ہیں ــــ اس نے تو اسریٰ بعبدہٖ کہہ کر مقام عبدیت کا اعلان کیا ہے کہ آج کا جانے والا اور عرش اعظم تک جانے والا، سید الملائکہ سے بہت آگے جانے والا، انبیار کرام کی امامت کرنے والا ایک عبد، بندۂ خدا ہے جس کا مقام عبدیت اس قدر بلند ہے کہ وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہے، تاکہ بندگانِ خدا میں شعور بندگی پیدا ہو اور وہ مقام عبدیت کو پہچانیں۔ انھیں اندازہ ہو کہ بندہ مقام بندگی میں کامل ہوتا ہے تو عرش و کرسی کی بلندی تک پہونچ جاتا ہے۔ چاہے صاحبِ معراج بن کر پہونچ جائے یا "لہجۂ گفتگو کا نمونہ بن کر پہونچ جائے، اور یہی وہ بات ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید کے لیے ضروری تھا کہ وہ رب العالمین کی "کتاب تربیت" ہے اور اس کے ذریعہ پروردگار نے اپنے بندوں کی فکری اور ذہنی تربیت کا انتظام کیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے دامن میں ایسے تذکرہ کو محفوظ رکھے جس سے مقام بندگی کی عظمت کا اندازہ ہو، اور انسان کا شعور بندگی بیدار ہو ــــ وہ بندۂ خدا بنے اور بندگانِ خدا میں شامل ہو جائے ورنہ سرکار دو عالمؐ کے لیے معراج میں جانا نہ کوئی کمال ہے نہ کوئی انوکھی بات کہ اس کے تذکرہ کو اس شد و مد کے ساتھ

بیان کیا جائے اور اسے مختلف مقامات پر تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا جائے۔ آیت اسرا نے معراج کے جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے ان کا خلاصہ بھی درج ذیل ہے:

۱۔ آیت اسرار کی ابتدار غیبت کے عنوان سے ہوئی ہے۔ "اسریٰ۔ بعبدہٖ" اور عبدیت کے مسجد اقصیٰ تک پہونچنے کے بعد تکلم کا عنوان پیدا ہوگیا ہے۔ "بَارَکْنَا۔ لِنُرِیَهٗ۔ آیَاتِنَا"۔ اس کے بعد جب سفر تمام ہوجاتا ہے اور تذکرۂ معراج بندگی ختم ہوجاتا ہے تو پھر لہجۂ اول واپس آجاتا ہے۔

اس انداز بیان میں یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ عبدیت کی معراج حقیقتاً خدا کا غیبت سے نکل کر منزل شہود و حضور میں آجانا ہے اور اس کے بغیر بندگی، بندگی کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

سورۂ حمد میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آغاز بیان میں خدا کی غائبانہ حمد ہے۔ اس کے بعد جب بندگی کا ذکر آیا تو لہجہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہوگیا، اور منزل شہود و حضور سامنے آگئی اور گویا خدائے غائب بندے کی نگاہوں کے سامنے آگیا، اور یہی بات مولائے کائنات نے اس وقت فرمائی تھی جب ذعلب یمانی نے سوال کیا تھا کہ یا علیؑ! کیا آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے جس کی بندگی کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تھا "کَیْفَ اَعْبُدُ رَبًّا لَمْ اَرَهٗ" میں اس خدا کی بندگی کیونکر کرسکتا ہوں جس کو دیکھا نہ ہو ـــ یعنی بندگی کا قوام حضور و شہود سے ہے، غائب کی بندگی نہیں ہوتی ہے۔ اَن دیکھی عبادت عبادت نہیں ہے۔ عبادت اور بندگی کی شان یہ ہے کہ معبود کا جلوہ نگاہوں کے سامنے رہے یہ اور بات ہے کہ اس کا مشاہدہ مادی آنکھوں سے نہیں ہوتا ہے وہ دل کی آنکھوں اور ایمان کے نور سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ معراج پیغمبرؐ نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ بندگی میں یہ صلاحیت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ آلات و اسباب کے بغیر آسمانوں کی طرف بلند ہوسکتی ہے۔ بندگی میں کمزوری ہوتی ہے تو آلات و اسباب تلاش کیے جاتے ہیں ـــ اور بندگی کامل ہوتی ہے تو عروج بشر آلات کا محتاج نہیں رہ جاتا۔ جنگ خیبر میں مولائے کائنات کا دوش ہوا پر بلند ہونا اسی معراج بندگی کا ایک نمونہ تھا اور علیؑ کے لیے یہ بھی کوئی کمال نہیں تھا کہ جو انسان دوش پیغمبرؐ پر بلند ہوسکتا ہے اس کے لیے دوش ہوا پر بلند ہونا کیا مقام رکھتا ہے۔

حکیم الٰہی نے حضرت عیسیٰ کے تذکرہ کے موقع پر فرمایا تھا کہ "اگر ان کا یقین اور زیادہ بلند ہوجاتا تو وہ پانی کے بجائے ہوا پر چلنے لگتے"۔ گویا کمالِ یقین کمالِ بندگی کی ایک نشانی ہے کہ جس کا جتنا یقین کامل ہوگا اتنا ہی اس کی بندگی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جب "لَوْ کُشِفَ" کی منزل آجائے گی تو ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہوجائے گی۔

۳۔ سفر معراج سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ عبدیت کے لیے زمان و مکان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بندہ کم سے کم وقت میں بھی طویل ترین فاصلہ طے کرسکتا ہے اور اس کی عظمت کے لیے مکہ و مدینہ کوئی منزل نہیں ہے۔ وہ زمین پر بھی رہ سکتا ہے اور آسمان پر بھی۔ مسجد الحرام میں بھی عبادت کرسکتا ہے اور مسجد اقصیٰ میں بھی۔ وہ زمین پر بھی امامت کرسکتا ہے اور بزم انبیاء میں بھی۔

۴۔ معراج نے اس حقیقت کو بھی واضح کردیا ہے کہ مسلمان کے لیے مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے رسولؐ نے ایک نماز مسجد الحرام میں ادا کی ہے، اور ایک مسجد اقصیٰ میں۔ مسجد اقصیٰ کی حیثیت قبلہ کی رہے یا نہ رہے اس کی عظمت معراج پیغمبرؐ کی نشانی ہے اور اس کا تحفظ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اسے یہودیوں کے حوالہ کردینے کی خفیہ سازش کرنا معراج پیغمبرؐ کی عظمت کا انکار اور سرکار دوعالمؐ سے کھلی ہوئی غداری ہے۔ ایسے غداروں کو نہ "مردِ آہن" کہا جاسکتا ہے نہ "مردِ مومن"۔ مرد مومن شعائر ایمان کا تحفظ کرتا ہے۔ شوقِ حکومت میں ایمان کا سودا نہیں کرتا ہے۔

۵۔ سرکار دوعالمؐ کا انبیاء کرام کو نماز پڑھانا علامت ہے کہ اسلام کے آنے کے بعد کسی قانون یا شریعت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب سب کو اسی ایک قانون کا اتباع کرنا ہے اور جملہ صاحبان شریعت کو اسی قانون کے تحت بندگی پروردگار کرنا ہے۔ بندگی بندگی ہے تو اس میں شخصیت کی گنجائش نہیں ہے۔

انبیاء کرام بھی اسی جذبہ کے تحت ماموین کی صفوں میں کھڑے ہوگئے کہ جب ہیں صاحب شریعت تھا تو اپنی شریعت کے مطابق بندگی کرتا تھا اور جب آخری صاحبِ شریعت آگیا تو اب اس کی شریعت کے مطابق بندگی کرنا ہوگی ـــ اور اس کا ایک نمایاں منظر اس دن دیکھنے میں آئے گا جب آخری شریعت کا وارث امام جماعت ہوگا اور حضرت عیسیٰ بن مریم اس کے پیچھے نماز ادا کررہے

ہوں گے۔

معراجِ پیغمبر کے سلسلہ میں یہ بات بھی تشنہ بیان نہ رہ جائے کہ سفر معراج کا سلسلہ جناب اُمّ ہانی بنت ابی طالبؑ کے گھر سے شروع ہوا ہے اور اس کے خاتمہ پر میزبانی یا ترجمانی کے فرائض علیؑ بن ابی طالبؑ نے انجام دیے ہیں اور مرسل اعظمؐ سے گفتگو انھیں کے لہجہ میں ہوئی ہے۔ یعنی معراج کی ابتدا اور انتہا دونوں میں ابوطالبؑ کی اولاد کا حصہ ہے۔ اب اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہوگی کہ انسان کی تاریخِ عظمت، عظمتِ پیغمبرؐ سے مل جائے اور اُس کے گھرانے کے تذکرہ کے بغیر تذکرۂ معراج رسولؐ بھی ناتمام رہ جائے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

سیرت النبی الاعظمؐ

اس وقت آپ کے سامنے آستان قدس امام رضا علیہ السلام کی طرف سے شائع کیے جانے والے ایک رسالے کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی سیرت مبارکہ پر لکھی جانے والی کتابوں کی مختصر فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس اشاعت کا مقصد ریسرچ اسکالرز کے لیے مطالعہ کی سہولت کا فراہم کرنا بھی ہے اور تفرقہ پرداز عناصر کی تردید بھی ہے۔ جن کا خیال ہے کہ ملت شیعہ نے سیرت پیغمبرؐ پر کوئی کام نہیں کیا ہے یا شیعوں کا عقیدہ معاذ اللہ نبوت مرسلِ اعظمؐ پر نہیں ہے۔ فہرست میں دونوں فریق کے علماء کی کتابوں کا تذکرہ ہے لیکن اہلِ نظر ان کے درمیان بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ علماء شیعہ نے روزِ اوّل سے سیرت و کردار مرسلِ اعظمؐ پر کس قدر کام کیا ہے اور کتنی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام کیا ہے۔

کتابوں کی فہرست کے ساتھ صفحات، طباعت، مصنف وغیرہ کی نشان دہی بھی کردی گئی ہے۔

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۔ آداب معاشرت محمدؐ	فارسی	۸۰	تہران	محسن فیض کاشانی
۲۔ الآثار النبویہ	عربی	۱۴۰	عیسیٰ البابی الحلبی	احمد تیموریان
۳۔ آمنہ مادر محمدؐ	فارسی ترجمہ	۱۰۰	تہران	ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۴۔ آئینۂ اسلام	فارسی ترجمہ	۲۰۶	تہران	طہٰ حسین
۵۔ احتجاجاتِ رسول اکرمؐ	عربی	۳۰۲	″	ابومنصور احمد طبرسی
۶۔ احمد موعود انجیل	فارسی	۲۲۰	″	جعفر سبحانی
۷۔ الحوار فی القرآن	عربی	۴۰۷	بیروت	محمد حسین فضل اللہ
۸۔ اخلاقِ محمدؐ	فارسی	۱۵۱	تہران	سید محمد جواد غزدی
۹۔ اخلاق و کردار محمدؐ	″	۷۶	قم	شیخ عباس قمی
۱۰۔ الدعوۃ والدولۃ	عربی	۳۴	کویت	.... دار التوحید
۱۱۔ الاذکار المنتخبہ	″	۳۷۶	مصر	یحییٰ بن شرف النووی
۱۲۔ الرسول یحدثنا	″	۵۶	تہران	ازطرف مسجد جامع
۱۳۔ از ہجرت تا وفات	فارسی	۱۳۷	″	علی شریعتی
۱۴۔ اسس الدعوۃ المحمدیہ	عربی	۸۶	نجف	مہدی البصری
۱۵۔ اشتراکیۃ محمدؐ	″	۳۵۰	بیروت	محمد شلبی
۱۶۔ اشعۃ من حیات الرسولؐ	″	۵۸	نجف	عبدالامیر قبلان
۱۷۔ اصحاب رسول اکرمؐ	فارسی ترجمہ	۱۶۱	تہران	محمد علی بحر العلوم
۱۸۔ الاعتذار	عربی ترجمہ	۱۹۲	″	ڈاڈیوپورٹ جان
۱۹۔ اعلام النبوۃ	عربی	۳۵۳	″	ابو حاتم الرازی
۲۰۔ اعیان الشیعہ	″	۶۴۸	بیروت	السید محسن الامین العاملی
۲۱۔ افق وحی	فارسی	۷۴۸	تہران	الحاج میرزا خلیل کمرہٗ
۲۲۔ افکار جاوید محمدؐ	فارسی ترجمہ	۲۱۹	″	محمد علی لاہوری
۲۳۔ رقیۃ النبی محمدؐ	عربی	۲۲۸۰	دار الکتب الحدیثہ	ناصح الدین الانصاری
۲۴۔ الاکتفا فی مغازی الرسولؐ	″	۴۹۵	قاہرہ	ابوالربیع الاندلسی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۲۵۔ انقلاب تکاملی اسلام	فارسی	۸۹۲	تہران	جلال الدین فارسی
۲۶۔ الانوار فی مولد النبیؐ	عربی	۲۵۸	نجف	ابوالحسن البکری
۲۷۔ الانوار المحمدیہ	″	۶۳۲	....	یوسف بن اسماعیل النبہانی
۲۸۔ الہجرۃ والقرآن	″	۱۵۰	تہران	دار التوحید
۲۹۔ ایضاح الانباء	فارسی	۸۳	تبریز	علی بن موسیٰ شفیع
۳۰۔ بازرگانی محمدؐ	″	۹۶	تہران	علی رضا ریحانی
۳۱۔ بانگ تکبیر	″	۲۳۹	″	حسینیہ ارشاد
۳۲۔ بحار الانوار	عربی	۸ جلد جدید	″	محمد باقر مجلسی
۳۳۔ بشارات عہدین	فارسی	۲۹۹	″	محمد صادقی
۳۴۔ بعثت و دولت	″	۴۸	″	مہدی بازرگان
۳۵۔ بعثت در اجتماع	″	۵۳	″	عبدالعلی بازرگان
۳۶۔ بعثت عاشورا	″	۲۸	″	محمد باقر بہبودی
۳۷۔ بین الجاہلیۃ والاسلام	عربی	۳۱۵	بیروت	محمد مہدی شمس الدین
۳۸۔ پندہائی گراں مایہ	فارسی	۶۴	تہران	ابوطالب تبریزی
۳۹۔ پیام	″	۴۳	″	میرزا زادہ نعمت
۴۰۔ پیامبر	″	۷۵۲	″	زین العابدین رہنما
۴۱۔ پیامبر اسلام	″	۲۵۵	قم	علی دوانی
۴۲۔ پیامبر اُمّی	″	۹۳	″	مرتضیٰ مطہری
۴۳۔ پیامبر در مکہ	″	۸۴	″	علی اکبر پرورش
۴۴۔ پیامبر و منافقین	″	۷۱	تہران	سیردس سعیدی
۴۵۔ پیامبر و آئین نبرد	″	۵۷۴	″	مصطفیٰ طلاس

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۴۶۔ پژوهشی درباره قرآن	فارسی	۳۵۶	تهران	فخرالدین حجازی
۴۷۔ پیشگوییهای محمدؐ	〃	۱۵۴	قم	ہادی خوئینی
۴۸۔ التاج الجامع	عربی	۵ جلد	مصر	منصور علی ناصف
۴۹۔ تاثیر شخصیت محمدؐ	فارسی	۲۱۸	تہران	محمد علی خلیلی
۵۰۔ تاریخ الائمہ	〃	۲۰۶	〃	واعظ تبریزی
۵۱۔ تاریخ النبی احمدؐ	عربی	۲۶۰	صیدا	حسن الحسینی اللواسانی
۵۲۔ تاریخ پیغمبر خاتم	فارسی ترجمہ	۲۸۴	تہران	〃
۵۳۔ تاریخ تمدن اسلام	فارسی	۴۰۰	〃	ہادی خاتمی بروجردی
۵۴۔ تاریخ تمدن	فارسی ترجمہ	۳۶۱	〃	ویل دورانٹ
۵۵۔ تاریخ جہاد خیبر	〃	۳۴	〃	جعفر جمال عبدالصاحب
۵۶۔ تاریخ شخصیت پیغمبرؐ	فارسی	۲۹۲	قم	عباس صفائی حائری
۵۷۔ تاریخ طبری	عربی	دو جلد	قاہرہ	محمد بن جریر طبری
۵۸۔ ترجمہ تاریخ طبری	فارسی	〃	تہران	ابوالقاسم پاینده
۵۹۔ تاریخ مجاہدات پیغمبرؐ	〃	۵۴۸	〃	عباس صفائی حائری
۶۰۔ تاریخ مطہر	〃	۱۴۸	〃	اکبر مظفری
۶۱۔ تاریخ مقدس	فارسی ترجمہ	۳۲۵	〃	اروِنگ واشنگٹن
۶۲۔ تاریخ منظوم	فارسی	۲۲۶	قم	علی دعوتی
۶۳۔ تاریخ نبوی	فارسی ترجمہ	۱۵۳	تہران	داریر بن یوسف
۶۴۔ تاریخ یعقوبی	عربی	۲۴۷	نجف	ابن واضح یعقوبی
۶۵۔ ترجمہ تاریخ یعقوبی	فارسی	۶۱۰	تہران	محمد ابراہیم آیتی
۶۶۔ تبلیغ پیغمبرؐ	〃	۳۸	〃	مہدی بازرگان

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۶۷۔ تنبیہ الانام	عربی	۲۴۲	مصر	عبدالجلیل بن عظوم
۶۸۔ تہذیب سیرۃ ابن ہشام	〃	۶۱۳	〃	عبدالسلام ہارون
۶۹۔ جلوہ ای از چہرہ محمدؐ	فارسی	۳۲۰	قم	مجتبیٰ موسوی کاشانی
۷۰۔ مجموعہ پیکار و بزم	〃	۵ جلد	〃	علی دوانی
۷۱۔ جوامع السیرۃ	عربی	۴۷۲	مصر	ابو محمد سعید بن حزم
۷۲۔ جہان در عصر بعثت	فارسی	۱۵۰	تہران	محمد جواد باہنر
۷۳۔ جیش اسامہ	عربی	۱۲۴	تہران	محمد بن حسن شیروانی
۷۴۔ چہل دستور جامع	فارسی	۱۴	تہران	نقل از مجموعہ درام
۷۵۔ حجۃ اللہ مع العالمین	عربی	۶۹۸	ترکیہ	یوسف بن اسماعیل نبہانی
۷۶۔ حجۃ الوداع	〃	۲۰۸	ہند لکھنؤ	محمد زکریا کاندھلوی
۷۷۔ حماسہ شہیداں	فارسی	۲۲۶	قم	ہادی راستباز
۷۸۔ حیات النبیؐ	اردو	۳۶۰	لاہور	نور حسین جنگ سیالوی
۷۹۔ حیات محمدؐ	ترکی	۲۲۶	استانبول	لطف احمد
۸۰۔ حیات محمدؐ	عربی	۶۲۴	مصر	محمد حسین ہیکل
۸۱۔ حیاتِ محمدؐ	عربی ترجمہ	۳۷۹	دارالاحیاء	عادل زعیتر
۸۲۔ حیات محمدؐ و رسالتہ	عربی	۳۰۲	بیروت	مولانا محمد علی
۸۳۔ حیاۃ القلوب	فارسی	۴۰۴	تہران	علامہ محمد باقر مجلسی
۸۴۔ خاتم النبیینؐ	〃	۳۴۹	〃	عباس شوستری مہرین
۸۵۔ 〃	عربی	۳۶۴	مصر	محمد خالد
۸۶۔ ختم نبوت	فارسی	۱۰۲	تہران	مرتضیٰ مطہری
۸۷۔ 〃	اردو ترجمہ	۷۹	راولپنڈی	محمد خالد فاروقی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۸۸۔ خاتمیت	فارسی	۲۳۹	تہران	علی امیر پور
۸۹۔ خاتمیت از دیدگاہ عقل	”	۲۷۲	”	جعفر سبحانی
۹۰۔ ہجرت محمدؐ	”	۹۵	”	علی قائمی
۹۱۔ خطوط اساسی سیاست	”	۳۹	”	ح ۔ خ
۹۲۔ خورشیدی کہ از مکہ طلوع کرد	”	۲۴۵	”	عبدالامیر فولاد زادہ
۹۳۔ داستانہائے از زندگی	فارسی ترجمہ	۱۷۰	”	ممتاز احمد پاکستانی
۹۴۔ در آستانہ ساغر ادہ پیغمبرؐ	فارسی	۳۰۴	”	محمود رامیار
۹۵۔ دراسۃ فی السیرۃ	عربی	۴۰۷	موسستہ الرسالۃ	عماد الدین خلیل
۹۶۔ الدرر	”	۳۵۲	قاہرہ	یوسف بن عبداللہ النمری
۹۷۔ در مکتب وحی	فارسی	۱۳۹	تبریز	جعفر سبحانی
۹۸۔ درود محمدیؐ	”	۲۳۶	تہران	حسن رضوی قمی
۹۹۔ دعوت محمدی	”	۲۷۴	”	عبدالمطلب اردو بادی
۱۰۰۔ دلائل الخیرات	عربی	۱۸۷		محمد بن سلیمان الجزولی
۱۰۱۔ دلائل النبوۃ	”	۵۶۶	حیدرآباد	ابونعیم احمد بن عبداللہ
۱۰۲۔ دو گواہ بزرگ	فارسی	۹۰	اصفہان	ابوالفضل میرلوحی
۱۰۳۔ دولت الرسولؐ	عربی	۳۲۴	کویت	احمد ابراہیم الشریف
۱۰۴۔ الدین و تاریخ الحرمین	”		مصر	عباس کرارہ
۱۰۵۔ راز بعثت	فارسی	۲۴۵	تہران	ابوتراب ہدائی
۱۰۶۔ راز بزرگ رسالت	”	۴۹۲	”	جعفر سبحانی
۱۰۷۔ راہ محمدؐ	فارسی ترجمہ	۳۴۴	”	عباس محمود عقاد
۱۰۸۔ الرسالۃ العلیہ	فارسی	۵۰۶	”	کمال الدین کاشفی بہشتی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۰۹۔ الرسالۃ الکاملۃ	عربی ترجمہ		آکسفورڈ	علاء الدین علی بن نفیس
۱۱۰۔ رسالت محمدیہ	فارسی	۲۳۲	تہران	محمد عباس الموسوی
۱۱۱۔ الرسالۃ المحمدیۃ	عربی	۸۶	مصر	محمد کامل
۱۱۲۔ رسول اکرم در میدان جنگ	فارسی	۲۰۰	تہران	محمد حمید اللہ
۱۱۳۔ رسول الاسلام	عربی	۲۷۲	بیروت	محمد صادقی
۱۱۴۔ الرسول القائد	”	۳۵۹	بغداد	محمود شیث
۱۱۵۔ الرسول محمدؐ	عربی ترجمہ	۳۲۱	مصر	محمد فروخ
۱۱۶۔ رشحۃ الرسول	فارسی	۹۴	ایران	میرزا ضیاء الدین ندیم ہاشمی
۱۱۷۔ الرسول فی المدینۃ	عربی	۲۷۹	مصر	علی حسنی الخربوطلی
۱۱۸۔ کتاب الوصف	”	۵۵۹	کویت	محمد بن محمد بن عبداللہ
۱۱۹۔ الروض الانف	”	۲ جلد ضخیم	بیروت	ابوالقاسم
۱۲۰۔ زمان پیغمبرؐ	فارسی ترجمہ	۲۷۹	تہران	عائشہ بنت الشاطی
۱۲۱۔ زمان پیغمبر اسلامؐ	فارسی	۴۴۴	”	حسین عماد زادہ
۱۲۲۔ زمان صدر اسلام		۱۴۲	”	محمد علی بحر العلوم
۱۲۳۔ زندگانی پیامبر		۵۲۳	تہران	علی اکبر خدیو محسنی
۱۲۴۔ زندگانی حضرت محمدؐ		۱۵۳	”	غلام رضا سعیدی
۱۲۵۔ ” ”		۷۲	”	عبداللہ نوبخت
۱۲۶۔ ” ”		۱۰۸	”	کاظم آل نوح
۱۲۷۔ ” ”		۱۲۳	”	س ۔ نظام زادہ
۱۲۸۔ زندگانی رہبر عالم		۳۱	”	محمد جوہری
۱۲۹۔ زندگانی محمدؐ		۱۰۲	”	محسن جاویدان

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۳۰۔ زندگانی محمدؐ	فارسی ترجمہ	۳۱۰	تہران	کارلائل
۱۳۱۔ " "	"	۴۴۷	"	عبدالملک بن ہشام
۱۳۲۔ " "	"	دوجلد	"	محمد حسین ہیکل
۱۳۳۔ " "	فارسی	۷۳	"	محمد علی خلیلی
۱۳۴۔ زندگانی پیشوائے اسلام	"	۴۶۴	"	حسین عمادزادہ اصفہانی
۱۳۵۔ زندگی نامہ حضرت محمدؐ	"	۷۲	"	شرکت نسبی
۱۳۶۔ زندگی و آئین محمدؐ	"	۳۲۷	"	حسین خراسانی
۱۳۷۔ زبدۃ التواریخ	"	۱۹۱	"	محمد جواد نجفی
۱۳۸۔ سبیل الہدیٰ والرشاد	عربی	۳ جلد	قاہرہ	محمد بن یوسف الصالحی
۱۳۹۔ زندگی و آئین محمدؐ	فارسی	۳۲۷	تہران	ابوالقاسم پائندہ
۱۴۰۔ سرگزشت پیغمبران	"	۱۷۹	"	ابوتراب صفائیؒ
۱۴۱۔ سعادۃ الدارین	عربی	۷۲۶	—	—
۱۴۲۔ سلام بر بعثت	فارسی	۱۴۴	تہران	عظیم صاعدی
۱۴۳۔ سیرۃ الرسولؐ	عربی	۴۴۳	مصر	محمد احمد
۱۴۴۔ السیرۃ الحلبیۃ	"	۴۴۹	"	حلبی شافعی
۱۴۵۔ سیرت در صحیحین	فارسی	۴۱۳	قم	محمد صادق نجفی
۱۴۶۔ سنن النبیؐ	عربی، فارسی	۳۱۱	تہران	محمد حسین طباطبائیؒ
۱۴۷۔ السیرۃ المعطرۃ	عربی	۴۱۱	قاہرہ	خیرالدین عبدالعزیز
۱۴۸۔ سیرۃ المصطفیٰ	"	۷۴۷	بیروت	ہاشم معروف الحسینی
۱۴۹۔ السیرۃ النبویۃ	"	۴ جلد	مصر	عبدالملک بن ہشام
۱۵۰۔ " "	"	"	قاہرہ	ابوالفداء اسماعیل بن کثیر

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۵۱۔ سیرت رسول اکرمؐ	فارسی	۷۱	تہران	محمد باقر سنگلجی
۱۵۲۔ سیمائے رسول اللہؐ	"	۳۵۶	"	مرتضیٰ
۱۵۳۔ سیمائے محمدؐ	عربی انگریزی	۹۳	"	علی شریعتی
۱۵۴۔ نثار گل محمدیؐ	فارسی شعر	۱۵۲	مشہد	فاطمہ محبوبی
۱۵۵۔ شخصیت محمدؐ	فارسی	۲۴۱	تہران	منصور پویا
۱۵۶۔ شخصیت و سیرت رسول اکرمؐ	فارسی ترجمہ	۳۴	"	ڈاکٹر فضل الرحمٰن
۱۵۷۔ شرح حالات نبی خاتم	"	۲۹۵	"	سید حسن لواسانی نجفی
۱۵۸۔ شرح سفر السعادۃ	فارسی	۵۸۴	—	عبدالحق دہلوی
۱۵۹۔ شرح الصلوٰت	،	۲۴۷	—	احمد بن محمد الحسینی
۱۶۰۔ شرح کلمات قصار	فارسی	۳۷۶	تہران	یکے از علماء قرن ہفتم
۱۶۱۔ الشفاء	عربی	۲۷۱	—	قاضی ابوالفضل عیاض
۱۶۲۔ شفاء الاسلام	"	۲۵۰	حیدرآباد	تقی الدین السبکی
۱۶۳۔ شارع ولی	فارسی	۱۱۶	تہران	علی دوانی
۱۶۴۔ شمائل شریف	عربی	۱۲۹	—	ابوعیسیٰ ترمذی
۱۶۵۔ شہداء الاسلام	"	۳۲۵	—	علی سامی النشار
۱۶۶۔ صفوای از تاریخ صدر اسلام	فارسی	۱۴۹	تہران	علی جواہر الکلام
۱۶۷۔ صورٌ من حیاۃ الرسولؐ	عربی	۶۴۵	مصر	امین دریدار
۱۶۸۔ الصلوات علی النبیؐ	"	۲۴۸	قاہرہ	محمد اسماعیل ابراہیم
۱۶۹۔ طب النبی	"	۲۲	—	محمود بن محمد چغمینی
۱۷۰۔ الطبقات الکبریٰ	"	دوجلد	سیڈن	محمد بن سعد واقدی
۱۷۱۔ الطریقۃ المحمدیہ	"	۲۲۳	قاہرہ	زین الدین برکوی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۷۲۔ طلعت حق	فارسی	مجلدات	تہران	احسان اللہ استخری
۱۷۳۔ حلیۃ الغراء	عربی	۱۰۴	بیروت	یوسف بن اسماعیل النبہانی
۱۷۴۔ ظہور محمد مصطفیٰؐ	فارسی	۲۴۱	تہران	حسین رفیع پور
۱۷۵۔ عبقریۃ محمد عربیؐ	عربی	۱۵۸	مصر	عباس محمود العقاد
۱۷۶۔ عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ	فارسی ترجمہ	۲۶۳	تہران	غلام رضا سعیدی
۱۷۷۔ عشرۂ ایام	عربی	۲۱۶	مصر	محمد خالد
۱۷۸۔ عصر النبیؐ	”	۸۵۲	بیروت	محمد عزت
۱۷۹۔ عظمۃ الرسولؐ	”	۳۸۹	قاہرہ	محمد عطیہ الابراشی
۱۸۰۔ فتح مکہ	فارسی	۷۴	تہران	خلیل کمرہ ای
۱۸۱۔ فتح مبین	”	۳۰۱	-	محمد عزیز اللہ صفی پور
۱۸۲۔ فروغ ابدیت	”	۹۴۸	قم	جعفر سبحانی
۱۸۳۔ فروغ بینش	عربی، فارسی، انگریزی	۵۸۶	تہران	ابو القاسم حالت
۱۸۴۔ فلسفۃ الہجرت	عربی	۲۰۸	بیروت	دار الصادق
۱۸۵۔ فلسفۂ تاریخ محمدؐ	”	۲۵۵	”	محمد جمیل
۱۸۶۔ فی خطیٰ محمد	”	۴۷۱	”	سلہب نصری
۱۸۷۔ قصۃ المولد	”	۱۸۲	تونس	محمد طاہر بن محمد شاذلی
۱۸۸۔ کارنامہ سیاسی اجتماعی و اخلاقی	فارسی	۳۰۱	تہران	مصطفیٰ زمانی
۱۸۹۔ الکامل فی التاریخ	عربی	۵۶۹	بیروت	علی بن ابی الکرم ابن کثیر
۱۹۰۔ کحل البصر	”	۱۵۱	قم	عباس قمی
۱۹۱۔ کردار و گفتار محمد	فارسی ترجمہ	۲۴۹	تہران	خواجہ کمال الدین
۱۹۲۔ کشف الغمہ	عربی	۶۰۳	”	علی بن عیسیٰ الاربلی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۱۹۳۔ کلمات محمدؐ	فارسی، عربی	۵۶	تہران	محمد جواد مشکوٰۃ
۱۹۴۔ گنجینۂ گہر	”	۲۲۳	”	محمد جواد صافی گلپایگانی
۱۹۵۔ المجازات النبویہ	عربی	۴۶۹	قم	سید الشریف الرضی
۱۹۶۔ مجموعہ نفیسہ	”	۵۴۵	”	شہاب الدین مرعشی نجفی
۱۹۷۔ المحجۃ البیضاء	”	۳۸۴	تہران	ملا محسن فیض کاشانی
۱۹۸۔ محمدؐ المثل الکامل	”	۴۲۴	مصر	محمد احمد جاد المولیٰ بک
۱۹۹۔ محمدؐ پیامبر خاتم	فارسی	۴۸	تہران	ترجمہ ہادی دستباز
۲۰۰۔ محمدؐ پیامبر خدا	”	۴۴۹	”	” ”
۲۰۱۔ محمدؐ پیامبر شناختہ شدہ	”	دو جلد	قم	محمد علی انصاری
۲۰۲۔ محمدؐ پیامبر و سیاستدار	فارسی ترجمہ	۳۰۵	تہران	مترجم اسماعیل والی زادہ
۲۰۳۔ محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت	فارسی	۴۰۸	”	ذبیح اللہ منصوری
۲۰۴۔ محمدؐ خاتم پیمبران	”	دو جلد	”	جماعت مولفین
۲۰۵۔ محمدؐ در نظر دیگران	فارسی ترجمہ	۱۰۸	”	کاظم نوح
۲۰۶۔ ملحمۂ اہل بیتؑ	عربی	۲۹۹	بیروت	عبد المنعم الفرطوسی
۲۰۷۔ محمدؐ رسول اللہ	فارسی	۵۱۰	تہران	محمد صبیح فتحی رضوان
۲۰۸۔ ” ”	عربی	۲۰۴	قاہرہ	احمد تیموریان
۲۰۹۔ ” ”	”	۳ جلد	تہران	دار التوحید
۲۱۰۔ ” ”	”	۵۱۵	مصر	محمد رشید رضا
۲۱۱۔ ” ”	فارسی	۱۴۹	تہران	علی جواہر کلام
۲۱۲۔ ” ”	عربی	۲۶۷	مصر	مترجم سلیمان بن ابراہیم
۲۱۳۔ ” ”	فارسی	۲۲۲	تہران	ذبیح اللہ قدیمی رضوانی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۲۱۴۔ محمدؐ ستارہ ای کہ در مکہ درخشید	فارسی	۲۸۲	تہران	سا داری۔ م
۲۱۵۔ محمدؐ فرستادۂ خدا	فارسی ترجمہ	۱۸۴	〃	مولانا محمد علی
۲۱۶۔ محمدؐ قدوۃٌ و اسوۃٌ	عربی	۷۹	〃	محمد تقی مدرسی
۲۱۷۔ محمدؐ ناپلیون اسماء	عربی ترجمہ	۱۲۱	بیروت	مترجم محمد صالح البنداق
۲۱۸۔ محمدؐ والقرآن	عربی	۲۲۲	بغداد	کاظم آل نوح
۲۱۹۔ محمدؐ و تعلیمات عالیہ اسلام	فارسی	۱۶۳	تہران	حسین کاظم زادہ ایران شہر
۲۲۰۔ محمدؐ و زمامداران	〃	۳۲۸	قم	احمد صابری ہمدانی
۲۲۱۔ محمدؐ و مکتب درخشانش	〃	۱۴۴	تہران	محمد جواد واعظی سبزواری
۲۲۲۔ مدائن الفضائل و المعاجز	عربی	۳۹۱	〃	علی بن الحسن اصفہانی نجفی
۲۲۳۔ مسئلہ وحی	فارسی	۱۱۴	〃	مہدی بازرگان
۲۲۴۔ مطلع النور	عربی	۱۸۳	بیروت	عباس العقاد
۲۲۵۔ مظاہر محمدی	فارسی ترجمہ	۲۳۶	تہران	توفیق الحکیم
۲۲۶۔ مع المصطفیٰ	عربی	۳۲۴	بیروت	عائشہ بنت الشاطی
۲۲۷۔ المعراج	〃	۱۳۵	قاہرہ	عبدالکریم بن ہوازن
۲۲۸۔ المغازی	〃	تین جلد	لندن	محمد بن عمر واقدی
۲۲۹۔ مفاہیم القرآن	〃	۳۹۲	قم	جعفر سبحانی
۲۳۰۔ مکاتیب الرسولؐ	〃	۶۰۸	بیروت	علی بن حسین بن علی الاحمدی
۲۳۱۔ ملخص السیرۃ النبویہ	〃	۱۸۰	مکتبۃ السعادۃ	السید علی الشافعی
۲۳۲۔ ملف خاص بالہجرۃ	〃	۹۴	لبنان	نشریہ المنطلق
۲۳۳۔ مناقب آل ابی طالب	〃	۳۲۴	قم	محمد بن علی ابن شہر آشوب
۲۳۴۔ منتہی الآمال		۵۱۱	تہران	عباس قمی

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۲۳۵۔ المواہب اللدنیہ	عربی	۲ جلد	الطبقۃ الشرفیہ	احمد بن محمد بن ابی بکر القسطلانی
۲۳۶۔ موسوعہ آل النبیؐ	〃	۹۶۷	بیروت	عائشہ بنت الشاطی
۲۳۷۔ المولد النبوی الشریف	〃	۶۵	نجف	جعفر نقوی
۲۳۸۔ مولد النبیؐ	〃	۲۳	دمشق	سید محسن عاملی
۲۳۹۔ ناسخ التواریخ	فارسی	۴ جلد	قم	میرزا محمد تقی سپہر لسان الملک
۲۴۰۔ نبردہای محمدؐ	〃	۳۰۰	تہران	نصرت اللہ بختور تاش
۲۴۱۔ نبی الرحمۃ محمدؐ	عربی	۱۱۴	نجف	السید جعفر البشر الحسینی
۲۴۲۔ النبی محمدؐ	〃	۴۶۳	بیروت	عبدالکریم الخطیب
۲۴۳۔ نخستین معصوم	فارسی	۳۲۳	تہران	جواد فاضل
۲۴۴۔ نغمۂ اسیری	〃	۱۵۹	تبریز	عبدالرحیم طالب
۲۴۵۔ مجلۃ الاضواء	عربی	۱۴۴	نجف	مقالات
۲۴۶۔ نعت رسولؐ	فارسی	دیوان	تہران	ضیاء الدین
۲۴۷۔ نگرش کوتاہ بہ زندگی پیامبر اسلام	〃	۲۲۷	قم	نویسندگان در راہ حق
۲۴۸۔ نہج الفصاحہ	فارسی ترجمہ	۳۵۵		ابوالقاسم پائندہ
۲۴۹۔ نہج الہدایت	〃	۱۲۴	تہران	مترجم خطیب
۲۵۰۔ الوحی المحمدی	عربی	۳۳۵	مصر	محمد رشید رضا
۲۵۱۔ وحی محمدی	فارسی ترجمہ	۳۸۰	تہران	مترجم محمد علی
۲۵۲۔ وفاء الوفاء	عربی	۶۵۹	بیروت	نور الدین السمہودی
۲۵۳۔ وقائع السنین والاعوام	فارسی	۶۴۰	تہران	حسینی خاتون آبادی
۲۵۴۔ ہادیٔ عالمؐ	اردو	۳۱	لاہور	قاضی عبدالحمید قریشی
۲۵۵۔ ہجرۃ الرسولؐ الی عرب الانصار	عربی	۲۴۷	قاہرہ	عبدالدائم الانصاری

نام کتاب	زبان	صفحات	طباعت	مؤلف
۲۵۶۔ ہجرت ضرورت جاوداں تکامل	فارسی	۱۴۴	قم	علی منذر
۲۵۷۔ ہدی النبیؐ	عربی	۲۵۹	مصر	نورالدین محشر
۲۵۸۔ ہذا رسول اللہؐ	″	۸۸	نجف	مجتبی الحسینی
۲۵۹۔ ہمسران رسول خداؐ	فارسی	۹۵	قم	عقیقی بخشائشی

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی میں بے شمار کتابیں ہیں ـــ جو سرکار دو عالمؐ کی حیات طیبہ سے متعلق لکھی گئی ہیں جن کی مکمل فہرست مرتب کی جائے تو ایک ہزار سے زیادہ یقینی ہو جائے گی ـــ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ عالم اسلام میں اس سے اہم تر موضوع کیا ہو سکتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا جائے اور امت اسلامیہ کے لیے ایک لائحہ عمل اور دستور حیات تیار کیا جائے۔

حقیر کے قلم سے بھی اس موضوع پر چند رسالے اور کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ رب کریم سے التماس ہے کہ اس خدمت کے دوام و استمرار کی توفیق کرامت فرمائے۔

والسّلام علی من اتبع الھدیٰ

نقشِ

حیات حضرت علیؑ بن ابی طالب

ولادت ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل

شہادت ۲۱ رمضان ۴۰ھ

نقشِ زندگانی حضرت امیر المومنین علیہ السّلام

۳۰ عام الفیل جب سرکارِ دو عالمؐ کی عمرِ مقدس ۳۰ سال کے قریب تھی اور اعلان رسالت کے لمحات قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اسلام کو ایک عظیم مددگار اور رسول اکرمؐ کو دعوت دین کے لیے ایک بے نظیر موید کی ضرورت تھی ـــ رب العالمین نے جناب ابوطالب کو ایک ایسا فرزند عنایت فرمایا جس کی ولادت کا انداز تمام دوسری اولاد سے بالکل مختلف تھا۔ اب تک تمام فرزند اپنے گھر میں پیدا ہو رہے تھے یہاں تک کہ خود سرکارِ دو عالمؐ کی ولادت بھی شعب ابی طالب میں ہوئی تھی ـــ لیکن جب اس فرزند کی ولادت کا وقت قریب آیا تو جناب فاطمہ بنت اسد نے محلہ یا خاندان کی عورتوں کو مدد کے لیے طلب کرنے کے بجائے خود خانۂ خدا کا رُخ کیا اور بروایت یزید بن قعنب اپنے شکم اقدس کو دیوارِ کعبہ سے مَس کر کے دعا کی کہ "خدایا میں تجھ پر اور تیرے رسولوں پر اور تیری کتابوں پر ایمان رکھتی ہوں۔ میں اپنے جد ابراہیم خلیلؑ کی تصدیق کرنے والی ہوں۔ تجھے اس گھر، اس کے بانی اور اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے میری اس مشکل کو آسان کر دے"۔ جس کے بعد دیوارِ کعبہ شگافتہ ہو گئی اور جناب فاطمہ بنت اسد خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہو گئیں اور جناب ابوطالب کے اس عظیم فرزند کی ولادت ہوئی۔ جناب فاطمہ تین دن خانۂ کعبہ میں مقیم رہیں اور آخر میں باہر آئیں تو رسول اکرمؐ استقبال کے لیے آئے اور بچہ کو گود میں لیا تو بچہ نے آنکھیں کھول دیں فرمایا کہ "تو نے اپنی نگاہوں کے لیے میرا انتخاب کیا ہے اور میں نے اپنے علم کے لیے تیرا انتخاب کیا ہے ـــ اور اس طرح بنت اسد کے ایمان، ابوطالب کے شرف، فرزند کے کمالات اور نبوت کے اعزاز کا مکمل اعلان ہو گیا۔

ابتدائی طور پر ماں نے حیدر نام پسند کیا، باپ نے اسد قرار دیا اور اہلِ خاندان نے زید نام رکھنا چاہا لیکن ابوطالب کی دعا پر آسمان سے ایک تختی نازل ہوئی جس پر مرقوم تھا کہ "اس کا نام

نامِ خدا پر علیؑ رکھو، تاکہ نامِ خدا کی برکت سے اس کی بلندی برقرار رہے اور اس کی بقا سے نام خدا کی بقا وابستہ رہے"۔

ـ آپ کے القاب بے شمار ہیں جن میں عالمِ اسلام کا پسندیدہ ترین لقب "کرّم اللہ وجہہ" ہے، جو اس امر کی علامت ہے کہ عالمِ اسلام میں آپ کی تنہا ذات گرامی ہے جس نے بُتوں کے آگے سجدہ نہیں کیا۔ اور خود مولائے کائنات کا محبوب ترین لقب "ابو تراب" تھا۔ جس سے آپ کی عظمت اور خاکساری دونوں کا اظہار ہوتا تھا۔

تربیت کا کام خانۂ کعبہ ہی سے رسول اکرمؐ نے سنبھال لیا تھا اور وہی خانۂ خدا سے لے کر گئے تھے جب کہ بظاہر ابوطالب کو خبر بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد آپ نے مسلسل اپنے ساتھ رکھا اور اپنے کمالات کا مخزن و مصدر قرار دیتے رہے یہاں تک کہ اپنے کو شہرِ علم اور علیؑ کو اس کا دروازہ قرار دیدیا۔ ـــ معنوی رشتہ کے علاوہ بھی ابوطالب کے قلیل المال اور کثیر العیال ہونے کی بنا پر جب ان کی اولاد کی کفالت کا کام تقسیم کیا گیا تو آپ نے علیؑ کو اپنے حصہ میں لے لیا اور اس طرح شب و روز اپنے ساتھ رکھا اور کبھی "رزقنی رسول اللہ رزقاً" کا مرقع پیش کیا اور کبھی "کنت اتبعه اتباع الفصیل لامه" کا منظر نمایاں کیا۔

رسول اکرمؐ کے زیرِ سایہ دس سال گذر گئے تو وحی الٰہی نے بعثت کا اعلان کرایا ـــ اور اب رسول اکرمؐ کو واقعاً ایک مددگار کی ضرورت پیش آئی۔ اُدھر جناب ابوطالب نے اپنی اولاد جعفر اور علیؑ دونوں کو یہ تاکید کر رکھی تھی کہ منزلِ عبادت میں بھی اپنے ابن عم کا ساتھ نہ چھوڑیں اور دونوں فرزند برابر باپ کی نصیحت پر عمل کرتے رہے۔

تین سال کی خفیہ تبلیغ کے بعد جب اہلِ عشیرہ و قبیلہ کو دعوت دینے کا حکم آیا تو رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو ہی حکم دیا کہ دعوت کا انتظام کریں اور قبیلہ والوں کو مدعو کریں۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے اس فرض کو انجام دیا اور ۴۰ افراد کو مدعو کر لیا۔ کھانے کے بعد جب پیغام پیش کرنے کا وقت آیا تو ابوجہل نے جادوگری کا شاخسانہ چھیڑ دیا اور بھاگنے لگے۔ آپ نے دوسرے دن کے لیے پھر مدعو کر دیا اور آخرکار اپنا اعلان پیش کر دیا جس کے لیے ناصر و مددگار کا مطالبہ بھی کیا اور وصایت و وزارت کا وعدہ بھی کیا لیکن کسی نے بھی ساتھ نہ دیا صرف حضرت علیؑ نے تائید و تصدیق کا اعلان کیا جس پر آپ نے ان کی وصایت

وہ وزارت و خلافت کا پہلا اعلان کر دیا اور ابوطالب کو ان کے احسانات کا پہلا صلہ مل گیا۔

واضح رہے کہ اس دعوت اول میں نہ اسلام کے مشہور و معروف افراد دعوت دینے والوں میں تھے اور نہ شرکت کرنے والوں میں ___ اور نہ تائید و تصدیق کرنے والوں میں ___ یہ تو تاریخ کی کرامت ہے کہ جن کا کہیں وجود نہ تھا۔ وہ ذمہ داریِ اسلام میں اول ہو گئے اور جس نے سب سے پہلے اس بوجھ کو سنبھالا تھا اسے آخر بنا دیا گیا اور آخر بھی صحیح معنوں میں نہیں تسلیم کیا گیا۔

اس کے بعد عمومی دعوت کا مرحلہ سامنے آیا تو علیؑ حسب وعدہ رسول اکرمؐ کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ شعب ابی طالب کی سہ سالہ زندگی میں بھی ابوطالب کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ رات کے وقت رسولؐ کو ہٹا کر ان کی جگہ پر علیؑ کو لٹا دیتے تھے تاکہ شب کے وقت حملہ ہو جائے تو میرا بیٹا قربان ہو جائے لیکن رسول اکرمؐ کو کوئی نقصان نہ پہونچے اور اس طرح فداکاری اور جاں نثاری علیؑ کی زندگی کا امتیاز بن گئی اور قدرت نے ابوطالبؑ کی وفات کے بعد بھی شب ہجرت تک اسی انداز قربانی کو برقرار رکھا اور اپنے رسولؐ کو اسی انداز سے بچایا جس کی طرح روز اول ابوطالب نے ڈالی تھی اور جو طریقہ تاریخ میں ابوطالب کے اولیات میں شامل تھا۔

شعب ابی طالبؑ کی تین سالہ مسلسل زحمتوں کے نتیجہ میں سنہ ۱۰ بعثت میں ابوطالب نے انتقال فرمایا، جن کے انتقال پر رسول اکرمؐ نے جنازہ میں شرکت بھی کی اور نوحہ بھی پڑھا اور ان کے احسانات کا تذکرہ بھی کرتے رہے۔ اور حضرت علیؑ کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا کہ باپ کا کام بھی فرزند ہی کے ذمہ آ گیا اور حضرت علیؑ اسے بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔ اُدھر جناب خدیجہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ جو اسلام کی پہلی محسنہ اور خواتین میں پہلی مومنہ اور حضرت علیؑ کے ساتھ نماز جماعت میں شرکت کرنے والی پہلی عبادت گذار خاتون تھیں۔

پیغمبرؐ کے دو مددگاروں کے ایک ساتھ انتقال کر جانے کے بعد قدرت نے ہجرت کا حکم دے دیا اور سنہ ۱۳ بعثت میں رسول اکرمؐ نے مکہ سے مدینہ کا رُخ کیا۔ اس موقع پر حکم خدا سے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا دیا اور وہ رات بھر چین سے تلواروں کی چھاؤں میں سوتے رہے جس سونے کو خدا نے اپنی مرضی کے عوض خرید لیا اور حضرت علیؑ کو تاریخ میں ایک نیا امتیاز حاصل ہو گیا۔

رسول اکرمؐ کی ہجرت کے بعد حضرت علیؑ نے تمام کفار کی امانتوں کو واپس کیا اور فاطمہؑ

بنت پیغمبرؐ، فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر جیسی محترم خواتین کا قافلہ لے کر مدینہ کی طرف چلے۔ راستہ میں کھسیائے ہوئے کفار نے مزاحمت کی اور آپ نے شدید مقابلہ کر کے اپنے کو رسول اکرمؐ تک پہونچا دیا۔

اُدھر رسول اکرمؐ مدینہ کے باہر آپ کا انتظار کر رہے تھے اور آپ کے بغیر مدینہ کے محاذ پر تبلیغ کا کام نہیں شروع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ کے آنے کے بعد اسلام کی پہلی مسجد کی تعمیر کا کام انجام پایا جو حضرت علیؑ کے ہاتھوں انجام پایا اور خدا کے فضل سے تمام مسلمان اس میں نماز ادا کرنے کو بہترین کار خیر تصور کرتے ہیں اور ابھی تک اسے کسی تعصب کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔

مدینہ میں مستقر ہونا تھا کہ کفار مکہ کی طرف سے مزاحمت شروع ہو گئی اور آپ نے جواب دینا شروع کر دیا لیکن بڑا معرکہ بدر کے میدان میں پیش آیا جہاں مدینہ سے تقریباً ۷۰ میل دور لشکر اسلام میں ۳۱۲ نہتے افراد تھے اور لشکر کفار میں ۹۵۰ مسلح سپاہی۔ رات کے وقت مسلمان پیاسے ہوئے تو بدر کے کنویں سے پانی لا کر سارے لشکر کو آپ ہی نے سیراب کیا جس پر جبرئیل و میکائیل و اسرافیل نے ایک ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور آپ کو سلام کیا۔

۱۷ رمضان سنہ ۲ھ کو یہ معرکہ پیش آیا تو جنگ کے خاتمہ پر ۷۰ کفار قتل ہوئے اور ۷۰ اسیر ہوئے۔ ان مقتولین میں سے ۳۵ تنہا حضرت علیؑ کے مارے ہوئے تھے اور ۳۵ کے قتل میں آپ کی امداد شامل تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ فرشتوں کی امداد کا وعدہ نہ ہو جاتا تو شائد کوئی ثابت قدم نہ رہ سکتا۔

بدر کی فتح کے بعد قدرت نے علیؑ کو اس عظیم کارنمایاں کا انعام دیا اور یکم ذی الحجہ کو حضرت علیؑ کا عقد جناب فاطمہؑ سے ہو گیا۔ جن کی خواستگاری کرنے والے بڑے بڑے صحابۂ کرام بھی تھے لیکن قدرت نے فیصلہ کر دیا کہ نور کا عقد صرف نور سے ہو سکتا ہے اور پھر رسول اکرمؐ نے فرما دیا کہ علیؑ نہ ہوتے تو آدم و غیر آدم میں کوئی میری بیٹی فاطمہؑ کا ہمسر نہ ہوتا۔ یہ نورانی رشتہ زمین پر بھی انجام پایا اور عرش اعظم پر بھی انجام دیا گیا۔

مہر کے سلسلہ میں رسول اکرم کے مطالبہ پر علیؑ نے اپنی زرہ بیچ کر زہراؑ کا مہر ادا کیا اور رسول اکرمؐ نے اسی مہر میں سے ۶۳ درہم کا سامان جہیز خرید کر اپنی بیٹی کو رخصت کر دیا اور اسلام میں شادی کا

بہترین تصور اور سادگی کا عظیم ترین مرقع سامنے آگیا جس پر کسی بھی غریب اور فقیر کو اسلامی نظام سے شکوہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نبی کریم کی بیٹی کا مہر ۵۰۰ درہم ہو سکتا ہے تو دوسرے شخص کو زیادہ مہر کے مطالبہ کا کیا حق ہے؟ اور اگر نبیؐ کا داماد ۶۳ درہم کے جہیز پر گزارا کر سکتا ہے جو اسی کے مہر سے خریدا گیا ہے تو دوسرے کسی داماد کو فرمائشیں کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا نبیؐ کی بیٹی سے عظیم تر کسی کی بیٹی یا نبی کے داماد سے بالاتر کسی کا بھی داماد ہو سکتا ہے؟

سنہ ۳ھ میں کفار نے بدر کی شکست کا بدلہ لینے کا پروگرام بنایا اور تین ہزار کے لشکر سے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؑ اور چند دیگر مخلص اصحاب نے میدان احد فتح کر لیا تھا لیکن بعض اصحاب کی طمع دنیا اور مخالفت رسولؐ نے جنگ کا نقشہ بدل دیا اور صورت حال اتنی خراب ہو گئی کہ رسول اکرمؐ کا چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا اور مسلمان اپنے پیغمبرؐ کو چھوڑ کر احد کی پہاڑیوں پر اُچکنے لگے۔ صرف دو تین افراد تھے جو جان کی بازی لگائے رہے اور حضرت حمزہ و مصعب جیسے افراد کی شہادت کے بعد تنہا حضرت علیؑ دفاع کرتے رہے اور آخر میں انھوں نے ہی دختر پیغمبر حضرت فاطمہ زہراؑ کی مدد سے رسول اکرمؐ کے زخموں کے علاج کا انتظام کیا۔ اس جنگ میں شہادت کی سعادت حضرت حمزہؑ کو نصیب ہوئی کہ آپ سید الشہداء قرار پائے، اور فتح کا سہرا حضرت علیؑ کے سر بندھا کہ وہ تنہا مدافع رسولؐ قرار پائے۔ معاویہ کی ماں اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جناب حمزہ کی لاش کے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ رسول اکرمؐ مدتوں روتے رہے

انفرادی طور پر شکست کے بعد کفار نے یہودیوں سے مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا اور اس طرح سنہ ۵ھ میں جنگ احزاب پیش آئی۔ رسول اکرمؐ نے مدینہ کے گرد سلمانؓ کے مشورہ سے خندق تیار کرا دی لیکن چند سربراہان کفار خندق پار کر کے آگئے اور لشکر اسلام پر غضب کا ہراس طاری ہو گیا۔ حضرت عمرؓ عمرو بن عبدود کی تعریف کر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے لگے اور باقی اصحاب نے سر اٹھانے کا بھی ارادہ نہیں کیا لیکن حضرت علیؑ نے میدان میں عمرو کا مقابلہ کر کے اسے تہ تیغ کر دیا اور رسول اکرمؐ نے اس ضربت کو ثقلین کی عبادت سے زیادہ وزنی قرار دے دیا کہ اس وقت اسلام و کفر کا معرکہ تھا اور کل ایمان کل کفر کی زد پر تھا۔ رب العالمین نے امداد کی اور کل ایمان نے کل کفر پر غلبہ حاصل کر لیا۔

شوال سنہ ۶ھ میں جنگوں سے قدرے فرصت پانے کے بعد مسلمانوں کے تقاضے پر رسول اکرمؐ نے ذی قعدہ سنہ ۶ھ میں عمرہ کا ارادہ کیا اور کفار مکہ کو اطلاع کر دی کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے مکہ میں داخلہ سے روک دیا اور رسول اکرمؐ بھی اس امر پر راضی ہو گئے کہ عمرہ آئندہ سال انجام دیں گے اور صلح نامہ مرتب کر کے واپس تشریف لے آئے۔ صلح نامہ کی کتابت کا کام بھی حضرت علیؑ ہی نے انجام دیا اور اسلام کا معرکۂ قلم بھی انھیں کے ہاتھوں سر ہوا، جب کہ اس صلح کی ظاہری کمزوری کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کو رسول اکرمؐ کی رسالت میں بھی شک ہو گیا تھا اور بمشکل تمام حضرت ابوبکرؓ کے سمجھانے سے بات سمجھ میں آئی کہ عام طور سے انھیں اسلامی حقائق انھیں کے بیان کے بعد سمجھ میں آتے تھے۔

سنہ ۷ھ میں مدینہ سے نکالے ہوئے یہودیوں نے خیبر کے یہودیوں سے مل کر سازش کی، اور اسلام سے انتقام لینے کا پروگرام بنایا تو رسول اکرمؐ خیبر کے یہودیوں کی سرکوبی کے لیے مقام خیبر تک پہونچ گئے اور قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ دو تین دن تک حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ زور آزمائی کرتے رہے لیکن میدان سے فرار کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا تو رسول اکرمؐ نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ "کل اُسے علم دوں گا جو مرد میدان، کرار غیر فرار اور محب و محبوب خدا و رسولؐ ہو گا۔" دوسرے دن علم لشکر حضرت علیؑ کے حوالے کیا اور انھوں نے حارث و عنتر و مرحب جیسے پہلوانوں کا خاتمہ کر کے خیبر کو فتح کر لیا اور ہمیشہ کے لیے فاتح خیبر قرار پا گئے۔

خیبر کی فتح کے بعد فتوحات کی جملہ قسمیں مکمل ہو گئیں اور اسلام نے کفر، شرک، یہودیت سب کو شکست دے دی تو ذی قعدہ سنہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کا پروگرام بنا اور رسول اکرمؐ ایک بڑی جماعت کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت علیؑ نے مکہ خالی کرایا اور مسلمانوں نے باقاعدہ طور پر عمرہ ادا کیا اور سکون کے ساتھ واپس چلے گئے۔

سنہ ۸ھ میں مکہ میں رسول اکرمؐ کے حلیف بنی خزاعہ کے ایک فرد کو عین حرم خدا میں قتل کر دیا گیا تو آپ اپنے حلیفوں کی فریاد پر دس ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہو گئے۔ رمضان سنہ ۸ھ میں روانگی عمل میں آئی اور مکہ پہونچ کر آپ نہایت شان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے اس طرح کہ احساس شکست و ذلت نے ابوسفیان و معاویہ جیسے افراد کو مسلمان بنا دیا اور آپ نے خانۂ خدا میں نماز ادا کرنے کے بعد حضرت علیؑ

کو اپنے کاندھوں پر بلند کر کے طاقِ کعبہ سے تمام بُت گروا دیے اور اس طرح حضرت "شاہِ بُت شکن" قرار پا گئے۔

۱۰ شوال ۸ھ کو جنگ حنین پیش آئی جس میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی جس کی بنا پر ان میں غرور فتح پیدا ہو گیا لیکن آخر میں سب نے فرار اختیار کیا اور بہ مشکل تمام واپس آئے تو ۷ کفار قتل ہوئے اور چار مسلمان اور اس فتح کا سہرا بھی حضرت علیؑ ہی کے سر رہا ورنہ میدانِ جنگ صحابۂ کرام سے خالی ہو چکا تھا۔

۹ھ میں ہرقل روم کی تیاریوں کی خبر پا کر آپ نے تمام مسلمانوں کو جہاد کا حکم دے دیا اور عظیم قافلہ لے کر نکل پڑے۔ لیکن چونکہ آپ کے علم میں تھا کہ دشمن میں مقابلہ کا حوصلہ نہیں ہے اور جنگ کی نوبت نہ آئے گی اس لیے حضرت علیؑ کو مدینہ میں چھوڑ دیا اور یہ تاریخی اعلان کر دیا کہ "تمھارا وہی مرتبہ ہے جو موسیٰ کے لیے ہارون کا تھا صرف میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے"۔

تبوک کی اس بلا جنگ کامیابی کے بعد تبلیغ سورۂ برأت کا مرحلہ پیش آیا، جس کام پر پہلے حضرت ابوبکرؓ مامور ہوئے۔ اس کے بعد وحی الٰہی نے انھیں واپس کر کے یہ کام حضرت علیؑ کے سپرد کیا اور انھوں نے حج اکبر کے موقع پر برأت مشرکین کا اعلان کر دیا جو علیؑ والوں کا آج تک شعار ہے اور جس سے تمام مسلمان حکام خوف زدہ رہتے ہیں۔

۹ھ حج کے موقع پر اس اعلان کے بعد ۲۴ ذی الحجہ کو نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کی نوبت آگئی کہ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر اصرار کیا اور قرآن کا کوئی پیغام ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے تو رسول اکرمؐ نے بحکم خدا مباہلہ کی دعوت دے دی اور آپ نسائنا میں حضرت فاطمہؑ، ابنائنا میں حسنؑ و حسینؑ اور انفسنا میں حضرت علیؑ کو لے کر روانہ ہوئے جس کو دیکھ کر عیسائیوں نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا اور اسلام اپنی آخری فتح سے ہمکنار ہو گیا۔

۲۵ ذی قعدہ ۱۰ھ کو رسول اکرمؐ حجۃ الوداع کے لیے روانہ ہوئے اور لاکھوں مسلمانوں نے آپ کے ساتھ حج کیا اور واپسی میں بحکم خدا مقامِ غدیر پر قافلہ کو روک کر حضرت علیؑ کی ولائیت کا اعلان کر دیا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے، جس پر تمام اصحاب نے بیعت کی اور حضرت عمرؓ نے مبارکباد دی کہ آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے مولا ہو گئے۔

اس واقعہ سے پہلے رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو اہلِ یمن کی طرف تبلیغی مشن پر روانہ کیا تھا جہاں آپ نے ایک دن میں سارے قبیلہ ہمدان کو مسلمان بنا لیا تھا اور وہیں سے حجۃ الوداع کے لیے قربانی کے جانور لے کر آئے تھے اور رسول اکرمؐ کے قافلہ میں شامل ہوئے تھے۔

آخر وقت میں رسول اکرمؐ نے ایک لشکر رومیوں سے مقابلہ کے لیے تیار کیا اور اسامہ بن زید کو تمام صحابہ کا سردار بنا کر اعلان کر دیا کہ جو لشکر اسامہ میں نہ جائے گا اس پر خدا کی لعنت ہو گی۔ اس سرداری سے صرف حضرت علیؑ کو الگ رکھا گیا تھا کہ انھیں اپنے سے جُدا کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا باقی حضرت ابوبکر و عمر جیسے تمام افراد کو بھی اسامہ کی سرداری میں دے دیا تھا۔

اس کے بعد رسول اکرمؐ کے مرض الموت کی شدّت شروع ہو گئی اور آپ نے وقت آخر حضرت علیؑ کی آغوش میں سر رکھ کر دنیا سے رحلت فرمائی۔

حضرت علیؑ ہی نے آپ کے غسل و کفن کا انتظام کیا اور اپنے ہاتھوں سے دفن کیا جب کہ بقول ابوالفدا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ شریک بھی نہیں ہوئے اور سقیفہ سازی میں مصروف رہے۔

حضرت علیؑ تجہیز و تکفین رسولؐ میں مصروف تھے کہ مسلمانوں نے سقیفہ میں جمع ہو کر بہ عجلت خلافت کا فیصلہ کر لیا اور غدیری اعلان کو نظر انداز کر کے حضرت علیؑ کو ان کے واقعی حق سے محروم کر دیا جس کے بعد آپ خانہ نشین ہو گئے۔

خانہ نشینی کے بعد آپ نے پہلا کام یہ انجام دیا کہ قرآن مجید کو اس کے تنزیلی اشارات اور توضیحات کے مطابق جمع فرمایا اور دربار خلافت میں پیش کیا کہ جس طرح الفاظ میں اختلاف نہیں ہے معانی میں بھی اختلاف نہ رہنے پائے لیکن ہوا خواہانِ تفسیر بالرائے نے ان توضیحات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور امت اسلامیہ ایک بہت بڑے علمی ذخیرہ سے محروم ہو گئی۔

رسول اکرمؐ کے ۷۵ یا ۹۵ دن کے بعد حضرت علیؑ کی شریک حیات حضرت فاطمہؑ نے انتقال فرمایا اور وہ اس عالم میں دنیا سے رخصت ہوئیں کہ حکومتی سازش کی بنا پر باپ کے ترکہ سے محروم ہو چکی تھیں، پہلو شکستہ ہو چکا تھا اور محسن شہید ہو چکے تھے۔ حضرت علیؑ نے اس سخت ترین مصیبت کا بھی نہایت درجہ صبر و شکیبائی سے مقابلہ کیا اور تلوار نہیں اٹھائی، صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ رسول اکرمؐ کے بعد زہراؑ کا فراق دلیل ہے کہ دنیا میں کسی دوست کے لیے بقا نہیں ہے۔

حضرت علیؑ حالات کے پیش نظر ۲۵ سال تک خانہ نشین رہے اور مسلمان یکے بعد دیگرے

حکام سازی کرتے رہے اور کسی موقع پر بھی صحیح معنوں میں حضرت علیؑ کو ان کا حق نہیں دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ برابر حکامِ وقت کی مدد کرتے رہے اور انھیں نیک مشورہ دیتے رہے اور کسی ایسے اقدام میں کوتاہی نہیں کی جس میں اسلام اور امتِ اسلامیہ کی بھلائی ہو، یا جس میں شریک نہ ہونے سے اسلام کی رسوائی کا خطرہ ہو۔

حضرت عمر نے اپنے آخری وقت میں خلافت کا فیصلہ ایک خاص کمیٹی کے حوالے کر دیا جس نے مخصوص اسباب کے تحت آپ سے سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا اور آپ نے اس مطالبہ کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ سیرتِ رسولؐ کے بعد کسی سیرت کی ضرورت نہیں ہے اور اس طرح عثمانؓ اس شرط کو قبول کر کے خلیفہ ہو گئے اور حضرت عمر کا منصوبۂ شوریٰ مکمل ہو گیا۔

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ اپنی اقربا پروری اور بنی امیہ نوازی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیے گئے اور مسلمانوں کے ایک گروپ نے ان کی ناانصافیوں کے خلاف علم احتجاج بلند کر کے انھیں خانہ قید کر دیا اور آخر کار تہ تیغ کر دیے گئے۔ اس محاصرہ کے دوران حضرت علیؑ ہی ان کے لیے پانی کا بندوبست کرتے رہے۔ جس کا انتقام اس طرح لیا گیا کہ کبھی انھیں قاتلِ عثمانؓ قرار دیا گیا اور کبھی ان کی اولاد پر پانی بند کر دیا گیا کہ انھوں نے عثمانؓ کو پانی فراہم کر کے گویا بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

قتلِ عثمانؓ کے موقع پر حضرت عائشہ مکہ میں تھیں اور انھوں نے بار بار مسلمانوں کو ان کے قتل پر آمادہ بھی کیا تھا کہ ان کی مثال نعثل یہودی کی جیسی ہے اور انھوں نے سنتِ رسولؐ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے قتل کے بعد خلافت طلحہ یا زبیر کو مل جائے گی۔ لیکن جب انھیں راہِ مکہ میں یہ معلوم ہوا کہ خلافت حضرت علیؑ کو مل گئی ہے تو فوراً نعرہ تبدیل کر دیا اور فرمایا عثمان مظلوم مارے گئے ہیں اور ان کے خون کا انتقام ضروری ہے۔ قاتل ہونے کا الزام حضرت علیؑ پر لگایا گیا اور ان سے جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

بصرہ حضرت علیؑ کے چاہنے والوں کا مرکز تھا لہٰذا حضرت عائشہ نے پہلے اس مرکز پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور تیس ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہو گئیں۔ ۲۵ جمادی الثانیہ ۳۶ھ کو بصرہ پہونچ کر حضرت علیؑ کے گورنر عثمان بن حنیف پر حملہ کر دیا اور انھیں بے حد اذیت دی یہاں تک کہ سر اور داڑھی کے بال

تک نوچ ڈالے۔ امیر المومنینؑ ربیع الاول میں روانہ ہو چکے تھے لیکن عائشہ کا لشکر پہلے پہونچ گیا، اور آپ مقام ذی قار پر تھے جب جناب عثمانؓ نے آکر فریاد کی اور آپ نے ۱۵ جمادی الثانیہ کو بیس ہزار لشکر کے ساتھ بصرہ میں نزول فرمایا۔ ادھر طلحہ و زبیر نے راتوں رات آپ کے قتل کا منصوبہ بنا کر حملہ کر دیا جس کے بعد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے متعدد ذرائع سے عائشہ کو سمجھایا اور طلحہ و زبیر کو بھی نصیحت کی کہ حرمِ رسولؐ کو سرِ میدان لے آنا اسلامی غیرت کے منافی ہے لیکن کسی فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا، اور بالآخر ایسا رن پڑا کہ نتیجہ میں تیرہ ہزار عائشہ کے سپاہی اور پانچ ہزار حضرت علیؑ کے مجاہدین کام آئے اور بعض مجاہدین نے ناقہ کے پاؤں کاٹ دیے اور ہودج زمین پر آرہا۔ آپ نے نہایت درجہ احتیاط سے انھیں سنبھالنے کا انتظام کیا اور چالیس خواتین سپاہیوں کے ساتھ محمد بن ابی بکر کی سرکردگی میں انھیں مدینہ واپس پہونچا دیا جس کا احساس انھیں زندگی بھر رہا اور حضرت علیؑ کی شرافت کا برابر تذکرہ کرتی رہیں۔ جمل کے فتح ہو جانے کے بعد آپ نے ۱۶ رجب ۳۶ھ کو ابن عباس کو بصرہ کا گورنر بنا کر واپسی کا قصد فرمایا اور عراق کے خطرہ کے پیشِ نظر کوفہ کو مستقل دار الحکومت قرار دے دیا۔

اُدھر جنگ جمل کے زیر اثر موقع سے فائدہ اٹھا کر معاویہ نے بھی شام میں بغاوت کا اعلان کر دیا اور حضرت کے گورنر سہل بن حنیف کو نکال باہر کر دیا۔ انھوں نے حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے فہمائش کے خطوط لکھے لیکن کوئی اثر نہ ہوا تو معاویہ کی سرکوبی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شوال ۳۶ھ میں ۹۰ ہزار کا لشکر لے کر آپ مقام رقہ پر پہونچے ادھر ایک لاکھ ۲۰ ہزار کا لشکر معاویہ کا تھا۔ معاویہ کے لشکر نے صفین میں دریا پر قبضہ کر کے پانی بند کر دیا۔ حضرت علیؑ نے جوابی کارروائی کا حکم دے دیا اور لشکر نے دریا کو واپس لے لیا تو فرمایا کہ خبردار! تم پانی بند نہ کرنا، لیکن مزاحمتوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ محرم ۳۷ھ آگیا اور جنگ موقوف ہو گئی۔ اس کے بعد صفر کے شروع ہوتے ہی لشکر شام نے پھر حملہ کر دیا اور گھمسان کی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ایک ہفتہ تک جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ لشکر شام کے ۲۵ ہزار افراد اور لشکر حضرت علیؑ کے تقریباً اس سے آدھے افراد کام آگئے۔ اور عمرو عاص جیسے افراد نے اپنے کو برہنہ کر کے جان بچانے کی تدبیر نکالی اور بے حیائی کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو گیا۔

اس درمیان وہ قیامت خیز رات بھی آئی جسے لیلۃ الہریر کہا جاتا ہے اور جس میں تمام رات جنگ جاری رہی اور طرفین کے ۳۶ ہزار افراد مارے گئے۔ خود حضرت علیؑ نے اپنے دست مبارک سے ۹۰۰ افراد کو واصل جہنم کیا اور مالک اشتر معاویہ کے خیمہ تک پہونچ گئے۔ قریب تھا کہ معاویہ کا خاتمہ ہو جائے اور جنگ اپنے آخری فیصلہ سے ہمکنار ہو جائے کہ عمرو عاص نے پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر دیے کہ ہم قرآن سے فیصلہ چاہتے ہیں اور اس طرح لشکر حضرت علیؑ میں پھوٹ پڑ گئی اور ایسے جاہل افراد بھی پیدا ہو گئے جو اہل بیتؑ کے مقابلہ میں قرآن کو استعمال کرنے پر راضی ہو گئے اور مجبوراً حضرت علیؑ کو عزت قرآن کی خاطر جنگ موقوف کرنا پڑی۔ اور عوام الناس نے باہمی تحکیم کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت علیؑ کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری کو مقرر کیا گیا اور معاویہ کی طرف سے عمرو عاص کو۔ دونوں حَکَم ماہِ مبارک میں ایک مقام پر جمع ہوئے اور ابو موسیٰ نے عمرو عاص کے چکر میں آکر منبر پر جاکر اعلان کر دیا کہ میں علیؑ کو معزول کرتا ہوں، قوم اپنا حاکم خود منتخب کرلے اور عمرو عاص نے اعلان کر دیا کہ جب علیؑ کو ان کے نمائندہ نے معزول کر دیا ہے تو میں معاویہ کا تقرر کرتا ہوں اور اس طرح عوامی انتخاب کا نتیجہ معاویہ کی حاکیت کی شکل میں سامنے آگیا اور اس قرآن کا دور دور تک ذکر نہیں آیا جس سے فیصلہ کرانے کے لیے جنگ کو روکا گیا تھا۔

حضرت علیؑ کی فوج کے ایک حصہ نے جنگ کو موقوف کرکے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ایک حصہ جنگ جاری رکھنے پر مصر تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب فیصلہ غلط ہو گیا تو اس حصہ نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور ۱۰ شوال ۳۷ھ کو مقام نہروان پر لوگوں کو ستانا شروع کر دیا حضرت علیؑ نے ان کی سرکوبی کے لیے نہروان کا رُخ کیا اور بغداد سے چار فرسخ کی دوری پر یہ معرکہ پیش آیا۔ ابتدا میں باغی بارہ ہزار کی تعداد میں تھے، بعد میں انتشار پیدا ہو گیا اور صرف چار ہزار رہ گئے۔ لیکن حضرت نے ایسا حملہ کیا کہ نو ۹ افراد کے علاوہ سب قتل کر دیے گئے، یہاں تک کہ مشہور خارجی ذوالثدیہ بھی کام آگیا اور یہ جنگ بھی اپنے خاتمہ کو پہونچ گئی۔

اُدھر معاویہ نے مصر میں حضرت علیؑ کے گورنر محمد بن ابی بکر پر حملہ کا پروگرام بنایا اور حضرت علیؑ کو اطلاع ملی تو آپ نے مالک اشتر کو کمک کے لیے روانہ کر دیا۔ معاویہ نے مقام عریش کے ایک زمیندار سے بیس سال کے خراج کی معافی کا وعدہ کرکے افطار کے بہانے مالک اشتر کو زہر دلوا دیا،

اور وہ شہید ہو گئے اور مصر پر عمرو عاص نے چھ ہزار کی فوج کے ساتھ حملہ کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر محمد بن ابی بکر کو گدھے کی کھال میں رکھ کر زندہ جلوا دیا جس کا صدمہ حضرت عائشہ کو زندگی بھر رہا اور وہ ہر نماز میں معاویہ اور عمرو عاص کے حق میں بد دعا کرتی رہیں، اگرچہ معاویہ نے اس واقعہ پر بے حد مسرت کا اظہار کیا (طبری، مسعودی) یہ واقعہ صفر ۳۸ھ کا ہے۔

صفین کے بے پناہ قتل و خون کے بعد معاویہ کی مکاریوں سے تحکیم کا فیصلہ اور اس کے بعد محمد بن ابی بکر اور مالک اشتر کا قتل، یہ وہ واقعات تھے جنھوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کر دیا کہ معاویہ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کریں اور اس سلسلہ میں آپ نے لشکر فراہم کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے لشکر میں ۴۰ ہزار تجربہ کار سپاہی اور ۱۷ ہزار رنگروٹ تھے۔ امام حسینؑ، قیس بن سعد اور ابو ایوب انصاری ۱۰-۱۰ ہزار کے لشکر کے سردار تھے لیکن لشکر کی روانگی سے پہلے ہی ابن ملجم ملعون نے عین حالت سجدہ میں آپ کو شہید کر دیا، اور یہ منصوبہ مکمل نہ ہو سکا جس طرح کہ حیات پیغمبرؐ کا آخری معرکہ (سریہ اسامہ بن زید) اصحاب کی نافرمانی کی بنا پر نامکمل رہ گیا تھا۔

ابن ملجم کے اس ظالمانہ اقدام کی یہ تاریخی توجیہ کی گئی ہے کہ خوارج حضرت علیؑ، معاویہ اور عمرو عاص تینوں سے ناراض تھے اور انھوں نے تینوں کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا اور ایک شخص کو شام، ایک کو مصر اور ایک کو کوفہ روانہ کیا تھا لیکن اتفاق سے معاویہ اس دن نماز صبح میں نہیں آیا اور عمرو عاص حملہ سے بچ گیا صرف حضرت علیؑ شہید ہو گئے اور پھر مزید افسانہ یہ تراشا گیا کہ ابن ملجم کو اچانک ایک عورت مل گئی اور اس نے علیؑ کے سر اقدس کو اپنی قربت کی قیمت قرار دے دیا، اور اس کا یہ اقدام اس جنسی بنیاد پر وقوع پذیر ہو گیا۔ لیکن اس داستان کا رُخ صاف بتا رہا ہے کہ یہ حملہ حضرت علیؑ کے حملے کو روکنے کے لیے معاویہ کی سازش سے کیا گیا تھا اور ایسی زبردست تلوار اور ایسا قیامت خیز زہر اور ایسی حسین و جمیل عورت کا وسیلہ سب اسی کا فراہم کیا ہوا ساز و سامان تھا اور اس طرح حضرت علیؑ کے قتل کی تمام تر ذمہ داری شام کے حاکم پر ہے۔ اگرچہ اس کا براہ راست مجرم ابن ملجم ہے اور بالواسطہ وہ تمام افراد ہیں جنھوں نے معاویہ جیسے بے دین انسان کو اسلام کا بے لگام حاکم بنا دیا تھا۔

ماہ مبارک ۴۰ھ کی ۱۹ تاریخ تھی جب حضرت علیؑ مسجد میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور

ایک مرتبہ آپ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کی طرف رُخ کرکے فرمایا، بیٹا اس مہینے کے کتنے دن گذر چکے ہیں؟ عرض کی ۱۲ دن۔ پھر دوسرے فرزند امام حسینؑ کی طرف رُخ کیا اور فرمایا، کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ عرض کی ۱۷ دن۔ فرمایا اب وہ وقت قریب آگیا ہے جب میرے محاسن میرے خون سے رنگین ہوں۔

ماہ مبارک کی ۱۹ ویں شب تھی جب آپ اپنی دختر حضرت ام کلثوم کے یہاں افطار پر مدعو تھے۔ افطار کے بعد تمام شب مصروف عبادت رہے اور بار بار باہر آکر آسمان کی طرف دیکھتے رہے، یہاں تک کہ فرمایا کہ واللہ یہ وہی شب ہے جس کی رسول اکرمؐ نے خبر دی ہے اور یہ کہہ کر نماز صبح کے لیے برآمد ہوئے۔ دروازہ پر مرغابیوں نے بھی روکا اور زنجیر در نے بھی۔ لیکن آپ قضائے الٰہی کا حوالہ دے کر مسجد میں تشریف لے گئے۔ اذان سے سارے کوفہ کو بیدار کیا۔ نماز شروع کی تو ابن ملجم ملعون نے سر اقدس پر وار کر دیا اور سر زخمی ہو گیا۔ مصلیٰ پر بیٹھ گئے "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" کا اعلان کیا اور "بسم اللہ وباللہ و فی سبیل اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ" کا ورد کرتے رہے۔

ادھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ مسجد میں وارد ہوئے تو آپ نے امام حسنؑ کو نماز پڑھانے کا حکم دے دیا۔ نماز کے بعد فرزندوں کے ہاتھوں پر بیت الشرف تک آئے۔ دو دن علاج کا سلسلہ جاری رہا۔ اس درمیان ابن ملجم گرفتار ہو کر آیا تو قانون اسلامی کے مطابق قصاص کا فیصلہ کرکے اس کی سیرابی کا حکم دے دیا اور اکیسویں کی رات میں وصیت تمام کرکے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے حسب وصیت پدر غسل و کفن کا انتظام کیا اور ظہر کوفہ (جسے نجف کہا جاتا ہے) کے اس مقررہ مقام پر دفن کر دیا جو حضرت نوحؑ کے دور سے طے ہو چکا تھا۔ ملائکہ آسمان نے دفن میں کمک کی، روح رسولؐ نے استقبال کیا اور آخرکار جو کعبہ سے لے کر آیا تھا اسی کے حوالے کر دیا۔

ایک مدت تک قبر مطہر مخفی رکھی گئی اور صرف مخصوص افراد زیارت سے مشرف ہوتے رہے۔ ہارون رشید کے دور میں بادشاہ شکار کے لیے نکلا، اور شکاری کتا ایک مقام پر ٹھہر گیا اور اس نے ہرن کا تعاقب ترک کر دیا، تو اس نے اطراف کے افراد سے تحقیق کی اور انھوں نے بتایا کہ یہاں ایک ولی خدا حضرت علیؑ کی قبر ہے اور اس طرح قبر کا اعلان ہو گیا جس کے بعد مسلسل روضہ کی تعمیر و ترقی

ہوتی رہی اور آج تک یہ روضہ مرجع خلائق بنا ہوا ہے اور انشاء اللہ صبح قیامت تک بنا رہے گا۔

رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو شہر علم کا دروازہ بنایا تھا تو شیخ طوسیؒ نے یہاں حوزہ علمیہ قائم کر دیا اور تقریباً ۱۰۵۰ برس سے یہ مدرسہ قائم ہے اور دینی تعلیم کے اعتبار سے کائنات کا سب سے عظیم ترین ادارہ ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل افراد روسائے مذہب اور مراجع تقلید بنتے رہے اور یہ سلسلہ بحمد اللہ آج تک جاری ہے۔

خصوصیات

یوں تو ہر انسان کی زندگی میں کچھ خصوصیات پائے جاتے ہیں اور وہی اس کی شخصیت کی علامات ہوتے ہیں لیکن حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو انفرادیت کا حامل نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ کھانے پینے سے لے کر عبادات تک ہر مقام پر آپ کی شخصیت ایک انفرادی خصوصیت کی حامل ہے اور اس کا شریک دنیا کا کوئی دوسرا صاحب کردار نہیں ہے۔ ذیل میں صرف چند امتیازات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جسے "مشتِ نمونہ از خروارے" سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی ہے:

- غذا کے اعتبار سے ہمیشہ جَو کا آٹا نوش فرماتے رہے اور کبھی گندم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جَو کے آٹے میں بھی یہ ہدایت تھی کہ اسے چھانا نہ جائے اور اپنی اصلی حالت میں استعمال کیا جائے۔

آدَمُ قَدْ اَكَلَ الْحِنْطَةَ وَاللّٰهُ نَهٰى
وَعَلِيٌّ تَرَكَ الْاَكْلَ لِقَصْدِ الْقُرْبِ

- لباس کے اعتبار سے خلافت اسلامیہ کے مل جانے کے بعد بھی پیوند دار لباس پہنتے رہے۔ یہاں تک کہ خود فرمایا کرتے تھے کہ اب تو رفو کرنے والے سے بھی شرم آتی ہے۔
- مکان کے اعتبار سے ساری زندگی مکان کا انتظام نہ کر سکے اور کوفہ میں بھی ایک عاریت کے مکان میں دور خلافت گزار دیا۔
- معیشت کے اعتبار سے بیت المال کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور ہمیشہ اپنے زور بازو

کی کمائی پر گذارہ کرتے رہے۔

کارناموں کے اعتبار سے۔ روزِ اول دعوتِ ذوالعشیرہ کا اہتمام کرنے والے اور رسول اکرمؐ کی تصدیق کرنے والے آپ ہی تھے۔

● ہجرت کی رات اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر رسول اکرمؐ کی جان بچانے والے آپ ہی تھے اور آپ ہی نے امانتوں کو واپس کرکے وقارِ رسالت کا تحفظ کیا تھا۔

● غارِ ثور میں قیام کے دوران رسولِ اکرمؐ اور ابوبکرؓ کے لیے آب و غذا کا انتظام آپ ہی کیا کرتے تھے۔

● بدر کے معرکہ میں آپ ہی کی تلوار چمکتی رہی اور ۷۰ مقتولین میں سے ۳۵ کو تن تنہا آپ ہی نے تہ تیغ کیا تھا۔

● احد کے معرکہ میں سب کے فرار کر جانے کے بعد آپ ہی کا اعلان تھا کہ میں ایمان کے بعد کفر اختیار نہیں کر سکتا ہوں۔

● خندق کے معرکہ میں کل کفر کا سر آپ ہی نے قلم کیا تھا۔

● خیبر میں مرحب و عنتر کا خاتمہ کرکے قلعہ قموص کو آپ ہی نے فتح کیا تھا۔

● آیتِ نجویٰ کے موقع پر صدقہ دے کر رسول اکرمؐ سے راز و نیاز کا شرف آپ ہی نے حاصل کیا تھا۔

علمی اعتبار سے۔ رسول اکرمؐ نے آپ کو شہرِ علم و حکمت کا دروازہ قرار دیا تھا اور امت کا بہترین قاضی قرار دیا تھا۔ آپ کی قضاوت کے محیر العقول واقعات مکمل کتاب کی شکل میں موجود ہیں۔

● منبر کی بلندی سے "سلونی قبل أن تفقدونی" کا نعرہ آپ ہی نے بلند کیا تھا۔

● حکام وقت نے اپنے مشکلات میں آپ ہی کی طرف رجوع کیا تھا اور ان کی علمی گتھیوں کو آپ ہی نے سلجھایا تھا۔

● اسلام میں جتنی عظیم شخصیتیں فقہی، ادبی، اخلاقی یا صوفی قسم کی پائی جاتی ہیں، سب کا سلسلۂ شاگردی آپ ہی کی ذاتِ اقدس تک منتہی ہوتا ہے۔

● مختلف علوم میں کمالِ اعلیٰ کے علاوہ علم نحو کے قواعد کی ایجاد آپ ہی نے فرمائی ہے اور حروف کے تعارف کے اصول آپ ہی نے تعلیم فرمائے ہیں۔

اخلاقی اعتبار سے۔ غلاموں کے ساتھ آپ نے ایسا برتاؤ کیا ہے کہ انھوں نے غلامی کو آزادی پر ترجیح دی ہے اور نیا لباس قنبر کو عطا فرمایا ہے تو پرانا یا معمولی لباس خود زیب تن فرمایا ہے۔

● محاصرہ کے دوران عثمانؓ کے لیے آب و دانہ کا انتظام آپ ہی نے کیا ہے۔

● ابن ملجم کی گرفتاری کے بعد اسے سیراب کرنے کا حکم آپ ہی نے دیا ہے۔

● زہد کا یہ فلسفہ آپ ہی نے سمجھایا ہے کہ زہد اس امر کا نام نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کا مالک نہ ہو۔ زہد اس امر کا نام ہے کہ کوئی چیز انسان کی مالک نہ بننے پائے اور اس کا اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رہے خواہشات کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔

قرآنی اعتبار سے۔ آیت ولایت و تطہیر و مباہلہ و تبلیغ جیسی کم سے کم تین سو تیرہ آیتیں ہیں جن میں صراحت کے ساتھ آپ کے کمالات کا اعلان کیا گیا ہے۔ ویسے سارے قرآن کا محور و مرکز آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ چاہے آپ کا اپنا تذکرہ ہو یا دوستوں کا ذکر ہو یا دشمنوں کا ذکر ہو۔ یہاں تک کہ ہر "یا ایھا الذین آمنوا" کا راس و رئیس آپ ہی کی ذات گرامی کو قرار دیا گیا ہے۔

سیاسی اعتبار سے۔ آپ کی سیاست ہر دور کے لیے ایک مستقل نمونۂ عمل ہے، جس کے چند نمونے یہ ہیں:

● رسول اکرمؐ کے بعد سخت ترین حالات میں بھی آپ نے اپنے حق کے مطالبہ کے لیے تلوار نہیں اٹھائی جب کہ مذہب کے تحفظ کے لیے بدر سے لے کر حنین تک ہر میدان میں رہے اور بعد میں بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے جمل و صفین و نہروان میں کمال شجاعت کا مظاہرہ کرتے رہے اور اس طرح پاکیزگیٔ نفس کا ایک بہترین نمونہ پیش فرمایا ہے۔

● اپنے جملہ حقوق کے غصب ہو جانے کے بعد بھی حکام وقت کو مشورہ دیتے رہے اور ان کی مشکل کشائی فرماتے رہے کہ اسلام کے معاملات کو شخصیت سے بالاتر ہونا چاہیے۔

● عثمانؓ کو محاصرہ کے دوران آب و دانہ فراہم کیا جب کہ انھوں نے براہ راست آپ کے

مقابلہ میں حکومت پر قبضہ کیا تھا۔

● جمل کی فتح کے بعد بھی عائشہ کو بصد احترام وطن پہونچا دیا کہ حرمتِ رسولؐ کا احترام بہر حال ضروری ہے چاہے خود شخصیت قابلِ احترام نہ رہ گئی ہو۔

● صفین کے موقع پر لشکر معاویہ نے پانی بند کر دیا۔ لیکن جب آپ کو نہر پر قبضہ ملا تو فوراً پانی کے عام ہونے کا اعلان کر دیا۔

● اسی جنگ میں قرآنوں کے نیزوں پر بلند ہو جانے کے بعد جیتی ہوئی جنگ کو روک دیا کہ اسلام میں فتوحات کا معیار ملک پر قبضہ نہیں ہے قرآن کی حاکمیت کا قائم کرنا ہے۔

● جناب شہربانو گرفتار ہو کر آئیں تو ان کے ساتھ کنیزوں جیسا برتاؤ کرنے کے بجائے انھیں اپنے عزیز ترین فرزند کی زوجیت کا شرف عنایت کر دیا جس نے ایک پوری قوم کے دلوں کو فتح کر لیا۔

● عمرو عاص نے میدانِ جنگ میں برہنگی کا حربہ اختیار کیا تو اسلامی قوانین کے احترام میں اسے نظر انداز کر دیا ورنہ وہ دُوہری سزا کا حق دار ہو چکا تھا۔

● سرِ اقدس پر ابن ملجم کی تلوار لگنے کے بعد "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" کا نعرہ لگا کر واضح کر دیا کہ اسلام میں کامیابی کا معیار دشمن کا گلا کاٹنا نہیں ہے بلکہ راہِ خدا میں اپنی قربانی پیش کر دینا ہے اور آخر وقت تک اطاعتِ خدا و رسولؐ میں زندگی بسر کرنا ہے۔

● فدک کے موقع پر خود دربار میں جانے کے بجائے صدیقہ طاہرہؑ کو دعویٰ پیش کرنے کے لیے بھیج دینا اتمامِ حجت کی بہترین سیاست ہے جس سے بہتر کوئی راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ امت کے پاس نہ آیاتِ قرآن کا احترام ہے اور نہ قرابتِ رسولؐ کا۔ جو قوم اپنے نبیؐ کی بیٹی کے وسیلۂ حیات پر قبضہ کر کے اسے فاقوں پر مجبور کر سکتی ہے اس سے کس شرافت اور احسان مندی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

● آپ کے سامنے دنیا مختلف شکلوں میں آتی رہی لیکن ہر مرتبہ ٹھکرا دیا اور جب تک مذہب کی ضرورت پیش نہیں آئی تختِ حکومت کی طرف مڑ کر بھی دیکھنے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ صفین کے موقع پر تو مقام ذی قار میں اپنی بوسیدہ نعلین کی مرمت فرماتے ہوئے ابن عباسؓ سے فرما دیا کہ میری نگاہ میں یہ جوتیاں تمھارے تخت و تاج سے کہیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔ دنیا کو تین مرتبہ طلاق دینے کا

مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا برابر قدموں میں آتی رہی لیکن آپ اس کی طرف سے برابر اعراض فرماتے رہے۔

● دنیا کی نعمتوں کے بارے میں آپ کا یہ ارشادِ گرامی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سے آپ کی سیاست کی بنیادوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور دنیا والوں کو زندہ رہنے کا بہترین سبق بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:

دنیا کی بہترین غذا شہد ہے جو ایک جانور کا فضلہ ہے۔

دنیا کا بہترین مشروب پانی ہے جو زمین پر بہتا پھرتا ہے۔

دنیا کی بہترین لذّت جنسی لذّت ہے جس کا خلاصہ نجاست کا نجاست سے اتصال ہے۔

دنیا کا بہترین لباس ریشم ہے جو ایک جانور کے جسم کا فاضل حصہ ہے۔

دنیا کی بہترین سواری گھوڑا ہے جو جنگ و جدال کا مرکز ہے۔

دنیا کی بہترین سونگھنے کی چیز مشک ہے جو ایک جانور کا جما ہوا خون ہے۔

دنیا کی بہترین سننے کی آواز گانا ہے جو نگاہِ قدرت میں انتہائی ناپسندیدہ اور حرام ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی ایسی معرفت جسے بھی حاصل ہو جائے وہ اپنا مقصدِ حیات نہ دولت کو بنا سکتا ہے اور نہ ریاست کو۔ اس کی نگاہ میں نہ راحت دنیا کی کوئی حیثیت ہے اور نہ نعمات دنیا کی۔ یہ تو انسان کی بے معرفتی ہے کہ اپنی سیاست کا محور دنیا کو بنائے ہوئے ہے اور اپنے سے پست تر مقصد پر جان دے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں امیر المومنینؑ کا یہ ارشادِ گرامی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "دنیا کی مثال ایک سانپ کی جیسی ہے جس کا ظاہر انتہائی نرم و نازک ہوتا ہے اور باطن انتہائی سمِ قاتل ـــــ رب العالمین ہر بندۂ مومن کو یہ عرفان عطا فرمائے اور اس ہدایت پر عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

ادبی اعتبار سے

آپ کے کلام کا وہ مجموعہ جسے سید شریف رضیؒ نے جمع فرمایا ہے اور جسے بجا طور پر نہج البلاغہ کا نام دیا گیا ہے، فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار ہے جس کے بارے میں علماء لغت و ادب نے "تحت کلام الخالق و فوق کلام المخلوق" کہہ کر قلم رکھ دیا ہے کہ اس سے زیادہ جامع تعریف کا امکان

نہیں ہے۔

یہ مجموعہ اگرچہ مکمل نہیں ہے اور اس کے بعد مستدرک نہج البلاغہ کے نام سے دوسرا مجموعہ بھی تیار کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود بہترین مجموعہ ہے جو ترتیب و تبویب اور سند و ثبوت کے اعتبار سے بھی بہترین درجہ کا مالک ہے، اور بہت سے علماء نے اس کے ایک ایک خطبہ کے مدرک و ماخذ کا بھی سراغ لگایا ہے اور اس کی مکمل نشان دہی کی ہے جو مدارک نہج البلاغہ اور اسناد نہج البلاغہ وغیرہ کے نام سے مشہور ہے۔

بعض علماء اسلام نے اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر اس کے بعض خطبوں کے بارے میں تشکیک کرنا چاہی ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ یہ امیرالمومنینؑ کا کلام نہیں ہے بلکہ سید رضیؒ نے اپنی طرف سے تیار کر کے حضرت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن اس کا واضح سا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اولاً تو اس خطبہ شقشقیہ کے کلمات کا تذکرہ سید رضیؒ کی پیدائش سے پہلے کے علماء کے بیانات میں بھی پایا جاتا ہے لہٰذا ان کی تصنیف ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ارباب بلاغت اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ سید رضیؒ یا کوئی بھی دوسرا شخص اگر اس انداز کا کلام پیش کرنا چاہے تو اس کے حدود امکان سے باہر ہے۔ سید رضیؒ کا اپنا نظم و نثر کا کلام بھی محفوظ ہے اور امیرالمومنینؑ کی نہج البلاغہ بھی موجود ہے۔ دونوں کا موازنہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے اہل فن جانتے ہیں کہ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے اور ایک کے کلام کو دوسرے کی طرف ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نہج البلاغہ کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ میں حضرت کے خطبات ہیں جو کل یا جزو کی شکل میں جمع کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں آپ کے مکتوبات ہیں جنھیں خط یا فرمان یا وصیت کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے اور تیسرے حصہ میں متفرق کلمات ہیں جو جوامع الکلم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے ہر فقرہ میں مطالب کا ایک سمندر ہے یا حکمتوں کا ایک صحیفہ ہے جسے نقطہ میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

اولاد و ازواج

شیخ مفید علیہ الرحمہ کے بیان کے مطابق آپ کی ۲۷ اولاد تھی،

امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینب کبریٰ اور جناب زینب صغریٰ المعروفہ بام کلثوم۔ جن کی والدہ گرامی جناب فاطمہ زہراؑ تھیں اور جن میں سے جناب زینب کا عقد حضرت عبداللہ بن جعفر سے ہوا تھا جن کے دو فرزند عون اور محمد واقعۂ کربلا میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور جناب ام کلثوم کا عقد محمد بن جعفر سے ہوا جن سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

ان چار اولاد کے علاوہ ایک محسن ہیں جنھیں شکم مادر ہی میں شہید کر دیا گیا اور جن کا نام پیغمبر اسلامؐ نے قبل ولادت محسن قرار دیا تھا۔

محمد۔ جن کی کنیت ابوالقاسم ہے اور جن کی والدہ خولہ حنفیہ تھیں۔ اپنے وقت کے نہایت درجہ شجاع و بہادر انسان تھے یہاں تک کہ مولائے کائنات کے سامنے ایک زرہ کے طولانی ہو جانے کی بنا پر اسے ہاتھ سے کھینچ کر توڑ دیا۔ آپ کی پیدائش کی بشارت سرکار دو عالمؐ نے دی تھی اور اپنا نام اور اپنی کنیت بھی عنایت فرمائی تھی۔ دور خلافت دوم میں پیدا ہوئے اور دور عبدالملک بن مروان میں ۶۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

ان کی اولاد کی تعداد ۲۴ تھی اور چودہ ۱۴ ان میں سے فرزند تھے جن کی نسل کافی بڑھی اور مختلف اطراف و اکناف میں پھیل گئی۔

عمرو رقیہ کبریٰ ــ جن کی والدہ ام حبیب بنت ربیعہ تھیں۔

عباس، جعفر، عثمان، عبداللہ اکبر۔ جن کی والدہ کا نام ام البنین فاطمہ کلابیہ تھا جن سے امیرالمومنینؑ نے جناب عقیل کے مشورہ کی بنا پر عقد کیا تھا کہ عرب میں اس سے بہادر خاندان نہیں ہے اور جس رشتہ کی بنا پر شمر ملعون نے ان حضرات کو بھانجا کہہ کر پکارا تھا کہ اس کا تعلق بھی بنی کلاب سے تھا۔

محمد اصغر، عبداللہ۔ ان دونوں کی والدہ لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ تھیں اور یہ دونوں کربلا میں شہید ہو گئے۔ محمد کی کنیت ابوبکر بھی تھی۔

یحییٰ۔ ان کی والدہ جناب اسماء بنت عمیس تھیں۔

ام محسن، رملہ۔ ان دونوں کی والدہ ام سعید بنت عروہ بن مسعود ثقفی تھیں، اور یہ رملہ، رملہ کبریٰ ہیں۔

نفیسہ، زینب صغریٰ، رقیہ صغریٰ۔ ان تینوں کی والدہ بقول ابن شہر آشوب ام سعید بنت

عروہ تھیں اور ام محسن اور رملہ کی والدہ کا نام ام شعیب مخزومیہ تھا۔ نفیسہ کو ام کلثوم صغریٰ بھی کہا جاتا تھا، اور اس طرح حضرت کی اولاد میں متعدد زینب اور متعدد ام کلثوم تھیں۔ رقیہ صغریٰ کا عقد جناب مسلم بن عقیل سے ہوا تھا۔

ام ہانی، ام الکرام، جمانہ، امامہ، ام سلمہ، میمونہ، خدیجہ، فاطمہ۔

بعض مورخین نے اولاد کی تعداد ۳۶ بتائی ہے ۱۸ فرزند اور ۱۸ دختر۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ازواج مطہرات کی فہرست بھی معلوم ہوگئی۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان تمام ازواج میں کسی کا مرتبہ جناب فاطمہ زہراؑ کے برابر نہیں ہے اور آپ نے ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا عقد اسی طرح نہیں کیا تھا جس طرح رسول اکرمؐ نے جناب خدیجہ کی زندگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں کیا تھا، اور یہ ان دونوں خواتین کا ایک مخصوص امتیاز ہے جو قدرت کی طرف سے عنایت ہوا تھا۔

امیرالمومنینؑ کی شہادت کے وقت ان تمام ازواج میں صرف چار خواتین موجود تھیں باقی اٹھارہ ام ولد تھیں۔ ان چار خواتین کے اسمار گرامی یہ ہیں: امامہ، اسمار بنت عمیس، لیلیٰ التمیمیہ، ام البنین۔

امامہ جناب فاطمہؑ کی رشتہ کی بہن جناب زینب کی بیٹی تھیں اور امیرالمومنینؑ نے صدیقہ طاہرہؑ کی وصیت کی بنا پر سب سے پہلے انھیں سے عقد کیا تھا۔

امیرالمومنینؑ کی نسل کا ایک سلسلہ محمد الحنفیہ سے چلا ہے اور ایک عباس علمدار سے۔ عباس علمدار کے فرزند عبیداللہؑ کے فرزند حسن بن عبیداللہ تھے۔ اور ان کے پانچ فرزند تھے۔ عبیداللہ بن الحسن جو امیر مکہ و مدینہ بھی تھے، عباس جو بہترین خطیب تھے، حمزہ الاکبر، ابراہیم، فضل۔

فضل کے تین فرزند تھے، جعفر، عباس اکبر، محمد۔

حمزہ الاکبر کی نسل میں بہت سے صاحبان علم وفضل وکمالات وکرامات گذرے ہیں جن میں معروف ومشہور شخصیت جناب حمزہ بن قاسم بن علی بن حمزہ الاکبر کی ہے، جن کا مزار حلہ کے قریب ہے اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

اصحاب کرامؓ

یوں تو رسول اکرمؐ کے بعد سخت ترین حالات میں بھی امیرالمومنینؑ کا ساتھ دینے والے افراد

بے شمار تھے اور بعض اوقات میدان جہاد میں یہ تعداد لاکھ کے قریب پہونچ جاتی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیعت کرنے والے یا جنگ میں شرکت کرنے والے افراد اور ہوتے ہیں اور باکمال اصحاب باوفا اور ــــ ذیل میں انھیں باکمال اور باوفا اصحاب میں سے چند ایک کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ مفصل حالات کے لیے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

اصحاب امیرالمومنینؑ میں بعض وہ افراد بھی ہیں جن کا شمار اصحاب رسول اکرمؐ میں بھی ہوتا ہے اور اُن کا تذکرہ اس ذیل میں ہو چکا ہے۔ لہذا ان کے اسمار کی تکرار نہ ہوگی، اگرچہ ان کا مرتبہ ان تمام ذکر ہونے والے افراد سے بالاتر ہے اور کوئی صحابی سلمان محمدی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔

۱۔ اصبغ بن نُباتہ

یہ خواص اصحاب امیرالمومنینؑ میں تھے اور آپ کے ذخائر میں شمار ہوتے تھے۔ امیرالمومنینؑ کی فوج میں بعض افراد تھے جنھوں نے آپ سے وفاداری کا عہد کیا تھا اور آپ نے ان سے جنّت کا وعدہ کیا تھا۔ ان افراد کو شرطۃ الخمیس کہا جاتا تھا۔ خمیس لشکر کا نام ہوتا ہے کہ اس میں میمنہ، میسرہ، قلب، مقدمہ اور ساقہ پانچ حصے ہوتے ہیں اور شرطہ اسے باہمی شرط اور قرارداد کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ اصبغ بن نباتہ انھیں افراد میں شامل تھے۔ بعض علمار اسلام نے ان کی روایات کو صرف اس جرم میں ناقابل اعتبار قرار دیا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کی محبت میں دیوانے ہو رہے تھے۔

۲۔ اویس قرنی

رسول اکرمؐ نے ان کی بے حد مدح فرمائی ہے اور ان سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا ہے اور یمن سے آنے والی خوشبوئے رحمان سے تعبیر کیا ہے۔ ماں سے ایک ساعت کی اجازت لے کر یمن سے مدینہ سرکار دوعالمؐ کی ملاقات کے اشتیاق میں آئے۔ حضورؐ موجود نہ تھے۔ ماں کی اطاعت کے خیال سے بلاملاقات واپس چلے گئے۔ حضورؐ نے اس جذبہ کی بے حد قدر کی اور فرمایا کہ اویس کو قبیلہ ربیعہ ومُضر کے برابر شفاعت کرنے کا حق دیا جائے گا۔

اویس پوری پوری رات رکوع یا سجود میں گذار دیا کرتے تھے۔ زہاد ثمانیہ میں شمار ہوتے تھے۔ صفین میں امیرالمومنینؑ کی رکاب میں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔ (مقام رقہ شام]

میں آجکل حکومت ایران کے زیرِ نگرانی عظیم الشان مقبرہ تعمیر ہو رہا ہے۔ حقیر کو چند بار زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے)۔

واضح رہے کہ زہادِ ثمانیہ میں ربیع بن خیثم، ہرم بن حیان، اویس قرنی، عامر بن عبد قیس، ابو مسلم خولانی، مسروق بن الاجدع، حسن بن ابی الحسن، اسود بن یزید کا شمار کیا جاتا ہے، جن میں ابتدائی چار افراد امیر المومنینؑ کے مخلصین میں تھے اور باقی چار اہلِ باطل میں شمار ہوتے ہیں۔

۳۔ حارث بن عبداللہ الاعور الہمدانی

یمن کے قبیلہ ہمدان کی ایک نمایاں فرد اور امیر المومنینؑ کے مخصوص اصحاب میں تھے۔ ان کی روایتیں سنن اربعہ میں بھی درج کی گئی ہیں اور ان کو افقہ الناس، افرض الناس اور احسب الناس شمار کیا جاتا ہے۔ ایک شب امیر المومنینؑ کی ملاقات کے اشتیاق میں اچانک وارد ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ تم پریشان نہ ہو میں خود ہر چاہنے والے کے سر ہانے وقتِ آخر حاضر ہوتا ہوں تاکہ دنیا سے مطمئن اور مسرور رخصت ہو۔

واضح رہے کہ جناب شیخ بہائیؒ انھیں حارث ہمدانی کی نسل سے تھے، اس لیے کبھی کبھی انہیں حارثی بھی لکھا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ امیر المومنینؑ کے دور سے امام صادقؑ کے دور تک ہَمدانی (بمیم ساکن) قبیلہ ہمدان کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے بعد سے ہَمَدان شہر کی طرف نسبت کا بھی احتمال پایا جاتا ہے جسے ہمدان بن فلوح بن سام بن نوح نے آباد کیا تھا۔

۴۔ حُجر بن عدی الکندی الکوفی

امیر المومنینؑ کے اصحاب ابدال میں شمار ہوتے تھے اور روزانہ ہزار رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ صفین میں قبیلۂ کندہ کے علمبردار تھے اور نہروان میں پورے لشکر امیر المومنینؑ کے سردار تھے، معاویہ کے ایک والی نے انھیں حضرت علیؑ پر لعنت کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے منبر پر جا کر خود معاویہ اور اس کے گورنر پر لعنت کی جس کے نتیجہ میں ۵۱ھ میں شہید کر دیے گئے اور ان کے ساتھ حسبِ ذیل حضرات بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے:

شریک بن شدّاد حضرمی، صیفی بن شہل الشیبانی، قبیصہ بن ضبیعہ العبسی، محرز بن شہاب المنقری، کدام بن حیان العنزی، عبدالرحمان بن حسان العنزی۔ ان تمام حضرات کی قبر مرج عذرا، میں دمشق

کے قریب ہے۔

رسول اکرمؐ نے مرج عذرا میں بعض مقربین بارگاہ احدیت کی شہادت کی خبر دی تھی جس کی بنا پر عائشہ نے معاویہ سے شدید احتجاج کیا۔ لیکن اس احتجاج کا کیا اثر ہوا؟۔

۵۔ رُشَید ہجری

امیر المومنینؑ کے اصحاب خاص اور حاملانِ اسرار میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ میثم تمار اور حبیب بن مظاہر ایک دوسرے کو اس کی شہادت کی خبر دے رہے تھے تو لوگ حیرت زدہ تھے کہ رُشید آ گئے اور انھیں نے یہ اضافہ کر دیا کہ حبیب کا سر لانے والے کو زیادہ انعام دیا جائے گا تو لوگوں نے مزید حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن بالآخر تمام خبریں صحیح ثابت ہوئیں۔ ابن زیاد نے طلب کر کے حضرت علیؑ سے برارت کی دعوت دی۔ فرمایا کہ یہ ناممکن ہے۔ مولاؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ ان کی محبت میں ہاتھ پاؤں اور زبان سب قطع ہوں گے اور سولی دی جائے گی۔ ابن زیاد نے ہاتھ پاؤں کاٹ کے زبان کاٹنے سے انکار کر دیا۔ رشید نے علوم علویہ کی اشاعت شروع کر دی تو مجبوراً زبان بھی قطع کر دی۔ صَدَقَ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَؑ۔

۶۔ زید بن صوحان العبدی

ان کا شمار اصحاب و ابدال میں ہوتا تھا۔ جنگ جمل میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ عائشہ نے ماں ہونے کے رشتہ سے جنگ جمل میں شرکت کی دعوت دی۔ تو جواب میں لکھا کہ مجھے ایسی بات کا حکم دے رہی ہیں جو خلاف مرضی خدا ہے، اور خود اس بات کو ترک کر دیا ہے، جو عین مرضی خدا تھی، (قَـرْنَ فِی بیوتکن)۔

مسجد زید کوفہ کی مشہور مساجد میں ہے۔ رسول اکرمؐ نے انھیں بشارت دی تھی کہ تمھارا ایک عضو تم سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ چنانچہ جنگ نہاوند میں ان کا ایک ہاتھ شہید ہوا۔

۷۔ سلیمان بن صُرَد الخزاعی

جاہلیت میں ان کا نام یسار تھا۔ رسول اکرمؐ نے سلیمان کر دیا تھا۔ صفین میں امیر المومنینؑ کے ساتھ رہے۔ یزید کے حاکم بننے کے بعد اپنے گھر میں اجتماع کر کے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی لیکن کربلا میں نصرت امام نہ کر سکے جس کے نتیجہ میں ۶۵ھ میں توابین کی ایک جماعت لے کر

انتقام کربلا کے لیے قیام کیا۔ اُدھر سے شام کا تیس ہزار کا لشکر روانہ ہوا۔ راستہ میں دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہوئی اور سلیمان حصین بن نمیر کے تیر سے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً تمام ساتھی درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔

۸۔ سہل بن حنیف انصاری

بدر و احد کے معرکوں میں بھی شریک ہوئے اور صفین میں امیرالمومنینؑ کے ساتھ رہے۔ صفین سے واپسی پر کوفہ میں انتقال کیا۔ امیرالمومنینؑ نے نماز جنازہ میں ۲۵ تکبیریں کہیں، اور فرمایا کہ سہل کے لیے ۷۰ تکبیریں بھی روا ہیں۔ جنگ جمل کے لیے روانگی کے وقت امیرالمومنینؑ نے انھیں مدینہ کا حاکم بنا دیا تھا۔

۹۔ صعصعہ بن صوحان العبدی

امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ اصحاب امیرالمومنینؑ میں ان کے حق کی مکمل معرفت رکھنے والے صرف صعصعہ اور ان کے ساتھی تھے، رسول اکرمؐ کے زمانے کے مسلمان تھے، لیکن حضرت کی خدمت میں باریاب نہ ہو سکے تھے۔ معاویہ کوفہ وارد ہوا تو لوگوں نے اس سے امان طلب کی۔ صعصعہ گئے تو اس نے کہا کہ تمھارے لیے امان نہیں ہے جب تک منبر پر جا کر علیؑ پر لعنت نہ کرو۔ صعصعہ نے منبر پر جا کر معاویہ پر لعنت کر دی جس کے نتیجہ میں کوفہ سے نکال باہر کر دیے گئے۔

۱۰۔ ابوالاسود ظالم بن ظالم الدئلی

صاحبانِ علم و فضل میں تھے۔ امیرالمومنینؑ نے انھیں علم نحو تعلیم کیا تھا اور قرآن مجید پر نقطہ و اعراب لگانے کی تعلیم دی تھی۔ معاویہ نے ان کے یہاں حلوہ بھیجا تو پانچ چھ برس کی بچی نے کھانا چاہا۔ فرمایا کہ یہ حلوہ محبت علیؑ سے دستبرداری کی اجرت کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ بچی نے برجستہ کہا، خدا اُس کا بُرا کرے۔ حلوہ مزعفر کے ذریعہ سید مطہرؑ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ خدا بھیجنے والے اور کھانے والے دونوں کو غارت کرے۔ سنہ ۶۹ھ میں ۸۵ سال کی عمر میں بصرہ کے طاعون میں انتقال کیا۔

۱۱۔ عبداللہ بن جعفر الطیار

سرزمین حبشہ پر پیدا ہونے والا پہلا مسلمان فرزند۔ جو ہجرت کے بعد اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ مرسل اعظمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حاضر رہے۔ جعفر طیار کی شہادت پر رسول اکرمؐ

نے باقاعدہ گریہ وزاری کرتے ہوئے تعزیت پیش فرمائی اور جناب اسماء بنت عمیس سے فرمایا کہ ان بچوں کا میں والی و وارث ہوں۔

جناب عبداللہ بے حد کریم اور سخی انسان تھے۔ ان کی سخاوت ضرب المثل تھی۔ بعض لوگوں نے تنقید کی تو فرمایا کہ خدا نے مجھے اپنے کرم کا عادی بنا دیا ہے اور میں نے فقیروں کو اپنی سخاوت کا عادی بنا دیا ہے۔ اب خطرہ یہ ہے کہ اگر میں ہاتھ روک لوں تو کہیں میرا پروردگار بھی اپنا ہاتھ نہ روک لے۔ سنہ ۸۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی اولاد کی تعداد ۲۰ یا ۲۴ تھی جن میں سے جناب عون و محمد بھی ہیں جو کربلا میں شہید ہوئے تھے۔

۱۲۔ عدی بن حاتم الطائی

سنہ ۱۰ھ میں اسلام لائے، اور ان کے اسلام کا سبب یہ تھا کہ سنہ ۹ھ میں لشکر اسلام نے جبل طے پر حملہ کیا، وہاں کے بُت خانہ کو تباہ کیا اور لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ عدی شام کی طرف فرار کر گئے، ان کی بہن اسیر ہو گئی۔ مدینہ پہونچنے کے بعد رسول اکرمؐ سے فریاد کی کہ باپ مر گیا، بھائی فرار کر گیا اب آپ کرم کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی معتبر آدمی مل گیا تو تمھیں تمھارے بھائی کے پاس روانہ کر دوں گا۔ چند روز کے بعد قبیلہ قضاعہ کی ایک جماعت آ گئی۔ آپ نے حسب خواہش ان کے ساتھ شام روانہ کر دیا، وہاں بہن نے بھائی سے اخلاق نبویؐ کا ذکر کیا، عدی فوراً مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں رسول اکرمؐ نے انتہائی احترام کا برتاؤ کیا اور اپنی مسند پر جگہ دی جس کے نتیجہ میں اسلام قبول کر لیا اور پھر حضرت علیؑ کے ساتھ جمل و صفین و نہروان میں شریک جہاد رہے۔ سنہ ۶۸ھ میں کوفہ میں انتقال فرمایا۔

ایک مرتبہ معاویہ کے پاس گئے تو اس نے طنز کیا کہ تمھارے فرزند کہاں ہیں؟ کہا کہ حضرت علیؑ کے ساتھ صفین میں شریک ہوئے اور قتل ہو گئے۔ معاویہ نے کہا کہ علیؑ نے انصاف نہیں کیا کہ تمھارے بیٹوں کو قتل کرا دیا اور اپنی اولاد کو بچا لیا۔ فرمایا معاویہ میں نے علیؑ کے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ وہ شہید ہو گئے اور میں زندہ رہ گیا۔

۱۳۔ عمرو بن الحمق الخزاعی

بندہ صالح پروردگار اور حواریینِ امیرالمومنینؑ میں شمار ہوتے تھے۔ تمام جنگوں میں

حضرت کے ساتھ رہے۔ زیاد نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا تو موصل چلے گئے، وہاں ایک غار میں پناہ لی تو سانپ نے کاٹ لیا اور انتقال فرما گئے۔ زیاد کے سپاہیوں نے لاش کو دیکھا تو سر کاٹ کر زیاد کے پاس لائے۔ اس نے معاویہ کے پاس بھیج دیا اور اس نے نیزہ پر چڑھا دیا جو اسلام کا پہلا سر تھا جو نوکِ نیزہ پر بلند کیا گیا جس کے بارے میں امام حسینؑ نے معاویہ کو سخت احتجاجی خط روانہ فرمایا۔

ایک مرتبہ عمرو نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں پانی پیش کیا تو حضرت نے دعا دی جس کے نتیجہ میں ۸۰ سال کی عمر تک ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔

۱۴۔ قنبر

امیرالمومنینؑ کے مخصوص غلاموں میں تھے۔ حجاج ثقفی نے گرفتار کرایا تو پوچھا کہ علیؑ کے یہاں تمھارا کیا کام تھا؟ فرمایا کہ وضو کا پانی حاضر کرتا تھا اور حضرت وضو کرنے کے بعد اس آیت کی تلاوت کرتے تھے کہ ظالموں کا سلسلہ بہرحال ختم ہونے والا ہے۔ حجاج نے کہا کہ اس سے شاید میری ذات کو مراد لیتے تھے۔ فرمایا بے شک! کہا کہ اگر تمھیں قتل کر دوں تو کیا ہوگا؟ فرمایا میں نیک بخت ہوں گا اور تو شقی و بدبخت۔ حجاج نے غیظ میں آکر قتل کا حکم دے دیا۔

۱۵۔ کمیل بن زیاد النخعی

امیرالمومنینؑ کے مخصوص اصحاب اور حاملانِ اسرار میں شمار ہوتے تھے۔ دعائے کمیل ان کی عظمت و جلالت کے لیے کافی ہے۔ حجاج ثقفی نے والیِ عراق ہونے کے بعد ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا تو روپوش ہو گئے۔ اس نے ان کی قوم کا وظیفہ بند کر دیا۔ کمیل کو اطلاع ملی تو حجاج کے دربار میں پہونچ گئے کہ میں قوم کے رزق کے بند کرانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ حجاج نے کہا کہ میں تو تمھیں سزا دینے کے لیے تلاش کر رہا تھا۔ فرمایا ضرور ضرور۔ میری زندگی میں اب صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں، اس کے بعد ہم تم دونوں مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ حجاج نے ان کے قتل کا حکم دے دیا اور ۸۳ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں شہید کر دیے گئے۔ نجف و کوفہ کے درمیان آپ کا مزار مبارک معروف ہے۔

۱۶۔ مالک بن الحارث الاشتر النخعی

امیرالمومنینؑ کے مخصوص ترین اصحاب میں تھے اور اپنے دَور کے سب سے بڑے شجاع

اور بہادر تھے۔ امیرالمومنینؑ نے انھیں مصر کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو معاویہ نے راستہ کے ایک شخص کو ۲۰ سال خراج کی معافی کا وعدہ دے کر شہد میں زہر دلوا دیا اور مقام عریش پر زہر دغا سے شہید ہو گئے۔ جنازہ مدینہ لاکر دفن کیا گیا۔ امیرالمومنینؑ نے اس حادثہ پر انتہائی تاسف کا اظہار کیا۔ اور فرمایا کہ مالک میرے لیے ویسے ہی تھے جیسے میں رسول اللہ کے لیے تھا۔

اس شجاعت کے باوجود تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ بازار کوفہ میں ایک شخص نے کوڑا پھینک دیا تو خاموشی سے آگے بڑھ گئے، کسی شخص نے دیکھ لیا اور اُس شخص کو تنبیہ کی کہ یہ مالک اشتر تھے، وہ معذرت کے لیے دوڑا۔ دیکھا مسجد میں مصروف نماز ہیں، نماز کے بعد قدموں پر گر پڑا۔ فرمایا کہ میں تو تیرے حق میں استغفار کر رہا تھا کہ تو نے عظیم گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔

امیرالمومنینؑ نے مالک اشتر کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا تھا وہ آج تک دنیا کے ہر حاکم کے لیے بہترین نظام حکومت ہے جس پر عمل کیے بغیر عدل و انصاف کا قیام ناممکن ہے۔

۱۷۔ محمد بن ابی بکر بن ابی قحافہ

حجۃ الوداع کے سفر میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ والدہ گرامی اسماء بنت عمیس تھیں، جو پہلے جناب جعفر طیار کی زوجہ تھیں اور ابوبکرؓ کے بعد حضرت علیؑ سے عقد کیا جس کی بنا پر محمد کی تربیت حضرت علیؑ کے زیر سایہ ہوئی اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ محمد میرا فرزند ہے، اگرچہ ابوبکرؓ کے صلب سے ہے۔ امیرالمومنین نے ۳۶ھ میں مصر کا حاکم بنایا تو معاویہ نے عمرو عاص، معاویہ بن خدیج، ابوالاعور سلمی جیسے افراد کو مصر روانہ کر دیا۔ ان لوگوں نے سازش کر کے محمد کو گرفتار کر لیا اور شہید کر کے جسم کو گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دیا۔ جس کے غم میں حضرت عائشہ نے تاحیات بھُنا گوشت نہیں کھایا اور برابر معاویہ، عمرو عاص اور ابن خدیج پر لعنت کرتی رہیں۔

معاویہ نے ان کی شہادت پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور امیرالمومنینؑ نے انتہائی غم کا مظاہرہ فرمایا۔

محمد کے مادری بھائیوں میں عبداللہ اور محمد و عون بن جعفر ہیں، اور پدری بہن حضرت عائشہ تھیں، اور محمد کے فرزند قاسم مدینہ کے فقہاء میں شمار ہوتے تھے جو امام جعفر صادق

کے مادری جد شمار ہوتے تھے۔

۱۸۔ میثم بن یحییٰ تمّار

امیرالمومنینؑ کے صاحب اسرار تھے اور اس قدر علم قرآن کے مالک تھے کہ ابن عباس
کو درس قرآن دیا کرتے تھے اور وہ ان کے بیانات کو ضبط کیا کرتے تھے۔ ایک دن کشتی سے
سفر کر رہے تھے، تیز آندھی چلی تو فرمایا کہ معاویہ دنیا سے رخصت ہوگیا ہے اور بعد میں اس
بیان کی تصدیق ہوگئی۔ امیرالمومنینؑ کے زرخرید غلام تھے۔ حضرت نے خریدنے کے بعد نام
پوچھا تو کہا کہ سالم۔ فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے تمہارا اصلی نام میثم بتایا ہے لہذا نام وہی ہوگا اور
کنیت ابوسالم ہوگی۔ حضرتؑ کی خبر کے مطابق ابن زیاد نے آپ کو سولی دے دی ۔۔ اور
امام حسینؑ کے وارد عراق ہونے سے ۱۱ روز قبل ۲۲ ذی الحجہ کو درجۂ شہادت پر فائز ہوگئے۔

۱۹۔ ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص المرقال

تیز حملوں کی بنا پر مرقال لقب ہوگیا تھا۔ روز فتح مکہ مسلمان ہوئے اور صفین میں
امیرالمومنینؑ کے ہمرکاب رہے۔ صفین ہی میں شہید ہوئے اور ان کے ساتھ ان کے فرزند
عتبہ بن ہاشم بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

عَلیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ولایت علیؑ کا اقرار کیے بغیر ایمان کی تکمیل
ممکن نہیں ہے۔ از روئے قرآن علیؑ اللہ کے ولی ہیں، اور علی کی ولایت کا اقرار جزو ایمان ہے،
علیؑ کی ولایت کا اعلان فرض ایمان ہے اور علیؑ کی ولایت کے تقاضوں پر عمل کرنا شانِ اسلام
وایمان ہے۔

دورِ حاضر میں جہاں بہت سے دوسرے فتنوں نے جنم لیا ہے۔ ان میں سے ایک فتنۂ سنت
وبدعت بھی ہے، جہاں بعض مسلمانوں کو ہر شے بدعت نظر آتی ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید
نے غیر خدا کو ولی بنانے سے انکار کیا ہے لہذا علیؑ کو ولی تسلیم کرنا خلاف قرآن وسنت اور بدعت
ہے، اور بدعت کا انجام جہنم ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی آیتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔
اور ان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ غیر خدا ولی نہیں ہوسکتا اور غیر خدا کو ولی بنانا
خلاف اسلام وایمان ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں دو موضوعات زیر بحث آسکتے ہیں۔ پہلا موضوع یہ
ہے کہ غیر خدا سے مراد کیا ہے؟ اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ ولی بنانے سے مراد کیا ہے؟
جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے اس کے بارے میں قابل توجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے
ایسے مقامات پر "مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ غیر خدا اور ہوتا ہے
اور "من دون اللہ" اور ہوتا ہے، مغالطہ کا منشا یہ ہے کہ لفظ "غیر خدا" کے دو معنی ہیں۔ خدا کا
غیر اور خدا کے علاوہ۔ اردو زبان میں ان دونوں الفاظ میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور عربی
محاورات میں بھی غیر اللہ اور من دون اللہ میں ایسا ہی فرق پایا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر "مِنْ
دون اللہ" کو ولی بنانا ناجائز بھی ہوگا تو غیر خدا کا ولی بنانا ناجائز نہیں ہوسکتا۔

کفار و مشرکین کی تردید و تنبیہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو ولی اور سرپرست بناتے تھے اور صاحبانِ ایمان خدا کے اقرار کے ساتھ ولایت کا اقرار کرتے ہیں لہٰذا ان کا قیاس کفار و مشرکین پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے ولی بنانے سے روکا ہے اور یہاں مسئلہ ولی بنانے کا نہیں ہے، ولی تسلیم کرنے کا ہے۔ بنانے والا تو خدا ہی ہے جس نے ولی بنا دیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر غیر خدا کی ولایت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن خدا کو چھوڑ کر نہیں، بلکہ خدا کی دی ہوئی صلاحیت اور حیثیت کے پیش نظر۔

خود پیغمبر اسلامؐ نے ولی کے لیے دعا کی ہے۔ جناب زکریاؑ نے ولی کی دعا کی ہے۔ مومنین آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ متقین اولیاء خدا ہیں اور اس کے علاوہ ایسے متعدد مقامات ہیں جہاں مختلف معانی کے اعتبار سے غیر خدا کی ولایت کا اعلان کیا گیا ہے اور اس تصور کی نفی کی گئی ہے کہ غیر خدا ولی نہیں ہوسکتا ہے۔

انبیاء کرامؑ کا خدائے کریم سے ولی طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر خدا "من جانب اللہ" ولی ہوسکتا ہے۔ "من دون اللہ" ولی نہیں ہوسکتا ہے۔ برادران اسلام نے اس مقام پر شدید دھوکا کھایا ہے اور بدعت کے چکر میں پڑ کر من جانب اللہ اور من دون اللہ کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے اور اولیاء خدا کی ولایت کے انکار کو بھی اسلام کا جزو بنا لیا ہے حالانکہ اسلام ولایت کے اقرار کا نام ہے ولایت کے انکار کا نام نہیں ہے۔

خود رب العالمین نے قرآن مجید میں اپنے رسول اور صاحبانِ ایمان کے ولی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ تو کیا اس کے بعد بھی ولایت کو صرف خدا کی ذات تک محدود کیا جاسکتا ہے اور نام خدا پر کلام خدا کا انکار کیا جاسکتا ہے۔

سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ رسولؐ کے ساتھ جسے ولی بنایا گیا ہے۔ وہ کون ہے؟

علماء اسلام کے بے شمار اقوال اس امر پر متفق ہیں کہ "آیت ولایت" میں "الذین آمنوا" سے مراد مولائے کائنات کی ذات گرامی ہے اور اس میں انھیں کی ولایت کا اعلان کیا گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل حضرات محدثین و مفسرین نے اپنی تحریروں میں اظہار و اعتراف فرمایا ہے۔

۱۔ علامہ شیخ محب الدین طبری صاحب ذخائر العقبیٰ ص ۸۸
۲۔ علامہ سید شہاب الدین اندلسی صاحب روح المعانی ج ۶ ص ۱۴۹
۳۔ علامہ ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن حیان اندلسی صاحب المحیط ج ۳ ص ۵۱۳
۴۔ علامہ شیخ محمد بن علی قاضی شوکانی صاحب فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰
۵۔ ابن کثیر شامی صاحب تفسیر معروف ۴ ص ۷۱
۶۔ علامہ محدث علی ابن احمد نیشاپوری صاحب اسباب النزول ص ۱۴۸
۷۔ علامہ جلال الدین سیوطی صاحب لباب المنقول ص ۹۰
۸۔ علامہ سبط بن جوزی صاحب تذکرۂ خواص الامۃ ص ۱۸
۹۔ علامہ محمد مومن بن الحسن الشبلنجی نور الابصار ص ۱۰۵
۱۰۔ علامہ گنجی شافعی صاحب کفایت الطالب ص ۱۰۶
۱۱۔ علامہ بیضاوی صاحب انوار التنزیل ص ۱۳۰
۱۲۔ علامہ طبری صاحب تفسیر معروف ۶ ص ۱۶۵
۱۳۔ الشیخ علامہ علاء الدین الخطیب البغدادی صاحب تفسیر مشہور ج ۱ ص ۴۷۵
۱۴۔ علامہ نسفی صاحب تفسیر خازن ج ۱ ص ۴۸۴
۱۵۔ علامہ شیخ سلیمان القندوزی صاحب ینابیع المودۃ ج ۱ ص ۱۱۴
۱۶۔ علامہ جار اللہ زمخشری صاحب کشاف ج ۱ ص ۳۴۷
۱۷۔ حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب الکاف الشاف ص ۵۶
۱۸۔ علامہ فخر الدین الرازی صاحب تفسیر معروف ج ۱۲ ص ۲۶
۱۹۔ السید رشید رضا صاحب تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۴۲
۲۰۔ علامہ نظام الدین نیشاپوری صاحب تفسیر معروف ج ۶ ص ۱۴۵
۲۱۔ علامہ محدث اسماعیل بن کثیر الدمشقی صاحب تفسیر معروف ج ۲ ص ۷۱
۲۲۔ علامہ ابوبکر احمد بن علی الرازی صاحب کتاب احکام القرآن ج ۲ ص ۵۴۳
۲۳۔ علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی صاحب کتاب الجامع

لاحکام القرآن، ج ۲، ص ۲۲۱

۲۴۔ علامہ جلال الدین السیوطی صاحب تفسیر درمنشور ج ۲ ص ۲۹۳

۲۵۔ میر محمد صالح ترمذی خفی صاحب کتاب مناقب مرتضوی ص ۷

ان تمام اعترافات کے بعد ولایت علیؑ کا انکار دراصل اسلام اور قرآن کا انکار ہے اور عالم اسلام مساجد میں اس کا اعلان کرے یا نہ کرے منزل ایمان میں اس کا اقرار کرنا اسلام وایمان کا فرض ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ

مختلف روایات اور تواریخ کی بنا پر ۵۰ ہزار سے سوا لاکھ تک کا مجمع تھا جس میں مرسل اعظمؐ نے پالان شتر کا منبر بنوا کر کڑی دھوپ میں سر میدان قافلہ کو روک کر منبر پر بلند ہو کر حضرت علیؑ کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے یہ اعلان فرمایا تھا کہ "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی کے سوا لاکھ راوی تو بر وقت موجود تھے جنھوں نے واپس آکر یہ واقعہ ضرور بیان کیا ہوگا۔

مسافر کی عام فطرت یہ ہے کہ وہ سفر میں پیش آنے والے ہر انوکھے واقعہ کا ذکر ضرور کرتا ہے، اور سفر حج کے ساتھ تو یہ خصوصیت آج تک باقی ہے کہ جو مکہ سے آتا ہے لوگ اسے گھیر لیتے ہیں اور تفاصیل سفر دریافت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خود حاجی صاحب کا بھی مزاج یہی ہوتا ہے کہ اپنے سفر کے جملہ خصوصیات سے لوگوں کو باخبر کریں۔ جب کہ آج کل کے زمانے میں ساری دنیا سے دس بیس لاکھ افراد ہر سال حج کے لیے جاتے ہیں اور سب ہی واقعات بیان کرتے ہیں۔ ریڈیو سے حالات نشر کیے جاتے ہیں، ٹی وی پر پروگرام دکھائے جاتے ہیں اور حاجی صاحب کی واپسی سے پہلے ہی شہر والے اکثر حالات سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی حاجی صاحب کو بیان کرنے اور دوستوں کو ان کی زبانی سننے کا اشتیاق ضرور رہتا ہے تو جب سرکار دو عالمؐ اپنے اصحاب مخلصین کے ساتھ آخری حج کے لیے تشریف لے گئے ہوں گے اور قدم قدم پر بیان احکام کے امکانات رہے ہوں گے اور قافلہ خلاف معمول تین دن کی تاخیر سے اپنے اپنے وطن پہونچا ہوگا، اور تاخیر کا سبب بھی کڑی دھوپ میں، چٹیل میدان میں ایک جلسۂ عام ہوگا تو کون ایسا ہوگا جسے اپنے گھر، محلہ، گاؤں اور شہر میں اس واقعہ کو بیان کرنے کا شوق نہ ہوگا اور کون ہوگا جو واپسی کی تاریخ میں تین دن کی تاخیر کا سبب نہ دریافت کرے گا۔ حد یہ ہے کہ جس کو اس اعلان سے اختلاف

بھی رہا ہوگا اس نے بھی واقعہ کو ضرور بیان کیا ہوگا کہ بلاسبب ایک غیر ضروری اعلان کے لیے چٹیل میدان میں روک لیا گیا، یا اپنے خاندان کو مسلط کرنے کے لیے ہمیں گرمی میں پریشان کیا گیا، یا بھائی کی محبت میں مسلمانوں کی زحمت کا خیال نہیں کیا گیا، یا یا یا . . . . غرض کہ کوئی بھی تاویل اور توجیہ کی جائے اور کسی طرح کے غم و غصّہ کا اظہار کیا جائے لیکن واقعہ کا بیان کرنا ناگزیر ہے اور اس طرح مرسل اعظمؐ کی مکمل حیات میں کسی روایت کو اتنے راوی نہ ملے ہوں گے جتنے راوی حدیث غدیر کو مل گئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جملہ حاجی صاحبان کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ ان کا نام راویوں کی فہرست میں درج ہو جاتا کہ ان کا بیان بھی سلسلہ بہ سلسلہ نقل کیا جاتا۔ یا ان کی شخصیت کو اس قدر اہمیت دی جاتی کہ انھیں بھی حدیث کے راویوں میں شمار کر لیا جایا۔ لیکن تاہم واقعہ کو اس قدر راویوں کا مل جانا اس کے تواتر و تیقن اور قطعیت کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ جملہ غزوات پیغمبرؐ میں اتنا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا جتنا غدیر میں تھا لیکن ان کے تفصیلات زبان زد خواص و عوام ہیں تو اس جلسہ کا تذکرہ کیوں کر عالم آشکار نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں اس اعلان کو نقل کیا ہے۔ صحابۂ کرام نے بیان کیا ہے اور مؤلفین و مصنفین نے اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ جن کو اپنی کتاب کو کلام باری کے بعد کا درجہ دینا تھا ان کی مصلحت نے ایسی اہم حدیث کو نقل نہ ہونے دیا اور یہ خود لفظ مولیٰ کے معنی کے تعین کا بہترین قرینہ ہے جب کہ روایت ان کے شرائط کی بنا پر بھی صحیح اور قابل وثوق و اعتبار تھی۔

اس مقام پر صرف چند کتابوں کا حوالہ درج کیا جاتا ہے جن میں اس روایت کا اندراج ہوا ہے اور جن کے مؤلفین و مصنفین نے اس حدیث کے تواتر و اعتبار کا اعتراف کیا ہے۔ تفصیلات کے لیے عبقات الانوار اور الغدیر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

تواترِ حدیث کے معترفین

۱۔ علامہ شیخ جلال الدین سیوطی صاحب کتاب الازھار المتناثرۃ فی الاحادیث المتواترۃ۔

۲۔ علامہ جزری صاحب کتاب اسنیٰ المطالب۔

۳۔ علامہ جمال الدین نیشاپوری صاحب کتاب اربعین۔

۴۔ صاحب کتاب شرح الجامع الصغیر (السراج المنیر)۔

۵۔ علامہ الشیخ ضیاء الدین صالح بن مہدی صاحب کتاب الابحاث المسددہ۔

۶۔ علامہ ابن کثیر شامی در حالات محمد بن جریر طبری (طبقات شافعیہ)۔

۷۔ علامہ محمد ابن اسماعیل بن صلاح الدین صاحب کتاب التحفۃ الندیہ۔

۸۔ میرزا مخدوم بن میر عبدالباقی صاحب کتاب نواقض الروافض۔

۹۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب کتاب السیف المسلول۔

۱۰۔ شمس الدین ترکمانی ذہبی۔

۱۱۔ علامہ ابوالقاسم عبداللہ بن عبداللہ الحسکانی صاحب کتاب "دُعاۃ الہداۃ الیٰ اداء حق الموالاۃ"۔

۱۲۔ ابوسعید بن ناصر سجستانی صاحب کتاب "درایۃ حدیث الولایۃ"۔

۱۳۔ مولوی محمد مبین فرنگی محلی صاحب کتاب وسیلۃ النجاۃ۔

اس کے علاوہ بے شمار کتابوں میں 'حدیث' اس کے اسناد اور رواۃ کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ علامہ ابوالعباس احمد بن محمد بن عقدہ کی کتاب الولایۃ میں تو حدیث کو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے نقل کیا گیا ہے جیسا کہ علامہ ابن طاؤس نے کتاب الطرائف میں درج کیا ہے اور جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

راویانِ حدیث غدیر

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عثمان، عثمانؓ بن عفان، حضرت علیؑ، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن العوام، عبدالرحمان بن عوف، سعید بن مالک، عباس بن عبدالمطلب، امام حسنؑ بن علیؑ، امام حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، ابوذر، سلمان فارسی، اسعد بن زرارہ، خزیمہ بن ثابت، ابوایوب بن [illegible] زید انصاری، عثمان بن حنیف، سہل بن حنیف، حذیفہ یمانی، عبداللہ بن عمر، براء بن عازب، رفاعہ بن رافع، ابولیلیٰ

انصاری، ابو قدامہ انصاری، سہل بن سعد، عدی بن حاتم، ثابت بن یزید، مالک بن الحویرث، حبشی بن جنادہ، ضمیرہ بن الاسدی، عبید بن عاذب انصاری، عبداللہ بن ابی اوفی، زید بن شراحیل، ابو حمرا خادم رسول اللہ، ابو فضالہ انصاری، عامر بن لیلیٰ غفاری، عامر بن واثلہ، عبدالرحمان بن عبدالرب انصاری، سعد بن جنادہ عوفی، عامر بن عمیر العمیری، عبداللہ بن یاعیل، حبہ بن جوین، عقبہ بن عامر، ابو ذریب الشاعر، ابو شریح خزاعی، سمرہ بن جندب، سلمہ بن الاکوع، زید بن ثابت، کعب بن بحر، ابوالہیثم بن التیہان، ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، المقداد بن عمر الکندی، عمر ابی سلمہ، عبداللہ ابن اسید، عوان بن حصین، بریدہ بن حصیب، جلبہ بن عمر، ابو ہریرہ، ابوالبرزہ اسلمی، ابو سعید خدری، جابر بن عبداللہ انصاری، جریر بن عبداللہ، زید بن ارقم، ابو رافع، ابو عمرہ بن محصن، انس بن مالک، ناجیہ بن عمرو الخزاعی، ابو زینب بن عوف، لیلیٰ بن مرہ، سعد بن عبادہ، حذیفہ بن اسید، ابو سریحہ غفاری، عمرو بن الحمق انصاری، عبدالرحمٰن بن نعیم دیلمی، عطیہ بن بشر، حسان بن ثابت، جابر بن سمرہ، عبداللہ بن ثابت، ابو جحیفہ، وہب بن عبداللہ، ابو امامہ انصاری، عامر بن لیلیٰ بن حمزہ، جندب بن سفیان، امامہ بن زید، وحشی بن حرب، قیس بن ثابت، عبدالرحمٰن بن مدلج، جبیب بن بدیل بن ورقا الخزاعی۔ فاطمہؑ بنت رسولؐ، عائشہ بنت ابی بکر، ام سلمہؓ، ام ہانی، فاطمہ بنت حمزہؓ، اسما بنت عمیس۔

خطبۂ غدیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ساری تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو اپنی یکتائی میں بلند اور اپنی انفرادی شان کے باوجود قریب ہے۔ وہ سلطنت کے اعتبار سے جلیل اور ارکان کے اعتبار سے عظیم ہے۔ وہ اپنی منزل پر رہ کر بھی اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اپنی قدرت اور اپنے برہان کی بنا پر تمام مخلوقات کو قبضہ میں رکھے ہوئے ہے ہمیشہ سے بزرگ ہے اور ہمیشہ قابل حمد رہے گا۔ بلندیوں کا پیدا کرنے والا، فرش زمین کا بچھانے والا، آسمان و زمین پر اختیار رکھنے والا بے نیاز، پاکیزہ صفات، ملائکہ اور روح کا پروردگار، تمام مخلوقات پر فضل و کرم کرنے والا اور تمام ایجادات پر مہربانی کرنے والا ہے وہ ہر آنکھ کو دیکھتا ہے اگرچہ کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھتی، وہ صاحب حلم و کرم ہے، اس کی رحمت ہر شے کے لیے وسیع اور اس کی نعمت کا احسان ہر شے پر قائم ہے۔ انتقام میں جلدی نہیں کرتا اور مستحقین عذاب کو عذاب دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتا، مخفی امور کو جانتا ہے اور چیزوں سے باخبر ہے، پوشیدہ چیزیں اس پر مخفی نہیں رہتیں، اور مخفی امور اس پر مشتبہ نہیں ہوتے، وہ ہر شے پر محیط اور ہر چیز پر غالب ہے، اس کی قوت ہر شے میں اور اس کی قدرت ہر چیز پر ہے، وہ بے مثل ہے اور شے کو شے بنانے والا ہے، ہمیشہ رہنے والا، انصاف کرنے والا ہے، اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہ عزیز و حکیم ہے، نگاہوں کی رسائی سے بالاتر ہے اور ہر نگاہ کو اپنی نظر میں رکھتا ہے کہ وہ لطیف بھی ہے اور خبیر بھی۔ کوئی شخص اس کے وصف کو پا نہیں سکتا اور کوئی اس کے ظاہر و باطن کا ادراک نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا ہی جتنا اس نے

خود بتا دیا ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ ایسا خدا ہے جس کی پاکیزگی زمانہ پر محیط اور جس کا نور ابدی ہے۔ اس کا حکم نافذ ہے۔ نہ اس کا کوئی مشیر ہے نہ وزیر۔ نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ اس کی تدبیر میں کوئی فرق ہے، جو کچھ بنایا وہ بغیر کسی نمونہ کے بنایا اور جسے بھی خلق کیا بغیر کسی کی اعانت یا فکر و نظر کی زحمت کے بنایا۔ جسے بنایا وہ بن گیا اور جسے خلق کیا وہ خلق ہو گیا۔ وہ خدا ہے لاشریک ہے جس کی صفت محکم اور جس کا سلوک بہترین ہے۔

وہ ایسا عادل ہے جو ظلم نہیں کرتا اور ایسا بزرگ و برتر ہے کہ ہر شے اس کی قدرت کے سامنے متواضع اور ہر چیز اس کی ہیبت کے سامنے خاضع ہے وہ تمام ملکوں کا مالک، تمام آسمانوں کا خالق، شمس و قمر پر اختیار رکھنے والا، ہر ایک کو ایک معین مدت کے لیے چلانے والا، دن کو رات اور رات کو دن پر حاوی کرنے والا، ظالموں کی کمر توڑنے والا، شیطانوں کو ہلاک کرنے والا ہے۔ نہ اس کی کوئی ضد ہے نہ مثل۔ وہ یکتا ہے بے نیاز ہے، نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ بیٹا، نہ ہمسر۔ وہ خدائے واحد اور رب مجید ہے، جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے پورا کر دیتا ہے۔ جاننے والا، خیر کا احصار کرنے والا، موت و حیات کا مالک، فقر و غنا کا صاحب اختیار، ہنسانے والا، رلانے والا، قریب کرنے والا، دور ہٹا دینے والا، عطا کرنے والا، روک لینے والا ہے۔ ملک اسی کے اختیار میں ہے اور حمد اسی کے لیے زیبا ہے اور اسی کے قبضہ میں ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ رات کو دن اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے۔ اس عزیز و غفار کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہ دعاؤں کا قبول کرنے والا، عطاؤں کو بکثرت دینے والا، سانسوں کا شمار کرنے والا اور انسان و جنات کا پروردگار ہے، اس کے لیے کوئی شے مشتبہ نہیں ہے۔ وہ فریادیوں کی فریاد سے پریشان نہیں ہوتا ہے اور اسے گڑگڑانے والوں کا اصرار خستہ حال نہیں کرتا ہے، نیک کرداروں کا بچانے والا، طالبان فلاح کو توفیق دینے والا اور عالمین کا مولا و حاکم ہے۔ اس کا حق ہر مخلوق پر یہ ہے کہ راحت و تکلیف اور نرم و گرم میں اس کی حمد و ثنا کرے اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرے۔ میں اس پر اور اس کے ملائکہ، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں، اس کے حکم کو سنتا ہوں اور اطاعت کرتا ہوں، اس کی مرضی کی طرف سبقت کرتا ہوں اور اس کے فیصلہ کے سامنے

سراپا تسلیم ہوں اس لیے کہ اس کی اطاعت میرا فرض ہے اور اس کے عتاب کے خوف کی بنا پر کہ نہ کوئی اس کی تدبیر سے بچ سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کے ظلم کا خطرہ ہے میں اپنے لیے بندگی اور اس کے لیے ربوبیت کا اقرار کرتا ہوں اور اس کے پیغام وحی کو پہونچانا چاہتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوتاہی کی شکل میں وہ عذاب نازل ہو جائے جس کا دفع کرنے والا کوئی نہ ہو — اس خدائے وحدہٗ لاشریک نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے اس پیغام کو نہ پہونچایا تو اس کی رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اس نے میرے لیے حفاظت کی ضمانت لی ہے۔ اس خدائے کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ، اے رسول! جو حکم تمہاری طرف علیؑ کے بارے میں نازل کیا گیا ہے، اسے پہونچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو رسالت کی تبلیغ نہیں کی اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

ایہا الناس! میں نے حکم کی تعمیل میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور میں اس آیت کا سبب واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جبریل بار بار میرے پاس یہ حکم پروردگار لے کر نازل ہوئے کہ میں اسی مقام پر ٹھہر کر ہر سفید و سیاہ کو یہ اطلاع دے دوں کہ علیؑ بن ابی طالب میرے بھائی، وصی، جانشین اور میرے بعد امام ہیں۔ ان کی منزل میرے لیے ویسی ہی ہے جیسے موسیٰ کے لیے ہارون کی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، وہ اللہ و رسول کے بعد تمہارے حاکم ہیں اور اس کا اعلان خدا نے اپنی کتاب میں کیا ہے کہ، بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

علیؑ ابن ابی طالب نے نماز قائم کی ہے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دی ہے، وہ ہر حال میں رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں۔ میں نے جبریل کے ذریعہ یہ گذارش کی کہ اس وقت تمہارے سامنے اس پیغام کو پہونچانے سے معذور رکھا جائے اس لیے کہ متقین کی قلت ہے اور منافقین کی کثرت، فساد کرنے والے، بدعمل اور اسلام کا مذاق اڑانے والے منافقین کی مکاری کا بھی خطرہ ہے، جن کے بارے میں خدا نے صاف کہہ دیا ہے کہ "یہ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے، اور یہ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ پیش پروردگار یہ بہت بڑی بات ہے۔" ان لوگوں نے بارہا مجھے اذیت پہونچائی ہے یہاں تک کہ مجھے "کاہن" کہنے لگے ہیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ میں ایسا ہی ہوں

اسی لیے خدا نے آیت نازل کی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نبی کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو فقط کان ہیں، تو پیغمبر کہہ دیجیے کہ اگر ایسا ہے تو تمھارے حق میں یہی خیر ہے، ورنہ میں چاہوں تو ایک ایک کا نام بھی بتا سکتا ہوں اور اس کی طرف اشارہ بھی کر سکتا ہوں اور لوگوں کے لیے نشان دہی بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ان معاملات میں کرم اور بزرگی سے کام لیتا ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مرضیٔ خدا یہی ہے کہ میں اس حکم کی تبلیغ کر دوں۔ لہذا لوگو! ہوشیار رہو کہ اللہ نے علیؑ کو تمھارا ولی اور امام بنا دیا ہے اور ان کی اطاعت کو تمام مہاجرین، انصار اور ان کے تابعین اور ہر شہری، دیہاتی، عجمی، عربی، آزاد، غلام، صغیر، کبیر، سیاہ، سفید پر واجب کر دیا ہے۔ ہر توحید پرست کے لیے ان کا حکم جاری، ان کا امر نافذ اور ان کا قول قابلِ اطاعت ہے، ان کا مخالف ملعون اور ان کا پیرو مستحق رحمت ہے۔ جو ان کی تصدیق کرے گا اور ان کی بات سُن کر اطاعت کرے گا اللہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔

ایھا الناس! یہ اس مقام پر میرا آخری قیام ہے لہذا میری بات سنو، اور اطاعت کرو اور اپنے پروردگار کے حکم کو تسلیم کرو۔ اللہ تمھارا رب، ولی اور پروردگار ہے اور اس کے بعد اس کا رسول محمدؐ تمھارا حاکم ہے جو آج تم سے خطاب کر رہا ہے۔ اس کے بعد علیؑ تمھارا ولی اور بحکم خدا تمھارا امام ہے۔ اس کے بعد امامت میری ذرّیت اور اس کی اولاد میں تا روز قیامت باقی رہے گی۔

حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال کیا ہے اور حرام وہی ہے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ یہ سب اللہ نے مجھے بتایا تھا اور میں نے سارے علم کو علیؑ کے حوالہ کر دیا۔

ایھا الناس! کوئی علم ایسا نہیں ہے جو اللہ نے مجھے عطا نہ کیا ہو، اور جو کچھ خدا نے مجھے عطا کیا تھا سب میں نے علیؑ کے حوالہ کر دیا۔ یہ امام المتقین بھی ہے اور امام المبین بھی ہے۔

ایھا الناس! علیؑ سے بھٹک نہ جانا، ان سے بیزار نہ ہو جانا اور ان کی ولایت کا انکار نہ کر دینا کہ وہی حق کی طرف ہدایت کرنے والے، حق پر عمل کرنے والے، باطل کو فنا کر دینے والے اور اس سے روکنے والے ہیں، انھیں اس راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ سب سے پہلے اللہ و رسولؐ پر ایمان لائے اور اپنی جان سے رسولؐ

پر قربان تھے ہمیشہ خدا کے رسولؐ کے ساتھ رہے جب کہ رسولؐ کے علاوہ کوئی عبادت خدا کرنے والا نہ تھا۔ ایھا الناس! انھیں افضل قرار دو کہ انھیں اللہ نے فضیلت دی ہے اور انھیں قبول کرو کہ انھیں اللہ نے امام بنایا ہے۔ ایھا الناس! وہ اللہ کی طرف سے امام ہیں، اور جو ان کی ولایت کا انکار کرے گا نہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور نہ اس کی بخشش کا کوئی امکان ہے بلکہ اللہ کا حق ہے کہ وہ اس امر پر مخالفت کرنے والے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدترین عذاب نازل کر دے۔ لہٰذا تم ان کی مخالفت سے بچو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جہنم میں داخل ہو جاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جس کو کفار کے لیے مہیّا کیا گیا ہے۔

ایھا الناس! خدا گواہ ہے کہ سابق کے تمام انبیاء و مرسلین کو میری بشارت دی گئی ہے اور میں خاتم الانبیاء و المرسلین اور زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کے لیے حجت پروردگار ہوں۔ جو اس بات میں شک کرے گا وہ گذشتہ جاہلیت جیسا کافر ہو جائے گا۔ اور جس نے میری کسی ایک بات میں بھی شک کیا اس نے گویا تمام باتوں کو مشکوک قرار دیا اور اس کا انجام جہنم ہے۔

ایھا الناس! اللہ نے جو مجھے یہ فضیلت عطا کی ہے یہ اس کا کرم اور احسان ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور وہ ہمیشہ تا ابد اور ہر حال میں میری حمد کا حق دار ہے۔

ایھا الناس! علیؑ کی فضیلت کا اقرار کرو کہ وہ میرے بعد ہر مرد و زن سے افضل و برتر ہے۔ اللہ نے ہمارے ہی ذریعہ رزق کو نازل کیا ہے اور مخلوقات کو باقی رکھا ہے۔ جو میری اس بات کو رد کر دے وہ ملعون ہے ملعون ہے اور مغضوب ہے مغضوب ہے۔ جبریل نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ پروردگار کا ارشاد ہے کہ جو علیؑ سے دشمنی کرے گا اور انھیں اپنا حاکم تسلیم نہ کرے گا اس پر میری لعنت اور میرا غضب ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے کیا مہیا کیا ہے۔ اس کی مخالفت کرتے وقت اللہ سے ڈرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قدم راہ حق سے پھسل جائیں اور اللہ تمھارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

ایھا الناس! علیؑ وہ جَنبُ اللہ ہے جس کے بارے میں قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ ظالمین افسوس کریں گے کہ انھوں نے جنب اللہ کے بارے میں کوتاہی کی ہے۔

ایھا الناس! قرآن میں فکر کرو، اس کی آیات کو سمجھو، محکمات کو نگاہ میں رکھو اور

متشابہات کے پیچھے نہ پڑو۔ خدا کی قسم قرآن مجید کے احکام اور اس کی تفسیر کو اس کے علاوہ کوئی واضح نہ کر سکے گا۔ جس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے اور جس کا بازو تھام کر میں نے بلند کیا ہے اور جس کے بارے میں میں یہ بتا رہا ہوں کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ یہ علیؑ بن ابی طالب میرا بھائی بھی ہے اور وصی بھی۔ اس کی محبت کا حکم اللہ کی طرف سے ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔

ایھا الناس! علیؑ اور میری اولادِ طیبین ثقل اصغر ہیں اور قرآن ثقل اکبر ہے ان میں ہر ایک دوسرے کی خبر دیتا ہے اور اس سے جدا نہ ہوگا یہاں تک کہ دونوں حوض کوثر پر وارد ہوں۔ یہ میری اولاد مخلوقات میں احکام خدا کے امین اور زمین میں ملک خدا کے حکام ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ میں نے تبلیغ کر دی میں نے پیغام کو پہونچا دیا۔ میں نے بات سنا دی۔ میں نے حق کو واضح کر دیا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جو اللہ نے کہا وہ میں نے دُہرا دیا۔ پھر آگاہ ہو جاؤ کہ امیر المومنین میرے اس بھائی کے علاوہ کوئی نہیں ہے اور اس کے علاوہ یہ منصب کسی کے لیے سزاوار نہیں ہے۔

(اس کے بعد علیؑ کو اپنے ہاتھوں پر اتنا بلند کیا کہ ان کے قدم رسولؐ کے گھٹنوں کے برابر ہو گئے۔ اور فرمایا)

ایھا الناس! یہ علیؑ میرا بھائی اور وصی اور میرے علم کا مخزن اور امت پر میرا خلیفہ ہے۔ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والا، اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے والا، اس کے دشمنوں سے جہاد کرنے والا، اس کی اطاعت پر ساتھ دینے والا، اس کی معصیت سے روکنے والا، اس کے رسولؐ کا جانشین اور مومنین کا امیر، امام اور ہادی ہے اور بیعت شکن، ظالم اور خارجی افراد سے جہاد کرنے والا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حکم خدا سے کہہ رہا ہوں میری کوئی بات بدل نہیں سکتی ہے۔ خدایا علیؑ کے دوست کو دوست رکھنا اور علیؑ کے دشمن کو دشمن قرار دینا، ان کے منکر پر لعنت کرنا اور ان کے حق کا انکار کرنے والے پر غضب نازل کرنا۔ پروردگارا! تو نے یہ وحی کی تھی کہ امامت علیؑ کے لیے ہے اور تیرے حکم سے میں نے انھیں مقرر کیا ہے۔ جس کے بعد تو نے دین کو کامل کر دیا، نعمت کو تمام کر دیا اور اسلام کو

پسندیدہ دین قرار دے دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا وہ دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں خسارہ والوں میں ہوگا ــــ پروردگارا! میں تجھے گواہ قرار دیتا ہوں کہ میں نے تیرے حکم کی تبلیغ کر دی۔

ایھا الناس! اللہ نے دین کی تکمیل علیؑ کی امامت سے کی ہے۔ لہذا جو علیؑ اور ان کے صلب سے آنے والی میری اولاد کی امامت کا اقرار نہ کرے گا۔ اس کے اعمال برباد ہو جائیں گے وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ ایسے لوگوں کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ ان پر نگاہ رحمت کی جائے گی۔

ایھا الناس! یہ علیؑ ہے تم میں سب سے زیادہ میری مدد کرنے والا، مجھ سے قریب تر اور میری نگاہ میں عزیز تر ہے۔ اللہ اور میں دونوں اس سے راضی ہیں۔ قرآن مجید میں جو بھی رضا کی آیت ہے وہ اسی کے بارے میں ہے اور جہاں بھی یا ایھا الذین اٰمنوا کہا گیا ہے اس کا پہلا مخاطب یہی ہے۔ ہر آیت مدح اسی کے بارے میں ہے۔ ھَلْ اَتٰی میں جنت کی شہادت اسی کے حق میں دی گئی ہے اور یہ سورہ اس کے علاوہ کسی غیر کی مدح میں نہیں نازل ہوا ہے۔

ایھا الناس! یہ دین خدا کا مددگار، رسولؐ خدا سے دفاع کرنے والا، متقی، پاکیزہ صفت، ہادی اور مہدی ہے۔ تمہارا نبی بہترین نبی اور اس کا وصی بہترین وصی ہے اور اس کی اولاد بہترین اوصیاء ہیں۔

ایھا الناس! ہر نبی کی ذریت اس کے صلب سے ہوتی ہے اور میری ذریت علیؑ کی صلب سے ہے۔

ایھا الناس! ابلیس آدمؑ کے مسئلہ میں حسد کا شکار ہوا۔ لہذا خبردار! تم علیؑ سے حسد نہ کرنا کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہارے قدموں میں لغزش پیدا ہو جائے۔ آدم صفی اللہ ہونے کے باوجود ایک ترک اولیٰ پر زمین میں بھیج دیے گئے تو تم کیا ہو اور تمہاری کیا حقیقت ہے۔ تم میں تو دشمنانِ خدا بھی پائے جاتے ہیں۔ یاد رکھو علیؑ کا دشمن صرف شقی ہوگا اور علیؑ کا دوست صرف تقی ہوگا۔ اس پر ایمان رکھنے والا صرف مومن مخلص ہی ہو سکتا ہے اور انھیں کے بارے میں سورۂ عصر نازل ہوا ہے۔

ایھا الناس! میں نے خدا کو گواہ بنا کر اپنے پیغام کو پہونچا دیا اور رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ایھا الناس! اللہ سے ڈرو، جو ڈرنے کا حق ہے۔ اور خبردار! اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک اس کے اطاعت گذار نہ ہو جاؤ۔

ایھا الناس! اللہ، اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لاؤ جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ خدا اچھے چہروں کو بگاڑ دے اور انہیں پشت کی طرف پھیر دے۔

ایھا الناس! نور کی پہلی منزل میں ہوں۔ میرے بعد علیؑ اور ان کے بعد ان کی نسل ہے اور یہ سلسلہ اس مہدی قائم تک برقرار رہے گا جو اللہ کا حق اور ہمارا حق حاصل کرے گا! اس لیے کہ اللہ نے ہم کو تمام مقصرین، معاندین، مخالفین، خائنین، آثمین اور ظالمین کے مقابلہ میں اپنی حجت قرار دیا ہے۔

ایھا الناس! میں تمہیں باخبر کرنا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے لیے اللہ کا نمائندہ ہوں جس سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا میں مر جاؤں یا قتل ہو جاؤں تو تم اپنے پرانے دین پر پلٹ جاؤ گے؟ تو یاد رکھو جو پلٹ جائے گا وہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کرے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جزا دینے والا ہے۔

آگاہ ہو جاؤ کہ علیؑ کے صبر و شکر کی تعریف کی گئی ہے اور ان کے بعد میری اولاد کو صابر و شاکر قرار دیا گیا ہے جو ان کے صلب سے ہے۔

ایھا الناس! اللہ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو کہ وہ تم سے ناراض ہو جائے اور تم پر اس کی طرف سے عذاب نازل ہو جائے کہ وہ مسلسل تم کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے۔

ایھا الناس! عنقریب میرے بعد ایسے راہنما پیدا ہوں گے جو جہنم کی دعوت دیں گے اور روز قیامت کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا۔ اللہ اور میں دونوں ان لوگوں سے بری اور بیزار ہیں۔

ایھا الناس! یہ لوگ اور ان کے اتباع و انصار سب جہنم کے پست ترین درجے میں ہوں گے اور یہ متکبر لوگوں کا بدترین ٹھکانا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہ لوگ اصحاب صحیفہ ہیں لہٰذا ان کے صحیفہ پر تمہیں نگاہ رکھنی چاہیے۔ لوگوں کی قلیل جماعت کے علاوہ سب صحیفہ کی بات بھول چکے

ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میں امامت کو امانت اور قیامت تک کے لیے اپنی اولاد میں وراثت قرار دے کر جا رہا ہوں اور مجھے جس امر کی تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا میں نے اس کی تبلیغ کر دی ہے تاکہ ہر حاضر و غائب، موجود و غیر موجود، مولود و غیر مولود سب پر حجت تمام ہو جائے۔ اب حاضر کا فریضہ ہے کہ یہ پیغام غائب تک پہنچائے اور ہر باپ کا فریضہ ہے کہ قیامت تک اس پیغام کو اپنی اولاد کے حوالے کرتا رہے اور عنقریب لوگ اس کو غصبی ملکیت بنا لیں گے۔ خدا غاصبین پر لعنت کرے۔ قیامت میں تمام حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی اور آگ کے شعلے برسائے جائیں گے جب کوئی کسی کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

ایھا الناس! اللہ تم کو انہیں حالات میں نہ چھوڑے گا جب تک خبیث اور طیب کو الگ الگ نہ کر دے اور اللہ تم کو غیب پر باخبر کرنے والا نہیں ہے۔

ایھا الناس! کوئی قریہ ایسا نہیں ہے جسے اللہ اس کی تکذیب کی بنا پر ہلاک نہ کر دے وہ اسی طرح ظالم بستیوں کو ہلاک کرتا رہا ہے۔ علیؑ تمہارے امام اور حاکم ہیں یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ صادق الوعد ہے۔

ایھا الناس! تم سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے ہیں اور اللہ ہی نے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے اور وہی بعد کے ظالموں کو ہلاک کرنے والا ہے۔

ایھا الناس! اللہ نے امر و نہی کی مجھے ہدایت کی ہے اور میں نے اسے علیؑ کے حوالہ کر دیا ہے وہ امر و نہی الٰہی سے باخبر ہیں۔ ان کے امر کی اطاعت کرو تاکہ سلامتی پاؤ، ان کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔ ان کے روکنے پر رک جاؤ تاکہ راہ راست پر آجاؤ۔ ان کی مرضی پر چلو اور مختلف راستوں پر منتشر نہ ہو جاؤ۔ میں وہ صراط مستقیم ہوں جس کے اتباع کا خدا نے حکم دیا ہے۔ پھر میرے بعد علیؑ ہیں اور ان کے بعد میری اولاد جو ان کے صلب سے ہے۔ یہ سب وہ امام ہیں جو حق کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں اور حق کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین

(سورہ حمد کی تلاوت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا) یہ سورہ میرے اور میری اولاد کے بارے میں نازل ہوا ہے، اس میں اولاد کے لیے عمومیت بھی ہے اور اولاد کے ساتھ خصوصیت بھی ہے۔ یہی میری اولاد وہ اولیاء ہیں جن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن! یہ حزب اللہ

ہیں جو ہمیشہ غالب رہنے والے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ دشمنانِ علیؑ ہی اہلِ تفرقہ، اہلِ تعدی اور برادرانِ شیطان ہیں جن میں ایک دوسرے کی طرف مہمل باتوں کے خفیہ اشارے کرتا رہتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دوست ہی مومنین برحق ہیں جن کا ذکر پروردگار نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ "تم کسی ایسی قوم کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو نہ دیکھو گے کہ وہ اللہ اور رسول کے دشمنوں سے محبّت رکھیں۔۔۔" آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دوست ہی وہ افراد ہیں جن کی توصیف پروردگار نے اس انداز سے کی ہے۔ "جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انھیں کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں"۔ آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دوست ہی وہ ہیں جو جنت میں امن و سکون کے ساتھ داخل ہوں گے اور ملائکہ سلام کے ساتھ یہ کہہ کے ان کا استقبال کریں گے کہ تم طیب و طاہر ہو، لہٰذا جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔"

آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دوست ہی وہ ہیں جن کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے کہ "یہ جنّت میں بغیر حساب داخل ہوں گے۔"

آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دشمن ہی وہ ہیں جو جہنم میں تپائے جائیں گے اور جہنم کی آواز اس عالم میں سُنیں گے کہ اس کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے اور ہر داخل ہونے والا گروہ دوسرے گروہ پر لعنت کرے گا۔

آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دشمن ہی وہ ہیں جن کے بارے میں پروردگار کا فرمان ہے کہ جب کوئی گروہ داخل جہنم ہوگا تو جہنم کے خازن سوال کریں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟

آگاہ ہو جاؤ کہ ان کے دوست ہی وہ ہیں جو اللہ سے از غیب ڈرتے ہیں اور انھیں کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

ایہا الناس! دیکھو جنت و جہنم میں کتنا بڑا فاصلہ ہے۔ ہمارا دشمن وہ ہے جس کی اللہ نے مذمّت کی ہے، اس پر لعنت کی ہے اور ہمارا دوست وہ ہے جس کو اللہ دوست رکھتا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔

ایہا الناس! آگاہ ہو جاؤ کہ میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہادی ہیں۔ ایہا الناس! میں نبی ہوں اور علیؑ میرے وصی ہیں۔ یاد رکھو کہ آخری امام ہمارا ہی قائم مہدیؑ ہے، وہی ادیان پر غالب آنے والا اور ظالموں سے انتقام لینے والا ہے، وہی قلعوں کا فتح کرنے والا اور ان کا منہدم کرنے والا ہے۔ وہی مشرکین کے ہر گروہ کا قاتل اور اولیاء اللہ کے ہر خون کا انتقام لینے والا ہے، وہی دین خدا کا مددگار اور ولایت کے عمیق سمندر سے سیراب کرنے والا ہے۔

وہی ہر صاحب فضل پر اس کے فضل اور ہر جاہل پر اس کی جہالت کا نشان لگانے والا ہے۔

آگاہ ہو جاؤ کہ وہی اللہ کا منتخب اور پسندیدہ ہے۔ وہی ہر علم کا وارث اور اس پر احاطہ رکھنے والا ہے، وہی پروردگار کی طرف سے خبر دینے والا اور امر ایمانی کی تنبیہ کرنے والا ہے، وہی رشید اور صراط مستقیم پر چلنے والا ہے، اسی کو اللہ نے اپنا قانون سپرد کیا ہے اور اسی کی بشارت دور سابق میں دی گئی ہے، وہی حجت باقی ہے اور اس کے بعد کوئی حجت نہیں ہے۔ ہر حق اس کے ساتھ ہے اور ہر نور اس کے پاس ہے۔ اس پر غالب آنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ زمین پر خدا کا حاکم، مخلوقات میں اس کی طرف سے حَکَم اور خفیہ اور علانیہ ہر مسئلہ میں اس کا امین ہے۔

ایہا الناس! میں نے سب بیان کر دیا اور سمجھا دیا، اب میرے بعد یہ علیؑ تمھیں سمجھائیں گے۔ آگاہ ہو جاؤ! کہ میں تمھیں خطبہ کے اختتام پر اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ پہلے میرے ہاتھ پر ان کی بیعت کا اقرار کرو، اس کے بعد ان کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ میں نے اللہ کے ہاتھ اپنا نفس بیچا ہے اور علیؑ نے میری بیعت کی ہے اور میں تم سے علیؑ کی بیعت لے رہا ہوں۔ جو اس بیعت کو توڑ دے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

ایہا الناس! یہ حج اور عمرہ، اور یہ صفا و مروہ سب شعائر اللہ ہیں، لہٰذا حج اور عمرہ کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے۔

ایہا الناس! خانۂ خدا کا حج کرو، جو لوگ یہاں آجاتے ہیں وہ بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور جو اس سے الگ ہو جاتے ہیں وہ محتاج ہو جاتے ہیں۔

ایہا الناس! کوئی مومن کسی موقف میں وقوف نہیں کرتا مگر یہ کہ خدا اس وقت تک

کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ لہٰذا حج کے بعد سے از سرِ نو نیک اعمال کا سلسلہ شروع کرنا چاہیے۔

ایہا الناس! حجاج خدا کی طرف سے محل امداد ہیں اور ان کے اخراجات کا اس کی طرف سے معاوضہ دیا جاتا ہے، اور اللہ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے۔

ایہا الناس! پورے دین اور معرفت احکام کے ساتھ حج بیت اللہ کرو، اور جب وہاں سے واپس ہو تو مکمل توبہ اور ترک گناہ کے ساتھ۔

ایہا الناس! نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو جس طرح کہ اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ اگر وقت زیادہ گزر گیا ہے اور تم نے کوتاہی و نسیان سے کام لیا ہے تو علیؑ تمھارے ولی اور تمھارے لیے ان احکام کے بیان کرنے والے ہیں جن کو اللہ نے میرے بعد معین کیا ہے اور میرا جانشین بنایا ہے وہ تمھارے ہر سوال کا جواب دیں گے اور جو کچھ تم نہیں جانتے ہو سب بیان کر دیں گے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ حلال و حرام اتنے زیادہ ہیں کہ سب کا احصار اور بیان ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں تمام حلال و حرام کی امر و نہی اس مقام پر یہ کہہ کر بیان کیے دیتا ہوں کہ میں تم سے علیؑ کی بیعت لے لوں اور تم سے یہ عہد لے لوں کہ جو پیغام علیؑ اور ان کے بعد کے ائمہ کے بارے میں خدا کی طرف سے لایا ہوں، تم ان سب کا اقرار کر لو۔

"کہ یہ سب مجھ سے ہیں اور ان میں ایک امت قیام کرنے والی ہے جن میں سے مہدیؑ بھی ہے جو قیامت تک حق کے ساتھ فیصلہ کرتا رہے گا۔"

ایہا الناس! میں نے جس جس حلال کی رہنمائی کی ہے اور جس جس حرام سے روکا ہے کسی سے نہ رجوع کیا ہے اور نہ ان میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ لہٰذا تم اسے یاد رکھو اور محفوظ کر لو، ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہو اور کسی طرح کی تبدیلی نہ کرنا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میں پھر دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے روکو، اور یہ یاد رکھو کہ امر بالمعروف کی اصل یہ ہے کہ میری بات کی تہہ تک پہونچ جاؤ، اور جو لوگ نہیں ہیں ان تک پہونچاؤ اور اس کے قبول کرنے کا حکم دو اور اس کی مخالفت سے منع کرو۔ اس لیے کہ یہی اللہ کا حکم ہے اور یہی میرا حکم بھی ہے اور امام معصوم کو چھوڑ کر نہ کوئی واقعی امر بالمعروف ہو سکتا ہے اور نہ نہی عن المنکر۔

ایہا الناس! قرآن نے بھی تمھیں سمجھایا ہے کہ علیؑ کے بعد امام ان کی اولاد ہے اور میں نے بھی سمجھایا ہے یہ سب میرے اور علیؑ کے اجزا ہیں جیسا کہ پروردگار نے فرمایا ہے کہ اللہ نے انھیں اولاد میں کلمہ باقیہ قرار دے دیا ہے۔ اور میں نے بھی کہا کہ جب تک تم قرآن اور عترت سے متمسک رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔

ایہا الناس! تقویٰ اختیار کرو تقویٰ۔ قیامت سے ڈرو کہ اس کا زلزلہ بڑی عظیم شے ہے۔ موت، حساب، میزان، اللہ کی بارگاہ کا محاسبہ، ثواب اور عذاب سب کو یاد کرو کہ وہاں نیکیوں پر ثواب ملتا ہے اور برائی کرنے والے کا جنت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

ایہا الناس! تم اتنے زیادہ ہو کہ ایک ایک میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بیعت نہیں کر سکتے ہو۔ لہٰذا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھاری زبان سے علیؑ کے امیر المومنین ہونے اور ان کے بعد کے ائمہ جو ان کے صلب سے میری ذرّیت ہیں سب کی امامت کا اقرار لے لوں، لہٰذا تم سب مل کر کہو، ہم سب آپ کی بات کے سننے والے، اطاعت کرنے والے، راضی رہنے والے اور علیؑ اور اولاد علیؑ کے بارے میں جو پروردگار کا پیغام پہونچایا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ ہم اس بات پر اپنے دل، اپنی روح، اپنی زبان اور اپنے ہاتھوں سے بیعت کر رہے ہیں، اسی پر زندہ رہیں گے، اسی پر مریں گے اور اسی پر دوبارہ اٹھیں گے۔ نہ کوئی تغیر و تبدیلی کریں گے اور نہ کسی شک و ریب میں مبتلا ہوں گے، نہ عہد سے پلٹیں گے نہ میثاق کو توڑیں گے۔ اللہ کی اطاعت کریں گے۔ آپ کی اطاعت کریں گے اور علیؑ امیر المومنین اور ان کی اولاد ائمہؑ جو آپ کی ذرّیت میں ہیں ان کی اطاعت کریں گے۔ جن میں سے حسنؑ و حسینؑ کی منزلت کو اور ان کے مرتبہ کو اپنی اور خدا کی بارگاہ میں تمھیں دکھلا دیا ہے اور یہ پیغام پہونچا دیا ہے کہ یہ دونوں جوانان جنّت کے سردار ہیں اور اپنے باپ علیؑ کے بعد امام ہیں اور میں علیؑ سے پہلے ان دونوں کا باپ ہوں۔ اب تم لوگ یہ کہو کہ ہم نے اس بات پر اللہ کی اطاعت کی، آپ کی اطاعت کی، اور علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ائمہ جن کا آپ نے ذکر کیا ہے اور جن کے بارے میں ہم سے عہد لیا ہے سب کی دل و جان سے اور دست و زبان سے بیعت کی ہے۔ ہم اس کا کوئی بدل پسند نہیں کریں گے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی کریں گے۔ اللہ ہمارا گواہ ہے اور وہی گواہی کے لیے کافی ہے اور آپ

بھی ہمارے گواہ ہیں اور ہر ظاہر و باطن اور ملائکہ اور بندگانِ خدا سب اس بات کے گواہ ہیں اور اللہ ہر گواہ سے بڑا گواہ ہے۔

ایھا الناس! اب تم کیا کہتے ہو؟۔ یاد رکھو کہ اللہ ہر آواز کو جانتا ہے اور ہر نفس کی مخفی حالت سے باخبر ہے، جو ہدایت حاصل کرے گا وہ اپنے لیے اور جو گمراہ ہوگا وہ اپنا نقصان کرے گا۔ جو بیعت کرے گا اس نے گویا اللہ کی بیعت کی، اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

ایھا الناس! اللہ سے ڈرو، علیؑ کے امیرالمومنین ہونے اور حسنؑ و حسینؑ اور ائمہ کے کلمہ باقیہ ہونے کی بیعت کرو۔ جو غداری کرے گا اسے اللہ ہلاک کر دے گا اور جو وفا کرے گا اس پر رحمت نازل کرے گا، اور جو عہد کو توڑ دے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ایھا الناس! جو میں نے کہا ہے وہ کہو اور علیؑ کو امیرالمومنین کہہ کر سلام کرو، اور یہ کہو کہ پروردگار ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ہمیں تیری مغفرت چاہیے اور تیری ہی طرف ہماری بازگشت ہے اور یہ کہو کہ شکر پروردگار ہے کہ اس نے ہمیں اس امر کی ہدایت دی ہے ورنہ اس کی ہدایت کے بغیر ہم راہ ہدایت نہیں پا سکتے تھے۔

ایھا الناس! علیؑ ابن ابی طالبؑ کے فضائل اللہ کی بارگاہ سے ہیں اور اس نے قرآن میں بیان کیا ہے اور اس سے زیادہ ہیں کہ میں ایک منزل پر شمار کرا سکوں۔ لہٰذا جو بھی تمہیں خبر دے اور ان فضائل سے آگاہ کرے اس کی تصدیق کرو۔ یاد رکھو جو اللہ، رسولؐ، علیؑ اور ائمہ مذکورین کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی کا مالک ہوگا۔

ایھا الناس! جو علیؑ کی بیعت، ان کی محبت اور انھیں امیرالمومنین کہہ کر سلام کرنے میں سبقت کریں گے وہی جنت نعیم میں کامیاب ہوں گے۔ ایھا الناس! وہ بات کہو جس سے تمہارا خدا راضی ہو جائے ورنہ تم اور تمام اہل زمین بھی منکر ہو جائیں تو اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ پروردگار مومنین و مومنات کی مغفرت فرما اور کافرین پر اپنا غضب نازل فرما۔

والحمد للہ رب العالمین

نقشِ

حیاتِ جناب فاطمہ زہراؑ

ولادت۔ ۲۰؍ جمادی الثانیہ ۵ ؁ بعثت

شہادت۔ ۳؍ جمادی الثانیہ ۱۱ ؁ھ

نقشِ زندگانی حضرت فاطمہ زہراؑ

● اسم گرامی فاطمہؑ تھا جس کا انتخاب قدرت نے اس لیے کیا تھا کہ آپ اپنے اتباع کرنے والوں کو آتشِ جہنم سے نجات دلانے والی ہیں۔

● القاب: زہرا، راضیہ، مرضیہ، صدیقہ، بضعۃ الرسولؐ اور ام ابیہا وغیرہ۔ (آخری لقب کا راز یہ ہے کہ آپ نے پدر بزرگوار کو شفقت مادری بھی فراہم کی ہے اور آپ سے نسل کی بقا بھی رہی ہے۔

ولادت باسعادت سنہ ۵ بعثت میں ہوئی ہے یعنی بعثت رسولؐ کے پانچ برس بعد۔ اگرچہ بعض علماء نے بعثت سے پانچ برس پہلے لکھا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ جناب خدیجہ کے عقد اور معصومہؑ کی ولادت میں بیس سال کا فاصلہ نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ بطن جناب خدیجہ سے قاسم بعثت سے پہلے پیدا ہوئے اور دو سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ عبداللہ بھی بعثت سے پہلے پیدا ہوئے اور کمسنی میں وفات پا گئے۔ حالانکہ یہ بات عجیب و غریب ہے کہ دو فرزندوں کے بعد بیس سال کا فاصلہ نہیں رہ جاتا ہے بلکہ ۵ یا ۶ سال ہی کا رہ جاتا ہے۔

● جناب خدیجہ نے اپنے تمام پیغامات رد کر کے مرسل اعظمؐ سے عقد کیا تھا۔ اس وقت ولادت تمام عورتوں نے بائیکاٹ کر دیا اور کوئی امداد کے لیے نہ آیا تو قدرت نے جناب آسیہ، جناب مریم، جناب کلثوم خواہر حضرت موسیٰؑ جیسی مقدس خواتین کو خدمت کے لیے بھیج دیا جو راہِ خدا میں ایثار کرنے والوں کا انعام بھی ہے اور خدائے کریم کی غیبی امداد کا بہترین مرقع بھی ہے۔

● آپ سرکار دو عالمؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں اور زینب و ام کلثوم اور رقیہ سرکار کی ربیبہ

تھیں جن کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ یہ جناب خدیجہ کی بیٹیاں تھیں، یا جناب خدیجہ باکرہ تھیں اور ان کی بہن ہالہ کی بیٹیاں تھیں جیسا کہ بعض علماء نے ثابت کیا ہے اور اس کے بہت سے دلائل بیان کیے ہیں۔ یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی بیٹیاں نہیں تھیں، اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا عقد ۲۵ سال کی عمر میں بعثت سے ۱۵ سال پہلے ہوا ہے اور ۵ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور ان تینوں بیٹیوں کا عقد بعثت سے پہلے ہی عتبہ و عتیبہ فرزندان ابولہب اور ابوالعاص بن ربیع سے ہو چکا تھا، اور اب یہ بات تقریباً ناممکن، اور بعید از قیاس ہے کہ ۱۰ سال کے اندر تینوں بیٹیاں پیدا بھی ہوں اور ان کا عقد بھی ہو جائے جب کہ درمیان میں قاسم اور عبداللہ کی ولادت کا وقفہ بھی رکھنا پڑے گا۔

پھر اگر کسی صورت سے انھیں دختران پیغمبرؐ فرض بھی کر لیا جائے تو یہ وہ دختران ہیں جن کا عقد کفار سے ہو چکا ہے اور کفار سے عقد ہو جانے کے بعد مسلمان سے عقد نہ اسے مستحق منصب بنا سکتا ہے اور نہ ذوالنورین۔ ذوالنورین ہونے کے لیے لڑکی کا نور ہونا ضروری ہے، اور یہ شرف صدیقہ طاہرہؑ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔

● پانچ برس کی عمر میں سنہ ۱۰ بعثت میں ۱۰ رمضان المبارک کو جناب خدیجہ کا انتقال ہو گیا جو جناب فاطمہؑ کی زندگی کا پہلا عظیم صدمہ تھا اور جس کے بعد رسول اکرمؐ کے لیے فراق خدیجہؓ کا صدمہ اور شدید ہو گیا اور آپ برابر انھیں یاد کرنے لگے اور ان کی طرف سے صدقہ و خیرات نکالنے لگے یہاں تک کہ عائشہ نے ٹوک دیا کہ جوان ازواج کے ہوتے ہوئے بوڑھی زوجہ کے یاد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور آپ نے واضح کر دیا کہ یہ زوجہ کی یاد نہیں ہے۔ یہ خدیجہ کی یاد ہے جو اس وقت ایمان لائیں جب سب کافر تھے، اس وقت میری مالی امداد کی جب اسلام کو مال کی شدید ضرورت تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا نے مجھے خدیجہ کے ذریعہ اس وقت صاحب اولاد بنایا جب سب ابتر کے طعنے دے رہے تھے۔

● وفات جناب خدیجہؓ کے بعد جناب فاطمہؑ کا دوسرا امتحان اس وقت ہوا جب قدرت نے رسول اکرمؐ کو حکم ہجرت دے دیا اور آپ حضرت علیؑ کو بستر پر لٹا کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے جب کہ گھر دشمنوں اور قاتلوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا اور جناب فاطمہؑ گھر کے اندر موجود تھیں۔ لیکن تمام

رات کسی طرح کے خوف و ہراس کا اظہار نہیں کیا اور نہایت درجہ اطمینان کے ساتھ رات گذار دی بلکہ مدینہ روانگی کے موقع پر بھی ظالموں نے مزاحمت کی اور آپ نے اپنے سکون قلب اور توکل علی اللہ کا مظاہرہ کیا۔

● ہجرت کے بعد اسلام کا پہلا عظیم معرکہ جنگ بدر کی شکل میں پیش آیا جہاں مسلمان انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں تھے اور رسول اکرمؐ کو حکم جہاد مل چکا تھا۔ فطری بات ہے کہ باپ کے ان حالات میں بیٹی کو جہاد سے روکنا چاہیے تھا اور اس شکل میں اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہیے تھا لیکن جناب فاطمہؑ نے دین خدا کے معاملہ میں کسی طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہمیشہ ایثار و قربانی سے کام لیتی رہیں۔

● جنگ بدر کے خاتمہ کے بعد آپ کا عقد مولائے کائنات سے ہوا، جب کہ آپ کے فضائل و کمالات کا شہرہ سن کر تمام بڑے بڑے افراد نے آپ کے عقد کا پیغام دیا تھا اور وحی خدا نے سب کے پیغامات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ نور کا رشتہ صرف نور سے ہوسکتا ہے۔ یکم ذی الحجہ سنہ ۲ھ کو یہ عقد عمل میں آیا۔

● امیرالمومنینؑ کے پیغام پر رسول اکرمؐ نے مہر کا مطالبہ کیا۔ آپ کے پاس مال دنیا میں ایک تلوار، ایک رہوار اور ایک زرہ تھی۔ آپ نے زرہ کے فروخت کردینے کا حکم دیا۔ ۵۰۰ درہم میں زرہ فروخت ہوئی اور وہی رقم جناب سیدہ کا مہر قرار پائی، جس سے روز اول یہ واضح ہوگیا کہ مہر کی ادائیگی اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ اسے عقد سے پہلے ہی ہوجانا چاہیے چاہے اس کی راہ میں بہترین سامان زندگی فروخت کرنا پڑے۔ اور اس طرح اس عصری نظریہ کی واضح تردید ہوگئی کہ مہر صرف برائے تذکرہ ہوتا ہے اور اس کا ادائیگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، یا سامانِ زندگی فروخت کرنا ہے تو شادی کے انتظامات کے لیے کیا جائے مہر کی ادائیگی کے لیے نہیں۔

● مہر کی رقم لے کر رسول اکرمؐ نے جہیز کا انتظام کیا جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جہیز لعنت نہیں ہے سنت ہے البتہ اس کا انتظام مہر کی رقم سے ہونا چاہیے اور ضروریات زندگی کی حد تک محدود رہنا چاہیے۔ مہر سے زیادہ جہیز کا مطالبہ کرنا، یا مہر ادا کیے بغیر جہیز کا تقاضا

کرنا یقیناً ایک بدعت ہے جسے ظالمانہ حرکت اور نفسانیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جناب سیدہ کے جہیز کی کُل تفصیل یہ ہے:

(۱) ایک سفید پیراہن (۲) ایک چادر (۳) ایک حُلہ سیاہ (۴) ایک تخت خواب (۵) دو عدد توشک (۶) چار تکیے (۷) ایک چٹائی (۸) ایک چکی (۹) ایک کاسہ مسی (۱۰) ایک مشک (۱۱) ایک ظرف لباس شوئی (۱۲) ایک کاسۂ شیر (۱۳) ایک ظرف آبخوری (۱۴) ایک پردہ (۱۵) ایک لوٹا (۱۶) ایک پوست برائے فرش (۱۷) ایک سبوئے گلی (۱۸) دو مٹی کے پیالے (۱۹) ایک عبا۔

اس سامان کی مجموعی قیمت ۶۳ درہم تھی جب کہ مہر کی رقم ۵۰۰ یا ۴۸۰ درہم تھی۔ اس تفصیل سے جہیز کی نوعیت کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے اور مہر کے مقابل میں اس کی مالیت کا بھی۔ کاش ہمارے بزرگوں نے مہمل رسموں اور نام و نمود کے ڈھکوسلوں سے قطع نظر کر کے سیرت معصومینؑ کو رواج دیا ہوتا تو آج قوم و ملت اس قدر مصائب سے دوچار نہ ہوتی اور مسلمانوں میں مہنگی شادی سستی بدکاری کا پیش خیمہ نہ بنتی۔

● عقد کے چند دنوں کے بعد رخصتی کا انتظام ہوا، بنی ہاشم کی خواتین، مخصوص اصحاب کرام نے اس جلوس میں حصہ لیا اور نہایت احترام کے ساتھ دختر پیغمبرؐ کو مولائے کائنات کے گھر پہونچا دیا گیا اور اس طرح ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

● اس موقع پر انتظامات میں جناب اسماء کا ذکر کیا جاتا ہے جب کہ وہ اس وقت جناب جعفر طیار کی زوجہ تھیں اور سنہ ۵ بعثت میں ان کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی تھیں اور جعفر طیّار کی مکمل واپسی سنہ ۷ھ میں جنگ خیبر کے بعد ہوئی ہے۔ اس لیے بعض علماء نے اسماء بنت عمیس کے بجائے دوسری خاتون کا احتمال دیا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ مہاجرین کی مدینہ آمد و رفت جاری تھی اور اسی ذیل میں جناب اسماء بھی آگئی ہوں گی جس طرح کہ علامہ مجلسیؒ نے اس موقع پر خود جناب جعفر طیار کی شرکت کا بھی ذکر کیا ہے حالانکہ ان کی باقاعدہ واپسی سنہ ۷ھ میں ہوئی ہے۔

● دوسرے دن رسول اکرمؐ بیٹی کے گھر تشریف لے آئے اور داماد سے یہ سوال کیا کہ تم نے اپنی زوجہ کو کیسا پایا ہے؟ تو حضرت علیؑ نے عرض کی کہ عبادت خدا میں بہترین مددگار۔ جس سے

داماد اور خسر کی گفتگو کا انداز، رشتہ کی پاکیزگی کا فلسفہ اور زوجہ کی عظمت وجلالت کا راز کھل کر سامنے آگیا کہ اسلام میں مال وجمال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اصل ایمان وکردار ہے اور اس میں حضرت علیؑ کے علاوہ کائنات میں کوئی مرد صدیقہ طاہرہؑ کا مثل ونظیر نہیں ہے۔

● سنہ ۳ھ میں جنگ احد پیش آئی جو جناب فاطمہؑ کی زندگی کا دوسرا امتحان تھا۔ جہاں صورت حال ایسی خراب ہوگئی کہ امیرالمومنینؑ نے بھی حفاظت رسولؐ میں سولہ گہرے زخم کھائے اور رسول اکرمؐ کا چہرۂ مبارک بھی زخمی ہوگیا۔ لیکن جناب سیدہ نے کسی خوف وہراس کا مظاہرہ کرنے کے بجائے باپ کی مرہم پٹی بھی کی، شوہر کا علاج بھی کیا اور ذوالفقار حیدری کی صفائی کا فرض بھی انجام دیا جب کہ احد کے حالات نے بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا کردیے تھے اور بہادران وقت نے فرار کا راستہ اختیار کرنے کو غنیمت سمجھا تھا۔

● جنگ احزاب سنہ ۵ھ اور خیبر سنہ ۷ھ کے معرکے بھی جناب سیدہ کے سامنے پیش آتے رہے اور ہر معرکہ میں حضرت علیؑ جان کی بازی لگاتے رہے لیکن کبھی جناب سیدہ نے باپ سے یہ نہیں کہا کہ یہ کام آگئے تو آپ کی بیٹی کا کیا ہوگا؟ مناسب یہی ہے کہ دوسرے اصحاب کو قربان گاہ کے حوالے کردیجیے بلکہ برابر اس بات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور اسے اپنے فضائل وکمالات میں شمار کیا کہ رب العالمین نے مجھے ایسا شوہر عطا کیا ہے جو راہِ خدا کا مجاہد اور اسلام کی خاطر جان قربان کردینے والا ہے۔ ماں ایسی کہ دین کے لیے سارا مال قربان کردے۔ باپ ایسا کہ مذہب کے لیے ہر مصیبت برداشت کرلے اور شوہر ایسا کہ اسلام کی بقا اور رسول اکرمؐ کے تحفظ کے لیے ہر معرکہ میں جان کی بازی لگادے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست

● سنہ ۷ھ میں رسول اکرمؐ نے آپ کو فضہ جیسی کنیز عطا فرمائی تو اس کے ساتھ بھی آپ کا برتاؤ یہ رہا کہ گھر کا کام ایک دن فضہ کرے اور آپ آرام کریں، اور ایک دن آپ کریں اور فضہ آرام کرے تاکہ اسلامی مساوات بھی برقرار رہے اور کنیزوں کو کنیزی اور ذلت کا احساس بھی نہ ہونے پائے۔

● سنہ ۹ھ مباہلہ میں نصاریٰ نجران کی بے جا ضد پر جب مباہلہ کی نوبت آگئی اور یہ طے ہوگیا کہ فریقین اپنے اپنے گھر والوں کو لے کر میدان میں آکر مباہلہ کریں گے اور لعنت خدا کے

ذریعہ عیسیٰ بن مریم کے بندۂ خدا یا فرزند خدا ہونے کا فیصلہ ہوگا، تو رسول اکرمؐ اپنے گھر والوں میں حضرت علیؑ، حضرت حسنؑ وحسینؑ کے علاوہ جناب فاطمہؑ کو بھی میدان مباہلہ میں لے آئے اور اس اہتمام کے ساتھ لے آئے کہ آگے خود رہے اور پیچھے حضرت علیؑ کو رکھا اور درمیان میں جناب فاطمہؑ کو رکھا تاکہ جناب فاطمہؑ کا مکمل پردہ اور ان کی مرکزی شخصیت بھی برقرار رہے اور اسلام کا انصاف وعدالت بھی مکمل ہوجائے کہ اسلام میں یہ وہ بلند پایہ صادق افراد ہیں جن کو جھوٹوں پر لعنت کرنے کا حق ہے اور جن کی لعنت پر عذاب الٰہی نازل ہوسکتا ہے جیسا کہ عالم نصاریٰ نے خود اقرار کیا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ یہ اگر خدا سے بددعا کردیں تو روئے زمین پر کوئی ایک بھی عیسائی نہ رہ جائے گا۔

● سنہ ۱۰ھ میں رسول اکرمؐ نے ہجرت کے بعد زندگی کا پہلا اور آخری حج انجام دیا جس میں تمام اہل خانہ کو بھی شرکت کی دعوت دی اور حج کی واپسی پر مقام غدیر میں حضرت علیؑ کی ولائیت کا اعلان کیا جو جناب فاطمہؑ کے لیے مستقبل میں امت کو ہوشیار کرنے کا بہترین سامان تھا اور جس سے آپ نے مختلف مقامات پر استدلال بھی فرمایا ہے۔

● سنہ ۱۱ھ میں ماہ صفر کی ۲۸ تاریخ کو رسول اکرمؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی اور اس وقت آپ کا قیام صدیقہ طاہرہؑ کے گھر میں تھا اور سر آپ کی آغوش میں تھا، ملک الموت نے آواز دی، صدیقہ طاہرہؑ نے رسول اکرمؐ کو اطلاع دی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اجازت دے دو۔ یہ ملک الموت کسی کے دروازے پر اجازت نہیں لیتا ہے۔ یہ صرف تمہارے در کا شرف ہے کہ بغیر اجازت اندر نہیں آرہا ہے۔

● رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد صدیقہ طاہرہؑ نے پہلا انقلاب یہ دیکھا کہ مسلمانوں نے سقیفہ میں جمع ہوکر اس خلافت کا فیصلہ شروع کردیا جس کا فیصلہ میدان غدیر خم میں ہوچکا تھا اور اس طرح کم سے کم ایک لاکھ چودہ ہزار اصحاب چھوڑ کر جانے والے پیغمبرؐ کے جنازہ میں صرف انگلیوں پر گنے جانے والے افراد نے شرکت کی اور صدیقہ طاہرہؑ نے چند گھنٹوں میں بے رُخی اور بے وفائی کا یہ آغاز بھی دیکھ لیا۔

● خلافت کے فیصلہ کے بعد مسلمانوں نے صدیقہ طاہرہؑ کے گھر کا رُخ کیا اور باپ کے انتقال کی تعزیت پیش کرنے کے بجائے یہ مطالبہ کیا کہ علیؑ کو گھر سے باہر نکالو کہ دربار میں آکر خلیفۂ وقت

کی بیعت کریں ورنہ گھر میں آگ لگا دی جائے گی۔ اور بعض روایات کی بنا پر دروازہ سے اُٹھتا ہوا دھواں بھی دکھائی دیا۔ جس کے بعد دروازہ صدیقہ طاہرہؑ کے پہلوئے اقدس پر گرایا گیا، اور آپ کے فرزند محسن نے شکم مادر میں شہادت پائی اور حضرت علیؑ کے گلے میں رسّی ڈال کر دربار میں لے گئے کہ ان سے جبری بیعت کا مطالبہ کیا جائے۔ صدیقہ طاہرہؑ نے فریاد کی کہ میں قمیصِ رسولؐ کو سر پر رکھ کر بددعا کروں گی جس پر مسجد پیغمبرؐ کی دیواریں بلند ہوگئیں اور حضرت علیؑ نے سلمان کے ذریعہ پیغام بھیج کر خاموش کر دیا۔

بیعت کے مطالبہ کے بعد حکومت وقت نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ وہ فدک جو رسول اکرمؐ کا خالصہ تھا اور جسے آپ نے صاحبان قرابت کے حق ادا کرنے کے حکم الٰہی پر جناب فاطمہؑ کو ہبہ کر دیا تھا اس پر قبضہ کر لیا اور آپ کے نمائندہ کو نکال باہر کر دیا۔ آپ اس ظلم پر احتجاج کرنے کے لیے ہاشمی خواتین کے حلقہ میں دربار میں آئیں اور ایک نہایت تفصیلی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اپنے باپ کے احسانات، اپنے شوہر کے خدمات اور اسلامی تعلیمات کا تذکرہ کرتے ہوئے میراث کی آیتیں پیش کیں تاکہ حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں کو قرآن سے قائل کیا جا سکے اور ان سے اپنے باپ کی میراث کا تقاضا کیا جا سکے لیکن امت قرآن پر آیات قرآن کا کوئی اثر نہ ہوا تو اپنے حق ہبہ کا تذکرہ فرمایا کہ میرے بابا جان نے اس جائداد کو مجھے ہبہ فرما دیا تھا اور اس پر گواہ بھی پیش کیے جس کے بعد بعض روایات کی بنا پر حاکم وقت نے مطالبہ کو تسلیم کر لیا لیکن حضرت عمرؓ نے مداخلت کی اور اقرارنامہ واپس لے لیا اور آپ اپنے حق سے محروم ہوگئیں۔

اپنے حق فدک سے محرومی، شوہر کے حق خلافت سے محرومی، شکم اقدس میں محسن کی شہادت، پہلو کی شکستگی۔ یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر دختر پیغمبرؐ باپ کے بعد دنیا میں ۷۵ یا ۹۵ دن سے زیادہ نہ رہ سکیں اور ماہ جمادی الاولیٰ کی تیرہ یا جمادی الثانیہ ۱۱ھ کی تیسری تاریخ کو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں جس پر جناب امیرؑ نے یہ مرثیہ پڑھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد زہراؑ کا فراق اس امر کی دلیل ہے کہ دنیا میں کسی بھی چاہنے والے کے لیے بقا نہیں ہے اور سب کو ایک دن رخصت ہو جانا ہے۔

وقت آخر آپ حجرۂ عبادت میں تشریف لے گئیں اور جناب اسماء سے فرمایا کہ جب تک میری تسبیح و تہلیل کی آواز آتی رہے سمجھنا کہ دختر پیغمبرؐ زندہ ہے اور جب یہ آوازیں موقوف ہو جائیں تو سمجھ لینا کہ دختر پیغمبرؐ نے انتقال کیا اور میرے بچوں کا خاص خیال رکھنا۔

● اُدھر امیر المومنینؑ کو پاس بٹھا کر وصیتیں فرمائیں کہ میرے جنازہ کو پردۂ شب میں اٹھائیے گا اور میرے ظالموں کو شرکت نہ کرنے دیجیے گا۔ میرے بعد امامہ سے عقد کیجیے گا اور ایک دن میرے بچوں کے ساتھ گذار دیجیے گا تاکہ انھیں ماں کی جدائی کا احساس اذیت نہ پہونچانے پائے۔

● بچوں کا بھی اس قدر خیال رکھا کہ اپنے ہاتھوں سے نہلایا، بالوں میں شانہ کیا، کپڑے دھو کر رکھ دیے، کھانا تیار کر دیا تاکہ بچوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے اور امیر المومنینؑ کو بھی زحمت نہ ہو جس صورت حال کو دیکھ کر امیر المومنینؑ نے اس غیر معمولی مصروفیت کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے بابا کو خواب میں دیکھا ہے اور میرا خواب سچا ہے۔ لہٰذا آج میں بابا کی خدمت میں جا رہی ہوں۔

● امیر المومنینؑ نے حسب وصیت غسل و کفن دیا۔ بچوں نے ماں کو رخصت کیا اور جنازہ رات کی تاریکی میں اس تابوت کے اندر اٹھایا گیا جو آپ نے اپنی زندگی میں تیار کرایا تھا اور اس طرح چند اہل خانہ اور مخلصین کے درمیان جنازہ دفن کر دیا گیا اور صورت حال کے پیش نظر نشان قبر بھی غیر واضح بنا دیا گیا۔

● دوسرے دن یہ خبر عام ہوئی تو مسلمانوں نے اپنی شرمندگی کا ازالہ کرنے کے لیے دوبارہ قبر کھول کر جنازہ نکال کر نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا جس پر امیر المومنینؑ کو جلال آگیا اور آپ تیغ بکف میدان میں آگئے کہ خبردار! کوئی قبر زہراؑ کے ساتھ بے ادبی نہ کرنے پائے اور اس طرح یہ مصیبت ٹل گئی اور قبر زہراؑ محفوظ رہ گئی، جس کے بعد قبر اطہر پر روضہ بھی تعمیر ہوا اور سیکڑوں سال قبر اطہر زیارت گاہ خلائق بنی رہی، یہاں تک کہ ابن سعود کے مظالم نے روضہ کو منہدم کر دیا اور نشان قبر بھی نامعلوم بنا دیا۔ (۸ شوال ۱۳۴۴ھ)

روضہ کے انہدام کے بعد تقریباً ۶۵ سال تک وہ حجرہ برقرار رہا جس میں معصومہ باپ کی وفات کے بعد بیٹھ کر ماتم کیا کرتی تھیں لیکن ۱۹۸۸ء میں وہ حجرہ بھی منہدم کر دیا گیا اور اب اس کے آثار بھی تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔

وسیعلم الذین ظلموا أی منقلب ینقلبون۔

چند مثالی کردار

آپ کی والدہ گرامی ملیکۃ العرب تھیں لیکن آپ نے کبھی راحت و آرام، اور زیب و زینت کی زندگی کو پسند نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے کردار کو ایک نمونۂ عمل بنا کر رکھا۔

آپ کے والد محترم مختارِ کائنات تھے اور آپ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں لیکن آپ نے کبھی اس رشتہ سے فائدہ نہیں اٹھایا اور تمام زندگی ہر طرح کی مصیبت و زحمت برداشت کرتی رہیں۔

آپ کے شوہر امیر المومنینؑ تھے لیکن آپ نے تمام زندگی کسی طرح کی فرمائش نہیں کی اور ہمیشہ شوہر کی خدمت کرنے کے بعد بھی وقت آخر معذرت طلب کی کہ اگر کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو معاف فرما دیجیے گا۔

آپ کے فرزند سرداران جوانان جنّت تھے اور ان کے لیے لباس جنت اور طعام جنت بھی مہیا تھے لیکن اس کے بعد بھی فاقوں میں زندگی گزاری یہاں تک کہ روزہ رکھنے کے بعد سامانِ افطار یتیم و مسکین و اسیر کے حوالے کر دیا جس پر سورۂ دہر کی آیات نے مدح سرائی کی۔

آپ کو رب العالمین نے پانچ اولاد عطا کی تھی، امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینب، جناب ام کلثومؑ اور جناب محسن۔ اور آپ نے سب کو راہِ خدا میں قربان کر دیا۔ فرزند سب شہید ہوئے اور بیٹیاں راہِ خدا میں یوں اسیر ہوئیں کہ تماشائیوں کے مجمع میں درباروں اور بازاروں میں حاضر ہونا پڑا۔

آپ کائنات کی تنہا خاتون ہیں جن کے رشتۂ ازدواج میں زوجہ اور شوہر دونوں معصوم تھے اور جس کا رشتہ عرش اعظم پر ہوا ہے۔

آپ کائنات کی وہ منفرد خاتون ہیں جن کی ولادت کے لیے سیب جنت کا مادہ فراہم کیا گیا ہے۔

آپ کائنات کی وہ بے مثال خاتون ہیں جنھیں دو اماموں کی ماں بننے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جن کی نسل میں امامت قائم رہ گئی ہے۔

آپ وہ ممدوحہ ہیں جن کی مدح سورۂ کوثر، آیت تطہیر، آیت مباہلہ اور سورۂ دہر جیسے قرآنی آیات و سور میں کی گئی ہے۔

آپ رسول اکرمؐ کی اکلوتی بیٹی ہیں جنھیں ام ابیہا کہلانے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے اور جنھیں بضعۃ الرسولؐ بھی قرار دیا گیا ہے۔

آپ وہ تنہا گواہ ہیں جس نے مباہلہ میں رسالت کی گواہی دی ہے اور مسئلہ فدک کے موقع پر امامت کی گواہی دی ہے۔

آپ وہ اکیلی دختر ہیں جن سے رسول اکرمؐ نے ہر سفر کے موقع پر سب سے آخر میں الوداع کہا ہے اور واپسی پر سب سے پہلے ملاقات کی ہے۔

آپ وہ معصومہ ہیں جن کی ذاتی عصمت کے علاوہ ان کے رشتے بھی معصوم تھے۔ باپ معصوم، شوہر معصوم اور دو فرزند معصوم، اور سب کے تعارف کا ذریعہ بھی آپ ہی کی ذات کو بنایا گیا ہے۔

آپ وہ عبادت گذار ہیں جس کی نماز کے وقت زمین سے آسمان تک ایک نور کا سلسلہ قائم ہو جاتا تھا۔

آپ وہ صاحب سخاوت ہیں جس نے فاقوں میں بھی سائل کو محروم واپس نہیں جانے دیا اور اپنی قناعت سے اپنے شوہر کی سخاوت کا بھرم برقرار رکھا۔

آپ وہ باعفّت خاتون ہیں جس کا پردہ تمام زندگی برقرار رہا کہ باپ کے ساتھ نابینا صحابی بھی آگیا تو اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے سکیں اور مرنے کے بعد بھی جنازہ اٹھوانے کے لیے تابوت کا انتظام فرمایا جس سے قد و قامت کا اندازہ نہ ہوسکے۔

آپ وہ صاحب نظر ہیں کہ جب رسول اکرمؐ کے سوال پر کہ عورت کے لیے سب سے بہتر شے کیا ہے؟ کوئی جواب نہ دے سکا تو آپ نے فرمایا کہ عورت کے حق میں سب سے بہتر شے یہ ہے کہ نہ مرد اسے دیکھیں اور نہ وہ مردوں کو دیکھے۔

دو غلط فہمیاں

۱۔ بعض مورخین نے آپ کی دختر نیک اختر جناب ام کلثوم کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ ان کا عقد عمر ابن الخطاب سے ہوا تھا اور اس سلسلہ میں ایک داستان بھی بیان

کی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ انتہائی بے بنیاد ہے۔ آپ کی دختر جناب ام کلثوم کا عقد جناب عبداللہ بن جعفر کے بھائی جناب محمد سے ہوا تھا اور آپ واقعۂ کربلا میں شریک رہیں اور شام کے قید خانہ سے واپسی پر آپ نے مدینہ کے در و دیوار کو دیکھ کر مرثیہ بھی پڑھا۔

حضرت عمر بن الخطاب کی زوجہ ام کلثوم بنت ابی بکر تھیں جن کی ماں اسماء بنت عمیس تھیں۔ یہ محمد بن ابی بکر کی بہن اور حضرت علیؑ کی ربیبہ تھیں جس کی بنا پر ان کو دخترانِ علیؑ میں شمار کیا گیا ہے۔ جس طرح آپ نے محمد کو ابوبکر کے صلب سے اپنا فرزند قرار دیا ہے۔ ام کلثوم کے ایک فرزند زید بن عمر بن الخطاب تھے جن کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔

۲۔ معصومۂ عالم کے بارے میں ارشادِ رسولؐ فاطمة بضعة منی من آذاها فقد آذانی کے ذیل میں ایک داستان یہ وضع کی گئی ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوجہل کی بیٹی سے عقد کرنا چاہا تو جناب فاطمہؑ نے اس بات کی شکایت رسول اکرمؐ سے کی، اور آپ نے فرمایا کہ فاطمہؑ کو اذیت دینے والا مجھے اذیت دینے والا ہے اور اس طرح روایت کا رُخ فاطمہ زہراؑ کے پہلو شکستہ کرنے والوں، ان کی جائداد پر قبضہ کرنے والوں اور انھیں بعد رسولؐ مسلسل اذیت دینے والوں کی طرف سے ہٹا کر حضرت علیؑ کی طرف موڑ دیا گیا۔ حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بات صحیح بھی ہوتی تو اس میں دخترِ رسولؐ کی اذیت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ امیرالمومنینؑ کا ایک قرآنی حق تھا جسے وہ استعمال کر سکتے تھے۔ اور صدیقہ طاہرہؑ کو حکم قرآنی پر عمل کرنے سے قطعاً کوئی اذیت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ رسول اکرمؐ قرآن کریم پر عمل کرنے پر کوئی احتجاج کر سکتے تھے۔

پھر اگر خود رسول اکرمؐ ابوسفیان کی بیٹی سے عقد کر سکتے ہیں تو دوسرے کو ابوجہل کی بیٹی سے عقد کرنے کو کس طرح روک سکتے ہیں۔

اور اگر خود بیک وقت ۹ ازواج کو بیت الشرف میں جگہ دے سکتے ہیں اور کسی زوجہ کی اذیت یا اس کے گھر والوں کی اذیت کا خیال نہیں ہے تو علیؑ کے اقدام کو کس طرح وجہ اذیت قرار دے سکتے ہیں۔

اور پھر کیا علیؑ کے لیے ابوجہل کی بیٹی کے علاوہ عرب میں کوئی خاتون نہیں تھی کہ

مورخین نے اس دشمن اسلام کا سہارا لیا ہے اور محدثین نے داستان کو حدیث کا مقدمہ قرار دے دیا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ حدیث رسولؐ کے لیے ایک تاویلی بازی گری ہے ورنہ اس کا کوئی تعلق مسئلہ ازدواج سے نہیں ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح رسول اکرمؐ نے حضرت خدیجہ کے ہوتے ہوئے دوسرا عقد نہیں کیا ہے اسی طرح صدیقہ طاہرہؑ کی حیات میں امیرالمومنینؑ نے کوئی دوسرا عقد نہیں کیا ہے، اور یہ ماں بیٹی کا ایک تاریخی امتیاز ہے جس میں کوئی دوسری خاتون شریک نہیں ہے۔

خصائص الزہراؑ

کسی شخص کے خصوصیات و امتیازات کے بارے میں دو طرح سے بحث کی جا سکتی ہے۔

ایک بحث کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اس کے امتیازات عام افراد بشر اور بنی نوع انسان کے درمیان کیا ہیں؟ اور وہ دوسرے افراد نوع کے مقابلہ میں کن خصوصیات کا حامل ہے!

اور ایک بحث کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے صاحبان فضل و کمال کے درمیان کیا امتیاز رکھتا ہے اور اسے کون سے خصوصیات حاصل ہیں جو دوسرے صاحبانِ فضل و کمال کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

پہلا انداز بحث نسبتاً آسان اور سہل الحصول ہوتا ہے کہ ہر شخص میں عوام الناس کے مقابلہ میں کچھ نہ کچھ خصوصیات و امتیازات بہر حال پیدا ہو جاتے ہیں اور ان خصوصیات کو اس کے وجود کا طرۂ امتیاز قرار دیا جا سکتا ہے ــ لیکن دوسرا انداز بحث قدرے مشکل ہے کہ صاحبانِ کمال کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے اور ان کے باہمی تفاوت کا اندازہ لگایا جائے۔

یہ بحث اس لیے بھی مشکل ہے کہ ہر انسان امتیازات اور خصوصیات کا مالک بھی نہیں ہوتا ہے اور اس لیے بھی مشکل ہے کہ صاحبانِ کمالات کے درمیان امتیاز قائم کرنا، اور خصوصیات کا سُراغ لگانا ہر کس و ناکس کے بس کا کام بھی نہیں ہے ــ پھر اگر موضوع ایسے افراد کی زندگی ہو جہاں قدم قدم پر حد ادب کا لحاظ رکھنا ضروری ہو، اور حفظ مراتب کے ادنیٰ

تغافل سے دین وایمان اور دنیا وآخرت کے خطرہ میں پڑجانے کا اندیشہ ہو تو مسئلہ اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

خصائص الزہراؑ کے موضوع پر بحث کرنے کی سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ کا تقابل عام ابنائے نوع انسان سے نہیں ہوسکتا ہے اور ان کے سامنے دیگر افراد کا تذکرہ بھی ایک طرح کی توہین کا درجہ رکھتا ہے جس طرح ایک شیر دل خاتون نے حاکم ظالم کے دربار میں یہ کہا تھا کہ یہ میرے اوپر الزام ہے کہ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کو دیگر افراد امت اور حکام اسلام سے افضل قرار دیتی ہوں۔ اس لیے کہ افضلیت کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں طرف فضیلت ہو اور صرف کم وبیش کا فرق ہو۔ لیکن جہاں ایک طرف فضیلت ہی فضیلت ہو اور دوسری طرف فقدان ہی فقدان ہو وہاں افضلیت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

صاحبانِ فضل وکمال کے درمیان امتیازات کا پتہ لگانا صاحبانِ فضل وکمال ہی کا کام ہے۔ عام انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ میرا شمار ان صاحبانِ فضل وکمال میں نہیں ہے جنھیں اس کام کا اختیار دیا جاسکتا ہو۔ لہذا یہ کام میرے اختیار سے باہر ہے۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر میں نے اس بحث کا آغاز کیوں کیا اور اس طرح کا موضوع کیوں اُٹھایا اور مجھے یہ اندازہ کس طرح ہوگیا کہ صاحبانِ عصمت وفضیلت کے درمیان بھی تفاوتِ کمالات ہوسکتا ہے اور ان کمالات کے درمیان صدیقہ طاہرہؑ کے کمالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔؟

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ میرے ذہن کی اُپج نہیں ہے۔ اس کا سُراغ آیات قرآن اور احادیث مرسلِ اعظمؐ میں موجود ہے اور اسی نکتہ نے اس حسّاس موضوع کے چھیڑنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ رب العالمین نے قرآن مجید میں صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ ہم نے مرسلینؑ کے درمیان بھی فضیلت وکمالات کے درجات رکھے ہیں اور ان میں بھی تفاوتِ مراتب قرار دیا ہے اور سرکار دو عالمؐ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے سردارانِ جوانانِ جنت ہونے کا اعلان کرنے کے بعد بھی فرمایا ہے کہ ان کے پدر بزرگوار ان سے بھی افضل ہیں۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ مرسلینؑ کی طرح ائمہ معصومینؑ کے درمیان بھی کسی نہ کسی اعتبار سے امتیاز ضرور پایا جاتا ہے۔

اور اسی بات نے اس امر کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ تاریخ بشریت وعصمت میں صدیقہ طاہرہؑ کے خصوصیات وامتیازات کا پتہ لگایا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو ان خواتین کے مقابلہ میں کیا امتیازات حاصل ہیں جنھیں امت اسلامیہ نے مبینہ طور پر صاحب کمال قرار دیا ہے اور ان خواتین کے مقابلہ میں کیا خصوصیات حاصل ہیں جو نگاہ قرآن وسنت میں بھی صاحبانِ فضل وکمال ہیں اور جن کی فضیلت وشرافت کا اعلان آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ نے کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ خواتین ہی کی طرح صدیقہ طاہرہؑ کو صنف رجال کے مقابلہ میں کیا امتیاز حاصل ہے، جس کی بنا پر سرکار دو عالمؐ نے فرمادیا ہے کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر ہوتا چاہے وہ آدم ہوں یا غیر آدم۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا موضوع ایک مفصل کتاب کا موضوع ہے۔ اس لیے میں صرف اشارات اور علامات پر اکتفا کروں گا اور تفصیلات کا معاملہ اربابِ دانش اور اہلِ علم کے حوالے کردوں گا، تاکہ وہ افراد ملت کو تفصیلات اور تشریحات سے باخبر کرسکیں۔

صدیقہ طاہرہؑ کے امتیازات کی دو قسمیں ہیں:

ذاتی امتیازات اور اضافی امتیازات۔

اضافی امتیازات کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ کائنات میں کوئی خاتون ایسی نہیں ہے جس کے تمام رشتے اس قدر بلند وبرتر ہوں جس قدر بلند وبرتر رشتے صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ کے ہیں کہ آپ کا باپ کائنات کے تمام انسانوں سے بالاتر اور آپ کا شوہر امت اسلامیہ کے تمام نامور افراد سے بہتر بلکہ انبیاء ومرسلین سے افضل اور آپ کے فرزند جوانانِ جنت کے سردار اور منصبِ امامت کے مالک ہیں۔

وطن کے اعتبار سے جائے پیدائش مدینہ منورہ اور بیتِ رسالت۔

خاندان کے اعتبار سے کائنات کا منتخب ترین گھرانہ بنی ہاشم۔

زبان کے اعتبار سے لغت قرآن میں گفتگو کرنے والی۔ جس کی خادمہ متکلم بالقرآن کا لقب حاصل کرے۔

اور اس طرح کے بے شمار خصوصیات ہیں جو دیگر افراد امت کے مقابلہ میں حاصل ہیں

لیکن یہ اضافی کمالات عام طور سے واقعی کمالات کا درجہ حاصل نہیں کر پاتے ہیں کہ ان میں انسان کے ذاتی کسب و اکتساب سے زیادہ دخل پروردگار کے فضل و کرم کا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پروردگار نے اس شخص کو اس فضل و کرم کے قابل سمجھا ہے اور دیگر افراد کو نہیں سمجھا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس شخص نے اپنی صلاحیت و استعداد سے یہ امتیاز حاصل کیا ہے ۔۔۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اضافی کمالات ہمیشہ دوسرے انسان کے ہوتے ہیں جن کی نسبت دوسرے انسان کی طرف دے دی جاتی ہے اور ذاتی کمالات خود اپنے ہوتے ہیں چاہے زور بازو سے حاصل کیے جائیں یا وہ بھی کرم پروردگار کا نتیجہ ہوں۔ لیکن بہرحال ان کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

صدیقہ طاہرہؑ کے ذاتی کمالات و امتیازات کی چند قسمیں ہیں:

ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق جسم عنصری سے ہے ۔۔۔ اور ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق روحانیات اور معنویات سے ہے۔ اور پھر روحانیات و معنویات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق علمی پہلو سے ہے، اور ایک کا تعلق عملی پہلو سے ہے۔ ذیل میں ان تمام کمالات و امتیازات کا ہلکا سا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے:

جسمانی امتیازات

۱۔ بتول: علماء شیعہ و سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مالک کائنات نے جناب فاطمہؑ کو بتول قرار دیا ہے اور ان تمام عوارض سے الگ رکھا ہے جن میں عام طور سے ہر عورت ہر مہینہ مبتلا ہوا کرتی ہے۔

علمائے اہل سنت میں صاحب ینابیع المودۃ علامہ قندوزی، صاحب مناقب علامہ صالح کشفی، صاحب ارجح المطالب علامہ امرتسری، صاحب تاریخ بغداد حافظ ابوبکر شافعی، صاحب تاریخ کبیر ابن عساکر، صاحب ذخائر العقبیٰ علامہ طبری اور حافظ سیوطی نے خصائص میں اس حقیقت کا تذکرہ کیا ہے جس کے بعد کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے اور نہ اس تشکیک کا کوئی اعتبار ہے کہ یہ ہر عورت کے عورت ہونے کا لازمہ ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتا ہے۔

یا یہ کہ یہ خون زمانہ حمل میں بچہ کی غذا بن جاتا ہے لہذا اس عادت سے پاک عورت نہ حاملہ ہو سکتی ہے اور نہ صاحب اولاد ۔۔۔ اس لیے کہ ان دونوں باتوں کا جواب جناب مریم کی زندگی میں موجود ہے کہ ایک طرف مریم طاہرہ تھیں اور مادی عوارض سے پاک تھیں اور دوسری طرف قدرت نے عام قوانین فطرت سے ہٹ کر انہیں صاحب اولاد بنا دیا تھا جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ قانون طبیعت ایک حقیقی قانون ہے لیکن اس کا پابند خالق طبیعت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے مقرر کردہ قوانین میں تبدیلی بھی پیدا کر سکتا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ امیرالمومنینؑ کے حیات فاطمہؑ میں عقد ثانی نہ کرنے کا ایک راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رب العالمین نے صدیقہ طاہرہؑ کو تمام عوارض سے پاک رکھا تھا لہذا دوسرے عقد کا کوئی داعی اور موجب نہیں تھا۔ علاوہ اس کے کہ کوئی عورت صدیقہ طاہرہؑ کی عظمت اور محبت میں شریک و سہیم بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

صدیقہ طاہرہؑ کو بتول قرار دینے کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ عورت ان ایام میں عبادات سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کے اعمال میں ایک طرح کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ رب العالمین نے یہ پسند نہیں کیا کہ صدیقہ طاہرہؑ کی عبادات میں کسی طرح کا نقص پیدا ہو اور انہیں کسی زمانے میں بھی عبادات سے محروم رکھا جائے اور اس طرح یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کی ہر خاتون نقص عبادات کا شکار ہو سکتی ہے لیکن صدیقہ طاہرہؑ اس اعتبار سے بھی کامل و اکمل ہیں اور ان کے کردار میں کسی نقص کی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عورت کو عام طور سے تین نقائص کا حامل بنایا گیا ہے، نقص ایمان، نقص میراث اور نقص عقل۔ کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔ رب العالمین نے صدیقہ طاہرہ کو تینوں نقائص سے پاک رکھا ہے۔ بتول بنا کر نقص ایمان و عبادت سے پاک بنایا۔ تنہا وارث پیغمبرؐ بنا کر نقص میراث سے بچایا اور معصومہ بنا کر نقص شہادت سے پاک و پاکیزہ بنا دیا اور یہ جامعیت کمالات آپ کے علاوہ کسی اور خاتون کو حاصل نہیں ہو سکی۔

۲۔ عذراء: صدیقہ طاہرہؑ کے جسمانی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ

پروردگارِ عالم نے انھیں دائمی طور پر عذرا قرار دیا تھا اور ان کی یہ صفت جنّت کی ان حوروں سے متشابہ تھی جنھیں "اتراب ابکار" قرار دیا گیا تھا اور اسی اعتبار سے رسولِ اکرمؐ نے صدیقہ طاہرہؑ کو حوراء انسیہ کے لفظ سے یاد کیا ہے کہ فاطمہؑ ظاہری اعتبار سے انسان ہیں لیکن باطنی اعتبار سے حورانِ جنّت کی صفت کی حامل ہیں۔

معنوی کمالات

۱۔ ان کمالات میں سب سے واضح کمال آپ کا محدّثہ ہونا ہے کہ آپ ملائکہ سے ہم کلام ہوتی تھیں اور ملائکہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کلام کیا کرتے تھے۔ امر و نہی اور آیاتِ قرآن کی وحی رسولِ اکرمؐ پر تمام ہو گئی تھی لیکن دیگر معاملات کی وحی اور اس کے الہام کا سلسلہ برابر جاری تھا جس طرح کہ قرآن مجید نے مادرِ جناب موسیٰ اور جناب مریم کو منزلِ وحی قرار دیا ہے اور ان کے ملائکہ سے ہم کلام ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

صدیقہ طاہرہؑ کے اس محدّثہ ہونے کا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے ان تمام الہامات کو اس طرح جمع کر لیا کہ ایک صحیفہ تیار ہو گیا جسے مصحفِ فاطمہؑ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے بارے میں امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ یہ صحیفہ حجم اور ضخامت کے اعتبار سے اس قرآن کا تین گنا ہے لیکن اس میں قرآن کے مطالب و معارف کی تکرار نہیں ہے بلکہ ان تمام معاملات کا تذکرہ ہے جن کی ضرورت عالمِ انسانیت کو ہو سکتی ہے اور ان تمام حادثات اور حکومتوں کا تذکرہ ہے جو قیامت تک قائم ہونے والی ہیں۔

اس مقام پر یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ کوئی دوسرا قرآن ہے جس پر کسی قوم یا مذہب نے اعتماد کیا ہے۔ قرآن ایک ہی قرآن ہے جس کا شریک و سہیم اہلبیتِ اطہارؑ کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک صحیفہ ہے جسے لغوی اعتبار سے مصحف کہا گیا ہے کہ مصحف لغوی اعتبار سے مجموعۂ رسائل و کلمات کا نام ہے۔ قرآن مجید کو اصطلاحاً مصحف کہا جاتا ہے ورنہ یہ لفظ بالکل عام ہے جس کا اطلاق ہر صحیفہ اور کتاب پر ہو سکتا ہے۔

وحی کا اطلاق بھی قرآن مجید نے مختلف مقامات پر الہام اور القاء پر کیا ہے اور

اس کا کوئی اختصاص آیاتِ قرآن یا احکامِ شریعت سے نہیں ہے۔ اس کا استعمال شہد کی مکھی کے بارے میں بھی ہوا ہے، بشر تو پھر بشر ہے۔ اور پھر اگر بشر بھی خیر البشر ہو، اور اس کا مرتبہ تمام عالمِ بشریت سے بالاتر ہو۔

۲۔ طہارت: مالکِ کائنات نے صدیقہ طاہرہؑ کو تطہیر کا مرکز قرار دیا ہے اور آیتِ تطہیر کے نزول کے لیے ان کے گھر اور ان کی چادر کا انتخاب کیا ہے جس کا اعتراف بے شمار محدّثین اور مفسّرین نے کیا ہے اور حدیثِ کساء میں اس واقعہ کی مفصّل تشریح موجود ہے۔

۳۔ صداقت: میدانِ مباہلہ میں رسولِ اکرمؐ اسلام کے عقائد کی حقانیت، قرآن کی عظمت اور اپنی صداقت کے گواہ لے کر نکلے تو خواتین میں صدیقہ طاہرہؑ کے علاوہ کوئی نہ تھا، جو اس بات کی علامت ہے کہ مَردوں میں چار مرد بیک وقت ایک جیسی صداقت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن صنفِ خواتین میں صدیقہ طاہرہؑ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے جسے رسالت کا گواہ بنا کر پیش کیا جا سکے۔ اور یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ تن تنہا بھی رسالت کی گواہی کے لیے کافی ہیں تو ان سے کسی معاملہ میں گواہی طلب کرنا قرآن مجید سے تغافل یا مقابلہ کے مترادف ہے۔

۴۔ شجاعت: شجاعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

ایک شجاعت کا اظہار قوتِ قلب و جگر سے ہوتا ہے جو عام طور سے خطرات کی منزل اور میدانوں میں سامنے آتی ہے اور ایک شجاعت کا اظہار زورِ زبان سے ہوتا ہے جہاں سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کا اعلان کیا جاتا ہے۔

مالکِ کائنات نے صدیقہ طاہرہؑ کو دونوں طرح کی شجاعت سے نوازا تھا۔

قوتِ قلب و جگر کے اعتبار سے وہ منظر بھی قابلِ توجہ ہے جب رسولِ اکرمؐ کا سارا گھر کفار و مشرکین کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا اور آپ ہجرت کر کے مدینہ کی طرف تشریف لے گئے تھے۔

خانۂ رسالت میں اگر ایک طرف شیرِ خدا علیؑ مرتضیٰ بسترِ رسالت پر محوِ استراحت تھے تو دوسری طرف صدیقہ طاہرہؑ نہایت ہی کمسنی کے عالم اس محاصرہ کا مقابلہ کر رہی تھیں اور

آپ پر کسی طرح کا خوف و ہراس نہیں تھا جب کہ انھیں کفار کے خوف سے بڑے بڑے بہادر افراد حزن و خوف میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

خود میدان احد میں بھی اس شجاعت کا ایک منظر دیکھنے میں آیا جہاں کفار و مشرکین کے خوف سے سپاہیانِ اسلام نے میدان چھوڑ دیا تھا۔ لیکن صدیقہ طاہرہؑ جناب صفیہ کے ہمراہ میدان کی طرف آئیں اور جناب حمزہ کے لاشہ پر گریہ بھی کیا اور اپنے باپ کے زخموں کا علاج بھی کیا۔

احد کی جنگ کا نقشہ دیکھنے والے اور قرآن مجید میں اصحاب رسولؐ کے فرار کی داستان پڑھنے والے صدیقہ طاہرہؑ کی اس قوت قلب و جگر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں اور انھیں احساس ہو سکتا ہے کہ اس قیامت خیز موقع پر میدانِ جہاد کی طرف قدم بڑھانا کس ہمت اور طاقت کا کام ہے۔

ادبی شجاعت کے لیے تاریخ صدیقہ طاہرہؑ کا وہ قیامت خیز موقع ہی کافی ہے، جب رسول اکرمؐ کے بعد اپنے حق کے اثبات کے لیے دربارِ خلافت میں آئیں اور وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس نے اہلِ دربار کے دل ہلا دیے اور حاکم وقت کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تاریخ میں اس خطبہ اور اس کے متعلقات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے اور اس تذکرہ سے اس شجاعت و ہمت کا مکمل اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس خطبہ میں اسلامی احکام کے علل و اسباب، آیاتِ قرآنی سے استدلال، انصار و مہاجرین کی غیرت کو چیلنج، اپنے حق کے اثبات اور عورتوں کے حقوق سے دفاع کے بارے میں جن حقائق و معارف کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا ہوش پُرسکون حالات میں بھی نہیں رہ جاتا ہے چہ جائیکہ ایسے سنگین حالات میں اور ایسے سخت ترین ماحول میں۔ ایسا خطبہ ایک خاتون کی زندگی کا وہ شاہکار ہے جسے معجزہ و کرامت سے کم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔

تسبیح فاطمہؑ

اضافی کمالات اور ذاتی مناقب کے بعد اسلام میں صدیقہ طاہرہؑ کی عطا کا جائزہ لیا جائے تو اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

صدیقہ طاہرہؑ نے ملتِ اسلامیہ کو درس تسبیح بھی دیا ہے اور اسلام کو محافظ بھی فراہم کیے ہیں۔ درسِ تسبیح کے اعتبار سے آپ کی تسبیح آج بھی ہر نماز کی تکمیل اور ہر عبادت کی جان ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ تکبیر، تحمید اور تسبیح سے مرکب ہے۔ اور ظاہری اعتبار سے ابتدا میں یہ تسبیح دھاگوں کی گرہوں سے بنائی گئی۔ اس کے بعد جب جناب حمزہ کی شہادت واقع ہوئی تو معصومۂ عالمؑ نے ان کی خاکِ قبر سے تسبیح کے دانے تیار کیے اور اسی طرز عمل کے اتباع میں امام سجادؑ نے خاک قبر سید الشہداءؑ سے تسبیح کے دانے تیار کیے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور اس کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ خاک شفا خود بھی تسبیح پروردگار کرتی رہتی ہے چاہے کوئی تسبیح پڑھنے والا ان دانوں پر ذکر خدا نہ بھی کرے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، اگر سورۂ جمعہ کے مطابق کائنات کا ہر ذرہ تسبیح پروردگار کر رہا ہے تو جن ذرات میں خون معصوم جذب ہو گیا ہو ان کے تسبیح پروردگار کرنے میں کیا تعجب ہے۔

تسبیح کے بارے میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ دانے ذکرِ خدا کا ذریعہ ہوتے ہیں، ذکر وہی ہے جو انسان کی زبان پر ہوتا ہے۔ اس بنا پر پلاسٹک کے دانوں کو ذریعہ بنا کر صلوات بھی پڑھی جا سکتی ہے اور خاک شفا کے دانوں کو ذریعہ بنا کر لعنت بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کا کوئی تعلق دانوں سے نہیں ہے۔ دانوں پر نہ صلوات پڑھی جاتی ہے اور نہ لعنت۔ دانے صرف عدد و شمار کرنے کا ذریعہ ہیں بلکہ خاک شفا کے دانے خود بھی ظالموں پر اسی طرح لعنت کرتے ہیں جس طرح ذکر پروردگار کرتے رہتے ہیں۔

اسلام کو محافظ فراہم کرنے میں صدیقہ طاہرہؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں مالکِ کائنات نے مصداقِ کوثر قرار دیا ہے اور ایک وحدت میں بے پناہ کثرت کو سمو دیا ہے۔

صدیقہ طاہرہؑ وہ دخترِ پیغمبرؐ ہیں جو نسلِ پیغمبرؐ کی بقا کا ذریعہ ہیں جب کہ دنیا میں ہر انسان کی نسل بیٹے کے ذریعہ قائم ہوتی ہے۔ اللہ نے پیغمبر اسلامؐ کی نسل کو بیٹی کے ذریعہ قرار دیا ہے اور پھر اس میں اس قدر برکت دے دی ہے کہ ایک محتاط اندازہ کے مطابق آج دنیا میں تقریباً ۳۵..۴ ملین سادات پائے جاتے ہیں، جن میں سے تقریباً ۲۰ لاکھ عراق میں، ۳۰ لاکھ ایران میں، ۵۰ لاکھ مصر میں، ۵۰ لاکھ مغرب میں، پھر لاکھوں کی تعداد میں الجزائر، تیونس، اردن، شام، لبنان، سوڈان، خلیج اور سعودی عرب میں۔ پھر تقریباً ۲ کروڑ یمن، ہندوستان، پاکستان،

افغانستان، انڈونیشیا وغیرہ ہیں، جیسا کہ "فاطمۃ الزھراءؑ من المھد الی اللحد" کے مصنف نے تحریر فرمایا ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے صدیقہ طاہرہؑ کے خصوصیات اور امتیازات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے، اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ کے جن کمالات میں دوسرے افراد شریک ہیں ان میں بھی صدیقہ طاہرہؑ کو ایک امتیاز حاصل ہے۔

مثال کے طور پر اگر نسبی اعتبار سے بعض خواتین معصوم کی بیٹی یا زوجہ یا ماں ہیں تو صدیقہ طاہرہؑ ہر اعتبار سے عصمتی رشتہ کی مالک ہیں اور ان کے دو فرزند امام ہیں۔

اگر طہارت کے اعتبار سے مریم بتول ہیں تو صدیقہ طاہرہؑ زوجہ شیر خدا ہونے کے باوجود اور اپنے فرزندوں کی مادی ولادت کے باوجود بتول ہیں۔

اگر بعض خواتین کو ملائکہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے تو صدیقہ طاہرہؑ نے ایک پورا مصحف بطور وراثت چھوڑا ہے جو دو چار کلمات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اولین و آخرین کے حالات و کوائف کا مجموعہ ہے۔

اگر صداقت کے اعتبار سے مادر جناب عیسیٰ صدیقہ ہیں تو جناب فاطمہ زہراؑ صدیقہ کبریٰ ہیں کہ مریم اپنی عصمت میں عیسیٰ کی گواہی کی محتاج تھیں اور صدیقہ طاہرہؑ نے مباہلہ میں رسول اکرمؐ کی صداقت کی گواہی دی ہے۔ اگر شجاعت کے اعتبار سے رسول اکرمؐ اور مولائے کائنات نے مرد ہو کر ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے تو صدیقہ طاہرہؑ نے صنف نازک سے تعلق رکھنے کے بعد بھی اسی ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے۔

ادبی شجاعت میں اگر مولائے کائنات نے مجمع مسلمین میں خطبے دیے ہیں تو صدیقہ طاہرہؑ نے دشمنوں کے اجتماع میں خطبہ پڑھا ہے، اور وہاں خطبہ پڑھا ہے جہاں مولائے کائنات بیت الشرف میں تھے اور صدیقہؑ سر دربار گرم خطاب تھیں اور باطل کو مکمل طور پر بے نقاب کر رہی تھیں صدیقہ طاہرہؑ کے شرف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مباہلہ میں رسالت کو ضرورت پڑی تو اس کی گواہی دی اور خلافت میں امامت کو ضرورت پڑی تو اس کی وکالت کا فرض انجام دیا۔ فسلام اللہ علیہا و علیٰ ابیہا و بعلہا و بنیہا و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

خطبۂ فدک

ساری تعریف اللہ کے لیے ہے اس کے انعام پر، اور اس کا شکر ہے اس کے الہام پر۔ وہ قابلِ ثنا ہے کہ اس نے بے طلب نعمتیں دیں اور مکمل نعمتیں دیں اور مسلسل احسانات کیے جو شمار سے بالاتر۔ معاوضہ سے دور اور ادراک سے بلند ہیں۔ بندوں کو دعوت دی کہ شکر کے ذریعہ نعمتوں میں اضافہ کرائیں، پھر ان نعمتوں کو مکمل کر کے مزید حمد کا مطالبہ کیا اور انھیں دُہرا دیا۔

میں شہادت دیتی ہوں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کلمہ کی اصل اخلاص ہے، اس کے معنی دلوں سے وابستہ ہیں۔ اس کا مفہوم فکر کو روشنی دیتا ہے۔ وہ خدا وہ ہے جس کی آنکھوں سے رویت، زبان سے تعریف اور خیال سے کیفیت محال ہے۔ اس نے چیزوں کو بلا کسی مادے اور نمونے کے پیدا کیا ہے صرف اپنی قدرت اور مشیت کے ذریعہ۔ اسے نہ تخلیق کے لیے نمونہ کی ضرورت تھی، نہ تصویر میں کوئی فائدہ سوائے اس کے کہ اپنی حکمت کو مستحکم کرے اور لوگ اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوں قدرت کا اظہار ہو، بندے اس کی بندگی کا اقرار کریں، تقاضائے عبادت کرے تو اپنی دعوت کو تقویت دے۔ اس نے اطاعت پر ثواب اور معصیت پر عذاب رکھا تاکہ لوگ اس کے غضب سے دور رہوں اور جنّت کی طرف کھنچ آئیں۔

میں شہادت دیتی ہوں کہ میرے والد حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور وہ رسول ہیں جن کو بھیجنے کے پہلے چُنا گیا اور بعثت سے پہلے منتخب کیا گیا۔ اس وقت جب مخلوقات پردۂ غیب میں پوشیدہ اور حجاب عدم میں محفوظ اور انتہاء عدم سے مقرون تھیں آپ مسائل امور اور حوادث زمانہ اور مقدرات کی مکمل معرفت رکھتے تھے۔ اللہ نے آپ کو بھیجا تاکہ اس کے امر کو تمام کریں، حکمت کو جاری کریں اور حتمی مقدرات کو نافذ کریں آپ نے دیکھا کہ امتیں مختلف ادیان میں تقسیم ہیں، آگ

کی پوجا، بتوں کی پرستش اور خدا کے جان بوجھ کر انکار میں مبتلا ہیں۔ آپ نے ظلمتوں کو روشن کیا، دل کی تاریکیوں کو مٹایا، آنکھوں سے پردے اٹھائے، ہدایت کے لیے قیام کیا، لوگوں کو گمراہی سے نکالا، اندھے پن سے بابصیرت بنایا، دینِ مستحکم اور صراطِ مستقیم کی دعوت دی۔ اس کے بعد اللہ نے انتہائی شفقت، مہربانی اور رغبت کے ساتھ انھیں بُلا لیا، اب وہ اس دنیا کے مصائب سے راحت میں ہیں، ان کے گرد ملائکہ ابرار اور رضائے الٰہی ہے اور سر پر رحمتِ خدا کا سایہ۔ خدا میرے اس باپ پر رحمت نازل کرے جو اس کا نبی، وحی کا امین، مخلوقات میں منتخب مصطفیٰ اور مرتضیٰ تھا، اس پر سلام و رحمت و برکتِ خدا ہو۔

بندگانِ خدا! تم ان کے حکم کا مرکز، ان کے دین و وحی کے حامل، اپنے نفس پر اللہ کے امین اور امتوں تک اس کے پیغام رساں ہو۔ تمھارا خیال ہے کہ تمھارا اس پر کوئی حق ہے حالاں کہ تم میں اس کا وہ عہد موجود ہے جسے اس نے بھیجا ہے اور وہ بقیہ ہے جسے اپنی خلافت دی ہے۔ وہ خدا کی کتاب ناطق قرآن صادق، نور ساطع ضیاء روشن ہے جس کی بصیرتیں بیّن اور اسرار واضح، ظواہر منوّر، اتباع قابلِ رشک قائد رضاء الٰہی اور سماعت ذریعۂ نجات ہے۔ اسی سے اللہ کی روشن حجتیں، اس کے واضح فرائض مخفی محرمات، روشن بینات کافی دلائل، مندوب فضائل، لازمی تعلیمات اور قابلِ رخصت احکام کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد خدا نے ایمان کو شرک سے تطہیر، نماز کو تکبر سے پاکیزگی، زکوٰۃ کو نفس کی صفائی اور رزق کی زیادتی، روزہ کو خلوص کا استحکام، حج کو دین کی تقویت، عدل کو دلوں کی تنظیم، ہماری اطاعت کو ملّت کا نظام، ہماری امامت کو تفرقہ سے امان، جہاد کو اسلام کی عزت، صبر کو طلبِ اجر کا معاون، امر بالمعروف کو عوام کی مصلحت، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو عذاب سے تحفظ، صلۂ رحمی کو عدد کی زیادتی، قصاص کو خون کی حفاظت، ایفائے نذر کو مغفرت کا وسیلہ، ناپ تول کو فریب دہی کا توڑ، حرمت شراب خوری کو رجس سے پاکیزگی، تہمت سے پرہیز کو لعنت سے محافظت، ترک سرقہ کو عفت کا سبب قرار دیا، شرک کو حرام کیا تاکہ ربوبیت سے اخلاص پیدا ہو۔ لہٰذا اللہ سے باقاعدہ ڈرو اور بغیر مسلمان ہوئے نہ مرو، اس کے امر و نہی کی اطاعت کرو اس لیے کہ اس کے بندوں میں خوفِ خدا رکھنے والے صرف صاحبانِ علم و معرفت ہیں۔

لوگو! یہ جان لو کہ میں فاطمہؑ ہوں، اور میرے باپ محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ یہی اول و آخر کہتی ہوں اور نہ غلط کہتی ہوں اور نہ بے ربط۔ وہ تمھارے پاس رسول بن کر آئے، ان پر تمھاری زحمتیں شاق تھیں، تمھاری بھلائی کے خواہاں اور صاحبانِ ایمان کے لیے رحیم و مہربان تھے۔ اگر تم انھیں اور ان کی نسبت کو دیکھو تو تمام عورتوں میں صرف میرا باپ، اور تمام مردوں میں صرف میرے ابن عم کا بھائی پاؤ گے، اور اس نسبت کا کیا کہنا؟

میرے پدر بزرگوار نے کھُل کر پیغامِ خدا کو پہنچایا، مشرکین سے بے پروا ہو کر ان کی گردنوں کو پکڑ کر اور ان کے سرداروں کو مار کر دینِ خدا کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دی، بتوں کو توڑ رہے تھے اور مشرکین کے سرداروں کو سرنگوں کر رہے تھے یہاں تک کہ مشرکین کو شکست ہوئی، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ رات کی صبح ہو گئی، حق کی روشنی ظاہر ہو گئی، دین کا ذمہ دار گویا ہو گیا، شیاطین کے ناطقے گنگ ہو گئے، نفاق تباہ ہوا، کفر و افتراق کی گرہیں کھل گئیں اور تم لوگوں نے کلمۂ اخلاص کو ان روشن چہرہ فاقہ کش لوگوں سے سیکھ لیا، جن سے اللہ نے رجس کو دور رکھا ہے اور حقِ طہارت عطا کیا ہے۔ تم جہنم کے کنارے تھے میرے باپ نے تمھیں بچایا، تم ہر لالچی کے لیے مالِ غنیمت اور ہر زود کار کے لیے چنگاری تھے، ہر پیر کے نیچے پامال تھے، گندہ پانی پیتے تھے پتے چباتے تھے، ذلیل اور پست تھے۔ ہر وقت چار طرف سے حملے کا اندیشہ تھا لیکن خدا نے میرے باپ کے ذریعہ تمھیں ان تمام مصیبتوں سے بچا لیا۔

خیر ان تمام باتوں کے بعد بھی جب عرب کے نامور سرکش بہادر اور اہلِ کتاب کے باغی افراد نے جنگ کی آگ بھڑکائی تو خدا نے اسے بجھا دیا یا شیطان نے سینگ نکالی یا مشرکوں نے منھ کھولا تو میرے باپ نے اپنے بھائی کو ان کے حلق میں ڈال دیا، وہ اس وقت تک نہیں پلٹے جب تک ان کے کانوں کو کچل نہیں دیا اور ان کے شعلوں کو آبِ شمشیر سے بجھا نہیں دیا۔ وہ اللہ کے معاملہ میں زحمت کش اور جد و جہد کرنے والے تھے اور تم عیش کی زندگی آرام سکون چین کے ساتھ گزار رہے تھے، ہماری مصیبتوں کے منتظر اور ہماری خبر بد کے خواہاں تھے۔ تم لڑائی سے منھ موڑتے تھے اور میدانِ جنگ سے بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب اللہ نے اپنے نبی کے لیے انبیاء کے گھر اور اصفیاء کی منزل کو پسند کر لیا تو تم میں نفاق کی روشنی ظاہر ہو گئی، چادرِ دین کہنہ ہو گئی، گمراہ ہو

کا منادی بولنے لگا۔ گمنام منظرِ عام پر آگئے، اہلِ باطل کے دودھ کی دھاریں بہہ بہہ کر تمھارے صحن میں آگئیں، شیطان نے سر نکال کر تمھیں آواز دی تو تمھیں اپنی دعوت کا قبول کرنے والا اور اپنی بارگاہ میں عزت کا طالب پایا تمھیں اُٹھایا تو تم ہلکے دکھائی دیے، بھڑکایا تو غصہ ور ثابت ہوئے۔ تم نے دوسرے کے اونٹ پر نشان لگا دیا اور دوسرے کے چشمہ پر وارد ہو گئے حالانکہ ابھی زمانہ قریب کا ہے اور زخم کشادہ ہے جراحت مندمل نہیں ہوئی اور رسولؐ قبر میں سو بھی نہیں سکے۔ یہ جلدی تم نے فتنہ کے خوف سے کی حالانکہ فتنہ ہی میں گرے اور جہنم تو تمام کفار کو محیط ہے۔

افسوس تم پر تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کہاں جا رہے ہو؟ تمھارے درمیان کتابِ خدا موجود ہے جس کے امور واضح، علائم روشن، ممانعت تابندہ، اوامر نمایاں ہیں تم نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس سے انحراف کے خواہاں ہو؟ یا کوئی دوسرا حکم ہے تو بہت برا بدل ہے اور جو غیرِ اسلام کو دین بنائے گا اس سے وہ قبول بھی نہ ہوگا اور آخرت میں خسارہ بھی ہوگا۔

اس کے بعد تم نے صرف اتنا انتظار کیا کہ اس کی نفرت ساکن اور مہار ڈھیلی ہو جائے پھر آتشِ جنگ کو روشن کر کے شعلوں کو بھڑکانے لگے۔ شیطان کی آواز پر لبیک کہنے اور دین کے انوار کو خاموش کرنے اور سنتِ پیغمبرؐ کو برباد کرنے کی کوشش شروع کر دی، بالائی جھاگ میں اپنی سیری سمجھے ہو اور رسولؐ کے اہل و اہلبیتؑ کے لیے پوشیدہ ضرر رسانی کرتے ہو، ہم تمھارے حرکات پر یوں صبر کرتے ہیں جیسے چھری کی کاٹ اور نیزے کے زخم پر۔ تمھارا خیال ہے کہ میرا میراث میں حق نہیں، کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہو، جب کہ ایمان والوں کے لیے اللہ سے بہتر کوئی حاکم نہیں ہے۔

تمھارے لیے مہرِ نیم روز کی طرح روشن ہے کہ میں اسی نبیؐ کی بیٹی ہوں۔ اے ابوبکرؓ! کیا مجھے ان کی میراث نہ ملے گی؟ کیا قرآن میں یہی ہے کہ تو اپنے باپ کا وارث بنے اور میں اپنے باپ کی وارث نہ بنوں۔ یہ کیسا افترا ہے؟ کیا تم نے قصداً کتابِ خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے جب کہ اس میں سلیمان کے وارث داؤد ہونے کا ذکر ہے اور حضرت زکریا کی یہ دعا ہے کہ خدایا مجھے ایسا ولی دے جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو اور یہ اعلان ہے کہ قرابت دار بعض بعض سے اولیٰ ہیں اور یہ ارشاد ہے کہ خدا اولاد کے بارے میں تم کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ لڑکے کو لڑکی کا دوگنا ملے اور یہ تعلیم ہے کہ مرنے والا اپنے والدین اور اقربا کے لیے وصیت کرے یہ متقین کی ذمہ داری ہے۔ اور تمھارا

خیال ہے کہ نہ میرا کوئی حق ہے نہ میرے باپ کی میراث ہے نہ میری کوئی قرابت داری ہے۔ کیا تم پر کوئی خاص آیت آئی ہے جس میں میرا باپ شامل نہیں ہے؟ یا تمھارا کہنا یہ ہے کہ میں اپنے باپ کے مذہب سے الگ ہوں اس لیے وارث نہیں۔ کیا تم عام و خاص قرآن کو میرے باپ اور میرے ابنِ عم سے زیادہ جانتے ہو۔ خیر ہوشیار ہو جاؤ! آج تمھارے سامنے وہ ستم رسیدہ ہے جو کل تم سے قیامت میں ملے گی جب اللہ حاکم، محمدؐ طالبِ حق ہوں گے موعد قیامت کا ہوگا۔ ندامت کام نہ آئے گی اور ہر چیز کا اک وقت مقرر ہے۔ عنقریب تمھیں معلوم ہوگا کہ کس کے پاس رُسواکن عذاب آتا ہے اور کس پر مصیبت نازل ہوتی ہے۔

(اس کے بعد آپ انصار کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا) اے جواں مرد گروہ ملت کے قوت بازو! اسلام کے انصار! یہ میرے حق میں چشم پوشی اور میری ہمدردی سے غفلت کیسی ہے؟ کیا وہ رسولؐ میرے باپ نہ تھے جنھوں نے یہ کہا تھا کہ انسان کا تحفظ اس کی اولاد میں ہوتا ہے۔ تم نے بہت جلدی خوف زدہ ہو کر یہ اقدام کیا حالانکہ تم میں وہ حق والوں کی طاقت تھی جس کے لیے میں حیران و پریشان ہوں۔ کیا تمھارا یہ بہانہ کہ رسولؐ کا انتقال ہو گیا تو بہت بڑا حادثہ رونما ہوا جس کا رخنہ وسیع، شگاف کشادہ۔ اتصال شگافتہ ہے، زمین ان کی غیبت سے تاریک، ستارے بے نور، امیدیں ساکن، پہاڑ سرنگوں، حرم زائل اور حرمت برباد ہو گئی ہے۔

یقیناً یہ بہت بڑا حادثہ اور بڑی عظیم مصیبت ہے، نہ ایسا کوئی حادثہ ہے اور نہ سانحہ۔ خود قرآن نے تمھارے گھروں میں صبح و شام بہ آوازِ بلند تلاوت و الحاق کے ساتھ اعلان کر دیا تھا کہ اس کے پہلے جو کچھ دوسرے انبیاء پر گزرا وہ اٹل حکم اور حتمی قضا تھی اور یہ بھی ایک رسول ہیں جنھیں موت آئے گی تو کیا تم ان کے بعد اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ ظاہر ہے کہ اس سے اللہ کا کوئی نقصان نہ ہوگا، اور وہ اہلِ شکر کو جزا دے کے رہے گا۔

ہاں اے انصار! کیا تمھارے دیکھتے سنتے اور تمھارے مجمع میں میری میراث ہضم ہو جائے گی؟ تم تک میری آواز بھی پہونچی تم باخبر بھی ہو۔ تمھارے پاس اشخاص، اسباب، آلات، قوت، اسلحہ اور سپر سب کچھ موجود ہے۔ لیکن تم نہ میری آواز پر لبیک کہتے ہو، اور نہ میری فریاد کو پہنچتے ہو، تم تو مجاہد مشہور ہو، خیر و صلاح کے ساتھ معروف ہو، منتخب روزگار اور سر آمد زمانہ ہو۔ تم نے عرب

سے جنگ میں رنج و تعب اُٹھایا ہے، امتوں سے ٹکرائے ہو، لشکروں کا مقابلہ کیا ہے۔ ابھی ہم دونوں اسی جگہ ہیں جہاں ہم حکم دیتے تھے اور تم مانتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے دم سے اسلام کی چکی چلنے لگی۔ زمانہ کا دودھ نکال لیا گیا، شرک کے نعرے پست ہوئے، افترا کے فوارے دب گئے، کفر کی آگ بجھ گئی، فتنہ کی دعوت خاموش ہو گئی، دین کا نظام مستحکم ہو گیا، تو اب تم اس وضاحت کے بعد کہاں چلے اور اس اعلان کے بعد کیوں پردہ پوشی کی؟ آگے بڑھ کے قدم کیوں پیچھے ہٹائے؟ ایمان کے بعد کیوں مشرک ہوئے جاتے ہو؟ کیا اس قوم سے جنگ نہ کرو گے جس نے اپنے عہد کو توڑا اور رسولؐ کو نکالنے کی فکر کی۔ اور پہلے تم سے مقابلہ کیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو جب کہ خوف کا مستحق صرف خدا ہے۔ اگر تم ایمان دار ہو۔ خبردار! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم دائمی پستی میں گر گئے اور تم نے بست و کشاد کے صحیح حق دار کو دور کر دیا، آرام طلب ہو گئے اور تنگی سے وسعت میں آ گئے۔ جو سنا تھا اسے پھینک دیا اور جو بادلِ نخواستہ نگل لیا تھا اسے اُگل دیا۔ خیر تم کیا اگر ساری دنیا بھی کافر ہو جائے تو اللہ کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔

خیر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی، تمھاری بے رُخی اور بے وفائی کو جانتے ہوئے جس کو تم لوگوں نے شعار بنا لیا ہے۔ لیکن یہ تو ایک دل گرفتگی کا نتیجہ اور غضب کا اظہار ہے، ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہے، اک اتمام حُجّت ہے، چاہو تو اسے ذخیرہ کر لو۔ مگر یہ پیٹھ کا زخم ہے، پیروں کا گھاؤ ہے، ذلّت کی بقا اور غضبِ خدا اور ملامتِ دائمی سے موسوم ہے اور اللہ کی اس بھڑکتی آگ سے متصل جو دلوں پر روشن ہوتی ہے خدا تمھارے کرتوت دیکھ رہا ہے اور عنقریب ظالموں کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسے پلٹائے جائیں گے۔ میں تمھارے اس رسولؐ کی بیٹی ہوں جس نے عذابِ شدید سے ڈرایا ہے، اب تم بھی عمل کر دیں بھی عمل کرتی ہوں، تم بھی انتظار کرو اور میں بھی وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔

حدیث کساء

حدیث کساء وہ بابرکت تذکرہ ہے جو حدیث بھی ہے اور بیان واقعہ بھی، باعثِ برکت بھی ہے اور موجبِ رحمت بھی۔ بیان فضائل بھی ہے اور سببِ سعادت بھی۔ صاحبانِ ایمان میں کون سا انسان ہے جو اس حدیث مبارک کے الفاظ یا مفاہیم سے باخبر نہ ہو، بیماروں کو شفا دینے والی یہی حدیث ہے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے کا ذریعہ یہی حدیث ہے، مشکلات میں گرفتار بے سہارا افراد کو سہارا دینے والی یہی حدیث ہے۔ جیسا کہ خود اس کے اندر بھی اس حقیقت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس کی تلاوت سے رحمتِ خدا نازل ہوتی ہے اور ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اور محوِ استغفار ہو جاتے ہیں۔ صاحبِ بصیرت کے سامنے پڑھی جائے تو کشائش حال حاصل ہوتی ہے، صاحبِ حاجت کے سامنے تلاوت کی جائے تو حاجتیں پوری ہوتی ہیں، اور سیکڑوں سال سے صاحبانِ ایمان اس کے برکات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کیوں نہ ہوتا۔ تذکرہ صاحبانِ عصمت و طہارت کا ہے، بیان صدیقہ طاہرہؑ کا ہے، تفسیر قرآن حکیم کی ہے، واقعہ انوارِ الٰہی کے اجتماع کا ہے، حیرت و حسرت ساکنانِ عرش کی ہے اور عظمت و فضیلت خیر البشر اور ان کی ذرّیت طیبہ کی ہے، پھر ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے برکت و سعادت و رحمت کا نزول نہ ہوگا تو کب ہوگا۔

سند کے اعتبار سے حدیث کساء نہایت درجہ معتبر ہے جس کی سند کو بحرین کے جلیل القدر عالم الشیخ عبداللہ البحرانی نے اپنی کتاب عوالم میں نقل کیا ہے اور اسے شیخ جلیل السید ہاشم البحرانی کے قلم سے لکھا ہوا دیکھا ہے۔ انھوں نے اپنے شیخ المحدیث السید ماجد بحرانیؒ، انھوں نے اپنے شیخ حسن بن زین الدینؒ، انھوں نے اپنے شیخ مقدس اردبیلیؒ، انھوں نے اپنے شیخ علی بن عبدالعالی الکرکیؒ، انھوں نے علی بن ہلال الجزائری، انھوں نے احمد بن فہد الحلیؒ، انھوں نے علی بن خازن الحائریؒ، انھوں نے شیخ ضیاء الدین علی بن الشہید الاولؒ، انھوں نے شہید اولؒ، انھوں نے فخر المحققینؒ، انھوں نے

اپنے پدر بزرگوار علامہ حلیؒ، انھوں نے اپنے بزرگ محقق حلیؒ، انھوں نے اپنے بزرگ ابن نما حلیؒ، انھوں نے اپنے شیخ محمد بن ادریس حلیؒ، انھوں نے ابن حمزہ طوسیؒ صاحب ثاقب المناقب، انھوں نے علامہ محمد بن شہر آشوبؒ، انھوں نے علامہ طبرسیؒ صاحب احتجاج، انھوں نے شیخ جلیل حسن بن محمد بن الحسن الطوسی، انھوں نے اپنے پدر بزرگوار شیخ الطائفہؒ، انھوں نے اپنے استاد شیخ مفیدؒ، انھوں نے اپنے شیخ ابن قولویہ قمیؒ، انھوں نے شیخ کلینیؒ، انھوں نے علی بن ابراہیمؒ، انھوں نے ابراہیم بن ہاشم، انھوں نے احمد بن محمد بن ابی نصر البزنطیؒ، انھوں نے قاسم بن یحییٰ الجلا الکوفی، انھوں نے ابو بصیرؒ، انھوں نے ابان بن تغلبؒ، انھوں نے جابر بن یزید اور انھوں نے جابر بن عبداللہ الانصاریؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے صدیقہ طاہرہؑ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ . . . .

بعض حضرات نے اس سند سے ناواقفیت کی بنا پر روایت کے آغاز میں لفظ رُوِیَ عن فاطمۃ الزہراء دیکھ کر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے، اس کا راوی معلوم نہیں ہے اور کسی مجہول صیغہ سے شروع ہونے والی روایت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ رُوِیَ بطور اختصار یا بطور احترام استعمال ہوا ہے ورنہ روایت کی ایک مسلسل سند موجود ہے اور اس میں ایک سے ایک جلیل القدر، مستند اور معتبر عالم کا نام آتا ہے جس کے بعد کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

اس حدیث کا ایک نسخہ علامہ الشیخ محمد تقی بن محمد باقر یزدی بافقی نے اپنے رسالہ میں درج کیا ہے جس کو انھوں نے عوالم سے براہ راست نقل کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث کتاب عوالم میں موجود ہے جس کی ۷۰ سے زیادہ جلدیں ہیں اور یزد میں حجۃ الاسلام آقای مرزا سلیمان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ گیارہویں جلد صدیقہ طاہرہؑ کے حالات میں ہے اور اسی میں یہ حدیث شریف پائی جاتی ہے۔

علامہ الشیخ محمد الصدوقی الیزدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مبارک عوالم کے حاشیہ پر درج کی گئی ہے۔ لیکن اصل کتاب میں بہرحال موجود ہے۔

دوسرا نسخہ علامہ جلیل الشیخ فخرالدین محمد الطریحی صاحب مجمع البحرین کا ہے جو عام طور سے ہمارے ملکوں میں رائج ہے اور دونوں میں اس جہت سے نمایاں فرق ہے کہ اس نسخہ میں سلام

کے ساتھ جواب درج نہیں ہے جب کہ عوالم کے نسخہ میں سلام اور جواب سلام دونوں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ عوالم کے نسخہ میں کچھ اور بھی اضافات ہیں جن کا ذکر منتخب طریحی کے نسخہ میں نہیں ہے۔

علّامہ دیلمیؒ نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب الغرر والدرر میں نقل کیا ہے اور علامہ الشیخ محمد جواد الرازی نے بھی اس کا تذکرہ اپنی کتاب نور الآفاق میں کیا ہے اور ان کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حدیث عوالم کی گیارہویں جلد میں بھی ہے اور تیرہویں جلد میں بھی ہے۔

بہرحال عبارتوں کے اختلاف کے سلسلہ میں چند خصوصیات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے تاکہ صاحبانِ تحقیق ان نکات سے استفادہ کرسکیں اور مومنین کو اپنے افادات سے مستفید کرسکیں۔

۱۔ عوالم کے نسخہ میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے ہر چادر میں آنے والے کے سلام کا جواب بھی مذکور ہے جو قوانینِ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اور جن نسخوں میں جواب سلام نہیں ہے ان کی بنا صرف اختصار پر ہے، یا ان علماء نے اس سلام کو سلام تحیہ نہیں قرار دیا ہے جس کا جواب واجب ہوتا ہے۔

۲۔ عوالم کے نسخہ میں سرکار دو عالمؐ نے ہر سلام کا جواب دیتے ہوئے بحسب قوانین اسلام بعض اضافات بھی فرمائے ہیں۔ مثلاً امام حسنؑ کے لیے "ولدی وصاحب حوضی" امام حسینؑ کے لیے "ولدی وشافع امتی" کہا ہے۔ امیرالمومنینؑ کو "خلیفتی وصاحب لوائی" فرمایا ہے، جن خصوصیات پر صاحبانِ معرفت بہترین روشنی ڈال سکتے ہیں۔

۳۔ عوالم کے نسخہ میں سب کے اجتماع کے بعد سرکار دو عالمؐ کے یہ فقرات بھی درج ہیں کہ:

"پروردگار! یہ میرے اہلبیتؑ اور مخصوصین ہیں۔ ان کا گوشت میرا گوشت ہے، ان کا خون میرا خون ہے، جو انھیں تکلیف پہونچاتا ہے اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، اور جو انھیں رنج دیتا ہے اس سے میں رنجیدہ ہوجاتا ہوں، جو ان سے جنگ کرتا ہے اس سے میری جنگ ہے، اور جو ان سے صلح کرتا ہے اس سے میری صلح ہے، جو ان کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے، اور جو ان کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے، یہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ پروردگار! اپنی صلوات و رحمت و برکت و مغفرت و رضا میرے اور ان کے شامل حال کردے، اور ان سے ہر رجس کو دور رکھ اور ان کی طہارت کا اعلان فرمادے۔"

یہ الفاظ عام رائج نسخہ میں نہیں ہیں جب کہ ان میں فضائل و کمالات کا ایک پورا سلسلہ پایا جاتا ہے۔

۴۔ عوالم کے نسخہ میں "فلکا" کے ساتھ "تسری" مذکور ہے جب کہ رائج نسخہ میں یسری اور تسری دونوں نقل کیے جاتے ہیں۔ لفظ فُلک واحد بھی ہے اور جمع بھی ہے۔

۵۔ آخر حدیث میں عوالم کے نسخہ میں پیغمبر اکرمؐ کے دونوں بیانات کے بعد "وَرَبِّ الکعبة" کا ذکر ہے، جب کہ رائج نسخہ میں یہ کلمہ ایک ہی مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

حدیث کساء میں معنوی اعتبار سے فضائل آلِ محمدؐ کے ایسے گوشے پائے جاتے ہیں کہ انسان ان کی معنویت پر غور کرتا رہے اور وجد کرتا رہے اور کلام معصومہ کی بلاغت پر جھومتا رہے۔ اس حقیقت کے بعض گوشوں کی طرف ابتداء میں اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کی طرف اب اشارہ کیا جا رہا ہے:

مرسلِ اعظمؐ نے بیماری کا ذکر نہیں کیا بلکہ ضعف کا ذکر کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ضعف کا علاج بیماری کے علاج سے مختلف ہوا کرتا ہے۔

مرسلِ اعظمؐ کے ضعف کا تعلق بدن سے ہے جسم سے نہیں ہے اور اس میں ایک بلیغ فرق پایا جاتا ہے کہ جسم میں سر شامل ہوتا ہے۔ لیکن بدن سر کے علاوہ باقی جسم ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ضعف کا تعلق سر اور دماغ سے نہیں ہو سکتا ہے۔

اہلبیتؑ کو نبوت کے لیے اہل بیت اور رسالت کے لیے معدن قرار دیا گیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ نبی کے اہلبیت نہیں ہیں بلکہ نبوت کے گھر والے ہیں، اور پیغام الٰہی ہم کو انھیں کے ذریعہ حاصل ہوگا۔

اجتماع میں شیعہ اور محب دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں جن کا فرق عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے خوب واضح ہو جاتا ہے۔

کامیابی کے اعلان میں ربِ کعبہ کی قسم کا ذکر کیا گیا ہے، جس کی مثال مولائے کائنات کے آخری لمحات میں بھی پائی جاتی ہے۔

آخر کلام میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ "اذا وجھہ یتلالأ" میں لفظ اِذَا ہے اِذاً نہیں ہے۔ اِذاً کا استعمال حدیث کے بالکل آخر میں ہوا ہے جس کے فرق کو صاحبانِ معرفت و ادب باقاعدہ طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔

اللّٰھم اجعلنا منھم واحشرنا مع محمد و آلہ الطاھرین۔

آیتِ تطہیر

صاحبانِ انصاف کے لیے اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آیتِ تطہیر اہلبیت اطہارؑ (پنجتن پاک) کی شان میں ان کی طہارت و عصمت کے اعلان کے لیے نازل ہوئی ہے، اور آیتِ کریمہ میں ان حضراتِ خمسۂ نجباء کے علاوہ کسی دوسری فرد کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا تعلق نہ ازواجِ پیغمبرؐ سے ہے اور نہ اصحابِ رسولؐ سے ــــ علماء شیعہ اور علماء اہل سنّت دونوں اس حقیقت پر متفق ہیں اور بعض متعصبین کے علاوہ کوئی اس حقیقت کا منکر نہیں ہے بلکہ بعض علماء اہل سنت نے تو اس آیت کے ذیل میں ایسے حقائق و معارف کا تذکرہ کیا ہے کہ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عرفانِ حق کسی فرد یا جماعت کی میراث نہیں ہے اللہ جسے بھی توفیق دیدے اور انصاف جس کے بھی شاملِ حال ہو جائے، وہ حقائق سے باخبر ہو سکتا ہے اور پھر ان معارف کی نشان دہی کر سکتا ہے۔

ذیل میں علماء اسلام کے انھیں جلیل القدر علماء میں سے دو ایک کے افادات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم محققین میں ایک شخصیت علاّمہ السید علوی الحداد العلوی الحضرمی الجاوی الشافعی کی ہے جنھوں نے ایک عظیم کتاب "القول الفصل فیما لبنی ھاشم و قریش من الفضل" تحریر کی ہے اور اس میں فضائلِ اہل بیتؑ کے ایسے ایسے گوشے بیان کیے ہیں کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اس کے بعد عالمِ اسلام میں ہونے والی بددیانتی، ناانصافی اور بے دینی کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ علماء اسلام نے کس طرح روایات کو اپنی مرضی کے مطابق معتبر و غیر معتبر قرار دیا ہے اور کس طرح فضائلِ اہل بیتؑ کی پردہ پوشی کی ناکام کوشش کی ہے۔

علامہ موصوف اپنی کتاب کے جلد دوم ص ۱۶۲ پر بعض متعصب افراد کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث کساء بالکل صحیح ہے اور نزولِ آیتِ تطہیر کا تذکرہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی، مسند احمد، مستدرک حاکم، سنن بیہقی میں پایا جاتا ہے اور ابن حبان، صاحب معجم کبیر، طبری، نسائی، تفسیر ابن کثیر،

ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، خطیب، ابن ابی شیبہ، طیالسی وغیرہ نے بھی اس حدیث کا استخراج کیا ہے۔

اس کو صحیح قرار دینے والوں میں مسلم، ابن ابی حاتم، حاکم بن محمد اسدی، ابن شاہین، حافظ احمد بن صالح مصری، حاکم، بیہقی، حافظ ابن حجر، ابن عبدالبر، ابن تیمیہ، سخاوی، قسطلانی، کمال، زرقانی، سمہودی، شوکانی جیسے جلیل القدر علماء اہلسنت ہیں اور علماء شیعہ میں تو سبھی نے اسے صحیح اور معتبر قرار دیا ہے، جس کے بعد کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کے روایت کرنے والوں میں پندرہ اصحاب رسولؐ بھی ہیں حضرت علیؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ، حضرت عبداللہ بن جعفر، ابن عباس، ام سلمہ، عائشہ، سعد بن ابی وقاص، انس بن مالک، ابوسعید الخدری، ابن مسعود، معقل بن یسار، واثلہ بن اسقع، عمرو بن ابی سلمہ، ابوالحمراء وغیرہ۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے آیت کی دلالت اور اس کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض علماء شافعیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت شریفہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہلبیت اطہار سرچشمہ فضائل وکمالات ہیں، اور ان کے علاوہ جہاں بھی کوئی کمال پایا جاتا ہے سب انھیں کا صدقہ اور طفیل ہے جس طرح کہ غلام آقا کے ساتھ شریک منزل رہتا ہے۔ یہ حضرات پیغمبر اسلامؐ کے خواص، وارث، خلیفہ اور قرآن کے ہمسر وہم زبان ہیں۔ ان کے فضائل میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔ ان کا جیسا شرف نہ آل عباس کو حاصل ہوا ہے اور نہ آل جعفر کو۔ بلکہ حد یہ ہے کہ اولاد علیؑ میں بھی اولاد فاطمہؑ کے علاوہ کسی کو یہ شرف وکمال حاصل نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے علامہ بیہقی نے جب واثلہ بن اسقع کے بارے میں روایت نقل کی کہ "انت من اھلی" تو اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ واثلہ کو اہلبیتؑ سے ملایا گیا ہے جو خود اہلبیتؑ کے کمال شرف وفضل کی بہترین دلیل ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے علامہ سمہودی کے حوالہ سے آیت کے معنی ومفہوم کے بارے میں ایک طویل تحقیق درج کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں تقریباً پندرہ خصوصیات پائے جاتے ہیں، اور ہر خصوصیت عظمت وفضیلت اہلبیتؑ کی ایک مستقل دلیل ہے۔

۱۔ آیت کا آغاز لفظ انما سے ہوا ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ نے اپنے ارادہ کو ان کی

طہارت میں منحصر کردیا ہے اور یہ ان کے سرچشمہ خیرات وبرکات ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

۲۔ پروردگار عالم نے یہ اہتمام صرف انھیں کے فضائل کے بیان کے لیے کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اہتمام کسی اور مقام پر نظر نہیں آتا ہے۔

۳۔ مصدر تطہیر کا ذکر کرکے بات میں مزید زور پیدا کردیا گیا ہے۔

۴۔ "تطہیرًا" کو نکرہ استعمال کرکے یہ اظہار کیا گیا ہے کہ یہ طہارت ایک خاص اور عظیم قسم کی طہارت ہے جس کا قیاس عام طہارتوں پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ پیغمبرؐ کا ان حضرات کو اہلبیتؑ کہہ کر دعائے تطہیر کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ارادہ الٰہی کے ساتھ مدعائے پیغمبرؐ بھی کام کررہا ہے اور سب کو فضائل اہلبیتؑ کے نشر کرنے کی فکر ہے۔

۶۔ ابوسعید خدری کی روایت کی بناپر آیت میں خود پیغمبر اکرمؐ بھی شامل ہیں جو اہلبیتؑ کی عظمت کی مزید دلیل ہے۔

۷۔ حضورؐ نے اہلبیتؑ کے حق میں برکات ورحمت وصلوات ومغفرت کی دعا کی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہی حضرات صاحبان تطہیر ہیں ورنہ صاحبان تطہیر کے علاوہ کوئی ان دعاؤں کا حق دار نہیں ہوسکتا ہے۔

۸۔ پیغمبرؐ نے ہر دعا میں اپنے کو بھی شامل رکھا ہے تاکہ اس سے اہلبیتؑ کی مساوات شرف کا بھی اندازہ ہوجائے۔

۹۔ حضورؐ نے مقام دعا میں جناب ابراہیمؑ پر نزول رحمت کا بھی ذکر کیا ہے جو اہلبیتؑ کے وارث ابراہیمؑ اور ہم رتبہ ابراہیمؑ ہونے کی دلیل ہے۔

۱۰۔ حضورؐ کا صلوات کے لیے دعا کرنا دلیل ہے کہ اہلبیتؑ مستحق صلوات ہیں اس لیے کہ پیغمبرؐ کی دعا رد نہیں ہوتی ہے۔

۱۱۔ "انھم منی وانا منھم" ایک اشارہ ہے کہ اہلبیتؑ جملہ مراتب فضل وکمال میں سرکار دوعالمؐ کے شریک ہیں۔

۱۲۔ ارادہ تطہیر واذہاب رجس ایک مستقل دلیل ہے کہ اہلبیتؑ آخرت میں بھی آتش جہنم سے مکمل طور پر محفوظ ہیں۔

۱۳۔ روزانہ صبح کو دروازۂ زہراؑ پر آ کر سلام کرنا ایک اشارہ ہے کہ جن کا مرتبہ بلند تر ہوتا ہے ان کا کردار بھی بلند تر ہونا چاہیے اور اہلبیتؑ ایسے ہی ہیں۔

۱۴۔ حدیث میں سرکار کا اپنے بارے میں یہ فرمانا کہ اللہ نے مجھے بہترین گھرانے میں رکھا ہے خود اہلبیتؑ کے بہترین افراد ہونے کی دلیل ہے۔

۱۵۔ آپ نے طہارت اور مساواتِ کمال کا اعلان کر کے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اہلبیتؑ پر صدقہ حرام ہے اس لیے کہ صدقہ ہاتھوں کا میل اور ایک طرح کا کثیف مال ہوتا ہے جو اہلِ تطہیر کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے بعض محققین کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اگرچہ اہلبیت میں گھر اور گھرانے والے سبھی شامل ہو جاتے ہیں لیکن عام اطلاق کے موقع پر رہائشی گھر والے شمار نہیں ہوتے ہیں بلکہ صرف گھرانے والے ہی شمار ہوتے ہیں جو ہمیشہ گھرانے کے ساتھ رہتے ہیں رہائشی گھر والے تو کسی وقت بھی گھر سے جدا ہو سکتے ہیں۔ زوجہ طلاق کے بعد اپنے گھر یا دوسرے شوہر کے گھر چلی جاتی ہے اور اس کے گھر والوں میں شامل ہو جاتی ہے لہٰذا وہ اہلبیت میں شامل نہیں ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید نے ازواج کو یا نساء النبی کہہ کر خطاب کیا ہے یعنی نبی کی طرف نسبت دی ہے اور اہلبیتؑ کی کوئی نسبت نہیں بیان کی ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اہلبیت اور ہیں اور ازواج اور۔ ازواج میں حضورؐ شامل نہیں ہیں اور اہلبیتؑ میں حضورؐ نے اپنے کو بھی شامل کیا ہے۔

آیتِ تطہیر میں لفظ بیت واحد ہے اور ازواج اہلبیت نہیں ہیں بلکہ "اہل بیوت" یعنی مختلف گھر والی ہیں۔ پھر بیت پر بھی الف لام داخل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص گھر ہے۔ جناب ام سلمہ کو علیٰ خیر کہہ کر چادر سے دور رکھنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آیتِ تطہیر میں ازواج کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ صرف پنجتن پاکؑ کی عظمت و عصمت و طہارت و جلالت کے اعلان کے لیے نازل ہوئی ہے۔

اصحابِ کساء

خدا بُرا کرے تعصب، حسد اور اہلبیتؑ دشمنی کا کہ اسلام کی کوئی مسلمہ حقیقت مسلّم نہ رہنے پائی اور ہر جگہ حکومت کے نمک خواروں نے کوئی نہ کوئی شبہ پیدا کر دیا۔ آیتِ تطہیر اہلبیت اطہارؑ کی شان میں ہے اور اہلبیت سے مراد حضرات خمسہ نجباء ہیں کون نہیں جانتا ہے۔ لیکن دورِ قدیم و جدید میں ایسے افراد بہرحال پیدا ہوتے رہے ہیں جن کا کام ہی حقائق میں تشکیک کرنا اور مسلماتِ اسلام کو شبہات کی نذر کر دینا ہے۔ انھوں نے آیت کے قبل و بعد کا سہارا لے کر اسے ازواجِ پیغمبرِؐ اسلام سے مربوط کرنا چاہا ہے اور ضمناً یہ اعتراف بھی کرتے رہے ہیں کہ اہلبیتؑ کا دائرہ ازواج سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں حضرات علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کی بھی گنجائش ہے۔ کہ جس کے بعد ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے اس گنجائش کو بھی ختم کر دیا اور اپنے خیالِ خام میں دلائل قائم کر دیے کہ اہلبیتؑ کا اطلاق حضرات معصومینؑ پر نہیں ہو سکتا ہے، اس سے مراد صرف ازواجِ پیغمبرؐ ہیں۔ اور پھر دو ایک روایتیں بھی تیار کر دیں جن میں راویوں نے اہلبیتؑ کو ازواج سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے مقابلہ میں ان تمام احادیث کو نظرانداز کر دیا ہے جن میں اہلبیت کی مکمل وضاحت موجود تھی اور حضرات معصومینؑ کے اسماء گرامی درج تھے اور جس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ بلکہ جناب ام سلمہ کا روک دینا دلیل تھا کہ اس میں ازواج شریک نہیں ہیں۔ بہرحال یہ زمانہ کا ایک کرشمہ ہے کہ جس زوجہ پیغمبرؐ نے داخل ہونے کی کوشش کی اسے سرکارِ دو عالمؐ نے روک دیا اور جس کا اس موقع پر پتہ اور نشان بھی نہیں تھا اسے ازغیب آیت میں شامل کر دیا گیا۔

اس وقت بطورِ حاصل مطالعہ امام احمد بن حنبل اور ان کے زمانہ یا بعد کے مستند علماءِ اہلسنت کے حوالے ذکر کیے جا رہے ہیں جنھوں نے نام بنام حضرات علیؑ و فاطمہؑ اور امام حسنؑ و امام حسینؑ کی

شان میں آیتِ کریمہ کے نزول کا ذکر کیا ہے اور جس کے بعد کسی تشکیک اور تردید کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے:

۱۔ حافظ ابو داؤد الطیالسی سلیمان بن داؤد بن الجارود البصری صاحب کتاب مسند ج ۸ ص ۲۷۴ طبع حیدرآباد
۲۔ علامہ حافظ ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی صاحب مسند ج ۱ ص ۳۳۱ طبع قاہرہ
۳۔ حافظ محمد بن عیسیٰ ترمذی صاحب صحیح ترمذی حسب نقل ابن حجر
۴۔ حافظ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ کوفی صاحب مسند بحوالہ فلک النجاۃ ص ۴۳
۵۔ علامہ ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی صاحب خصائص ص ۴
۶۔ حافظ محمد بن جریر طبری صاحب تفسیر ج ۲۲ ص ۵ طبع مصر
۷۔ حافظ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم محمد الرازی بحوالہ فلک النجاۃ
۸۔ سلیمان بن احمد بن ایوب طبرانی صاحب معجم بحوالہ صواعق
۹۔ علامہ جصاص صاحب احکام القرآن
۱۰۔ حافظ حاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ نیشاپوری صاحب مستدرک ج ۲ ص ۴۱۶، ۳ ص ۱۴۶، ۳ ص ۱۵۹، ۳ ص ۱۷۲
۱۱۔ علامہ محدث احمد بن الحسین بن ہارون المؤید باللہ صاحب کتاب امالی ص ۲۳
۱۲۔ حافظ احمد بن الحسین بن علی البیہقی صاحب سنن کبریٰ ج ۲ ص ۱۴۹
۱۳۔ علامہ حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی صاحب تاریخ بغداد ج ۱۰
۱۴۔ علامہ حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر الاندلسی صاحب استیعاب ج ۲ ص ۴۶۰
۱۵۔ علامہ محدث الشیخ ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیشاپوری صاحب کتاب اسباب النزول ص ۲۶۷
۱۶۔ حافظ دیلمی صاحب کتاب فردوس بحوالہ صواعق
۱۷۔ حافظ حسین بن مسعود الشافعی البغوی صاحب مصابیح السنہ ج ۲ ص ۲۰۴
۱۸۔ علامہ محمود بن عمر الزمخشری صاحب کشاف ج ۱ ص ۱۹۳
۱۹۔ علامہ قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ الاشبیلی صاحب احکام القرآن ج ۲ ص ۱۶۶
۲۰۔ ابوالمؤید موفق بن احمد اخطب خطباء خوارزم صاحب مناقب ص ۳۵
۲۱۔ علامہ علی بن الحسین بن ہبۃ اللہ دمشقی المعروف بابن عساکر صاحب تاریخ دمشق

۲۲۔ علامہ فخرالدین الرازی صاحب تفسیر معروف
۲۳۔ ابوالسعادات مبارک بن محمد بن اثیر الجزری صاحب جامع الاصول ج ۱ ص ۱۰۱
۲۴۔ علامہ محدث الشیخ حسن بن الحسین بن علی بن محمد بن بطریق الاسدی صاحب کتاب نہج العلوم
۲۵۔ علامہ الشیخ عزالدین ابوالحسن علی بن اثیر الجزری صاحب اسد الغابہ
۲۶۔ علامہ یوسف الواعظ بن عبداللہ المشتہر بابن الجوزی صاحب تذکرۃ خواص الامۃ
۲۷۔ علامہ گنجی شافعی صاحب کفایۃ الطالب
۲۸۔ علامہ کمال الدین محمد بن طلحہ الشافعی صاحب مطالب السؤول
۲۹۔ علامہ الشیخ ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی صاحب الجامع لاحکام القرآن
۳۰۔ علامہ الشیخ یحییٰ بن شرف الدین دمشقی صاحب شرح المہذب
۳۱۔ علامہ قاضی بیضاوی صاحب تفسیر معروف
۳۲۔ حافظ محب الدین احمد بن عبداللہ الطبری صاحب ذخائر العقبیٰ
۳۳۔ علامہ نسفی صاحب تفسیر مدارک
۳۴۔ علامہ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزی صاحب مشکوۃ المصابیح
۳۵۔ علامہ جلیل ابوالفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی صاحب تفسیر معروف
۳۶۔ حافظ نورالدین علی بن ابوبکر الہیثمی صاحب مجمع الزوائد
۳۷۔ الشیخ الامام علی بن محمد المعروف بابن الصباغ المالکی صاحب الفصول المہمہ
۳۸۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی العسقلانی المعروف بابن حجر صاحب اصابہ
۳۹۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی صاحب تلخیص المستدرک
۴۰۔ علامہ الشیخ حمید بن احمد المحلی الیمانی صاحب الحدائق الوردیہ
۴۱۔ علامہ نظام الدین الحسن الاعرج القمی صاحب تفسیر نیشاپوری
۴۲۔ محدث جلیل السید عطاء اللہ الحسینی صاحب روضۃ الاحباب
۴۳۔ علامہ جلال الدین السیوطی صاحب درِ منثور
۴۴۔ علامہ مورخ غیاث الدین بن ہمام الدین صاحب حبیب السیر

۴۵۔ الشیخ احمد بن حجر المکی صاحب صواعق محرقہ

۴۶۔ علامہ میر محمد صالح کشفی صاحب مناقب مرتضوی

۴۷۔ محدث جلیل علاء الدین بن عبد الملک حسام الدین المعروف بالمتقی الہندی صاحب منتخب کنز العمال

۴۸۔ علامہ محمد الشربینی الخطیب صاحب تفسیر سراج منیر

۴۹۔ علامہ الشیخ محمد الشافعی الیمانی صاحب منظومہ

۵۰۔ علامہ ملا علی القاری صاحب شرح الفقہ الاکبر

۵۱۔ صاحب ارجح المطالب

۵۲۔ علامہ برہان الدین الشافعی صاحب السیرۃ الجلیۃ

۵۳۔ محدث زرقانی صاحب کتاب معروف

۵۴۔ علامہ عبد اللہ بن محمد بن عامر

۵۵۔ علامہ شیخ محمد صبان مصری صاحب اسعاف الراغبین

۵۶۔ علامہ قاضی الحسین بن احمد بن الحسین الیمانی صاحب الروض النضیر

۵۷۔ علامہ الشیخ محمد بن علی الشوکانی فتح القدیر

۵۸۔ شہاب الدین محمود الآلوسی صاحب روح المعانی

۵۹۔ علامہ شبلنجی صاحب نور الابصار

۶۰۔ علامہ صدیق حسن خاں بھوپالی صاحب تشریف البشر

۶۱۔ الشیخ یوسف بن اسماعیل بنہانی صاحب الشرف المؤبد

۶۲۔ علامہ ابوبکر بن شہاب الدین الشافعی صاحب رشفۃ الصادی

۶۳۔ علامہ السید العلوی الحداد الصادقی الحضرمی الشافعی صاحب القول الفصل

پردہ اور سیرتِ معصومینؑ

سیرت خود ایک ساکت وصامت حقیقت ہوتی ہے اس لیے اس سے استدلال قائم کرنے سے پہلے اس کی نوعیت پر نظر کرنا ضروری ہوتا ہے کہ نوعیت کو دریافت کیے بغیر سیرت سے استدلال ایک بے معنی امر ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے کسی معصوم کو دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ظاہر ہے کہ اس نماز سے اتنا تو ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت میں دو رکعت نماز قائم کرنا جائز ہے لیکن یہ فیصلہ ناممکن ہوتا ہے کہ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ واجب ہے تو صرف معصوم کے لیے واجب ہے یا دوسرے افراد کے لیے بھی واجب ہے۔ اس نماز کی نوعیت دریافت کرنے کے لیے مذہب کے دوسرے قوانین پر نظر کرنا ہوگی۔ مثلاً یہ دیکھا جائے گا کہ اسلام میں واجب نمازوں کی تعداد معین ہو چکی ہے اور معصوم کے خصوصیات کی بھی تحدید کی جا چکی ہے اس لیے یہ نماز واجب نہیں ہو سکتی ہے اور نہ اس کا شمار خصوصیات معصومینؑ میں ہو سکتا ہے اس لیے اس نماز کا مستحب ہونا امر یقینی ہے۔ یہی حال جملہ سیرتوں کا ہے کہ جب تک ان کی نوعیت نہ معلوم ہو جائے اس وقت تک ان کے بارے میں فیصلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پردے کے بارے میں بھی اسلام کا موقف دریافت کیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں سیرت کا تجزیہ کیا جا سکے۔ قرآن و سنت کے اکثر بیانات سے اس موقف کی وضاحت کرنے کے لیے اس وقت معصومۂ عالم جناب فاطمہ زہراؑ کا یہ فقرہ پیش نظر ہے جو آپ نے سرور کائنات کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ آپؐ کا سوال یہ تھا کہ عورت کے لیے سب سے اچھی چیز کیا ہے؟ اور معصومۂ عالمؑ کا جواب یہ تھا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ نہ اس پر کسی مرد کی نگاہ پڑے اور نہ وہ کسی مرد کو دیکھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پردہ یک طرفہ ستر کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں طرفین کی حیا و غیرت کو دخل ہے۔ پردہ صرف گھر میں بیٹھنے کا نام نہیں ہے بلکہ گھر سے نکلنے کے بعد بھی مردوں کی نظر سے بچنے کا نام ہے اور گھر میں رہ کر بھی نامحرم کی نگاہ سے

اپنے کو بچائے رکھنے کا نام ہے۔ عورت کو قانونی اعتبار سے گھر کے اندر رہ کر امورِ خانہ کی نگرانی کرنا چاہیے۔ اور اگر کبھی بر بنائے ضرورت نکل بھی آئے تو اپنے کو مردوں کی نظر سے بچائے رکھنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد کو عورت پر حکومت کا درجہ اسی معنی میں دیا ہے کہ وہ عورت کو گھر سے باہر نہ جانے دے۔ بیرون خانہ کی مصلحتوں کو عورت کی نسبت سے مرد زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اگر ان حالات کے جانتے ہوئے بھی باہر جانے کی اجازت دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی شرم و حیا رخصت ہو جائے اس کا دین مذہب کہاں رہ جاتا ہے۔

معصومہ عالمؑ کے اسی ارشاد گرامی کی روشنی میں آپ کی اس سیرت کو دیکھا جا سکتا ہے کہ آپ کے دروازے پر سرور کائنات اپنے محترم صحابی کو لے کر آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی تو معصومۂ عالمؑ نے اجازت دے دی۔ لیکن آپ نے دوبارہ سوال کیا تو آپ نے عرض کیا کہ گھر آپ کا گھر ہے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟۔ آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ میرا ایک صحابی بھی ہے جناب سیدہؑ نے عرض کی کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے پاس ایک چادر ہے جس سے یا سر کو چھپا سکتی ہوں یا پیروں کو۔ ایسی حالت میں کسی صحابی کو گھر کے اندر آنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہوں ــــ؟ واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معصومۂ عالمؑ صحابی کو گھر کے اندر آنے سے نہیں روکنا چاہتیں بلکہ پردے کے حدود پر روشنی ڈالنا چاہتی ہیں۔ یعنی اگر میرے پاس چادر ہوتی تو ضرور اجازت دے دیتی اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت نے اپنی عبا عنایت فرما دی تو جناب سیدہ نے بخوشی صحابی کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

معصومہؑ کے گذشتہ ارشاد سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ عورت یا مرد کے دیکھنے کا مطلب اس کے چہرے اور صورت کا دیکھنا ہے۔ لیکن آپ کی سیرت نے اس کی مزید وضاحت اس طرح کر دی کہ اس کے حدود میں قد و قامت بھی آجاتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے کہ آپ نے اسماء سے یہ شکوہ کیا کہ مدینہ میں جنازہ اٹھانے کا طریقہ ناقص ہے اس سے مُردے کا قد و قامت نمایاں ہو جاتا ہے اور جب اسماء نے حبش کے طریقہ سے تابوت بنا کر دکھایا تو آپ کے لب ہائے مبارک پر مسکراہٹ آگئی۔ (بعض روایات میں یہ طریقہ معصومہؑ کے خواب کا نتیجہ بتایا گیا ہے)۔ ظاہر ہے کہ آپ کا اضطراب

مرنے کے بعد کے لیے تھا جب انسان سے ہر حکم اور فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اضطراب بتاتا ہے کہ آپ مرنے کے بعد بھی اپنے قد و قامت کو نمایاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں اور جو مرنے کے بعد اس بات کو پسند نہ کرتا ہو وہ زندگی میں کیسے پسند کر سکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب رسول اکرمؐ آپ کو مباہلہ میں لے کر چلے تو آگے خود رہے اور پیچھے حضرت علیؑ کو کر دیا تاکہ فاطمہؑ کا قد نمایاں نہ ہونے پائے اور فاطمہؑ کے نقش قدم پر کسی کی نظر نہ پڑنے پائے۔

حضرت فاطمہ زہرؑا کی یہی بلندیٔ نفس تھی جس کی عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ ابن مکتوم نابینا صحابی کو لے کر اپنے گھر میں تشریف لائے اور عائشہ و حفصہ سے کہا کہ حجرے میں چلی جاؤ تو دونوں نے کہا کہ یہ تو نابینا صحابی ہے، اس سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؛ تو آپ نے فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ وہ نابینا ہے لیکن تم تو نابینا نہیں ہو ــــ اسلام جہاں اس کا نظر کرنا پسند نہیں کرتا ہے وہیں تمھارا بھی نظر کرنا پسند نہیں کرتا ہے۔

مذکورۂ بالا واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت کی اصلی منزل حدود خانہ ہے اور اس کا اصل منصب امورِ خانہ کی نگرانی ہے ــ اس کے رُخ و رخسار کو نگاہ مردم سے بچانے میں خیر ہے اور اس کے قد و قامت کو اجنبی نظروں سے بچائے رکھنے میں عافیت ہے۔ یہی کردار معاشرہ کی اصلاح کا ضامن ہے اور یہی اصول حیات سماج کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اگرچہ اس کے حدود واجبات سے زیادہ ہیں اور واجبات میں ان میں سے بہت سی چیزیں شامل نہیں ہیں۔ لیکن خیر بہر حال خیر ہے اور حتی الامکان اس کا لحاظ ضروری ہے۔ بلا ضرورت خیر کو ترک کر دینا بعض اوقات شر کا باعث ہو جاتا ہے۔

خداوند عالم امت توحید و رسالت اور پیروان مسلک ولایت کو اس خیر کے حاصل کرنے کی توفیق کرامت فرمائے اور ہمارے معاشرہ کو ہر شر و آفت سے محفوظ رکھے۔

نقشِ زندگانی

حیاتِ امام حسنؑ مجتبیٰ

ولادت: ۱۵ر رمضان المبارک ۳ھ

شہادت: ۲۸ر صفر ۵۰ھ

باسمہ سبحانہ

نقشِ زندگانی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

یکم ذی الحجہ ۲ھ کو مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کا عقد صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہؑ سے ہوا، اور اس کے تقریباً ۹½ ماہ کے بعد ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ میں امام حسنؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ جس کے بارے میں جناب ام الفضل نے یہ خواب دیکھا تھا کہ رسول اکرمؐ کے جسم اقدس کا ایک ٹکڑا میری گود میں آگیا ہے اور سخت پریشان تھیں کہ رسول اکرمؐ نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ عنقریب میری بیٹی فاطمہؑ کے یہاں فرزند پیدا ہونے والا ہے اور اس کی تربیت کا شرف تمھیں کو حاصل ہوگا۔

ولادت کے موقع پر نام رکھنے کی رسم میں نہ حضرت علیؑ نے سبقت کی اور نہ حضرت زہراؑ نے۔ خود رسول اکرمؐ نے بھی وحی الٰہی کا انتظار کیا اور جبریل امین یہ پیغام الٰہی لے کر آئے کہ علیؑ بمنزلہ ہارون ہیں تو ان کے فرزند کا نام ہارون کے فرزند کے نام پر شبر رکھ دو یا عربی زبان کے اعتبار سے حسنؑ اور اس طرح زہراؑ کے اس پہلے فرزند کا نام حسنؑ طے ہوگیا اور یہ نام خزانۂ قدرت سے عطا کیا گیا تھا کہ اس سے پہلے یہ نام کسی کا نہ تھا۔

- القاب میں زکی، طیب، سبط رسولؐ اور نبضِ رسولؐ "سید" مشہور لقب ہے۔
- کنیت ابو محمد ہے، جس کا تذکرہ مسلسل روایات اور زیارات میں وارد ہوا ہے۔
- ولادت کے بعد پہلی غذا رسول اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے حاصل کی جو ظاہری اعتبار سے اثراتِ رسالت کے منتقل کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔
- عقیقہ کی رسم بھی رسولِ اکرمؐ نے ادا کی، اور اس طرح اسلام میں اس مبارک رسم یا سنتِ رسولؐ کا آغاز ہوگیا۔

امام حسن مجتبیٰؑ کی ولادت کا زمانہ وہ تھا جب مسلمان جنگ احد کی تیاریوں میں مصروف تھے اور اس طرح آپ نے عام بچوں کے اعتبار سے لاشعوری دور میں اور امامت کے اعتبار سے مکمل طور پر شعوری اعتبار سے سب سے پہلے "اصحاب باوفا" کی بے وفائی کا سامنا کیا۔ جہاں رسول اکرمؐ میدان میں تقریباً تنہا کھڑے تھے اور مالِ غنیمت کے لالچیوں نے انھیں فوج دشمن کے حوالے کرکے اپنی جان بچالی تھی اور انھیں متعدد زخموں کی اذیت بھی برداشت کرنا پڑی تھی اور پھر یہی نقشِ اول آپ کی زندگی کا نقشِ آخر بھی بن گیا۔

- ۳ھ کی جنگ احد کے بعد امام حسنؑ نے ۵ھ میں جنگ احزاب کا مشاہدہ کیا جہاں اصحاب کی یہ کمزوری اور بزدلی دیکھنے میں آئی کہ حضرت علیؑ کی تلوار اور ان کی جرأت شیرانہ نہ ہوتی تو رسول اکرمؐ کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا اور کلِ کفر کل اسلام پہ غالب آجاتا۔
- ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس میں اصحاب کا یہ طرزِ عمل دیکھنے میں آیا کہ یہ پہلے صلح کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں کہ اس طرح جان بچنے کا راستہ نکل آتا ہے اور اس کے بعد صاحب منصب کے منصب میں بھی شک کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی امام حسنؑ کی زندگی کا ایک المیہ تھا جس سے آپ کو خود اپنے دور میں بھی دوچار ہونا پڑا۔
- ۷ھ میں جنگ خیبر ہوئی۔ وہاں بھی یہ منظر سامنے آیا کہ حضرت علیؑ کی شجاعت کا سہارا نہ ہوتا تو تاریخِ اسلام میں فرار کے علاوہ کوئی داستان نہ ہوتی اور یہودی ہمیشہ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے سر پر سوار ہوجاتے۔
- ۸ھ میں فتح مکہ کا منظر سامنے آیا جہاں مصلحتاً ابوسفیان اور معاویہ نے اسلام قبول کرلیا اور امام حسنؑ نے منافقین کا بھی ایک مجمع دیکھ لیا۔
- ۹ھ میں اسلام کے صداقت کے معرکہ میں پہلے پہل امام حسنؑ نے براہ راست شرکت کی اور سب سے آگے آگے رہے۔ یہ معرکہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان تھا، جسے مباہلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ امام حسنؑ کمسنی کی بنا پر رسول اکرمؐ کی انگلی پکڑ کر چل رہے تھے یا رسول اکرمؐ قوم کو سمجھا رہے تھے کہ آج میں اسے سہارا دے رہا ہوں کل یہ میرے دین اسلام کو سہارا دے گا۔
- ۱۰ھ میں رسول اکرمؐ نے آخری حج فرمایا جس کی واپسی پر مقام غدیر میں حضرت علیؑ کی مولائیت

کا اعلان کیا اور صحابہ کرام نے بشمول حضرت عمر اس مولائیت کی مبارکباد پیش کی اور امام حسنؑ نے ظاہرداری کی ایک نئی رسم کا مشاہدہ کیا۔

● ۱۱ھ میں ۲۸ صفر کو رسول اکرمؐ نے انتقال فرمایا اور امام حسنؑ اپنی زندگی کے پہلے عظیم حادثہ سے دوچار ہوئے جس کے بعد یہ منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ لاکھوں صحابہ کا پیغمبرؐ بستر مرگ پر ہے اور کوئی غسل و کفن میں حاضری دینے والا نہیں ہے اور جنازہ میں مخصوص افراد کے علاوہ کوئی نہیں ہے اور اس طرح امام حسنؑ نے زندگی میں چاہنے والوں کے برتاؤ کے ساتھ مرنے کے بعد بھی "مخلصین" کا سلوک دیکھ لیا۔

اسی ۱۱ھ میں رسول اکرمؐ کے انتقال کے ۷۵ یا ۹۵ دن کے بعد مادر گرامی کی شہادت کا المیہ برداشت کیا۔ جہاں حق فدک سے محرومی، دروازہ پر آگ کے شعلے، پہلو پر دروازہ گرنے اور محسن کی شہادت کا منظر بھی دیکھا اور بجز صبر کوئی اقدام نہ کرسکے کہ ذمہ دار مذہب حضرت علیؑ موجود تھے اور اقدامات کے بارے میں انھیں کو فیصلہ کرنا تھا اور اس طرح امام حسنؑ نے سخت ترین حالات میں بھی صبر و سکوت کی پالیسی کا مشاہدہ کیا جس کا حوصلہ انھیں قدرت نے روز اول ہی امامت کے منصب کے ساتھ عطا کر دیا تھا۔

● اس سات سال کے وقفہ میں امام حسنؑ کے مختلف کارنامے دیکھنے میں آئے اور ان کے مختلف فضائل و کمالات کا اظہار ہوتا رہا، مثال کے طور پر:

ا۔ آپ رسول اکرمؐ کے موعظہ کی ترجمانی صدیقہ طاہرہؑ سے کیا کرتے تھے اور ایک دن حضرت علیؑ بھی پس پردہ اس ترجمانی کے سننے میں شریک ہوئے تو امام حسنؑ کے بیان میں فرق آگیا اور عرض کرنے لگے کہ مادر گرامی آج زبان میں وہ روانی نہیں ہے جو پہلے تھی ایسا لگتا ہے کہ کوئی سردار مجھے دیکھ رہا ہے۔

ب۔ رسول اکرمؐ کے سامنے صدقہ کے خرمے رکھے تھے، امام حسنؑ کی نظر پڑ گئی تو رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "بیٹا کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ صدقہ ہم اہلبیتؑ پر حرام ہے" جس سے علامہ ابن حجر عسقلانی نے یہ استنباط کیا ہے کہ امام حسنؑ آغوش مادر سے لوح محفوظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ اس روایت میں خرمہ کے منھ میں رکھ لینے کا بھی ذکر ہے جو شانِ امامت کے بجائے شانِ واضعین حدیث کے لیے زیادہ سازگار ہے۔

ج۔ بعض روایات کی بنا پر آپ سجدہ کی حالت میں پشت رسولؐ پر آ گئے تو آپ نے سجدہ کو طول دیدیا اور پشت سے اتارنا گوارا نہ کیا۔

د۔ بعض روایات کی بنا پر آپ مسجد میں آ کر گر پڑے تو رسول اکرمؐ نے خطبہ کو قطع کر کے منبر سے اتر کر آپ کو اٹھا لیا اور فرمایا کہ یہ میرا فرزند سید ہے۔

ہ۔ اسی مختصر سی عمر میں رسول اکرمؐ نے آپ کی سیادت و سرداری کا بھی اعلان کیا، آپ کو جوانانِ جنت کا سردار بھی قرار دیا، اور آپ کو لفظ امام سے بھی یاد کیا اور آپ کو اپنا ایک جزء بھی قرار دیا۔

و۔ آپ جس طرح میدان مباہلہ میں سب سے آگے رکھے گئے تھے اسی طرح زیر کساء یمانی جمع ہونے والے افراد میں بھی آپ سب سے پہلے نانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جس کے بعد خدائے کریم نے اہلبیتؑ کی عصمت و طہارت کا اعلان فرمایا تھا۔

ز۔ آپ کو مباہلہ کے میدان میں رسول اکرمؐ نے اپنی رسالت و صداقت کے گواہ کے طور پر پیش کیا تو صدیقہ طاہرہؑ نے مسئلہ فدک میں اپنے والد محترم کی طرف سے فدک کے ہبہ ہونے کی گواہی میں پیش کیا جب کہ فدک کے ہبہ کے موقع پر آپ کی عمر بہت سے بہت چار برس کی ہوگی لیکن واضح سی بات ہے کہ جو شخص چند برس کی عمر میں رسالت کی گواہی دے سکتا ہے وہ چار برس کی عمر میں ہبہ کا گواہ کیوں نہیں ہوسکتا اور اس کی گواہی کا متحمل کیوں نہیں ہوسکتا ہے۔

ح۔ اسی زمانے میں آپ نے بروایت صواعق محرقہ حاکم وقت ابوبکر کو منبر پر دیکھ کر ٹوک دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میرے باپ کے منبر سے اتر آ اور اپنے باپ کا منبر تلاش کر۔ اس طرح اپنے فرزند رسولؐ یا اپنے پدر بزرگوار کے صاحب منبر ہونے کا اعلان کر دیا تھا جس کی جرأت عام انسانوں اور بالخصوص بچوں کے لیے ناممکن ہے۔

ط۔ اسی زمانے میں بروایت اسد الغابہ آپ رسول اکرمؐ کے کاندھے پر تھے کہ کسی صحابی نے مبارکباد دی کہ کیا اچھی سواری ہے؟ تو رسول اکرمؐ نے ٹوک کر فرمایا یہ کہو کہ کیا اچھے سوار ہیں۔ اور اس طرح صحابی پر یہ واضح کر دیا کہ اسلام میں سواری بن جانا شرف نہیں ہے سوار دوشِ رسول بن جانا شرف ہے اور ایں سعادت بزور بازو نیست۔

علم امام حسنؑ

۱۔ بچپنے کا زمانہ تھا۔ ابوبکرؓ کا دورِ خلافت تھا۔ ایک شخص نے خلیفۃ المسلمین سے سوال کیا کہ حالتِ احرام میں شتر مرغ کے انڈے کھا لیے ہیں تو کیا کفارہ دینا ہوگا؟ — آپ نے مسئلہ کو عبدالرحمٰن بن عوف کے حوالے کر دیا۔ اس نے سنگینیِ مسئلہ کو دیکھ کر اسے حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے امام حسنؑ کو جواب دینے کا حکم دیا۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ اونٹنیوں پر اتنی ہی مقدار میں اونٹ چھوڑ دیے جائیں اور جو بچے پیدا ہوں انھیں خانۂ خدا کے حوالے کر دیا جائے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ فرزند بعض انڈے خراب بھی تو ہو سکتے ہیں۔ عرض کیا بے شک! لیکن بعض حمل ضائع بھی تو ہو سکتے ہیں۔ (مناقب ابن شہر آشوب)

۲۔ حضرت علیؑ مقام رحبہ میں تھے ایک شخص نے آکر اظہارِ خلوص کیا۔ فرمایا تو میرا دوست نہیں ہے معاویہ کا جاسوس ہے اور اس سے بادشاہ روم نے چند سوالات کیے ہیں۔ وہ ان کے جوابات سے عاجز تھا تو اس نے تجھے یہاں روانہ کیا ہے اور پھر امام حسنؑ کو جواب دینے کا حکم دیا — سوالات یہ تھے:

(۱) حق و باطل کا فرق کیا ہے؟ (۲) زمین و آسمان کا فاصلہ کیا ہے؟ (۳) مشرق و مغرب کی مسافت کتنی ہے؟ (۴) خنثیٰ کسے کہتے ہیں اور اس کی شناخت کا ذریعہ کیا ہے؟ (۵) وہ دس اشیاء کون سی ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے قوی تر ہے؟

آپ نے بالترتیب فرمایا کہ حق و باطل کا فاصلہ چار انگشت کے برابر ہے کہ جسے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ حق ہے اور جسے صرف سُنا ہے وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ زمین و آسمان کا فاصلہ بقدرِ آہِ مظلوم ہے کہ اس فاصلہ کو وہی طے کر سکتی ہے اور بس۔ مشرق و مغرب کا بُعد بقدرِ سیرِ آفتاب ہے کہ وہ ایک دن میں یہ فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ خنثیٰ اس انسان کو کہتے ہیں جس کے مرد و عورت ہونے کا معاملہ مشتبہ ہو۔ اس کا پہلا حل یہ ہے کہ جوانی میں اعضاء و جوارح کی ساخت دیکھی جائے۔ وہ بھی غیر واضح ہو تو پھر پیشاب کرنے کا انداز دیکھ کر اس کے مرد یا عورت ہونے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ دس اشیاء میں ایک سخت شے پتھر ہے جس سے شدید تر وہ لوہا ہے جو اسے توڑ دیتا ہے اور اس سے قوی تر وہ آگ ہے جو اسے پگھلا دیتی ہے اور اس سے قوی تر وہ پانی ہے جو اسے بُجھا دیتا ہے اور اس سے قوی تر وہ بادل ہے

جو اسے اٹھائے پھرتا ہے اور اس سے طاقتور وہ ہوا ہے جس کے کاندھوں پہ یہ بادل رہتا ہے اور اس سے قوی تر وہ فرشتہ ہے جو ہُوا کو حرکت دیتا ہے اور اس سے قوی تر وہ فرشتۂ موت ہے جو اسے بھی موت دے گا اور اس سے قوی تر وہ موت ہے جس سے وہ بھی نہ بچ سکے گا اور اس سے قوی تر وہ حکمِ خدا ہے جو موت پر بھی حکمرانی کرتا ہے۔

امام حسنؑ کے ان جوابات میں عظیم ترین علمی، سیاسی اور اجتماعی نکات پائے جاتے ہیں جن میں آپ نے ہر جواب سے معاویہ کو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے تاکہ وہ ہدایت یافتہ نہ ہو سکے تو کم سے کم اپنی طرف سے اتمامِ حجت کا فریضہ ادا ہو جائے۔

مثال کے طور پر حق و باطل کے فاصلہ میں سماعت اور بصارت کا حوالہ دے کر اس امر کو واضح کرنا چاہا ہے کہ ہمارے پاس جو سیرتِ رسولؐ ہے وہ ہمارے مشاہدہ کی بنیاد پر ہے اور تیرے پاس جو سیرت ہے وہ صرف سُنی سُنائی ہے، اور سُنی سُنائی کا اعتبار مشاہدہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوتا ہے، لہذا اصل ہمارا دین اور ہمارا مذہب ہے۔

زمین و آسمان کے فاصلہ میں آہِ مظلوم کا حوالہ دے کر اس بات کا اعلان کیا ہے کہ آہِ مظلوم ظالموں کے کانوں تک پہونچے یا نہ پہونچے آسمان اور عرشِ خدا تک بہرحال پہونچ جاتی ہے۔

قوی ترین اور شدید ترین اشیاء کی ترتیب و تدریج سے اس امر کا اعلان کیا ہے کہ تیرے اختیار میں صرف لوہا، پتھر اور آگ یا پانی ہے اور میرے اختیار میں وہ امرِ خدا ہے جو ہر صاحبِ امر کے اختیار میں رہتا ہے اور جس سے زیادہ قوی تر کوئی شے نہیں ہے لہذا ایسے صاحبِ اختیار کو مجبور سمجھ کر اس کی طاقت سے مقابلہ کرنا جہالت، سفاہت اور حماقت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۳۔ بادشاہ روم نے حضرت علیؑ اور معاویہ کے اختلافات کا ذکر سنا تو چاہا کہ دونوں کے نمائندوں کو بُلا کر صورتِ حال کا اندازہ کرے۔ چنانچہ اس نے فریقین کے نمائندے طلب کیے۔ معاویہ نے یزید کو بھیجا اور امیرالمومنینؑ نے امام حسنؑ کو۔ یزید نے بادشاہ روم کی دست بوسی کی اور امام حسنؑ نے شکرِ پروردگار ادا کیا۔ اس نے چند تصویریں نکالیں جن کا کوئی شناخت کرنے والا نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جناب آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور جناب شعیبؑ کی تصویریں ہیں اور ایک تصویر کو دیکھ کر رو دیے کہ یہ میرے جدِ بزرگوار کی تصویر ہے۔ جس پر بادشاہ روم نے یہ عجیب و غریب سوال کیا کہ وہ کون سی مخلوق ہے جو بغیر ماں باپ اور

نرومادہ کے پیدا ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ سات مخلوقات ہیں: (۱) جناب آدم (۲) جناب حوا (۳) فدیہ اسماعیل کا دنبہ (۴) جناب صالح کا ناقہ (۵) جناب موسیٰ کا اژدہا (۶) ابلیس (۷) وہ کوا جس نے قابیل کو دفن کا طریقہ سکھایا تھا۔ جس پر بادشاہ روم بیحد خوش ہوا اور اس نے آپ کو تحفہ و تحائف کا نذرانہ پیش کیا۔ (تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ)

اخلاق

امام حسنؑ اخلاق کریمانہ کی اس وسعت کے مالک تھے کہ خُلقِ حسن ایک محاورہ کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد واقعات تاریخ میں نقل کیے گئے ہیں:

۱۔ گھر کی خادمہ سے شوربہ کپڑے پر گر گیا تو آپ نے سزا دینے کے بجائے اسے راہِ خدا میں آزاد کر دیا تاکہ اسے کنیز ہونے اور کنیز ہونے کی بنا پر قابلِ تعزیر ہونے کا احساس نہ پیدا ہو۔

۲۔ ایک مردِ شامی نے راستہ روک کر بُرا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے، تجھے غذا کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے۔ لباس کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے، سواری کی ضرورت ہو تو یہ سواری حاضر ہے۔ وہ اپنی اس حرکت پر بیحد شرمندہ ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنے پیغام کو کس منزل پر رکھے گا۔

۳۔ آپ نے متعدد بار سارا مال راہِ خدا میں تقسیم کر دیا اور اپنے لیے کچھ نہ بچایا ـــ تو کہنے والے نے عرض کیا کہ حضور آپ تو سب خرچ کر دیتے ہیں اور بے حساب عطا کرتے ہیں۔ فرمایا میں اپنے مال سے کچھ نہیں کرتا ہوں، خدا مجھے دیتا ہے میں غربا کو دیتا ہوں، خدا دینا بند کر دے گا تو میں بھی بند کر دوں گا۔ لیکن میں بند کر کے خدا کی عطا پر بے اعتمادی کا اظہار نہیں کر سکتا (نورالابصار)۔ اپنے کمال کی تعریف کو عطائے پروردگار کی طرف موڑ دینا کمال شرافت اور معراجِ بندگی کی دلیل ہے جو اہلِ نفسانیت کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

۴۔ آپ کا دسترخوان ایک شہرت عام رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیرالمومنینؑ کے پاس سائل آتے تھے تو فرماتے تھے کہ سوکھی روٹی یہاں حاضر ہے اور اس سے بہتر غذا حسنؑ کے دسترخوان پر ملے گی کہ میں اس وقت امیرِ کائنات ہوں اور میری ذمہ داریاں بالفعل ہیں حسنؑ پر ان

ذمہ داریوں کا بار میرے بعد پڑے گا تو ان کا طرزِ عمل بھی ایسا ہوگا۔

۵۔ حاکم شام نے مدینہ میں اپنی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور سارا مال تقسیم کر کے امام حسنؑ کو طلب کیا اور آپ دربار میں گئے تو اتنا ہی مال طلب کر کے آپ کے حوالے کر دیا کہ آپ فرزندِ رسولؐ ہیں آپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے مال کو دیکھ لیا اور چلنے لگے تو معاویہ کے نوکر نے آپ کی جوتیاں سیدھی کر دیں۔ آپ نے سارا مال اسے عطا کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ تیری نظر میں میرا مرتبہ تمام قوم سے بالاتر ہے یہ تیرا اعترافِ حق ہے لیکن میں اتنے مال کا حقدار تیرے نوکر کو سمجھتا ہوں، میرے غلاموں کے لیے تو اس مالِ دنیا کی کوئی قیمت نہیں ہے، ان کے لیے تو خدا نے آخرت میں نعماتِ جنّت کا انتظام کیا ہے اور مجھے سردارِ جوانانِ جنت بنایا ہے۔

آپ کا فلسفہ زہد و قناعت و تسلیم و رضا یہ تھا کہ جب آپ کے سامنے جناب ابوذرؓ کا ذکر کیا گیا کہ وہ تونگری پر ناداری کو، اور صحت پر بیماری کو ترجیح دیا کرتے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ خدا ان پر رحمت نازل کرے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ انسان قضا و قدرِ الٰہی پر توکل کرے اور وہ جس حال میں رکھے اس کو پسند کرے اور اسی کو ترجیح دیتا رہے اور اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ اپنے فیصلوں کو اپنے مالک کے حوالے کر دینا کمالِ بندگی ہے۔ وماتشاؤن الا اَن یشاء اللہ۔

شجاعت

پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد مولائے کائنات کی زندگی کے تقریباً ۲۵ سال اس سکوت کے عالم میں گذرے کہ آپ نے ملتِ اسلامیہ کے مسائل بھی حل کیے، حکومتوں کو اسلامی قوانین کے مطابق مشورے بھی دیئے، اپنے حق کا مسلسل اظہار بھی کیا لیکن نہ حکومت کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی گئیں اور نہ آپ نے اس سلسلہ میں کوئی مسلح قدم اٹھایا۔ اور ظاہر ہے کہ جب مولائے کائنات کی زندگی کا ایک طویل وقفہ تقریباً تاریخ کے پردۂ راز میں رہ گیا تو امام حسنؑ کے کارہائے نمایاں کا کیا اظہار ہو سکتا ہے۔ صرف چند علمی مسائل کے سلسلہ میں آپ کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی واضح تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے۔ البتہ قتل عثمان کے موقع پر جب محاصرہ شدہ لوگوں کو پانی فراہم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو امام حسنؑ ہی نے یہ خدمت انجام دی تھی کہ بنی امیہ کو اس احسان کا بھی احساس رہے اور پھر امیرالمومنینؑ کے خلیفۃ المسلمین

ہونے کے بعد جب جمل و صفین کے معرکے پیش آئے تو ان میں امام حسنؑ نے شرکت بھی کی اور بعض اوقات پرچم اسلام بھی آپ کے ہاتھوں میں رہا۔ خود اپنی صلح کے بعد جب معاویہ کی شرارتیں تمام نہیں ہوئیں تو آپ حکم خدا کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اگرچہ آپ نے قوم کی سستی اور بیوفائی کا مشاہدہ کر لیا تھا اور اسی بنیاد پر صلح پر آمادہ ہو گئے۔

جنگ جمل میں حضرت عائشہ کو مدینہ واپس جانے پر آپ ہی کی ہیبت نے آمادہ کیا تھا ورنہ ان کے حوصلے شکست کے بعد بھی بلند تھے اور پھر جنگ صفین کے سلسلہ میں جب کوفے کے حالات خراب ہوئے تو امیرالمومنینؑ نے آپ ہی کو عمار یاسر کے ہمراہ روانہ کیا تھا کہ کوفہ کی فضا کو سازگار بنائیں اور آپ نے ایک تقریر سے کوفے کے حالات کا رُخ تبدیل کر دیا تھا اور تقریباً ۹½ ہزار کا لشکر تیار کر لیا تھا۔

عبادت

عبادت آل محمدؐ کا شعار اور ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان سے بہتر عبادت گزار کائنات میں نہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ان کی ایک ایک ضربت عبادت ثقلین پر بھاری ہو جاتی ہے۔ امام حسنؑ بھی انہیں آل محمدؐ کی ایک فرد ہیں جنھوں نے خوفِ خدا میں بے پناہ گریہ کیا۔ (محاضرات راغب)

- کبھی وقت وضو آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ (ربیع الابرار زمخشری)
- کبھی راہِ خدا میں اپنا سارا مال بار بار تقسیم کر دیا (حلیۃ الاولیاء، اسد الغابہ تذکرہ)
- کبھی ۲۵ حج پیدل کیے جب کہ سواریاں آگے آگے چل رہی تھیں۔ (مستدرک، سنن کبریٰ)

حدیہ ہے کہ جب مسجد کوفہ میں امیرالمومنینؑ کا سر اقدس شگافتہ ہو گیا اور آپ خون میں نہائے ہوئے مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے امام حسنؑ ہی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا اور آپ نے ایسے سنگین حالات میں بھی نہایت درجہ خشوع و خضوع اور اخلاص قلب کے ساتھ نماز پڑھائی تھی کہ ذہن اقدس پر حالات کی سنگینی اور سختی کا کوئی اثر نہیں تھا، اور توجہ الی اللہ کے بعد دنیا کا ہر خیال ذہن اقدس سے نکل گیا تھا۔

شہادت

معاویہ نے جب یہ دیکھ لیا کہ تخت و تاج پر قبضہ کر لینے کے بعد بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوا جو اس

کی نگاہ میں اہم ترین مقصد تھا اور عالم اسلام نے اسے ابوسفیان کے ایک فرزند ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے تو اس نے آپ کی زندگی کے خاتمہ کا ارادہ کر لیا۔ متعدد بار آپ کو زہر دیا گیا لیکن قضا و قدر نے بچا لیا۔ یہاں تک کہ مروان کے ذریعہ آپ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں زہر دلوایا گیا اور اسے ایک لاکھ درہم نقد کے ساتھ اس وعدہ سے نوازا گیا کہ اس کے احسان کے عوض اسے یزید کی زوجیت میں دے دیا جائے گا۔ حسن کی زوجیت یزید سے ختم کر دیا جائے گا چنانچہ اس ظالمہ نے زہر دے دیا اور آپ کے جگر کے ۷۲ ٹکڑے ہو گئے لیکن اس کے بعد اس ظالمہ کا بھی وہی انجام ہوا جو دنیا کے ہر ظالم کا جلد یا بدیر ہوا کرتا ہے اور معاویہ نے اسے دریا میں پھینکوا دیا کہ جب تو حسنؑ جیسے انسان سے وفا نہیں کر سکتی ہے تو یزید سے کیا وفا کرے گی اور اس طرح جعدہ کی زندگی کے ساتھ زوجیت کی عظمت بھی غرقِ دریا ہو گئی۔

معاویہ کے زہر دلوانے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے خبر شہادت امام حسنؑ سننے کے بعد سجدۂ شکر ادا کیا اور اس قدر بلند آواز سے تکبیر کہی کہ لوگ دریافت حال پر مجبور ہو گئے اور اس طرح انھیں امام حسنؑ کی خبر شہادت بھی مل گئی۔

معاویہ کے بعد بنی امیہ کا نمبر آیا کہ جب امام حسنؑ کا جنازہ روضۂ رسولؐ کی طرف چلا تو بنی امیہ نے مزاحمت کی اور ایک مرتبہ پھر حضرت عائشہ میدان میں آگئیں اس مرتبہ آپ خچر پر سوار تھیں اور فرمایا کہ حسنؑ کا جنازہ پہلوئے رسولؐ میں دفن نہیں ہو سکتا اور اس اشتعال انگیزی کا اثر یہ ہوا کہ بنی امیہ نے جنازہ پر تیراندازی شروع کر دی اور بنی ہاشم امام حسنؑ کے جنازہ کو واپس لا کر بقیع میں دفن کرنے پر مجبور ہو گئے اور امام حسینؑ نے کسی طرح کی مزاحمت پسند نہیں کی۔ امت کو اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ پہلوئے رسولؐ میں دفن ہونے کا شرف اہلبیتؑ کو نہیں حاصل ہو سکا، وہ اس بات سے غافل رہ گئی کہ اہلبیتؑ کی جگہ روز اول سے قلب رسولؐ میں ہے، انھیں پیغمبر اسلامؐ نے اپنا جزء اور ٹکڑا قرار دیا ہے وہ اپنی عظمت میں مسکن اور مدفن کے محتاج نہیں ہیں۔

ازواج

تاریخ کی نشان دہی کی بنیاد پر امام حسنؑ کی پوری زندگی میں مختلف اوقات میں صرف ۹ ازواج کا پتہ ملتا ہے جن کے اسماء یہ ہیں: ام فروہ۔ خولہ بنت منظور۔ ام بشیر ثقفیہ۔ رملہ۔ ام الحسن۔ بنت امرء القیس۔

جعدہ، ام اسحاق بنت طلحہ بن عبیداللہ تیمی۔

لیکن بنی امیہ کے نمک خواروں نے امام حسنؑ کے کردار کو مجروح بنانے کے لیے افسانہ سازی کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا، اور جس طرح امیرالمومنینؑ کے خلاف ابوجہل کی بیٹی سے عقد کرنے کا شاخسانہ تیار کیا تھا اسی طرح امام حسنؑ کے خلاف تعدد ازدواج کی داستان سازی کا مقابلہ شروع ہوگیا۔

ابن ابی الحدید نے علی بن عبداللہ المدائنی کے حوالے سے ستّر ازواج کا پتہ لگایا۔

اور شبلنجی نے نورالابصار میں نوّے ازواج کا ذکر کیا۔

قوت القلوب مکی میں یہ تعداد ۲۵۰، اور ۳۰۰ تک پہونچا دی گئی اور اس طرح اموی نمک خواروں نے حق نمک ادا کردیا۔ یہ اور بات ہے کہ میزان الاعتدال ذہبی کے بقول مدائنی امام مسلم کی نظر میں ناقابل روایت ہے اور نام کے اعتبار سے اس نے صرف دس ازواج کا نام بتایا ہے۔

شبلنجی اور قوت القلوب کی روایات میں تو راوی کا بھی پتہ نہیں ہے کہ کس نے اس قدر شادیوں میں شرکت کی اور اس کا نکاح نامہ مرتب کرکے رکھا ہے تاکہ صحیح تعداد محفوظ رہے اور کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے۔

مدائنی کا حافظہ بھی ازواج کے اعتبار سے تو قوی تھا کہ اس نے ستّر کا عدد یاد رکھا لیکن ازواج کے ناموں کے اعتبار سے دس سے زیادہ کا پتہ نہ دے سکا اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد

ازواج کی اس تعداد کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں چار سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں تو اتنی بڑی تعداد کس طرح جمع ہوگئی۔ کیا ازواج امام حسنؑ اور ملک الموت میں کوئی خاص اختلاف تھا کہ جس دن امام حسنؑ عقد کریں دوسرے دن عورت کا انتقال ہوجائے کر سن بلوغ کے بعد سے امام حسنؑ کی کل زندگی ۳۲ برس کے قریب ہوتی ہے اور امیرالمومنینؑ کے دور حیات میں ۲۵ سال کی خانہ نشینی کے دوران لوگ آل محمدؐ کی طرف رُخ کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے بیٹیاں دینا اور شادی کرنا تو بڑی بات ہے۔ امیرالمومنینؑ کا دور حکومت ۳۵ھ سے شروع ہوتا ہے اور امام حسنؑ کی شہادت ۵۰ھ میں ہوجاتی ہے، اس طرح کل زمانہ پندرہ سال کا ہوتا ہے جس میں ۷۰ کے اعتبار سے ہر سال ۵ شادیاں اور ۳۰۰ کے اعتبار سے ہر مہینہ تقریباً دو شادیاں ہوتی ہیں۔

مورخین نے اس مسئلہ کو وفات کے بجائے طلاق کے ذریعہ حل کیا ہے اور یہ روایت بھی تیار کی ہے کہ امیرالمومنینؑ نے مسجد میں آکر اعلان کیا کہ حسنؑ بہت زیادہ طلاق دیتے ہیں لہٰذا تم لوگ انھیں اپنی بیٹیاں مت دینا تو قوم نے جواب دیا کہ ضرور اپنی بیٹیاں ان کے حوالے کریں گے چاہے وہ جس قدر بھی طلاق دیتے رہیں۔

اس روایت کے مضمرات پر غور کیا جائے تو بنی امیہ کی خواہش کے عین برخلاف امام حسنؑ کے کردار کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ امام حسنؑ کسی دولت مند اور صاحب ثروت انسان کا نام نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی اتنا عظیم سرمایہ نہیں ہے کہ اس قدر عورتوں کا مہر ادا کرسکیں اور سب کے نفقہ کا انتظام کرسکیں۔ اس بنیاد پر تو خود عورتوں کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہونا چاہیے تھا نہ یہ کہ امام حسنؑ طلاق دیں اور وہ شادی کرنے پر بضد رہیں۔

۲۔ کسی شخص کے بارے میں یہ بات مشہور بھی ہوجائے کہ اس نے دو تین بیویوں کو طلاق دے دی ہے تو کوئی شخص اپنی بیٹی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ یہ امام حسنؑ کا کمال کردار ہے کہ اس قدر طلاقوں کے بعد بھی شادی کے امکانات باقی رہ گئے اور کوئی زحمت نہیں پیدا ہوئی۔

۳۔ امیرالمومنینؑ کے منع کرنے کے باوجود لوگوں کا بیٹیاں دینا اس امر کی علامت ہے کہ لوگوں کو امام حسنؑ کے کردار پر مولائے کائناتؑ کے ارشاد گرامی سے بھی زیادہ اعتبار تھا اور یہ بات خلاف واقعہ ہونے کے باوجود کردار امام حسنؑ کی ایک واضح دلیل ہے۔

۴۔ مورخین نے ازواج کی تعداد کے ذریعہ امام حسنؑ پر جنسی زندگی کا الزام تو لگانا چاہا ہے لیکن کسی مورخ کی عدالت میں مہر یا نفقہ کا مقدمہ درج نہیں ہوا ہے اور یہ علامت ہے کہ امام حسنؑ نے اس قدر شادیوں کے بعد بھی حقوق میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور ایسے شخص کو شادیاں کرنے کا یقیناً حق ہے۔

۵۔ عام طور سے جنسی الزام خود اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ انسان کے کردار پر لوگوں کو اعتماد ہے ورنہ ایک عیاش اور ہوس پرست انسان پر کوئی بھی الزام لگا دیا جائے اس پر جنسی الزام نہیں لگایا جاتا ہے کہ یہ اس کی افتاد طبع کے مطابق ہے اور ایسے مسائل الزام تراشی میں کام نہیں آتے ہیں۔ تارک صلوٰۃ پر نماز ترک کرنے کا الزام کارگر نہیں ہوتا۔ امام جماعت پر یہ الزام اثرانداز ہوسکتا ہے۔

اور پھر ان تمام باتوں کے بعد مسئلہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام جنسی زندگی کا مخالف تھا تو اسے اس طرح کی اجازت ہی نہیں دینا چاہیے تھی اور روز اول ہی اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ چار پانچ شادیوں کے بعد عقد کرنے کا حق نہیں ہے زوجہ زندہ رہے یا مر جائے ـــ لیکن اگر اسلام نے اجازت دی ہے تو اسلام کے جائز کو حرام بنانے کا کام بنی امیہ ہی انجام دے سکتے ہیں کوئی شریف مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا ہے۔

امام حسنؑ ـــ بانیٔ اسلام کی نگاہ میں

تاریخ کے جن مسلمات میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے ان میں سے ایک عظمت آل محمدؐ کا مسئلہ بھی ہے۔ ان کے منصب اور عہدہ کا اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے، ان کے تعلیمات اور احکام کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے ـــ ان کے فرامین اور ارشادات پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ بہر حال مسلم ہے کہ یہ حضرات ساری امت سے بالاتر درجہ کے مالک تھے اور مالک کائنات نے انھیں غیر معمولی فضائل و کمالات کا حامل بنایا تھا۔ ان کا آغاز طیب و طاہر تھا، ان کا انجام پاک و پاکیزہ تھا۔ ان کے کمالات شہرۂ آفاق تھے اور ان کے فضائل ناقابلِ انکار تھے۔ زمانہ نے انھیں منصب دار مانا ہو یا نہ مانا ہو، ان کے فضائل کا اقرار ضرور کیا ہے اور دشمن نے بھی انھیں قتل کیا ہے تو ان کے مناقب و کمالات کا اعتراف کرنے کے بعد، اور قاتلوں نے بھی انعامات کے مطالبہ میں یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ کسی معمولی آدمی کو نہیں مارا ہے بلکہ ایک عظیم صاحب کمالات و کرامات کو قتل کیا ہے۔

عظمتِ آل محمدؐ کا انکار درحقیقت ارشادات مرسلِ اعظمؐ کا انکار ہے۔ "عظمت آل محمدؐ کا انکار آیاتِ قرآنی، تاریخی حقائق اور عقائدی مسلمات کا انکار ہے ـــ "عظمت آل محمدؐ کا انکار روز روشن اور آفتاب نصف النہار کا انکار ہے اور یہ کام شپرہ چشم کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔

امام حسنؑ انھیں آل محمدؐ کی ایک نمایاں فرد ہیں جنھیں تطہیر کی منزل میں، مباہلہ کے میدان میں، بازار میں دوشِ پیغمبرؐ پر، مسجد میں پشت رسولؐ پر، منبر پر آغوشِ رسالت میں بارہا دیکھا گیا ہے اور جن کی عظمت و جلالت کے اظہار میں سرکارِ رسالتؐ نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے اور تاریخ نے دشمن کے بارے میں بھی جو روایت تیار کی ہے اس میں بھی فضیلت امام حسنؑ کا انکار ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

سیرت امام حسنؑ کے خاکہ کی مناسبت سے سرکار دو عالمؐ کے ان چند اقوال و اعمال کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن سے امام حسنؑ کی عظمت و جلالت کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے، اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ امام حسنؑ سے دشمنی کرنے والا اور انھیں زہر دینے والا کسی قیمت پر مسلمان نہیں کہا جاسکتا ہے۔

روایات علماء اسلام کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ان کا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انسان جس کتاب کو بھی اٹھا کر دیکھ لے گا امام حسنؑ کے فضائل کا ایک دفتر نظر آجائے گا۔

یہاں ابتدا میں صرف ان روایات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن میں سرکار دو عالمؐ نے امام حسنؑ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور اس کے بعد ان روایات کا ذکر کیا جائے گا جن میں امام حسنؑ کی محبت کو اپنی محبت کا لازمہ قرار دیا ہے کہ اس کے بغیر پیغمبرؐ کی محبت کا تصور بھی بے معنی اور کھوکھلا ہوکر رہ جاتا ہے۔

● ۱۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند ج ۴ ص ۹۳ پر معاویہ سے یہ روایت کی ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کو حسنؑ کی زبان اور ان کے لبوں کو چوستے دیکھا ہے، اور خدا ایسی زبان یا ایسے لبوں پر ہرگز عذاب نہیں کرسکتا ہے جنھیں رسول اکرمؐ نے چوسا ہو۔

اس حدیث کو محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۲۶ میں، علامہ خوارزمی نے مقتل الحسین ص ۱۰۵ میں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲ میں، علامہ ذہبی ہی نے تاریخ الاسلام ج ۲ ص ۲۵۲ میں، ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۳۶ میں ملّا علی متقی نے منتخب کنز العمال بحاشیہ مسند ج ۵ ص ۱۰۳ میں، اور علامہ باکثیر حضرمی نے وسیلۃ المآل ص ۱۶۸ میں نقل کیا ہے۔

اب سوال صرف یہ ہے کہ جس شخص نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اس نے خود اس کے مفہوم اور معنی پر کیوں غور نہیں کیا اور خیال کیوں نہیں کیا کہ اگر امام حسنؑ کی عظمت و جلالت یہ ہے تو انھیں زہر دلوانے والے کے عذاب الٰہی سے بچنے کا راستہ کیا ہوگا ؟ اور یہی دراصل میرے اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ عظمت امام حسنؑ کا اقرار ان کے قاتلوں نے بھی کیا ہے، اور یہ بات اس قدر واضح تھی کہ کسی سے اس کا انکار ممکن نہیں ہوسکا ہے۔

۲۔ ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ اپنی زبان امام حسنؑ کے دہن میں دے دیا کرتے تھے اور بچہ ان کی زبان کو چوسا کرتا تھا۔

اس روایت کو حافظ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حبّان اصفہانی نے "اخلاق النبی

و آدابہ" کے ص ۹۰ پر، ابن اثیر نے النہایۃ ج ۱ ص ۱۲۱ پر، ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۳۶ پر، سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص ۷۳ پر، علامہ محمد طاہر صدیقی ہندی نے مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۱۲۴ پر، علامہ امرتسری نے ارجح المطالب ص ۱۶۹ پر درج کیا ہے۔ اور اسے ہر اس مسلمان کو تسلیم کرنا ہوگا جو ابوہریرہ کی صداقت پر اعتماد رکھتا ہے اور ان کے بیانات کو اسلامی احکام اور مسائل کے بارے میں سند جانتا ہے۔

● ۳۔ ابوہریرہ ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے امام حسنؑ کو دیکھ کر فرمایا کہ میں نے رسول اکرمؐ کو آپ کے شکم مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے لہذا آپ اپنا پیراہن بلند کریں کہ میں شکم اقدس کو بوسہ دے سکوں۔

اس روایت کو علامہ حاکم نیشاپوری نے مستدرک ج ۳ ص ۱۶۸ پر نقل کیا ہے اور اسے بخاری اور مسلم کے شرائط کی بنیاد پر صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ طبرانی نے معجم کبیر ص ۱۳۰، ابوبکر شافعی نے تاریخ بغداد ج ۹ ص ۹۵، خوارزمی نے مقتل الحسین ص ۱۰۰، محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۲۶، ابن منظور مصری نے لسان العرب ج ۹ ص ۴۵۳، علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک ج ۳ ص ۱۶۸، اور سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۷۲، نور الدین ہیثمی نے مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۷۷، علامہ زرندی نے نظم درر السمطین ص ۲۰۰، ملا علی متقی نے منتخب کنز العمال ج ۵ ص ۱۰۲، ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۳۶، علامہ کاندھلوی نے حیاۃ الصحابہ ج ۲ ص ۴۳۹، علامہ شعرانی نے کشف الغمہ ج ۱ ص ۸۶، علامہ امرتسری نے ارجح المطالب ص ۲۶۹، علامہ حضرمی نے وسیلۃ المآل ص ۱۶۸ پر نقل کیا ہے اور یہ امام حسنؑ کی جلالت و عظمت اور سرکار دو عالمؐ کی نگاہ میں ان کی محبوبیت کی بہترین دلیل ہے جس کی تمنا بڑے بڑے صحابۂ رسولؐ کر رہے تھے۔

۴۔ عروہ بن زبیر نے اپنے والد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک مرد انصاری کے سامنے اپنے فرزند حسنؑ کو گلے لگا کر بوسہ دیا تو اس شخص انصاری نے کہا کہ میں نے تو آج تک اپنے فرزند کو اس طرح پیار نہیں کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ نے تیرے دل سے رحمت سلب کرلی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟

اس روایت کو علامہ حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں صحیح قرار دیتے ہوئے درج کیا ہے

جلد ۳ ص ۱۷۰، اور علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک ج ۳ ص ۱۷۰ میں بھی درج کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے امام حسنؑ سے اظہار محبّت کو رحمۃ للعالمین ہونے کا لازمہ قرار دیا ہے اور ایسے عمل پر ناگواری کا اظہار کرنے والے کو بے رحم قرار دیا ہے۔ جو عظمت امام حسنؑ کی بہترین دلیل ہے۔

۵۔ مقدام بن معدی کرب معاویہ کے یہاں حاضر ہوا تو معاویہ نے خبر وفات حسن مجتبیٰؑ سنائی۔ مقدام نے کہا کہ کیا آپ اسے مصیبت سمجھتے ہیں؟ معاویہ نے جواب دیا کہ کیونکر نہ سمجھوں میں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ رسول اکرمؐ انھیں اپنی آغوش میں بٹھا کر فرماتے تھے کہ یہ مجھ سے ہے اور حسینؑ، علیؑ سے ہے۔

اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے مسند ج ۴ ص ۱۳۲ میں، علامہ گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب ص ۲۶۷ میں، محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ ص ۱۲۳ میں، ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۸۹ میں، علامہ طبرانی نے معجم کبیر ص ۱۲۳ میں، علامہ سیوطی نے الجامع الصغیر ص ۱۹ میں، ملا علی متقی نے کنز العمال ج ۱۳ ص ۱۰۰ میں، علامہ مناوی نے کنوز الحقائق ص ۷۰ میں، علامہ بدخشی نے مفتاح النجا ص ۱۱۲ میں، علامہ حضرمی نے وسیلۃ المآل ص ۱۶۵ میں درج کیا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسنؑ اور سرکار دو عالمؐ میں کیا رشتہ اور تعلق تھا اور اس کا اعتراف معاویہ کو بھی تھا، والفضل ما شهدت به الأعداء۔

اس مضمون کی اور بھی بے شمار روایات ہیں جن سے سرکار دو عالمؐ کی شدت محبّت کا اندازہ ہوتا ہے اور جن کی تفصیلات کے لیے "ملحقات احقاق الحق" مولفہ آیۃ اللہ المرعشی طاب ثراہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ان روایات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جن میں سرکار دو عالمؐ نے امام حسنؑ کی محبت کو اپنی محبت کا معیار اور لازمہ قرار دیا ہے:

۱۔ براء راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ حسنؑ کو اپنے کاندھے پر بٹھائے ہوئے فرماتے تھے کہ جسے مجھ سے محبّت کرنا ہے وہ اِس سے محبّت کرے۔

اس روایت کو ابو داؤد نے اپنی مسند ص ۹۹ میں، حافظ ابو عبداللہ بخاری نے اپنی

صحیح ج ۵ ص ۲۶ میں، اور الادب المفرد ص ۲۳ میں، امام مسلم نے اپنی صحیح ج ۷ ص ۱۲۹ میں، علامہ ترمذی نے اپنی صحیح ج ۱۳ ص ۹۸ میں، احمد بن حنبل نے مسند ج ۴ ص ۲۹۲ میں، طبرانی نے معجم کبیر ص ۱۳۰ میں، ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۳۵ میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۳۹ میں، علامہ بیہقی نے سنن کبریٰ ج ۱۰ ص ۲۳۳ میں، علامہ بغوی نے مصابیح السنہ ص ۲۰۵ میں، ابن عساکر نے تاریخ دمشق ج ۴ ص ۲۰۲ میں، ابن اثیر نے اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۳ میں، علامہ گنجی نے کفایۃ الطالب ص ۱۹۶ میں، قاضی عیاض نے شفا ج ۲ ص ۲۱ میں، شیخ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ ص ۱۷۹ میں، ابن جوزی نے تذکرہ ص ۲۰۲ میں، ذہبی نے تاریخ الاسلام ج ۲ ص ۲۱۷ میں، حضرمی نے وسیلۃ المآل ص ۱۶۷ میں، ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۳۴ میں، عینی نے عمدۃ القاری ج ۱۶ ص ۲۴۲ میں، سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص ۷۳ میں، قسطلانی نے ارشاد الساری ج ۶ ص ۱۶۰ میں، ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۳۵ میں، بدخشی نے مفتاح النجا ص ۱۱۵ میں، علامہ نبہانی نے الشرف المؤبد ص ۶۰ میں، امرتسری نے ارجح المطالب ص ۲۶۸ میں درج کیا ہے۔

۲۔ ابو جحیفہ راوی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ میرا یہ فرزند سردار ہے، جو مجھ سے محبّت کرے اسے اس سے محبت کرنا چاہیے۔ (ابونعیم اصفہانی کتاب "اخبار اصبہان" ج ۱ ص ۲۹۱)

۳۔ حضرت علیؑ کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا، جو مجھ سے محبت کرے اسے اِس (حسنؑ) سے محبّت کرنا چاہیے۔ (منتخب کنز العمال حاشیہ مسند ۵ ص ۱۰۲)

۴۔ ازد شنوءہ کا ایک شخص راوی ہے کہ سرکارؐ نے فرمایا کہ جو مجھ سے محبت کرے اسے اس سے محبت کرنا چاہیے۔ (تاریخ کبیر بخاری ج ۲ ص ۲۹۱، مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۶، تاریخ ابن عساکر ج ۴ ص ۲۲، مستدرک ج ۳ ص ۱۷۳، اسد الغابہ ج ۵ ص ۳۴۷، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۷۶، اصابہ ج ۱ ص ۳۲۸، تاریخ الخلفاء ص ۷۳، کنز العمال ج ۱۶ ص ۲۶۱، اسعاف الراغبین ص ۱۹۷)۔

۵۔ انس بن مالک راوی ہیں کہ سرکارؐ نے فرمایا جو اسے اذیت دے گا وہ مجھے اذیت دے گا اور جو مجھے اذیت دینے والا ہے وہ خدا کو اذیت دینے والا ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۸۴، معجم کبیر طبرانی ص ۱۳۲، منتخب کنز العمال حاشیہ مسند ج ۵ ص ۱۰۲، مفتاح النجا ص ۱۱۵،

ارجح المطالب ص ۲۶۹)۔

ان روایات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی نگاہ میں امام حسنؑ کی عظمت و جلالت کیا ہے، اور امام حسنؑ سے محبّت نہ کرنے والے اور انھیں اذیت دینے والے کے بارے میں سرکارؐ کا نظریہ کیا ہے!

رب کریم سے التماس ہے کہ امت اسلامیہ کو توفیق دے کہ جس کا کلمہ پڑھا ہے اُسی کے ارشادات و افکار کا اتباع کرے اور اپنے پاس سے محبّت اور نفرت کے میزان و معیار نہ تیار کرے۔

والسّلام علی من اتبع الھدیٰ

صلح امام حسنؑ ــــ محرکات اور مضمرات

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی میں باطل کے پروپیگنڈوں کی نقاب کشائی کے اعتبار سے مسئلہ تعدد ازواج اور حقائق فہمی کے اعتبار سے مسئلہ صلح بیحد اہمیت رکھتا ہے مسئلہ تعدد ازواج پر مسلسل بحثوں کے بعد مسئلہ صلح پر قدرے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔

تمہیدی طور پر یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ امام حسنؑ کا کردار ان دونوں مسائل میں بالکل رسول اکرمؐ کا کردار ہے کہ آپ کے بارے میں بھی انھی دو طرح کے مسائل کو حربہ بنایا گیا ہے اور کبھی دشمن نے مسئلہ تعدد ازواج کو ہوس رانی کا مورد الزام ٹھہرایا ہے اور کبھی بظاہر دوستوں نے مسئلہ صلح کو نبوت میں تشکیک کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس طرح نانا اور نواسے کا اتحاد قہری طور پر منظر عام پر آگیا ہے چاہے دشمن اس امر کا اقرار نہ کرنا چاہے۔

صلح امام حسنؑ کے محرکات پر نظر ڈالنے کے لیے اس کے اس پس منظر کا نگاہ میں رکھنا ضروری ہوگا جو اس صلح کی پُشت پر کام کر رہا ہے۔ جس کی صورت حال یہ ہے کہ ۲۱ رمضان سنہ ۴۰ھ کو امیرالمومنینؑ کی شہادت اور ان کے دفن و کفن کے بعد امام حسنؑ نے مسلمانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے ایک مختصر مگر انتہائی جامع خطبہ پڑھا:

"اَیُّھا النّاس! آج کی شب اس شخص نے انتقال فرمایا ہے جس پر عمل و کردار کے اعتبار سے نہ پہلے والے سبقت لے گئے ہیں اور نہ بعد والے وہاں تک پہونچ سکتے ہیں۔ وہ مرد میدان، رسول اکرمؐ کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرتا تھا۔ انھیں بچاتا تھا اور جب وہ پرچم دے کر اسے میدان جہاد میں بھیج دیتے تھے تو داہنی طرف جبرئیل اور بائیں طرف میکائیل ہوتے تھے اور اُس وقت تک واپس نہ آتا تھا جب تک دونوں ہاتھوں پر فتح حاصل نہ کرلے۔ ان کا انتقال اس رات میں ہوا ہے جس رات عیسیٰ بن مریم کو آسمان پر اٹھایا گیا ہے اور یوشع بن نون کا انتقال ہوا ہے۔

انھوں نے ترکہ میں نہ درہم چھوڑے ہیں اور نہ دینار۔ صرف ۷۰۰ درہم عطایا سے باقی رہ گئے تھے جس سے ایک خادم خریدنے کا ارادہ تھا اور وہ نہ ہو سکا۔

ایھا الناس! جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہے وہ پہچان لے کہ میں حسن ابن علیؑ ہوں، فرزند رسول اکرمؐ، فرزند وصی رسولؐ، فرزند بشیر و نذیر اور اس کا فرزند ہوں جو خدا کی طرف دعوت دینے والا اور سراج منیر تھا۔ میرا شمار ان اہلبیتؑ میں ہوتا ہے جن سے خدا نے ہر رجس کو دور رکھا ہے اور انھیں مکمل طہارت عنایت فرمائی ہے اور ان کی محبت کو اجر رسالت قرار دیا ہے۔ نیکی ہم اہلبیتؑ کی محبت کا نام ہے۔"

اس خطبہ کا تمام ہونا تھا کہ قیس ابن سعد نے عرض کی کہ حضور ہاتھ بڑھائیں، ہم کتاب خدا، سنت رسولؐ اور دشمنوں سے جنگ کے نام پر آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بس کتاب خدا اور سنت رسولؐ۔ باقی چیزیں اسی میں شامل ہیں اور الگ سے کسی شرط کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کتاب و سنت کے ناقص ہونے کی علامت بن جائے۔ جب تم میری اطاعت کے لیے بیعت کر لوگے تو تمھیں میرے دشمن سے جنگ کرنا ہوگی اور میں جس سے صلح کروں گا، اس سے صلح کرنا ہوگی۔ بیعت تمام ہوگئی۔ ۴۰ ہزار افراد نے امام حسنؑ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور آپ امامت واقعی کے علاوہ خلافت ظاہری کے بھی مالک ہوگئے۔ لیکن اُدھر معاویہ جو جنگ صفین ہی میں اپنی بغاوت کا اعلان کر چکا تھا اور قضیہ تحکیم میں اپنی دانست میں خلافت اسلامیہ بھی حاصل کر چکا تھا اور اپنی مکمل حکومت کی راہ ہموار کرنے کے لیے ابن ملجم کے ذریعہ حضرت علیؑ کو شہید کرا چکا تھا۔ اسے اس امر کی اطلاع ملی کہ عراق کی حکومت پھر اولاد علیؑ کی طرف جا رہی ہے تو فوراً ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور کوفہ پر حملہ کرنے کے لیے ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوگیا۔ اور امام حسنؑ نے قیس بن سعد کی سرکردگی میں بارہ ہزار کا لشکر معاویہ کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے روانہ کر دیا۔ معاویہ نے اپنی فطری مکاری سے کام لے کر قیس اور امام حسنؑ دونوں کے لشکر میں یہ خبر عام کر دی کہ معاویہ سے صلح ہوگئی ہے اور اب جنگ بلاسبب ہوگئی ہے۔ قیس کے لشکر میں خبر نشر ہوئی کہ امام حسنؑ نے صلح کر لی ہے اور قیس بلاسبب لڑ رہے ہیں، اور امام حسنؑ کے کیمپ میں یہ خبر نشر ہوئی کہ قیس نے صلح کر لی ہے اور امام حسنؑ بلاسبب جنگ کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور تحکیم کے موقع پر حضرت علیؑ کو دین سے

خارج کہنے والوں نے امام حسنؑ پر بھی دین سے منحرف ہو جانے کا الزام لگا دیا اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسنؑ کے قدموں تلے سے مصلیٰ تک کھینچ لیا گیا اور آپ کو بے حد اذیت دی گئی، اور جب آپ مدائن جانے لگے تو آپ کو زخمی بھی کر دیا گیا کہ آپ کو تا دیر زیر علاج رہنا پڑا۔

اب امام حسنؑ کے حالات اس موڑ پر تھے کہ:

۱۔ امیرالمومنینؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ اسے تحکیم کو مستحکم کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمانوں کو بھی مال و دولت کی طرف جانے کا راستہ مل گیا۔

۲۔ امام حسنؑ کے لشکر میں شدید اختلاف پیدا ہوگیا، لوگ مسلسل جنگوں سے عاجز آگئے، مال غنیمت کی امیدیں ختم ہوگئیں۔ معاویہ نے رشوت دے کر سرداران لشکر کو بھی خرید لیا اور عبیداللہ بن عباس جیسے لوگوں نے بھی خیانت شروع کر دی اور سارے سردار پچاس ہزار میں بکے تو یہ ایک لاکھ میں بک گئے۔

۳۔ دشمن کی طاقت میں مادی اور معنوی دونوں طرح سے اضافہ ہوگیا۔ مادی اعتبار سے افراد بڑھے، اموال کی فراوانی ہوئی اور معنوی اعتبار سے سب اپنے حاکم کی اطاعت پر کمربستہ ہوگئے اور ہر حال میں اس کی فرمانبرداری پر تیار ہوگئے چاہے وہ اونٹ کو اونٹنی ہی کیوں نہ کہے اور باطل کسی قدر نمایاں کیوں نہ ہو جائے۔

۴۔ مدائن میں پیش آنے والے حادثات اور ساتھیوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی نہ ہونے کی بنا پر صورت حال اور سنگین ہوگئی اور مقابلہ کے امکانات بالکل ختم ہوگئے۔

۵۔ مسلمانوں کے خون کی حفاظت کی ذمہ داری بہرحال حاکم پر عائد ہوتی ہے اور اسے اُس وقت تک جہاد کا حق نہیں ہوتا ہے جب تک فتح یقینی نہ ہو جائے یا قربانی دین کے حق میں مفید نہ ہو جائے۔ امام حسنؑ کے لیے ظاہری فتح کا تو کوئی امکان نہ تھا، قربانی کی بھی کوئی افادیت نہ تھی کہ صرف چند مخلصین باقی رہ گئے ہیں ان کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور حقیقی اسلام کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود معاویہ بھی اپنی تمام مکاریوں کے باوجود یہ سوچ رہا تھا کہ حسنؑ بن علیؑ کو جھکا لینا ممکن نہیں ہے اور ان کی موافقت کے بغیر اپنی حکومت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے صلح کا راستہ اختیار کیا اور بظاہر انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سادہ کاغذ بھیج دیا کہ ہم آپ کے شرائط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اب امام حسنؑ کے سامنے چند مسائل آگئے۔ صلح کا انکار کردیں تو اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہوگی اور صلح پر آمادہ ہوجائیں تو لشکر میں مزید ہنگامہ ہوجائے گا۔ چنانچہ آپ نے مسئلہ کو ساتھیوں کے سامنے رکھا کہ اب بھی جہاد کے لیے آمادہ ہو تو میں اتمام حجت کے لیے جہاد کرنے پر تیار ہوں۔ لیکن اگر تمھیں لوگ زندگی چاہتے ہو تو میں کس کے ساتھ جہاد کروں گا۔ لشکر نے مکمل طور پر البقاء البقاء کا نعرہ لگا دیا اور آپ نے دیکھ لیا کہ میرے بارے میں جد بزرگوار رسول اکرمؐ نے جس صلح کا ذکر فرمایا ہے اس کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ آپ نے صلح کی منظوری دیدی اور حسب ذیل شرائط لکھ کر بھیج دیے:

۱۔ حکومت معاویہ کے ہاتھ میں رہے گی بشرطیکہ وہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کرے۔ (ابن ابی الحدید)

۲۔ معاویہ کو کسی کو ولی عہد نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ (اصابہ۔ الامامہ والسیاسۃ)

۳۔ اہل عراق کے لیے عمومی طور پر امن و امان کا حصول ہوگا۔ (حیوۃ الحیوان)

۴۔ معاویہ اپنے کو امیرالمومنین نہ کہے گا۔ (تذکرہ خواص الامۃ)

۵۔ معاویہ کے پاس شہادتوں کا قیام نہ ہوگا۔ (اعیان الشیعہ)

۶۔ سب علیؑ کا سلسلہ بند کردیا جائے گا۔ (شرح نہج البلاغہ)

۷۔ ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے گا۔ (مناقب)

۸۔ شیعوں کے لیے عمومی طور سے امن و امان رہے گا۔ (طبری)

۹۔ اہواز کا خراج جمل و صفین کے مقتولین کی اولاد کو دیا جائے گا۔ (الامامۃ والسیاسۃ)

۱۰۔ بیت المال کوفہ امام حسنؑ کے قبضہ میں رہے گا۔ (تاریخ دول الاسلام)

۱۱۔ معاویہ سالانہ دس لاکھ درہم ادا کرے گا۔ (جوہرۃ الکلام)

۱۲۔ امام حسنؑ۔ امام حسینؑ اور اہلبیتؑ کے خانوادہ کو کسی طرح کی اذیت نہ دی جائے گی۔ (بحار)

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر جب صلح کی پیش کش کی جائے اور اس طرح کے شرائط پر رضامندی کا اظہار کیا جائے تو جنگ جو افراد کے علاوہ کسی کے لیے جنگ و جدال کا جواز نہیں رہ جاتا ہے اور ہر انصاف پسند انسان کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ صلح پر آمادگی کا اظہار کردے، چاہے اس صلح کا انجام کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

پھر صلح کو نظر انداز کردینے میں دین و دنیا دونوں کا فساد تھا۔ دنیاوی اعتبار سے سوائے اصحاب باوفا اور اہل خاندان کے قتل عام کے اور کچھ ہاتھ نہ آتا۔۔۔ اور دینی اعتبار سے ہر خون کا جواب دہ بھی ہونا پڑتا کہ حالات کی مساعدت کے بغیر جنگ کا اعلان کردینا خودکشی یا خونریزی کو دعوت دینے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ایسے حالات میں صلح اور سکوت کی مثالیں رسول اکرمؐ کی حیات میں بھی موجود تھیں اور مولائے کائنات کی حیات میں بھی۔ بلکہ رسول اکرمؐ نے تو بظاہر کفار کی شرطوں کو تسلیم کرکے صلح کی تھی جس پر حضرت عمر نے اپنے غیظ و غضب کا بھی اظہار کیا تھا اور آپ کی رسالت کو بھی مشکوک بنا دیا تھا، لہٰذا امام حسنؑ نے صلح کی منظوری دے دی۔

اس کے بعد امام حسینؑ کی جنگ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا کہ آپ کے سامنے صلح کا کوئی ذکر نہیں آیا بلکہ یزید نے آپ سے براہ راست بیعت کا مطالبہ کیا جس کا مطلب ہی دین کی تباہی اور بربادی تھا اور ایسی صورت میں جہاد واجب ہوجاتا ہے ورنہ امام حسنؑ کی زندگی میں اور امام حسنؑ کی شہادت کے بعد بھی دونوں طرح کے حالات میں امام حسینؑ نے معاویہ کے مقابلہ میں صلح حسنؑ کا مکمل لحاظ رکھا اور کسی طرح کے جہاد کا اعلان نہیں کیا جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ صلح و جنگ ایک طرح کے عمل میں جو باطل کے طرز عمل کے مقابلہ میں سامنے آتے ہیں۔ باطل صلح کی پیش کش کرتا ہے تو صلح کرلی جاتی ہے اور باطل بیعت کا مطالبہ کرتا ہے تو جان قربان کردی جاتی ہے۔

مضمرات صلح

مضمرات صلح کے بارے میں شرائط کا بغور مطالعہ کرلینا ہی کافی ہے کہ اس سے واضح طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ امام حسنؑ نے صلح پر آمادگی کیوں ظاہر کی اور آپ اس صلح سے کس قسم کے نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اجمالی طور پر یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آل محمدؐ کا مقصد زندگانی حفظ شریعت اور صیانت اسلام کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے تمام زندگی اسی امر کی کوشش کی ہے اور ان کے جملہ حرکات و سکنات کا مقصد ہمیشہ تحفظ مذہب رہا ہے۔ کبھی اس مقصد کو حکومت نے کرانجام دیا ہے جیسا کہ امیرالمومنینؑ

نے خلافت کے چوتھے مرحلہ پر کیا ہے اور کبھی حکومت دے کر انجام دیا ہے جیسا کہ صلح امام حسنؑ میں ہوا ہے۔ اسی طرح کبھی دشمنوں کی جان لے کر اس فریضہ کو انجام دیا ہے جیسا کہ بدر و احد کے معرکوں میں ہوا ہے اور کبھی اپنی جان دے کر انجام دیا ہے جیسا کہ مسجد کوفہ میں ہوا ہے ۔ بلکہ کبھی دونوں اسلوب جمع کر دیے ہیں یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ جیسا کہ صحرائے کربلا میں ہوا ہے۔

آلِ محمدؐ کے طرزِ عمل میں اگر کسی وقت اختلاف نظر آتا ہے تو وہ اختلاف بھی اسی مقصد کے حصول کے حالات کا نتیجہ ہے اسے اختلاف کردار سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس کی مثالیں سنت الٰہیہ میں بھی موجود ہیں اور سیرت مرسلِ اعظمؐ میں بھی۔ پروردگار نے اپنے انبیاء کی زندگی کا تحفظ کرنا چاہا تو کبھی موسیٰؑ کے ہاتھوں کو ایک انگارہ سے بھی نہ بچایا اور اس پر نشان پڑ گیا اور کبھی ابراہیمؑ کو لاکھوں من لکڑیوں کے شعلوں کے درمیان سے بچا لیا۔

رسول اکرمؐ بھی کبھی بدر و احد کے میدانوں میں طاقت کا مظاہرہ کرتے رہے اور کبھی عجیب و غریب قسم کی صلح پر آمادہ ہو گئے جو بڑے بڑے "صحابۂ کرام" کی سمجھ میں بھی نہ آئی۔ بات صرف ایک تھی اور ایک ــــ اور وہ ہے دین کا تحفظ۔ تحفظ حالات کے اعتبار سے ہوتا ہے اور حالاتِ زمانہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

پھر امام حسنؑ نے صلح کے لیے بہترین موقع دیکھا تھا کہ جس کا باپ کل میرے نانا کی ایک ایک شرط پر ہنگامہ کر رہا تھا اسی باپ کا بیٹا آج میری ہر شرط کو ماننے کے لیے تیار ہے اور میرے حوالے سادہ کاغذ کر دیا ہے جو میری فتح کا پہلا اعلان ہے اور میرے لیے بہترین امکان ہے کہ میں شرائط لکھ کر ایک بہترین دستاویز تیار کر دوں جو صبح قیامت تک فریقین کی نیت اور ذہنیت کی بھی ترجمانی کرتی رہے اور حق و باطل کی شناخت حاصل کرنے والے کی رہنمائی بھی کرتی رہے۔

چنانچہ امام حسنؑ نے اپنی صلح سے حسب ذیل فوائد حاصل کر لیے:

۱۔ حاکم شام معاویہ جو باپ دادا، ماں نانا، یعنی دادھیال اور نانیہال دونوں طرف سے دشمنِ اسلام تھا اسے گویا دین اسلام کا محافظ بنا دیا، اور اب وہ اسلام کو آلِ رسولؐ کی میراث سمجھنے کے بجائے اپنی ملکیت سمجھنے لگا اور اس کے تحفظ پر آمادہ ہو گیا جس طرح بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر کہیں مال کو محفوظ رکھنا ہے تو اس کے پاس رکھوا دو جس سے چوری کا خطرہ ہو، مال ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

۲۔ ظالمین کا تاریخی کردار یہ رہا ہے کہ حالات کے بدلتے ہی اپنی سابقہ روش کا انکار کر دیتے ہیں اور اپنے کو معصوم ثابت کرنے لگتے ہیں۔ امام حسنؑ نے چاہا کہ سب علیؑ کے بند کرنے کی شرط لگا کر دنیا پر یہ واضح کر دیا جائے کہ شام کے زیر اقتدار نفس رسولؐ سے کس طرح کا برتاؤ کیا جا رہا ہے اور آلِ محمدؐ کس مظلومیت کی زندگی گزارتے رہے ہیں۔

۳۔ اسلامی حکومت کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو۔ اس سے ہٹ کر کوئی حکومت اسلامی کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ امام حسنؑ نے پہلی شرط یہ قرار دی کہ تجھے کتاب خدا اور سنت پر عمل کرنا ہوگا جو اس امر کا کھلا ہوا اعلان تھا کہ شام کی حکومت میں کتاب و سنت پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور امام حسنؑ کی پہلی ترجیح یہ ہے کہ کتاب و سنت پر عمل ہو چاہے حکومت کسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارا مقصد حکومت نہیں ہے کتاب و سنت پر عمل درآمد کرانا ہے۔

۴۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال کا تحفظ کرے اور اس کے لیے ہر وہ راستہ اختیار کرے جو قوانین شریعتِ اسلام کے خلاف نہ ہو۔ امام حسنؑ کو معلوم تھا کہ حاکم شام بہرحال کسی نہ کسی بہانے میرے اصحاب اور مخلصین جو اسلام کے حقیقی مخلصین ہیں ان کی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے اور ان زندگیوں کے تحفظ کا بہترین ذریعہ یہ صلح نامہ ہے جس کے مرتب کرنے کا اختیار میرے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ لہذا آپ نے صلح نامہ مرتب کر کے ان زندگیوں کا تحفظ کر لیا جن کے تحفظ کے لیے اچھے خاصے لشکر اور اسلحے بھی ناکافی تھے جیسا کہ تاریخی تجربات سے واضح ہو چکا تھا۔ البتہ اس طرز عمل کا قیاس جمل و صفین کی لڑائیوں پر نہیں ہو سکتا ہے کہ امیرالمومنینؑ نے اپنے مخلصین کی زندگیوں کا تحفظ کیوں نہیں کیا اس لیے کہ جمل و صفین میں دشمن حملہ آور تھا اور حملہ آور سے تحفظ کا طریقہ مسلح مقابلہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے وہاں صلح کی کوئی پیش کش نہیں تھی جسے وسیلہ بنایا جا سکتا جس طرح امام حسنؑ کے سامنے یہ غنیمت موقع آگیا تھا۔ بلکہ صفین میں بھی جب نیزوں پر قرآن بلند کر دیے گئے اور یہ امکان پیدا ہو گیا کہ جنگ کو روکا جا سکے تو امیرالمومنینؑ نے فوراً جنگ کو روک دیا اور دشمن کو خوں ریزی کا مزید موقع نہیں دیا۔ حالانکہ آپ کو معاویہ کی نیت کا بھی علم تھا اور آپ اس جنگ بندی کے نتائج سے بھی باخبر تھے۔

۵۔ صلح کے زیر اثر محبانِ اہلبیتؑ کو قدرے آزادی کی سانس لینے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے عقائد اور احکام کا اعلان شروع کر دیا اور اس طرح امت کو بالواسطہ حقائق سے آگاہ کرنے لگے۔ چنانچہ

اذان کے درمیان ولایتِ علیؑ کا اعلان بھی اسی استفادہ کی ایک کڑی تھی کہ جب معاویہ نے منبروں سے گالیاں دلوانا شروع کیں تو علیؑ والوں نے مناروں سے ولایت کا اعلان شروع کر دیا تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ گالیوں کا یہ سلسلہ کسی عام انسان کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک ولی خدا کے لیے ہے، جسے قرآن نے ولی خدا قرار دیا ہے۔ اور ولی خدا کو گالیاں دینا خود خدا کو دعوتِ جنگ دینے کے مرادف ہے۔ جس کے بعد اسلام کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے اور معاویہ کسی رُخ سے مسلمان نہیں رہ جاتا ہے۔

امام حسنؑ کا تاریخی مناظرہ

صاحب احتجاج علامہ طبرسیؒ کا بیان ہے کہ ابو مخنف، شعبی اور یزید بن ابی حبیب مصری کی روایت کی بنا پر اسلام میں اس سے بڑا کوئی مناظرہ نہیں ہوا ہے جیسا مناظرہ معاویہ کے دربار میں اس دن ہوا جس دن دربار میں عمرو بن عثمان بن عفان، عمرو بن العاص، عتبہ بن ابی سفیان، ولید بن عقبہ اور مغیرہ بن شعبہ سب جمع ہو گئے اور سب نے طے کر لیا کہ آج حسن مجتبیٰؑ کو دربار میں بلا کر انھیں خوب بُرا بھلا کہا جائے گا اور انھیں ذلیل کیا جائے گا۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے معاویہ سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ معاویہ نے کہا کہ یہ تم سب کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس میں تمھاری ہی رسوائی ہو گی۔ لیکن حاضرین نے اصرار کیا اور اس نے امام حسنؑ کو طلب کر لیا۔ آپ نے قاصد سے دربار کے حالات دریافت کیے اور دعائے حفظ از شیاطین پڑھ کر گھر سے نکل پڑے۔ دربار میں پہونچے تو معاویہ نے استقبال کیا اور احترام سے بٹھایا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟ اُس نے کہا کہ ان لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے بُلایا ہے کہ عثمانؓ مظلوم مارے گئے ہیں اور انھیں آپ کے باپ نے قتل کرایا ہے لہذا آپ ان کا بیان سُنیں اور انھیں جواب دیں۔

آپ نے فرمایا کہ یہ دربار تیرا ہے اگر تو نے انھیں بولنے کی اجازت دے دی ہے تو پھر جواب بھی سننا پڑے گا اور بہر حال کسی ایک فریق کی طرف سے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی بنی ہاشم کے اتنے ہی افراد ساتھ لے کر آتا لیکن اب اللہ میرا مددگار ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں، میں بحول و قوتِ خدا ان سب کا جواب دوں گا۔

یہ سُننا تھا کہ عمرو بن عثمان نے اپنی بکواس شروع کی، اور عثمان کی قرابت اور منزلت کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ بنی ہاشم نے حسد کی وجہ سے انھیں قتل کرایا ہے اور یہ کس قدر ذلّت کی بات ہے کہ خلیفہ مارا جائے اور اس کے قاتل آزاد گھومتے رہیں۔ ابھی تو تمھارے ذمہ

ہمارے ۱۹ خون باقی ہیں۔

اس کے بعد عمرو عاص نے اتنا اور اضافہ کیا کہ تمھارے باپ نے ابو بکرؓ کو بھی زہر دیا ہے اور عمرؓ و عثمانؓ کو بھی قتل کیا ہے اور غلط حق کا دعویٰ کیا ہے اور تم امیر المومنین بننا چاہتے ہو حالانکہ تمھارے پاس عقل اور فکر نہیں ہے۔ ہم نے تمھیں صرف گالیاں سُنانے کے لیے بُلایا ہے اور تم ہم میں کوئی عیب نہیں نکال سکتے ہو، اور ہمت ہو تو بیان کرو۔ تمھارے باپ بدترین خلائق تھے خدا نے ہمیں ان کے شر سے بچا لیا (معاذ اللہ) اب تم ہمارے اختیار میں ہو۔ ہم تمھیں قتل بھی کر دیں تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

اس کے بعد عتبہ بن ابوسفیان نے تقریر شروع کی کہ تمھارے باپ بدترین قریش تھے۔ قطع رحم کرنے والے اور اقربا کا خون بہانے والے اور تمھارا شمار بھی قاتلانِ عثمانؓ میں ہوتا ہے ہم تمھیں قتل بھی کر دیں تو ہمارا حق ہے۔ خدا نے تمھارے باپ کو تو فنا کر دیا۔ اب تم خلافت کی امید رکھتے ہو جو ہرگز تمھارا حق نہیں ہے اور نہ تم اس کے قابل ہو۔

اس کے بعد ولید بن عقبہ نے اسی بات کی تکرار کی اور آخر میں کہا کہ عثمانؓ تمھارے بہترین ماموں اور تمھارے گھرانے کے بہترین داماد تھے لیکن تم لوگوں نے حسد کیا اور انھیں قتل کرا دیا اب دیکھو کہ خدا تمھیں کیا دکھلاتا ہے۔

اس کے بعد مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؑ کی شان میں انتہائی گُستاخی کرتے ہوئے کہا کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور تمھارے باپ کے پاس اس خون کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انھوں نے قاتلانِ عثمانؓ کو پناہ دی ہے اور وہ ان کے قتل سے راضی تھے جب کہ بنی امیہ بنی ہاشم کے حق میں خود بنی ہاشم سے بھی بہتر تھے اور معاویہ تمھارے حق میں تمھارے باپ سے بھی بہتر ہے۔ تمھارے باپ نے رسول اکرمؐ سے دشمنی کی اور ان کے قتل کا منصوبہ بنایا جو رسول اکرمؐ کو معلوم ہو گیا تو بچ گئے۔ پھر انھوں نے ابو بکرؓ کی بیعت سے انکار کر دیا اور انھیں زہر دلوا دیا پھر عمرؓ کو قتل کرایا، پھر عثمانؓ کو قتل کرایا، تو اب خدا کی بارگاہ میں تمھاری کیا حیثیت ہے۔ معاویہ کو خون عثمانؓ کے قصاص کا حق ہے اور علیؑ کا خون عثمانؓ کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ خدا اولاد عبدالمطلب میں حکومت اور نبوت کو جمع نہیں کر سکتا ہے۔

یہ سب اپنی اپنی بکواس تمام کر چکے تو امام حسنؑ نے تقریر شروع کی: "خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اول کے ذریعہ تمھارے اول کو اور ہمارے آخر کے ذریعہ تمھارے آخر کو راہ ہدایت دکھلائی۔ میرے جد حضرت محمد مصطفٰؐ پر رحمت پروردگار۔ ایہا الناس! میری بات سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

اے معاویہ! خدا کی قسم یہ سب گالیاں تو نے دی ہیں اور اس کا انتظام تو نے کیا ہے ورنہ اگر مسجد پیغمبرؐ ہوتی اور انصار و مہاجرین کا مجمع ہوتا تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اس طرح کی بات کر سکے۔ اچھا اب سازش کرنے والو سنو اور دیکھو جس حق کو جانتے ہو اس کی پردہ پوشی نہ کرنا اور میں غلط کہوں تو میری تصدیق بھی نہ کرنا۔

معاویہ! میں گفتگو کا آغاز تجھ سے کر رہا ہوں اور اُس سے کم ہی بیان کروں گا جتنا عیب تجھ میں موجود ہے۔

ذرا خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ بتاؤ کہ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ جس کو بُرا بھلا کہہ رہے ہو اس نے اُس وقت دونوں قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے جب تم لوگ لات و عزّیٰ کی پوجا کر رہے تھے۔ اور اس وقت دونوں بیعتوں میں حصہ لیا ہے جب پہلی بیعت کے وقت تم کافر تھے اور دوسری بیعت کے موقع پر بیعت شکن اور منحرف ہو گئے تھے۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ میرے باپ نے تم سے بدر میں اس عالم میں ملاقات کی ہے کہ ان کے ہاتھ میں پرچم اسلام تھا اور تمھارے ہاتھ میں پرچم مشرکین اور تم لات و عزّیٰ کے پرستار تھے اور رسولؐ سے جنگ کو واجب سمجھ رہے تھے۔

انھوں نے روز احزاب بھی تم سے مقابلہ کیا ہے جب کہ وہ لشکر اسلام کے علم بردار تھے اور تم لشکر کفار کے۔ ان تمام مقامات پر خدا نے ان کی حجت کو مضبوط بنایا تھا، ان کی دعوت کو ثابت کیا تھا اور ان کی نصرت و امداد کی تھی۔ رسول اکرمؐ ان سے راضی تھے اور تم سے ناراض۔

برائے خدا یہ بتاؤ کہ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ رسول اکرمؐ نے بنی قریظہ اور بنی نضیر کا محاصرہ کیا تھا تو قلعہ کو فتح کرنے کے لیے سعد بن معاذ اور عمر بن الخطاب کو بھیجا تھا تو سعد زخمی ہو کر واپس آئے تھے اور عمرؓ نے فرار اختیار کیا تھا، اس عالم میں کہ وہ لشکر کو بزدل بتا رہے تھے اور لشکر انھیں۔

تو رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ کل اسے علم دوں گا جو مرد میدان اور کرار غیر فرار ہوگا۔ خدا اور رسول اس کے دوست ہوں گے اور وہ خدا و رسول کا دوست ہوگا اور فتح کیے بغیر واپس نہ آئے گا ــ اور پھر عمرؓ و ابو بکرؓ و انصار و مہاجرین نے علم داری کی کوشش بھی کی کہ حضرت علیؑ کی آنکھوں میں تکلیف تھی لیکن رسول اکرمؐ نے انھیں بلا کر لعاب دہن سے علاج کر کے پرچم اسلام انھیں دے دیا تھا اور انھوں نے بفضل خدا میدان کو فتح کر لیا تھا جب کہ تم مکہ میں خدا و رسولؐ کے دشمنوں میں سے تھے۔

تو کیا خدا کے لیے قربانی دینے والا اور خدا سے دشمنی کرنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

میں بخدا قسم کہتا ہوں کہ تمھارا دل اب تک مسلمان نہیں ہوا ہے اور تمھاری زبان دل کے خلاف کلمہ پڑھ رہی ہے۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ تبوک کے موقع پر رسول اکرمؐ نے انھیں مدینہ میں اپنا جانشین بنایا تھا اور جب منافقین نے طنز کیا اور انھوں نے گذارش کی کہ حضور مجھے اپنے سے جدا نہ کیجیے تو رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ تم میرے وصی اور میرے جانشین ہو اور تمھارا مرتبہ ہارون جیسا ہے اور اس کے بعد علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا تھا کہ جو اس کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو میرا دوست ہے وہ خدا کا دوست ہے اور جو اس کا مطیع ہے وہ میرا مطیع ہے اور جو میرا مطیع ہے وہ خدا کا اطاعت گذار ہے اس کی حکومت کا اقرار کرنے والا میرا اور خدا کا حاکم ماننے والا ہے۔

ذرا خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اکرمؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ میں تم میں کتاب خدا اور اپنی عترت چھوڑے جا رہا ہوں جو ان سے متمسک رہے گا گمراہ نہ ہوگا۔ ان کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام سمجھنا۔ ان کے محکم پر عمل کرنا اور متشابہ پر ایمان رکھنا۔ اہلبیتؑ سے محبت کرنا اور ان کے دوستوں سے بھی محبت کرنا اور دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرنا۔ یہ حوض کوثر تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ اس کے بعد منبر پر علیؑ کو بلند کر کے فرمایا تھا کہ خدایا! اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا ــــ خدایا! اس کے دشمن کو زمین میں ٹھکانا اور آسمان میں جگہ نہ دینا اور اس کی منزل درک اسفل کو قرار دینا۔

خدارا یہ بتاؤ کہ کیا تمھیں یہ ارشاد رسولؐ نہیں معلوم ہے کہ یا علیؑ تم حوض کوثر سے بعض لوگوں کو اس طرح ہنکاؤ گے جس طرح اجنبی جانور ہنکائے جاتے ہیں۔؟

کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ علیؑ کو رسولؐ نے اپنے مرض الموت میں دیکھ کر گریہ فرمایا تو آپ نے عرض کی کہ آپ روتے کیوں ہیں؟ تو فرمایا کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ لوگوں کے دلوں میں تمھاری طرف سے کینہ ہے جو میرے بعد ظاہر ہوگا۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ وقت آخر آپ نے گھر والوں کو جمع کر کے فرمایا تھا کہ خدایا! یہ میرے اہلبیتؑ ہیں، ان کے دوست سے دوستی اور ان کے دشمن سے دشمنی رکھنا اور فرمایا تھا کہ اہلبیتؑ کی مثال سفینۂ نوح کی ہے کہ جو اس سے وابستہ ہو گیا نجات پا گیا، اور جو اس سے الگ ہو گیا وہ ہلاک ہو گیا۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اصحاب رسولؐ، رسولؐ کی زندگی میں انھیں ولی اور حاکم کہہ کر سلام کیا کرتے تھے؟۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں علم نہیں ہے کہ علیؑ نے تمام اصحاب سے پہلے اپنے اوپر خواہشات دنیا کو حرام کر لیا تھا اور ان کے پاس موت و حیات کا علم، مستقبل کے حادثات کا، علم اور مسائل میں قضاوت کا مکمل علم تھا۔ ان کا شمار صاحبانِ علم و ایمان میں ہوتا تھا اور تمھارا شمار اس زمرہ میں ہوتا تھا جس پر رسول اکرمؐ نے لعنت کی تھی۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں یاد ہے کہ رسول اکرمؐ نے تمھیں بنی خزیمہ کے لیے فرمان لکھنے کے لیے بلایا تو قاصد نے بار بار یہ خبر دی کہ کھانا کھا رہے ہیں تو آپ نے بد دعا کی تھی کہ خدایا اس کا پیٹ کبھی نہ بھرنے پائے۔

خدارا معاویہ یہ بتاؤ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک دن تمھارے باپ کو اونٹ پر سوار دیکھا تھا جب تم اسے کھینچ رہے تھے اور تمھارا بھائی ہنکا رہا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ خدایا! اس سوار اور اس کے قائد و سائق تینوں پر لعنت فرمانا۔

خدارا معاویہ بتاؤ کیا رسول اکرمؐ نے ابوسفیان پر سات مواقع پر لعنت نہیں کی تھی۔؟

۱۔ جب آپ مکہ سے مدینہ کے لیے نکلے اور ابوسفیان شام سے واپس آیا اور اس نے آپ کو برا بھلا کہا اور آپ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن خدا نے آپ کو بچا لیا۔

۲۔ جس دن ابوسفیان نے قافلہ تجارت کو راستہ بدل کر رسول اکرمؐ سے بچا لیا۔

۳۔ روز احد جب رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ "اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم" اور ابوسفیان نے

کہا کہ" لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم" تو خدا و رسولؐ اور ملائکہ سب نے اس پر لعنت کی۔

۴۔ روز حنین جب ابوسفیان نے لشکر کفار میں اتحاد پیدا کرایا اور قرآن نے دس سوروں میں اسے کافر قرار دیا اور تم بھی اسی کے ساتھ تھے جب کہ علیؑ رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھے۔

۵۔ جس دن تم نے اور تمھارے باپ نے رسول اکرمؐ کی قربانی کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

۶۔ روز احزاب جب ابوسفیان نے کفار کی طاقت کو مجتمع کیا تھا۔

۷۔ جس دن بارہ افراد نے مل کر رسول اکرمؐ پر حملہ کیا تھا جن میں سے سات بنی امیہ میں سے تھے اور پانچ دیگر قریش میں سے۔

پھر خدارا بتاؤ کہ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ عثمانؓ کے خلیفہ بننے کے بعد ابوسفیان مبارکباد کے لیے آیا تو یہ معلوم کر کے کہ کوئی غیر آدمی نہیں ہے انھیں یہ مشورہ دیا کہ جوانان بنی امیہ خلافت تمھارے ہاتھ میں آگئی ہے اب اسے گیند کی طرح نچاؤ کہ جنت وجہنم کوئی چیز نہیں ہے۔

خدارا بتاؤ کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ روز بیعت عثمان ابوسفیان نے حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور بقیع میں جاکر باآواز بلند پکار کر کہا تھا کہ اے اہل قبور! جس بات کے لیے تم ہم سے جنگ کر رہے تھے وہ اب ہمارے قبضہ میں ہے اور تم خاک میں مل گئے ہو، تو حسینؑ بن علیؑ نے کہا تھا کہ خدا تیرا بُرا کرے اور تیرا منھ کالا کرے یہ کیا کہہ رہا ہے۔؟

معاویہ! یہ ہے تیری داستان ـــ اب بتا کیا کسی بات کی تردید کر سکتا ہے؟ تیری لعنت کے لیے یہی کافی ہے کہ جب ابوسفیان نے کلمہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو تو نے ایک مشہور شعر پڑھ کر اسے اسلام لانے سے روک دیا تھا۔ اور جب عمر بن الخطاب نے تجھے حاکم بنایا تو تو نے خیانت کی۔ اور جب عثمان نے گورنر بنایا تو ان کا ساتھ نہ دیا اور حالات کا تماشائی بنا رہا۔ اس سے بدتر یہ ہے کہ تو نے خدا و رسولؐ کے خلاف علیؑ سے جنگ کی ہے جب کہ تجھے ان کے فضائل و مناقب اور کارنامے سب معلوم تھے اور تو نے بے گناہ خلق خدا کا خون بہایا ہے جیسے کہ نہ قیامت پر ایمان ہے اور نہ عذاب الٰہی کا خوف۔ یقیناً انجام کار تمھاری منزل بدترین ہوگی اور ان کی منزل بہترین ہوگی۔

معاویہ! یہ سب تیری شان میں ہے اور زیادہ باتیں اس لیے ترک کر دی ہیں کہ بیان میں

طول ہو جائے گا۔

اس کے بعد اے عمرو بن عثمان! ـ تو وہ احمق ہے جو جواب کے قابل بھی نہیں ہے۔ تیری مثال اس مچھر جیسی ہے جس نے کھجور کے درخت سے کہا تھا کہ ذرا سنبھلنا کہ میں اترنے جا رہا ہوں۔ تو اس نے کہا تھا کہ مجھے تیرے چڑھنے ہی کی اطلاع نہیں ہوئی تو اب اترنے کا کیا غم ہوگا۔ خدا کی قسم مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ تو بھی ایسی باتوں کی جرأت کر سکتا ہے اور مجھے تیرا بھی جواب دینا پڑے گا خیر اب سچ سچ بتا کیا تیرے علیؑ کو بُرا کہنے سے ان کے حسب میں نقص پیدا ہو جائے گا یا وہ رسول اکرمؐ سے دور ہو جائیں گے یا ان کے کارنامے ختم ہو جائیں گے یا ان کا ظلم ثابت ہو جائے گا یا وہ دنیادار بن جائیں گے؟ تو ان میں سے جو بات بھی کہے گا وہ جھوٹ اور خلاف واقع ہوگی۔

تیرا یہ کہنا کہ ہمارے ذمہ ۱۹ خون ہیں تو ان مشرکین کو خدا و رسولؐ نے قتل کرایا ہے اور یقیناً تو بنی ہاشم میں سے ۱۹ کے بعد بھی تین کو اور قتل کرے گا۔ پھر بنی امیہ کے ۱۹۔۱۹ ملے جائیں گے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ آل مروان تیس ہو جائیں گے تو مال خدا کو غنیمت اور بندگان خدا کو غلام بنا لیں گے اور تین سو دس ہو جائیں گے تو ان پر لعنت خدا ثابت ہو جائے گی اور ۴۹۵ ہو جائیں گے تو سب ایک ساتھ قتل کر دیے جائیں گے۔ اور اتفاق سے اسی وقت حکم بن ابی العاص آگیا تو آپؐ نے فرمایا کہ آہستہ بات کرو کہ وزغ سن رہا ہے۔

رسول اکرمؐ نے تو بنی امیہ کی حکومت کو خواب میں دیکھا تھا تو سخت رنجیدہ تھے اور خدا نے انھیں تسلی دیتے ہوئے تیرے خاندان کو شجرۂ ملعونہ قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ایک شب قدر بنی امیہ کی ہزار ماہ کی حکومت سے بہتر ہے۔ حضرت علیؑ کے بعد تمھاری حکومت ہزار ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

اور تو اے عمرو عاص! تو تو وہ ملعون اور ابتر ہے جس کا حسب ایک سگ دنیا جیسا ہے، تیری ماں وہ زانیہ تھی جس کے یہاں تیری ولادت پر ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، عثمان بن الحرث، نضر بن کندہ اور عاص بن وائل سب نے دعویٰ کیا تھا اور آخر میں وہ شخص غالب آگیا جو حسب کا ذلیل، منصب کا خبیث اور بدکاری کا سربراہ تھا، اور آج تو مجھے دشمن رسولؐ کہہ رہا ہے جب کہ تیرے باپ نے رسول اکرمؐ کو ابتر کہا تھا جس پر آیت نازل ہوئی تھی: "ان شانئك

هوالابتر"۔ تیرا باپ دشمنِ رسولؐ اور ابتر تھا اور تو ابتر کی اولاد ہے۔

اس کے بعد تو تمام مواقف اور معارک میں رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں رہا ہے اور تو ان ظالموں میں شامل تھا جنھوں نے نجاشی سے مہاجر مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ تو کرمِ خدا تھا کہ اس نے تیرے مکر کو ناکام کر دیا اور تیری آرزو پوری نہ ہو سکی کہ اسلام کا کلمہ سربلند ہوا اور کفر کا کلمہ پست و ذلیل ہو گیا۔

عثمانؓ کے بارے میں تیرا دعویٰ بھی انتہائی بے حیائی کی دلیل ہے۔ تو نے فتنہ کی آگ کو بھڑکایا اور پھر فلسطین بھاگ گیا اور دور سے حالات کا تماشائی بنا رہا، اور جب عثمانؓ کا قتل واقع ہو گیا تو معاویہ کے ساتھ لگ گیا اور دین کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا۔ ہم نہ اپنی عداوت پر ملامت کرتے ہیں اور نہ اپنی محبت کے بارے میں عتاب کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو جاہلیت اور اسلام دونوں دور میں بنی ہاشم کا دشمن رہا ہے۔ تو نے رسول اکرمؐ کی ہجو میں ستّر اشعار کی نظم لکھی تھی جس پر حضورؐ نے یہ بددعا کی تھی کہ پروردگار! میں جوابی اشعار تو نہ کہوں گا لیکن تو ہر شعر کے بدلے ہزار مرتبہ لعنت فرمانا۔ پھر تو نے ایک مرتبہ اور دین کو فروخت کیا تھا جب دوبارہ نجاشی کے پاس ہدیے لے کر گیا تھا اور اسے گمراہ کرنا چاہا تھا لیکن تو اس مرتبہ بھی مغلوب اور ناکام ہوا۔ تو نے جناب جعفر اور ان کے گھر والوں کو ہلاک کرنا چاہا تھا لیکن ناکام رہا تو یہ کام عمارہ بن ولید کے حوالے کر دیا۔

اور تو اے ولید بن عتبہ! میں تجھے عداوتِ علیؑ پر ملامت نہیں کرتا کہ انھوں نے تجھے شراب خوری پر اسّی کوڑے لگائے ہیں اور تیرے باپ کو روزِ بدر قتل کیا ہے۔ پھر تو انھیں کیا بُرا کہے گا۔ خدائے متعال نے انھیں دس آیتوں میں مردِ مومن قرار دیا ہے اور تجھے فاسق۔ تو قریش کے بارے میں کیا کہتا ہے تو تو ذکوان جیسے کافر کا فرزند ہے۔ تیرا خیال ہے کہ عثمانؓ کو ہم نے قتل کیا ہے۔ یہ بات تو طلحہ و زبیر و عائشہ بھی حضرت علیؑ سے نہ کہہ سکے تھے، تو ہم سے کہہ رہا ہے؟

اگر تو اپنی ماں سے پوچھے کہ تیرا باپ کون ہے تو وہ بتائے گی کہ اس نے کس طرح ذکوان کو چھوڑ کر تجھے عتبہ بن ابی معیط سے جوڑ دیا تھا اور اس طرح سماج میں بلندی حاصل کر لی تھی۔ حالانکہ تیرے اور تیرے باپ کے لیے دنیا میں ذلّت اور آخرت میں رسوائی ہی ہے اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے۔

اور تو اے ولید! خدا گواہ ہے کہ تو جس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس سے عمر میں

بڑا ہے۔ تو علیؑ کو کیا بُرا کہے گا۔ تیرے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے کو اپنے باپ کا بیٹا ثابت کر لے جس کے بارے میں تیری ماں نے کہا تھا کہ تو جس کی طرف منسوب ہے تیرا باپ اس سے زیادہ لئیم اور ذلیل ہے۔

اور تو اے عتبہ بن ابوسفیان! ۔ خدا کی قسم تو قابلِ جواب بھی نہیں ہے اور نہ تیرے پاس عقل ہے کہ تجھ پر عتاب کیا جائے، نہ تجھ سے کسی خیر کی امید ہے۔ تو اگر علیؑ کو بُرا بھی کہے تو کیا کہا جائے کہ تو علیؑ کے ایک غلام کے برابر بھی نہیں ہے۔ پروردگار تیرے، تیرے ماں باپ اور بھائی کے لیے تاک میں ہے۔ اور تو ان آبار و اجداد کی اولاد ہے جن کے بارے میں قرآن نے اعلان کیا ہے کہ "ان کا انجام جہنم ہے اور انھیں بدترین طعام و شراب سے نوازا جائے گا۔"

تو آج مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے، تو نے اسے کیوں نہیں قتل کیا تھا جسے اپنی زوجہ کے ساتھ بستر میں دیکھا تھا اور جس نے تیری زوجہ پر قبضہ کر کے تیرے بیٹے کو زبردستی تیری طرف منسوب کر دیا تھا۔ تجھے پہلے اپنے معاملہ کا بدلہ لینا چاہیے اس کے بعد قتلِ عثمانؓ کی فکر کرنا چاہیے۔ میں تیری زبان سے علیؑ کی بُرائی پر ملامت نہیں کرتا کہ انھوں نے تیرے بھائی کو میدانِ بدر میں تنہا قتل کیا ہے اور تیرے دادا کو حمزہ کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے اور دونوں کو واصلِ جہنم کیا ہے اور تیرے چچا کو حکمِ رسولؐ سے شہر بدر کیا ہے تو تو اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے۔

رہ گئی میری امیدِ خلافت ۔ تو میں اگر ایسا کروں تو یہ میرا حق ہے اور تو تو اپنے بھائی جیسا بھی نہیں ہے۔ تیرا بھائی تو تجھ سے زیادہ خدا کا سرکش بندہ ہے اور مسلمانوں کا زیادہ خون بہانا چاہتا ہے اور مکر و فریب سے اس حق کا طلب گار ہے جو ہرگز اس کا نہیں ہے۔

اور تیرا یہ قول کہ علیؑ قریش کے حق میں بدترین انسان تھے ۔ تو خدا گواہ ہے کہ انھوں نے نہ کسی شریف کو حقیر بنایا ہے اور نہ کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے ۔!

اور تو اے مغیرہ بن شعبہ ۔! خدا کا دشمن ہے اور کتابِ خدا کو نظر انداز کرنے والا اور رسولِ خدا کی تکذیب کرنے والا ہے۔ تو وہ زانی ہے جس پر سنگسار کی سزا ثابت تھی، اور گواہوں نے گواہی بھی دے دی تھی لیکن حاکم نے سزا کو ٹال دیا اور حق کو باطل کے ذریعہ دفع کر کے صداقت کو غلط بیانوں سے مغلوب کر دیا تھا اور یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ تیرے لیے

آخرت میں دردناک عذاب اور دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔ تو نے ہی جناب فاطمہؑ بنتِ رسولؐ کو زخمی کیا تھا اور محسنؑ کو شہید کیا تھا جب کہ رسول اکرمؐ نے انھیں خواتین جنت کا سردار قرار دیا تھا۔ تو نے کس بات پر علیؑ کو بُرا کہا ہے۔ ان کے نسب میں کوئی نقص ہے یا وہ رسول اللہؐ سے دور ہیں یا اسلام میں کوئی بُرا کام کیا ہے یا فیصلہ میں ناانصافی کی ہے یا دنیا داری میں پڑ گئے ہیں۔ تو ایسے الزام لگائے گا تو تو جھوٹا ہوگا اور سب تیری تکذیب کریں گے۔

تیرا خیال ہے کہ علیؑ نے عثمانؓ کو قتل کیا ہے۔ تو خدا کی قسم ان کا دامن ایسے الزامات سے بالکل پاک و صاف ہے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو تجھ سے کیا تعلق ہے۔؟ تو نے تو زندگی میں بھی عثمانؓ کی مدد نہیں کی اور مرنے کے بعد بھی ان کے کام نہیں آیا۔ تیری منزل طائف میں تھی اور تو بدکار عورتوں کی تلاش میں گھوم رہا تھا اور جاہلیت کا احیاء کر کے اسلام کو فنا کرنا چاہتا تھا۔

حکومت کے بارے میں تیرا اور تیرے ساتھیوں کا قول کہ علیؑ مارے گئے اور تمھیں حکومت مل گئی ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ فرعون نے مصر پر چار سو سال حکومت کی تھی جب کہ موسیٰ اور ہارون مستقل اذیتوں کا شکار تھے۔ یہ تو ملک خدا ہے جسے بھی دے دیا جائے۔ وہ تو خود ہی فرماتا ہے کہ:

"شاید یہ آزمائش ہو یا چند روزہ مہلت ہو۔"

"وہ ہر قریہ کو اہلِ دولت کی بداعمالیوں ہی کی بنا پر تباہ کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر آپ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور فرمایا کہ خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لیے ہیں۔ اور اے معاویہ! یہ تیرا اور تیرے اصحاب کا حال ہے۔ اور پاکیزہ چیزیں پاکیزہ لوگوں کے لیے ہیں۔ اور یہ علیؑ اور ان کے اصحاب اور شیعہ افراد کا حال ہے۔ معاویہ! تو نے جو کچھ کیا ہے اس کا وبال تیری گردن پر ہے اور ظالموں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی عذابِ الیم ہے۔

یہ سُن کر معاویہ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ لو اپنے کیے کا مزہ چکھو۔

ولید نے کہا کہ ہم نے تو وہی مزہ چکھا ہے جو تو نے بھی چکھا ہے اور یہ تو در اصل تیرے اوپر حملہ ہوا ہے۔

معاویہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ حسنؑ کی توہین ممکن نہیں ہے۔ لیکن تم لوگوں نے قبول نہیں کیا اور نتیجہ میں ذلیل ہو گئے۔ خدا کی قسم وہ جس وقت دربار سے نکلے ہیں دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی تھی اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم لوگوں میں کوئی خیر نہیں ہے۔ نہ آج اور نہ آج کے بعد۔ (احتجاج طبرسیؒ ج ۱ ص ۴۱۲)

نوٹ: واضح رہے کہ متعصب افراد اس واقعہ کے وقوع سے انکار کر سکتے ہیں لیکن اس کے مندرجات سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ اور حق کی سربلندی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امام حسنؑ کا ہر دعویٰ ناقابلِ تردید ہے اور ظالموں کا ہر الزام مہمل، بے بنیاد اور باعثِ رسوائی دنیا و آخرت ہے۔!

والسّلام علیٰ مَن اتبع الھدیٰ

خصائص الحسنؑ

ائمہ طاہرینؑ کے خصوصیات کی دو قسمیں ہیں۔

بعض کا تعلق عام افرادِ امت یا اولیاء اللہ سے ہے کہ ان حضرات میں وہ خصوصیات پائے جاتے ہیں جو دیگر افرادِ امت یا اولیاء خدا میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

اور بعض کا تعلق خود ان کے گھرانے اور خاندان سے ہے کہ رب العالمین نے مواقع اور مصالح کی مناسبت سے ہر امام کو وہ خصوصیات عنایت فرمائے ہیں جو دوسرے ائمہ کی زندگی میں بھی نہیں پائے جاتے ہیں کہ ان کا دور ان خصوصیات کا مستحق نہیں تھا یا ان کے دور میں ان خصوصیات کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ذیل میں امام حسن مجتبیٰؑ کے دونوں قسم کے خصوصیات کی طرف اجمالی اشارہ کیا جا رہا ہے، تفصیلی مطالب واقعات اور کرامات وغیرہ کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں یا بیان ہوتے رہتے ہیں۔

ان خصوصیات کے تذکرہ کا سلسلہ نسب شریف اور وقت ولادت سے شروع ہوتا ہے اور شہادت اور اس کے بعد کے واقعات پر منتہی ہوتا ہے۔

امام حسن مجتبیٰؑ کا سب سے پہلا امتیاز یہ ہے کہ آپ تاریخ بنی آدم میں وہ پہلے انسان ہیں جو معصوم ماں باپ کے ذریعہ عالم وجود میں آئے ہیں اور آپ کے والدین کو وہ عصمت مطلقہ حاصل ہے جس کی مثال انبیاء کرام اور اولیاء خدا کی تاریخ حیات میں بھی نہیں ملتی ہے۔

آپ وہ پہلے انسان ہیں جنھیں رب العالمین نے وہ اوصاف اضافی عنایت فرمائے ہیں جن کی نظیر تاریخ کائنات میں کہیں نہیں ہے۔ آپ کے جد بزرگوار رسول اکرمؐ، آپ کی جدہ ماجدہ خدیجۃ الکبریٰؑ ام المومنین، آپ کے والد محترم مولائے کائناتؑ، آپ کی والدہ گرامی صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ، آپ کے چچا حضرت عقیل و جعفر طیارؑ، آپ کی پھوپھی حضرت ام ہانی جن کے گھر کو

مسجد الحرام کا مرتبہ دیا گیا ہے، آپ کے دادا حضرت ابو طالب جنھیں محسنِ اسلام اور مربیؑ رسول اکرمؐ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

واضح رہے کہ ان اوصاف میں اگرچہ امام حسینؑ بھی شریک ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ رب العالمین نے یہ شرف امام حسنؑ کو امام حسینؑ سے پہلے عنایت کیا ہے لہٰذا اس اعتبار سے آپ اپنے دور میں اس شرف کے اعتبار سے بالکل منفرد تھے اگرچہ آل محمدؐ میں باہمی طور پر کمالات کا موازنہ نہیں ہو سکتا ہے کہ سب ایک نور کے ٹکڑے اور ایک حقیقت نورانیہ کے اجزاء ہیں۔

دَورِ کمسنی

کمسنی کا زمانہ جب عام طور سے دنیا کے بچے کھیل کود میں زندگی گذارتے ہیں ـــ اور قرآن مجید نے بھی اسی نکتہ کا لحاظ رکھ کر زندگانی دنیا کو ابتدا میں لہو و لعب اور آخر میں زینت و تفاخر وغیرہ قرار دیا ہے۔ آل محمدؐ کے کمسن افراد ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، جن کا دوسرے انسانوں کی زندگی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

امام حسنؑ کی قوت شامہ اس قدر قوی تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہی مادر گرامی سے فرمایا کہ میں اپنے نانا کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امامت کی قوت احساس عام انسانوں سے بلند تر اور قوی تر ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے جسم میں ایک خوشبو ہوتی ہے جس کا ادراک ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا ہے اور اس کے لیے امام حسنؑ جیسی قوت احساس درکار ہے۔

امام حسنؑ کی قوت بصارت یا بصیرت اس قدر قوی تھی کہ جب مولائے کائنات نے پس پردہ بیٹھ کر بیٹے کا بیان سننا چاہا تو فوراً فرما دیا کہ مادر گرامی! آج میرے بیان میں روانی نہیں ہے اور میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا سردار مجھے دیکھ رہا ہے۔

امام حسنؑ نے اس بیان سے یہ بھی واضح کر دیا کہ مجھے سرکار دو عالمؐ نے جوانان جنت کا

سردار قرار دیا ہے۔ لیکن میں اپنے پدر بزرگوار کو باپ کے بجائے اپنا سردار کہہ کر یاد کر رہا ہوں تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اُن کا مقابلہ مجھ جیسے افراد سے نہیں کیا جا سکتا ہے تو امت کے گنہگار افراد کا کیا ذکر ہے۔

فضائل ومناقب

فضائل ومناقب کے اعتبار سے بھی امام حسنؑ کو ایک انفرادیت حاصل ہے جو عام افراد امت کے مقابلہ میں بھی ہے اور بعض اعتبارات سے خود دیگر افراد اہلبیتؑ کے مقابلہ میں بھی۔ مثال کے طور پر:

آپ پہلے انسان ہیں جنھیں کساء یمانی میں داخلہ کا شرف ملا ہے اور جنھیں قدرت نے ضعفِ پیغمبرؐ کا پہلا علاج قرار دیا ہے۔

میدان مباہلہ میں عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کے دفاع کے لیے حق وصداقت کے مجسمے بن کر آنے والوں میں آپ سب سے نمایاں فرد کی حیثیت رکھتے ہیں کہ انتہائی کمسنی کے باوجود میدان میں اپنے پیروں سے آئے اور رسول اکرمؐ نے آپ کو سب سے آگے رکھا اور اپنے برابر سے چلنے کا شرف عنایت فرمایا۔

سورہٗ ھَلْ اَتیٰ کے نزول کے لیے جن افراد کی بیماری کو سبب قرار دیا گیا ہے اور جن کی شفا وصحت کی نذر کو پورا کرنے کے لیے روزہ رکھے گئے ہیں ان میں امام حسنؑ بھی شامل ہیں اور یہ شرف حسنینؑ کے علاوہ دنیا کے کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا ہے۔

پروردگار عالم نے جن افراد کی محبت کو اجر رسالت قرار دیا ہے ان میں امام حسنؑ بھی شامل ہیں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اُس وقت آپ انتہائی کمسن تھے اور کمسنی میں انسان تعلیمات رسالت سے بھی فیضیاب نہیں ہوتا ہے چہ جائیکہ اس کی محبت کو رسالت کی اُجرت قرار دے دیا جائے لیکن پروردگار نے یہ شرف امام حسنؑ کو کمسنی کے عالم میں عنایت فرمایا ہے۔

اسی کمسنی کے دور میں رسول اکرمؐ نے آپ کو جوانانِ جنّت کا سردار قرار دیا ہے۔

اسی دور میں آپؐ نے امامت کا اعلان فرمایا ہے، اور فرمایا ہے کہ میرے دونوں فرزند

امام ہیں چاہیں قیام کریں یا بیٹھے رہیں۔

ریحان رسولؐ اور سبط پیغمبرؐ ہونے کا شرف بھی آپ کو اسی دور کمسنی میں حاصل ہوا ہے۔

دورِ شباب

جوانی کے زمانے میں آپ کو زور بازو اور قوت شجاعت دکھلانے کا موقع ملا ہے تو جمل وصفین کے معرکوں میں اس بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی ہے اور مولائے کائنات نے آپ کے وجود اقدس کی اس قدر توقیر وتقدیر کی ہے کہ جب محمد بن الحنفیہ نے یہ کہہ دیا کہ آپ ہر مرتبہ مجھی کو بھیجتے ہیں اور حسنینؑ کو میدان میں نہیں بھیجتے ہیں تو آپ نے ٹوک کر فرمایا کہ تم میرے فرزند ہو اور یہ دونوں رسول اللہؐ کے فرزند ہیں۔

دورِ امامت

آپ کے دورِ قیادت کا آغاز ایسے سخت حالات سے ہوا ہے جس کی مثال اس سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

آپ نے پہلی نماز جماعت اس وقت پڑھائی ہے جب باپ سامنے محراب میں زخمی بیٹھا ہوا تھا۔ خون فرق اقدس سے جاری تھا۔ ریش مبارک خون سے رنگین ہو رہی تھی اور آپ نہایت درجہ خضوع وخشوع سے عبادت الٰہی انجام دے رہے تھے۔

دوسری مصیبت آپ کے سامنے یہ آئی کہ اُس باپ کو بھی علی الاعلان دفن نہ کر سکے جو خلیفۃ المسلمین ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا تھا اور جس کے غم میں سارا عالم اسلام سوگوار تھا۔ اس لیے کہ آپ کو شام کے مظالم اور امت اسلامیہ کی بے حیائی اور بے وفائی کا مکمل اندازہ تھا اور یہ خطرہ تھا کہ نشانِ قبر واضح ہو گیا تو کسی وقت بھی قبر اقدس کی بے حُرمتی کی جا سکتی ہے جس طرح مسلمانوں نے مادر گرامی کی قبر کو کھولنے کا منصوبہ بنا لیا تھا اور مولائے کائناتؑ کے غیظ وغضب کو دیکھ کر اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

تیسری عظیم ترین مصیبت یہ ہے کہ آپ کو مصلحت اسلام کی خاطر ایسے شخص سے صلح کرنا پڑی

جس کے بارے میں آپ کو مکمل طور پر یقین تھا کہ میرے بابا کا قاتل یہی ہے، اور ابن ملجم کو تلوار، زہر اور ساتھی اسی نے فراہم کیے ہیں اگرچہ مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک ایسی سازش بھی کی گئی ہے جس سے قاتل کا صحیح سُراغ نہ مل سکے اور مسئلہ مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ جائے۔ لیکن آپ نے صلح کی اور صلح کر کے واضح کر دیا کہ ہم ذاتی مسائل کو اسلامی مسائل پر مقدم نہیں کرتے ہیں ورنہ صورت حال اتنی سنگین تھی کہ بعض مخلصین نے بھی آپ کو "مذل المومنین" کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ باپ کے قاتل سے جنگ کرنا اور اسے قتل کر دینا بہت آسان ہے لیکن اس سے صلح کرنا اور ظاہری حکومت کا اس کے حوالہ کر دینا اس قدر سخت اور سنگین کام ہے کہ اسے امام حسن مجتبیٰؑ کے علاوہ کوئی انجام نہیں دے سکتا ہے۔

امام حسنؑ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ نے صلح کے پردہ میں شام کے حاکم ظالم معاویہ بن ابوسفیان سے اس کی بے دینی کا بھی اقرار لے لیا اور اس کے مظالم کا بھی۔ چنانچہ آپ نے صلح نامہ کے سادے ورق پر یہ شرط بھی لکھ دی کہ تجھے کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا اور یہ شرط بھی طے کر دی کہ مولائے کائنات پر جاری سب و شتم کا سلسلہ بند کرنا ہوگا جس کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ شام میں کتاب و سنت پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور مولائے کائنات پر سبّ و شتم کا سلسلہ جاری ہے۔

سنتِ رسولؐ کا ذکر کر کے آپ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام میں سنتِ رسولؐ کے علاوہ کسی اور سیرت کی گنجائش نہیں ہے اور دوسری سیرت کا ادعا اسلامی مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اس بات کا مولائے کائنات نے زبانی اعلان کیا تھا لیکن امام حسنؑ نے حاکم شام سے تحریری اقرار لے لیا۔

آپ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ نے صلح نامہ میں ایسے شرائط لکھ دیے جن کے بارے میں معلوم تھا کہ حاکم شام عمل نہیں کرے گا اور اسے پارہ پارہ کر دے گا اور اس طرح عالم اسلام کو اس کی نیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ چنانچہ جب اس نے صلح نامہ کو پارہ پارہ کر کے پیروں تلے دبا دیا اور کسی نے امام حسنؑ سے کہا کہ آپ دھوکہ کھا گئے تو آپ نے نہایت حسین انداز میں جواب دیا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے دھوکہ دیا نہیں اور اس طرح حاکم شام کے دھوکہ باز ہونے کا اقرار قوم سے بھی لے لیا اور حاکم شام کو بھی متوجہ کر دیا کہ نام خدا و رسولؐ پر مشتمل صلح نامہ کا زیرِ قدم رکھنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا ہے۔

آپ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ حاکم شام کے اس برتاؤ کے بعد بھی آپ اپنے صلح نامہ کے شرائط پر قائم رہے اور کسی وقت بھی اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اپنے بعد ایسا انتظام اور اس قسم کی وصیت کر کے گئے کہ بنی ہاشم بھی اس صلح نامہ کی مخالفت نہ کرنے پائیں اور آل محمدؐ پر کسی آن بھی عہد شکنی کا الزام نہ آنے پائے۔

شہادت

امام حسنؑ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ سب سے پہلے شہید ہیں جنھیں زہر دغا سے شہید کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تاریخ حیات پیغمبرؐ میں اس قسم کے مصائب کا اشارہ ضرور ملتا ہے لیکن امام حسنؑ کی شہادت ایک بالکل واضح اور مسلم واقعہ ہے جس کا مورخین اسلام نے بھی اقرار کیا ہے اگرچہ قاتل اور زہر دینے والے کو مشتبہ بنا دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

امام حسنؑ نے اپنی شہادت سے یہ بھی واضح کر دیا کہ رشتۂ زوجیت کردار کی ضمانت نہیں ہے اور بدنفس زوجہ شوہر کی قاتل بھی ہو سکتی ہے اور ہوسِ دنیا شامل ہو جائے تو انسان کوئی بھی اقدام کر سکتا ہے۔

شہادت کے بعد جنازہ پر تیروں کی بارش بھی آپ کے امتیازات مصائب میں شامل ہے، جس کی مثال اس سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

پہلوئے رسولؐ میں دفن کی جگہ کا نہ ملنا بھی آپ کے امتیازاتِ مصائب میں شامل ہے جس سے امتِ اسلامیہ کی بے حیائی اور بے وفائی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصحابِ رسولؐ کو پہلوئے رسولؐ میں جگہ مل سکتی ہے لیکن فرزندِ رسولؐ کو نانا کے پہلو میں جگہ نہیں مل سکتی ہے۔

الزامات

امام حسنؑ کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ آپ کو امت اسلامیہ نے اس طرح خلیفۃ المسلمین تسلیم نہیں کیا جس طرح اس کے پہلے خلفاء اسلام کی شخصیتیں تسلیم کی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ نے آپ کے خلاف الزامات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سب سے پہلا الزام آپ پر کثرتِ ازواج کا لگایا گیا اور اس کے بارے میں طرح طرح کی روایتیں وضع کی گئیں۔ اور اس کی پشت پر عیسائیت نے مکمل طور پر بنی امیہ کی حمایت کی کہ معاویہ کا دربار عیسائیوں کے نمائندوں سے بھرا ہوا تھا۔ معاویہ کی زوجہ یزید کی ماں بھی عیسائی تھی۔ اور معاویہ کا طبیب خاص بھی عیسائی تھا۔ اور عیسائیت کی نگاہ میں کسی صاحبِ کردار کے کردار پر سب سے بڑا حملہ مسئلہ کثرت ازواج ہے۔ جس طرح کہ اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ مسئلہ جواز تعدد ازواج ہے۔ چنانچہ یہی حربہ روزِ اوّل رسول اسلامؐ کے خلاف استعمال کیا گیا اور بعد میں امام حسنؑ کے خلاف استعمال ہوا اور اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ عیسائیت میں شادی کا تصور ہی نہیں ہے اور وہ مذہبی طور پر ہر مثالی کردار سے خالی ہے۔

عیسائیت نے عورتوں میں مثالی کردار حضرت مریم کا قرار دیا ہے اور انھوں نے عقد نہیں کیا ہے۔

اور مردوں میں مثالی کردار حضرت عیسیٰ کا ہے اور انھوں نے بھی کوئی عقد نہیں کیا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی دنیا شادی کی اہمیت سے ناواقف رہ گئی اور اس کے ذہن میں یہ تصوّر قائم ہو گیا کہ شادی روحانیت اور عظمتِ کردار کے خلاف ہے اور اسے جہاں بھی دو چار شادیوں کا ذکر دکھائی دیا، یا جہاں کسی شخصیت سے اختلاف پیدا ہو گیا اس کے خلاف سب سے پہلے کثرتِ ازواج کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ یا اس کے تعدد ازدواج کو اس کے کردار کی کمزوری کی دلیل بنا دیا گیا۔

امام حسنؑ پر دوسرا الزام خوف اور بزدلی کا تھا۔ اور یہ بات اس سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں رسول اکرمؐ اور مولائے کائناتؑ کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال قدرے مختلف تھی لہذا ان حضرات کو اس مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس کا سامنا امام حسنؑ کو کرنا پڑا اور آپ نے اس مصیبت کے باوجود اپنی مہم کو جاری رکھا اور کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جسے ظالم بہانہ قرار دے کر بنی ہاشم، یا

محبانِ آلِ محمدؐ کا خاتمہ کر دے۔

امام حسنؑ کا یہ بھی ایک امتیازی کمال ہے کہ آپ نے قوم کے تحفظ کے لیے ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جو اس سے پہلے رائج نہ تھا۔ آپ نے ایک طرف طاقت کا استعمال کیے بغیر قوم کا تحفظ کر لیا اور دوسری طرف سخت ترین دشمنِ اسلام کو حکومت کے نام پر محافظ اسلام بنا دیا۔ اور وہ بنی امیہ جو روزِ اوّل سے اسلام کے مٹا دینے کے درپے تھے ان کا چشم و چراغ معاویہ بظاہر اسلامی سرحدوں کا محافظ بن گیا اور یہ بھی امام حسنؑ کی حکمت عملی کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

کربلائے امام حسینؑ

فرزندِ زہراؑ

وہ ہادیٔ برحق ـــــ جس نے آخری سانس تک دین کا پیغام سُنایا!
وہ قاریٔ قرآن ـــــ جس نے نوکِ نیزہ پر بھی تلاوت کی!
وہ محافظِ حرم ـــــ جس نے حرمت کعبہ کے لیے حج کو عمرہ سے تبدیل کر دیا!
وہ پاسبانِ شریعت ـــــ جس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے وطن عزیز کو ترک کر دیا!
وہ مجاہد فی سبیل اللہ ـــــ جس نے تین دن کی بھوک اور پیاس میں جہاد کیا!
وہ ذمہ دارِ اسلام ـــــ جس نے بقائے دین کے لیے بھرا گھر لٹا دیا!
وہ عبادت شعار ـــــ جس نے برستے تیروں میں نماز ادا کی!
وہ سجدہ گزار ـــــ جس نے زیرِ خنجرِ ستم سجدہ کیا!
وہ مساوات کا علمبردار ـ جس نے جون کا سر اپنے زانو پر رکھا!
وہ صاحبِ ایثار ـــــ جس نے راہِ حق میں طفلِ شیر خوار کو بھی قربان کر دیا!
وہ راکبِ دوشِ رسولؐ ـــ جس کی خاطر مرسلِ اعظمؐ ناقہ بنے!
وہ حافظِ فروع و اصول ـ جس نے پُشت پیغمبرؐ پر آکر سجدہ کو طولانی بنا دیا!
وہ وارثِ خلقِ عظیم ـــ جس نے بیگانوں کو بھی سیر و سیراب کیا!
وہ مولائے رحیم و کریم ـــ جس نے حُر کی خطا کو معاف کر کے اسے حقیقی حُرؑ بنا دیا!

مقدمۂ کتاب کربلا

کسی کتاب کے حقائق و معارف اور مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان کے مطالب کا ایک خاکہ ذہن نشین کر لیا جائے اور اس سے متعلق افراد کردار اور مقامات کا ایک نقشہ مرتب کر لیا جائے تاکہ اسی کی روشنی میں اصل حقائق کا صحیح اندازہ کیا جائے۔

کتابِ کربلا ایک کتابِ ہدایت ہے جس کے ہر گوشہ میں اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام کی تابانی نظر آتی ہے۔

کتابِ کربلا ایک کتابِ عبادت ہے جس کے ہر صفحہ پر عبادت گذاروں کی صفیں نظر آتی ہیں۔

کتابِ کربلا۔ ایک کتابِ انقلاب ہے جس کا ہر لفظ خون کی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

کتابِ کربلا۔ ایک کتابِ شہادت ہے جس کے ہر نقطہ میں حیات جاودانی کی مرکزیت پائی جاتی ہے۔

کتاب کربلا۔ ایک کتاب سیاست ہے جس میں تدبیر حیات کی ساری تعلیمات اور ظلم سے مقابلہ کی ساری تدبیریں بیان کی گئی ہیں۔

کتابِ کربلا۔ درحقیقت کتابِ کربلا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی کتاب نہ اس سے پہلے مرتب ہوئی ہے اور نہ اس کے بعد مرتب ہونے والی ہے۔

ایسی کتاب کا مکمل ادراک حاصل کرنے کے لیے ان تمام مقدمات پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوگا جن کے بغیر اس کتاب کے حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ انھیں مقدمات پر عبور حاصل نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اس کتاب کی بے شمار من مانی تفسیریں کی گئیں، طرح

طرح کی شرحیں لکھی گئیں، نئی نئی تاویلیں ایجاد کی گئیں اور کثرت تعبیرات سے حقائق کو خواب پریشاں بنا دینے کی اموی مشین ایجاد ہو گئی۔

کسی نے اس عظیم جہاد کو دو شہزادوں کی جنگ قرار دیا۔ کسی نے اس کو معاذاللہ امام حسینؑ کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ کہا، کسی نے یزید کے جوش جوانی کا نام دیا، کسی نے ارینب بنت اسحاق کے عشق کی داستان وضع کی، کسی نے عام سیاسی لڑائیوں کا رنگ دیا، کسی نے روٹی، کپڑے، مکان کے مسئلہ کا حل قرار دیا اور کسی نے اپنے مفروضات و مزعومات کی روشنی میں اس کی تشریح کرنا شروع کی۔

غرض جتنے مفکر تھے اتنے ہی خیالات، جتنے مقرر تھے اتنے ہی بیانات، جتنے اہل قلم تھے اتنے ہی مقالات اور جتنے اہل غرض تھے اتنے ہی رجحانات۔

مقدمۂ کتاب کربلا کا مقصد یہی ہے کہ اس عظیم جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت کو اُجاگر کیا جائے اور ان تمام سازشوں کو بے نقاب کیا جائے جو حسینی انقلاب کے خلاف کی گئی ہیں یا آج تک کی جا رہی ہیں۔

پہلا مقدمہ ــــ شخصیت امام حسینؑ

کربلا میں بنیادی کردار امام حسینؑ کا ہے جن کے جہادِ فی سبیل اللہ کی تابانیاں صفحۂ کربلا پر ہر طرف نظر آتی ہیں اور جن کے اشارہ پر وہ مختصر لشکر مرتب ہوا تھا جس نے ہر طرح کی قربانی دیکر دین الٰہی کو حیات دائمی اور بقائے جاودانی بخش دی ہے۔

امام حسینؑ کی شخصیت اور عظمت کو نہ پہچاننے ہی کا نتیجہ ہے کہ کربلا کو دو شہزادوں کی جنگ قرار دے دیا گیا اور اس کی معنوی اور روحانی حیثیت کو نظرانداز کر دیا گیا۔

امام حسینؑ کی شخصیت کسی طرح بھی محتاج تعارف نہیں ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو کسی نہ کسی مقدار میں امام حسینؑ کی شخصیت سے باخبر نہ ہو۔ کم سے کم اتنا تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ امام حسینؑ رسول اکرمؐ کے نواسے، مولائے کائنات علی بن ابی طالبؑ کے فرزند، صدیقۂ طاہرہ فاطمہ زہراؑ کے نورِ نظر، امام حسنؑ کے بھائی اور حضرت

ابوطالبؑ کے پوتے تھے اور یہ سارے رشتے وہ ہیں جو انسان کی عظمت و مرتبت کی بہترین علامت ہیں۔

رسول اکرمؐ کا نواسہ ہونا اور پھر ایسا نواسہ ہونا جسے انتہائی کمسنی کے عالم میں اسلام کی برتری، قرآن کی صداقت، توحید کی حفاظت کے معرکہ میں شریک کیا جائے اور اپنے پیروں سے نہ چل سکیں تو گودی میں اٹھا کر لے جایا جائے اور دنیا پر یہ واضح کر دیا جائے کہ جو اہمیت باقی بزرگوں کی بددعا کی ہے وہی اہمیت حسینؑ کی بددعا کی ہے، اور جس قدر خاندان کے بزرگ مستجاب الدعوات ہیں اسی قدر حسینؑ بھی مستجاب الدعوات ہیں اور جس قدر میدان مباہلہ کو نانا اور ماں باپ کی ضرورت ہے اسی قدر اس فرزند کی بھی ضرورت ہے اور جس قدر اسلام کا حال ان بزرگوں سے وابستہ ہے اسی قدر اسلام کا مستقبل اس کمسن فرزند سے وابستہ ہے، اور یہ سارے حقائق اس ایک مرکزی نقطہ کی وضاحت کر رہے ہیں کہ حسینؑ کا قیاس عام انسانوں پر جائز نہیں ہے اور حسینؑ اس خصوصیت کے حامل ہیں کہ انھیں فرزندِ رسولؐ قرار دیا گیا ہے جب کہ وہ مرسلِ اعظمؐ کے نواسے ہیں اور اس خصوصیت میں کائنات میں ان کے بھائی کے علاوہ کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے امت کے فرزندوں سے بڑی محبت کی ہے۔ صحابۂ کرام کی اولاد کو بڑی شفقت و عنایت کی نگاہ سے دیکھا ہے، اپنے کو ساری امت کا باپ کہا ہے۔ لیکن اتنی بڑی امت میں سے کسی ایک کو بھی "ابنائنا" کی منزل میں میدان مباہلہ میں نہیں لے گئے ہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اخلاقی اعتبار سے یا فرض اطاعت کے اعتبار سے امت کو اولاد بنا لینا اور ہے اور معنویت و روحانیت، کمالات کے اعتبار سے کسی کا ابنائنا میں شامل ہو جانا اور ہے۔ یہ تنہا امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا امتیاز ہے جس میں ساری امت میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ امام حسینؑ شہزادے ہیں اور بے شک شہزادے ہیں ــــ لیکن رسول اکرمؐ کے شہزادے ہیں اور ان کے مقابلہ میں آنے والا رسول اکرمؐ کے مقابلہ میں آنے والا ہے جسے کسی جہت سے بھی مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؑ و فاطمہؑ کا فرزند ہونا اور ایسا فرزند ہونا جس کی وراثت میں باپ کا جہاد اور ماں کا ایثار شامل ہو اور جس نے ابتدائی دور ہی سے اپنے ماں باپ کے کردار کا مکمل مشاہدہ

کیا ہو، اور انسانی نگاہ سے نہیں عرفانی، ایمانی، اور منصبی نگاہ سے مشاہدہ کیا ہو اس کی عظمت کردار کی بہترین دلیل ہے کہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والا' ایسے کرداروں کا وارث اور ایسے حالات کا دیکھنے والا عام انسان بھی اچھے خاصے کردار کا حامل ہو سکتا ہے چہ جائیکہ وہ انسان کہ جسے روز اول سے منصب الٰہی کا حامل بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہو' اور جس کی تربیت اسلام کی آغوش میں ہوئی ہو۔ جس کی رضاعت شیر ایمان سے مکمل ہوئی ہو، اور جس نے درس گاہ علام الغیوب سے علوم و کمالات حاصل کیے ہوں اور ابتدا ہی سے بزرگوں کے ساتھ مختلف مجاہدات میں شریک رہا ہو۔

حضرت ابوطالبؑ کا پوتا اور وارث ہونا بھی ایک مکمل تاریخ کی نشان دہی کرتا ہے جس میں ایثار، قربانی، جہاد، حفاظتِ دین، تحفظ ناموس رسولؐ جیسے جذبات پائے جاتے ہیں اور جس تاریخ میں اپنے بچوں کا فاقہ گوارا ہے خدا کے رسولؐ کی بھوک گوارا نہیں ہے۔ اپنے بچوں کی قربانی گوارا ہے حبیب کبریا کی قربانی گوارا نہیں ہے۔

امام حسینؑ ایک ایسے ہی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ایک ایسے ہی مقدس اور پاکیزہ ماحول کی ایک فرد تھے۔ امام حسینؑ کے حالات، معاملات، اخلاقیات، آداب، خیالات، رجحانات کا قیاس دنیا کے دوسرے انسانوں پر نہیں ہو سکتا ہے لہذا امام حسینؑ کے جہاد کا موازنہ بھی دنیا کی کسی جنگ سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا مقدمہ ـــــ یزید

امام حسینؑ کی شخصیت و عرفان کے بعد یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ واقعۂ کربلا کے سارے مظالم کے "ذمہ دار واقعی" یزید کا کردار کیا ہے اور اسے وراثت میں کون سے جذبات و خیالات ملے ہیں اور اس نے ذاتی طور پر کن صلاحیتوں کی تحصیل کی ہے۔

یزید خاندانی اعتبار سے اس دادا ابوسفیان کا پوتا ہے جس نے ہر معرکۂ اسلام و کفر میں اسلام کے خلاف لشکر کی ترتیب و تنظیم یا قیادت کا فرض انجام دیا ہے۔ جس کے "کمالِ اسلام" کا یہ عالم تھا کہ عثمان بن عفان کی خلافت کے بعد اپنے چہیتے فرزندِ خاندان کو مبارکباد دینے کے لیے آیا تو حالات کو سازگار دیکھ کر اس "عظیم عقیدہ" کا اعلان کیا کہ اب یہ خلافت تمہارے ہاتھ میں آگئی ہے

اسے گیند کی طرح نچاؤ اور اس کا مرکز و محور بنی امیہ کو قرار دو، جنت و جہنم کے خیالات کو ذہن سے نکال دو، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، دنیا یہی ہے اور راحت دنیا یہی خلافت اسلامیہ ہے۔

یزید کی دادی ـ ہندہ جگرخوارہ ہے جس نے احد کے میدان میں "سید الشہداء" حضرت حمزہؑ کے کلیجہ کو نکال کر چبانے کی کوشش کی تھی اور اس طرح ایک عظیم مجاہد اسلام کی توہین اور بے حرمتی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

تاریخ کے یہ دونوں منظر یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ ایک طرف رسول اکرمؐ اس بات پر آنسو بہا رہے ہیں کہ حضرت حمزہؑ کی لاش پر رونے والی عورتوں کا مجمع نہیں ہے اور دوسری طرف ہندہ جشن منا رہی ہے کہ لاش کے اجزاء جدا کیے گئے' اور ان کے کلیجہ کو منہ میں لے کر اپنی دیرینہ تمنا پوری کی گئی اور گویا تحریک اسلام سے انتقام لے لیا گیا۔

یزید کا باپ ـــــ معاویہ ہے جسے اسلام کے ایک نامور حکمراں نے "کسریٰ العرب" کا لقب دیا تھا اور جس کی خلافت ہر مکتب خیال میں ملوکیت اور شہنشاہی خیال کی جاتی ہے اور جس کے بارے میں خود سرکار دو عالمؐ نے فرما دیا تھا کہ خلافت کے بعد بدترین ملوکیت کا دور آنے والا ہے جس میں کسی انسان کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ رہے گی۔

معاویہ فتح مکہ میں مسلمان ضرور ہو گیا تھا لیکن اس اسلام کی حقیقت سرکار دو عالمؐ کے اس فقرے سے واضح ہوتی ہے کہ آپ نے ایسے تمام افراد کو طلقاء کہہ کر معافی دی تھی اور یہ ایک سند ہے کہ ان کا شمار اشراف میں نہیں ہے، آزاد کردہ افراد میں ہے۔ اور اسی لیے خانوادہ رسالت نے مختلف مواقع پر یزید اور معاویہ کے بارے میں اس لفظ کا استعمال کر کے انھیں ان کی حقیقت سے باخبر کیا ہے۔

معاویہ کا میدانِ صفین میں نفس رسولؐ سے مقابلہ کرنا اور موقع پاتے ہی لشکرِ علیؑ کو بیچ میں بند کر دینا، اصحابِ رسولؐ کو قتل کرا دینا، خلیفۂ اول کے فرزند کی لاش کی بے حُرمتی کرنا، خلیفۂ سوم کی کسی طرح کی امداد نہ کرنا اور مدینہ کے باہر لشکر کو روک کر ان کے قتل کا انتظار کرنا اور ان کے لیے ایک مشک آب کا بھی فراہم نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کفر و شرک کا وہ بقیۃ السلف ہے جس کے دل میں کسی کی ہمدردی نہیں ہے اور یہ نہ مکتبِ خلافت کی اہمیت کا قائل ہے اور نہ مکتب امامت

کی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو شخص اپنے خاندان کے خلیفہ کا لاوارثی کے عالم میں بھوکا پیاسا قتل ہو جانا گوارا کر سکتا ہے اور خود اپنے ہی خاندان کے چشم و چراغ پر رحم نہ کرتا ہو وہ دنیا کے کسی انسان پر کیا رحم کر سکتا ہے اور اس کے فرزند سے کس طرح کی شرافت کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اس کے برخلاف تاریخ میں حضرت علی علیہ السلام کا کردار بھی ہے جنھوں نے نہ صفین کے میدان میں بندشِ آب کو گوارا کیا اور نہ خلیفہ سوئم کو قصر کے اندر بے آب رہنے دیا۔ فرزند ابوطالبؑ کی اس شرافت و نجابت کا قیاس فرزند ابوسفیان کی اس ذلت و خباثت پر کیا جائے تو یہ تاریخ کا عظیم ترین ظلم ہے جس کی فریاد خود امیرالمومنینؑ نے بھی کی ہے کہ مجھے اتنا گرایا گیا، اتنا گرایا گیا کہ اب میرے نام کے ساتھ معاویہ کا نام لیا جانے لگا ہے۔

یزید۔۔ کی ماں میسون تھی جو عیسائی خاندان کی ایک عورت تھی اور جس نے ابتدائی دور میں یزید کو اپنے ساتھ صحرا و بیاباں میں رکھا تھا اور وہیں عیسائی اصول و قوانین کے مطابق تربیت دی تھی اور نفاق پر عیسائیت کا رنگ چڑھا کر کریلے کو نیم چڑھا بنانے کا کام انجام دیا تھا۔

عیسائیت نے اسلام کے خلاف جو سازشیں کی ہیں ان کا ایک جز دیزید کی تربیت بھی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح کی شکست عیسائیت کو مباہلہ کے میدان میں ہوئی تھی اس طرح کی شکست کفار و مشرکین اور یہودیوں کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ کفار و مشرکین کو یہ اطمینان تو تھا کہ

"مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا"

اور پھر شکست کے بعد بھی ہم نے شکست کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن عیسائیت کے دل میں تو یہ ایک ناسور تھا کہ ہم ایسے میدان میں آگئے، جہاں مقابلہ بھی ممکن نہ تھا اور پھر ہمیں ذلت آمیز شکست کا اعتراف بھی کرنا پڑا لہٰذا جس قیمت پر ممکن ہو ان پانچ افراد سے انتقام لے لیا جائے جنھوں نے مباہلہ کا معرکہ سر کیا ہے اور لعنت کے حربے سے ہماری قوم کو شکست دی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے یہ دو مسلمات قابل توجہ ہیں کہ معاویہ کے دربار میں ایک عیسائی طبیب تھا جس کا کام زہر قاتل تیار کرنا تھا اور یہی زہر ابن ملجم کی تلوار میں بھی دیکھا گیا ہے اور جعدہ کے پانی میں بھی۔ یعنی معاویہ نے اس زہر کے ذریعہ مباہلہ کی دو عظیم شخصیتوں کا قتل کیا ہے اور عیسائیت کو دو عظیم

ہستیوں سے بدلہ لینے کا موقع فراہم کیا ہے اب ایک امام حسینؑ کی ہستی باقی تھی اور عیسائیت کو ان سے انتقام لینا تھا، چنانچہ میسون کو معاویہ کے گھر میں داخل کیا گیا اور جب یزید پیدا ہو گیا تو اسے اپنے ماحول میں رکھ کر پالا گیا تاکہ ایک ایسی "شخصیت" تیار کی جائے جس کے دل میں اسلام سے کوئی ہمدردی نہ ہو اور وہ مباہلہ کے مجاہدین کی آخری فرد سے بھی عیسائیت کی شکست کا انتقام لے لے۔

امام حسینؑ دشمنانِ اسلام کی نگاہ میں دُہرے انتقام کا مرکز تھے۔ ایک طرف یزید اپنے باپ دادا کی لڑائیوں کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اس کا منشاء یہ تھا کہ امام حسینؑ کے ذریعہ جنگ بدر کے مقتولین کا بدلہ لے لیا جائے اور حضرت علیؑ کے مجاہدات کا انتقام ہو جائے اس لیے جب امام حسینؑ نے لشکر یزید سے خطاب کر کے سوال کیا کہ آخر میرا خون کیوں بہایا جا رہا ہے؟ کیا میں نے دین بدلا ہے؟ شریعت میں کوئی ترمیم کی ہے؟ احکام الٰہی میں کوئی تبدیلی کی ہے؟ تو سب نے یک زبان جواب دیا کہ ہمارے دل میں آپ کے باپ علیؑ کا بغض ہے اور ہم اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں اور پھر خود یزید نے بھی اپنے دربار میں فتح و کامرانی کے نشہ میں ڈوب کر کہا تھا کہ کاش ہمارے بدر کے بزرگ زندہ ہوتے اور یہ منظر دیکھتے کہ کس طرح ان کے خون کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔

کربلا کا واقعہ امام حسینؑ کی طرف سے حفاظت اسلام کا انتظام تھا تو یزید کی طرف سے شکست کفر کا انتقام۔ کربلا کے نتیجہ کا فیصلہ اس طرح آسان ہے کہ اگر یزید کا کفر باقی رہ گیا تو انتقام کامیاب ہو گیا اور اگر امام حسینؑ کا بچایا ہوا اسلام باقی رہ گیا تو انتظام کامیاب ہوا اور انتقام دوبارہ شکست کھا گیا۔

دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ عیسائیت اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتی تھی اور اس کے لیے میسونہ کو ذریعہ بنایا گیا تھا۔ امام حسینؑ نے دونوں طرح کے انتقام کا مقابلہ کیا اور یہ واضح کر دیا کہ یزید دو طرف سے کفر کا وارث ہے، بدر کے اعتبار سے مشرکین مکہ کا وارث ہے، اور مباہلہ کے اعتبار سے نصاریٰ نجران کا وارث ہے۔۔۔ اور میں بدر و احد کے اعتبار سے محمد مصطفےٰؐ اور علی مرتضیٰؑ کا وارث ہوں اور مباہلہ کے اعتبار سے جانِ پنجتن اور عیسیٰ روح اللہ کا وارث ہوں جنھوں نے گہوارہ ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ میں بندۂ خدا ہوں فرزند خدا نہیں ہوں۔

یزید۔۔ بذات خود یزید تھا، جس کا کردار تو کردار اس کا نام بھی اہل نظر و ادب کی نگاہ میں

داخل دشنام ہے۔

یزید کی "شخصیت و حیثیت" عالم اسلام میں کبھی زیر بحث نہیں رہی ہے۔ البتہ اس کا اسلام
و ایمان ہر دور میں زیر بحث رہا ہے اور اس سے بالاتر یہ بحث رہی ہے کہ وہ قابل لعنت ہے یا نہیں۔
یعنی یہ بات تقریباً مسلمات میں ہے جس کا اقرار ہر غیر متعصب عالم نے کیا ہے کہ یزید کا اسلام واقعی اسلام
نہیں تھا اور اس کا کردار واقعاً اس قابل تھا کہ اس پر لعنت کی جائے۔

علامہ برزنجی نے کتاب الاشاعہ میں اور ابن حجر نے صواعق میں نقل کیا ہے کہ احمد بن حنبل
کے فرزند عبداللہ نے اپنے باپ سے یزید پر لعنت کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں
نے جواب دیا کہ جس پر خدا نے لعنت کی ہے اس پر کس طرح لعنت نہ کی جائے اور اس کے بعد
قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ دیا جہاں فساد فی الارض کرنے والوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ قاضی ابوبکر بن العربی المالکی نے اپنی کتاب "العواصم والقواصم" میں
یہ کہہ کر کہ حسینؑ اپنے جد کی تلوار سے قتل ہوئے ہیں سخت غلطی کی ہے۔ یزید ہرگز حاکم اسلامی نہ تھا۔ اسلامی
حکومت کے لیے عدالت ضروری ہے اور حسینؑ سے بالاتر کوئی عادل نہ تھا۔ اس کے بعد مقدمہ تاریخ
کے صفحہ ۲۵۴ پر اس حقیقت کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ علماء اسلام یزید کے فسق پر متفق ہیں اور فاسق
ایسا اسلامی حاکم نہیں ہو سکتا کہ اس کے خلاف اقدام جائز نہ ہو۔ صحابہ کرام اور تابعین کا سکوت
یزید کے کردار سے رضامندی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوں ریزی کو پسند نہ کرتے تھے اس لیے یزید
کی نصرت کو بھی جائز نہیں قرار دیتے تھے۔

ابن مفلح حنبلی کا بیان ہے کہ ابن عقیل اور ابن الجوزی کی نگاہ میں غیر عادل حاکم کے خلاف
قیام جائز ہے جس طرح امام حسینؑ نے یزید کے خلاف قیام کیا ہے۔ یزید کو اگر ابتدا میں حاکم تسلیم
بھی کر لیا جائے تو قتل حسینؑ، ہتک حرمت کعبہ اور تاراجی مدینہ کے بعد تو یہ حکومت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفیہ میں تحریر کیا ہے کہ یزید کا قتل حسینؑ سے راضی ہونا
اور اس پر خوشی منانا مسلمات میں ہے اور ایسا انسان صاحب ایمان نہیں ہو سکتا ہے بلکہ قابل لعنت
ہے اور اس پر اور اس کے انصار و اعوان پر خدا کی لعنت ہے۔

ابن حزم نے "المحلی" ج ۱۱ ص ۹۸ میں تحریر کیا ہے کہ یزید بن معاویہ کا قیام صرف دنیا کے

لیے تھا اس کے اعمال کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ ظالم محض تھا۔ بعض علماء کی طرف سے اس
کے اعمال کی تاویل سراسر زیادتی ہے۔

جاحظ کا بیان ہے کہ یزید کے بدترین جرائم قتل حسینؑ، اسیری بنات رسولؐ، توہین سر امام حسینؑ،
غارت گری مدینہ، ہتک حرمت کعبہ وہ اعمال ہیں جو قساوت قلب، دشمنی آل رسولؐ، بغض و عداوت
دیگر، کینہ پروری اور نفاق و بے ایمانی کی علامت ہیں اور فاسق ملعون ہوتا ہے بلکہ جو ملعون پر لعنت
کرنے سے منع کرے وہ خود بھی ملعون ہے۔ (رسائل جاحظ ص ۲۹۸)

برہان حلبی نے استاذ الشیخ محمد بکری کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ اور ان کے والد
دونوں یزید پر لعنت کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا اسے جہنم کے پست ترین درجات میں جگہ دے۔

ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں بیان کیا ہے کہ یزید بن معاویہ ناصبی، بدسرشت، بدکردار،
شرابی اور بدکار تھا۔ اس نے اپنی حکومت کا آغاز قتل حسینؑ سے کیا ہے اور خاتمہ واقعۂ حرہ پر کیا ہے۔

سبط ابن الجوزی سے نقل کیا گیا ہے کہ ابن الجوزی سے یزید پر لعنت کے بارے میں سوال
کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ امام احمد نے اس پر لعنت کو جائز قرار دیا ہے اور ہم بھی یزید کو پسند
نہیں کرتے ہیں کہ اس کے اعمال بدترین اعمال تھے۔ اب اگر لوگ اس ناپسندیدگی پر راضی
ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم بھی صریحاً لعنت کرتے۔ (مرآۃ الزمان ج ۸ ص ۴۹۶)

ان تمام بیانات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ انصاف پسند علماء اور مورخین نے ہر دور
میں یزید کو کافر یا منافق یا قابل لعنت تسلیم کیا ہے اور کوئی اس کے اعمال، کردار سے اتفاق
نہیں کر سکا ہے۔

دور حاضر میں بعض اہل قلم نے اگر یزید کی طرف داری کی ہے تو اس کی وجہ یہ قرار دی
ہے کہ قتل حسینؑ وغیرہ جیسے اعمال کا یزید سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب ابن زیاد اور ابن سعد
کے اعمال تھے۔ یزید ان اعمال سے بری تھا ورنہ اگر یہ طے ہو جائے کہ ان سارے اعمال کا
ذمہ دار یزید ہی ہے تو بے شک ایسا انسان قابل لعنت ہوتا ہے۔

صرف چند بے ایمان اور خبیث النفس اہل قلم ایسے ہیں جنھوں نے امام حسینؑ کو باغی یا خارجی
قرار دیا ہے اور یزید کی حکومت کو جائز اور صحیح قرار دیا ہے اور یہ وہی معنوی نسل یزید ہے جس نے

کل یزید کو امیرالمومنین تسلیم کیا تھا اور امام حسینؑ کو باغی اور خارجی کہہ کر ان کا خون بہانے کی تدبیر کی تھی۔ لعنۃ اللہ علیھم اجمعین۔

تیسرا مقدمہ ـــ ہلاکت و شہادت

واقعہ کربلا کے سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ امام حسینؑ نے جان بوجھ کر اصحاب کی مختصر جماعت کے ساتھ کربلا کا رخ کیا۔ یزید کی بے شمار فوج سے مقابلہ کیا بیعت یزید سے انکار کیا اور یہ تمام باتیں اقدام قتل کے مرادف ہیں جسے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔ امام حسینؑ کو ہوا کا رُخ دیکھنا چاہیئے تھا اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے تھا۔ ہوا کے رُخ کے مطابق عمل کیا ہوتا تو اتنا بڑا سانحہ نہ ہوتا اور اتنے افراد کا خون نہ ہوتا بلکہ صاحب تحفہ کربلا نے واضح لفظوں میں یہ اعتراض کیا ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت (معاذ اللہ) ان کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تھی ورنہ وہ اپنی جان بچا سکتے تھے اور جو انسان جان بوجھ کر موت کے منھ میں چلا جائے اسے کس طرح مظلوم کہا جا سکتا ہے؟

اس سوال اور اعتراض کے تجزیہ کے لیے چند مراحل پر غور کرنا ہوگا:

مرحلہ اول ـــ یہ ہے کہ کیا امام حسینؑ کے لیے جان بچانا ممکن تھا اور اگر ممکن تھا تو اس کا طریقہ کیا تھا۔ اس مقام پر بعض تاریخی حوادث سے ناواقف افراد یہ کہہ دیتے ہیں کہ امام حسینؑ یزید کی بیعت کر لیتے تو ان کی زندگی محفوظ رہ سکتی تھی ـــ حالانکہ یہ بات تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ امام حسینؑ نے اس وقت تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا تھا جس اقدام سے یزید کی خلافت کو خطرہ ہوتا۔ یزید کی خلافت کو خطرہ امام حسینؑ کے وجود سے تھا اور اسے یہ اندیشہ تھا یہ آنکھ بند کر کے میرے اعمال کی تائید نہیں کر سکتے اور کسی قیمت پر میرے احکام پر عمل نہیں کر سکتے اور اس طرح امت میں یہ شعور ضرور بیدار ہوگا کہ یزید میں کوئی عیب، کوئی نقص اور کوئی خرابی ہے جس کی بنا پر فرزند رسولؐ اس کے احکام کو قبول نہیں کرتے اور اس طرح میری حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا ان کے وجود کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ مطالبۂ بیعت کو یزید نے بہترین بہانہ قرار دیا تھا کہ یہی وہ مسئلہ ہے جہاں امام حسینؑ اتفاق نہ کر سکیں گے ورنہ بیعت

کے بجائے صلح کا مطالبہ ہوگا تو وہ اتفاق کر سکتے ہیں کہ اسے معلوم تھا کہ آل محمدؐ صلح کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے اس گھرانے کی پوری تاریخ تھی کہ میرے دادا نے آزمایا تو رسول اکرمؐ صلح کے لیے تیار ہو گئے۔ میرے باپ نے تجربہ کیا تھا تو حسنؑ مجتبیٰ صلح کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ اب میں بھی صلح کے لیے تحریک کروں گا تو حسینؑ آمادہ ہو جائیں گے لہٰذا کوئی ایسا مطالبہ کرنا چاہیے جس سے امام حسینؑ کسی قیمت پر اتفاق نہ کر سکیں ـــ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے باپ کے گلے میں رسی ڈالی گئی، انھیں کھینچ کر گھر سے مسجد تک لایا گیا۔ طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں لیکن انھوں نے بیعت نہیں کی جب کہ مقام صلح میں ٢٥ سال تک خاموش رہے اور حکومت وقت سے مقابلہ نہیں کیا لہٰذا آل محمدؐ کے سامنے مطالبۂ صلح کے بجائے مطالبہ بیعت پیش کرنا چاہیے اور اس کے ذریعہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیے جیسا کہ خود امام حسینؑ نے اپنے بیانات میں اشارہ فرمایا تھا کہ میں کسی جانور کے سوراخ میں بھی پناہ لے لوں تو یہ مجھے نکال کر قتل کر دیں گے، انھیں میری زندگی گوارا نہیں ہے اور یہ میرے وجود کو خطرہ تصور کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بیعت سے جان بچ سکتی تھی تو بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا بیعت، امام حسینؑ کے لیے ممکن تھی اور کیا اسلام ہر راستہ سے حفاظت نفس کی اجازت دیتا ہے چاہے اس سے خود اس کی بربادی کا سامان فراہم ہو جائے؟

اس سوال کا تجزیہ علماء و مفکرین نے دو راستوں سے کیا ہے۔ امام حسینؑ کے ذاتی کمالات اور نسبی کرامات وغیرہ کے اعتبار سے ـــ کہ کیا یہ خصوصیات اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ امام حسینؑ بیعت کر لیں۔ جس کے باپ نے ایک لمحہ کے لیے یزید سے غنیمت حکام کی بیعت نہیں کی ہے، جس کے بھائی نے ایک دن کے لیے یزید کے باپ کی بیعت کا ارادہ نہیں کیا ہے وہ یزید جیسے بدترین انسان کی بیعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔! اس نکتہ کا احساس ابن سعد کو بھی تھا کہ اس نے اپنے حاکم کو آخری اطلاع نامہ میں تحریر کیا تھا کہ حسینؑ بیعت نہیں کریں گے۔ ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے۔ یہاں امر کی طرف اشارہ تھا کہ امام حسینؑ کے نسبی خصوصیات انھیں بیعت کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔

دوسرا راستہ شریعت کے احکام و قوانین کا ہے کہ کیا اسلامی قوانین کی روشنی میں ایسے انسان کی بیعت جائز تھی جو حرام محمدؐ کو حلال، اور حلال محمدؐ کو حرام بنا دے۔ قانون الٰہی کا مذاق اڑائے،

سر دربار شراب پیے، سوتیلی ماں بہن سے زنا کو جائز قرار دے اور دربار عام میں یہ اعلان کرے کہ دین و آئین فقط بنی ہاشم کا کھیل ہے ورنہ نہ کوئی وحی آئی ہے اور نہ خبر نازل ہوئی ہے۔

قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو عام مسلمان کے لیے بھی اس کی بیعت کو جائز قرار دے سکے۔ بیعت کے قواعد و قوانین معین ہیں ان میں فاسق و فاجر کی اطاعت کا بھی امکان نہیں ہے بیعت تو بہت بڑی بات ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر سے بھی یزید کی بیعت کسی عام انسان کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔ امام حسین کا مرتبہ تو ان سب سے بہت بالاتر ہے۔

لہٰذا یہ تصور کہ امام حسینؑ بیعت کے ذریعہ اپنی زندگی کا تحفظ کر سکتے تھے تاریخ اور شریعت دونوں سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ نہ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یزید کا منشائے حقیقی صرف طلب بیعت تھا اور وہ بیعت کے بعد اذیت و آزار سے دستبردار ہو سکتا تھا اور نہ شریعت اسلام کے قوانین کے اعتبار سے امام حسینؑ کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ یزید جیسے فاسق و فاجر انسان کی بیعت کر لیتے امام حسینؑ تو کسی عظیم ترین انسان کی بھی بیعت نہیں کر سکتے تھے کہ وہ خود اپنے دور کے ہر انسان سے عظیم تر تھے اور ان سے بالاتر کوئی نہیں تھا کہ وہ اس کی اطاعت یا بیعت کرتے اور پھر امام حسینؑ کا ہاتھ اللہ نے بیعت لینے کے لیے بنایا تھا بیعت کرنے کے لیے نہیں بنایا تھا۔ ان کا ہاتھ یداللہ تھا اور یداللہ تمام ہاتھوں سے بالاتر ہوتا ہے وہ کسی کے ہاتھ کے نیچے نہیں آسکتا ہے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ہلاکت کے معنی کیا ہیں اور کیا امام حسینؑ کے اقدام کو ہلاکت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب تمام علماء اخلاقیات نے یہ دیا ہے کہ ہلاکت بلا سبب جان کو برباد کر دینے یا اپنی حیثیت سے کمتر پر جان قربان کر دینے کا نام ہے اور امام حسینؑ راہ خدا میں قربانی دے رہے تھے جس سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے لہٰذا ان کے اقدام جہاد کو ہرگز ہلاکت کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ہلاکت بربادی کا نام ہے اور بربادی کے معنی یہ ہیں کہ چیز ضائع ہو جائے اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ شورہ زار زمین میں دانہ ڈال دینا اس کی بربادی ہے۔ لیکن زرخیز زمین میں بیج ڈال دینا اس کی بربادی نہیں ہے۔ اور دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں دانہ بے نتیجہ رہ جاتا ہے اور دوسری صورت میں ایک دانہ سے سات بالیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہر بالی میں سو سو دانے پیدا ہوتے ہیں، اور اس طرح دانہ

کارآمد ہو جاتا ہے برباد نہیں ہوتا۔ اسلام میں جہاد اور شہادت کا قانون اسی لیے رکھا گیا ہے کہ شہادت میں زندگی برباد نہیں ہوتی بلکہ اس کے مقابلہ میں بے شمار نتائج برآمد ہوتے ہیں، اور واضح ترین نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان کی عارضی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور مذہب کو ابدی زندگی مل جاتی ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ مذہب کی زندگی انسان کی زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

امام حسینؑ کے اقدام کی صورت حال بھی یہی تھی کہ انھوں نے مشیت الٰہی کے مطابق وہ وقت، موقع اور مقام منتخب کیا تھا جہاں جان کی قربانی بربادی نہیں تھی بلکہ ایک عظیم تر اور وسیع تر حیات کا پیش خیمہ تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ اس قربانی کے نتیجہ میں ظلم کے حوصلے پست ہوں گے، مظلوم کو بولنے کا موقع ملے گا، ترمیم شریعت کا راستہ بند ہو جائے گا، خلافت کے نام پر منکرات کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا۔ اہل دنیا کو قانون الٰہی میں دخل اندازی کا موقع نہ ملے گا۔ اور جس ماحول میں بڑے بڑے صحابہ زادوں کو بولنے کی تاب نہیں ہے اس ماحول میں ایک مرد نابینا یا مرد نصرانی بھی حاکم وقت کو ٹوکنے کا حوصلہ پیدا کر لے گا اور یہ حوصلہ تحفظ دین و شریعت کے اعتبار سے بے حد مفید ہوگا۔

امام حسینؑ نے اپنی قربانی ان تمام مصالح کے پیش نظر دی ہے اور وہ سارے فوائد حاصل کر لیے ہیں جو ایک شہادت سے حاصل کیے جا سکتے تھے اسلام کو حیات جاودانی دے دی ہے۔ شریعت کو تحفظ فراہم کر دیا ہے، قرآن کو سربلند کر دیا ہے، کعبہ کی عظمت و کرامت کو بچا لیا ہے اور دین محمدیؐ کو استحکام و دوام عطا کر دیا ہے اور ایسے نتیجہ خیز عمل کو ہلاکت یا بربادی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ۔۔۔ یہ ہے کہ کیا انسان کے لیے تمام صورتوں میں جان، مال، آبرو کی حفاظت واجب ہے یا بعض حالات میں ان کی قربانی بھی ضروری ہے؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ اس مسئلہ کو عقلی طور پر طے کیا جائے تو عقل واضح فیصلہ دیتی ہے کہ مقصد کی عظمت کی راہ میں تینوں کو قربان کیا جا سکتا ہے اور انسانی زندگی میں یہ برابر ہوتا رہتا ہے کہ حالات و مصالح کے تحت مال بھی قربان کیا جاتا ہے اور بلند ترین مقاصد کے لیے ظاہری

عزت و وجاہت بھی قربان کی جاتی ہے اور واقعی مفاہیم و اقدار کے لیے جان کی بازی بھی لگا دی جاتی ہے۔ کون عقلمند ہے جو اس حقیقت سے انکار کر دے گا اور کون سا باشعور ہے جو اپنی زندگی میں اس قانون پر عمل درآمد نہیں کرتا ہے۔

شرعی اعتبار سے بھی جان و مال و آبرو تینوں رب العالمین کا عطیہ اور اس کی امانتیں ہیں، لہذا انھیں دوسرے کی راہ میں صرف کرنا ناجائز ہو تو ہو خود صاحب مال ہی اگر مخصوص انداز صرف کا مطالبہ کر دے تو صرف کر دینا ہلاکت نہیں ہے اس سے انحراف کرنا ہلاکت ہے۔ خاصانِ خدا نے ہمیشہ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھا ہے کہ جان، جان آفریں کی امانت ہے۔ مال، مالک ملک کی امانت ہے۔ آبرو رب العزت کی امانت ہے۔ لہذا وہ جس طرح رکھنا چاہے گا اسی طرح صرف کر دیں گے اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ہماری مرضی کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ عقل و شرع دونوں کے اعتبار سے قربانی ایک ضرورت ہے اور قربانی کو ہلاکت اور بربادی نہیں کہہ سکتے ہیں تو اب صرف اتنا واضح کرنا ہوگا کہ امام حسینؑ عقل و شرع دونوں کی طرف سے اس قربانی کے لیے مامور تھے اور انھوں نے عقل و شرع دونوں کے قانون پر عمل درآمد کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ تاریخی اعتبار سے انتہائی واضح ہے کہ حالات نے عقلی طور پر وجوب عائد کر دیا تھا اور سرکار دو عالمؐ نے خواب کے ذریعہ، شریعت اسلام نے تحفظِ اسلام کی ضرورت کے ذریعہ اس وجوب کا اعلان کر دیا تھا جیسا کہ خود امام حسینؑ نے فرمایا کہ میں امت جد کی اصلاح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے گھر سے باہر نکلا ہوں اور یہ سب امور اسلام میں واجبات اور اہم ترین فرائض شریعت میں تھے۔

چوتھا مقدمہ۔ فتح و شکست

دنیا میں جو صاحب عقل بھی کوئی عمل انجام دیتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور اسی مقصد کے اعتبار سے کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ عمل کے دوران پیش آنے والے حالات و کیفیات نہ کامیابی کی علامت ہیں اور نہ ناکامی کی۔ ایک فلاح (کاشتکار) اپنے کام کا آغاز کرتا ہے تو سب سے پہلے زمین کی حالت خراب ہوتی ہے۔ اس کے

بعد دانہ خاک میں ملا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد زمین پر بہنے والا صاف و شفاف پانی خاک میں جذب ہو جاتا ہے اس کے بعد پیداوار کو سہارا دینے والا کیمیاوی مادہ زیر زمین گم ہو جاتا ہے تو زراعت کا عمل مکمل ہوتا ہے جس میں ظاہری تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن جب چار مہینے انتظار کرنے کے بعد لہلہاتا ہوا کھیت سامنے آجاتا ہے تو سب یہی کہتے ہیں کہ فلاح اپنے عمل میں کامیاب ہے۔ کسی نے اس کامیابی پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ دانہ برباد ہو گیا، پانی جذب ہو گیا۔ کھاد کا پتہ نہیں چلا اس لیے کہ کامیابی کا فیصلہ نتیجہ کے اعتبار سے ہوتا ہے حالات اور مقدمات کے اعتبار سے نہیں ہوتا ہے۔

یہی حال خاصان خدا کی حیات کا ہے کہ اس میں زحمتیں، مصیبتیں، آفتیں سب ہیں اور حادثات کی کثرت بھی ہے۔ کوئی پتھر میں دبا دیا گیا، کوئی آرے سے چیر دیا گیا، کسی پر کوڑا پھینک دیا گیا، کوئی سخت ترین مصائب کا شکار ہو گیا لیکن ان تمام مصائب و آفات کو ان کی ناکامی کی علامت نہیں قرار دیا گیا بلکہ اللہ والوں کی فوج کو کامیابی اور کامرانی کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

اہل دنیا کی نگاہ میں یہی مصائب و آلام ناکامی کی علامت ہو سکتے ہیں کہ وہ خدمات سے راحت چاہتے ہیں، تبلیغات سے مفاد دنیوی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ والے ان مصائب کو اس وقت تک اپنی ناکامی نہیں تصور کرتے جب تک کہ ایک شخص کے بھی راہ راست پر آجانے کا امکان ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اس دنیا میں راحت و آرام طلبی نہیں ہے۔ وہ بندگان خدا کو راہ خدا پر چلانے اور منزل قرب الٰہی تک پہونچانے کے لیے آئے ہیں اور جب تک یہ کام ہوتا رہے گا وہ اپنے کو کامیاب تصور کرتے رہیں گے اور اپنے تصور میں حق بجانب رہیں گے۔

کیا یہ تاریخ کی عظیم حقیقت نہیں ہے کہ جس مرد مجاہد نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، نام آور پہلوانوں کے گلے کاٹے، ایک ایک وار میں مرحب و مرکب کے دو ٹکڑے کیے، دو انگلیوں سے در خیبر اکھاڑ لیا، ایک ضربت سے کل کفر کا خاتمہ کر دیا، ایک اکیلے دم پر سارے لشکر سے مقابلہ کر لیا وہ ان تمام مجاہدات و فتوحات کو اپنی کامیابی کے اعلان کا محل نہیں قرار دیتا اور جب سر پر ابن ملجم کی تلوار لگتی ہے تو اعلان کرتا ہے کہ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔"

کیا یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ کامیابی اور ناکامیابی، راحت و تکلیف، اطمینان و مصیبت، دولت و غربت، لطف حیات اور تلخ کامیِ زندگانی کی تابع نہیں ہے۔ اس کا معیار صرف مقصد کا حاصل ہونا اور مقصد کے حصول سے محروم ہو جانا ہے۔ مقصد حاصل ہو گیا تو انسان ہزار مصائب کے باوجود کامیاب ہے اور مقصد حاصل نہ ہو سکا تو انسان لاکھوں راحتوں کے باوجود بھی ناکام ہے۔

اس بنیاد پر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ کربلا کے معرکے میں فاتح کون ہے اور شکست خوردہ کون؟ دونوں فریقین کا مقصد دیکھنا ہوگا اور پھر مقصد کے حصول و عدم حصول کا جائزہ لینا ہوگا۔

تاریخ اس حقیقت کی بہترین شاہد ہے کہ امام حسینؑ کی نگاہ میں دنیا کا کوئی آرام نہ تھا۔ انھوں نے مصائب کا راستہ اختیار کیا تھا اور بار بار اپنے قتل کی پیش گوئی کر دی تھی، اصحاب کو بھی آزاد کر دیا تھا کہ مصائب میں ساتھ نہیں دے سکتے تو چلے جائیں، مجھے دینِ محمدؐ کو مستحکم بنانا ہے اور اس راہ میں تلواروں کو اپنا گلا بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ایسی حالت میں ان کی مصیبت یا شہادت کو ناکامی کی علامت قرار دینا ایک غفلت یا تغافل یا جہالت و حماقت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس کے برخلاف یزید حکومت چاہتا تھا۔ اس کے باپ نے اہل کوفہ سے خطاب کرکے اعلان کر دیا تھا کہ میں نے تم لوگوں سے نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے لیے جنگ نہیں کی ہے، میں صرف تم پر حکومت کرنا چاہتا ہوں۔ اسی حکومت کی بقا کے لیے اس نے اپنے بدترین بیٹے یزید کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا کہ یہ اقتدار کسی بھی صورت سے بنی امیہ میں رہ جائے ورنہ اس کے بیٹے کی نگاہ میں دین و مذہب سب بنی ہاشم کا کھیل تھا۔

اب امام حسینؑ اور یزید کا معرکہ صرف اس مرحلہ پر تھا کہ دین باقی رہے یا مٹ جائے، رسالت حقیقت و واقعیت ثابت ہو یا بنی ہاشم کا کھیل تماشا ثابت ہو جائے۔ یزید نے سارا زور صرف کر دیا کہ رسالت تماشا بن جائے، دین فنا ہو جائے اور ابو سفیان کے قول کے مطابق یہ گیند بنی امیہ کے گرد ناچتی رہے اور امام حسینؑ کا سارا جہاد اس مقصد کے لیے تھا کہ دین الٰہی باقی رہ جائے، رسالت کا وقار زندہ رہے، اسلام کی آبرو ضائع نہ ہونے پائے۔ چاہے اس راہ

میں میری لاش پامال ہو جائے اور میرا بھرا گھر اُجڑ جائے۔

ان حالات میں نتیجہ بالکل سامنے ہے۔ اگر یزید انکار رسالت میں کامیاب ہو جائے تو معاذ اللہ امام حسینؑ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے لیکن اگر یزید خود ہی امام زین العابدینؑ کے خطبہ کو قطع کرنے کے لیے اعلان کرائے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" تو یہ علامت ہے کہ یزید نے شکست کا اعتراف کر لیا اور امام حسینؑ نے کربلا کے بعد شام کا معرکہ بھی فتح کر لیا۔

اگر یزید شراب و بدکاری و عیاری کو مذہب میں روا رکھ سکے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور امام حسینؑ کی قربانی ضائع ہو گئی، اور اگر یزید کی حمایت کرنے والے بھی شراب و بدکاری کو حرام کہہ رہے ہیں تو یہ علامت ہے کہ امام حسینؑ کامیاب ہیں اور یزید ناکام ہو گیا۔

ان حالات میں تو ان لوگوں کو بھی اپنے نظریہ کا جائزہ لینا پڑے گا جو یہ کہہ رہے تھے کہ امام حسینؑ نے ہوا کا رُخ نہیں پہچانا اور اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کا ساتھ نہیں دیا جس کے نتیجہ میں قتل ہو گئے اور سارا گھر برباد ہو گیا۔ یعنی یہ اہل قلم اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ یزید کے دور میں تمام بڑی شخصیتوں کا موقف امام حسینؑ سے بالکل مختلف تھا۔ سب کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر یزید کی بیعت کیے ہوئے تھے اور اس کے اعمال و افعال سے رضامندی کا اعلان کر رہے تھے اور امام حسینؑ کھلم کھلا اپنی مخالفت اور بیزاری کا اظہار فرما رہے تھے اور اس راہ میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار تھے۔ تو اب یہ فیصلہ آسان ہے کہ اگر یزید کا دین باقی رہ گیا ہے اور اسلام میں وہ تمام منکرات جائز رہ گئے ہیں جنھیں یزید اپنے عمل سے جائز ثابت کر رہا تھا تو امام حسینؑ نے حالات زمانہ سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے اور معاذ اللہ دھوکہ کھا گئے ہیں لیکن اگر یزید کا دین مٹ گیا، یزید کا مشن فنا ہو گیا، یزیدیت رسوائے زمانہ ہو گئی اور وہ اسلام رہ گیا جو اسلام محمدیؐ تھا اور جس کی خاطر امام حسینؑ قربانی دے رہے تھے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یزید ہارا۔ امام حسینؑ جیتے اور اس فتح میں ان کے اصحاب و انصار و اہلبیت کے علاوہ کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ آج جو دین اسلام باقی و زندہ و پائندہ ہے اس کی بقا پر نہ کسی صحابی کا احسان ہے نہ صحابی زادہ کا، نہ کسی شخصیت کا احسان ہے نہ شخصیت پرست

کا۔ یہ صرف تنہا امام حسینؑ کی قربانی کا اثر ہے کہ دین الٰہی زندہ و پائندہ رہ گیا اور تا ابد زندہ رہے گا۔

امام حسینؑ کی اصولی کامیابی کے بعد حالات زمانہ کا جائزہ لیا جائے تو ہر دور کے حالات امام حسینؑ کی کامیابی کا بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں۔ یزید کامیاب ہوتا تو اس کی کامیابی کے اثرات ہوتے۔ لیکن آج نہ اس کی قبر کا نشان ہے نہ اس کے نائرین ہیں، نہ چند بندگان زر کے علاوہ کوئی اس کا نام لیوا ہے، نہ اس کی بارگاہ ہے نہ اس کا تذکرہ ہے، نہ اس کی راہ میں فداکاری ہے، نہ اس کا پرچم ہے، نہ اس کا کوئی نام و نشان ہے، اور اگر کوئی نام ہے بھی تو داخل دشنام ہے۔

لیکن امام حسینؑ آج بھی ہر جہت سے فاتح ہیں اور ہر محرم ان کی فتح کا اعلان کرتا ہے۔ ہر گھر میں عزاخانہ انھیں کا سجایا جاتا ہے، ہر شاہراہ پر پرچم انھیں کا لہراتا ہے، ہر بزم میں تذکرہ انھیں کا ہوتا ہے، ہر پیاسے کو پانی انھیں کے نام پر پلایا جاتا ہے، ہر قانون الٰہی اور تعلیم اسلام کا چرچا انھیں کی مجالس میں ہوتا ہے، ہر اخبار انھیں کا تذکرہ کرتا ہے، ہر رسالہ انھیں کا نمبر نکالتا ہے، ہر زبان انھیں کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے، ہر شریف غیر مسلم انھیں کی بارگاہ میں سر نیاز جھکاتا ہے، ہر مورخ انھیں کو تاریخ ساز قرار دیتا ہے، ہر مفکر انھیں کے فلسفۂ جہاد کو اپناتا ہے، ہر ادیب انھیں کو صبر و استقلال کی علامت قرار دیتا ہے، ہر انقلابی انھیں کو ہیرو تسلیم کرتا ہے، ہر مومن انھیں کو اپنا سردار تسلیم کرتا ہے، ہر حق انھیں کے گرد چکر لگاتا ہے، اور ہر باطل انھیں کے نام سے گھبراتا ہے، ہر سپاہی کو انھیں کے جہاد سے حوصلہ ملتا ہے اور ہر نہتے انسان کے لیے انھیں کی داستان استقلال ہتھیار کا کام کرتی ہے۔

غرض حسینؑ غریبوں کا سہارا، اسلام کا عزم جاوداں، مجاہدوں کی طاقت، شریعت کے پاسبان اور محرومیت کے ادبی نگراں ہیں۔ حسینؑ پر ہمارے لاکھوں سلام،

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

پانچواں مقدمہ ــــ امام حسینؑ اور شریعت

اصول مذہب کے اعتبار سے ہر امام محافظ شریعت ہوتا ہے اور رسالت کے ساتھ

امامت کی ضرورت اسی لیے ہوتی ہے کہ جب رسالت تبلیغ شریعت کا کام مکمل کر دے اور وحی تشریعی کا سلسلہ موقوف ہو جائے تو کوئی ایسا شخص رہے جو اس شریعت کی محافظت کرے تاکہ یہ قانون اسلام اپنی واقعی شکل میں باقی رہے۔ ظاہری شکل میں شریعت علماء امت کے ذریعہ بھی باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن احکام واقعیہ کے تحفظ کے لیے بہرحال امامت کی ضرورت ہے اس لیے کہ علماء امت احکام واقعیہ سے باخبر نہیں ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ لوح محفوظ سے متعلق نہیں ہوتا ہے، وہ کتاب و سنت کا مطالعہ کرتے ہیں اور بقدر فہم احکام شریعت کا استنباط کر لیتے ہیں اور اسی لیے ان کے فتاویٰ میں اختلاف ہوتا ہے اور ان کے مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن امام احکام واقعیہ کا مبلّغ ہوتا ہے وہ آغوش مادر سے لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے احکام میں تعدّد اور اختلاف و تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے کہ نہ ایک مسئلہ میں مختلف واقعی احکام ہوں گے اور نہ ایک مسئلہ میں ائمہ طاہرین کے مختلف احکام ہوں گے۔

ائمہ طاہرینؑ سب محافظ شریعت تھے اور سب نے اپنے فرض کو بخوبی انجام دیا ہے۔

لیکن محافظت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) محافظت داخلی (۲) محافظت خارجی

محافظت داخلی ــــ جہاں احکام واقعیہ کو ذہن میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور وقتاً فوقتاً ان کی تبلیغ کی جاتی ہے جہاں امت میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور واقع سے انحراف کا امکان پیدا ہوا امامؑ نے حکم واقعی بیان کر کے شریعت الٰہی کا تحفظ کر لیا۔

محافظت خارجی ــــ جہاں واقعی احکام دنیا تک پہونچ جانے کے بعد خطرات سے دوچار ہو جائیں اور ان میں تبدیلی کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ ایسے موقع پر بھی امام کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کی زحمت و مشقت کا مقابلہ کر کے حکم واقعی کا تحفظ کرے اور اسے ہر طرح کی تبدیلی سے بچائے۔

اس محاذ پر جو خدمت امام حسینؑ نے انجام دی ہے اس کی مثال تاریخ ائمہؑ میں بھی نہیں ملتی ہے نہ اس لیے کہ ائمہ معصومین میں باہمی کمالات میں تفاوت تھا اور کوئی امام، امام حسینؑ کے مرتبہ کا نہیں تھا۔ بلکہ اس لیے کہ جو حالات و خطرات امام حسینؑ کے دور میں پیدا ہو گئے تھے

وہ حالات و خطرات کسی اور دَور میں نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اور جو موقع تحفظ شریعت کا امام حسینؑ کو ملا تھا وہ کسی امامؑ کو حاصل نہیں ہوا تھا۔

احکام و تعلیمات کے اعتبار سے اس کی مثال امام جعفر صادقؑ کی حیات میں ملتی ہے کہ جس قدر بیان احکام اور تبلیغ قوانین کا موقع آپ کو ملا کسی دوسرے امام کو نہیں ملا اور اسی لیے ساری فقہ اہلبیتؑ کا نام فقہ جعفری ہو گیا کہ آپ کے بیان کردہ احکام سارے معصومینؑ کے بیان کردہ احکام سے زیادہ ہیں اور شریعت اہلبیتؑ پر آپ کے بیانات کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

خطرات و آفات کی منزل میں یہی حیثیت امام حسینؑ کی ہے کہ آپ نے دین الٰہی کو ان خطرات سے بچایا ہے جن کی مثال کسی معصوم کے دور میں نہیں تھی اسی لیے صاحبان فکر و نظر نے حقیقت اسلام کا تعارف کراتے ہوئے یہ لفظ استعمال کیا ہے کہ "اسلام محمدی الحدوث ہے اور حسینی البقاء" اسلام آغاز کے اعتبار سے محمدیؐ ہے کہ اس کے تعلیمات وحی الٰہی کے ذریعہ سرکار دو عالمؐ پر نازل ہوئے ہیں اور بقا کے اعتبار سے حسینی ہے کہ اس کے سارے قوانین کو کفر و الحاد، بے دینی و عیاری، اموریت و یزیدیت کے خطرات سے امام حسینؑ نے بچایا ہے۔

امام حسینؑ ہر اعتبار سے محافظ شریعت ہیں اس لیے صاحب شریعت کی حکیمانہ ذمہ داری تھی کہ وہ بقاء حسینیت کا انتظام کرے جو بقاء شریعت کی علامت بھی ہے اور ضمانت بھی۔ اسی لیے شریعت اسلام نے حسینیت کو ہر اعتبار سے زندہ و پائندہ بنایا ہے۔ امام حسینؑ کی محبت کو فریضۂ اسلامی بنایا ہے۔ ان کے تذکرے کو عبادت بنایا ہے۔ ان کے غم میں آنسو بہانا ان کی یاد میں محو رہنا، ان کے مصائب کی یاد میں مراسم عزا کا قائم کرنا ان سارے اعمال کو بندگی پروردگار اور اطاعت الٰہی کا درجہ دیا ہے، یہاں تک کہ اشک افشانی کے ساتھ ساتھ تباکی کی دعوت اور اس کے مظاہرہ کو بھی وسیلہ نجات قرار دے دیا ہے۔ محافظ شریعت معصوم نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ امام حسینؑ پر رونا، رُلانا اور رونے والوں کی صورت بنانا سب وسیلہ جنت اور عبادت الٰہی ہے اگرچہ بعض نافہم افراد نے اس قسم کے مضامین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ صورت بنانا ریاکاری ہے اور ریاکاری اسلام میں حرام ہے اور فعل حرام کسی صورت سے عبادت نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن ان بیچاروں کو یہ خبر نہیں ہے کہ تباکی اس

شدت تاثر کا نام ہے جس کا اظہار چہرے کے خطوط اور شکل و صورت کے کیفیات سے ہو جاتا ہے، چاہے مختلف اسباب کے تحت آنسو نہ نکل سکیں۔ گویا معصوم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بنیادی کام آنسو بہانا اور آنسو بہانے کی دعوت دینا ہے لیکن مسئلۂ غم انھیں حدود تک محدود نہیں ہے اور آنسو بذات خود موضوع کلام نہیں ہیں۔ آنسو ایک طریقہ ہے اس جذبۂ قلبی کے اظہار کا جو ہر صاحب ایمان کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر آنسو نہ نکل سکیں تو اس جذبۂ محبت کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ہونا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دل میں محبت پائی جاتی ہے اور انسان ذکر مصائب یا تصور آلام سے متاثر ہے۔

اسلامی روایات میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ صاحب کنز العمال ج ۱ ص ۱۴۷، مرسل اعظمؐ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ نے سورہ زمر کی آخری آیات کی تلاوت کی جس میں عذاب جہنم کا تذکرہ ہے تو انصار کی ساری جماعت نے گریہ شروع کر دیا۔ صرف ایک نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے۔ اس نے پریشان ہو کر عرض کی، سرکار! میری آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے "وانی تباکیت" میں صرف تباکی پر اکتفا کر رہا ہوں۔ فرمایا: من تباکیٰ فلہ الجنۃ" جو رونے والے کی صورت اختیار کرے اس کے لیے بھی جنت ہے ــــ جو اس بات کی علامت ہے کہ انسان کا دل اس عذاب سے متاثر ہے ورنہ بے دین افراد کی طرح عذاب آخرت کا مذاق اڑاتا؛ اس کے تذکرہ پر تبسم کا مظاہرہ کرتا، گریہ کن صورت حال اختیار نہ کرتا۔ یہ صورت حال تاثر قلبی کی علامت ہے اور تاثر قلبی بہترین عبادت ہے۔

دوسری روایت کنز العمال ہی میں وارد ہوئی ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے سورۂ تکاثر کی تلاوت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو اس سورہ کو سن کر بکا کرے گا اس کے لیے بھی جنت ہے اور جو تباکی کرے گا اس کے لیے بھی جنّت ہے۔

کتاب اللؤلؤ والمرجان ص ۴۷، اور مجموعہ ورام ص ۲۷۲ پر جناب ابوذر سے روایت ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص رو سکتا ہے تو روئے ورنہ حزن و رنج کو دل کا شعار بنائے اور تباکی کرے کہ سنگدل رحمت الٰہی سے بعید ہوتا ہے۔

اس روایت میں واضح طور پر تباکی کی دعوت بھی موجود ہے اور اس کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے لہذا نہ انسان تباکی کی روایت کو رد کر سکتا ہے اور نہ اسے ریا کاری قرار دے سکتا ہے۔ شیخ محمد عبدہٗ کا قول تفسیر المنار ج ۸ ص ۳۰۱ میں نقل کیا گیا ہے کہ تباکی تکلف البکا ہے ریا نہیں ہے۔

علامہ شریف جرجانی نے فرمایا ہے کہ باب تفاعل عام طور سے صفت غیر موجود کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے جائز قرار دیا ہے کہ اس سے تحصیل صفت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جیسا کہ سرکار دو عالمؐ کے ارشادات میں ہے کہ بکا ممکن نہ ہو تو تباکی کرو۔ (تعریفات ص ۴۸)

بکا اور تباکی کی یہی اہمیت تھی جس کے تحت امام محمد باقرؑ نے آٹھ سو درہم معین کیے تھے ان عورتوں کے لیے جو موسم حج میں منیٰ کے میدان میں آپ کے مصائب پر گریہ کریں جس سے تین باتوں کا اندازہ ہوتا ہے:

۱۔ گریہ کا اہتمام کرنا اور اس پر پیسہ خرچ کرنا خلاف شریعت نہیں ہے۔

۲۔ ایام حج اور میدان منیٰ میں گریہ کرنا منافی حج و مناسک و اعمال حج نہیں ہے۔

۳۔ گریہ کا اہتمام ایک اہم دینی افادیت رکھتا ہے کہ اس طرح مظالم و مصائب دونوں کا اعلان ہوتا ہے اور میدانِ منیٰ اس کے لیے بہترین میدان ہے کہ وہاں حجاج کرام فرصت سے تین دن قیام کرتے ہیں اور راتوں کو ان کے پاس کوئی عمل نہیں ہوتا ہے۔

اس روایت سے یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسلام میں عورت کی آواز کو نامحرم نہیں قرار دیا گیا ہے ورنہ امام باقر علیہ السلام عورتوں کے میدان منیٰ میں رونے کی دعوت نہ دیتے اور سرکار دو عالمؐ جناب حمزہ کے غم میں مدینہ کی عورتوں کو رونے کی دعوت نہ دیتے۔

عورت کے لیے اپنی آواز نامحرم کو سنانا اور اس میں لگاوٹ پیدا کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے لیکن آواز گریہ میں یہ بات ہرگز نہیں ہوتی ہے البتہ کوئی عورت انفرادی طور پر اپنی آواز سنانے کا جذبہ رکھتی ہے یا غیر مخلصانہ عمل انجام دیتی ہے تو اس کا عمل حرام ہوگا لیکن اس سے اصل قانون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

فقہ اہلسنت میں بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ عورت کی آواز نامحرم نہیں ہے

اس لیے کہ ان کے یہاں تو دو تہائی دین خاتون ہی کی آواز میں پہونچا ہے اور صحابۂ کرام برابر خواتین سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔

فقہی اعتبار سے گریہ و بکا محبوب ـــ اور امام حسینؑ کی قربانیوں کے پیش نظر ایک امر مطلوب ہے جس کا اہتمام ہر صاحب ایمان کو کرنا چاہیے۔ قابل افسوس ان افراد کا کردار ہے جو گریہ کو عبادت، غرض خلقت، تقاضائے محبت قرار دینے کے باوجود ایک آنسو بہانے کی توفیق حاصل نہیں کرتے اور ذکر مصائب پر ان کی آنکھیں اس جذبۂ محبت کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ رب کریم جملہ صاحبان ایمان کو قول و عمل میں مطابقت اور نیت میں اخلاص کی توفیق کرامت فرمائے۔!

پس منظر

اُن ضمیر فروش اور یتیم العقل اہلِ قلم کے علی الرغم جنھوں نے واقعۂ کربلا کو ایک اچانک حادثہ کی شکل میں پیش کرنا چاہا ہے اور امت اسلامیہ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ "حر سے ملاقات کے بعد امام حسینؑ نے اس بات پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا کہ میں ابن زیاد کے پاس حاضری نہیں دوں گا۔ بلکہ جب یزید ہی کی بیعت کرنا ہے تو شام جا کر براہ راست اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا اور اس بنا پر آپ نے کوفہ کا ارادہ تبدیل کر کے شام کا رُخ کر لیا تھا اور یزید سے ملاقات کرنے کے خواہش مند تھے کہ اچانک ابن زیاد کے حکم پر سرزمین کربلا پر دوبارہ قافلہ کو روک دیا گیا اور اسے روکنے میں مزاحمت ہو گئی اور بالآخر امام حسینؑ اپنے ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے"۔

اس بے عقل اور بے دین تاریخ نویس کو اس قدر بھی شعور نہیں ہے کہ شام جانے والے کا راستہ کیا ہوگا اور وہ کوفہ کا راستہ چھوڑ کر کس رُخ سے شام کا ارادہ کرے گا۔ اور جس نے مدینہ میں واضح لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ مجھ جیسا انسان یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا ہے، وہ یکبارگی اپنا ارادہ کو کس طرح تبدیل کر سکتا ہے اور اس کے ذہن پر موت کا خوف کس طرح طاری ہو سکتا ہے جب کہ اس نے بارہا اعلان کیا ہے کہ مجھے میرے نانا نے خبر دی ہے کہ مشیتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں قربانی دوں اور میرے اہلِ حرم اسیر ہوں تاکہ نانا کے دین کو بقا اور استحکام کا سہارا ملے۔

حقیقت امر تو یہ ہے کہ واقعۂ کربلا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے اور کربلا تاریخ کے تسلسل کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد آلِ رسولؐ اور دین اسلام کو فنا کر دینا تھا۔ اور جس کے لیے ایک عرصۂ دراز سے منصوبہ بندی ہو رہی تھی۔

سوال صرف یہ ہے کہ اس طرح کی منصوبہ بندی کے لیے کس قدر اہتمام کی ضرورت تھی اور اتنے بڑے اقدام کے لیے کتنے بڑے آدمی کی ضرورت تھی، اور کیا یزید میں یہ ساری

صلاحیتیں پائی جاتی تھیں کہ وہ امام حسینؑ جیسے مدبر اور مفکر انسان کا مقابلہ کرے اور ساری امت کو اپنا ہم خیال بنا کر امام حسینؑ کے سارے گھرانے کو ایک دوپہر میں تہ تیغ کرا دے یا یزید کا کاروبار ایک تاریخی سلسلہ کی آخری کڑی تھا جس کے لیے ایک مدت سے ذہن تیار کیے جا رہے تھے اور مزاجوں کو نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا اور ہر آن اس لمحہ کا انتظار کیا جا رہا تھا جب طے شدہ مقدمات کا نتیجہ حاصل کیا جائے اور وہ آخری اقدام کیا جائے جس کی تیاری تقریباً نصف صدی سے کی جا رہی تھی۔

تاریخ اسلام میں وہ مناظر اور وہ عوامل و محرکات محفوظ ہیں جنھوں نے مسلمان ذہنیت کو مسخ کر دیا تھا اور امت کو اس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا جہاں غیرت اسلامی اور شرافت انسانی صرف الفاظ کی شکل میں باقی رہ جائے اور اس کی کوئی معنویت نہ رہ جائے۔ تفصیلی تذکرہ کے لیے اوراق اور صفحات نہیں بلکہ کتب اور مؤلفات درکار ہیں۔ اجمالی طور پر کربلا میں پیش آنے والے واقعات کے پس منظر میں صرف اُن واقعات کی نشان دہی کرائی جائے گی جنھوں نے امت کے مزاج کو درہم برہم کیا تھا اور غیرت اسلامی کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا اور جس کے بعد کوئی شخص بھی بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے ایک قدم آگے بڑھ جائے تو امت اس کا ساتھ بھی دے سکتی تھی اور اس کے مظالم کو خندہ پیشانی سے برداشت بھی کر سکتی تھی۔ مثال کے طور پر چند نمونہ ملاحظہ ہوں:

۱۔ یزیدی شرارت اور شیطنیت کا سب سے بڑا نمونہ یہ تھا کہ اس نے بھرے دربار میں بکمال بے حیائی یہ اعلان کر دیا کہ اسلام صرف بنی ہاشم کا کھیل ہے اور نہ کوئی خبر آئی ہے اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قدر مجرمانہ خیال کو پیش کرنے کے بعد یزید کو زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا اور رسول اکرمؐ کے کلمہ گو افراد کو اسے تہ تیغ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا، اور قوم نے نہایت آسانی سے اس اعلان کو سن لیا اور اس کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہو سکا جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قوم اس طرح کے گستاخ فقرات کی عادی ہو چکی تھی اور اس کی نظر میں اس طرح کے اعلانات میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ قوم یہ سوچ رہی تھی کہ یزید تو رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد مدینہ سے سیکڑوں میل دور اپنے دربار میں اس طرح

کا اعلان کر رہا ہے ۔ یزید کے پہلے کے با اقتدار مسلمانوں نے تو خود سرکارِ دو عالمؐ کی زندگی میں
ان کے سامنے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ شخص ہذیان بک رہا ہے اور اس پر مرض کا غلبہ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے
کہ جب رسول اکرمؐ کی محفل میں اتنی بڑی گستاخی کی جا سکتی ہے تو رسول اکرمؐ کے بعد کیوں نہیں
کی جا سکتی ہے اور جب ہذیان کے الزام کو برداشت کیا جا سکتا ہے تو " فلا خبر جاء ولا وحیٌ
نزل" کو کیوں نہیں برداشت کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ یزید کے مظالم کی ایک عظیم بنیاد یہ بھی تھی کہ اسے پورے عالم اسلام کا اقتدار
حاصل ہو گیا تھا اور وہ اسلامی سرزمین کے ۱۲½ لاکھ مربع میل پر حکومت کر رہا تھا۔ ظاہر ہے
کہ اس کے پاس اس قدر وسیع اختیار اور طویل و عریض اقتدار نہ ہوتا تو وہ اتنے بڑے اقدام
کا ارادہ بھی نہ کرتا۔ لیکن یہ اقتدار و اختیار یزید کی ذاتی صلاحیت یا اس کے حسن تدبیر کا نتیجہ
نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں بھی وہ نظام کام کر رہا تھا جس نے یزید جیسے افراد کی حکومت کے
لیے زمین ہموار کی اور پھر اس کے نتیجے میں اتنا بڑا واقعہ منظرِ عام پر آ گیا۔
رسولِ اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد اور آپ کے جسدِ اقدس کے دفن سے پہلے مسلمانوں میں
اقتدار کی جو رسہ کشی شروع ہوئی اور انصار و مہاجرین نے جس طرح اسلامی حکومت کا فیصلہ کیا اور
جن بنیادوں پر اقتدار پر قبضہ کیا گیا۔ ان کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہوا۔ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں
قرآن و سنت کو نظر انداز کر دیا گیا اور رسول اکرمؐ کے مقرر کردہ حاکم کو ناقابلِ توجہ قرار
دے دیا گیا اور اقتدارِ اسلامی کا سنگِ بنیاد ملک، قوم، قبیلہ اور قرابت پر رکھ دیا گیا تو اس کا
فطری نتیجہ تھا کہ تمام اسلامی صلاحیتوں سے عاری اور تمام شریفانہ اصولِ کردار سے بے خبر
افرادِ امت کی تقدیر کے مالک ہو جائیں اور ابوسفیان جیسے انسان کو اپنے چشم و چراغِ خاندان
سے یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ اب خلافت کو گیند کی طرح نچاؤ اور بنی امیہ کو کلیدی عہدوں کا مالک
بنا دو اور یاد رکھو کہ دنیا، دنیا ہے اور اقتدار، اقتدار۔ اس کے بعد نہ کوئی جنت ہے اور نہ جہنم۔
سقیفہ کا پہلا نتیجہ ابوسفیان کے اس اعلان کی شکل میں برآمد ہوا، اور دوسرا نتیجہ یزید کے
اقتدار اور اس کے مظالم کی شکل میں برآمد ہوا جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ :

"حسینؑ اندر سقیفہ کشتہ شد"

۳۔ یزید کے ساتھ اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں بے شمار نمازی، روزہ دار اور
حافظانِ قرآن بھی شامل تھے جو مسلسل آیاتِ قرآن کی تلاوت کرتے جاتے تھے اور قتلِ حسینؑ کے
لیے خنجر تیز کرتے جاتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قرآن نے مسلسل حسینؑ کی عظمت، صداقت،
طہارت، مودت کا اعلان کیا ہے اس کے پڑھنے والے اور حفظ کرنے والے کس طرح قتلِ حسینؑ
پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے امام حسینؑ کے حقوق کا لحاظ کیوں نہیں کیا؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ
یہ بھی ایک تاریخی حادثہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اگر رسول اکرمؐ کے وقت آخر قرآن لے کر اہلبیتؑ کو نظر انداز
کرنے کی بنیاد نہ رکھی گئی ہوتی اور رسول اکرمؐ کے سامنے حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ نہ لگایا گیا ہوتا
تو یزیدیوں میں اس انداز کے کردار کی جرأت نہ ہوتی اور انھیں بہرحال یہ احساس ہوتا کہ اہلبیتؑ
کو نظر انداز کر کے اور ان کے قتل کا منصوبہ بنا کر قرآن سے تمسک کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔
رسول اکرمؐ کو اس نتیجہ کی اطلاع تھی اور آپ حالیہ واقعات کے آئینہ میں بخوبی مستقبل کا مشاہدہ فرما رہے
تھے اسی لیے آپ نے اس نعرہ کی شدت سے مخالفت کی اور ایسے افراد کو محفل سے نکال باہر
کر دیا جنھوں نے ایسے مظالم کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اور ایسے نظریات کا حوالہ دیا تھا جس کا نتیجہ
اتنے بڑے ظلم کی شکل میں برآمد ہونے والا تھا۔

۴۔ یزید کی حکومت کے جواز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عالم اسلام نے اس کے ہاتھ
پر بیعت کر لی تھی لہٰذا اس کی حکومت ایک جائز اسلامی حکومت تھی اگرچہ اس بیعت کی صحیح صورتحال
یہی تھی کہ امام حسینؑ کے بیعت سے انکار کرنے کی بنا پر ان کے سارے گھرانے کا خاتمہ کر دیا
گیا اور یہ بات واضح کر دی گئی کہ مسلمان حاکم کو عوام کی بیعت سے سروکار ہے چاہے وہ بیعت
اختیاری اور رضامندی سے ہو یا مکمل جبر و اکراہ کے نتیجہ میں ہو۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس قسم کی بیعت کو کس طرح گوارا کیا اور ایسے
بیعت لینے والے کو کس طرح حاکم تصور کر لیا؟ ـــ اس کا جواب بھی ماضی کے اوراقِ پریشاں میں
محفوظ ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد جب امت اسلامیہ نے حکومت کا فیصلہ کر لیا تو پہلا
خیال یہ پیدا ہوا کہ لوگوں سے اس حکومت کی بیعت لی جائے اس لیے کہ جس حکومت کی بنیاد
قرآن و سنت کی نص اور خدا و رسولؐ کے ارشادات پر نہ ہو اس کا جواز عوامی رائے ہی سے

حاصل کیا جا سکتا ہے اور عوامی رائے حاصل کرنے کے لیے جبر و تشدد ہی استعمال کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ عوام اکثر اوقات جبر و اکراہ کے بغیر اتفاق رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ چنانچہ اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ عوام کے ساتھ خواص اور امت کے ساتھ اہلبیتؑ کے ساتھ بھی ایک ہی طرح کا برتاؤ کیا گیا اور ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کر دیا گیا اور انکار کی صورت میں گھر میں آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی اور بعض روایات کی بنا پر دروازے سے بلند ہوتا ہوا دھواں بھی دکھائی دیا، تو ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں اس طرح کی بیعت کو حکومت کا جواز نہ سمجھا گیا ہوتا اور اس شدت سے بیعت کا مطالبہ نہ کیا گیا ہوتا اور انکار کی صورت میں آگ لگانے کی بات نہ کہی گئی ہوتی تو نہ یزید خلیفۃ المسلمین ہوتا، نہ اسے امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے کی ہمت ہوتی اور نہ انکار کی صورت میں خیام حسینی میں آگ لگانے کا حکم دیا جاتا۔ یہ سب انھیں ابتدائی حالات کے نتائج تھے جنھیں کربلا کے قریب ترین مقدمات میں شمار کیا جا سکتا ہے اور جن کی بنا پر کربلا ایک وقتی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی تسلسل کا نتیجہ ہے جس کے مقدمات و مقومات میں بڑے بڑے واقعات اور بڑے بڑے افراد کے نام آتے ہیں۔

۵۔ یزید نے امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لیے جن وسائل کو اختیار کیا ان کی آخری کڑی یہ سامنے آئی کہ اگر وہ بیعت نہ کریں تو انھیں بے آب و گیاہ صحرا میں محصور کیا جائے اور ان کے بچوں پر پانی بند کر دیا جائے اگرچہ اس سلسلے میں مظلومیت عثمان کا سہارا لیا گیا تھا جس کا امام حسینؑ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ صرف ایک بہانہ اور عوام کو ورغلانے کا ایک ذریعہ تھا ورنہ امام حسینؑ نے تو اس محاصرہ کے دوران بھی انتہائی کمال کردار کا مظاہرہ کیا تھا جو ایسے بپھرے ہوئے مجمع کے مقابلہ میں کوئی اپنے عزیز ترین آدمی کے بارے میں بھی اختیار نہیں کر سکتا جیسا کہ تاریخ خود گواہی دیتی ہے کہ شام کی فوجیں شہر سے باہر رکی رہیں اور واقعہ کے واقع ہو جانے تک کسی دفاعی اقدام کے لیے تیار نہ ہوئیں۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت منوانے اور بیعت حاصل کرنے کا یہ کون سا طریقہ تھا۔ بیعت تو ایک رضامندی کا سودا ہے جو انسان ہنسی خوشی کسی کی اطاعت اور فرماں برداری کے لیے اختیار کرتا ہے اس کے لیے کھانا پانی بند کرنے کی ضرورت نہیں

ہوتی ہے اور ایسے اقدام میں اسلامی مزاج کو یقیناً برہم ہو جانا چاہیے تھا اور یزید کے خلاف انقلاب کی ایک لہر دوڑ جانا چاہیے تھی جو کام شہادت امام حسینؑ سے پہلے نہ ہو سکا ــــ اور شہادت امامؑ ہی نے اس تحریک کو پیدا کیا اور ملت کے سرد لہو میں حرارت کی لہر دوڑا دی۔

اس کا راز بھی بظاہر ماضی کی تاریخ ہی میں پایا جاتا ہے جب مولائے کائنات سے بیعت لینے کے لیے اقتصادی محاصرہ کو ذریعہ بنایا گیا تھا اور حق ذوی القربیٰ کے ساقط کرنے سے فدک پر قبضہ کر لینے تک کسی وسیلہ سے دریغ نہیں کیا گیا اور امت کو محسوس کرا دیا گیا کہ حکومت وقت سے اختلاف کرنے کے نتیجہ میں اقتصادی محاصرہ کوئی عیب اور غیر اسلامی اقدام نہیں ہے بلکہ مخالف کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ بھی کیا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کو بھی اس طرح کے اقدام کی جرأت ہو گئی اور امت اسلامیہ کا احساس بیدار نہ ہو سکا۔

تاریخ میں ایک قدم پیچھے چلے جائیے تو یہی برتاؤ خود رسول اکرمؐ کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔ جب آپ نے قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ کی آواز بلند کی اور کسی قیمت پر کفر سے ہم خیال اور ہم آواز ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے تو کفار مکہ نے آپ کا معاشی بائیکاٹ کر دیا اور آپ کو اپنے گھر والوں سمیت تین سال تک نہایت پریشانی کی زندگی گزارنا پڑی اور درختوں کے پتوں تک پر گزارا کرنا پڑا۔

کفر کا یہی اقدام نظیر بن کر اسلام میں داخل ہوا اور مسلمانوں نے بھی اپنے مخالفین کے ساتھ یہی برتاؤ روا رکھا اور ظاہر ہے کہ جب سرکار دو عالمؐ کی تربیت کردہ قوم میں ایسے عناصر پیدا ہو سکتے ہیں تو یزید کو تو یہ شرف بھی حاصل نہ تھا اور وہ ایک طرف سے ابوسفیان کا پوتا اور معاویہ کا بیٹا تھا تو دوسری طرف سے عیسائی گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور ایسے شخص سے اسلام کے بارے میں ایسی ہی توقعات کی جا سکتی ہیں جن کا مظاہرہ اس کے کردار سے ہوا، اور جس کے ذریعہ اس نے قدیم تاریخ کے بہت سے ورق اُلٹ دیے اور تاریخ کو پھر سے دُہرا دیا۔

۶۔ یزید نے امام حسینؑ سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک یہ حربہ بھی اختیار کیا کہ اسلامی حکومت کے تمام اہم عہدے اپنے خاندان والوں کے حوالے کر دیے اور کسی حاکم نے بھی اہلبیتؑ کے ساتھ قدرے نرم رویہ کا تصور بھی کیا تو اسے فوراً برخاست کر دیا گیا اور اس کی

جگہ دوسرے نفظ غلیظ کا تقرر کردیا گیا اور یہ سبق بھی اس نے اپنی خاندانی تاریخ سے سیکھا تھا جب خلافت سوم کے آغاز پر اس کے دادا ابوسفیان نے حاکم وقت کو مبارکباد دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ حکومت کے مرکزی عہدے بنی امیہ کے حوالے کردو اور خلافت کو گیند کی طرح نچاؤ اس لیے کہ جنّت و جہنّم کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور حاکم نے بھی نہایت سعادت مندی سے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور تمام اہم عہدوں پر خصوصیت کے ساتھ ان علاقوں میں جن میں اہلبیتؑ کے ماننے والے پیدا ہوسکتے تھے بدترین عمال اور گورنر مقرر کردیے۔ کوفہ پر سعید بن العاص کو مقرر کیا جس کا کردار عالم آشکار ہے۔ مصر پر عبداللہ بن عامر کو مقرر کیا جو حاکم وقت کا ماموں زاد بھائی تھا اور اہم مرکزی مقامات پر ولید بن عقبہ فاسق اور عبداللہ بن سعد کو گورنر بنایا جن میں اوّل الذکر ایسا بے دین تھا کہ صبح کی نماز چار رکعت پڑھانے کے بعد بھی مجمع سے پوچھ رہا تھا کہ کہو تو کچھ اور اضافہ کردیا جائے اور ثانی الذکر خلیفۂ وقت کا رضاعی بھائی تھا۔ اس کے بعد اپنے افراد خاندان کو دولت اور جاگیر بخشنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا حساب لاکھوں بلکہ کروڑوں سے گزر گیا۔

ظاہر ہے کہ جب رسول اکرمؐ سے نسبتاً قریب ترین زمانہ میں اور رسول اکرمؐ سے رشتہ داری رکھنے کے بعد انسان اپنے بزرگ خاندان کے مشورہ پر ایسا عمل کرسکتا ہے تو یزید تو ان خصوصیات کا حامل نہ تھا اور اس کے لیے ابوسفیان حقیقی دادا کی حیثیت رکھتا تھا اسے تو اس وصیت و نصیحت کا خاص خیال رکھنا چاہیے تھا اور اسی طرح کے کردار کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔

اور یہ نتیجہ اُس کج روی کا ہے جو عالم اسلام میں پیدا ہوگئی تھی اور جس کی بنا پر یزید جیسے بدکردار انسان کو حکومت کا موقع مل گیا تھا اور پھر حکومت کو سنبھالنے کے لیے ہر وسیلہ اور ہر ذریعہ مباح ہوگیا تھا۔

اس کے علاوہ تاریخ میں اور بہت سی کڑیاں پائی جاتی ہیں جن کو مرتب کرلیا جائے تو تاریخی مادیت کے اعتبار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کے بعد امت اسلامیہ نے جو روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ لازمی طور پر ایسا ہی برآمد ہونا چاہیے تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مسئولیت اور ذمہ داری کے اعتبار سے ہر وہ شخص روز قیامت مسئول ہوگا جس نے حالات کو اس ابتری تک

پہونچانے میں کسی طرح کا بھی رول ادا کیا تھا اور جس کی کسی بھی انفرادی یا اجتماعی حرکت سے حالات اس قدر افسوسناک اور ناگفتہ بہ ہوگئے تھے اور ملت اسلامیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی حقیقی قیادت اور واقعی دیانت سے محروم ہوگئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کربلا کے حصۂ مظالم کا مسودہ منتشر اوراق میں بہت دنوں سے جمع ہورہا تھا اور ظلم اس موقع کی تلاش میں تھا جب ان اوراق پریشاں کو مرتب کرکے ایک پورے صحیفہ ظلم کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کردے جس طرح کہ حصہ مظلومیت و کردار بھی امام حسینؑ کے بزرگوں اور افراد خاندان کی زندگی میں منتشر تھا اور امام حسینؑ نے پورے کردار کو مرتب کرکے ایک وقت میں پیش کردیا اور بیک وقت تمام انبیاء کے کارناموں کا مظہر بن گئے بلکہ اس سے بھی بالاتر۔

از ہیچ پیمبرے نہ آید ایں کار
واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

منظر کربلا

عاشور کی رات تمام ہو رہی ہے، سپیدۂ سحری نمودار ہو رہا ہے اور امام حسینؑ اپنے قدیم مؤذن حجاج بن مسروق کو روک کر اپنے فرزند علی اکبرؑ کو حکم اذان دے رہے ہیں کہ امام حسینؑ کے پاس کلمہ گو منافقین کے مقابلہ میں علی اکبرؑ سے بہتر اتمام حجت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

علی اکبرؑ صورت میں، سیرت میں، رفتار میں، گفتار میں رسول اکرمؐ کی شبیہ ہیں، اور دشمن کو معلوم ہے کہ شبیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے اصل سے عداوت کا اظہار ہوتا ہے۔

علی اکبرؑ نے اذان کہی اور یہ آواز ساری فضائے کربلا میں گونج گئی۔ امام حسینؑ اپنے باوفا اصحاب کے ساتھ نماز صبح کے لیے تیار ہوئے۔ پانی موجود نہیں ہے کہ تجدید وضو کرتے۔ خاکِ گرمِ کربلا پر تیمم کر کے اصحاب صف بستہ ہو گئے اور امام حسینؑ نے نماز شروع کر دی۔

ساری رات عبادت الٰہی، تلاوت، ذکر و فکر اور رکوع و سجود میں گذارنے والی قوم اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آمادہ ہو گئی اور زندگی کی آخری قدرے پرسکون نماز ادا کرنے کے لیے خاک کے مصلیٰ پر استادہ ہو گئی۔

نماز تمام ہوئی تھی کہ فضائے کربلا میں ایک آواز گونجی ـــ قوم والو! گواہ رہنا۔! خیام حسینی کی طرف پہلا تیر میں نے رہا کیا ہے ـــ یہ تھا سردار لشکر ابن سعد جو اپنی ریاست و سرداری کے تحفظ کے لیے اور ملک رَے کی گورنری کو بچانے کے لیے فرزند رسولؐ کے خلاف جنگ چھیڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔ اور چند روزہ دنیا کے عوض ہمیشہ رہنے والی آخرت کو بیچ رہا تھا۔

ابن سعد کا آواز دینا تھا کہ تیروں کی بوچھار شروع ہو گئی اور لشکر یزید کے چار ہزار

کمان داروں نے سردار کے اتباع میں تیروں کا مینھ برسانا شروع کر دیا۔

اُدھر امام حسینؑ نے بھی اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ تیر نہیں ہیں۔ یہ موت کے سفیر ہیں لہٰذا اب مقابلہ کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔ اصحاب نے مورچہ سنبھال لیے مگر یہ آمنے سامنے کی جنگ اور افراد کی باہمی نبرد آزمائی نہیں تھی کہ جنگ کا مظاہرہ ہوتا اور مجاہدین کی شجاعت کے جوہر کھلتے۔ یہ دشمن کا انتہائی بزدلانہ حملہ تھا جس کے مقابلہ کے اسباب اصحاب امام حسینؑ کے پاس ناپید تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیر باراں کے خاتمہ پر امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کا جائزہ لیا تو چالیس سے پچاس تک اصحاب و انصار راہِ خدا میں کام آ چکے تھے جن کے اسمار گرامی بعض ارباب مقاتل کے بیان کے مطابق یہ ہیں:

نُعیم بن عجلان، عمران بن کعب بن حارث، حنظلہ بن عمرو شیبانی، قاسط بن زہیر، کنانہ بن عمرو بن ضُبیعہ، ضرغامہ بن مالک، عامر بن مسلم، سیف بن مالک، عبدالرحمان الارجی، عائذ بن مجمّع العائذی، حباب بن الحارث، عمرو الجُندعی، مُحلاس بن عمرو راسبی، سوّار بن ابی عمیر، عمار بن ابی سلامہ، نعمان بن عمرو، زاہر مولی، عمرو بن عبداللہ جَندَ بن علی، مسعود بن الحجاج، عبداللہ بن عروہ الغفاری، زہیر بن سلیم، عبداللہ بن یزید بصری، عبیداللہ بن یزید بصری، دس غلامان امام حسینؑ، اور دو غلامان امیرالمومنینؑ ــــــــ (مناقب)

ظاہر ہے کہ اصحاب کی اتنی بڑی تعداد کے شہید ہو جانے کے بعد لشکر امام حسینؑ میں ایک نمایاں کمی ہو گئی اور امام حسینؑ کو پہلے ہی مرحلہ میں اتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا جس کا تحمل مشکل تھا۔ لیکن مشکل کشا کے لال کے لیے کوئی امر مشکل نہیں ہے۔ امام حسینؑ کے حوصلے بلند ہیں اور اصحاب کے حوصلے امام کے طفیل میں بلند ہیں اور سب قربانی کے لیے ہمہ تن تیار ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد جب باضابطہ جنگ کا آغاز ہوا تو باقی ماندہ اصحاب مکمل حوصلہ کے ساتھ دادِ شجاعت دینے کے لیے تیار ہو گئے اور ایک کے بعد ایک راہِ خدا میں جان قربان کرنے لگا۔

سب سے پہلے عبداللہ بن عمیر کلبی میدان میں آئے اور ایک عظیم جہاد کے بعد راہِ خدا میں قربان ہو گئے، عبداللہ کے بعد سیف بن حارث بن سریع جابری اور مالک بن عبد بن سریع

جابری میدان میں آئے اور دونوں نے جہاد کا حق ادا کیا۔

ان دونوں کے بعد بنی غفار کے دو مجاہدین نے میدان میں قدم رکھا۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن (فرزندانِ عروہ غفاری) ان دونوں حضرات کے راہِ خدا میں کام آجانے کے بعد چار افراد نے میدان کا رُخ کیا عمرو بن خالد صیداوی، سعد، جابر بن حارث السلمانی اور مُجمع اور سب نے داد وفا دے کر جام شہادت نوش کیا۔ اور آخر میں مسلم بن عوسجہ نے میدان کا رُخ کیا اور ایسی جنگ کی کہ دشمنوں کے حوصلے پست کر دیے اور چلتے چلتے حبیب بن مظاہر کو وصیت کر گئے کہ جب تک زندہ رہنا امام مظلوم کا خیال رکھنا۔

اصحاب کی اس بے مثال قربانی کے بعد ظہر کا ہنگام آگیا اور امام حسینؑ نے حبیب بن مظاہر کو جنگ بندی کا پیغام دے کر بھیجا۔ جس کا جواب بدترین انداز سے دیا گیا اور امام حسینؑ نے مکمل دفاعی انتظام کے ساتھ نماز شروع کر دی۔ زہیر بن قین اور سعید امامؑ کے سینہ سپر ہو گئے اور نماز تمام ہوتے ہوتے سعید نے خاک پر گر کر آواز دی، فرزند رسولؐ! کیا میں نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ اور امام حسینؑ نے سند وفا دے کر دنیا سے رخصت کر دیا۔

اس کے بعد جنگ کا دوسرا سلسلہ شروع ہوا، اور ادھر سے حبیب بن مظاہر اور ابو ثمامہ میدان میں آئے اور دادِ شجاعت دے کر رخصت ہو گئے۔

ان کے بعد حر بن یزید، زہیر بن قین اور ان کے چچازاد بھائی سلمان بن مضارب نے میدان جہاد کا رُخ کیا۔ اور خوب خوب جنگ کی۔ بعض روایات کی بنا پر حر سے پہلے ان کے جوان فرزند علی بن حر نے بھی قربانی پیش کی۔ لیکن ان تینوں حضرات کے بعد عمرو بن قرظہ میدان میں آئے اور ان کی شہادت کے بعد نافع بن ہلال جملی نے شجاعت کے جوہر دکھلائے۔ نافع کے بعد دو غلام واضح اور اسلم میدان میں آئے اور اسلام میں نسل و رنگ کی تفریق کا خاتمہ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

ان غلاموں کے بعد بریر بن خضیر کی باری آئی اور انھوں نے دشمنوں پر ہر طرح حجت تمام کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔

پھر اس کے بعد حنظلہ بن سعد شبامی نے شہادت پائی اور ان کے بعد دو عظیم سپاہی میدان میں آئے جن کے نام سے دشمن لرز جاتے تھے اور جن کی خاندانی شجاعت کا شہرہ زبان زد خاص و عام تھا جناب عابس بن شبیب شاکری اور ان کے ہمراہ شاکر کے غلام شوذب جنھوں نے شجاعت کا سبق اپنے آقا کے گھرانے سے سیکھا تھا اور منزلِ قربانی میں غلامی اور آزادی کے تفرقہ پر خط نسخ کھینچ دیا تھا۔

ان بہادران عرب کے قربان ہو جانے کے بعد جناب ابوذر کے غلام جون کی باری آئی اور جون نے راہِ خدا میں قربان ہوتے ہوتے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ شرفِ شہادت کے لیے رنگ یا نسل یا قوم اور قبیلہ کی شرط نہیں ہے۔ اس شرف کے لیے ایمان اور کردار کی ضرورت ہے اور یہ کسی بھی نسل یا قوم کی میراث نہیں ہے۔

جون کے بعد انس بن حارث بن نبیہ الکاہلی میدان میں آئے اور ان کی شہادت کے بعد عمرو بن جنادہ نے میدان میں قدم رکھا۔ یہ عمر کے اعتبار سے کمسن تھے لیکن ہمت و حوصلہ کے اعتبار سے بالکل جواں مرد اور مکمل طور سے آزمودہ کار سپاہی کی طرح جہاد کرنے والے تھے۔

عمرو بن جنادہ کے قربان ہو جانے کے بعد امام حسینؑ کے مستقل موذن حجاج بن مسروق کی باری آئی اور حجاج کی قربانی نے یہ واضح کر دیا کہ لشکر یزید کی نگاہ میں داعی حق کی کوئی قیمت نہیں ہے اور یہ فوج اذان اور نماز کی بھی کسی اہمیت کی قائل نہیں ہے۔ ورنہ جو انسان چھ ماہ سے مستقل دعوت نماز دے رہا ہے اور ہر نماز کے وقت بہ آواز بلند اذان دے رہا ہے اس کے اس شرف مؤذنیت کا تو خیال کیا جاتا اور اس پر تلوار نہ اٹھائی جاتی۔

حجاج کی شہادت کے بعد سوار بن ابی عمیر نے قربانی پیش کی اور اس کے بعد لشکر امام حسینؑ کے آخری صحابی سوید بن عمرو بن ابی المطاع میدان میں آئے اور ان کی قربانی کے ساتھ اصحاب و انصار کی قربانی کا سلسلہ تمام ہو گیا اور امام حسینؑ کے جملہ اصحاب راہِ خدا میں کام آگئے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز ظہر کے ہنگام امام عالی مقام کے ساتھ نماز ادا کرنے والے اصحاب صرف چند افراد تھے جنھوں نے ظہر کے بعد قربانی پیش کی ہے ورنہ سب حملہ اولیٰ میں یا اس کے فوراً بعد راہ خدا میں کام آچکے تھے۔

اس کے بعد اعزاء اور بنی ہاشم کے جوانوں کی باری آئی۔

بنی ہاشم کے شہداء کی ترتیب کے بارے میں علماء اعلام کے درمیان مختلف قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں اور مؤرخین نے بھی مختلف ترتیب کے ساتھ ان قربانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن تمام بیانات کے دیکھنے کے بعد جو ترتیب سامنے آتی ہے اس کا اندازہ اس ایک حقیقت کے اندازہ کے بعد بالکل آسان ہوجاتا ہے کہ کربلا کے شہداء کو "شہداء بنی ہاشم" ضرور کہا جاتا ہے اور یہ سب مورث اعلیٰ کے اعتبار سے ہاشمی سیادت و شرافت ہی کے وارث ہیں۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ان کا کوئی تعلق جناب ہاشم کی دیگر اولاد سے نہیں تھا، اور یہ سب نسل ابوطالب سے تعلق رکھتے تھے اور اس اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کربلا کی قربان گاہ پر صرف اولاد ابوطالب نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے اور اسلام حقیقی اپنی بقا میں صرف اولاد ابوطالب کا شرمندۂ احسان ہے۔ اس کے علاوہ اولاد ہاشم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی احسان اسلام کی گردن پر ہو۔ بلکہ سب کی گردن پر اسلام اور اولاد ابوطالب کا احسان ہے کہ انھوں نے قربانی دے کے اسلام کو بچالیا اور مسلمان کو مسلمان کہلانے کا موقع فراہم کیا ورنہ مسلمان ہونا بھی ایک جرم ہوتا اور کسی انسان میں اس قدر ہمت نہ ہوتی کہ بنی امیہ کے درندوں کے مقابلہ میں اپنے اسلام کا اعلان کرتا ــــ اور شعائر اسلامی پر عمل پیرا ہو سکتا۔

اولاد ابوطالبؑ کو نگاہ میں رکھنے کے بعد قربانیوں کی ترتیب کا اندازہ کرنا بڑی حد تک آسان ہوجاتا ہے۔ صرف ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ کربلا میں حضرت علی اکبرؑ کی حیثیت دیگر شہداء بنی ہاشم سے قدرے مختلف تھی اور وہ اس بنیاد پر کہ علی اکبرؑ ہر اعتبار سے رسول اکرمؐ سے مشابہت رکھتے تھے اور امام حسینؑ کے پاس اتمام حجت کے لیے علی اکبرؑ سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اس لیے آپ نے جہاد کربلا کے آغاز کا کام علی اکبرؑ کے حوالے کر دیا، صبح عاشور کی اذان علی اکبرؑ نے دی تاکہ فوج یزید رسول اکرمؐ کا لہجہ سن کر اپنی غلطی اور بے دینی کی طرف متوجہ ہوجائے اور اس طرح ہلاک بھی ہو تو دلیل اور حجت کے قیام کے بعد اور امام حسینؑ قربانی بھی پیش کریں تو حجت تمام کرنے اور حق و حقانیت کا اعلان کرنے کے بعد۔

حضرت علی اکبرؑ کی اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں صبح عاشور اذان کے لیے مقدم کیا گیا اور بعد ظہر خاندان کی قربانیوں کے موقع پر سب سے پہلے میدان میں بھیجا گیا اور روایات و زیارات میں انھیں اول قتیل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ورنہ اس نکتہ سے قطع نظر کرلیا جائے تو قدرت نے اولاد ابوطالب کو شہادت کا شرف بھی اسی ترتیب کے ساتھ عنایت فرمایا ہے جس ترتیب کے ساتھ انھیں لباس وجود سے آراستہ کیا تھا۔ یعنی جناب ابوطالب کے چار فرزند تھے۔ طالب، عقیل، جعفر اور علیؑ۔ اور ہر ایک دوسرے سے دس سال بڑا تھا۔

اور اس اعتبار سے سب سے پہلے فرزند جناب طالب تھے جن کی اولاد کا کوئی سُراغ تاریخ کربلا میں نہیں ملتا ہے۔ اس کے بعد ان سے دس سال چھوٹے جناب عقیل تھے لہذا قدرت نے کربلا میں شہادت کا شرف بھی سب سے پہلے اولاد عقیل کو عطا کیا اور اولاد عقیل میں سفیر حسینی کی حیثیت سے جناب مسلمؑ سب سے پہلی قربانی پیش کر چکے تھے اس لیے قدرت نے کربلا میں بھی قربانی کا شرف سب سے پہلے انھیں کے فرزند کو عطا کیا جو مسلم کی قربانی کی قبولیت کی عظیم ترین دلیل ہے۔

مورخین کربلا کے بیان کے مطابق اول قتیل جناب علی اکبرؑ کے بعد سب سے پہلے عبداللہ بن مسلم میدان میں آئے اور باپ کی جیسی شیرانہ شجاعت کا مظاہرہ کرکے راہ حق میں قربان ہوگئے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ اولاد عقیل کام آئیں۔

جعفر بن عقیل، عبدالرحمان بن عقیل، محمد بن عقیل، عبداللہ اکبر بن عقیل، محمد بن ابی سعید بن عقیل، محمد بن مسلم بن عقیل اور علی بن عقیل۔

اولاد عقیل کی قربانیوں کے بعد اولاد جعفر طیّار کی باری آئی۔ اس لیے کہ اولاد جناب ابوطالبؑ میں جناب جعفر طیّار جناب عقیل سے دس سال چھوٹے تھے۔

اولاد جعفر طیّار میں جناب عبداللہ بن جعفر مصالح امامت کی بنیاد پر مدینہ میں رہ گئے تھے لہذا ان کی نیابت میں ان کی اولاد نے قربانیاں پیش کیں۔ عون بن عبداللہ بن جعفر جن کی والدہ گرامی جناب زینبؑ تھیں اور محمد بن عبداللہ بن جعفر اور عبیداللہ بن جعفر جن کی مادر گرامی بعض مورخین نے جناب خوصاء کو قرار دیا ہے۔

اولاد جعفر طیّار کے بعد اولاد علیؑ کی باری آئی کہ جناب امیرالمومنینؑ جناب جعفر طیّار سے دس سال چھوٹے تھے۔ البتہ اولاد علیؑ کی قربانی میں جناب عباس علمدار نے یہ اہتمام رکھا کہ پہلے چھوٹے

بھائیوں کو راہِ حق میں قربان کیا اور اس کے بعد خود میدان میں آئے اور اس کے دو بنیادی اسباب تھے:

ایک سبب یہ تھا کہ جناب عباس علمدارِ لشکر تھے، اور علمدار لشکر کو آخری مرحلہ تک لشکر کی نگرانی کرنا پڑتی ہے اور دوسرا سبب یہ تھا کہ جناب عباسؑ اس عظیم مصیبت کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ لشکر، سردار کی نگرانی میں جہاد کرے اور اس کی ہدایات کے مطابق قربانی پیش کرے۔

اولاد علیؑ میں جناب عباسؑ نے سب سے پہلے عبداللہ بن علیؑ کو بھیجا۔ اس کے بعد جعفر بن علیؑ کو روانہ کیا اور ان کی شہادت کے بعد عثمان بن علیؑ کو راہِ حق میں قربانی کی دعوت دی اور آخر میں خود بھی قربان ہو گئے۔

ان حضرات کے علاوہ بھی اولاد علیؑ میں دو نام اور ذکر کیے جاتے ہیں۔ محمد اصغر بن علیؑ اور عباس اصغر بن علیؑ۔ لیکن یہ دونوں حضرات جناب ام البنین کی اولاد میں نہیں تھے۔

جناب امیرالمومنینؑ کی براہ راست اولاد کے قربان ہو جانے کے بعد ان کی نسل کی باری آئی اور وہاں بھی یہی ترتیب برقرار رہی کہ امام حسنؑ بڑے بھائی تھے۔ تو ان کی اولاد پہلے قربان ہوئی اور امام حسینؑ چھوٹے تھے تو ان کی اولاد کی قربانی بعد میں پیش ہوئی اور اسے آخری قربانی قرار دیا گیا۔

اولاد امام حسنؑ میں جن شہدا کا ذکر کیا جاتا ہے ان میں عبداللہ بن الحسن، قاسم بن الحسن نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے بعد اولاد امام حسینؑ میں حضرت علی اصغرؑ کی قربانی پیش کی گئی اور اس طرح جناب علی اکبرؑ کی حیثیتِ اتمام حجت اور جناب عباسؑ کی حیثیتِ علمداری و سرداری کو الگ کر لیا جائے تو کربلا میں اولاد ابوطالب نے نہایت درجہ منظم اور مرتب انداز سے قربانیاں پیش کی ہیں اور بقاء حق و حقانیت اور زندگی دین و مذہب میں اولاد ابوطالبؑ کے علاوہ کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ابوطالبؑ نہ ہوتے تو اسلام پیش نہ ہو سکتا اور ابوطالب کی اولاد نہ ہوتی تو اسلام زندہ نہ رہ سکتا۔ والسّلام علیھم ورحمة اللّٰه وبرکاته

تمہیدِ کربلا

۱۔ امام حسینؑ دربار ولید میں

حاکم دیکھ!۔۔۔ ہم اہلبیتؑ نبوت اور معدن رسالت ہیں، ہمارے گھر میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ امور کی ابتدا و انتہا ہم سے ہے۔ یزید ایک شرابی اور قاتلِ نفسِ محترم شخص ہے۔ اس کا فسق و فجور واضح ہے۔ اور مجھ جیسا انسان اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ صبح ہونے دے اس وقت غور کیا جائے گا کہ ہم میں واقعاً مستحق خلافت کون ہے؟

(مثیر الاحزان ابن نما حلیؒ)

۲۔ امام حسینؑ قبرِ رسولؐ پر

خدا کے رسول آپ پر میرا سلام! میں حسینؑ ابن فاطمہؑ آپ کا فرزند اور آپ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ آپ نے مجھے اپنا وارث بنا کر چھوڑا ہے۔ لیکن گواہ رہیے گا کہ اس امت نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور میری حفاظت نہیں کی ہے۔ اب آپ کی بارگاہ میں میری فریاد ہے یہاں تک کہ میں خود آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ (بحارالانوار ج ۴۰ ص ۱۷۲)

پروردگار! یہ تیرے نبی حضرت محمدؐ کی قبر ہے اور میں تیرے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ جو حالات پیش آئے ہیں وہ تجھے معلوم ہیں۔ میں نیکیوں کو دوست رکھتا ہوں، برائیوں سے نفرت کرتا ہوں۔ اے ذوالجلال والاکرام! تجھے صاحبِ قبر کا واسطہ۔ میرے لیے وہ چیز پسند کرنا جس میں تیری اور پیغمبر کی رضا ہو۔!

۳۔ امام حسینؑ اور محمد حنفیہؒ

برادر!۔۔۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے نصیحت فرمائی اور اپنے اعتبار

سے نیک مشورہ دیا۔ لیکن میں مکہ کی طرف جانے کا عزم کر چکا ہوں اور میرا اور میرے برادران اور اقربا، کا عزم مکمل ہے۔ ان سب کا خیال ایک اور سب کا ارادہ متحد ہے۔ آپ کو اختیار ہے آپ چاہیں تو مدینہ میں رہیں اور مجھے دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہیں۔

(مقتل محمد بن ابی طالب)

۴۔ امام حسینؑ اور حضرت اُمّ سلمہ

نانی !۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے ظلم و ستم کے ساتھ شہید ہونا ہے۔ مشیت یہی ہے کہ میرے اہلِ حرم دربدر پھرائے جائیں، میرے بچّے ذبح کیے جائیں، انھیں قیدی بنایا جائے اور فریاد کریں تو کوئی ان کا فریاد رس نہ ہو، اسی میں دین کی بقا اور حیات ہے۔

نانی !۔ میں آج نہ جاؤں گا تو کل جاؤں گا، اور کل نہ جاؤں گا تو پرسوں جاؤں گا۔ موت سے کوئی مفر نہیں ہے۔ میں وہ دن اور ساعت بھی جانتا ہوں جب مجھے قتل ہونا ہے اور وہ جگہ بھی جانتا ہوں جہاں مجھے دفن ہونا ہے۔ گویا میں وہ جگہ دیکھ رہا ہوں اور آپ چاہیں تو آپ کو بھی دکھلا دوں۔ یہ کہہ کر جگہ دکھلا دی اور ایک مُشتِ خاک اُٹھا کر جناب ام سلمہ کو دے دی کہ جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھ لیجیے گا کہ میرا حسینؑ شہید ہو گیا ہے۔ (مقتل عوالم ص ۲۷)

۵۔ امام حسینؑ اور عبداللہ ابن عمر

اے عبداللہ !۔ دنیا کی پستی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو گی کہ حضرت یحییٰ بن زکریا کا سر ایک زنا زادے کے سامنے پیش کیا گیا اور میرا سر بھی ایک ایسے ہی آدمی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ بنی اسرائیل طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کے درمیان ستّر انبیاء کو قتل کر کے یوں کاروبار کرتے تھے جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد بھی اللہ نے فی الفور بدلہ نہیں لیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انھیں فنا کر دیا۔ (لہوف)

۶۔ وصیّت نامۂ امام حسینؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ حسینؑ ابن علیؑ کی وصیّت ہے محمد حنفیہ کے نام ۔ حسینؑ گواہی دیتا ہے کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، حضرت محمد مصطفٰےؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، ان کا پیغام حق اور جنت و جہنم سب برحق ہیں۔ قیامت بہر حال آنے والی ہے اس میں کسی شک

اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس وقت اللہ سب کو قبروں سے نکالے گا۔

میں کسی تفریح، غرور، فساد اور ظلم کے ارادہ سے نہیں نکل رہا ہوں۔ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دوں اور بُرائیوں سے روکوں، اپنے باپ اور نانا کی سیرت پر چلوں۔ اس کے بعد جو میری بات کو قبول کرلے گا تو اللہ اولیٰ بالحق ہے، اور جو رد کر دے گا اس کے رد کر دینے پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

یہ میری وصیت ہے اور میری توفیقات اللہ کی طرف سے ہیں۔ اسی پر بھروسہ ہے اور اسی کی طرف توجہ ہے۔ (مقتل العوالم ص ۵۴)

۷۔ امام حسینؑ کا خط اہلِ بصرہ کے نام

اما بعد ! اللہ نے حضرت محمدؐ کو منتخب کر کے اپنا نبی اور رسول بنایا اور پھر اپنی بارگاہ میں بلا لیا۔ انھوں نے بندگانِ خدا کو نصیحت کی، پیغامِ الٰہی کو پہونچایا۔ ہم ان کے اہلبیتؑ اولیاء اور وارث ہیں۔ قوم نے ہمارے اوپر سبقت کی اور ہم نے برداشت کر لیا کہ ہم افتراق کو ناپسند کرتے ہیں اور عافیت چاہتے ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ ہم اس کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ میں اس پیغام کے ذریعہ تم کو کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ کی دعوت دیتا ہوں۔ سنت کو مُردہ بنا دیا گیا ہے اور بدعت زندہ کی جا رہی ہے۔ اگر تم لوگ میری بات مانو گے تو میں تمھیں حق کی ہدایت کروں گا۔

(طبری ص ۲۰۰)

۸۔ اہلِ کوفہ کے خط کا جواب

تم نے میرے آنے کے بارے میں جس اشتیاق کا اظہار کیا ہے اس کا حال مجھے معلوم ہوا۔ میں اس وقت اپنے چچازاد بھائی اور میرے گھر والوں میں سے ایک معتبر فرد مسلم بن عقیل کو بھیج رہا ہوں تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے۔ اگر صورت حال وہی ہے جس کا تم لوگوں نے اظہار کیا تو میں جلد تمھاری طرف آ رہا ہوں۔ (طبری ج ۶ ص ۱۹۸)

۹۔ مکّہ سے روانگی

خدا کا شکر ہے۔ ساری قوت اسی کے سہارے ہے۔ صلوات و سلام حضرت مرسلؐ پر۔ موت

ابن آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں اپنے بزرگوں سے ملنے کا مشتاق ہوں جیسے یعقوبؑ یوسفؑ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ میں اپنے آخری مرکز تک بہر حال جاؤں گا۔ بلکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بنی امیہ کے درندے انسان مجھ کو نوادیس وکربلا کے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں اور اپنے ظلم وستم کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ مرضیٔ خدا ہم اہلبیتؑ کی مرضی ہے، ہم اس کے امتحان پر صابر ہیں، وہی بہترین اجر دینے والا ہے جس سے آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور وعدۂ الٰہی پورا ہو۔ جو میرے ساتھ چلنا چاہتا ہو اُسے معلوم رہے کہ میں صبح جا رہا ہوں۔ لقائے الٰہی کے لیے نفس آمادہ ہے تو میرے ساتھ چلے ورنہ نہیں۔

(لہوف ص ۲۳)

۱۰۔ امام حسینؑ اور ابن سعد

ابن سعد! کیا تو مجھ سے جنگ کرنا چاہتا ہے؟ کیا تیرے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں کس کا فرزند ہوں۔ اب بھی انھیں چھوڑ کر میرے ساتھ آجا تو اس میں قربتِ الٰہی ہے۔

اگر مکان کے گرا دیے جانے کا خوف ہے تو میں حجاز میں بہترین مکان دے دوں گا۔

خدا جانے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اللہ تجھے تیرے بستر پر ذبح کرے اور روزِ قیامت معاف نہ کرے۔ خدا کی قسم تو عراق کے دانۂ گندم سے بہرہ یاب نہ ہو سکے گا۔

(مقتل الخوارزمی ص ۲۲۵)

۱۱۔ شبِ عاشور

میں خدا کی حمد وثنا اور ہر سختی و آرام پر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پروردگار تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں نبوّت کے ذریعہ محترم بنایا، قرآن کا علم دیا، دین کا فہم دیا، ہمارے لیے چشم وگوش ودل قرار دیے اور ہمیں مشرکین میں سے نہیں بنایا۔

اما بعد! میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اصحاب اور اپنے اہلبیتؑ سے زیادہ نیک کردار اہلبیتؑ نہیں جانتا ہوں۔ میرے جد نے خبر دی ہے کہ میں عراق میں زمین کربلا پر اُتارا جاؤں گا اور وہیں میری شہادت ہو گی اور اب اس کا ہنگام آ چکا ہے۔ کل میری شہادت ہو گی۔ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ رات کا پردہ حائل ہے۔ ہر شخص میرے گھر والوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ لے اور جہاں چاہے چلا جائے۔ قوم میرے خون کی طالب ہے، مجھے پا کر تمھاری جستجو

نہ کرے گی۔ (ارشاد مفید۔ طبری ج ۶ ص ۲۳۹)

۱۲۔ روزِ عاشور

ایھا الناس! میری بات سنو اور جلد بازی نہ کرو کہ میں اپنے حق کو ادا کروں اور اپنا عذر بیان کروں۔ اس کے بعد تم قبول کر لو اور تصدیق کر دو اور میرے ساتھ انصاف کرو تو تمھاری نیک بختی ہے ورنہ پھر فیصلہ خداوندی کے لیے تیار ہو جاؤ کہ وہی میرا مالک اور سرپرست ہے۔

ساری تعریف اس خدا کے لیے ہے جس نے دنیا کو پیدا کر کے اسے محلِّ فنا و زوال بنایا ہے جہاں ہر آن ایک نہ ایک تغیّر ہوتا رہتا ہے۔ فریب خوردہ وہ ہے جسے دنیا دھوکہ دیدے، اور شقی و بدبخت وہ ہے جو اس فتنہ کا شکار ہو جائے۔ خبردار! تمھیں یہ دنیا دھوکہ نہ دیدے۔ یہ ہر امیدوار کی امید منقطع کر دیتی ہے اور ہر لالچی کو مایوس کر دیتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اس امر پر اجتماع کیا ہے جس میں غضب پروردگار اور اس کی ناراضگی ہے۔ یہ امر باعث عذاب اور سبب دوریٔ رحمت ہے۔ وہ بہترین رب ہے اور تم بدترین بندے۔ تم نے اطاعت کا اقرار کیا، نبیؐ پر ایمان لائے اور پھر ان کی ذریت پر ہجوم کر کے انھیں قتل کرنا چاہتے ہو۔ شیطان تم پر غالب آ گیا ہے اور تمھیں یادِ خدا سے غافل بنا دیا ہے۔ خدا تمھارا بُرا کرے کیا بُرا ارادہ تمھارا ہے۔ انا للہ ــــ یہی وہ قوم ہے جو ایمان کے بعد کافر ہو گئی ہے اور ظالمین کے لیے ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

ایھا الناس! ذرا مجھے پہچانو میں کون ہوں۔ پھر فیصلہ کرو کہ کیا میرا قتل تمھارے لیے جائز ہے۔ کیا میں تمھارے نبی کی بیٹی کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا میں ان کے وصی اور ابن عم اول المومنین والمصدقین کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا حضرت حمزہؑ سید الشہداء میرے باپ کے چچا نہیں ہیں؟ کیا حضرت جعفر طیارؑ میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا پیغمبرؐ کے اس ارشاد کی خبر نہیں ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں؟

اگر میری باتیں صحیح ہیں اور تم تصدیق کرتے ہو جیسا کہ یہ صحیح ہے کہ میرا قول حق ہے، اس لیے کہ میں نے کبھی کلمۂ باطل سے زبان کو آشنا نہیں کیا کہ اس میں خدا کی ناراضگی اور بندہ کا نقصان ہوتا ہے ــــ تو یہ سب کیا ہے؟ ــــ اور اگر میری تکذیب کرتے ہو، تو ابھی

جابر بن عبد اللہ انصاری، ابو سعید خدری، سہل بن سعد ساعدی، زید بن ارقم، انس بن مالک جیسے اصحاب زندہ ہیں ان سے دریافت کرلو، یہ بتائیں گے کہ یہ ارشادِ رسولؐ ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ ساری باتیں تمھیں میرے قتل سے باز نہیں رکھ سکتیں؟ —

اگر تمھیں میری باتوں میں شک ہو تو کیا اس بات میں شک ہے کہ میں نبی کا نواسہ ہوں؟ تو بتاؤ مشرق و مغرب کے درمیان میرے علاوہ کون رسولؐ کا نواسہ ہے؟ کیا مجھ سے کسی قتل کا بدلہ لے رہے ہو یا میں نے تمھارا کوئی مال تباہ کر دیا ہے یا کسی زخم کا قصاص لے رہے ہو.....؟ (طبری ۶ ص ۲۴۳)

۱۳۔ خطبۂ دوم۔ بروز عاشور

اے جماعت ضلالت! تمھارے لیے ہلاکت و بربادی ہے کہ تم نے ہم سے فریاد کی اور ہم تمھاری فریاد کو پہونچے تو تم نے وہ تلوار ہمارے خلاف کھینچ لی جو ہمارے دشمنوں پر کھینچنا چاہیے تھی اور وہ آگ ہمارے خلاف بھڑکا دی جو ہم تمھارے دشمنوں کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے۔ تم نے دشمنوں کا ساتھ دیا اور حق و انصاف کا خیال نہیں کیا، تمھیں ان سے کیا ملنے والا ہے؟..... تم سر براہوں کے غلام، کتاب کے نظر انداز کرنے والے، کلمات میں تحریف کرنے والے اور گناہگار جماعت کے ارکان ہو۔ شیطان تمھارے اوپر غالب ہے۔ تم نے سیرتوں کو فراموش کر دیا ہے، دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہو، اور ہم سے الگ ہو رہے ہو۔ یہ تمھارا پرانا طریقہ ہے اسی پر تمھاری بنیادیں قائم ہیں۔ تم بدترین ثمر ہو۔

یہ ناتحقیق ابن ناتحقیق۔ اس نے مجھے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے کہ یا تلوار نکال لوں یا ذلت برداشت کرلوں۔ ظاہر ہے کہ میں ذلت گوارہ نہیں کرسکتا۔ یہ میرے خدا و رسولؐ کی مرضی کے خلاف اور میری پرورش کی پاکیزہ آغوش اور میرے بزرگوں کے طیب و طاہر نفوس کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ میں کمینوں کی اطاعت کو شریفوں کی طرح شہادت پر مقدم کروں یہ ناممکن ہے۔ میں اپنے مختصر ساتھیوں کو لے کر راہِ خدا میں آگے بڑھ رہا ہوں..... (لہوف ص ۵۶)

۱۴۔ آخری دُعا

اے خدا! اے بلند مکان، عظیم الجبروت، شدید القویٰ، مخلوقات سے بے نیاز، کبریائی کے مالک، ہر شے پر قادر، رحمتوں کے اعتبار سے قریب، وعدوں کے صادق، نعمتوں کے کامل کرنے والے، بہترین امتحان لینے والے، تجھے بلایا جاتا ہے تو تو قریب ہے، مخلوقات پر محیط ہے، توبہ کا قبول کرنے والا ہے، ارادوں پر قادر ہے، جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے، شکر گذاروں کا شکریہ قبول کرتا ہے، یاد کرنے والوں کو یاد رکھتا ہے۔ میں احتیاج کے ساتھ تجھے پکار رہا ہوں اور فقر و فاقہ کے ساتھ تیری بارگاہ کی طرف آرہا ہوں، میں رنجیدہ و پریشان حال ہوں اور تجھ سے مدد مانگ رہا ہوں۔ تجھے کافی سمجھ کر تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں۔

پروردگار! میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ فرما۔ انھوں نے مجھے دھوکہ دیا، نظر انداز کر دیا، قتل کیا، ہم تیرے رسولؐ کی عترت و ذریت ہیں جنھیں تو نے رسالت کے لیے اور وحی کے لیے امین بنایا ہے۔ ہمیں کشائش احوال عطا فرما، تو ارحم الراحمین ہے۔ میں تیرے فیصلہ پر صابر ہوں۔ تیرے علاوہ کوئی خدا اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو ہی سب کا فریاد رس ہے۔ میں تیرے حکم پر صبر کر رہا ہوں۔ اے بے سہاروں کے سہارے، ہمیشہ رہنے والے..... میرے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ فرما کہ تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ (ریاض المصائب۔ مصباح کفعمی۔ اقبال)

شہدائے کربلا

۱۔ اولادِ ابوطالبؑ

حضرت امام حسین علیہ السلام۔ حضرت علی اکبرؑ۔ حضرت علی اصغرؑ۔ حضرت عباسؑ۔ حضرت عبداللہ بن علیؑ۔ حضرت عثمان بن علیؑ۔ حضرت جعفر بن علیؑ۔ حضرت ابوبکر بن علیؑ۔ حضرت ابوبکر بن حسن بن علیؑ۔ حضرت قاسم بن حسنؑ۔ حضرت عبداللہ بن حسنؑ۔ حضرت عون و محمد بن عبداللہ بن جعفرؑ۔ حضرت عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ۔ حضرت محمد بن مسلمؑ۔ حضرت محمد بن سعید بن عقیلؑ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عقیلؑ۔ حضرت جعفر بن عقیل۔

۲۔ شہداءِ بنی اسد

انس بن حرث اسدی۔ حبیب بن مظاہر اسدی۔ مسلم بن عوسجہ اسدی۔ قیس بن مسہر اسدی۔

۳۔ شہداءِ آلِ ہمدان

ابوثمامہ عمرو بن عبداللہ۔ بُریر ہمدانی۔ عابس شاکری۔ حنظلہ بن اسعد۔ عبدالرحمٰن رحبی۔ سیف بن حرث۔ عمرو بن عبداللہ ہمدانی۔

۴۔ مذحجی شہداء

جنادہ بن حرث۔ مجمع بن عبداللہ۔ نافع بن ہلال۔ حجاج بن مسروق۔

۵۔ انصاری شہداء

عمرو بن قرظہ۔ عبدالرحمٰن بن عبدرب۔ جنادہ بن کعب۔ عمرو بن جنادہ نُعیم بن عجلان۔ سعد بن حرث۔

۶۔ بجلیؓ اور خشعمی شہداء

زہیر بن قین۔ سلمان بن مضارب۔ سدید بن عمر۔ عبداللہ بن بشیر۔

۷۔ کندی اور غفاری شہداء

یزید بن زیاد کندی، حرب بن امرؤالقیس۔ زاہر بن عمرو۔ بشر بن عمرو۔ عبداللہ بن عروہ غفاری۔ جون غلام ابوذر غفاری۔

۸۔ کلبی شہداء

عبداللہ بن عمیر۔ عبدالاعلیٰ بن یزید۔ سالم بن عمرو۔

۹۔ اَزدی شہداء

قاسم بن حبیب۔ زہیر بن سلیم۔ نعمان بن عمرو۔

۱۰۔ عبدی شہداء

یزید بن ثبیط۔ عامر بن مسلم۔ سیف بن مالک۔

۱۱۔ تیمی و طائی شہداء

جابر بن حجاج۔ مسعود بن حجاج۔ عبدالرحمٰن بن مسعود۔ بکر بن حیؓ۔ عمّار بن حسّان طائی۔

۱۲۔ تغلبی شہداء

ضرغامہ بن مالک۔ کنانہ بن عتیق۔

۱۳۔ جہنی و تمیمی شہداء

عقبہ بن صلت۔ حر بن یزید تمیمی۔ عقبہ بن صلت۔

۱۴۔ متفرق شہداء

جبلہ بن علی شیبانی۔ قعنب بن عمر۔ عبداللہ بن یقطر۔

انقلابِ کربلا

دورِ حاضر میں عام طور سے انقلاب کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک ہی نظام کے ماننے والوں میں ایک نااہل کو کرسی سے اُتار کر دوسرے کو اس کی جگہ پر بٹھا دیا جائے۔

اور اس سے بڑا انقلاب یہ ہوا ہے کہ نظام میں بھی جزوی تبدیلی کر دی جائے اور پارٹی کے منشور کے مطابق ملک کا نیا نظامِ حکومت مرتب کر لیا جائے۔

تیسری قسم انقلاب کی یہ ہوسکتی ہے کہ نظام کی بنیادی شکل کو مختلف کیا جائے اور درحقیقت ایک ہی قسم کے انسانوں کو مختلف ناموں سے تختِ حکومت پر بٹھایا جائے۔ پہلے اسی قسم کا انسان شہنشاہ کے نام سے تخت نشین ہوا اور پھر بدلے ہوئے حالات میں ویسا ہی انسان یا وہی انسان صدرِ جمہوریہ کے نام سے تخت نشین ہو جائے اور اس کا نام "بنیادی انقلاب" رکھ دیا جائے۔

چوتھی قسم انقلاب کی یہ ہوتی ہے کہ سرحدوں کے محافظ حدودِ مملکت کے اندر داخل ہو جائیں اور بزورِ طاقت قدیم نظام کے نفاذ کا عمل تیز تر کر دیں جس کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہو کہ گزشتہ حکومت اسے نافذ کرنے میں ناکام رہی ہے اور اسی کی وجہ سے ملک میں بدامنی پھیل گئی ہے جسے فوجی انقلاب کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب میں نظامِ حکومت اور دستور میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی ہے صرف نفاذ کے عمل کو تیز تر بنایا جاتا ہے اور اپنی مقبولیت میں اضافہ کے لیے چند خوشگوار تبدیلیوں کا نام لے لیا جاتا ہے ورنہ ملکی دستور بعینہٖ وہی دستور ہوتا ہے جس کا نفاذ ضروری تھا اور گویا کہ سابق حکومت کے زیرِ اثر نہیں ہو سکا ہے۔

پانچویں قسم ایک مخلوط انقلاب کی ہے جو بیک وقت سیاسی بھی ہوتا ہے اور فوجی بھی۔ یعنی فوجی حکمراں اپنے انقلاب کو عوامی ظاہر کرنے کے لیے ایک فرضی الکشن کرا دیتا ہے اور پھر اسی فوجی انقلاب کو عوامی اور سیاسی انقلاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔

ان تمام اقسام میں جو بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سارے رہنما ایک ہی جیسے ہوتے ہیں اور انھیں عوامی تائید حاصل ہو یا نہ ہو، خدائی تائید بہرحال حاصل نہیں ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کے انقلاب میں کم و بیش وہ ساری کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو سابق نظام میں رائج تھیں۔

دورِ حاضر میں بعض مقامات پر انقلاب کی ایک جدید ترین شکل نکل آئی ہے جسے بظاہر مذہبی انقلاب کہا جاتا ہے لیکن حقیقتاً وہ بھی ایک نیم سیاسی انقلاب ہوتا ہے جیسے کہ دورِ حاضر کی اکثر اسلامی تحریکات میں دیکھا جاتا ہے کہ نام اسلامی انقلاب کا لیا جاتا ہے اور اعتماد مشرق یا مغرب پر کیا جاتا ہے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے ــــ یا موجودہ حاکم وقت ہی سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کو رائج کرے اور تحریک میں یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ جس حاکم نے آج تک اسلام رائج نہیں کیا اور اسلام سے بیگانہ ہو کر اپنا اقتدار جمائے رکھا ہے، جس نے اسلام کے نصاب کی چار کتابیں بھی نہیں پڑھی ہیں۔ اس کا اقتدار تسلیم شدہ ہے صرف اس کا نظام تسلیم نہیں ہے اور یہ نتیجہ اس ذہنی غلامی یا ضمیر فروشی کا ہوتا ہے جو انقلابی افراد کو وراثت میں ملی ہے ورنہ اسلامی انقلاب کے معنی تو یہ ہیں کہ سب سے پہلے نااہل حکمراں کو معزول کیا جائے جس نے اب تک اسلام سے قطع نظر کر کے حکومت کی ہے اور ملکِ خدا کو غیرِ خدا کے راستہ پر چلایا ہے اور اب حالات کی مجبوری کے تحت اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتا ہے۔ ایسے حکمراں کے اقتدار کا باقی رکھنا اور اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرنا ایک سیاسی مکاری ہے جسے اسلامی انقلاب کا نام دیا جا رہا ہے ورنہ اس عمل کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے اپنے دور کے حاکمِ وقت سے یہی بات کہی تھی جب اس نے اپنی شرافت و عدالت کا مظاہرہ کرنے کے لیے حضرتؑ سے یہ مطالبہ کیا کہ میں تمام صاحبانِ حقوق کے حقوق واپس کرنا چاہتا ہوں آپ بھی فدک کے حدود کا تعین کر دیں تاکہ میں اسے آپ کے حوالہ کر دوں اور اس طرح آپ کے حق سے بھی سبکدوش ہو جاؤں، تو آپ نے اس دور کے پورے خطۂ اسلام کا رقبہ شمار کرا دیا تھا کہ مشرق و مغرب

اور شمال و جنوب میں درحقیقت فدک ایک پورے عالم اسلام کا نام ہے اور حاکم وقت حیرت زدہ رہ گیا تھا کہ میں نے تو اتنی بڑی جاگیر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا میں تو ایک باغ یا ایک جاگیر کے تصور میں تھا جس کے دے دینے کے بعد اپنے اقتدار پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ تو پورے عالم اسلام کا رقبہ شمار کرا رہے ہیں جس کے بعد اپنی حکومت کا کوئی تصور ہی نہیں رہ جاتا ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ یہی واضح کرنا چاہتے تھے کہ ظالم کے تحت حکومت پر رہتے ہوئے مظلوم کے حقوق کی ادائیگی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے حقوق میں تو خود مملکت اسلامیہ بھی شامل ہے جسے بحق وراثت پیغمبرؐ اور نص آیات قرآنیہ ہمیں ملنا چاہیے تھا اور اس مملکت پر قبضہ باقی رکھنے کے بعد ہمارے حقوق کی بحالی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

یہ درحقیقت اسی نکتہ کی وضاحت تھی کہ ظالمین کے اقتدار کو بحال رکھتے ہوئے اسلامی انقلاب کا تصور ایک جاہلانہ تصوّر ہے جس کے واقعی کوئی معنی نہیں ہیں۔

آثارِ انقلاب

انقلاب کے جملہ اقسام اپنے آثار کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اقسام میں صرف جزوی عملدرآمد ہوتا ہے اور اصل نظام معطل ہی رہتا ہے۔ بعض اقسام میں عملدرآمد کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے لیکن نظام کے اثرات بدستور باقی رہتے ہیں۔۔۔ بعض اقسام میں عوام میں محترم شخصیت یا احترام کی نوعیت میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن سماج کی حالت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور بعض اقسام میں صرف دہشت کا اضافہ ہو جاتا ہے اور باقی حالات بدستور رہتے ہیں۔

اسلام ایسے کسی انقلاب کا حامی نہیں ہے۔ وہ الٰہی قانون کے تحت سماج کے جملہ شعبوں میں انقلاب چاہتا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ میں کسی سرزمین پر قدم رکھوں تو وہاں کے عقائد و افکار بدلیں، تہذیب و تمدن میں تبدیلی پیدا ہو، اقدار حیات متغیر ہوں، طریقۂ زندگانی میں فرق آجائے، حکومت بدلے، حاکم بدلے، رعایا کا اندازِ حیات بدلے، اور قدیم دنیا ایک دوسری

دنیا نظر آنے لگے۔ جس طرح کہ سرکار دو عالمؐ کا اسلامی انقلاب تھا کہ آپ نے پتھروں کے پجاریوں کو ذہنی طور پر اتنا بلند کر دیا تھا کہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی خدا نہیں رہ گیا تھا۔ سیکڑوں خداؤں میں بٹی ہوئی قوم کو ایک توحید کے پرچم تلے جمع کر دیا تھا، متکبّرین کو نمازی بنا دیا تھا، لٹیروں کو زکوٰۃ و خمس کا پابند بنا دیا تھا، بے تحاشہ کھانے والوں کو روزہ کا خوگر بنا دیا تھا، غارت گری کرنے والوں کو مجاہد بنا دیا تھا اور مجاہد بنا کر میدانِ جہاد میں غنیمت کے خمس کا عادی بنا دیا تھا۔ سود خواروں کو ایثار گر بنا دیا، جواریوں کو عبادت گذار بنا دیا، شرابیوں کو پارسا بنا دیا، بدکاروں کو پاکیزہ نگاہ بنا دیا۔۔۔ اور اس طرح حیوانوں کو انسان، انسانوں کو مسلمان اور مسلمانوں کو صاحب ایمان بنا دیا۔

درحقیقت ایسا ہی انقلاب، انقلاب کہے جانے کے قابل ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ایسا انقلاب کسی مریض ذہن کے لیے کبھی قابلِ قبول نہیں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرک، بت پرست، شرابی، جواری، سود خوار، حرام خور، بدکار سب متحد ہو گئے اور مکہ کی گلیوں میں ایک قسم کی "سرد جنگِ احزاب" شروع ہو گئی۔ سرکار دو عالمؐ نے اپنے قوانین کے استحکام، اپنے قدم کے ثبات اور اپنے پروردگار کی امداد کا سہارا لے کر پورے طوفان کا مقابلہ کیا، اور بالآخر ایک بڑی جماعت کو مسلمان بنا لیا۔ اس راہ میں کانٹے ملے، کوڑا ملا، گالیاں ملیں، دھمکیاں ملیں، قتل کی سازش ملی، پروپیگنڈہ ملا، اتہامات والزامات ملے، غریب الوطنی ملی، لیکن سب کے آخر میں کامیابی ملی اور ایک دن وہ بھی آیا جب مکہ سے بے وطن کر دیا جانے والا پیغمبرؐ اس شان سے مکہ میں داخل ہوا کہ ابوسفیان تک مسلمان ہو گیا اور یہ اندازِ فتح پروردگار کی طرف سے ہر انقلابی انسان، انقلابی تحریک اور انقلابی جماعت کے لیے ایک نظیر بن گیا کہ اسلامی انقلاب کی راہ میں حلوے پراٹھے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اس راہ میں گالیاں ہیں، الزامات ہیں، دھمکیاں ہیں، پروپیگنڈے ہیں، گروہ بندی ہے، زبان کے خنجر اور قلم کے نیزے ہیں، غریب الوطنی ہے لیکن استقامت برقرار ہے تو کامیابی بھی ہے، کامرانی بھی ہے، فلاح بھی ہے، نجات بھی ہے اور فتح مبین بھی ہے۔ استقامت کے بعد وہ دن بھی آسکتا ہے جب ابوسفیان کلمہ پڑھنے لگے اور کفر بھی اسلام کی پناہ ڈھونڈنے لگے۔

اسلامی انقلاب ایک ہمہ گیر انقلاب تھا۔ تہذیب و تمدن کا انقلاب، عقائد و افکار کا انقلاب، مفاہیم و اقدار کا انقلاب، زندگی اور بندگی کا انقلاب — اور پھر ہر شعبۂ حیات میں انقلاب ہی انقلاب۔

ظاہر ہے کہ یہ انقلاب جن لوگوں سے برداشت نہ ہو سکا اور اس کی روز افزوں ترقّی جن کی نگاہوں میں نہ سما سکی، انھوں نے اس کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کی ہر طرح کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔

دشمن کے اقدامات ہمیشہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ابتدا میں وہ زور آزمائی کرتا ہے اور جب ناکام ہو جاتا ہے تو ساتھ مل کر نظام کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بدر و احد اور فتح مکہ کے بعد ابوسفیان کا اسلام اسی تدریجی ردعمل کا اظہار تھا کہ اب مل کر اسلام کو تباہ کرنا ہے۔

چنانچہ اس نے پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد پہلے مولائے کائنات کی امداد کا راستہ اختیار کیا اور جب آپ نے صریحی طور پر اس امداد کو ٹھکرا دیا اور فرما دیا کہ میں بقار اسلام کی خاطر منحرف حکومت کو برداشت کر سکتا ہوں کفر کی امداد کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس طرح کفر کو دوبارہ اسلامی دنیا میں کام کرنے کا موقع مل جائے گا —— تو آپ کے انکار کے بعد تختِ اقتدار کا رُخ کیا کہ اس سے اظہار خلوص کر کے اسلامی اقدار کی تباہی کا عمل شروع کیا جائے چنانچہ چار دن کے اندر اتنا نمایاں فرق ہو گیا کہ نفسِ پیغمبرؐ کی حمایت کا اعلان کرنے والا حزب اختلاف سے اتنا قریب تر ہو گیا کہ اپنے چشم و چراغ خاندان کو اسلام کا حکمراں بنانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر براہ راست اپنے فرزند کو بھی ایک حصہ مملکت کا حاکم بنوا دیا جس کے بعد وہ اس کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا، جس کی حمایت کے لیے کل باپ نے ہر قربانی دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اُس وقت اسلام ایک انتہائی خطرناک موڑ پر آ گیا اور داخلی ریشہ دوانیوں کی بنا پر وہ سارے اقدار اچانک تبدیل ہو گئے جو سرکار دو عالمؐ کی ۲۳ سالہ ریاضت و محنت سے قائم ہوئے تھے۔ جہاں مملکت میں ایک ایک قطرۂ شراب کا فقدان تھا وہاں تختِ خلافت

پر شراب آ گئی۔ جہاں نامحرم پر نگاہ کرنا جرم تھا وہاں سوتیلی ماؤں سے زنا کا رواج ہو گیا۔ جہاں علم معیارِ فضیلت تھا وہاں علمار کی توہین شعار بن گئی۔ اسلامی دربار میں رسالت کو بنی ہاشم کا کھیل اور اسلام کو بے بنیاد نظریہ قرار دیا جانے لگا اور اس طرح نااہل باپ کے نالائق بیٹے نے باپ کی کمی کو پوری کر دیا اور پورا معاشرہ یکسر تبدیل ہو گیا اب صورت حال یہ ہے کہ برائیاں ہیں اور ٹوکنے کی ہمت نہیں ہے۔ منکرات ہیں اور نہی نہیں ہے۔ فواحش ہیں اور روکنے والا نہیں ہے۔ صاحبانِ علم مہر بلب ہیں اور اپنی حیثیت کے تحفظ میں لگے ہوئے ہیں۔ درباری علمار نہی عن المنکر کے خلاف فتوے صادر کر رہے ہیں اور اسلام فنا کے راستے پر لے جایا جا رہا ہے۔

ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی ایک مرد مجاہد اٹھے اور پائے ہوس سے طاقت رفتار کھینچ لے، میدان میں نیام سے تلوار کھینچ لے۔"

چنانچہ فرزند رسول الثقلین امام حسینؑ اٹھے اور آپ نے ہر مصیبت کو برداشت کرنے کا عزم کر کے اس سیلاب کے سامنے بندھ باندھ دیا۔ آپ نے اپنا بھرا گھر قربان کر دیا لیکن دوبارہ ایسا اسلامی انقلاب برپا کر دیا کہ پورے عالم اسلام میں یزیدیت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے اور چند دنوں میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ جس گھرانے میں فقط وراثت پر حکومت کی جاتی تھی وہیں یزید کا بیٹا باپ کے تخت پر بیٹھنے سے انکار کرنے لگا۔

امام حسینؑ کے اس انقلاب میں خواتین کربلا اور بالخصوص ثانی زہراؑ کا بھی ایک عظیم حصہ تھا کہ جس یزید کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں میں سانس لینے کی طاقت نہیں تھی اسی کے دربار میں وہ عظیم الشان خطبہ پڑھا کہ دربار ہل گیا اور عوام میں از سر نو حاکم ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا تصوّر پیدا ہو گیا۔

کربلا کا واقعہ تمام ہو گیا۔ اہلِ حرم نے کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں کو فتح کر لیا۔ لیکن جس عیسائیت اور بُت پرستی نے یزید کو اپنا مشترک نمائندہ بنایا تھا وہ پسپا ہو کر دوبارہ باطنی انتقام پر آمادہ ہو گئی اور ہر دور میں اسلامی اقدار کی تباہی کا کام شروع ہو گیا۔ ائمہ معصومینؑ نے اپنی موجودگی کے دور میں اس ریشہ دوانی کا مکمل مقابلہ کیا اور ہر دور میں باطل کو بے نقاب کرتے رہے اور ایک اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن غیبت کا زمانہ باطل طاقتوں کو گویا زور آزمائی کا بہترین زمانہ مل گیا اور ہر طرف سے اسلام کی بربادی کا عمل شروع ہو گیا۔ کافر، مشرک، یہودی، عیسائی سب متحد ہو گئے اور سب کا ایک ہی منشا تھا کہ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو تو اس کے تعلیمات کو بے روح، بے جان اور بے اثر بنا دیا جائے جیسا کہ دورِ یزید میں ہوا تھا کہ اسلام کو تماشہ بھی کہا جا رہا تھا اور نمازیں بھی ہو رہی تھیں۔ گویا باطل طاقتیں چاہتی تھیں کہ دونوں تجربات ایک ساتھ ہوتے رہیں کہ اگر امت کا احساس بالکل مردہ ہو گیا ہے تو اسلام ہی تماشہ بن جائے گا اور اگر امت میں کوئی صاحب ضمیر زندہ ہے تو کم سے کم احکام بے روح اور بے جان ہو جائیں گے۔

ہمارے ملکوں میں عیسائیت نے مدتہائے دراز تک اپنی حکومت میں یہی کام کیا ہے اور اسلام کو فنا نہیں کر سکی تو بے جان ضرور بنا دیا ہے اور سارے اقدار کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ (یزید بھی عیسائی ماں کا بیٹا اور عیسائی ماحول کا پروردہ تھا اور عیسائیت اس ریشہ دوانی میں مہارت رکھتی ہے)۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسجدیں آباد ہیں لیکن دل ویران ہیں۔ نمازیں ہیں لیکن برائیوں سے روکنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پاکیزہ کردار افراد سے محبت کا نام ہے لیکن اپنے کردار میں پاکیزگی نہیں ہے۔ تقریروں کا ہنگامہ ہے لیکن اثر کا فقدان ہے۔ مذہب کا چرچا ہے لیکن احکام سے ناواقفیت عام ہے اور حد یہ ہے کہ امامؑ و رسولؐ پر قربان ہیں لیکن ان کے احکام سے بے خبر ہیں۔ علماء کی جوتیاں اٹھاتے ہیں لیکن ان کے احکام کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ سرکار کے خادم ہیں لیکن سرکار کے دین کے خادم نہیں ہیں۔ علم کو معیارِ فضیلت مانتے ہیں لیکن جاہلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ غرضکہ زندگی کا ہر عمل بے جان ہو کر رہ گیا ہے اور بندگی اپنے اثرات سے عاری ہو گئی ہے اور جنھیں بیدار کرنا چاہیے تھا وہ خود بھی سو رہے ہیں، بلکہ خوابِ غفلت کے فضائل بیان کر رہے ہیں تاکہ سونے والا مزید سو جائے اور شاید انھیں یہ خطرہ بھی ہے کہ معاشرہ بیدار ہو گیا تو نقب زنی کے مواقع ہاتھ سے نکل جائیں گے اور مالِ مفت کے ذریعہ ایک رات میں لکھ پتی بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

پروردگار امت اسلامیہ کو بیداری کی توفیق عنایت فرمائے اور رہبرانِ قوم کو بیدار کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ والسّلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

نقشِ حیاتؑ

۱۔ اسم گرامی ــ حسینؑ (یہ نام خود پروردگار کا رکھا ہوا ہے)۔ ارجح المطالب
۲۔ کنیت ــ ابو عبداللہ
۳۔ القاب ــ سیّد، سبطِ اصغر، سید الشہداء، وغیرہ
۴۔ والد محترم ــ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام
۵۔ والدہ گرامی ــ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام
۶۔ ولادت ــ ۳ر شعبان سنہ ۴ھ
۷۔ شہادت ــ ۱۰ر محرم سنہ ۶۱ھ
۸۔ مقامِ ولادت ــ مدینہ منورہ
۹۔ مدفن ــ کربلائے معلیٰ
۱۰۔ ازواج ــ جناب شہربانوؑ، جناب ام لیلیٰؑ، جناب ربابؑ
۱۱۔ اولاد ــ امام زین العابدینؑ، علی اکبرؑ، علی اصغرؑ، سکینہؑ، فاطمہؑ (بربنائے مشہور)

امام حسینؑ ۔ وسیلۂ عمل بالقرآن

۱۔ حکمِ عبادت پر آخری سانس تک عملی درس دیتے رہے۔
۲۔ حکمِ تقویٰ پر عمل کے لیے سراپا تقویٰ بنے رہے۔
۳۔ حکمِ انفاق پر عمل کے لیے بھرا گھر لٹا دیا۔
۴۔ حکمِ جہاد پر ہر نوع اور ہر انداز جہاد کا طریقہ تعلیم فرمایا۔
۵۔ حکم تَزَوَّدُوْا پر تقویٰ کو ہر محب کے لیے زادِ راہ بنا دیا۔

۶۔ حکم اَقْرِضُوا پر سب کچھ راہ خدا میں دے دیا۔
۷۔ حکم استجابت پرتا حیات حکم خدا و رسولؐ پر لبیک کہنے کا ذریعہ بنے رہے۔
۸۔ حکم تقدیم پر سب کچھ راہ خدا میں پیش کر دیا۔
۹۔ حکم سَارِعُوا پر سب کے لیے سبب مغفرت بن گئے۔
۱۰۔ حکم دعا پر وسیلۂ استجابت دعا بن گئے۔
۱۱۔ حکم نصرت خدا پر راہ نصرت پروردگار قرار پائے۔
۱۲۔ حکم اجابت داعی خدا پر مستقل داعی الی اللہ بن گئے۔
۱۳۔ حکم جستجوئے وسیلہ پر ساری امت کے لیے وسیلۂ نجات بن گئے۔
۱۴۔ حکم اختیار سبیل اللہ پر بہترین سُبل و اقرب طرق بن گئے۔

امام حسینؑ اور قرآن

۱۔ تاریخ زندگانی

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کی وصیت کی کہ اس کی ماں نے زمانۂ حمل اور وقت ولادت بڑے رنج کا سامنا کیا ہے اور اس انسان کے حمل اور دودھ پینے کا زمانہ کل ملا کر تیس مہینے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ انسان توانا و تندرست اور ۴۰ سال کا ہوگیا تو اس نے ہماری بارگاہ میں دعا کی کہ بارالٰہا مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل کی ہیں اور میں ایسا عمل صالح کروں کہ تو راضی ہو جائے اور میری اولاد کو صالح قرار دے کہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوں اور تیرا ہی اطاعت گذار بندہ ہوں ——— (احقاف ۱۵)

۲۔ سکوت تا مرگ حاکم شام

ایمان والو! اپنے عہد کو وفا کرو ——— (مائدہ)

۳۔ خبر مرگ حاکم شام

صابرین کی شان یہ ہے کہ مصائب میں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں

پلٹ کر جانے والے ہیں ——— (بقرہ)

۴۔ دربار ولید

اگر وہ لوگ صلح پر آمادہ ہو جائیں تو تم بھی تیار ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو ——— (انفال)

۵۔ مطالبۂ بیعت

خبردار ظالموں کی طرف میلان نہ پیدا ہونے پائے کہ تم جہنم کے حقدار ہو جاؤ ——— (ہود)

۶۔ ترک وطن

جو شخص اپنے گھر سے راہ خدا میں ہجرت کرتا ہے وہ مر بھی جاتا ہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو جاتا ہے (نساء)

۷۔ قصد مکہ

جو خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے وہ محفوظ ہو جاتا ہے ——— (آل عمران)

۸۔ ارسال مسلمؑ ابن عقیلؑ

اگر وہ لوگ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو ——— انفال

۹۔ خروج از مکہ

جو شخص بھی شعائر الٰہیہ کی تعظیم کرے گا وہ اس کے تقویٰ کا نتیجہ ہوگا ——— (حج)

۱۰۔ قصد عراق

اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ رہو گے تو وہ لوگ بہر حال نکلیں گے جن کا مقدر شہادت ہے ——— (آل عمران)

۱۱۔ امتحان

اللہ تمہارا ایک نہر کے ذریعہ امتحان لے گا جو اس سے پانی نہ پیئے گا وہ مجھ سے ہوگا ——— (بقرہ)

۱۲۔ جہاد

جن لوگوں سے زبردستی جنگ کی جاتی ہے انھیں اللہ کی طرف سے جہاد کی اجازت دی گئی ہے ——— (حج)

۱۳۔ ختم جہاد

اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف پلٹ آ۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں ——— (فجر)

۱۴۔ شہادت

خبردار! راہِ خدا کے شہیدوں کو مُردہ خیال بھی نہ کرنا۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رزق پا رہے ہیں ـــــ (آلِ عمران)

امام حسینؑ اور ارشاداتِ رسولِ اکرمؐ

۱۔ پروردگار! میں حسینؑ کو دوست رکھتا ہوں تو اسے اور اس کے دوستوں کو دوست رکھنا ـــــ (مسند احمد بن حنبل)

۲۔ میں اہلبیتؑ سے جنگ کرنے والے کے لیے سراپا جنگ اور صلح کرنے والے کے لیے سراپا صلح ہوں ـــــ (مسند احمد)

۳۔ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ پروردگار حسینؑ کے دوست کو دوست رکھتا ہے ـــــ (مسند احمد)

۴۔ حسنؑ و حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں ـــــ (مسند احمد)

۵۔ جو سردار جوانانِ جنت کو دیکھنا چاہتا ہے وہ حسینؑ کی طرف نظر کرے ـــــ (مسند احمد)

۶۔ حسنؑ و حسینؑ دنیا میں میرے دو پھول ہیں ـــــ مسند احمد

۷۔ میرے تمام گھرانے میں سب سے زیادہ محبوب حسنؑ و حسینؑ ہیں ـــــ (ترمذی)

۸۔ میں نے حسنؑ و حسینؑ کے نام اس لیے رکھے ہیں کہ یہ جنتی نام ہیں ـــــ (ایضاح بغوی)

۹۔ جو حسنؑ و حسینؑ کو دوست رکھے گا وہ میرا دوست اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میرا دشمن ہے (ابوس

۱۰۔ مجھے حسینؑ کے رونے سے تکلیف ہوتی ہے ـــــ (ابن منیع)

۱۱۔ جو حسنؑ و حسینؑ، ان کے باپ اور ان کی مادرِ گرامی سے محبت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا ـــــ (مسند احمد)

۱۲۔ حسینؑ! تم سید ابن سید، برادر سید، امام، ابن امام، برادر امام، حجت ابن حجت اور برادر حجت ہو ـــــ (مودۃ القربیٰ)

۱۳۔ حسینؑ میرا پارۂ جگر ہے۔ جو اسے اور اس کی اولاد کو دوست رکھے اس کے لیے طوبیٰ

ہے اور اس کے قاتل کے لیے جہنم ـــــ (مودۃ القربیٰ)

۱۴۔ میرا حسینؑ سرزمین طف پر شہید ہوگا اور یہ امت میرے بعد فتنہ میں مبتلا ہو جائے گی (جمع الفوائد)

اندازِ غمِ حسینؑ

۱۔ دل کا رنجیدہ ہونا۔

۲۔ دل میں درد کا اُٹھ جانا۔

۳۔ آنکھوں کا نم ہو جانا۔

۴۔ آنسوؤں کا نکل آنا۔

۵۔ آنسوؤں کا ٹپکنے لگنا۔

۶۔ آنسوؤں کا رخساروں پر جاری ہونا۔

۷۔ آواز کا بلند ہو جانا۔

۸۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ جانا۔

۹۔ صدائے نالہ و شیون کا بلند ہو جانا۔

۱۰۔ سر و سینہ پیٹ لینا۔

۱۱۔ اندازِ حزن و غم پیدا کر لینا۔

۱۲۔ روتے روتے آنسوؤں کا خشک ہو جانا۔

۱۳۔ شدتِ غم سے ترکِ آب و دانہ کر دینا۔

۱۴۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے خون کے قطرے ٹپک پڑنا۔

اسبابِ بکاء علی الحسینؑ

۱۔ جنابِ آدمؑ نے عالمِ قدس میں تصویر دیکھی تو روئے۔

۲۔ مومن کے سامنے ذکر آئے گا تو روئے گا۔

۳۔ مرسلِ اعظمؐ کی نگاہ پڑ گئی تو روئے۔

۴۔ ارضِ کربلا پر نگاہ سبب گریہ ہے۔

۵۔ انبیاء نے نام حسینؑ لیا اور روئے۔

۶۔ پیغمبرؐ نے لب و دنداں کے بوسے لیے اور روئے۔

۷۔ انتساب الی الحسینؑ موجب گریہ ہے جناب نوحؑ نے نام حسینؑ سے کیل اٹھائی اور روئے۔

۸۔ ماہ محرم آیا اور آنسو نکل پڑے۔

۹۔ مومن سرزمین کربلا پر وارد ہوا اور رو دیا۔

۱۰۔ نام کربلا آیا اور آنسو نکل آئے۔

۱۱۔ ٹھنڈا پانی پیا اور امام صادقؑ کے آنسو نکل پڑے۔

۱۲۔ خاک کربلا کو سونگھا اور ثانی زہراؑ گریہ فرمانے لگیں۔

۱۳۔ کسی غریب و مظلوم کا ذکر آیا اور حسینؑ کے مصائب پر رونا آگیا۔

۱۴۔ مصائب کربلا پر غور کیا اور آنسوؤں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

فضائل و امتیازاتِ گریہ

۱۔ گریہ رسول اکرمؐ سے ارتباط کا ذریعہ ہے۔

۲۔ گریہ معصومۂ عالمؑ کی تسکین کا سبب ہے۔

۳۔ گریہ ادائے حق پیغمبرؐ ہے۔

۴۔ گریہ اقتدائے سیرت مرسلین ہے۔

۵۔ گریہ مصداق اجر رسالت ہے۔

۶۔ گریہ تسلیتِ قلب معصومینؑ ہے۔

۷۔ گریہ نصرتِ حسینؑ ابن علیؑ ہے۔

۸۔ گریہ ہمہ وقت عبادت ہے۔

۹۔ گریہ وجہ شفاعت ہے۔

۱۰۔ گریہ آتشِ جہنم کو خاموش کرنے کا ذریعہ ہے۔

۱۱۔ چشم گریاں بر حسینؑ روز قیامت گریاں نہ ہوگی۔

۱۲۔ قطرۂ اشک محبوب پروردگار ہے۔

۱۳۔ قطرات اشک کو ملائکہ شیشے میں جمع کرتے ہیں۔

۱۴۔ اشکِ عزا ذخیرۂ آخرت اور موجب ثواب بے حساب ہے۔

خبردار! ان روایات پر کوئی شخص یہ اعتراض نہ کرے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ گریہ خود دعوتِ عمل ہے۔ گریہ امام حسینؑ سے ربط کی علامت ہے اور ربطِ حسینؑ مستقل دعوتِ عمل ہے۔ حسینؑ کا ربط عمل صالح سے ہے بے عملی سے نہیں ہے!

مجالس قبلِ ولادت امام حسینؑ

۱۔ جناب آدمؑ نے عرفات میں پنجتن پاک کا واسطہ دے کر دعا کی تو نام حسینؑ پر آنسو نکل آئے اور جبرئیل نے مصائب بیان کیے۔

۲۔ شب معراج جنت میں حوریہ نے مصائب بیان کیے اور پیغمبرِ اسلامؐ سماعت فرماتے رہے۔

۳۔ شب معراج دو قصر سرخ و سبز دیکھ کر جنت میں جبرئیل نے مصائب امام حسینؑ بیان کیے اور حضور سرور کائنات نے گریہ فرمایا۔

۴۔ جناب آدمؑ سرزمین کربلا سے گذرے تو ٹھوکر کھانے پر پیروں سے خون جاری ہوگیا اور وحی الٰہی آئی کہ یہ ارضِ کربلا ہے اور آدمؑ روئے۔

۵۔ سفینۂ نوحؑ کو جھٹکا لگا تو ارشاد قدرت ہوا کہ سفینہ ارضِ کربلا سے گذر رہا ہے، اور جناب نوحؑ روئے۔

۶۔ جناب موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات ہوئی تو خضرؑ نے مصائب آل محمدؐ بیان کیے اور دونوں روئے۔

۷۔ بساط سلیمانی کا گزر کربلا کی سمت سے ہوا تو چکر آگیا اور حاملان بساط نے مصائب کربلا بیان کیے۔

۸۔جناب ابراہیمؑ نے ملکوت سماوات وارض کے مشاہدہ میں شبیہ حسینؑ دیکھی تو گریہ شروع کر دیا۔
۹۔بت شکنی کے موقع پر تصور مصائب حسینؑ کی بنا پر فرمایا کہ میں بیمار ہوں۔
۱۰۔اسماعیلؑ کی قربانی پر ذکر حسینؑ آگیا تو بے ساختہ گریہ فرمایا۔
۱۱۔جناب ابراہیمؑ کا زمین کربلا سے گذر ہوا تو گھوڑے سے گر پڑے اور گریہ فرمایا۔
۱۲۔جناب اسماعیلؑ شط فرات پر گوسفند چرا رہے تھے اور گوسفندوں نے پانی نہیں پیا تو بیان مصائب کربلا پر روئے۔
۱۳۔جناب عیسیٰ نے حواریین کے درمیان ذکر کربلا کیا اور سب رونے لگے۔
۱۴۔جناب موسیٰؑ طور سینا پر بار بار روئے۔
(الخصائص الحسینیہ)

مجالس بعد ولادت امام حسینؑ

۱۔آسمانوں پر تہنیت ولادت کے لیے آنے والے دس لاکھ ملائکہ سے پروردگار عالم نے مصائب حسینؑ بیان کیے۔
۲۔حجرۂ جناب سیدہؑ میں تذکرۂ مصائب کیا گیا۔
۳۔ازواج کے حجرات میں بھی تذکرہ کیا گیا۔
۴۔مسجد پیغمبرؐ میں کبھی خود پیغمبرؐ نے بیان کیا، کبھی جبرئیل امین نے اور کبھی بارہ فرشتوں نے جو زیارت امام حسینؑ کے لیے آئے تھے۔
۵۔خاک کربلا جناب ام سلمہ کے حوالہ کرتے ہوئے جناب پیغمبر اسلامؐ کا بیان۔
۶۔منبر کوفہ سے مولائے کائنات کا بیان مصائب۔
۷۔صفین سے واپسی پر زمین کربلا پر مولائے کائنات کا بیان۔
۸۔صدیقہ طاہرہؑ کی مجلسیں۔
۹۔مدینہ میں ام البنینؑ کا بیان۔
۱۰۔وقت آخر امام حسنؑ کا بیان مصائب جس کے سامع خود امام حسینؑ تھے۔

۱۱۔مدینہ سے رخصت کے وقت قبر رسولؐ پر تذکرۂ مصائب جس کے ذاکر پیغمبر اکرمؐ تھے اور سامع امام حسینؑ۔
۱۲۔ہاشمی خواتین کے درمیان وقت رخصت مدینہ امام حسینؑ کا بیان مصائب۔
۱۳۔امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے وقت ملائکہ اور جنات کے درمیان بیان مصائب۔
۱۴۔حجاج کے درمیان امام حسینؑ کا بیان مصائب بیت اللہ الحرام میں۔
(خصائص حسینیہ)

مجالس بعد شہادت امام حسینؑ

۱۔مقتل میں ثانی زہراؑ کا بیان۔
۲۔لاش مطہر کے گرد جنات کا نوحہ۔
۳۔کوفہ کے بازار میں اہل حرم کا بیان
۴۔شام و مدینہ میں اہلبیتؑ کا بیان۔
۵۔دربار یزید میں تذکرۂ مصائب۔
۶۔مسجد اموی میں امام زین العابدینؑ کا خطبہ۔
۷۔شام کی عورتوں کے درمیان ثانی زہراؑ کا بیان۔
۸۔مدینہ کے باہر عابدؑ بیمار کا بیان۔
۹۔قریب مدینہ جناب ام کلثومؑ کا مرثیہ۔
۱۰۔قبر حسینؑ پر ملائکہ کا نوحہ و ماتم۔
۱۱۔آسمانوں پر مجلس صدیقہ طاہرہؑ۔
۱۲۔ائمہ معصومینؑ کی مجلسیں۔
۱۳۔ملائکہ کی مجلسیں۔
۱۴۔عزاداران حسینؑ کی مجلسیں۔

منازلِ شہادت

۱۔ شہید مربوط بحق ہوتا ہے۔
۲۔ شہید قوم پر صاحب حق ہوتا ہے۔ اپنی زندگی دے کر ساری قوم کو زندہ کرتا ہے۔
۳۔ شہید نمونۂ ایثار ہوتا ہے۔
۴۔ شہید کا جسم بھی محترم ہوتا ہے۔
۵۔ شہید کا ہر قطرۂ خون محبوب پروردگار ہوتا ہے۔
۶۔ شہید نیکیوں کے آخری مرتبے کا نام ہے۔
۷۔ شہید روز قیامت شہادت دیتا ہے۔
۸۔ شہید روز قیامت شفاعت کرتا ہے۔
۹۔ شہید کی خاک تربت طیب و طاہر ہوتی ہے۔
۱۰۔ لفظ شہید ہر قوم و ملت میں قابلِ احترام ہے۔
۱۱۔ شہید جنت کا خریدار ہوتا ہے۔
۱۲۔ شہید نفس مطمئن اور مرضیٔ حق کا طلبگار ہوتا ہے۔
۱۳۔ شہید صاحب نعمت و فضلِ الٰہی ہوتا ہے۔
۱۴۔ شہید زندۂ جاوید اور مرزوق عند اللہ ہوتا ہے۔

دُروسِ کربلا

۱۔ وطن کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو، اسلام پر وقت پڑ جائے تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔
۲۔ مقصد کی راہ میں ہر طرح کی قربانی ضروری ہے۔
۳۔ حقیقی محبت یہی ہے کہ دوست کی راہ میں جان بھی دے دی جائے۔
۴۔ حریت کا اسلامی مفہوم یہ ہے کہ ظالم کی نوکری سے آزادی حاصل کر لی جائے۔
۵۔ فقاہت کے معنی یہ ہیں کہ نصرت حسینؑ میں قدم آگے بڑھیں، اور ظالموں کو بھی

دعوتِ نماز دی جائے۔
۶۔ حقیقی مساوات یہ ہے کہ غلام کا سر بھی اپنے زانو پر رکھا جائے۔
۷۔ شجاعت جذبات نفس پر قابو پانے اور جذبات کو پابند مشیت بنا دینے کا نام ہے۔
۸۔ تقاضائے وفا یہ ہے کہ امان نار ملے مگر اسے ٹھکرا دیا جائے۔
۹۔ قربانی کا مفہوم یہ ہے کہ جذبات کی قربانی دی جائے نہ کہ جذباتی قربانی۔
۱۰۔ تبلیغ کا صحیح راستہ یہ ہے کہ راستہ روکنے والے کو بھی پانی پلا دیا جائے۔
۱۱۔ اسلامی جہاد کا انداز یہ ہے کہ شدت مظالم میں بھی جنگ کی ابتدا نہ کی جائے۔
۱۲۔ دشمن لاکھ سرکشی پر آمادہ ہو لیکن دعوت الی اللہ دیتے رہو۔
۱۳۔ میدانِ جہاد میں قدم جما دو تو لاکھوں کے مقابلہ میں بھی قدم پیچھے نہ ہٹیں۔
۱۴۔ بندگی کی حقیقی شان یہ ہے کہ زیر خنجر بھی سجدۂ معبود ادا کیا جائے۔

ترجمہ

دُعائے عرفہ امام حسینؑ

امام حسینؑ ـــــ میدانِ عرفات میں

ماہِ ذی الحجہ کی نویں تاریخ تھی۔ مکہ معظمہ کے قریب عرفات کے میدان میں حجاج بیت اللہ مصروف ثنا و دعا تھے کہ ایک مرتبہ راوی کی نگاہ دامنِ کوہ کے اس حصہ پر پڑ گئی جہاں سرکار سید الشہدا امام حسینؑ اپنے اصحاب و انصار اور اہلِ خاندان کے ساتھ دعا و مناجات میں مصروف تھے۔ زبان مبارک پر حمد و ثنا اور التماس و دعا کے فقرات تھے اور چشم مبارک سے مسلسل آنسو جاری تھے۔

رُخ طرف آسمان اور ہاتھ اُٹھے ہوئے

لہجہ میں دعا و مناجات کا انداز اور طریقۂ التماس میں ایسا گداز جیسے کوئی گدائے بے نوا سلطان السلاطین کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض مدعا کر رہا ہو۔

امت کے لیے اس سے بہتر نسخۂ شفا و دعا اور تربیت قوم کے لیے اس سے بالاتر اندازِ بیانِ مدعا ممکن نہیں ہے۔ رب کریم جملہ اہلِ ایمان کو توفیق دے کہ میدانِ عرفات میں حاضر ہو کر یا کم سے کم روزِ عرفہ اس دُعا کی تلاوت کا شرف حاصل کریں۔

ـــــ جوادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساری تعریف اس خدا کے لیے ہے کہ جو بے طلب عطا کرنے والا اور بے پایاں کرم کا مالک ہے۔ نہ کوئی اس کے فیصلے کو ٹوک سکتا ہے نہ کوئی اس کی عطا کو روک سکتا ہے اور نہ اس کی جیسی کوئی شے ایجاد کر سکتا ہے۔

اس نے بے مثال چیزیں ایجاد کی ہیں اور اپنی حکمت کاملہ سے ہر صنعت کو محکم بنایا ہے۔ زمانہ کی ایجادات اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں اور امانتیں اس کی بارگاہ میں ضائع نہیں ہوتیں۔

ہر عمل کرنے والے کو جزا دینے والا، ہر قناعت کرنے والے کو صلہ عطا کرنے والا اور ہر فریاد کرنے والے پر رحم کھانے والا ہے۔ منافع کا نازل کرنے والا اور روشن و تابناک نور کے ساتھ کتابِ جامع کا اتارنے والا ہے۔

ہر ایک کی دعا سُننے والا، ہر ایک کے رنج کا دفع کرنے والا، درجات کا بلند کرنے والا اور جبّاروں کا قلع قمع کرنے والا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے، وہ بے مثال اور ہر ایک کی سُننے والا، ہر چیز کا دیکھنے والا اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

خدایا! میں تیری طرف متوجہ ہوں اور تیری ربوبیت کی گواہی دیتا ہوں۔ مجھے اقرار ہے کہ تو میرا پروردگار ہے۔ تیری بارگاہ میں مجھے پلٹ کر آنا ہے۔

تو نے مجھ پر اس وقت سے انعامات شروع کیے ہیں جب میں کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔ مجھے خاک سے پیدا کیا، مختلف صلبوں سے گزارا، زمانے کے حوادث، دہر کے اختلافات اور ماہ و سال کے تغیرات و انقلابات سے محفوظ رکھا۔

میرا سفر ایک مدت تک اصلاب سے ارحام کی طرف جاری رہا اور آخر میں یہ تیرا کرم ہوا کہ

تو نے اس دنیا میں بھیج دیا لیکن اپنے کمالِ رحم و کرم اور تمام لطف و احسان کی بنا پر ان سربراہانِ کفر کی حکومت میں نہیں بھیجا جنھوں نے تیرے عہد کو توڑا اور تیرے اصولوں کو جھٹلایا بلکہ اس ماحول میں بھیجا جہاں آسان ہدایت کے انتظامات تھے اور پھر اسی میں میری نشو و نما کا انتظام کیا۔

اس خلقت و تربیت سے پہلے بھی تیرا بہترین برتاؤ اور کامل ترین انعام یہ تھا کہ تو نے ایک قطرۂ نجس سے مجھے بنایا اور عجیب تر بنایا۔ گوشت، خون اور کھال کے درمیان تین تین پردوں میں رکھا اور خود مجھے بھی میری خلقت سے آگاہ نہ کیا۔ میرے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں رکھا اور مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔

اب جو تو نے دنیا میں بھیجا تو ہدایت و رہنمائی کے سارے انتظامات کے ساتھ مکمل برابر اور کامل الخلقت پیدا کیا۔ میں گہوارہ میں بچہ رہا تو تو نے حفاظت کا انتظام کیا۔ غذا کے لیے تازہ دودھ فراہم کیا۔ پالنے والی عورتوں کو مہربان بنا دیا۔ رحم دل ماؤں کو کفیل اور نگران بنا دیا۔ جنات کے آسیب سے محفوظ رکھا۔ زیادتی اور کمی سے بچائے رکھا۔ بے شک اے خدائے رحیم و کریم تیری ہستی بہت بلند و برتر ہے۔

اس کے بعد جب میں بولنے کے لائق ہوا تو تو نے اور مکمل نعمتیں دیں اور تربیت کے ذریعہ ہر سال مجھے آگے بڑھایا یہاں تک کہ جب میری فطرت کامل ہو گئی اور میرے قویٰ مضبوط ہو گئے تو تو نے اپنی حجت کو لازم قرار دے دیا۔ مجھے معرفت کا الہام کیا، اپنی حکمت کے عجائبات سے مدہوش بنا دیا اور زمین و آسمان کی عجیب ترین مخلوقات کے سمجھنے کے لیے مجھے بیدار مغز بنا دیا اور پھر اپنی یاد، اپنے شکریہ اور اپنی اطاعت و عبادت کے لیے ہوشیار کر دیا۔ اتنی صلاحیت دی کہ رسولوں کے پیغام کو سمجھ سکوں۔ اتنی آسانی فراہم کی کہ تیری مرضی کی باتوں کو قبول کر سکوں، اور پھر ان سب مواقع پر اپنی مدد اور اپنے لطف و کرم و احسان سے محروم نہیں رکھا۔ مجھے بہترین مٹی سے پیدا کیا اور پھر اسی ایک نعمت پر اکتفا نہیں کی بلکہ طرح طرح کی غذائیں دیں، قسم قسم کے لباس دیے۔ تیرا احسان میرے اوپر عظیم اور تیرا لطف قدیم ہے۔

پھر جب ساری نعمتوں کو مکمل کر دیا اور ساری بلاؤں کو دفع کر دیا تو بھی میری جہالت اور میری جسارت تجھے کرم سے روک نہیں سکی اور تو نے اس راستہ کی رہنمائی کی جو تجھ سے قریب تر بنا سکے، ان اعمال کی توفیق دی جو تیری بارگاہ میں تقرب کا باعث بن سکیں۔

اب بھی جب میں دعا کرتا ہوں تو قبول کر لیتا ہے اور جب سوال کرتا ہوں تو عطا کر دیتا ہے، جب اطاعت کرتا ہوں تو شکریہ ادا کرتا ہے اور جب شکریہ ادا کرتا ہوں تو مزید دے دیتا ہے۔ یہ سب درحقیقت تیرے احسانات و انعامات کی تکمیل ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

تو پاک، بے نیاز، پیدا کرنے والا، واپس لے جانے والا، قابلِ حمد و ثنا اور مالک مجد و بزرگی ہے۔ تیرے نام پاکیزہ اور تیری نعمتیں عظیم ہیں۔

خدایا! میں تیری کن کن نعمتوں کو شمار کروں اور کیسے یاد رکھ سکوں۔ تیرے کس کس عطیہ کا شکریہ ادا کروں جب کہ ساری نعمتیں بڑے بڑے شمار کرنے والوں کے احصاء سے بالاتر اور بڑے بڑے حافظہ والوں کے علم کی رسائی سے بلند تر ہیں۔ اس کے علاوہ جن نقصانات، مصائب اور بلاؤں کو تو نے ٹالا ہے وہ اُس عافیت و مسرت سے کہیں زیادہ اہم ہیں جن کا میں نے مشاہدہ کیا ہے اور جو میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

پروردگارا! میں اپنے ایمان کی حقیقت، اپنے یقین محکم، اپنی خالص اور واضح توحید، ضمیر کے پوشیدہ اسرار، نورِ بصارت کی گزرگاہوں، صفحۂ پیشانی کے خطوط، سانس کے گزرنے کے شگاف، قوتِ شامہ کے خزانوں، قوتِ سماعت تک آواز پہونچنے کے سوراخوں، ہونٹوں کے اندر دبے ہوئے رموز، زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ، دہن کے اوپر اور نیچے کے جبڑوں کے ارتباط کی جگہوں، داڑھ کے اُگنے کے مقامات، کھانے پینے کی سہولت کے راستے، کار سر کو سنبھالنے والے استخوان، گردن کے اعصاب کے ارتباط کی وسعتوں، سینہ کی فضاؤں، گردن کے رشتوں کو سنبھالنے والے اعصاب، قلب کے پردہ کو روکنے والے ڈورے، جگر کے ٹکڑوں کو جمع کرنے والے اجزاء، پہلو، جوڑ بند، قوائے عمل، اطراف انگشت کے محتویات و مشتملات، گوشت، خون، بال، کھال، اعصاب، شرائین، استخوان، مغز، رگیں، جوارح اور دورانِ رضاعت و شیر خواری مرتب ہونے والے اجزاء بدن اور زمین نے جو میرے وجود کا بار اٹھا رکھا ہے اور اپنی نیند، بیداری، حرکات و سکنات، رکوع و سجود سب کے حوالے سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر میں ارادہ بھی کروں اور کوشش بھی کروں کہ آخر زمانہ

تک زندہ رہ کر تیری کسی ایک نعمت کا شکریہ ادا کروں تو یہ ناممکن ہے۔ مگر یہ کہ تیرا احسان ہی شاملِ حال ہو جائے۔ مگر وہ خود بھی تو ایک شکریہ کا طلبگار رہے۔ میرے اوپر ہر وقت ایک نیا احسان ہے اور جس سے ہر آن ایک نئے شکریہ کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے۔

بے شک ہیں کیا اگر میرے ساتھ تمام شمار کرنے والے انسان شریک ہو کر تیرے جدید و قدیم احسانات کی انتہا دریافت کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے اور نہ انھیں شمار کر سکتے ہیں۔ اور یہ ممکن بھی کس طرح ہوگا جب کہ تو نے خود اپنی کتابِ ناطق اور خبرِ صادق کے ذریعہ یہ اعلان کر دیا ہے کہ:

"اگر تم سب مل کر بھی میری نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو نہیں کر سکتے ہو۔"

بے شک تیری کتاب صادق، تیری خبر سچی اور تیرا بیان حق ہے۔ تیرے انبیاء و مرسلین نے تیری وحی اور شریعت کو مکمل طریقہ سے پہونچایا ہے اور میں خود بھی اپنی کوشش، ہمت، حدّ اطاعت اور وسعت و امکان بھر اس بات کی گواہی دیتا ہوں اور اس پر اپنے ایمان و یقین کا اعلان کرتا ہوں کہ ساری تعریف اس خدا کے لیے ہے جس کا کوئی بیٹا نہیں ہے کہ اس کی میراث کا مالک ہو جائے۔ کوئی شریک نہیں ہے کہ ایجادات میں جھگڑا کرے، کوئی ولی و سرپرست نہیں ہے کہ صنعت میں تعاون کرے۔ وہ پاک و پاکیزہ اور بے نیاز ہے۔ اگر زمین و آسمان میں اس کے علاوہ کوئی بھی خدا ہوتا تو زمین و آسمان دونوں برباد ہو جاتے اور ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے۔

وہ پاک و بے نیاز، ایک، اکیلا اور سب سے مستغنی ہے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے، نہ بیٹا اور نہ ہمسر۔

میں اس کی اس حمد کا اعلان کرتا ہوں جو ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین کی حمد کے برابر ہو۔ خدا خیر المرسلین، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰؐ اور اُن کی آلِ طیّبین و طاہرین پر رحمتیں نازل فرمائے۔

خدایا! مجھے ایسا بنا دے کہ میں تجھ سے اس طرح ڈرروں جیسے تجھے دیکھ رہا ہوں۔ اپنے تقویٰ سے میری امداد فرما اور معصیت سے مجھے شقی اور بدبخت نہ بنا دینا، اپنے فیصلہ کو میرے

حق میں بہتر قرار دے اور اپنے مقدرات کو میرے لیے مبارک بنا دے تاکہ جس چیز کو تو نے دیر میں رکھا ہے اس کی جلدی نہ کروں اور جس چیز کو مقدم کر دیا ہے اس کی تاخیر نہ چاہوں۔

خدایا مجھے دل کا غنی بنا دے۔ میرے نفس میں یقین، عمل میں اخلاص، بصارت میں نور اور دین میں بصیرت عطا فرما، میرے لیے اعضا و جوارح کو مفید قرار دیدے اور سماعت و بصارت کو میرا وارث بنا دے، ظلم کرنے والوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما اور ان سے میرا انتقام میری نظروں کے سامنے لے لے تاکہ میری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔

خدایا! میرے رنج کو دور فرما، میرے مخفی امور کی پردہ پوشی فرما، میری خطاؤں کو بخش دے، شیطان کو مجھ سے دور رکھ، میری گرفتاریوں میں رہائی عطا فرما اور دنیا و آخرت میں مجھے بلند ترین درجات پر فائز فرما۔

خدایا! تیرا شکر کہ تو نے پیدا کیا، تو سماعت و بصارت سمیت پیدا کیا۔ تیرا شکر کہ تو نے خلق کیا تو تام و کامل خلق کیا۔

یہ صرف تیری رحمت ہے ورنہ تو میری تخلیق سے بے نیاز تھا۔

خدایا! جس طرح تو نے تخلیق میں خلقت کو معتدل بنایا ہے اور تصویر میں صورت کو حسین اور متناسب بنایا ہے مجھ پر احسان کر کے میرے نفس میں عافیت عطا کی ہے مجھے محفوظ رکھا ہے ۔۔۔ اور توفیق کرامت فرمائی ہے، مجھ پر انعام کیا ہے اور مجھے ہدایت دی ہے، مجھے احسان کے قابل بنایا ہے اور ہر خیر کا ایک حصہ عطا کیا ہے، مجھے کھانا کھلایا ہے اور پانی پلایا ہے، مجھے بے نیاز بنایا ہے اور سرمایہ و عزت عطا کی ہے۔ میری مدد کی ہے اور مجھے معزز بنایا ہے۔ مجھے اپنی خاص کرامت سے ستر پوشی کرنے والا لباس دیا ہے اور اپنی مخصوص رحمت سے مشکلات کو آسان بنایا ہے۔

خدایا! تو اب محمدؐ و آلِ محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور زمانہ کے مہلکات اور روز و شب کے تصرفات کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ دنیا کے ہولناک مواقع اور آخرت کے رنج افزا مراحل سے نجات عطا فرما اور روئے زمین کے ظالموں کی تدبیروں سے محفوظ فرما۔

خدایا! جس چیز کا مجھے خوف ہے اس کے لیے کفایت فرما اور جس چیز سے پرہیز کرتا ہوں،

اس سے بچالے۔ میرے نفس اور دین میں میری حراست فرما اور میرے سفر میں میری حفاظت فرما، اہل و مال کی کمی کو پوری فرما، اور جو رزق تو نے دیا ہے اس میں برکت عطا فرما۔ مجھے خود میرے نزدیک ذلیل بنادے اور لوگوں کی نگاہوں میں صاحب عزّت قرار دیدے، جنّ وانس کے شر سے صحیح وسالم رکھنا اور گناہوں کی بنا پر مجھے رُسوا نہ کرنا، میرے اسرار کو بے نقاب نہ فرمانا اور میرے اعمال میں مجھے مبتلا نہ کرنا، جو نعمتیں دے دی ہیں انھیں واپس نہ لینا اور اپنے علاوہ کسی غیر کے حوالہ نہ کردینا۔

خدایا ! تو مجھے اپنے علاوہ کس کے حوالے کرے گا ؟ اقربار کے حوالے کرے گا کہ قطع تعلق کرلیں۔ یا دور والوں کے سپرد کردے گا کہ حملہ آور ہوجائیں۔ یا مجھے کمزور بنا دینے والوں کے حوالے کردے گا جب کہ تو ہی میرا رب اور میرے امور کا مالک ہے۔

خدایا۔ میں تجھ سے اپنی غربت، وطن سے دوری اور صاحبانِ اختیار کی نگاہوں میں اپنی ذلّت کی فریاد کرتا ہوں۔

خدایا ! مجھ پر اپنا غضب نازل نہ فرمانا کہ تو نے غضب سے آزاد کردیا تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ تو پاک و بے نیاز ہے اور تیری عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔

پروردگار ! میں تیرے روئے روشن کے واسطہ سے جس نے زمین وآسمان کو منور کردیا ہے اور ظلمتوں کو کافور بنا دیا ہے اور اولین وآخرین کے امور کی اصلاح کردی ہے۔ یہ سوال کرتا ہوں کہ میری موت تیرے غضب کے عالم میں نہ ہو اور مجھ پر تیری ناراضگی کا نزول نہ ہو۔ میں بار بار گزارش کرتا ہوں کہ عذاب نازل ہونے سے پہلے مجھ سے راضی ہوجا اور اپنی ناراضگی کو لطف وکرم میں تبدیل کردے تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ تو شہر محترم، مشعر الحرام اور اس عذاب سے آزاد کرانے والے قدیم ترین گھر کا مالک ہے جسے تو نے برکتوں سے بھر دیا ہے اور لوگوں کے لیے جائے امن بنا دیا ہے۔

اے خدا ! جس نے اپنے علم سے عظیم ترین گناہوں کو معاف کیا ہے اور اپنے فضل وکرم سے مکمل ترین نعمتیں عطا کی ہیں۔

اے خدا ! جس نے اپنے کرم سے بہت کچھ عطا فرمایا ہے۔ اے شدتوں کے لیے ذخیرۂ بندگان ! تنہائیوں کے ساتھی رنج وغم کے فریاد رس، نعمتوں کے مالک ! میرے اور میرے

بزرگان خاندان ابراہیمؑ واسماعیلؑ واسحاق ویعقوب کے مالک ! جبرئیل ومیکائیل واسرافیل اور خاتم النبیین محمد مصطفیٰؐ اور ان کی آل طیبین وطاہرین کے پروردگار ! توریت وانجیل وزبور وقرآن کے نازل کرنے والے ! کٓھٰیٰعٓصٓ وطٰہٰ ویٰسٓ اور قرآن حکیم کے عرش اعظم سے اُتارنے والے ! تو اس وقت بھی میری پناہ گاہ ہے جب وسیع ترین راستے بھی مشکل ہوجائیں اور بے پناہ وسعتیں رکھنے والی زمین بھی تنگ ہوجائے۔

تیری رحمت نہ ہوتی تو میں ہلاک ہوجاتا کہ تو گرتے ہوئے کو سہارا دینے والا ہے، تیری پردہ پوشی نہ ہوتی تو میں رُسوا ہوجاتا کہ تو دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کرنے والا ہے اور تیری کمک نہ ہوتی تو میں بالکل مغلوب ہوجاتا۔

اے وہ خدا ! جس نے بلندی اور رفعت کو اپنے لیے مخصوص رکھا ہے اور چاہنے والے اسی کی عزّت سے صاحب عزّت بنے ہوئے ہیں۔

اے وہ خدا ! جس کے سامنے بادشاہوں نے ذلّت اور خاکساری کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے اور وہ اس کی ہیبت سے لرزہ براندام ہیں۔

وہ آنکھوں کے خیانت کار اشاروں اور دل کے ہر رنگ رازوں سے باخبر ہے اور اسے آنے والے زمانوں کے تمام حالات وکیفیات کی اطلاع ہے۔

اے وہ خدا ! جس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے کہ اس کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔

اے زمین کو پانی پر روکنے والے اور ہوا کے راستوں کو آسمانوں سے بند کرنے والے !۔ اے وہ خدا جس کے نام بزرگ ترین ہیں اور جس کی نیکیاں ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ اے صحرائے بے آب وگیاہ میں یوسفؑ کے لیے قافلے کے روکنے والے ! اور انھیں کنویں سے نکال کر غلامی کی کیفیت سے بادشاہت تک پہونچانے والے ! اے شدتِ گریہ سے آنکھوں کے سفید ہوجانے کے بعد انھیں یعقوب تک پلٹا دینے والے !

اے ایوبؑ کی بلاؤں اور مصیبتوں کے دور کرنے والے ! اور اے ابراہیمؑ کی ضعیفی میں ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹے کے ذبح کے امتحان سے روکنے والے !

اے زکریاؑ کی دعا کو قبول کر کے یحییٰ جیسا فرزند عطا کرنے والے اور انھیں تنہائی اور لاوارثی کی مصیبت سے بچانے والے!

اے یونسؑ کو شکم ماہی سے نکالنے والے!

اے سینۂ سمندر کو چاک کر کے بنی اسرائیل کو نجات دلانے والے اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دینے والے!

اے اپنی رحمتِ خاص سے ہواؤں کو خوش گوار موسم کی بشارت دے کر بھیجنے والے!

اے اپنی گناہ گار مخلوقات پر جلدی عذاب نہ کرنے والے! اور موسیٰؑ کے مقابلہ میں آنے والے جادوگروں کو عذاب سے بچا لینے والے! جب کہ انھوں نے بہت دنوں تک حقائق کا انکار کیا تھا اور رزق خدا کھا کر غیر خدا کی عبادت کی تھی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کر کے ان سے برسرِ پیکار رہ چکے تھے۔

اے اللہ! اے اللہ! اے بے مثل ایجاد کرنے والے اور بے مثال پیدا کرنے والے! تیرا کوئی جواب نہیں ہے اور تو ہمیشہ سے ہے، تجھے فنا نہیں ہے تو اس وقت بھی زندہ رہنے والا ہے جب کوئی ذی حیات نہ رہ جائے۔ اے مُردوں کو زندہ کرنے والے اور ہر نفس کے اعمال و افعال کی نگرانی کرنے والے!

اے وہ خدا! جس کا شکریہ میں نے بہت کم ادا کیا ہے لیکن اس نے نعمتوں سے محروم نہیں رکھا ہے۔ میری خطائیں بہت عظیم رہی ہیں لیکن اس نے رُسوا نہیں کیا ہے مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اسے مشہور نہیں کیا ہے۔ اس نے بچپنے میں بھی میری حفاظت کی ہے اور ضعیفی میں بھی مجھے رزق دیا ہے۔

اے وہ خدا! جس کی نعمتیں میرے پاس بے شمار ہیں اور اس کے الطاف و مکارم ناقابلِ معاوضہ ہیں۔

اے وہ خدا! جس نے میرا سامنا خیر و احسان کے ساتھ کیا ہے جب کہ میں نے اس کا مقابلہ برائی اور عصیان سے کیا ہے۔

اے وہ خدا! جسے میں نے حالتِ مرض میں پکارا تو شفا دے دی، برہنگی میں آواز دی

تو لباس عطا فرما دیا، بھوک میں پکارا تو غذا دے دی، پیاس میں فریاد کی تو پانی پلا دیا، ذلت میں پکارا تو عزت دے دی، جہالت میں پکارا تو معرفت دے دی، اکیلے میں آواز دی تو کثرت دے دی، غائب کے بارے میں التماس کی تو واپس پہونچا دیا، غربت میں فریاد کی تو غنی بنا دیا، ظلم کے مقابلہ میں کمک مانگی تو عطا فرما دی، مالداری میں پکارا تو نعمت واپس نہیں لی اور کچھ نہ مانگا تو از خود عطا کر دیا۔

اے وہ خدا! جس نے لغزشوں میں سہارا دیا، رنج و غم سے نجات دی، دعا کو قبول کیا، مخفی امور کی پردہ پوشی کی، گناہوں کو معاف کیا، مقصد کو پورا کیا، دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کی۔ میں تیری نعمتوں، تیرے احسانات اور تیری عظیم بخششوں کو شمار کرنا بھی چاہوں تو ہرگز شمار نہیں کر سکتا۔

تو ہی وہ ہے جس نے احسان کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے انعام دیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے لطف و فضل کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے بہترین برتاؤ کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے فضل و کرم کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے کامل نعمتیں عطا کی ہیں۔

تو ہی وہ ہے جس نے رزق دیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے توفیق دی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے عطا کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے غنی بنایا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے منتخب نعمتیں عطا کی ہیں۔ تو ہی وہ ہے جس نے پناہ دی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے کفایت کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے ہدایت کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے محفوظ رکھا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے پردہ پوشی کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے مغفرت کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے لغزشوں میں سہارا دیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے طاقت دی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے عزت دی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے امداد کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے زور بازو عطا کیا ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے تائید کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے نصرت کی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے شفا دی ہے۔ تو ہی وہ ہے جس نے عافیت دی ہے۔ اور تو ہی وہ ہے جس نے بزرگی عطا کی ہے۔

تو صاحبِ برکت و عظمت ہے، تیری حمد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے اور تیرا شکریہ بے حساب و بے نہایت ہے۔ اب اس کے بعد میرا حال زار یہ ہے کہ میں وہ بندۂ گناہ گار ہوں جسے اپنے

گناہوں کا اقرار اور اپنی خطاؤں کا اعتراف ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے بُرائیاں کی ہیں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے خطائیں کی ہیں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے گناہوں کا ارادہ کیا ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے جہالت سے کام لیا ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے غفلت برتی ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس کو سہو ونسیان عارض ہوا ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے قصداً گناہ کیے ہیں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے جان بوجھ کر غلط اقدامات کیے ہیں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے بے شمار وعدے کیے ہیں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے عہدوں کو توڑا ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے بُرائیوں کا اقرار کیا ہے۔ میں ہی وہ ہوں جس نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ نعمتیں مجھ پر نازل ہوتی رہی ہیں اور اب بھی میرے پاس ہیں لیکن میں برابر گناہوں میں مبتلا رہا ہوں۔

پروردگار! مجھے معاف فرما دے کہ مجھ جیسے بندوں کے گناہوں سے تیرا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تو ہر ایک کی عبادت سے بے نیاز ہے اور ہر نیک عمل کرنے والے کو اپنی توفیق وتائید سے سہارا بھی دیتا رہتا ہے۔ میرے مالک اور میرے پروردگار! ساری حمد تیرے لیے ہے۔ خدایا! تو نے مجھے حکم دیا ہے تو میں نے سرتابی کی ہے اور منع کیا ہے تو میں نے اطاعت نہیں کی ہے۔ اب میرے پاس برات کے لیے کوئی عذر نہیں ہے اور عذاب کو دفع کرنے کے لیے کوئی صاحب طاقت بھی نہیں ہے۔

میں کس طرح تیرا سامنا کروں اور کس کے سہارے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اس سماعت کے سہارے یا اس بصارت کے ذریعہ۔ اس زبان کے سہارے یا اس دل کے سہارے۔ اس ہاتھ کے وسیلہ سے یا ان پیروں کے سہارے سے؟ یہ سب ہی تو تیری نعمتیں ہیں اور ان سب ہی سے تو میں نے تیری معصیت کی ہے۔ یہ سب ہی تو میرے خلاف تیری حجتیں اور دلیلیں ہیں۔

میرے پروردگار! جس نے میری بُرائیوں کو میرے ماں باپ سے بھی مخفی رکھا ہے اور انھیں جھڑکنے نہیں دیا ہے۔ عشیرہ وقبیلہ سے مخفی رکھا ہے اور انھیں سرزنش نہیں کرنے دیا ہے۔ حکام وسلاطین سے پوشیدہ رکھا ہے اور انھیں سزا نہیں دینے دی ہے۔ جب کہ یہ سب تیری طرح ساری حرکتوں پر مطلع ہوتے تو ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دیتے اور مجھے بالکل نظرانداز کر دیتے بلکہ مجھ سے قطع تعلق کر لیتے۔

اب میں تیری بارگاہ میں خضوع وخشوع، تواضع وانکسار اور اپنی حقارت وذلّت کے

ساتھ حاضر ہوں نہ برات ذمہ کے لیے کوئی عذر رکھتا ہوں اور نہ گناہوں سے بچانے والا کوئی طاقتور سہارا۔ نہ میرے پاس کوئی دلیل ہے جس سے استدلال کروں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ گناہ میں نے نہیں کیا ہے یا یہ بُرائی مجھ سے نہیں ہوئی ہے۔ میں تو انکار بھی نہیں کر سکتا ہوں اور انکار کروں بھی تو کیا فائدہ ہوگا جب کہ سارے اعضاء وجوارح میرے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تو ان بڑے بڑے امور کے بارے میں سوال ضرور کرے گا اور تو حاکم عادل ہے تیرے یہاں ظلم کا گزر نہیں ہے لیکن خدایا میرے لیے تو انصاف وعدل بھی تباہ کن ہے۔ میں تو تیرے عدل وانصاف سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں اور صرف فضل وکرم کا معاملہ چاہتا ہوں۔

میرے پروردگار! تو اگر عذاب بھی کرے گا تو یہ میرے گناہوں کا نتیجہ ہوگا کہ تیری حجت تمام ہو چکی ہے اور تو معاف بھی کر دے گا تو یہ تیرے حلم وجود وکرم کا نتیجہ ہوگا۔ کہ تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ تو پاک اور بے نیاز ہے اور میں ظلم کرنے والوں میں ہوں۔

تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں استغفار کرنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں توحید کا کلمہ پڑھنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں خوف زدہ ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں لرزہ براندام ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں امیدواروں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں رغبت رکھنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں تیری وحدانیت کا اقرار کرنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں تیری تسبیح کرنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میں تیری بزرگی کا اعتراف کرنے والوں میں ہوں۔ تو اکیلا اور بے نیاز ہے اور میرا اور میرے آباء واجداد سب کا پروردگار بھی ہے۔

پروردگار! یہ میری حمد وثنا تیری بزرگی کے اقرار کے ساتھ ہے۔ اور یہ میرا اخلاص ذکر تیری توحید کے اعتراف کے ہمراہ ہے۔ میں تیری نعمتوں کا ایک ایک کر کے اقرار کرتا ہوں اور پھر یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ کوئی انھیں شمار نہیں کر سکتا۔ وہ بے حد وبے حساب اور بے نہایت وبے شمار ہیں۔ تام وکامل بھی ہیں اور واضح وروشن اور قدیم وجدید بھی۔

تیری نعمتوں کا سلسلہ روز اول سے جاری ہے۔ جس دن سے تو نے مجھے خلق کیا اور میری زندگی کا آغاز کیا۔ وہ نعمتیں یہ ہیں کہ تو نے فقیری میں بے نیازی دی ہے، نقصانات کو رفع کیا ہے۔ سہولتوں کے انتظامات کیے ہیں، سختیوں کو دور کیا ہے، رنج والم کو برطرف کیا ہے، بدن میں عافیت دی ہے، دین میں سلامتی دی ہے۔ اور یہ نعمتیں اس قدر بے حساب ہیں کہ اگر اولین و آخرین مل کر میری مدد کریں اور میں ان کا حساب کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا اور نہ وہی سب کر سکتے ہیں۔ تو پاک و پاکیزہ اور بلند و برتر ہے۔ تو رب کریم و عظیم و رحیم ہے اور تیری نعمتوں کا شمار نہیں ہے۔ تیری حمد و ثنا کی منزل تک کوئی پہونچ نہیں سکتا اور تیری نعمتوں کا بدلہ ممکن نہیں ہے۔

پروردگار! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور میرے اوپر اپنی نعمتوں کو مکمل کر دے اور اپنی اطاعت سے نیک بخت بنا دے کہ تو پاک و بے نیاز اور وحدہ لاشریک ہے۔

خدایا! تو مضطر لوگوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے، بُرائیوں کو دفع کرتا ہے، ستم رسیدہ کی فریاد رسی کرتا ہے، بیماروں کو شفا دیتا ہے، فقیروں کو غنی بناتا ہے دل شکستہ کے دل کو جوڑ دیتا ہے، بچوں پر رحم کرتا ہے، بڑوں کو مدد پہونچاتا ہے۔ تیرے علاوہ کوئی مددگار نہیں ہے اور تجھ سے بالاتر کوئی صاحب طاقت نہیں ہے۔ تو خدائے علی و کبیر ہے۔

اے پابستۂ زنجیر اسیروں کو رہائی دلانے والے! اے کمسن بچوں کو روزی دینے والے! اے خوف زدہ طالبان پناہ کو پناہ دینے والے! اے وہ خدا جس کا کوئی شریک اور وزیر نہیں ہے۔ محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور آج کی شام مجھے وہ سب کچھ عطا فرما دے جو تو نے کسی بھی نیک بندے کو عطا کیا ہے۔ ظاہری نعمتوں کا تسلسل۔ باطنی نعمتوں کی تجدید۔ بلاؤں سے نجات، رنج و غم کا دفعیہ۔ دعاؤں کی استجابت، نیکیوں کی قبولیت بُرائیوں کی پردہ پوشی وغیرہ۔ تو لطیف بھی ہے اور خبیر بھی۔ اور ہر شے پر قادر و قدیر بھی۔

خدایا! جس جس کو پکارا جاتا ہے ان میں تو سب سے زیادہ قریب ہے اور جو بھی لبیک کہنے والا ہے ان میں تو سب سے جلدی قبول کرنے والا ہے۔ ہر معاف کرنے والے سے زیادہ کریم اور ہر عطا کرنے والے سے زیادہ بخشنے والا ہے۔ ہر مشغول سے زیادہ سننے والا ہے

اور دنیا و آخرت کے لیے رحمان و رحیم ہے۔ تیرا جیسا کوئی قابل سوال نہیں ہے اور تیرے علاوہ کوئی امیدوں کا مرکز نہیں ہے۔ میں نے تجھے پکارا تو تو نے قبول کیا۔ تجھ سے مانگا تو تو نے عطا کر دیا۔ تیری طرف رغبت کی تو تو نے رحم کیا اور تجھ پر بھروسہ کیا تو تو نے نجات عطا کر دی، تیری پناہ مانگی تو اکیلا ہی کافی ہو گیا۔

خدایا! اپنے بندے اپنے رسول و نبی حضرت محمد مصطفےٰؐ اور ان کی آل طیبینؑ طاہرین پر رحمت نازل فرما، اور ہمارے لیے اپنی نعمتوں کو مکمل فرما دے، ہر عطا کو خوش گوار بنا دے اور ہمارا نام شکر گذاروں میں اور نعمتوں کو یاد رکھنے والوں میں درج فرما دے۔ آمین یارب العالمین۔

خدایا۔ اے وہ پروردگار جس کی ملکیت کے ساتھ اختیارات بھی ہیں۔ اور جس کے اختیارات کے ساتھ قہاری بھی ہے۔ جس نے عاصیوں کی پردہ پوشی کی ہے، استغفار کرنے والوں کو معاف کیا ہے۔ اے طلب گاروں اور رغبت کرنے والوں کی منزلِ آخر۔ امیدواروں کی امیدوں کی آماجگاہ، ہر شے پر علمی احاطہ رکھنے والے اور عذر خواہوں پر رافت و رحمت و تحمل کا مظاہرہ کرنے والے!

خدایا! ہم اس شام کے وقت تیری طرف متوجہ ہیں جسے تو نے باشرف و باعظمت قرار دیا ہے۔ ہمارا وسیلہ تیرا رسولؐ۔ تیری مخلوقات کا منتخب ترین بندہ۔ تیری وحی کا امین۔ تیرے ثواب کی بشارت دینے والا۔ تیرے عذاب سے ڈرانے والا اور روشن چراغ پیغمبر ہے جس کے ذریعہ تو نے مسلمان بندوں پر انعام کیا ہے اور اسے عالمین کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔

خدایا! محمدؐ و آل محمدؐ پر ویسی رحمت نازل فرما جس کے وہ اہل ہیں۔ اے خدائے عظیم! حضرت محمدؐ اور ان کی آل طیبین و طاہرین پر رحمت نازل فرما اور اپنی معافی اور مغفرت کے ذریعہ ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما۔

تیری طرف مختلف زبانوں میں آوازیں اور فریادیں بلند ہیں لہذا آج کی شام مجھے ہر اس نعمت میں حصہ دار قرار دیدے جسے تو اپنے بندوں پر تقسیم کر رہا ہے اور جس نور سے ہدایت کر رہا ہے اور جس رحمت کو نشر کر رہا ہے اور جس برکت کو نازل کر رہا ہے اور جس لباس عافیت سے پردہ پوشی کر رہا ہے اور جس رزق میں وسعت دے رہا ہے۔ اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے۔ خدایا! میں اس وقت واپس جاؤں تو کامیاب، نجات یافتہ، نیک عمل، بہرہ ور اور

فائز المرام واپس جاؤں۔ مجھے مایوسِ رحمت نہ قرار دینا اور اپنی رحمت سے خالی نہ رکھنا۔ میری امیدیں محرومی کا شکار نہ ہونے پائیں اور مجھے اپنے فضل وکرم سے الگ نہ رکھنا۔ جس عطا کی امید رکھتا ہوں اس سے مایوس نہ ہو جاؤں اور تیری بارگاہ سے نامراد واپس نہ جاؤں۔ اپنے دروازے سے ہٹا نہ دینا کہ تو بہترین بخشش کرنے والا اور بلند ترین کرم کرنے والا ہے۔

میں تیری طرف بڑے یقین کے ساتھ متوجہ ہوں اور تیرے محترم مکان کا دل سے قصد کیے ہوئے ہوں۔ ان مناسک میں میری امداد فرما۔ میرے حج کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ میرے گناہوں کو بخش دے اور میری خطاؤں کو معاف فرما۔

میں نے تیری بارگاہ میں وہ ہاتھ پھیلایا ہے جس پر ذلت وحقارت کے نشانات لگے ہوئے ہیں لیکن پروردگار جو ہم نے مانگا ہے وہ آج کی شام عطا کر دے اور جس کام کے لیے پکارا ہے اس کے لیے کافی بن جا۔ تیرے علاوہ کوئی اور کافی نہیں ہے اور تیرے سوا کوئی اور پروردگار بھی نہیں ہے۔ تیرا حکم نافذ ہے اور تیرا علم محیط اور تیرا فیصلہ مبنی بر انصاف ہے۔ ہمارے حق میں خیر کا فیصلہ فرما اور ہمیں اہلِ خیر میں قرار دے۔

خدایا! اپنے جود وکرم سے ہمارے لیے عظیم ترین اجر اور بہترین ذخیرۂ ثواب اور دائمی سہولت ورفاہیت کو لازم قرار دے دے۔ ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمیں ہلاک ہونے والوں میں نہ قرار دینا۔ اپنی رحمت ورافت کا رُخ ہماری طرف سے نہ موڑ دینا کہ تو ارحم الراحمین اور خیر الغافرین ہے۔

خدایا! آج کی شام ان لوگوں میں قرار دے جن کے سوال پر تو نے عطا کیا ہے اور جن کے شکر پر اضافہ کیا ہے۔ جن کی توبہ کو قبول کیا ہے اور جن کے گناہوں سے جدا ہو جانے پر انہیں معاف کر دیا ہے۔ اے صاحب جلال واکرام!

خدایا۔! ہمیں پاکیزہ بنا دے۔ ہماری مدد فرما۔ ہماری فریاد وزاری پر رحم فرما۔ اے بہترین مسئول اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔ اے وہ خدا جس پر پلکوں کی بندش اور آنکھوں کے اشارے مخفی نہیں۔ جو دلوں کے مضمرات کو بھی جانتا ہے اور سینے کے اندر چھپے ہوئے رازوں سے بھی باخبر ہے۔ اس کا علم سب کا احصار کیے ہوئے ہے اور اس کا علم ہر شے پر احاطہ

رکھتا ہے۔

تو پاک و بے نیاز ہے اور مخالفین کے اقوال وتصورات سے بہت زیادہ بلند وبرتر ہے۔ ساتوں آسمان، تمام زمینیں اور دونوں کی مخلوقات سب تیری تسبیح کر رہی ہیں۔ ہر ذرۂ کائنات تیرا تسبیح خواں ہے۔ حمد تیرے لیے ہے اور بزرگی اور برتری بھی تیرے ہی لیے ہے تو صاحبِ جلال واکرام اور مالکِ فضل وانعام ہے۔ تیری نعمتیں عظیم ہیں اور تو جواد وکریم اور رؤف ورحیم ہے۔

پروردگار! ہمارے لیے رزقِ حلال میں وسعت عطا فرما۔ ہمارے بدن اور دین دونوں میں عافیت عطا فرما۔ ہمیں خوف میں امن وامان عطا فرما اور ہماری گردن کو آتشِ جہنم سے رہائی عطا فرما۔

خدایا!۔ ہمیں اپنی تدبیروں کا نشانہ نہ بنانا اور اپنے عذاب میں دھیرے دھیرے کھینچ نہ لینا۔ ہم کسی دھوکے میں نہ رہنے پائیں اور جنات وانسان کے فاسقوں کے شر سے محفوظ رہیں۔

اس کے بعد حضرت نے سر مبارک آسمان کی طرف بلند کیا اس عالم میں کہ چشم مبارک سے مسلسل آنسو رواں تھے اور زبان پر یہ فقرات تھے:

اے سب سے بہتر سننے والے اور سب سے زیادہ نگاہ رکھنے والے! سب سے تیز تر حساب کرنے والے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے! محمدؐ وآلِ محمد پر رحمت نازل فرما۔

پروردگار! میں تجھ سے ایسی حاجت طلب کر رہا ہوں کہ اگر تو اسے پورا کر دے گا تو باقی سب کا رد کر دینا بھی مضر نہ ہوگا اور اگر اسے رد کر دے گا تو باقی سب کا عطا کر دینا بھی مفید نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ میری گردن کو آتشِ جہنم سے آزاد کر دے کہ تیرے علاوہ کوئی دوسرا خدا نہیں ہے اور تو وحدہٗ لاشریک ہے۔ تیرے ہی لیے حمد ہے اور تیرے ہی لیے ملک ہے اور تو ہی ہر شے پر قادر ومختار ہے۔

اے رب۔ اے رب۔ اے رب۔ اے رب۔ اے رب۔ اے رب۔

اے رب۔ اے رب۔ اے رب!

خدایا!۔ میں اپنی مالداری میں بھی فقیر ہوں تو غربت میں کس طرح فقیر نہ ہوں گا، اور

اپنے علم کے باوجود جاہل ہوں تو جہالت میں کس طرح جاہل نہ ہوں گا۔

تیری تدبیروں کی نیرنگی اور تیرے مقدرات کی بسرعت تبدیلی نے تیرے بامعرفت بندوں کو اِن دونوں باتوں سے روک رکھا ہے کہ نہ کسی عطیہ کی طرف سے پُرسکون ہونے پاتے ہیں اور نہ کسی بلا کی وجہ سے مایوس ہونے پاتے ہیں۔

پروردگار۔! میری طرف سے وہ سب کچھ ہے جو میری ذلّت و پستی کے مطابق ہے تو تیری طرف سے بھی وہ سب کچھ ہونا چاہیے جو تیرے رحم و کرم کے شایان شان ہے۔

خدایا۔! تو نے اپنی تعریف لفظ لطیف و رؤف سے کی ہے اور میرے ضعف کے وجود سے پہلے سے اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ تو کیا اب ضعف کے ظاہر ہو جانے کے بعد اسے روک دے گا۔

خدایا۔! اگر مجھ سے نیکیوں کا ظہور ہو تو وہ تیرے کرم ہی کا نتیجہ ہے اور اگر بُرائیاں ظاہر ہوں تو یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہیں اور ان پر تیری حجّت تمام ہے

خدایا !۔ جب تو میرا کفیل ہے تو دوسرے کے حوالے کس طرح کرے گا؟ اور جب تو میرا مددگار ہے تو میں ذلّت سے دوچار کس طرح ہوں گا؟۔ تو میرے حال پر مہربان ہے تو مایوس اور ناکام ہونے کی کیا وجہ ہے۔؟

اب میں اپنی فقیری ہی کو واسطہ قرار دیتا ہوں لیکن اسے کس طرح واسطہ قرار دوں، جس کے تیری بارگاہ تک پہونچنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ میں اپنے حالات کا شکوہ کس طرح کروں کہ تو خود ہی بہتر جانتا ہے، اپنی زبان سے کس طرح ترجمانی کروں کہ سب تو تجھ پر خود ہی واضح اور روشن ہے۔ تو کیسے میری امیدوں کو نا امید کرے گا کہ وہ تیرے ہی کرم کی بارگاہ میں پیش کی گئی ہیں اور کیسے میرے حالات کی اصلاح نہیں کرے گا جب کہ ان کا قیام تیری ہی ذات سے وابستہ ہے۔

خدایا !۔ میری عظیم ترین جہالت کے باوجود تو کس قدر مہربان ہے اور میرے بدترین اعمال کے باوجود تو کس قدر رحیم و کریم ہے۔

خدایا۔! تو کس قدر مجھ سے قریب ہے اور میں کس قدر تجھ سے دور ہوں۔ اور جب تو

اس قدر مہربان ہے تو اب کون درمیان میں حائل ہو سکتا ہے۔

خدایا۔! آثار کے اختلاف اور زمانہ کے تغیرات سے میں صرف یہ سمجھا ہوں کہ تو ہر رنگ میں اپنے کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ میں کسی طرح جاہل نہ رہ جاؤں اور بہرحال تجھے پہچان لوں۔

پروردگار! جب میری ذلّت و خساست میری زبان کو بند کرنا چاہتی ہے تو تیرا کرم قوتِ گویائی پیدا کر دیتا ہے اور جب میرے حالات و کیفیات مجھے مایوس بنانا چاہتے ہیں تو تیرے احسانات پھر پُرامید بنا دیتے ہیں۔

خدایا۔! میں جس کی نیکیاں بھی بُرائیوں جیسی ہیں۔ اس کی بُرائیوں کا کیا حال ہوگا، اور میں جس کی نگاہ کے حقائق بھی دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں اس کے دعووں کی کیا حیثیت ہوگی۔

پروردگار! تیرے نافذ حکم اور تیری مہربان مشیت نے کسی کے لیے بولنے کا موقع نہیں چھوڑا، اور نہ کسی کو کسی حال پر ثابت رہنے دیا ہے۔ کتنی ہی مرتبہ میں نے اطاعت کی بنا رکھی اور حالات کو مضبوط بنایا لیکن تیرے عدل و انصاف نے میرے اعتماد کو منہدم کر دیا اور پھر فضل و کرم نے مجھے سہارا دے دیا۔

پروردگار! تجھے معلوم ہے کہ اگر فعل و عمل کے اعتبار سے میری اطاعت دائمی نہیں ہے تو عزم و جزم کے اعتبار سے بہرحال دائمی ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ میں کس طرح عزم کروں جبکہ صاحبِ اقتدار اور قاہر تو ہے اور کس طرح عزم نہ کروں جب کہ حاکم و آمر بھی تو ہی ہے۔

خدایا ! آثارِ کائنات میں غور و فکر مجھے تیری ملاقات سے دور تر کیے جا رہے ہیں لہذا کسی ایسی خدمت کا سہارا دیدے کہ میں تیری بارگاہ میں پہونچ جاؤں۔ میں ان چیزوں کو کس طرح راہنما بناؤں جو خود ہی اپنے وجود میں تیری محتاج ہیں۔ کیا کسی شے کو تجھ سے زیادہ بھی ظہور حاصل ہے کہ وہ دلیل بن کر تجھے ظاہر کر سکے۔ تو کب ہم سے غائب رہا ہے کہ تیرے لیے کسی دلیل اور رہنمائی کی ضرورت ہو اور کب ہم سے دور رہا ہے کہ آثار تیری بارگاہ تک پہونچانے کا ذریعہ بنیں۔ وہ آنکھیں اندھی ہیں جو تجھے اپنا نگراں نہیں سمجھ رہی ہیں اور وہ بندہ اپنے معاملاتِ حیات میں سخت خسارہ میں ہے جسے تیری محبت کا کوئی حصہ نہیں ملا۔

خدایا! تو نے آثار کائنات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو اب نور کے لباس اور ہدایت کی بصیرت کے سہارے اپنی بارگاہ میں واپس بلا لے تاکہ میں اس شان سے واپس آؤں کہ میرا باطن اس کائنات کی طرف توجہ سے محفوظ ہو اور میری ہمت اس دنیا پر بھروسہ کرنے سے بلند ہو۔ تو ہر شے پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔

پروردگار! یہ میری ذلّت ہے جو تیری جناب میں بالکل واضح اور روشن ہے اور یہ میری حالت ہے جس پر کوئی پردہ نہیں ہے۔ میں تیرے ہی ذریعہ تیری بارگاہ تک پہونچنا چاہتا ہوں اور تیری ہی رہنمائی کا طلب گار ہوں۔ اپنے نور سے اپنی طرف ہدایت فرما اور اپنی سچی بندگی کے ساتھ اپنی بارگاہ میں حاضری کی سعادت کرامت فرما۔

خدایا! مجھے اہل تقرب کو حاصل ہونے والے حقائق عطا فرما اور جذب و کشش رکھنے والوں کے مسلک پر چلنے کی توفیق کرامت فرما۔

اپنی تدبیر کے ذریعہ مجھے میری اپنی تدبیر سے بے نیاز کر دے اور اپنے اختیار کے ذریعہ میرے اختیار و انتخاب مستغنی بنا دے اور اضطرار و اضطراب کے مواقع کی اطلاع اور آگاہی عطا فرما۔

پروردگار! مجھے میرے نفس کی ذلّت سے باہر نکال دے اور موت سے پہلے ہر شک و شرک سے پاک و پاکیزہ بنا دے۔ میں تیری ہی مدد چاہتا ہوں تو تو میری امداد کر اور تجھی پر بھروسہ کرتا ہوں، تو تو کسی اور کے حوالے نہ کر دینا۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تو نا امید نہ کرنا اور صرف تیرے فضل و کرم میں رغبت رکھتا ہوں تو مجھے محروم نہ رکھنا۔ میں تیری جناب سے رشتہ رکھتا ہوں تو مجھے دور نہ کرنا اور میں تیرے دروازہ پر کھڑا ہوں تو مجھے بھگا نہ دینا۔ تیری مرضی اس بات سے بلند تر ہے کہ اس میں تیری طرف سے کوئی نقص پیدا ہو سکے تو میری طرف سے کیا نقص پیدا ہو سکتا ہے۔ تو اپنی ذات سے اس بات سے بے نیاز ہے کہ تجھے تیری طرف سے کوئی فائدہ پہونچے تو میری طرف سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

خدایا یہ تو صرف قضا و قدر ہے جو امیدوار بنائے ہوئے ہے ورنہ خواہش تو آرزوؤں کی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ اب تو ہی میرا مددگار بن جا تاکہ تو ہی مدد کرے اور تو ہی راستہ دکھلائے۔ اپنے فضل و کرم سے ایسا غنی بنا دے کہ اپنی طلب سے بھی بے نیاز ہو جاؤں۔

تو ہی وہ ہے جس نے اپنے دوستوں کے دلوں میں انوار الوہیت کی روشنی پیدا کرائی ہے تو وہ تجھے پہچاننے لگے ہیں اور تیری وحدانیت کا اقرار کرنے لگے ہیں اور تو ہی وہ ہے جس نے اپنے محبوب کے دلوں سے اغیار کو نکال باہر کر دیا ہے، تو اب تیرے علاوہ کسی کے چاہنے والے نہیں ہیں اور کسی کی پناہ نہیں مانگتے ہیں تو نے اس وقت اُنس کا سامان فراہم کیا جب سارے عالم سبب وحشت بنے ہوئے تھے اور تو نے اس طرح ہدایت دی ہے کہ سارے راستے روشن ہو گئے ہیں۔

پروردگار! جس نے تجھے کھو دیا اس نے پایا کیا۔؟ اور جس نے تجھے پا لیا اس نے کھویا کیا۔؟ جس نے تیرا بدل تلاش کیا وہ مایوس ہو گیا اور جس نے تجھ سے منھ موڑا وہ گھاٹے میں رہا۔ تیرے علاوہ غیر سے امید ہی کیوں کی جائے جب کہ تو نے احسان کا سلسلہ روکا نہیں ہے اور تیرے سوا دوسرے سے مانگا ہی کیوں جائے جب کہ تیرے فضل و کرم کی عادت میں فرق نہیں آیا ہے۔

پروردگار! جس نے اپنے دوستوں کو انس و محبّت کی حلاوت کا مزہ چکھا دیا ہے تو اس کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے اولیاء کو ہیبت کا لباس پہنا دیا ہے تو اس کے سامنے استغفار کرنے کے لیے استادہ ہیں۔ تو تمام یاد کرنے والوں سے پہلے یاد کرنے والا ہے اور تمام مانگنے والوں سے پہلے عطا کرنے والا ہے اور پھر کرم بالائے کرم یہ ہے کہ خود ہی دے کر خود ہی قرض کا مطالبہ کرتا ہے۔

خدایا۔! مجھے اپنی رحمت کے دروازے سے طلب کر لے تاکہ میں تیری بارگاہ تک پہونچ جاؤں اور مجھے اپنے احسان کے سہارے اپنی طرف کھینچ لے تاکہ میں تیری طرف متوجہ ہو جاؤں۔

خدایا۔! میں ہزار گناہ کروں مگر میری امید تجھ سے قطع ہونے والی نہیں ہے اور میں لاکھ اطاعت کروں مگر تیرے جلال سے میرا خوف ختم ہونے والا نہیں ہے۔ سارے عالم نے تیری طرف ڈھکیل دیا ہے اور تیرے فضل و کرم کی اطلاع نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

خدایا۔! جب تو میری امید ہے تو میں مایوس کس طرح ہو جاؤں اور جب تجھ پر میرا بھروسہ ہے تو میں ذلیل کس طرح ہو سکتا ہوں۔ اگر تو نے ذلّت میں ڈال دیا تو صاحب عزّت کیسے بنوں گا؟ اور تو نے اپنا بنا لیا تو ذلیل کیسے ہو سکوں گا۔؟

پروردگار۔! میں کس طرح فقیر نہ بنوں کہ تو نے فقیروں کے درمیان رکھا ہے، اور کیسے

فقیر رہ سکوں گا جب کہ تو نے اپنے فضل و کرم سے غنی بنا دیا ہے۔ تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ تو نے اپنے کو ہر ایک کو پہچنوا دیا ہے تو اب کوئی تجھ سے ناواقف نہیں ہے اور میرے لیے اور بھی واضح اور نمایاں ہو گیا ہے تو مجھے تیرا جلوہ ہر شے میں نظر آنے لگا ہے۔ تو درحقیقت ہر ایک کے لیے ظاہر اور روشن ہے۔

اے خدا۔! جس نے اپنی رحمانیت سے ہر شے پر احاطہ کر لیا ہے تو عرش اعظم بھی اس کی ذات میں گم ہو گیا ہے۔ تو نے آثار وجود کو دوسرے آثار کے ذریعہ نابود کر دیا ہے اور اغیار کو افلاک نور کے احاطہ سے محو کر دیا ہے۔

اے وہ خدا۔! جو عرش کے سراپردوں میں اس طرح پوشیدہ ہوا کہ نگاہیں اس کے دیکھنے کو ترس گئیں اور کمالِ تجلّی سے اس طرح روشن ہوا کہ اس کی عظمت ہر شے پر حاوی ہو گئی۔ تو کیسے چھپ سکتا ہے جب کہ ہر شے میں تیرا ظہور ہے اور کس طرح غائب ہو سکتا ہے جبکہ ہر ایک کے سامنے رہ کر اس کے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔ تو ہر شے پر قادر ہے۔ اور ساری تعریف تیری ذات واجب کے لیے ہے۔

مومنین کرام آخر روز عرفہ معصومینؑ کی دعاؤں کے ان دو فقرات کو ضرور دُہرائیں اور یہ محسوس کریں کہ ہادیانِ اسلام نے اپنے چاہنے والوں کو توبہ و استغفار کے کیسے کیسے طریقے تعلیم فرمائے ہیں سلاطین دنیا کو ان کا تصور بھی نہیں ہے۔

۱۔ پروردگار! میرے گناہوں سے تیرا کوئی نقصان نہیں ہے اور مجھے معاف کر دینے سے تیرے یہاں کوئی کمی نہ پیدا ہو جائے گی۔ لہذا جس چیز سے تیرے یہاں کمی کا خطرہ نہیں ہے وہ دیدے اور جس چیز سے تیرا نقصان نہیں ہے اسے معاف کر دے۔

۲۔ خدایا۔! میری بُرائیوں کی وجہ سے مجھے اپنی نیکیوں سے محروم نہ کرنا، اور اگر میری زحمت و مصیبت اور میرے رنج و الم پر رحم نہیں بھی کرنا ہے تو کم از کم مجھے مصیبت زدگان اور آفت رسیدہ کا اجر ہی دیدے۔ اللھم صل علی محمدؐ و آل محمدؐ واجعلنا من اتباعھم و شیعتھم و اولیائھم و محبیھم والحمد للہ اولاً و آخراً۔

نقشِ

حیات امام علی بن الحسینؑ

ولادت: ۱۵؍جمادی الاولی ۳۸ھ

شہادت: ۲۵؍محرّم ۹۵ھ

نقشِ
حیات امام علی بن الحسینؑ

ولادت: ۱۵؍جمادی الاولیٰ ۳۸ھ
شہادت: ۲۵؍محرم ۹۵ھ

نقشِ زندگانی امام زین العابدین علیہ السّلام

ماہ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ کی پندرھویں تاریخ تھی جب مالکِ کائنات نے امام حسینؑ کو پہلا فرزند عطا فرمایا جس کا نام نامی علیؑ قرار پایا۔

اور اس طرح امام حسینؑ کے گھر میں اس نام کے باقی رکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے گھر میں جو فرزند بھی پیدا ہوا عام طور سے اس کا نام علیؑ ہی رکھا گیا تاکہ اس طرح یہ نام زندہ رکھا جاسکے۔ اس لیے کہ دشمنانِ ایمان کی مکمل کوشش یہی ہوگی کہ یہ نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائے جیسا کہ بعد کے حالات سے مکمّل طور پر اندازہ ہوگیا ہے۔

آپ کا لقب زین العابدین، سید الساجدین، سجاد اور ذوالثفنات وغیرہ بے حد شہرت کا مالک ہے۔ کنیت کے طور پر آپ کو ابو محمد کہا جاتا ہے۔

آپ کے زین العابدین ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے آپ کو یہ لقب عطا فرمایا تھا اور اپنی زندگی میں یہ خبر دے گئے تھے کہ روزِ قیامت جب زین العابدین کو آواز دی جائیگی تو میرا ایک فرزند علیؑ بن الحسینؑ لبیک کہتا ہوا بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا۔ لیکن اس کی مزید تائید اس واقعہ سے بھی ہوگئی جسے صاحب مناقب اور صاحب شواہد النبوۃ نے نقل کیا ہے کہ آپ نمازِ تہجد میں مصروف تھے کہ شیطان نے بہ شکل اژدھا آکر آپ کو اذیت دینا شروع کی اور پیروں کے انگوٹھے کو چبانے لگا لیکن جب آپ نے کوئی توجہ نہ کی تو شکست کھا کر چلا گیا اور ایک آوازِ غیب آئی: "انت زین العابدین"۔ ظاہر ہے کہ اس آواز کا کوئی تعلق اس اژدھا یا ابلیس سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ندائے قدرت ہے جو اس فتحِ مبین کے موقع پر بلند ہوئی تھی جس طرح کہ پہلے علیؑ کی میدانی فتح پر لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیؑ کی آواز فضائے عرش سے گونج رہی تھی۔

لقب سجاد کے بارے میں بھی روایت میں وارد ہوا ہے کہ آپ ہر معمولی سے معمولی نعمتِ خدا

کے ملنے یا مصیبت کے دفع ہوجانے یا مومنین کے درمیان اصلاح ہوجانے پر سجدۂ شکر کیا کرتے تھے اور اس طرح سجاد کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ کربلا کی قیامت خیز شب میں بھی آپ نے سجدۂ الٰہی کو نظر انداز نہیں کیا اور جس طرح باپ نے زیر خنجر سجدہ کیا تھا اسی طرح آپ نے خاکسترِ گرم کربلا پر سجدہ کیا ہے۔

آپ کے والد گرامی امام حسین علیہ السلام تھے اور والدہ ماجدہ جناب شہربانو تھیں جنھیں شاہ زنان بھی کہا جاتا ہے اور جن کا انتقال آپ کی ولادت کے بعد دس دن کے اندر ہی ہوگیا تھا۔

جناب شہربانو کے بارے میں یہ ایک عام شہرت ہے کہ یہ دورِ عمر بن الخطاب میں فتوحات کے زیر اثر لائی گئی تھیں اور انھوں نے بطور کنیز فروخت کرنے کا ارادہ کیا تھا تو امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ نے روک کر قیمت ادا کرکے لے لیا تھا اور اپنے فرزند امام حسینؑ سے ان کا عقد کردیا تھا لیکن ہندوستان کے مشہور مورخ مولانا شبلی نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ یزدگرد بادشاہ کی بیٹی تھیں جو ۲۱ سال کی عمر میں سنہ ۱۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا اور مدائن کی وہ فتح جس موقع پر شہربانو کی گرفتاری کا ذکر کیا جاتا ہے سنہ ۱۶ھ یا ۱۷ھ میں ہوئی تھی جس وقت یزدجرد کی عمر کل ۲۲ - ۲۴ سال تھی تو اس کی دختر کی عمر کیا ہوگی جسے کنیزی سے بچانے کے لیے فوراً اس کا عقد کردیا جائے؟ علاوہ اس کے کہ یہ تذکرہ زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے اور زمخشری تاریخ میں کسی استناد کے مالک نہیں ہیں ــــــ بات اصل یہ ہے یزدجرد بادشاہ دورِ خلافت عثمان سنہ ۳۱ھ میں اصطخر کے فتح ہوجانے کے بعد دربدر پھرتا رہا یہاں تک کہ اسے قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے اپنے دور میں ایران کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے حریث بن جابر کو بھیجا اور اس نے وہاں سے مالِ غنیمت کے ساتھ ان دو شہزادیوں کو بھیجا۔ جن میں سے ایک کا عقد امام حسینؑ کے ساتھ ہوا اور دوسری کا عقد محمد بن ابی بکر کے ساتھ۔ محمد بن ابی بکر کی زوجہ کا نام گیہان بانو تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (بعض علماء نے شہربانو نام کی یزدجرد کی بیٹی ہی کا انکار کیا ہے)۔

امام زین العابدینؑ کا زمانۂ ولادت مولائے کائنات کا دورِ خلافت تھا اور اس طرح آپ نے زندگی کے دو سال اپنے دادا کے زیر سایہ گزارے ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۴۰ھ میں مولائے کائنات کی شہادت ہوگئی تو آپ اپنے پدر بزرگوار اور عم نامدار امام حسنؑ کے ہمراہ رہے جن کی دختر نیک اختر

جناب فاطمہ سے آپ کا عقد ہوا سنہ ۵۰ھ میں امام حسنؑ کی شہادت کے بعد دس سال اپنے والد محترم امام حسینؑ کے ساتھ گذارے اور ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ سے آپ کا اپنا دورِ قیادت شروع ہوگیا۔

اس دور میں آپ کو مختلف بادشاہوں اور ظالموں کا سامنا کرنا پڑا سنہ ۶۴ھ تک یزید برسرِ اقتدار رہا، سنہ ۶۵ھ میں معاویہ بن یزید اور مروان بن الحکم کی حکومت رہی پھر ۶۵ سے ۸۶ تک عبدالملک بن مروان کی حکومت رہی اور ۸۶ سے ۹۶ تک ولید بن عبدالملک تختِ حکومت پر قابض رہا جس نے سنہ ۹۵ھ میں آپ کو زہر دلوا کر شہید کرا دیا۔

آپ کے بچپن کے دور میں چند واقعات نظر آتے ہیں جن سے آپ کی جلالت قدر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

● ابراہیم بن ادہم راوی ہے کہ میں نے راہِ مکہ میں ایک کمسن بچہ کو مکہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو گھبرا کر پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ سواری کیوں نہیں ہے اور زادِ راہ کا انتظام کیوں نہیں کیا ہے تو اس بچہ نے جواب دیا کہ "زادی تقوای و راحلتی رجلای وقصدی مولای" (میرا زادِ راہ میرا تقویٰ ہے اور میری سواری میرے دونوں پیر ہیں اور میرا مقصود میرا مولا ہے۔

● دوسری روایت میں ہے کہ آپ بیمار ہوئے اور آپ کے پدر بزرگوار امام حسینؑ نے عیادت کرتے ہوئے پوچھا کہ فرزند کوئی خواہش ہو تو بیان کرو۔ تو آپ نے عرض کی کہ خواہش صرف یہ ہے کہ قضا و قدرِ الٰہی پر راضی رہوں اور اس کے علاوہ کوئی خواہش نہیں ہے۔ جو وہ چاہتا ہے وہی بہتر ہے اس سے بہتر میں کیا طے کر سکتا ہوں۔ امام حسینؑ نے اس جواب پر گلے سے لگا لیا اور فرمایا کہ میرے لال تمہارا جواب بالکل ابراہیم خلیلؑ سے ملتا جلتا ہے کہ جب ان سے امداد کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جس کا محتاج ہوں وہ میرے حالات کو خوب جانتا ہے اور اس کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھنا ہی اپنی ذمہ داری ہے۔

● آپ کی عمر مبارک واقعہ کربلا کے وقت تقریباً ۲۲۔۲۳ سال تھی اور اس دوران آپ کی زندگی کے واقعات بہت کم نظر آتے ہیں اور شائد اس کا راز یہ تھا کہ آپ بزرگوں کے زیرِ سایہ زندگی گذار رہے تھے اور آپ کی الگ کوئی زندگی نہ تھی جسے خصوصیت کے ساتھ زیرِ نظر رکھا جاتا۔

واقعاتِ کربلا کے بعد سے آپ کے دورِ قیادت کا بھی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور آپ کے دورِ مصائب و آلام کا بھی اس لیے اس دور میں آپ کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ اور میرے خیال میں تاریخِ بشریت میں کسی شخص نے بھی قیادت کی ذمہ داری ایسے حالات میں نہیں سنبھالی ہے جن حالات میں قدرت نے یہ کام آپ کے سپرد کیا تھا اور حقیقت امر یہ ہے کہ جس طرح آپ نے اس ذمہ داری کو ادا کیا ہے اس کی مثال بھی تاریخِ قیادت میں کہیں نہیں ملتی ہے۔

واقعاتِ کربلا کے بعد جب اہلِ حرم قید شام سے چھٹ کر مدینہ آئے اور مدینہ والوں کو یزید کے مظالم کا اندازہ ہوا تو ایک مرتبہ احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی اور اہلِ مدینہ نے یزید کے نمائندہ عثمان بن محمد کو معزول کر کے عبداللہ بن حنظلہ کو حاکم بنا لیا جو جناب حنظلہ کے فرزند تھے جنھیں غسیل الملائکہ کہا جاتا ہے اور جنھیں شہادت کے بعد حسبِ ارشاد رسول اکرمؐ ملائکہ نے غسل دیا تھا۔

یزید نے اس بغاوت کو دبانے کے لیے بدترین خلائق مسلم بن عقبہ کا انتخاب کیا اور اس نے مدینہ پر چڑھائی کا منصوبہ بنا لیا۔ اہلِ مدینہ نے دفاع کا ارادہ کیا اور شہر سے باہر مقام حرّہ پر گھمسان کا رَن پڑا جس کے نتیجہ میں دس ہزار مسلمان جن میں سات سو حافظانِ قرآن بھی شامل تھے قتل کر دیے گئے اور ہزاروں لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی، سارا شہر لوٹ لیا گیا اور تین دن تک مدینہ لشکرِ یزید پر مباح کر دیا گیا جس کے نتیجہ میں اگلے سال ایک ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ۲۷، ۲۸ ذی الحجہ سنہ ۶۳ھ کو پیش آیا۔ امام سجادؑ ان حالات کے پیشِ نظر ایک دیہات ینبع کی طرف منتقل ہوگئے تھے جہاں دورِ حکومت عثمان میں مولائے کائنات رہا کرتے تھے اور لشکرِ یزید نے بھی سارے مدینہ سے غلامی کی بیعت لینے کے باوجود آپ سے تقاضائے بیعت نہیں کیا اور اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ یزید ایک مرتبہ مطالبۂ بیعت کا حشر دیکھ چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ حکومت کی ساری پریشانیاں اُسی ایک مطالبہ کا نتیجہ ہیں لہٰذا اب اس قسم کی غلطی کی تکرار نہیں ہونی چاہیے ورنہ لشکرِ یزید سے نہ کسی شرافت کی توقع تھی اور نہ کسی عرفانِ امامت کی۔

اس موقع پر مروان جیسے بدترین دشمن نے بھی آپ سے پناہ کی درخواست کی کہ مدینہ مخالف ہوگیا ہے اور میں اپنے بچوں کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ میرے گاؤں

● یزید کے بعد اس کے فرزند معاویہ بن یزید کو حاکم بنایا گیا لیکن اس کی حکومت چالیس دن یا بقولے پانچ ماہ سے زیادہ نہ چل سکی اور اُدھر حجاز پر ابن زبیر اور عراق پر عبیداللہ بن زیاد نے قبضہ کر لیا اور ملک میں ایک افراتفری پھیل گئی۔

اور اس کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ معاویہ بن یزید نے اپنے خطبۂ خلافت میں اس بات پر زور دیا تھا کہ میرا دادا اور میرا باپ دونوں خلافتِ اسلامی کے لیے نا اہل تھے اور ان کے مقابلہ میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اور حسینؑ بن علیؑ یقیناً اس کے اہل تھے لیکن ان لوگوں نے اُن سے حکومت کو غصب کر لیا اور آج قبر کے گڑھے میں پڑے اپنے عذاب کو بھگت رہے ہیں لہٰذا میں ایسی غاصبانہ حکومت کو سنبھالنے کے لیے تیار نہیں ہوں جب کہ امت میں ابھی وارثِ حسینؑ علیؑ بن الحسینؑ زندہ موجود ہیں۔

اس خطبہ کا تمام ہونا تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور مروان نے بات کو دبانے کے لیے کہا کہ آپ غالباً حضرت عمر کی طرح شوریٰ سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ خاموش ہو جا، تجھے میرے بیان کی تاویل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حضرت عمر نے بھی شوریٰ کے ذریعہ حضرت علیؑ پر ظلم کیا تھا اور اب اس ظلم کی بھی تجدید نہیں ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاویہ بن یزید بھی زندہ نہ رہ سکا اور اس کے استاد مقصوص کو بھی زندہ دفن کر دیا گیا کہ اسی نے اسے بہکایا ہے اور ایسے نظریات کی تلقین کی ہے۔ (کیا کہنا ہے اس پروردگار کا جو مُردوں سے زندوں کو نکالتا ہے۔)

● ۲۱ سال کی عمر میں معاویہ بن یزید قتل کر دیا گیا تو خلافت آلِ ابی سفیان سے نکل کر آلِ مروان کی طرف چلی گئی اور ۶۵ھ میں مروان اور اس کے بعد ابن مروان حاکم ہو گیا اور جب جناب مختار اور عبداللہ بن زبیر دونوں قتل ہو گئے تو ۷۳ھ میں پورے ملک کا تنہا مالک ہو گیا۔ حجاج بن یوسف جیسے سفاک اور بے ایمان کو حجاز کا گورنر اور پھر پورے علاقہ کا حاکم بنا دیا جس کے نتیجہ میں اُس نے لاکھوں افراد کو قتل کیا اور بے گناہ انسانوں کے قتل کے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔

● عبدالملک بن مروان بے حد ظالم اور سفاک تھا اور اس نے امام سجادؑ کی گرفتاری کا بھی حکم دے دیا تھا لیکن اس کے سرکاری عالم زہری نے خطرہ سے آگاہ کیا کہ اس طرح ملک میں پھر بغاوت پھیل جائے گی تو بنی ہاشم کو معاف کر دیا اور باقی افراد برابر ظلم کا نشانہ بنتے رہے۔

بھیج دے میں ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں اور اس طرح اس شخص کے گھرانے کو پناہ دی جس نے سب سے پہلے قتلِ امام حسینؑ کا اشارہ دیا تھا۔ (تاریخ کامل)

● مسلم بن عقبہ نے شہر کو فتح کر لینے کے بعد آپ کو طلب کیا اور آپ دربار میں گئے تو وہ آلِ محمدؐ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا لیکن جیسے ہی آپ کو دیکھا تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور نہایت احترام سے بٹھایا۔ پھر آپ کے جانے کے بعد لوگوں نے اس طرزِ عمل کی وجہ دریافت کی تو کہا کہ یہ میرا اختیاری فعل نہیں تھا۔ میں ان کی ہیبت کے سامنے اپنی جگہ پر نہ بیٹھ سکا اور مجبوراً تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔

(مروج الذہب)

● مدینہ منورہ کو برباد کرنے کے بعد مسلم بن عقبہ نے مکہ مکرمہ کا رُخ کیا لیکن راستہ ہی میں ملک الموت نے روک لیا اور اس نے حصین بن نمیر کو اپنا جانشین بنا دیا۔ حصین بن نمیر نے چالیس روز تک مکہ کا محاصرہ رکھا اور عبداللہ بن زبیر کو گرفتار کرنے کے لیے خانۂ خدا پر آگ برسائی لیکن وہ گرفتار نہ ہو سکے اور اسی دوران یزید بھی واصلِ جہنم ہو گیا اور شہر کا نقشہ بدل گیا۔ ابن زبیر نے فتح حاصل کر لی اور حصین بن نمیر بھاگ کر مدینہ کی طرف چلا گیا وہاں ایک گاؤں کی طرف غلّہ کی تلاش میں جا رہا تھا کہ امام سجادؑ سے ملاقات ہو گئی اور آپ نے اسے غلّہ فراہم کر دیا اور پھر قیمت بھی نہیں لی جس کی بنا پر اس نے یزید کے بعد آپ کو خلیفۃ المسلمین بنانا چاہا لیکن آپ نے واضح طور سے انکار کر دیا اور ظاہر ہے کہ جس خلافت کو یزید کا بیٹا برداشت نہ کر سکا اسے فرزند حسینؑ بن علیؑ کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔

● ۶۴ھ کے اوائل میں یزید کے فی النار ہونے کے بعد ابن زبیر نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور پھر ایک مرتبہ بنی ہاشم کو اذیت دینے کا منصوبہ بنا لیا گیا — چنانچہ جناب محمد حنفیہ اور ابن عباس جیسے افراد کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور ایک گھر میں بند کر کے آگ لگا دینے کا پروگرام بنا لیا گیا کہ اُدھر جناب مختار کی فوج نے قیام کر دیا اور ان حضرات کی جان بچ گئی۔ ابن زبیر کے مظالم کا یہ عالم تھا کہ امام سجادؑ فتنۂ ابن زبیر سے تحفظ کی دعائیں مانگا کرتے تھے اور بے حد مغموم رہا کرتے تھے کہ ایک دن ایک بزرگ نے آکر تسلی دی کہ آپ گھبرائیں نہیں جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کے لیے مصائب سے بچ نکلنے کا انتظام خود کرتا ہے اور یہ کہہ کر غائب ہو گئے تو ایک ندائے غیب آئی کہ یہ حضرت خضرؑ ہیں جو آپ کی امداد کے لیے آئے ہیں۔ (نور الابصار۔ شواہد النبوۃ)

سنہ ۷۱ھ میں عبدالملک نے عراق میں مصعب بن عمیر کو قتل کرایا اور سنہ ۷۲ھ میں حجاج کو عبداللہ بن زبیر کے قتل کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے خانۂ خدا میں پناہ لے لی تو حجاج نے اسے بھی نشانہ بنایا۔ خانۂ کعبہ پر مسلسل سنگ باری کی اور آخر میں جمادی الثانیہ سنہ ۷۳ھ میں ابن زبیر کو گرفتار کرکے تہ تیغ کر دیا۔

ابن زبیر کی گرفتاری کے سلسلہ میں خانۂ خدا پر اتنے حملے ہوئے کہ چھت اور دیوار سب تباہ ہو گئے تو حجاج نے اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے تعمیر نو کا منصوبہ بنایا لیکن جب بنیاد قائم کرنے کا وقت آیا تو ایک سانپ نکل آیا اور اس نے کسی کو قریب نہ آنے دیا۔ یہاں تک کہ امام سجادؑ کو طلب کیا گیا۔ آپ کے آتے ہی سانپ نے راستہ دے دیا اور آپ نے سنگ بنیاد رکھ کر فرمایا کہ اب تعمیر شروع کر دو۔ اب کوئی زحمت نہ ہوگی۔

اس کے بعد جب حجر اسود کے نصب کرنے کا وقت آیا تو پھر آپ نے اقدام فرمایا، اور اسی طرح حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کیا جس طرح تعمیر اوّل کے موقع پر یہ کام سرکار دو عالمؐ نے انجام دیا تھا اور دنیا پر واضح ہوگیا کہ آل محمدؐ کا رشتہ خانۂ خدا اور حجر اسود سے دنیا کے دوسرے انسانوں کے روابط سے بالکل مختلف ہے۔

اور شاید یہی راز تھا کہ جب شہادت امام حسینؑ کے بعد لوگوں نے خاندان کے بزرگ ہونے کے اعتبار سے محمد حنفیہ کو امام کہنا شروع کر دیا تو انھوں نے امام سجادؑ کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اس کا فیصلہ خانۂ خدا میں حجر اسود سے کرا لیا جائے تاکہ لوگوں کو حقائق کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ چنانچہ دونوں حضرات تشریف لے گئے۔ پہلے محمد حنفیہ نے سلام کیا اور کوئی جواب نہ ملا تو امام سجادؑ نے سلام کیا اور اس کا جواب مل گیا۔ تو گویا حجر اسود نے آپ کی امامت کی شہادت دے دی اور اس طرح مسئلہ امامت بالکل واضح ہوگیا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی انا پر قائم رہنے والے اور مذہب کو جذبات و مفادات سے طے کرنے والے اس کے بعد بھی محمد حنفیہ کو امام مانتے رہے اور ان کے سمجھانے کے باوجود نہ سمجھ سکے جس طرح کہ مولائے کائنات کے مسلسل افہام کے بعد بھی نصیریوں کی سمجھ میں ان کی بندگی نہ آئی اور وہ انھیں خدا ہی کہتے رہے۔

جناب مختار سنہ ۶۶ھ میں قید سے نکلے، حکومت حاصل کی اور اس کے صحیح مصرف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شمر، خولی، عمر سعد، قیس بن اشعث، یزید بن سالک، عمران بن خالد، عبداللہ بن قیس، زرعہ بن شریک، سنان بن انس، عمرو بن الحجاج جیسے کربلا کے قاتلوں اور ظالموں کو تہ تیغ کیا۔ ابن زیاد موصل میں گورنر تھا اس کی گرفتاری کے لیے ابراہیم ابن مالک اشتر کو بھیجا انھوں نے اسے وہاں قتل کیا۔ منہال کے ذریعہ امام سجادؑ نے قتل حرملہ کا تقاضا کیا تو اسے بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا، اور اس طرح ابن زیاد اور عمر بن سعد کا سر امامؑ کی خدمت میں بھیج دیا اور امام سے دعائے خیر حاصل کی اور بنی ہاشم میں ایک طرح کے سلسلۂ عزا کا خاتمہ ہوا۔

جناب مختار نے شرح دیوان مرتضوی کے مطابق ۸۰۳۰۰ دشمنان اہلبیتؑ اور قاتلانِ حسینؑ کو تہ تیغ کیا ہے اور اس طرح اپنے کامل جذبہ محبت اہلبیتؑ کا ثبوت فراہم فرمایا ہے، ۱۴ رمضان سنہ ۶۷ھ کو آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔

سنہ ۸۶ھ میں عبدالملک کا بیٹا ولید حاکم بنا اور اسی نے سنہ ۹۵ھ میں ۲۵ محرم کو امامؑ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا۔ آپ کی شہادت کا یہ اثر ہوا کہ سارے مدینہ میں کہرام برپا ہوگیا اور یتیم و بیوہ و لاوارث سب اپنے والی و وارث کے ماتم میں مصروف ہو گئے۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کا ناقہ بھی تین دن تک آپ کی قبر کے قریب سر پٹکتا رہا اور آخرکار دنیا سے رخصت ہوگیا۔

ازواج

تاریخ میں آپ کی مختلف شریک حیات کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان میں سب سے نمایاں حیثیت جناب فاطمہ بنت حسنؑ کی ہے جنھیں امام محمد باقرؑ کی والدہ گرامی بننے کا بھی شرف حاصل تھا اور باقی سب ام ولد کی حیثیت رکھتی تھیں اور امام کی خدمت میں بے پناہ عظمت کی مالک ہو گئی تھیں۔

اولاد

آپ کے ۱۱ فرزند اور ۴ دختران کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن کے اسمار گرامی یہ ہیں:

امام محمد باقرؑ، عبداللہ، حسن، زید، عمر، حسین، عبدالرحمان، سلیمان، علی، محمد اصغر، حسین اصغر، خدیجہ، فاطمہ، علیہ، ام کلثوم۔ (ارشاد مفیدؒ)

جناب زید شہیدؒ

امام محمد باقرؑ کے بعد سب سے نمایاں شخصیت جناب زید کی ہے جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۲۱ھ میں ہشام کے مظالم سے عاجز آ کر یکم صفر ۱۲۲ھ کو ۴۰ ہزار ساتھیوں کے ساتھ قیام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت ابو حنیفہ نے آپ کی بیعت کا اعلان کر دیا، اور اس طرح ایک بہترین لشکر تیار ہو گیا۔ لیکن حکومتِ وقت نے انھیں "امام اعظم" کا لقب دے کر توڑ لیا اور لشکر میں پھوٹ پڑ گئی۔ اکثر لوگوں نے جناب زید کا ساتھ چھوڑ دیا جنھیں آپ نے رافضی کے نام سے یاد کیا۔ اور اس لقب کا کوئی تعلق ان کے وفاداروں سے نہیں تھا۔

حکومتی فوجوں سے غضب کا مقابلہ ہوا۔ آخر میں آپ کی پیشانی پر ایک تیر لگا اور اس کے اثر سے شہید ہو گئے، لاش مخفی کر دی گئی، لیکن ظالموں نے ڈھونڈھ نکالا اور سولی پر لٹکا دیا۔ چار سال تک اسی طرح لاش لٹکی رہی۔ چار سال کے بعد سولی سے اُتار کر نذرِ آتش کر دی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ چار سال کے اندر بھی کسی طرح کا عیب نہیں پیدا ہوا، اور یہ شہید راہِ خدا کی زندگی کا بہترین ثبوت ہے۔ آپ کا قیام مقام واسطین تھا اس لیے آپ کی اولاد کو زیدی واسطی کہا جاتا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے فرزند یحییٰ بن زید کو بھی ۱۲۹ھ میں شہید کر دیا گیا اور ان کی لاش کو بھی سولی پر لٹکایا گیا اور آخر میں نذرِ آتش کر کے خاکستر کو فرات میں بکھرا دیا گیا۔

آلِ محمدؐ کی قربانیوں کی داستان سے فرات کا کلیجہ پانی ہو گیا اور ظالموں کے دماغ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وسیعلم الذین ظلموا أیّ منقلب ینقلبون۔

عبادت

آپ کی عبادت کائنات میں شہرۂ آفاق تھی اور اسی بنا پر آپ کو ہمیشہ زین العابدین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور قیامت میں بھی اسی نام سے پکارا جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ جب

امام محمد باقرؑ نے اس عبادت کی شدت و کثرت سے روکنا چاہا تو فرمایا کہ ذرا وہ صحیفہ تو لے آؤ جس میں میرے جد امیرالمومنینؑ کی عبادتوں کا تذکرہ ہے اور پھر اس صحیفہ کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ "من یبلغ ذٰلك" (اس منزل عبادت کو کون پا سکتا ہے؟)۔ اور کیوں نہ ہو۔ اگر آپ کی عبادت نے آپ کو زین العابدین بنا دیا ہے تو امیرالمومنینؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری تھی۔

آپ کی ایک کیفیت یہ تھی کہ وضو شروع کرتے تھے تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا کہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے۔

نماز میں بسا اوقات جسم بید کے مانند لرزتا تھا کہ مالک یوم الدین کی بارگاہ میں کھڑے ہیں۔ ایاك نعبد وایاك نستعین کہہ کر کبھی کبھی اس جملہ کی تکرار فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مدد طلب کی ہے تو اُدھر سے مدد کا وعدہ بھی تو ہونا چاہیے۔

خضوع و خشوع کا یہ عالم تھا کہ فرزند کنویں میں گر گیا تو نماز میں مصروف رہے اور جب نماز تمام ہو گئی تو کنویں سے اپنی امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اس طرح بچہ کو نکال لیا کہ دامن بھی تر نہ ہونے پایا تھا۔

خوف خدا کی یہ کیفیت تھی کہ نماز میں مصروف تھے اور گھر میں آگ لگ گئی تو نماز کو مختصر نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ میں جہنم کی آگ کے بجھانے میں مصروف تھا مجھے یہاں کی آگ کی کوئی فکر نہیں تھی اسے تو محلہ والے بھی بجھا سکتے تھے۔

مدینہ میں آپ کا ایک باغ تھا جس میں پانچ سو خرمہ کے درخت تھے جب باغ میں داخل ہوتے تھے تو ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے تھے کہ پروردگار نے یہ رزق عطا فرمایا ہے اور اسے حوادث زمانہ سے تباہ نہیں ہونے دیا ہے۔

آپ نے خاکِ شفا کی ایک سجدہ گاہ بنا رکھی تھی جس پر سجدہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ خاک روزِ قیامت ان سجدوں کی گواہی دے گی۔ (منتہی الآمال)

بسا اوقات نماز میں سورۂ الحمد کی تلاوت کرتے ہوئے مالك یوم الدین کی تکرار فرمایا کرتے تھے اور لرزتے رہتے تھے کہ میں کس کی بارگاہ میں کھڑا ہوں جو روزِ قیامت کا مالک ہے جس کا سارا ملک اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور مال و اولاد کوئی

کام آنے والا نہیں ہے۔

اخلاق

آلِ محمدؐ میں ہر فرد کا اخلاق ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن امام سجادؑ نے اخلاقیات کے مظاہرہ کے ساتھ فلسفۂ اخلاقیات کی بھی ایک دنیا آباد کی ہے جس سے انسان اپنے کردار کی بہترین تعمیر کر سکتا ہے۔

آپ کے سامنے کوئی طالب علم دین آجاتا تھا تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ رسولؐ کی وصیت ہے۔ گویا اس طرح اسلام میں علم دین کی عظمت و اہمیت کا بھی اظہار فرماتے تھے اور طلاب علم دین کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ کاش اہل دولت و اقتدار کے لیے سراپا تعظیم ہو جانے والے افراد کبھی ان غریب طلاب کی طرف بھی ایک نظر عنایت فرمالیتے۔

آپ کے سامنے کوئی سائل بھی آجاتا تھا تو اس کا استقبال فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ یہ شخص وہ ہے جو میرے مال کو دنیا سے آخرت تک پہونچا دیتا ہے اور کسی اُجرت کا مطالبہ بھی نہیں کرتا ہے۔

آپ نے جس ناقہ پر بیس حج فرمائے تھے اسے بھی کبھی ایک تازیانہ نہیں لگایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے انتقال کے بعد قبر مطہر پر تین روز تک مسلسل گریہ کر کے دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ایسے شفیق و مہربان کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں ہے۔

آپ کی وہ مادر گرامی جنھوں نے آپ کی تربیت فرمائی تھی آپ ان کے سامنے بیٹھ کر بھی کھانا نوش نہیں فرماتے تھے اور جب کسی نے دریافت کر لیا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ انھیں میری وجہ سے کسی چیز کے کھانے میں تکلف ہو۔ یا وہ کسی چیز کو پسند کرتی ہوں اور مجھ پر سبقت نہ کرنا چاہتی ہوں اور میں سبقت کر دوں۔

مدینہ میں یزید کے مظالم کے خلاف احتجاج کے موقع پر جب مروان اور حصین بن نمیر جیسے افراد پر دنیا تنگ ہو گئی تو آپ نے مروان کے بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور حصین بن نمیر کو مفت غلہ فراہم کیا۔

مدینہ میں چار سو غرباء کے گھرانے تھے جہاں رات کی تاریکی میں سامانِ غذا پہونچایا کرتے تھے، اور اس طرح پشت مبارک پر سامان اُٹھانے کا واضح نشان پڑ گیا تھا۔

صحیفہ کاملہ

امام سجادؑ کی زندگی میں جتنی اہمیت آپ کی نمازوں اور عبادتوں کو حاصل ہے اتنی ہی اہمیت آپ کی دعاؤں کو بھی حاصل ہے اور شاید کسی معصوم سے بھی اس طرح کی دُعائیں نقل نہیں ہوئی ہیں جس طرح کی عظیم دُعائیں امام سجادؑ سے نقل کی گئی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جناب ابو حمزہ ثمالی کی دعائے سحر جس میں درسِ معرفت کے ساتھ عرض مدعا کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جس کا غیر معصوم نہ تصور کر سکتا ہے اور نہ وہ سلیقہ پیدا کر سکتا ہے۔

صحیفہ کاملہ آپ کی دعاؤں کا مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی دعاؤں کا فلسفہ وہ نہیں تھا جو ہمارے یہاں کی دعاؤں کا ہوا کرتا ہے کہ انسان غرض کے موقع پر ہاتھ پھیلا کر معبود سے کچھ زندگانی دنیا کا سامان طلب کر لے اور پھر کام نکل جانے کے بعد مصلیٰ لپیٹ دے یا دست دعا گرا لے۔ بلکہ آپ اپنی دعاؤں کو عرض مدعا سے زیادہ عرض بندگی کا ذریعہ قرار دیتے تھے کہ فلسفہ دعا دراصل غرض برآری نہیں ہے۔ بلکہ وہ احساس عظمت ربوبیت اور ذلت عبودیت کے مجموعہ کا نام ہے کہ جب تک انسان میں مالک کی عظمت اور اپنی کمزوری کا مکمل احساس نہ پیدا ہو، اس کی دعا، دعا کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

اور جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا تو انسان سراپا دعا بن جائے گا کہ کسی وقت بھی نہ مالک کی عظمت کمزوری میں تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ اپنی کمزوری بے نیازی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ، اگر تمھاری دعائیں نہ ہوتیں تو پروردگار تمھاری طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ اور روایات میں اسی اعتبار سے دعا کو "مغز عبادت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام سجادؑ کی دعاؤں میں ایک نکتہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ آپ نے دعا کو صاحبانِ ایمان کے

کے لیے تعمیر کردار اور ظالمین کے خلاف احتجاج کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے اور اپنی دعاؤں کے ذریعہ ان مطالب کا اعلان فرما دیا ہے جن کا اعلان دوسرے انداز سے ممکن نہیں تھا۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو کام امیرالمومنینؑ نے اپنے خطبوں سے لیا ہے وہ کام امام سجادؑ نے اپنی دعاؤں سے لیا ہے، اور اس طرح واضح کر دیا ہے کہ علیؑ کا کام پیغام الٰہی کا پہونچا دینا اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنا ہے اور بس حالات سازگار ہو جاتے ہیں اور مخاطب مل جاتے ہیں تو یہ کام ان کی طرف رخ کر کے خطبہ کی شکل میں انجام دیا جاتا ہے اور حالات نامساعد ہو جاتے ہیں اور زمانہ منھ موڑ لیتا ہے تو اس سے منھ پھیر کر مالک کائنات کو مخاطب بنا کر اس سے حالات کی فریاد کی جاتی ہے اور اس طرح حالات کی تنقید کو دعاؤں کی شکل میں ایک دستاویز بنا کر محفوظ کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ کی دعائے روز جمعہ یا اور دیگر دعاؤں سے مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

دلائلِ امامتؑ

اعلانات واعترافات

روزِ قیامت میرے اُس فرزند کو زین العابدین کے لقب سے پکارا جائے گا۔ (رسول اکرمؐ)

امام زین العابدینؑ سے زیادہ متقی اور پرہیزگار انسان نہیں دیکھا گیا۔ (سعید بن المسیب) مطالب السؤل

جو روایت زہری امام زین العابدینؑ سے منسوب کرے وہ بہترین سند کی مالک ہے۔

(ابن ابی شیبہ) طبقات الحفاظ

امام زین العابدینؑ روایات میں انتہائی محتاط، صادق اللہجہ اور معتمد علیہ تھے۔ وہ فقہاء اہلبیتؑ میں شمار ہوتے تھے۔ (دمیری) حیوٰۃ الحیوان

آپ کے جلال وجمال کی بنا پر ہر دیکھنے والا تعظیم پر مجبور ہو جاتا تھا۔ (وسیلۃ النجاۃ)

آپ علم و زہد و عبادات میں امام حسینؑ کی زندہ تصویر تھے۔ (صواعق محرقہ)

آپ سے زیادہ عبادت گذار اور فقیہ نہیں دیکھا گیا۔

کرامات

حبابہ والبیہ ۔ جو امیرالمومنینؑ کے دور کی ایک محترم خاتون تھیں اور انھوں نے امیرالمومنینؑ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ بازار کوفہ میں حرام مچھلی بیچنے والوں اور ڈاڑھی منڈوں کو اپنے تازیانہ سے ہنکار رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ تم لوگ بنی مروان کے لشکر ہو کہ ڈاڑھی منڈاتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ یہی خاتون ایک مرتبہ امیرالمومنینؑ کی خدمت میں ثبوت امامت حاصل کرنے کے لیے آئیں تو آپ نے سنگ ریزوں پر مہرِ امامت ثبت کر دی اور اسی کو علامت قرار دیدیا اس کے بعد امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں آئیں اور یہی ثبوت لے گئیں، یہاں تک کہ امام سجادؑ کا دور آیا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئیں۔ آپ نماز میں مشغول تھے۔ حبابہ نے واپسی کا ارادہ کیا تو آپ نے ایک

اشارہ سے روک دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبابہ پلٹیں تو ان کی جوانی بھی واپس آگئی اور اس کے بعد امام رضاؑ کے دورِ حیات تک زندہ رہیں۔

● امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب بعض لوگوں نے جناب محمد حنفیہ کو امام ماننا شروع کر دیا تو وہ امام سجادؑ کو ساتھ لے کر اظہارِ حقیقت کے لیے خانہ کعبہ تک آئے اور حجرِ اسود کو سلام کیا جس کا کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے بعد جب امام سجادؑ نے سلام کیا تو حجرِ اسود نے آپ کی امامت کی گواہی دے دی اور اس طرح حق واضح ہو کر سامنے آگیا۔

● بلخ کا رہنے والا ایک شخص اکثر آپ کی زیارت کے لیے آیا کرتا تھا اور اپنے ہمراہ کچھ تحفہ بھی لایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ زوجہ نے کہا کہ تم ہمیشہ تحفہ لے جاتے ہو لیکن ادھر سے کوئی جواب نہیں ملتا ہے۔ اتفاق سے اس مرتبہ وہ امام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھانا نوش فرما رہے تھے۔ آپ نے اسے شریکِ طعام کر لیا اور آخر میں ہاتھ دھلوانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا کہ یہ خدمت میں انجام دوں گا۔ اس کے بعد جب وہ ہاتھ دھلانے لگا تو آپ اس دھوون کے بارے میں برابر سوال کرتے رہے اور وہ اسے پانی بتاتا رہا اور آپ اُسے جواہرات میں تبدیل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب طشت جواہرات سے پُر ہو گیا تو فرمایا اسے لے جا کر اپنی زوجہ کو دے دینا تاکہ اسے کوئی شکایت نہ رہ جائے۔ اس شخص نے واپس آکر زوجہ کو جواہرات دیے تو وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ انھیں غیب کی اطلاع کس طرح ہو گئی اور دوسرے سال شوہر کے ہمراہ زیارت کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے آکر امامؑ کو اطلاع دی۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور وہ زائرہ زندہ ہو گئی اور امام کی خدمت میں آکر گواہی دی کہ یہی وہ شخص ہیں جنھوں نے ملک الموت سے روح کی واپسی کا تقاضا کیا تھا۔

واضح رہے کہ اس واقعہ میں کوئی بات ناقابلِ یقین نہیں ہے جو خدا کہ ملک الموت کے ذریعہ روح قبض کرا سکتا ہے وہ واپس بھی کرا سکتا ہے اور جو عیسیٰ بن مریم کو احیاءِ موتیٰ کی کرامت دے سکتا ہے وہ فرزندِ زہراؑ کو بھی دے سکتا ہے جب کہ آپ کی قربانیاں دینِ خدا کے لیے جناب عیسیٰ کی قربانیوں سے یقیناً زیادہ تھیں۔

● ہشام بن عبدالملک اپنے باپ کے دورِ حکومت میں حج کے لیے آیا تو حجرِ اسود تک نہ پہونچ سکا اس کے بعد امام سجادؑ آئے تو انھیں خود بخود راستہ مل گیا۔ جس پر لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے کہا لا اعرفہ تو فرزدق کو جوش آگیا اور انھوں نے برجستہ امامؑ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ دیا جس کے نتیجہ میں اس نے انھیں مقام عسفان پر قید کر دیا اور جب امامؑ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے ۱۲ درہم بطور انعام روانہ کیے۔ فرزدق نے معذرت کی کہ میں نے فی سبیل اللہ اشعار کہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا اجر اپنے مقام پر محفوظ ہے لیکن یہ خدمت تو ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔

دربارِ یزید میں خطبۂ امام سجادؑ

بعد الحمد والثناء۔ ایہا الناس! ہمیں چھ صفتیں عطا کی گئی ہیں اور ہمیں سات باتوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی ہے:

ہماری صفتیں علم، حلم، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور مومنین کے دلوں میں ہماری محبت ہے۔ اور ہمارے اسبابِ فضیلت یہ ہیں کہ رسول مختارؐ ہمیں میں سے ہیں۔ صدیق (علیؑ)، طیار (جعفرؑ)، اسد اللہ (حمزہؑ)، سیدۃ نساء العالمین (فاطمہؑ)، سبطینِ امت و سیدا شباب اہل الجنۃ (حسنینؑ) ہمارے ہی بزرگ ہیں۔ جس نے مجھے پہچان لیا اس نے پہچان لیا اور جس نے نہیں پہچانا اس سے اپنا تعارف کرا رہا ہوں۔

میں مکہ و منیٰ کا فرزند ہوں، میں زمزم و صفا کا لال ہوں، میں اُس کا فرزند ہوں جس نے ردا میں زکوٰۃ کو اٹھا کر غریبوں تک پہونچایا ہے، میں بہترین لباس و ردا والے کا فرزند ہوں، میں بہترین زمین پر قدم رکھنے والا کا لال ہوں۔ میں بہترین طواف و سعی کرنے والے اور بہترین حج و تلبیہ ادا کرنے والے کا لال ہوں، میں اس کا فرزند ہوں جسے براق پر سوار کیا گیا، میں اس کا لال ہوں جسے راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جایا گیا اور کیا بے نیاز اور پاکیزہ صفات ہے وہ لے جانے والا۔ میں اس کا لال ہوں جسے جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ تک اپنے ساتھ لے گئے، میں اس کا فرزند ہوں جس نے تقرب کی تمام منزلیں طے کر کے اپنے کو دو کمانوں کے فاصلہ تک پہونچا دیا، میں اس کا لال ہوں جس نے ملائکہ کے ساتھ نماز ادا کی، میں اس کا فرزند ہوں جس سے ربِ جلیل نے وحی کے ذریعہ راز کی باتیں کیں۔ میں محمد مصطفےٰؐ کا لال ہوں، میں علی مرتضیٰؑ کا فرزند ہوں، میں اس کا لال ہوں جس نے کفار کی ناک رگڑ دی یہاں تک کہ کلمہ پڑھ لیا، میں اس کا وارث ہوں جس نے رسولِ اکرمؐ کے سامنے دو تلواروں سے جنگ کی، دو نیزوں سے نیزہ بازی کی، دو

قبلوں کی طرف نماز پڑھی، دو بیعتوں میں حصہ لیا اور دو ہجرتیں کیں، اس نے بدر و حنین کے معرکے سَر کیے اور ایک پلک جھپکنے کے برابر شرک نہیں کیا۔ میں صالح المومنین کا فرزند ہوں، میں وارث النبیین، قاتل الملحدین، یعسوب المسلمین، نور المجاہدین، زین العابدین، تاج البکائین، اصبر الصابرین، افضل القائمین من آل یٰسین و رسول رب العالمین کا فرزند ہوں، میں اس کا لال ہوں جس کی جبرئیل کے ذریعہ تائید اور میکائیل کے ذریعہ مدد کی گئی، میں حرم مسلمین کے محافظ کا لال ہوں، میں بیعت شکن، منحرف اور دین سے نکل جانے والوں سے جہاد کرنے والے، نواصب سے جنگ کرنے والے اور تمام قریش میں سب سے زیادہ بلند تر انسان کا وارث ہوں، میں اس کا فرزند ہوں جس نے سب سے پہلے دعوت الٰہی پر لبیک کہی، سب سے پہلا صاحب ایمان تھا، ظالموں کی کمر توڑنے والا، مشرکین کو ہلاک کرنے والا، منافقین کے حق میں سہم ترکش الٰہی، کلمہ عابدین کی زبان، دین خدا کا مددگار، امر خدا کا ولی، حکمت الٰہی کا باغ، علم الٰہی کا خزانہ، جواد و کریم زیرک و زکی، رضی و مرضی، مجاہد و باہمت، صابر و روزہ گزار، مہذب و نیک کردار، بہادر و شجاع، اصلاب کا قطع کرنے والا، دشمنوں کی صفوں کا برہم کر دینے والا، سب سے زیادہ مطمئن قلب، سب سے زیادہ صاحب اختیار، سب سے زیادہ فصیح و بلیغ، سب سے زیادہ صاحب عزم و عزیمت، سب سے زیادہ صاحب حوصلہ و ہمت، شیر نیستان شجاعت، باران رحمت، میدانِ جنگ میں نیزوں کی باہمی آویزش اور گھوڑوں کی باہمی دواد وش کے موقع پر ظالموں کو پیس ڈالنے والا اور انھیں ذرات کی طرح ہوا میں اڑا دینے والا، حجاز کا شیر، صاحب اعجاز، عراق کا سردار، نص و استحقاق کا امام، مکی و مدنی، ابطحی، تہامی، بدری و احدی، بیعت شجرہ و ہجرت کا مجاہد، عرب کا سردار، میدان جنگ کا شیر، مشعرین کا وارث، سبطین کا والد، مظہر عجائب و غرائب، برہم کن جمعیت لشکر، شہاب ثاقب، نور عاقب، اسد اللہ الغالب، مطلوب کل طالب، غالب کل غالب تھا یعنی میرا جد علیؑ بن ابی طالب۔

میں فاطمہ زہرؑا، سیدۃ النساء، طاہرہ بتول، بضعۃ الرسولؐ کا فرزند ہوں۔

اس کے بعد مصائب کربلا کا ذکر کر کے دربار میں انقلاب برپا کر دیا اور گویا ظالم کے دربار میں فضائل و مصائب پر مشتمل ایک مکمل تقریر کر دی جو اس جہت سے نامکمل رہ گئی کہ ظالم

یزید نے اذان کے ذریعہ ذکر مصائب کو مکمل نہ ہونے دیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ فضائل کی تکذیب آسان ہے لیکن مصائب کے درد کا روکنا آسان نہیں ہے۔

مذکورہ خطبہ میں جو بات قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ امامؑ نے ابتدا میں تمام اسلامی آثار کا تذکرہ کر کے اپنی وراثت کا ذکر کیا اور اس کے بعد اپنے کو وارث رسولؐ قرار دیا اور پھر اپنے بزرگوں کے فضائل کا تذکرہ کیا کہ دیکھیں ظالم ان میں سے کس حصہ کو چیلنج کرتا ہے۔۔۔ لیکن تاریخ کربلا گواہ ہے کہ یزید خطبہ کے کسی حصہ کو چیلنج نہیں کر سکا بلکہ اس نے اذان شروع کرا دی جو امامؑ کی فتح مبین کا اعلان تھا کہ رسالت کو بنی ہاشم کا کھیل کہنے والا أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ کہلوا رہا ہے اور امامؑ نے اسی مقام پر اپنے حق کا اعلان کر کے رسالت کے ساتھ ذکر امامت کی بنیاد ڈال دی جس کا سلسلہ بحمداللہ آج تک قائم ہے اور درباروں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی مظلومیت کی بنیادیں استوار ہیں۔

زین العابدین بارگاہ معبود میں!

دعا کرنا بظاہر انتہائی آسان ہے اور واقعاً انتہائی مشکل ہے۔ دنیا کا کون سا انسان ہے جو محتاج نہیں ہے، اور کون سا محتاج ہے جو کسی سے طلب نہیں کرتا ہے۔ درحقیقت اسی طلب کا نام دعا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو ناواقف اسرار طلب ہیں وہ محتاجوں سے مانگتے ہیں۔ اور جنھیں طلب کا سلیقہ میسر آتا ہے وہ بے نیاز سے مانگتے ہیں۔ محتاجوں سے مانگنے کا نام خوشامد، تملق، تعریف بے جا، تواضع بے محل اور استدعا و التماس ہے۔ اور بے نیاز سے مانگنے کا نام دعا ہے ــــ بے نیاز نے خود کسی کو اپنا نمائندہ بنا دیا ہے تو اس سے مانگنا مذکورہ بالا عناوین سے خارج ہے کہ یہ درحقیقت بے نیاز ہی سے طلب کرنا ہے اور مانگنے والا جانتا ہے کہ یہ افراد اس کے مقابلہ میں حاجت روائی کے دعوے دار نہیں ہیں بلکہ اس کی نمائندگی میں حاجت روائی کا کام انجام دیتے ہیں اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اگر ایک فرشتہ اس کی طرف سے جان لینے پر مامور ہو سکتا ہے تو ایک بندہ جان دینے پر بھی مامور ہو سکتا ہے۔ اس امکان سے کوئی صاحبِ عقل انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے واقعات کی دنیا الگ ہے اور اس پر بحث کرنے کے لیے بڑی تفصیل درکار ہے۔

دعا جس قدر آسان ہے کہ تقاضائے فطرت، عادت بشر اور مزاج انسانی کے عین مطابق ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سہل ممتنع اگر کوئی چیز ہے تو وہ دعا ہی ہے جو الفاظ کے اعتبار سے انتہائی آسان ہوتی ہے اور اسرار کے اعتبار سے انتہائی مشکل۔

دعا کے لیے جس قدر آداب درکار ہیں، جو پاکیزگی نفس ضروری ہے اور جس طرح کے تصوّرات لازم ہیں ان کا حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دعا، مرکز دعا کی معرفت پر موقوف ہے، اور معرفت زندگی کا عظیم ترین مرحلہ ہے جسے

مولائے کائنات نے ابتدار دین اور بنیاد مذہب قرار دیا تھا۔ معرفت کے بعد بارگاہ کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا اس سے سخت ترین مرحلہ ہے اور ان تمام مراحل کے بعد طلب میں صدق نیت پیدا کرنا اور ایک انتہائی دشوار گذار مرحلہ ہے۔ ورنہ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ مانگنے والا، بظاہر خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے رہتا ہے لیکن نظر کسی حاکم کے اقتدار، کسی دولتمند کی جیب، کسی صاحب خیرات کے جود و کرم پر لگی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دعا کا نام دعا نہیں ہے اور گہرائیوں پر غور کیا جائے تو یہ توہین دعا ہے ــــ دعا معبود پر اعتماد کا نام ہے ــــ اور دوسروں پر نگاہ رکھنا بد اعتمادی کی علامت ہے۔ بعض روایات میں تو یہ تک مضمون وارد ہوا ہے کہ اگر کسی شخص کو دعا کی قبولیت پر اعتماد نہ ہو اور وہ صرف حسب عادت یا برائے تجربہ دعا مانگ رہا ہے تو وہ معبود کی توہین کا مرتکب ہو رہا ہے۔ دنیا کے کسی صاحبِ کرم کے بارے میں بے اعتمادی اس کے کرم کی توہین ہے تو معبود کے کرم کے بارے میں بے اعتمادی کتنی بڑی توہین کا باعث ہوگی۔ اور تجربہ تو اصلاً حدودِ اسلام سے باہر ہے۔ بھلا کس بندہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پروردگار سے مانگ کر اس کے کرم کی آزمائش کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔ "تماشائے اہلِ کرم" دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ مذہب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علمار کرام نے یہ تاکید کی ہے کہ اپنی دعاؤں میں ائمہ معصومینؑ کے الفاظ کا اتباع کرو اور اس کی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرو کہ تمھارے الفاظ اس کی بارگاہ کے لیے نامناسب ہو سکتے ہیں لیکن ان کے الفاظ میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہ کامل الایمان اور کامل المعرفۃ تھے وہ جو الفاظ استعمال کر دیں گے وہ یقیناً بارگاہ کے شایانِ شان ہوں گے اور اس سے مدعا کے حصول کی راہ ہموار ہو گی بلکہ انھیں الفاظ سے انسان اپنے اندر سلیقۂ معرفت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ہماری دعائیں نتیجۂ معرفت ہیں اور معصومینؑ کی دعائیں درسِ معرفت۔ ہم وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہماری معرفت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور انھوں نے وہ الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہم معرفت باری کی راہیں متعین کر سکتے ہیں۔ "یامن دلّ

علیٰ ذاته بذاته۔ (اے وہ معبود جس نے خود اپنی ذات کی طرف رہنمائی کی ہے) وہ خود ہی راہ نما بھی ہے اور منزل بھی۔

یہ جملہ معرفت کا ایک سمندر ہے کہ اگر دعا میں یہ فقرہ نہ آگیا ہوتا تو انسان کے سامنے معرفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ مخلوقات سے خالق کو پہچانے اور کائنات کی عظمت سے مالک کائنات کی بزرگی و برتری کا اندازہ لگائے۔ لیکن امامؑ کے اس ایک فقرہ نے معرفت کا ایک نیا راستہ کھول دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ مخلوقات میں خالق کو پہچنوانے کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو معرفت خود خالق کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے ۔۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مرتبہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہے۔ اس کی طرف اشارہ دعائے صباح میں مولائے کائنات نے کیا تھا اور اس کے بعد اس کی مکمل تشریح دعائے ابوحمزہ ثمالی میں امام زین العابدینؑ نے کی ہے، سرکار سید الشہداؑ نے دعائے عرفہ میں اسی حقیقت کی طرف بہت سے اشارے فرمائے ہیں اور معرفت کے بے شمار راستے کھول دیے ہیں۔

دعاؤں کے سلسلہ میں معصومین کے الفاظ و کلمات کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بھلا کس کی مجال ہے جو ان لفظوں کی بلاغت کا اندازہ کر سکے اور اس کے بعد یہ کہے کہ یہ الفاظ اس معرفت کی مکمل ترجمانی کر رہے ہیں یا معبود کی بارگاہ کے شایان شان ہیں۔ صاحبانِ بصیرت کے بیان کے مطابق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں جس قدر راہنمائی امام زین العابدینؑ نے کی ہے اور دعا کو جس قدر آپ نے درس و تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے دیگر معصومینؑ کے یہاں اس کی مثالیں نہیں ملتی ہیں اور غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے معصومینؑ کو دوسرے ذرائع بھی فراہم ہو گئے تھے اور انھوں نے ان ذرائع کو بھی درس بصیرت اور تبلیغ دین و مذہب کا ذریعہ بنا لیا تھا، یا بعض اوقات انھیں اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ دعاؤں کے ذریعہ اس کارنامہ کو انجام دے سکتے۔

امام زین العابدینؑ کا زمانہ واقعہ کربلا کے بعد ایک انتہائی حساس اور دشوار گذار دور تھا۔ اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح کا مسلح اقدام ممکن نہیں تھا اور ایک عظیم اقدام کا اثر نظر کے سامنے تھا یعنی مذہب نے اپنی زندگی کے لیے خون کا مطالبہ کیا تھا اور وہ مطالبہ

پورا کیا جا چکا تھا۔ انقلابی تحریک کے لیے وہ مقدس خون ہی کافی تھا اس کے لیے مزید قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن امام کے لیے خاموش بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا کہ امام ہدایت خلق کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے آپ نے تصویر کے دوسرے رُخ پر نظر ڈالی کہ یہ صحیح ہے کہ میرا قیام غیر ضروری ہے اور اسلام کو فی الحال میرے خون کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت مظلومیت کے نام پر قوم گوش بر آواز ہے اور الفاظ کی اتنی سخت گرفت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انھیں الفاظ کے ذریعہ مذہب کی تبلیغ بھی کی جائے اور مظلومیت کی ترویج کا کام بھی انجام دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہ شکل خطبہ ممکن نہیں تھا کہ خطبہ میں مسلح اقدام کے اعتراض کے امکانات پائے جاتے تھے اور ایک خونی سانحہ ممکن تھا جس کی اس وقت مشیت پروردگار کو ضرورت نہیں تھی اس لیے آپ نے دعاؤں کا راستہ اختیار کیا اور انھیں دعاؤں کے ذریعہ تمام مراحل تبلیغ و ترویج مکمل کر لیے۔

آپ کے الفاظ اس قدر جامع، موثر اور مطابق مقصد و مدعا تھے کہ صاحبانِ حاجت آپ کی دعاؤں پر مکمل اعتماد کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کے ایک شاگرد نے آپ کی ایک دعا کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس دعا کے ذریعہ مدعا حاصل نہ ہو تو دعا کرنے والے کو مجھ پر لعنت کرنے کا حق ہے۔ یعنی یہ دعا بارہا کی آزمائی ہوئی ہے اور جب بھی اس کے سہارے مدعا طلب کیا گیا ہے ضرور حاصل ہوا ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ ان پاکیزہ الفاظ کے لیے پاکیزہ زبان اور پاکیزہ قلب فراہم کرے تاکہ اس کے اثرات و نتائج سے بہرہ یاب ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ امامؑ کی اس دعا کا لہجہ، اسلوب اور انداز اس قسم کا ہے کہ دعا کرنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا مدعا ضرور حاصل ہوگا۔

"خدایا! میں تجھے کیسے پکاروں کہ میری حیثیت معلوم ہے (میں میں ہوں) اور تجھ سے کس طرح امیدیں منقطع کروں کہ تیرا کرم بھی معلوم ہے کہ (تو تو ہے)۔۔ خدایا! میں تجھ سے سوال نہیں بھی کرتا ہوں تو عطا کرتا ہے۔ بھلا ایسا کون ہے جس سے سوال کروں تب ہی عطا کر دے ۔۔ خدایا! تجھے نہیں بھی پکارتا ہوں تو تو دعائیں قبول کر لیتا ہے۔ اب تیرے علاوہ کون ہے جو مانگنے ہی پر دیدے۔ خدایا! تجھ سے تضرع و زاری نہیں بھی کرتا ہوں تو تو رحم کرتا ہے، اب تیرے علاوہ کون ہے جو کم از کم تضرع و زاری ہی پر رحم کر دے۔ خدایا! جس طرح تو نے سمندر میں راستہ بنا کر موسیٰؑ کو نجات دی ہے

میری التماس یہ ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمتیں نازل فرما اور مجھے بھی میری پریشانیوں سے نجات دیدے اور میرے لیے فی الفور سہولت و آسانی کا راستہ کھول دے ۔ اسے ارحم الراحمین! تجھے تیرے فضل و کرم کا واسطہ !

ان الفاظ سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان اس اخلاص و صدق نیت کے ساتھ دعا کرے اور اپنے دل میں واقعتًا یہ جذبات پیدا کرلے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ہر فرعونِ وقت کے مقابلہ میں غریب الوطن موسیٰؑ کی طرح صرف ذاتِ واجب پر بھروسہ کرلے تو کس طرح ممکن ہے کہ سمندروں میں سے راستہ نہ نکل آئے اور فرعون جیسے ظالموں سے نجات نہ مل جائے اور وہ ظالم غرقاب نہ ہوجائیں۔

آج جب کہ بر و بحر مصائب کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور سمندر سرچشمۂ رحمت ہونے کے بجائے سرچشمۂ آلام و مصائب بن گئے ہیں ان دعاؤں، ان الفاظ، ان کلمات اور ان معارف و جذبات کی شدید ترین ضرورت ہے۔ رب کریم ہم سب کو اس انداز دعا سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت سے مشرف کرے جن میں سب سے اہم دعا وارث زین العابدینؑ کے ظہور اور قبر زین العابدینؑ کے آبادی کی دعا ہے۔ خدایا! حجت آخر کے ظہور میں تعجیل فرما اور بقیع کے ویران قبرستان کو آباد فرما۔!

اسلام میں دُعا کی اہمیت اور اس کے آداب

دُعا :

اے پیغمبرؐ! کہہ دو کہ تمہاری دعا نہ ہوتی تو پروردگار تمہاری طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ (قرآن کریم)

ہم سے دعا کرو ہم قبول کریں گے۔ دعا کی منزل میں اکڑ جانے والے ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ (قرآن کریم)

میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو کہہ دو کہ میں بہت قریب ہوں اور سب کی دعائیں سن لیتا ہوں۔ (قرآن کریم)

کیا میں تمہیں ایسے اسلحہ کا پتہ دوں جو دشمن سے بچا سکے اور روزی کو فراواں کر سکے؟ یہ اسلحہ دعا ہے۔ (رسول اکرمؐ)

دعا مومن کی سپر ہے اور جب دروازہ دیر تک کھٹکھٹایا جائے گا تو بالآخر کھل جائے گا۔ (امیرالمومنینؑ)

مبتلائے مصیبت سے زیادہ سزاوار دعا وہ صاحب عافیت ہے جو بلا کے خطرہ سے محفوظ نہیں ہے۔ دونوں کو برابر سے دعا کرنا چاہیے۔ (امیرالمومنینؑ)

دعا ردِّ بلا کا مستحکم ترین ذریعہ ہے۔ (امام زین العابدینؑ)

دعا سے قضا پلٹ جاتی ہے۔ (امام محمد باقرؑ)

رات بھر نماز پڑھنے والے سے رات بھر دعا کرنے والا افضل ہے۔ امام صادقؑ۔ (نماز میں ریاکاری اور غفلت کا امکان ہے۔ دعا اخلاص اور توجہ چاہتی ہے ۔ جوادی)

دعا تیز ترین نیزہ سے زیادہ موثر ہے۔ (امام صادقؑ)

دعا ردِّ بلا کا ذریعہ ہے۔ (امام کاظمؑ)

انبیاء کے اسلحہ کو اختیار کرو جس کا نام دعا ہے۔ (امام رضاؑ)

آداب و اسبابِ استجابتِ دُعا

۱۔ انسان باوضو دعا کرے۔

۲۔ خوشبو استعمال کرے۔

۳۔ رو بہ قبلہ ہو۔

۴۔ حضورِ قلب کے ساتھ دعا کرے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ حضورِ قلب دعا کے چھ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

۵۔ خدا سے حسنِ ظن رکھے کہ وہ کریم ہے۔ سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرے گا۔

۶۔ دعا سے پہلے صدقہ دے۔

۷۔ فعلِ حرام یا قطعِ رحم کی دعا نہ کرے۔

۸۔ گڑگڑا کر دعا کرے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ ایسی دعا ضرور مستجاب ہوتی ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ پروردگار بندوں سے گڑگڑانے کو بُرا سمجھتا ہے اور اپنے سامنے گڑگڑانے کو دوست رکھتا ہے۔

۹۔ حاجتوں کو بیان کرے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ خداوند ہر ایک کی حاجت جانتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ انسان خود بھی بیان کرے۔

۱۰۔ مخفی انداز سے دعا کرے۔ امام رضاؑ کا ارشاد ہے کہ مخفی انداز کی ایک دعا علانیہ ستّر دعاؤں سے بہتر ہے۔

۱۱۔ اپنی دعا میں دوسرے مومنین کو بھی شامل کرے۔ مرسلِ اعظمؐ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اپنی دعاؤں میں دوسرے مومنین کو بھی شامل رکھو۔

۱۲۔ اجتماعی طور پر دعا کرے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جس جگہ ۴۰ مومنین جمع ہو کر دعا کریں گے وہ دعا ضرور قبول ہوگی اور ۴۰ ممکن نہ ہوں تو چار آدمی دس مرتبہ دعا کریں، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ایک آدمی ۴۰ مرتبہ دعا کرے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک آدمی دُعا کرے اور باقی لوگ آمین کہیں۔

امام محمد باقرؑ کا طریقہ تھا کہ آپ مشکلات میں گھر کے بچوں اور عورتوں کو جمع کر کے فرماتے تھے کہ میں دعا کروں تم سب آمین کہو۔ (اگرچہ امامؑ کی دعا آمین کی محتاج نہ تھی لیکن یہ امت کی تربیت کا بہترین سلیقہ تھا۔ جوآدمی)

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں، دعا کرنے والا اور آمین کہنے والا دونوں شریکِ دعا سمجھے جاتے ہیں۔

۱۳۔ بارگاہِ احدیت میں اپنی ذلت، عاجزی اور کمزوری کا اظہار کرے کہ پروردگار نے جناب موسیٰؑ کی طرف وحی کی ہے کہ مجھ سے لرزتے ہوئے دعا کرو، اپنے چہرہ کو خاک پر رکھو، میرے سامنے باقاعدہ سجدہ کرو اور کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا کر دعا مانگو اور خوف زدہ دل کے ساتھ مجھ سے مناجات کرو۔

۱۴۔ دعا سے پہلے حمد و ثنائے الٰہی کرے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ دعا سے پہلے خدا کی بزرگی کا اقرار کرو اور یہ کہو: "اے وہ پروردگار جو رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے، جو انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، جو انتہائی بلند منظر پر ہے، جس کا مثل کوئی نہیں ہے۔ اے بہترین عطا کرنے والے اور بہترین مرکزِ سوال! اے بہترین رحم کرنے والے!" کہ ان الفاظ کے ذریعہ دعا قبولیت سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ (یہ الفاظ دلیلِ معرفتِ عبد ہیں۔ جوآدمی)

۱۵۔ دعا سے پہلے صلوات پڑھے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ صلوات کے بغیر دُعا بارگاہِ احدیت تک نہیں پہونچ سکتی۔ بغیر صلوات کی دعا، دعا کرنے والے کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ دعا کے قبل و بعد صلوات پڑھو تاکہ خداوند اسی صلوات کے طفیل میں تمھاری دعا بھی قبول کرلے اس لیے کہ صلوات کی دعائے رحمت رد نہیں ہو سکتی۔

۱۶۔ دعا کے بعد بھی صلوات پڑھے۔

۱۷۔ خدا کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے حق کا واسطہ دے۔

۱۸۔ وقتِ دعا گریہ کرے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ کسی ضرورت میں دعا کرنا ہو تو پہلے اوصافِ خدا بیان کرو۔ پھر صلوات پڑھو اور پھر گریہ کرو چاہے ایک ہی آنسو ہو۔ امام باقرؑ فرماتے

ہیں کہ بندے کے تقرب کا بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں گریہ وزاری کرتا ہے۔ تاریکی شب میں قطرۂ اشک سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں ہے۔ رب العالمین نے جناب عیسیٰؑ سے فرمایا کہ اپنی آنکھوں سے مجھے آنسو دو اور اپنے قلب سے خشوع دو۔

امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن تین آنکھوں کے علاوہ سب آنکھیں روتی ہوں گی۔ (۱) وہ آنکھ جو نامحرم سے محفوظ رہی ہے۔ (۲) وہ آنکھ جو اطاعتِ خدا میں بیدار رہی ہے۔ اور (۳) وہ آنکھ جس نے تاریکی شب میں خوف خدا سے گریہ کیا ہے۔

اسحاق بن عمار نے امام صادقؑ سے عرض کی کہ دعا کے لیے رونا چاہتا ہوں تو آنسو نہیں نکلتے اور عزیزوں کو یاد کرتا ہوں تو آنسو نکل آتے ہیں۔ اب کیا کروں؟ فرمایا پہلے عزیزوں کو یاد کرو اور جب دل بھر آئے تو دعا کرو کہ ایسے وقت میں دعا قبول ہوگی۔

واضح رہے کہ محرماتِ شریعت سے پرہیز کیے بغیر گریہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جیسا کہ آغازِ بیان میں عرض کیا گیا ہے کہ ظالمین کی سلامتی کی دعا کے ساتھ گریہ ریاکاری ہے تضرع وزاری نہیں ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ صرف رو لینے اور آنسو بہا لینے کا نام خوفِ خدا نہیں ہے۔ جب تک محرماتِ اسلام اور معصیتِ خداوندی سے پرہیز نہ کیا جائے۔ یہ جھوٹا خوف ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جوادی)

۱۹۔ دعاؤں سے پہلے گناہوں کا اقرار کرے۔ کہ اس طرح خوف پیدا ہوگا، دل نرم ہوگا، آنکھ نم ہوگی اور دعا قبول ہوگی۔

۲۰۔ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ رہے۔

۲۱۔ بلا نازل ہونے سے پہلے دعا کرے۔ مرسل اعظمؐ فرماتے ہیں کہ تم راحت میں خدا کو پہچانو وہ مصیبت میں تمھارے کام آئے گا۔

۲۲۔ برادران ایمانی سے التماس دعا کرے۔ کہ رب کریم مومن کی دعا مومن کے حق میں قبول کرتا ہے۔

۲۳۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ مرسل اعظمؐ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہاتھ اٹھا کر دعا کرو جس طرح مسکین کریم سے کھانا مانگتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں پناہ مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ تو ہتھیلی قبلہ کی طرف رہے اور رزق کے لیے دعا کرو تو ہتھیلی آسمان کی طرف رہے۔ اور دشمن کے مقابلہ میں دعا کرو تو دونوں ہاتھ سر سے زیادہ اونچے رہیں۔

۲۴۔ برادران مومنین کے حق میں دعا کرے۔

۲۵۔ دعا قبول ہو یا نہ ہو برابر دعا کرتا رہے۔ شاید کہ تاخیر میں مصلحت پروردگار ہو، اور دعا محبوب پروردگار ہے لہذا محبوب عمل کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔

۲۶۔ دعا کے بعد دونوں ہاتھوں کو چہرہ پر ملے۔ بلکہ سر اور سینہ پر بھی ہاتھ پھیرے۔

۲۷۔ دعا کے خاتمہ پر ماشاءاللہ لاقوۃ الاباللہ کہے۔

۲۸۔ دعا کے بعد اپنے کردار کو پہلے سے بہتر بنائے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد کے اعمال دعا کو قبولیت سے روک دیں۔

۲۹۔ دعا کے ساتھ تمام محرمات اور معاصی کو ترک کر دے کہ بدنیتی، خبثِ باطن، نفاق، نماز کا تاخیر کر دینا اور والدین کی نافرمانی دعا کو قبولیت سے روک دیتی ہے۔

۳۰۔ بندوں کے جملہ حقوق ادا کر کے دُعا کرے ورنہ جس کے ذمہ کسی کا حق ہوگا اس کی دُعا قبول نہ ہوگی۔

۳۱۔ وقتِ دعا ہاتھ میں عقیق یا فیروزہ کی انگوٹھی ہو۔

۳۲۔ دعا کی عبارت بھی غلط نہ ہو کہ اس کا بھی اثر ہو سکتا ہے۔

اسبابِ استجابتِ دُعا

دعا کے ان آداب کے ساتھ ان اسباب کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے جن کے ذریعہ دُعا قبولیت سے قریب تر ہو جاتی ہے اور اس کا تعلق کبھی زمان سے ہوتا ہے اور کبھی مکان سے، اور کبھی افعال واحوال سے۔ مثال کے طور پر زمان کے اعتبار سے بہترین وقتِ دعا، شبِ جمعہ، روزِ جمعہ، آخر روز جمعہ، آخر شب، ماہِ رمضان، شب ہائے قدر، شبِ عرفہ، روز عرفہ، شبِ بعثت، روزِ بعثت، شب عید فطر واضحیٰ، شب عید غدیر، روز ہائے عید، شب اول رجب، شبِ نیمہ شعبان،

شب نیمہ رجب، روز نیمہ رجب، روز ولادت پیغمبرؐ، وقت زوال، وقت باران رحمت، وقت طلوع فجر تا طلوع آفتاب، وقت اذان۔

(کاش متبرک اوقات میں رسمی خوشیوں اور گناہوں کے بجائے دعاؤں کی پابندی کی جاتی اور اس کے برکات سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ مگر ہمارا معاشرہ ابھی ان حقیقتوں سے دور ہے۔ قدیم استعماری ماحول سے نجات ملے گی تو یہ سارے حقائق سامنے آجائیں گے۔ جوادی)

مکان کے اعتبار سے۔ مسجد، خانۂ کعبہ، میدان عرفات، میدان مزدلفہ، روضۂ رسولؐ، حائر امام حسینؑ، مشاہد مقدسہ دعا کے لیے بہترین مقامات ہیں۔ افعال و احوال کے اعتبار سے نماز کے بعد کی دعا۔ مریض کی دعا عیادت کرنے والے کے حق میں، سائل کی دعا معطی کے حق میں، روزہ دار، بیمار، حاجی، عمرہ کرنے والے، مظلوم، مومن محتاج، وقت افطار، ماں باپ کی دعائے خیر اور دعائے بد دونوں قبولیت سے زیادہ قریب رہتی ہیں۔

بعض دُعائیں قبول نہیں

جو شخص گھر میں بیٹھ کر بغیر محنت و مشقت وسعت رزق کی دعا کرے۔
جو شخص بیوی کے حق میں بد دعا کرے حالانکہ طلاق کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔
جو شخص قرض دار کے انکار پر بد دعا کرے حالانکہ گواہ فراہم کرنے کا حق اس کے ہاتھ میں تھا۔
جو شخص ایک مرتبہ رزق خدا کو برباد کر کے دوبارہ رزق کی دعا کرے۔
جو شخص مکان بدل سکتا ہو اور ہمسایہ کے حق میں بد دعا کرے۔
جو شخص گناہوں پر مصر ہو، بندوں پر ظلم کرتا ہو، مال حرام کھاتا ہو اور پھر دعا کرے کہ ایسی دُعا کرنے والے ملعون ہوتے ہیں ان کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔ (مفتاح الجنات علامہ محسن الامین عاملیؒ)

مذکورہ بالا شرائط، آداب اور اسباب کو دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ معصومینؑ کی دعا رد کیوں نہیں ہوتی اور ان کا ہر دعا کس طرح پورا ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مصلحت الٰہی کے عارف اور رموز مشیت کے دانا ہیں وہ اس قوی ترین اسلحہ کو جا و بیجا استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے محل استعمال سے مکمل طور

پر واقف ہیں اور مشیت الٰہی کو دیکھے بغیر استعمال نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ادنیٰ تکلیف پہونچ جاتی ہے تو ہم تباہی اور بربادی کی دُعا شروع کر دیتے ہیں اور وہ زغۂ اعداء میں گھرنے کے بعد بھی قوم کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔ ہم اپنی برتری کے اظہار کے لیے دعا کا استعمال کرنا چاہتے ہیں اور وہ دین خدا کی صداقت و حقانیت کے لیے مباہلہ کا ارادہ کرتے ہیں۔

دعا کی اہم ترین ضرورت اور دعا کرنے والے کی عظیم ترین معرفت کو دیکھنا ہو تو کربلا کے میدان میں دیکھئے جہاں ہر مصیبت، ہر آفت، ہر بلا مصیبت زدہ انسان کو بد دعا کی دعوت دے رہی ہے۔ ہر قربانی ماں کو اپنے لال کی سلامتی کی دعا پر مجبور کر رہی ہے۔ ہر اُجڑتی ہوئی مانگ، مٹتی ہوئی جوانی، برباد ہوتا سہاگ بد دعا پر آمادہ کر رہا ہے۔ لیکن نہ کوئی ماں اذن امام کے بغیر بچہ کی سلامتی کی دعا کرتی ہے۔ نہ کوئی خاتون اپنے گود کے خالی کرنے والے، اپنے سہاگ کو اُجاڑنے والے اور اپنے باغ تمنا کو برباد کرنے والے کے حق میں بد دعا کر رہی ہے۔ بلکہ ہر ایک کی زبان پر صبر، استقامت، قبولیت قربانی اور فوز عظیم کی دعا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا اس قافلہ کا قافلہ سالار وہ دانائے رموز مشیت، ناز پروردہ رسول الثقلینؐ ہے جس نے جوان بیٹے کا لاشہ اٹھایا، ۳۴ سال کے بھائی کو رویا، بھانجوں اور بھتیجوں کا داغ دیکھا، احباب و انصار کے لاشے اٹھائے، چھ مہینے کے بچے کی قربانی دی کمسن بچی کو روتا چھوڑ کر میدان میں گیا، ماں کے گریہ کی آواز سُنی، باپ کو میدان میں جام کوثر بکف دیکھا، نانا کو برہنہ سر تباہ حال دیکھا، کونین میں تہلکہ اور تلاطم کا مشاہدہ کیا اور ان سب مصائب کے ہجوم میں پیشانی خاک پر رکھی تو یہی کہا کہ خدایا! میں نے اپنے وعدے کو پورا کر دیا اب تو بھی نانا کی امت کی بخشش کا خیال رکھنا۔ ایسے ہی وقت میں شاعر نے حالات کی ترجمانی کی ہے کہ جب فرزندِ رسولؐ زغۂ اعداء میں گھر گیا، زہراؑ کا چاند شام کی فوجوں کے بادل میں چھپ گیا، آسمان کی نگاہیں حسینؑ کو تلاش کرنے لگیں:

عرش پرسید قرارِ دلِ کونین کجا است
آسماں گفت کہ مشغولِ دعا است حسینؑ

دعائے سحر ابو حمزہ الثمالی

باسمہ سبحانہ

دُعائے سحر جناب ابو حمزہ ثمالی

جناب ابو حمزہ ثمالی کا اسم گرامی ثابت بن دینار تھا۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور وہاں کے زاہدوں میں شمار ہوتے تھے۔

قبیلہ ثُمالہ کی طرف منسوب ہیں جو بنی ازد کی ایک شاخ ہے۔ اس قبیلہ کو ثمالہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ثمالہ کے معنی بقایا کے ہیں اور اس قبیلہ نے ایک جنگ میں شرکت کی۔ جس میں سارا قبیلہ کام آگیا صرف چند افراد باقی رہ گئے جنھیں ثُمالہ کہا جاتا تھا۔

فضل بن شاذان کی روایت ہے کہ امام رضاؑ نے انھیں اپنے دور کا سلمان فارسی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ انھوں نے چار اماموں کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور موسیٰ کاظمؑ۔

امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر سے فرمایا کہ ابو حمزہ سے ملاقات کرنا تو میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ تم فلاں مہینہ میں فلاں دن انتقال کر جاؤ گے۔ ابو بصیر نے عرض کی کہ وہ آپ کے واقعی شیعوں میں ہیں؟ فرمایا بیشک میرے پاس جو کچھ بھی ہے تم لوگوں کے لیے خیر ہے۔ ابو بصیر نے عرض کی مولا! کیا آپ کے شیعہ آپ کے ساتھ رہیں گے؟ فرمایا، بے شک اگر ان کے دل میں خوفِ خدا و رسول ہے اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں تو یقیناً وہ ہمارے ساتھ، ہمارے درجہ میں ہوں گے۔ (جوادی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائے سحر ابو حمزہ الثمالی

خدایا! اپنے عتاب کے ذریعہ ہماری تنبیہ نہ کرنا اور ہمیں اتنی چھوٹ نہ دے دینا کہ ہم دھوکہ میں پڑ جائیں۔ ہمارے پاس خیر کہاں سے آئے گا اس کا مرکز تو تیری ہی ذات ہے اور ہم نجات کیسے پائیں گے اس کا اختیار تو تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔

خدایا! نیک کردار بندے بھی تیری نصرت و امداد سے بے نیاز نہیں ہیں اور بدعمل انسان بھی تیرے اختیار سے باہر نہیں ہیں۔ پروردگار! پروردگار! ہمارے پروردگار! ہم نے تجھے تیرے ہی ذریعے سے پہچانا ہے اور تو نے ہی ہماری رہبری کی ہے ورنہ تو نہ ہوتا تو ہم کیا جانتے کہ تو کون ہے۔ تعریف ہے بس اس خدا کی جس کو پکارتا ہوں تو سن لیتا ہے۔ اگرچہ میں اُس کے بُلانے پر دیر کرتا ہوں اور تعریف ہے اس خدا کی جس سے عرضِ حاجت کرتا ہوں اور بلا سفارش راز دل کہتا ہوں۔ تو حاجت روائی کر دیتا ہے۔ اگرچہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

میں اُس کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتا کہ سب رد کر دیتے ہیں اور اُس کے سوا کسی سے آس نہیں لگاتا کہ سب مایوس کر دینے والے ہیں۔

شکر ہے کہ اُس نے اپنے حوالے رکھ کر عزت دی ہے ورنہ لوگوں کے حوالے کر دیتا تو لوگ ذلیل کر دیتے۔ وہ بے نیاز ہو کر بھی ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم کو یوں برداشت کرتا ہے جیسے ہم نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔ وہ سب سے زیادہ قابل تعریف اور لائق شکر ہے۔

پروردگار! تیری طرف آنے والوں کے راستے ہموار ہیں اور تیری عطا کے چشمے لبریز ہیں۔ تیرے امیدواروں کی استعانت عام ہے اور تیرے فریادیوں کے لیے دروازے کھلے

ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو امیدواروں کا حاجت روا اور فریادیوں کا فریاد رس ہے۔ تیرے جود و کرم کی التماس اور تیرے فیصلوں پر راضی رہنا ہی تمام بخیلوں کے انکار کا بدل ہے اور تمام صاحبانِ حیثیت کے اختیارات سے آزادی ہے۔

پروردگار! تیری طرف آنے والوں کی مسافت بہت کم ہے اور تو اپنے بندوں سے پوشیدہ نہیں ہے جب تک اعمال درمیان میں پردہ نہ ڈال دیں۔

میں اپنے مقاصد اور اپنی حاجتیں لے کر تیری طرف آرہا ہوں تجھی سے فریاد ہے اور تیری ہی دعا کا وسیلہ ہے۔ میں نہ قبولیت کا حق رکھتا ہوں اور نہ معافی کا حق دار ہوں۔

صرف تیرے کرم اور تیرے صادق الوعد ہونے کا سہارا ہے۔ تیری توحید پر ایمان اور تیری معرفت کا یقین مطمئن بنائے ہوئے ہے کہ تیرے سوا کوئی پالنے والا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو تنہا اور لاشریک ہے۔

پروردگار! تیرا ہی فرمان ہے اور تو ہی صادق الوعد ہے اور تیرا ہی یہ قولِ برحق ہے کہ "فضلِ خدا کا سوال کرو، وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے"۔ اور معبود یہ تیری صفت نہیں کہ سوال کا حکم دے اور پھر عطا نہ کرے جب کہ تو تمام اہلِ مملکت کو بار بار بلا طلب عطا کرنے والا ہے۔

تو نے بچپنے میں ہمیں اپنی نعمتوں میں پالا ہے اور بڑے ہونے پر نام آور بنایا ہے۔

اے دنیا میں احسان و فضل و نعمت سے پالنے والے اور آخرت میں عفو و کرم کا اشارہ دینے والے! میری یہ معرفت ہی میری رہنما ہے اور میری محبت ہی میری شفیع ہے۔ مجھے اپنے رہنما کی رہنمائی پر اعتماد اور اپنے شفیع کی شفاعت پر بھروسہ ہے۔

پروردگار! تجھے اس زبان سے پکار رہا ہوں جسے گناہوں نے گونگا بنا دیا ہے اور تجھ سے اس دل سے مناجات کر رہا ہوں جسے جرائم نے برباد کر دیا ہے۔

پروردگار! میری اس دعا میں خوف بھی ہے اور رغبت بھی۔ گناہوں کو دیکھتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں اور کرم کو دیکھتا ہوں تو پُرامید ہو جاتا ہوں۔

معبود۔ تو معاف کر دے گا تو بہترین رحم کرنے والا ہے اور عذاب کرے گا تو ظالم نہیں ہے بلکہ انصاف کرنے والا ہے۔

میں اپنے بُرے اعمال کے باوجود تیرے جود و کرم کے واسطے سے مانگنے کی جرأت کر رہا ہوں اور میری بے حیائی کے باوجود میرا سہارا تیری رحمت اور تیری مہربانی ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں ان حالات میں بھی ناامید نہ ہوں گا تو اب میری امیدوں کو پورا کر، اور میری دعاؤں کو سُن لے۔ اے بہترین دعاؤں کے مرکز اور عظیم ترین امیدوں کے مصدر۔

پروردگار! میری امیدیں عظیم ہیں اور میرے اعمال بدترین ہیں۔ مجھے اپنے عفو و کرم سے بقدر امید دے دے اور میرے بدترین اعمال کا محاسبہ نہ فرما کہ تیرا کرم گناہ گاروں کی مجازات سے بالاتر ہے اور تیرا حلم کوتاہ عملوں کی مکافات سے بلند تر ہے۔

پروردگار! میں تیرے فضل و کرم کی پناہ لینے کے لیے تیری طرف بھاگ کر آیا ہوں۔ اب تو اس حُسنِ ظن کی لاج رکھ لے اور اپنے وعدۂ مغفرت کو پورا کر دے۔

میں کیا اور میری اوقات کیا؟ تو ہی اپنے فضل و کرم و مغفرت سے بخش دے۔

پروردگار! اپنی پردہ پوشی سے مجھے عزت دے اور اپنے کرم سے میری تنبیہ کو نظر انداز فرما دے کہ تیرے علاوہ کسی اور کو ان گناہوں کا علم ہوتا تو میں کبھی گناہ نہ کرتا اور تیرے عذاب میں بھی عجلت کا خیال ہوتا تو میں گناہوں سے پرہیز کرتا۔ نہ اس لیے کہ تیری ہستی معمولی اور تیری ذات ناقابلِ توجہ ہے (معاذ اللہ) بلکہ اس لیے کہ تو بہترین پردہ پوش، کریم، مہربان، عیوب کا چھپانے والا، گناہوں کا بخشنے والا اور غیب کا جاننے والا ہے۔ تو اپنے کرم سے گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اپنے حلم سے عذاب کو ٹال دیتا ہے۔

پروردگار! علم کے بعد بھی اس حلم پر تیرا شکر ہے اور قدرت کے بعد بھی اس مہربانی پر تیرا احسان ہے۔ مجھے یہی حلم گناہوں کی ہمت دلاتا ہے اور یہی پردہ پوشی بے حیائی کی دعوت دیتی ہے۔ یہی عظیم رحمت اور وسیع مغفرت کا خیال معصیت کی طرف تیز رفتاری سے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

اے حلیم و کریم! اے حی و قیوم! اے گناہوں کے بخشنے والے! اے توبہ کے قبول کرنے والے! اے عظیم احسان کرنے والے اور ہمیشہ سے کرم عام کرنے والے! اب وہ تیری پردہ پوشی کہاں ہے، اب وہ تیری عظیم معافی کہاں ہے، وہ کشائشِ احوال کہاں ہے،

وہ فریاد رسی کہاں چلی گئی، وہ وسیع رحمت، وہ عظیم عطیے، وہ بلند ترین برتاؤ، وہ فضل عظیم، اور احسان قدیم سب کہاں ہیں۔

اے کریم! اپنے کرم سے بچالے، اپنی رحمت کے ذریعے نجات دیدے۔

اے محسن و منعم! میرا اعتماد نجات کے بارے میں اپنے اعمال پر نہیں ہے بلکہ تیرے فضل و کرم پر ہے۔ تو اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ہے، بلا مانگے نعمتیں عطا کرتا ہے اور گناہ بھی بخش دیتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کس چیز کا شکریہ ادا کروں۔ نیکیوں کے مشہور کر دینے کا یا برائیوں پر پردہ ڈال دینے کا؟ بہترین عطیوں کا یا مصیبتوں سے نجات دلانے کا؟ اے محبت کرنے والوں کے دوست اور پناہ گزینوں کی خنکی چشم۔ تو ہمارا محسن ہے اور ہم تیرے گناہ گار۔ اب ہماری برائیوں کو اپنے رحم و کرم کے ذریعہ درگزر فرما۔

ہماری کون سی جہالت ہے جو تیرے کرم سے زیادہ وسیع ہو جائے اور کون سا زمانہ ہے جو تیری مہلت سے زیادہ طویل ہو جائے۔ تیری نعمتوں کے مقابلے میں ہمارے اعمال کی کیا قیمت ہے اور تیرے کرم کے سامنے ہم اپنے اعمال کو کیا شمار کریں۔ گناہ گاروں کے لیے تیری وسیع تر رحمت تنگ نہیں ہو سکتی۔ اے وسیع مغفرت کرنے والے اور دونوں ہاتھوں سے عطا کرنے والے میرے مالک تو اپنے دروازے سے دھتکار بھی دے گا تو میں کہیں جاؤں گا نہیں اور تجھ سے امید لگائے رکھوں گا اس لیے کہ مجھے تیرے جود و کرم کا عرفان ہے اور یہ معلوم ہے تو صاحب اختیار ہے۔ جس پر چاہے عذاب کر سکتا ہے اور جس پر جس طرح چاہے رحم کر سکتا ہے۔ نہ کوئی تیرے ملک میں مدِ مقابل ہے اور نہ تیرے امر میں شریک۔ نہ تیرے حکم کا مخالف ہے اور نہ تیری تدبیر میں رکاوٹ پیدا کرنے والا، خلق و امر سب تیرے ہاتھ میں ہے اور تو صاحب برکت اور عالمین کا پروردگار ہے۔

پروردگار! میری منزل تیری پناہ کے طلب گار، کرم کے امیدوار، احسان کے آشنا، اور نعمت کے شناسا کی سی ہے۔ تو وہ سخی ہے جس کے یہاں معافی کی کمی نہیں اور فضل کا نقص نہیں اور رحمت کی قلت نہیں۔ ہم تیرے عفو و درگزر، فضل و رحمت کا یقین رکھتے ہیں اور تو

یقیناً ہمارے یقین کو جھوٹا نہیں کرے گا اور ہماری امید کو ناامید نہیں کرے گا۔ کریم تیرے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہے۔ ہم تجھ سے بہت کچھ امید رکھتے ہیں اور بہت کچھ امید لگائے بیٹھے ہیں۔

ہم نے گناہ کیا ہے اور ہمیں پردہ پوشی کی امید ہے۔ تجھے پکارا ہے اور تیرے سُن لینے کا یقین ہے۔ ہماری امید کو پورا فرما کہ ہمیں اپنے اعمال کا تقاضا بھی معلوم ہے۔ لیکن یقین بھی ہے کہ رحمت کے حقدار ہوں یا نہ ہوں تو ضرور رحم کرے گا۔ تو اپنے فضل و کرم سے ہم جیسے تمام گنہ گاروں پر مہربانی کرتا ہے۔ ہمارے اوپر بھی اپنی شان کے مطابق رحم فرما کہ ہم تیری عطا کے محتاج ہیں۔

اے خدائے غفار! ہم نے تیرے نور سے ہدایت پائی ہے اور تیرے فضل کی بدولت مستغنی ہو گئے ہیں۔ تیری نعمتوں میں صبح و شام گذار رہے ہیں اور ہمارے گناہ تیری نظر کے سامنے ہیں۔ اُن کے بارے میں توبہ و استغفار کر رہے ہیں۔ تو نعمتیں دے کر ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم گناہ کر کے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تیرا خیر برابر ہماری طرف آ رہا ہے اور ہمارا شر برابر تیری طرف جا رہا ہے۔

فرشتہ برابر تیری بارگاہ میں ہماری بداعمالیوں کا دفتر لے کر حاضر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تیری نعمتوں میں کمی نہیں آتی اور تو برابر فضل و کرم کر رہا ہے۔

تجھ جیسا حلیم، عظیم اور کریم کون ہے۔ تیرے سب نام پاکیزہ، تیری ثنا جلیل، تیری نعمتیں بزرگ اور تیرے افعال کریمانہ ہیں۔ تیرا فضل و کرم وسیع اور تیرا حلم و تحمل اس بات سے عظیم تر ہے کہ تو ہمارے افعال کا مقابلہ کرے۔ پروردگار! میرے مالک! میرے پروردگار! ہمیں معاف کر دے، ہمیں بخش دے اور ہماری مغفرت فرما۔

ہمیں اپنے ذکر میں مشغول رکھ، اپنے عذاب سے محفوظ رکھ، اپنی ناراضگی سے پناہ دے۔ اپنے عطایا سے سرفراز فرما، اپنے فضل و کرم کو ہمارے شامل حال کر، ہمیں حج بیت اللہ اور زیارت قبر پیغمبرؐ نصیب فرما کہ تو قریب بھی ہے اور مجیب بھی ہے۔

پروردگار! ہمیں اطاعت پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ ہمیں اپنی شریعت اور اپنے

رسولؐ کی سیرت پر اس دنیا سے اٹھانا۔

ہمیں اور ہمارے والدین کو بخش دے اور اُن پر اس طرح رحمت نازل فرما جس طرح انھوں نے بچپنے میں ہمیں پالا ہے۔ اُن کے احسان کے بدلے میں احسان اور گناہوں کے بدلے میں مغفرت عطا فرما۔ زندہ و مُردہ، حاضر و غائب، مرد و عورت، صغیر و کبیر، غلام و آزاد سب کی مغفرت فرما۔ کسی کو تیرے برابر قرار دینے والے جھوٹے، گمراہ اور خسارہ میں ہیں۔

پروردگار محمدؐ وآل محمدؐ پر رحمت نازل فرما۔ ہمارا خاتمہ خیر پر کر۔ دنیا و آخرت کے مشکلات میں ہماری مدد فرما۔ کسی بے رحم کو ہمارے اوپر مسلط نہ فرما دینا، ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھنا، اور اپنی نعمتوں کو ہم سے سلب نہ کرلینا، ہمیں رزق واسع و حلال و طیب عطا فرما، اپنی حراست و حفاظت میں رکھ۔ حج بیت اللہ اور زیارت قبر رسولؐ و ائمہ طاہرینؑ کی توفیق عطا فرما اور ہمیں ان مشاہد مقدسہ اور مقامات شریفہ سے دور نہ رکھنا۔

پروردگار! ایسی توفیق توبہ دے کہ پھر گناہ نہ کروں اور ایسے خیر و عمل خیر کا حوصلہ دے کہ شب و روز تجھ سے ڈرتا رہوں اور تمام زندگی نیکیوں پر عمل پیرا رہوں۔

پروردگار! جب بھی یہ کہتا ہوں کہ اب میں آمادہ ہوگیا اور تیار ہو کر نماز کے لیے کھڑا ہوگیا اور تجھ سے مناجات شروع کر دی تو مجھے نماز میں نیند آنے لگتی ہے اور مناجات میں بے کیفی محسوس ہونے لگتی ہے اور جب بھی یہ سوچتا ہوں کہ اب میرا باطن درست ہوگیا ہے اور میری منزل تو ابین سے قریب تر ہوگئی ہے تو کوئی نہ کوئی مصیبت آڑے آجاتی ہے اور میرے قدموں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے اور تیری خدمت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے مجھے اپنے دروازے سے ہٹا دیا ہے اور اپنی خدمت سے دور کر دیا ہے یا اپنے حق کا خیال نہ کرنے والا دیکھ کر دربار سے الگ کر دیا ہے یا اپنی جانب سے کنارہ کش پاکر مجھے چھوڑ دیا ہے یا جھوٹوں کی صف میں دیکھ کر نظرانداز کر دیا ہے یا نعمتوں کا شکر گذار نہ پاکر محروم کر دیا ہے۔ یا مجلس علماء سے الگ دیکھ کر ترک کر دیا ہے یا غافلوں میں دیکھ کر رحمتوں سے مایوس کر دیا ہے یا اہل باطل کا ہم نشیں پاکر اُنھیں کے حوالے کر دیا ہے یا میری آواز کو ناگوار قرار دے کر اپنی بارگاہ سے دور کر دیا ہے یا میرے جرائم و معاصی کا بدلہ دے دیا ہے یا

میری بے حیائی کی سزا دی ہے۔

بہرحال اب بھی تو معاف کر دے تو حیرت کی بات نہیں ہے کہ مجھ سے پہلے بھی کتنے گنہگاروں کو معاف کر چکا ہے۔ تیرا کرم مقصرین کے انتقام سے بالاتر ہے اور میں تیرے فضل کی پناہ چاہتا ہوں اور تیرے غضب سے تیری رحمت کی طرف بھاگ کر آیا ہوں۔ تیرے وعدۂ معافی کی وفا کا امیدوار ہوں کہ تیرا فضل وسیع اور تیرا حلم عظیم ہے۔ تو اعمال کا بدلہ لینے سے بالاتر ہے۔ پروردگار! میں کیا اور میری بساط کیا؟ اپنے فضل و کرم سے عطا کر اور اپنے عفو کو شامل حال کر اور میری پردہ پوشی سے عزت عطا کر اور اپنی مہربانیوں کی بنا پر سرزنش سے درگذر فرما۔

پروردگار! میں وہی بچہ ہوں جسے تو نے پالا ہے۔ میں وہی جاہل ہوں جسے تو نے علم دیا ہے۔ میں وہی گمراہ ہوں جسے تو نے ہدایت دی ہے۔ میں وہی پست ہوں جسے تو نے بلند کیا ہے۔ میں وہی پیاسا ہوں جسے تو نے سیراب کیا ہے۔ میں وہی برہنہ ہوں جسے تو نے لباس پہنایا ہے۔ میں وہی فقیر ہوں جسے تو نے غنی بنایا ہے۔ میں وہی ضعیف ہوں جسے تو نے قوت دی ہے۔ میں وہی ذلیل ہوں جسے تو نے عزت دی ہے۔ میں وہی مریض ہوں جسے تو نے شفا دی ہے۔ میں وہی سائل ہوں جسے تو نے عطا کیا ہے۔ میں وہی گنہگار ہوں جس کی تو نے پردہ پوشی کی ہے۔ میں وہی خطاکار ہوں جسے تو نے سنبھالا ہے۔ میں وہی نادار ہوں جسے تو نے بکثرت عطا کیا ہے۔ میں وہی کمزور ہوں جس کی تو نے مدد کی ہے اور میں وہی نکالا ہوا ہوں جسے تو نے پناہ دی ہے۔ میں وہی ہوں جس نے تنہائی میں تجھ سے حیا نہیں کی اور مجمع میں تیرا خیال نہیں کیا۔ میرے مصائب عظیم ہیں۔ میں نے اپنے مولا کی شان میں گستاخی کی ہے۔ میں نے آسمان و زمین کے خدائے جبّار کی مخالفت کی ہے۔ میں نے گناہ کے لیے رشوت دی ہے۔ میں نے گناہ کے نام پر تیزی سے سبقت کی ہے۔

میں وہی ہوں جسے تو نے مہلت دی ہے تو میں سنبھلا نہیں۔ پردہ پوشی کی ہے تو میں نے حیا نہیں کی۔ گناہ کیے ہیں تو بڑھتا ہی چلا گیا، اور تو نے نظروں سے گرا دیا تو کوئی پرواہ نہیں کی۔ پھر بھی تو نے اپنے حلم سے مہلت دی اور اپنے پردہ سے عیب پوشی کی جیسے کہ تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ میں کیا ہوں اور مجھے گناہوں کے عذاب سے اس طرح بچایا ہے جیسے کہ تجھے خود شرم آگئی ہے۔

پروردگار! میں نے جب بھی گناہ کیا ہے۔ تو میں تیری خدائی کا منکر یا تیرے حکم کا معمولی سمجھنے والا یا تیرے عذاب کے لیے آمادہ یا تیرے وعدۂ عتاب کی توہین کرنے والا نہیں تھا۔ بلکہ صورت حال صرف یہ تھی کہ گناہ سامنے آیا اور نفس نے اسے آراستہ کر دیا۔ خواہشات نے غلبہ پالیا اور بدبختی نے ساتھ دے دیا۔ تیری عیب پوشی نے سہارا دے دیا اور میں گناہ کر بیٹھا۔

اب تو ہی بتا کہ میں گناہ کر بیٹھا تو تیرے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟ اور کل کون چھٹکارا دلا سکتا ہے اور اگر تو نے ناامید کر دیا تو کس سے امید وابستہ کروں گا؟۔

میرے سارے اعمال تیرے نامۂ اعمال میں محفوظ ہیں اور اگر تیرے کرم و وسعتِ رحمت کی امید نہ ہوتی تو میں انھیں یاد کر کے مایوس ہو چکا ہوتا لیکن تو سُننے والا اور امیدوں کا بَرلانے والا ہے۔

پروردگار! دین اسلام کے حقوق، قرآن کی حُرمت اور رسول عربیؐ، قریشی، ہاشمی، مکی، مدنی کی محبت کے واسطے سے تجھ سے قربت چاہتا ہوں۔ میرے اس انس کو وحشت سے تبدیل نہ فرما دینا اور میرا اجر ان لوگوں جیسا قرار نہ دینا جو کسی اور کی پرستش کرتے ہیں اس لیے کہ ایک قوم نے صرف جان بچانے کے لیے اسلام اختیار کیا تھا تو تو نے ان کا مدعا پورا کر دیا اور ہم تو دل و جان سے ایمان لائے ہیں تاکہ تو ہمیں معاف کر دے تو اب ہماری امیدوں کو بھی پورا فرما اور ہمارے دلوں میں بھی اپنی آس کو ثابت کر دے اور ہدایت کے بعد ہمارے قلوب کو گمراہی سے محفوظ رکھنا۔ ہمیں رحمت عطا فرما کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے۔ پروردگار! تیری عزت کی قسم اگر تو جھڑک بھی دے گا تو ہم تیرے دروازے سے جائیں گے نہیں اور تجھ سے آس نہیں توڑیں گے۔ ہمارے دل کو تیرے کرم کا یقین ہے اور ہمیشہ تیری وسیع رحمت پر اعتماد ہے۔

میرے مالک! بندہ مالک کو چھوڑ کر کدھر جائے اور مخلوق خالق کے ماسوا کس کی پناہ لے۔ پروردگار! تو زنجیروں میں جکڑ بھی دے گا اور مجمع عام میں عطا سے انکار بھی کر دے گا اور لوگوں کو ہمارے عیوب سے آگاہ بھی کر دے گا اور ہمیں جہنم کا حکم بھی دے دے گا اور اپنے نیک بندوں سے الگ بھی کر دے گا تو بھی میں تجھ سے امید کو منقطع نہیں کروں گا اور تیری معافی سے آس نہ توڑوں گا اور تیری محبت کو دل سے نہ نکالوں گا اس لیے کہ میں تیری نعمتوں اور پردہ پوشی

کو فراموش نہیں کر سکتا۔

پروردگار! میرے دل سے محبت دنیا کو نکال دے اور مجھے اپنے منتخب بندے حضرت خاتم النبیینؐ کے ساتھ قرار دے۔ مجھے منزل توبہ تک پہونچا دے اور توفیق دے کہ میں اپنے نفس کے حالات پر گریہ کر سکوں۔ میں نے اپنی عمر کو خواہشات اور بے جا امیدوں میں برباد کر دیا ہے اور اب نیکیوں سے مایوس لوگوں کی منزل میں آ گیا ہوں کہ اگر اس عالم میں دنیا سے چلا گیا اور اُس قبر میں پہونچ گیا جسے اپنے آرام کے لیے ہموار نہیں کیا اور اُس میں عمل صالح کا فرش نہیں بچھایا تو مجھ سے بدتر حالت والا کون ہوگا۔

میں کیسے نہ روؤں جب کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ مجھے نفس برابر دھوکہ دے رہا ہے اور روزگار برابر مبتلائے فریب کیے ہوئے ہے۔ موت کے پر میرے بالائے سر جنبش کر رہے ہیں۔ میں کیسے نہ روؤں؟ میں جاں کنی کا تصور کر کے رو رہا ہوں۔ میں قبر کی تاریکی اور لحد کی تنگی کے لیے رو رہا ہوں۔ میں منکر و نکیر کے سوال کے لیے رو رہا ہوں۔ میں اپنی قبر سے برہنہ، ذلیل اور گناہوں کا بوجھ لادے کے نکلنے کے تصور سے رو رہا ہوں۔ جب داہنے بائیں دیکھوں گا اور کوئی پُرسانِ حال نہ ہوگا۔ سب اپنے اپنے حال میں پریشان ہوں گے۔ کچھ نیک بندے ہوں گے جن کے چہرے روشن اور ہشاش بشاش ہوں گے تو (انھیں میری کیا پرواہ) اور کچھ چہرے خود ہی ذلیل اور گرد آلود ہوں گے (تو وہ کیا کریں گے)۔

پروردگار! میرا اعتماد، میرا بھروسہ، میری امید، میرا سہارا صرف تیری ذات ہے تیری رحمت کی آس لگائے ہوں کہ تو جسے چاہتا ہے مرکز رحم بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنے کرم سے ہدایت دے دیتا ہے۔ تیرا شکر ہے کہ تو نے دل کو شرک سے پاک رکھا ہے اور زبان کو توبہ کے لیے آزاد رکھا ہے۔ ورنہ یہ گونگی زبان کیا شکر ادا کرے گی اور یہ حقیر اعمال کیا تجھے راضی کریں گے۔ تیرے شکر کے سامنے اس زبان کی کیا حیثیت ہے اور تیری نعمتوں کے مقابلے میں میرے اعمال کی کیا حقیقت ہے۔

پروردگار! تیرے کرم نے آس دلائی ہے اور تیرے شکر نے اعمال کو قبول کیا ہے۔ تیری ہی طرف رغبت ہے اور تجھی سے خوف، تجھی سے امید ہے اور تیری ہی طرف توجہ

کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ہمت تیری جناب میں ٹھہر گئی ہے اور تیری نعمتوں کی طرف راغب ہے۔ خالص امید اور خوف تیری ہی ذات سے وابستہ ہے۔ محبت تجھ ہی سے مانوس ہے اور ہاتھ تیری ہی طرف بڑھا ہے۔

خدایا! میرا دل تیری یاد سے زندہ ہے اور میرا دردِ خوف تیری مناجات سے ٹھہرا ہے۔ میرے مالک! میری امیدوں کے مرکز! میرے سوال کی انتہا! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان جُدائی پیدا کر دے۔ میں قدیم ترین امیدوں اور عظیم ترین آسرے کی بنا پر سوال کرتا ہوں کہ تو نے اپنے اوپر رحمت و رافت کو واجب کر لیا ہے۔ سارا امر تیری ذاتِ لاشریک سے وابستہ ہے اور ساری مخلوقات تیرے عیال و اختیار میں ہے۔ سب تیرے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور تو رب العالمین اور صاحب برکت ہے۔ پروردگار اُس وقت رحم کرنا جب حجت قطع ہو جائے۔ زبان جواب سے عاجز ہو جائے اور سوال سُن کر ہوش و حواس اڑ جائیں۔

اے عظیم ترین امید کے مرکز فاقہ کی شدت میں مایوس نہ کرنا، اور میری جہالت کی بنا پر مجھے واپس نہ کر دینا اور صبر کی قلت کی بنا پر منع نہ کر دینا۔ میری فقیری کی بنا پر مجھے عطا کرنا اور میری کمزوری پر رحم کرنا۔

خدایا تیرے ہی اوپر اعتماد، بھروسہ اور توکل ہے اور تجھ ہی سے امید وابستہ ہے، تیری رحمت سے وابستگی ہے اور تیری جناب میں ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ تیرے کرم کی بنا پر سوال کر رہا ہوں اور تیری سخاوت کے نام پر مانگنا شروع کر رہا ہوں۔ تیرے پاس فاقوں کا علاج اور غربت کا تدارک ہے۔ تیری معافی کے زیر سایہ قیام اور تیرے جود و کرم پر نگاہ ہے۔ تیرے نیک برتاؤ پر مستقل نظریں جمائے ہوئے ہوں ایسے حالات میں مجھے جہنم میں جلا نہ دینا، اور قعرِ جہنم میں ڈال نہ دینا کہ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ہمارے خیالات کو غلط نہ ہونے دینا۔

پروردگار! تجھ پر اعتماد ہے تو ہمارے فقر و فاقہ کو جانتا ہے۔ لہٰذا اپنے ثواب سے محروم نہ کرنا۔

پروردگار! اگر موت قریب آگئی اور اعمال نے تجھ سے قریب نہیں کیا ہے تو اب گناہوں کے اعتراف کو وسیلہ قرار دیتا ہوں کہ تو اگر معاف کر دے گا تو تجھ سے زیادہ منصفانہ فیصلہ کرنے والا کون ہے، اس دنیا میں میری غربت اور وقت موت میرے کرب قبر میں میری تنہائی اور لحد میں میری وحشت

اور وقت حساب میری ذلت پر رحم کرنا اور میرے ان تمام گناہوں کو معاف کر دینا جن کی لوگوں کو اطلاع بھی نہیں ہے اور پھر اس پردہ داری کو برقرار رکھنا۔

پروردگار! اُس وقت میرے حال پر رحم کرنا جب میں بستر مرگ پر ہوں اور احباب کروٹیں بدلوا رہے ہوں۔ اُس وقت رحم کرنا جب میں تختۂ غسل پر ہوں اور ہمسایہ کے نیک افراد غسل دے رہے ہوں۔ اُس وقت کرم کرنا جب تابوت میں اقربا کے کاندھوں پر سوار ہوں۔ اُس وقت مہربانی کرنا جب تنہا قبر میں وارد ہوں اور پھر اُس نئے گھر میں میری غربت پر رحم کرنا تاکہ تیرے علاوہ کسی سے مانوس نہ ہوں۔

میرے مالک! تو اگر مجھے میرے حوالے کر دے گا تو میں ہلاک ہو جاؤں گا اور تو سنبھالا نہ دے گا تو میں کس سے فریاد کروں گا۔ تیری عنایت شاملِ حال نہ ہوگی تو میں کس کے سامنے دردِ دل کا اظہار کروں گا اور تو مشکلات میں سکون نہ دے گا تو میں کس سے پناہ مانگوں گا۔

پروردگار! تو رحم نہ کرے گا تو میرا دوسرا کون ہے۔ اور تیرا فضل نہ ہوگا تو میں کس سے امید رکھوں گا۔ وقت نکل جانے پر گناہ سے بھاگ کر کس کی طرف جاؤں گا۔ پروردگار! میں تیرا امیدوارِ کرم ہوں۔ مجھ پر عذاب نہ کرنا۔ میری امیدوں کو پورا کرنا۔ میرے خوف کو تمام کر دینا کہ اتنے گناہوں میں تیری مغفرت کے علاوہ کسی کی امید نہیں ہے۔

پروردگار! میں تجھ سے وہ سوال کر رہا ہوں جس کا میں حق دار نہیں ہوں لیکن تو اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہے۔ مجھے معاف کر دے اور نگاہِ کرم سے وہ لباس عنایت کر جس سے سارے عیب چھُپ جائیں اور پھر کسی گناہ کا حساب نہ ہو۔ تو بہت ہی قدیم ترین محسن ہے۔ عظیم ترین معاف کر دینے والا ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔

پروردگار! تو انھیں بھی عطا کرتا ہے جو مانگتے نہیں ہیں۔ تیری خدائی کے منکر ہیں۔ میں تو سوال بھی کر رہا ہوں، یقین بھی رکھتا ہوں کہ خلق و امر سب تیرے ہاتھ میں ہے، تو صاحب برکت اور رب العالمین ہے۔

پروردگار! تیرا بندہ تیرے دروازہ پر کھڑا ہے۔ فقر و فاقہ یہاں تک کھینچ کر لایا ہے۔ دعاؤں سے درِ احسان کو کھٹکھٹایا ہے۔ اب تو اپنا رُخ پھیر نہ لینا اور میری بات سُن لینا۔ میں اِس یقین کے

ساتھ دعا کر رہا ہوں کہ تو رد نہیں کرے گا۔

پروردگار! کوئی سائل تجھے عاجز نہیں کر سکتا اور کوئی عطا تیرے خزانے میں کمی نہیں کر سکتی۔ تو اپنے قول کے مطابق ہے اور میرے قول سے بالاتر ہے۔

پروردگار! میں تجھ سے صبرِ جمیل، وسعت قریب، قول صادق اور اجرِ عظیم کا سوال کرتا ہوں۔ میں تجھ سے ہر چیز کا سوال کرتا ہوں چاہے مجھے معلوم ہو یا نہ ہو۔ میں تجھ سے وہ سب کچھ مانگ رہا ہوں جو بندگان صالحین نے مانگا ہے کہ تو بہترین مسئول اور سخی ترین عطا کرنے والا ہے۔

میری دعا کو میرے نفس، میرے اہل و عیال، میرے والدین، میری اولاد، متعلقین، برادران سب کے بارے میں قبول فرما۔ میری زندگی کو خوش گوار بنا۔ مردت کو واضح فرما کر میرے حالات کی اصلاح فرما۔ مجھے طولانی عمر، نیک عمل، کامل نعمت اور پسندیدہ بندوں کی مصاحبت عطا فرما جن کی زندگی پاکیزگی اور سرور و کرامت و نعمت میں گذری ہے۔ تیرے پاس ہر شے کا اختیار ہے اور تیرے علاوہ کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

مجھے اپنے ذکر خاص کے لیے مخصوص کر دے اور میرے کسی بھی عمل خیر کو ریاکاری، غرور اور تکبّر کا نتیجہ نہ قرار دے۔ مجھے خضوع و خشوع والوں میں شمار کر۔

پروردگار! مجھے رزق میں وسعت، وطن میں امن و امان، اہل و عیال، مال و اولاد میں خنکی چشم۔ نعمتوں میں قیام۔ جسم میں صحت، بدن میں قوت، دین میں سلامتی اور اطاعت خدا اور رسولؐ کا حوصلہ عطا فرما۔ جب تک بھی میں زندہ رہوں ماہ رمضان اور شب قدر میں نازل ہونے والے ہر خیر میں میرا حصۂ وافر قرار دے اور ہر نشر ہونے والی رحمت، ہر لباس عافیت، ہر دفع بلا۔ ہر حسنۂ مقبول اور ہر گناہِ معفو میں میرا حصہ قرار دے۔

مجھے حج بیت اللہ کے لیے اس سال اور ہر سال توفیق دے۔ اپنے فضل و کرم سے رزق واسع عطا فرما۔ بُرائیوں سے دور رکھ۔ تمام قرضوں اور حقوق کو ادا کر دے کہ کسی شے کی تکلیف نہ رہ جائے۔ دشمنوں اور حاسدوں کے گوش و چشم کو میری طرف سے موڑ دینا اور ان سب کے مقابلہ میں میری مدد فرمانا۔ مجھے خنکی چشم، فرحت قلب عطا فرما۔ ہر رنج و غم سے نکلنے کا راستہ عطا فرما۔ ہر مخالف کے مکر و شر کو زیر قدم قرار دیدے۔ ہر شیطان ہر سلطان، اور بداعمال کے شر سے محفوظ

رکھنا۔ گناہوں سے پاک کر دے۔ جہنم سے نجات دیدے۔ جنت میں جگہ عطا فرما دے۔ حور العین سے عقد کرا دے کہ یہ سب تیرے فضل و کرم و رحمت و رافت کے نتائج ہیں۔ مجھے اپنے صالح اولیا حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ سے ملا دے جن کے اوپر ہمیشہ تیری رحمت و رافت اور تیرا درود و سلام ہے۔

خدایا! پروردگار! تیری عزت و جلال کی قسم کہ اگر تو نے مجھ سے میرے گناہوں کا محاسبہ کیا تو میں تجھ سے تیری معافی کا مطالبہ کروں گا۔ اور اگر تو نے مجھ سے میری ذلّت کے بارے میں پوچھا تو میں تجھ سے تیرے کرم کے بارے میں سوال کروں گا اور اگر تو نے مجھے جہنم میں ڈال دیا تو میں سب کو بتا دوں گا کہ میں تیرا چاہنے والا تھا۔

پروردگار! اگر تو صرف اولیا کرام اور اہل اطاعت ہی کو بخشے گا تو گناہگار کدھر جائیں گے اور اگر صرف اہلِ وفا ہی پر نگاہ کرم کرے گا تو بدعمل کس سے فریاد کریں گے۔

پروردگار! تجھے معلوم ہے کہ اگر تو مجھے جہنم میں ڈال دے گا تو تیرے دشمن خوش ہوں گے اور جنّت عطا کر دے گا تو تیرا رسولؐ خوش ہوگا اور ظاہر ہے کہ تو اپنے رسولؐ کی خوشی کو دشمن کی خوشی پر مقدم رکھے گا۔

پروردگار! میرا سوال یہ ہے کہ میرے دل میں اپنی محبت اور اپنا خوف بھر دے۔ مجھے اپنی کتاب کی تصدیق، اپنے اوپر ایمان، اپنا خوف اور اشتیاق عنایت فرما کہ تو صاحب جلال و اکرام ہے۔ میری نگاہ میں اپنی ملاقات کو محبوب بنا دے اور اس ملاقات میں راحت و وسعت و کرامت قرار دے دے۔

پروردگار! مجھے ماضی کے صالحین سے ملا دے اور آئندہ کے صالحین میں قرار دیدے۔ مجھے صالحین کے راستے پر چلا اور نفس کے مقابلے میں دیگر صالحین کی طرح میری بھی مدد فرما۔ مجھے ثبات قدم عطا فرما، اور جن برائیوں سے نکال دیا ہے ان میں دوبارہ واپس نہ جانے دینا۔

خدایا! مجھے وہ ایمان چاہیے جو تیری ملاقات سے پہلے تمام نہ ہو۔ اسی پر زندہ رہوں اور اسی پر مر جاؤں اور پھر دوبارہ اسی ایمان پر اٹھوں۔ میرے دل کو ریاکاری اور شک و شبہ سے محفوظ رکھنا کہ میرا عمل خالص رہے۔

پروردگار! مجھے دین میں بصیرت، احکام میں فہم، علم میں تفقہ، رحمت کے دُوہرے حصے اور معصیت سے روکنے والا تقویٰ عطا فرما۔ میرے چہرے کو نورانی بنادے۔ میرے اندر ثواب کی رغبت پیدا کردے۔ مجھے اپنے راستے اور اپنے رسولؐ کے طریقے پر موت عطا فرما۔

پروردگار! میں کسل مندی، کمزوری، غم، بُزدلی، بخل، غفلت، سنگ دلی، فقروفاقہ اور جملہ بلاؤں اور ظاہری و باطنی تمام بداعمالیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

پروردگار! میں اُس نفس سے پناہ مانگتا ہوں جو قانع نہ ہو۔ اُس شکم سے پناہ مانگتا ہوں جو سیر نہ ہو۔ اس قلب سے پناہ مانگتا ہوں جو خشوع نہ رکھتا ہو۔ اس دُعا سے پناہ مانگتا ہوں جو قبول نہ ہو، اور اُس عمل سے پناہ مانگتا ہوں جو کارآمد نہ ہو۔

پروردگار! میں اپنے نفس، دین، مال اور تمام نعمتوں کے بارے میں شیطان رجیم سے پناہ مانگتا ہوں۔ تو بہترین سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

معبود! تیرے غضب سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہے اور تیرے علاوہ کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ لہذا مجھے عذاب میں مبتلا نہ کرنا، ہلاکت میں واپس نہ کردینا اور عذاب الیم میں پلٹا نہ دینا۔

پروردگار! میرے اعمال کو قبول فرما۔ میرے ذکر کو بلند فرما۔ میرے درجات کو اعلیٰ قرار دے۔ میرے بوجھ کو ختم کردے۔ میری خطاؤں کو نظرانداز کردے۔ میری منزل، میری گفتگو، میری دعا سب کا ثواب جنت اور اپنی رضا کو قرار دیدے۔ میرے تمام مطالب کو پورا فرما اور مجھے اپنے فضل وکرم سے مزید عطا فرما کہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوں۔

پروردگار! تو نے اپنی کتاب میں ہم سے فرمایا ہے کہ ہم اپنے ظالموں کو معاف کردیں تو ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے تو اسے معاف کردے اس لیے کہ تو مجھ سے زیادہ اس کا حق دار ہے اور تو نے حکم دیا ہے کہ ہم اپنے دروازے سے سائل کو واپس نہ کریں تو ہم تیرے دروازے پر آئے ہیں۔ اب ہمیں بھی بغیر حاجتوں کو پورا کیے ہوئے واپس نہ کرنا۔ تو نے حکم دیا ہے کہ ہم اپنے غلاموں سے نیک برتاؤ کریں ہم بھی تو تیرے بندے ہیں۔ اب تو بھی ہمیں جہنم سے آزاد کردے۔

اے رنج و غم کی پناہ گاہ اور سختیوں کے فریادرس! ہم تیری بارگاہ اور تیری پناہ میں حاضر ہوئے ہیں۔ تیرے علاوہ کسی کی پناہ درکار نہیں ہے اور نہ کسی سے کشائش احوال کی التماس ہے۔ تو فریاد رسی کر۔ رنج و غم کو دور فرما، کہ تو اسیروں کا رہا کرنے والا اور کثیر گناہوں کا معاف کرنے والا ہے۔ میرے مختصر اعمال کو قبول فرما اور میرے کثیر گناہوں کو بخش دے۔ تو بہترین مہربان اور بخشنے والا ہے۔

پروردگار! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو دل میں پیوست ہوجائے۔ اور اُس یقین صادق کا طلب گار ہوں جس کے بعد یہ اطمینان رہے کہ جو میرے حق میں لکھ دیا گیا ہے وہ ضرور پہونچے گا۔ اب اپنی تقسیم سے میری زندگانی کو خوش حال بنادے کہ تو ارحم الراحمین ہے۔

نقشِ

حیات امام محمد باقرؑ

ولادت : یکم رجب ۵۷ھ

شہادت : ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ

نقشِ زندگانی امام محمد باقر علیہ السلام

ماہ رجب ۵۷ھ کی پہلی تاریخ تھی جب مطلع امامت پر یہ پانچواں چاند نمودار ہوا اور اس کی روشنی سے سارا مدینہ منور ہوگیا۔ قدرت کا یہ خاص اہتمام تھا کہ آپ کو سلسلۂ امامت کا پانچواں امام اور سلسلۂ عصمت کا ساتواں معصوم قرار دیا تو سن ولادت بھی ۵۷ رکھا تاکہ اس سے دونوں حقائق کی طرف اشارہ ہو جائے اور اس کے بعد عمر شریف بھی ۵۷ سال قرار دی جس سے سنۂ وفات کا معین کرلینا بھی بے حد آسان ہوگیا اور امامت و عصمت کی ابتدائی نسبت آخر تک محفوظ رہ گئی۔

اسم گرامی الہام خداوندی کے مطابق محمد قرار پایا جو سلسلۂ عصمت میں پیغمبرؐ کے بعد پہلی مرتبہ اختیار کیا گیا اور پھر اس کی علامت بن گیا کہ پیغمبرؐ کے بعد جس دین کے تعلیمات کو بنی امیہ کے مظالم نے تباہ کردینا چاہا تھا اس کا احیار کرنے والا ہمنام محمدؐ دنیا میں آگیا ہے اور اب ان تعلیمات کو محو نہیں کیا جاسکتا ہے۔

کُنیت ابوجعفر قرار پائی اور القاب باقر، شاکر اور ہادی وغیرہ قرار پائے جن میں سب سے زیادہ شہرت لقب باقر یا باقر علوم النبیین یا باقر علوم الاولین والآخرین کو حاصل ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بقر کے معنی وانشگاف کرنے کے ہیں اور آپ نے اسرار و رموز علوم و فنون کو اس قدر وسعت دی ہے اور ان کی اس طرح تشریح کی ہے کہ دوسرے افراد کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ حد یہ ہے کہ عالم اسلام کے امام اعظم بھی آپ کے خرمن علم کے خوشہ چینوں میں تھے اور انھوں نے بھی آپ کے علوم سے استفادہ کیا ہے اور انھیں مناسب مواقع پر آپ نے مفید ترین ہدایات دی ہیں۔

● آپ کے والد ماجد امام زین العابدینؑ علیؑ بن الحسینؑ اور آپ کی والدہ گرامی فاطمہ

بنت الحسنؑ تھیں اور اس اعتبار سے آپ کو ابن الخیرتین کہا جاتا ہے کہ آپ ماں باپ دونوں طرف سے ہاشمی اور علوی ہیں۔

● آپ کی ولادت کے وقت معاویہ بن ابی سفیان کا دورِ حکومت چل رہا تھا۔ ۶۰ھ میں معاویہ کی وفات ہوئی تو یزید کا دور شروع ہوا۔ ۶۴ھ میں یزید داصل جہنم ہوا تو ۶۴ھ میں اس کے فرزند معاویہ بن یزید اور مروان نے حکومت کی اور اس کے بعد ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک عبدالملک بن مروان کا دورِ حکومت رہا۔ ۸۶ھ میں عبدالملک کا خاتمہ ہوا تو ۹۶ھ تک دس سال ولید بن عبدالملک نے حکومت کی۔ ولید کے بعد ۹۶ھ سے ۹۹ھ تک سلیمان بن عبدالملک حاکم رہا۔ ۹۹ھ میں عمر بن عبدالعزیز کی حکومت قائم ہوئی لیکن قوم اس کی قدرے منصفانہ روش کو برداشت نہ کرسکی اور یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا جس کے بعد ۱۰۱ھ میں یزید بن عبدالملک حاکم بنا اور پھر ۱۰۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کی حکومت قائم ہوگئی جس کا سلسلہ امامؑ کے آخر حیات تک قائم رہا، اور اسی نے آپ کو زہر دغا سے شہید کرایا۔ ہشام کا خاتمہ ۱۲۳ھ میں ہوا۔

● خاندانی اعتبار سے ۶۱ھ کے آغاز تک زندگی کے ۳½ سال آپ نے جد بزرگوار امام حسینؑ کے زیر سایہ گذارے۔ اس کے بعد ۹۵ھ تک تقریباً ۳۸ سال والد بزرگوار کے ساتھ رہے۔ اور ۹۵ھ کے بعد ۱۹ سال اپنا دورِ قیادت گذارا۔ جس میں اسلام کی تمام تر ذمہ داری آپ کے اوپر تھی اور آپ نے اسے بکمال حسن و خوبی انجام دیا۔

آپ کے بچپن کے چند واقعات سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ باقی تمام تفصیلات کا ذکر بنی امیہ کے مظالم کی نذر ہوگیا۔

۱۔ ایک مرتبہ آپ تقاضائے مصلحت الٰہیہ کی بنا پر کنویں میں گر گئے۔ اُس وقت امام سجادؑ محو نماز تھے اور اہل خانہ سب پریشان تھے۔ لیکن امامؑ نے نماز تمام کرنے کے بعد جب فرزند کو کنویں سے نکالا تو لباس بھی تر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ امام خشک و تر دونوں کا حاکم ہوتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی اسے متاثر نہیں کرسکتا ہے۔

۲۔ علامہ جامی کے نقل کے مطابق ایک شخص نے راہ حج میں سات سال کے بچے کو مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو حیرت زدہ ہو کر سوال کیا 'فرزند! تم کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو اور

زاد راہ کیا ہے ؟ تو فرمایا میرا سفر من اللہ الی اللہ (اللہ سے اللہ کی طرف ہے)۔ میرا زادِ راہ تقویٰ ہے، اور میرا نام محمدؑ بن علیؑ بن الحسین بن علیؑ بن ابی طالبؑ ہے۔ (شواہد النبوۃ)

● آپ کے امتیازات میں ایک امر یہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ نے جب جابر بن عبداللہ انصاری کو اپنے جانشین اور اولیاء امر کے نام بتائے تو آپ کا نام لے کر فرمایا کہ میرے اس وارث سے تمھاری ملاقات ہوگی تو میرا سلام کہہ دینا جس کے بعد جابر باوجود ضعیفی آپ کو ہر طرف تلاش کرتے رہے اور ایک دن امام سجادؑ کے ہمراہ جاتے ہوئے راستہ میں ملاقات ہوگئی تو آپ نے باپ کے حکم کے مطابق جابر کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جابر نے گلے سے لگا کر رسول اکرمؐ کا سلام پہونچایا۔ (صواعق محرقہ)

اس سلام کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس رسولؐ کو ساری دنیائے اسلام سلام کر رہی ہے اور جس کی بارگاہ تک کروڑوں مسلمان اپنا سلام پہونچانے کے لیے بے چین ہیں اس نے آپ کے نام سلام کہلوا بھیجا ہے اور اس طرح یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ دنیا میں کسی اور کو علیہ السلام کہا جاسکتا ہو یا نہیں۔ ائمہ طاہرینؑ اور آلِ رسولؐ کو بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ اپنی زندگی میں خود رسول اکرمؐ دس مہینہ تک ان کے دروازے پر سلام کرنے کے لیے آئے اور اپنے بعد آنے والے کو سلام کہلوا بھیجا۔

● اسی کمسنی میں آپ نے ۲۸ رجب ۶۰ھ سے ۸ ربیع الاول ۶۲ھ تک کے کربلا و کوفہ کے مصائب برداشت کیے اور کسی لمحہ بھی دامن صبر و تحمل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ورنہ ایسے مصائب کو بڑے بڑے انسان برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو بچوں کا کیا تذکرہ ہے خصوصیت کے ساتھ تین روز کی تشنگی خود کربلا کے میدان میں اور پھر مسلسل بھوک اور پیاس کوفہ و شام کے راستوں اور قید خانوں میں۔

● ۸۰ھ میں آپ نے پہلا تاریخی کارنامہ انجام دیا جو اسلامی تاریخ سے محو نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ۸۰ھ تک مسلمانوں میں رومی سکے رائج تھے اور عیسائی افراد ان سکّوں کے ذریعہ اپنے عقائد کی ترویج کر رہے تھے۔ عبدالملک نے اپنے دورِ حکومت میں ان سکّوں کو ترک کر کے ان پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ لکھنے کا حکم دے دیا۔ اس کی اطلاع قیصر روم کو ملی تو اس نے روک دیا، اور

اس سلسلہ میں رشوت بھی دینا چاہی لیکن عبدالملک نے قبول نہیں کی جس کے بعد اس نے تہدید کی کہ اگر میرے سکّوں کی شکل بگاڑ کر اس پر کلمہ لکھ لیا گیا تو میں اسلام اور رسول اسلامؐ کے بارے میں گالیاں لکھوا کر سکّے رائج کر دوں گا جسے سُن کر عبدالملک کے ہوش و حواس اڑ گئے اور اس نے بعض مشیروں کے کہنے کی بنا پر مجبوراً امام محمد باقرؑ کی طرف رجوع کیا اور آپ نے فرمایا کہ سفیر روم کو روک لیا جائے اور نئے سکّے اس انداز کے ڈھالے جائیں جن کے سانچے ایسے ہوں اور وزن اس قدر ہو۔ ان سکّوں کے ایک طرف کلمہ توحید ہو اور دوسری طرف کلمۂ رسالت اور سنۂ ایجاد بھی لکھ دیا جائے اور انھیں فوراً رائج کر دیا جائے اور رومی سکّوں کو لغو قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ عبدالملک نے ایسا ہی کیا اور یہ سارا کام مکمل ہو جانے کے بعد سفیر روم کو آزاد کیا گیا اور قیصر روم کو اطلاع کر دی گئی کہ اب حکومت اسلامی میں رومی سکّے لغو ہو چکے ہیں اور نئے سکّے رائج ہو چکے ہیں لہٰذا اسلام کو کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں رہ گیا ہے اور یہ سارا کام امام محمد باقرؑ کے مشورہ کے مطابق انجام دیا گیا ہے۔ قیصر روم اس خبر کو سُن کر دنگ رہ گیا اور اسے اندازہ ہوگیا کہ خانوادۂ رسالت کے علاوہ کوئی اس الٰہی سیاست کا وارث نہیں ہو سکتا ہے جس نے مسیحیت کو پھر ایک مرتبہ شکست دے کر مباہلہ کی صداقت اور فتح کا اعلان کر دیا۔ (حیٰوۃ الحیوان دمیری)

ان تمام احسانات کے باوجود جب عبدالملک کا بیٹا ولید حاکم ہوا تو اس نے بنی ہاشم پر بے پناہ ظلم کیے اور یہاں تک طے کر دیا کہ ان کے مکانات منہدم کر کے مسجد میں شامل کر دیے جائیں اور اگر بخوشی دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو مکانات میں آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر حسن مثنیٰ کے دروازہ پر تاریخی آگ اور لکڑیوں کا منظر دیکھنے میں آیا جس کے بعد بنی ہاشم نے مکانات خالی کر دیے اور ان کے مکانات بے نشان کر دیے گئے جب کہ حضرت عمرؓ کے خاندان والوں سے حفصہ کا مکان واپس نہیں لیا گیا اور ان کے قبضہ کو برقرار رہنے دیا گیا۔ یہ واقعہ ۹۱ھ کا ہے۔

● ۹۵ھ میں امام سجادؑ کی شہادت ہوگئی تو اس کے بعد آپ کے علمی خدمات کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کا ذکر کمالات اور کرامات کے ذیل میں آئے گا۔

اخلاقِ حسنہ

محمد بن المنکدر صوفی مسلک انسان تھا اس نے امام کو ضعیفی کے عالم میں دو اشخاص پر

تکیہ کیے ہوئے باہر جاتے دیکھا تو طنز کیا کہ بنی ہاشم کے شیوخ بھی کسب دنیا کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کسب معاش کسب دنیا نہیں ہے اطاعت الٰہی ہے۔ میں اس وقت مر بھی جاؤں تو یہ موت اطاعت الٰہی میں ہوگی۔

● آپ کسی وقت خندہ فرماتے تھے تو فوراً کہتے تھے "اَللّٰھُمَّ لَا تَمْقُتْنِیْ" (خدایا! مجھ سے ناراض نہ ہونا) یہ دنیا واقعتاً اس قابل نہیں ہے کہ یہاں کوئی انسان خوش ہو سکے۔ خصوصیت کے ساتھ جسے ہر وقت آخرت کا خیال ہو، اس کی ہنسی بھی مصلحت امت کی خاطر ہو سکتی ہے ورنہ اس کی زندگی میں ہنسی اور مسرّت کہاں؟

شہادت

۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ہشام بن عبدالملک نے آپ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا اور آپ اپنے بزرگوں کی طرح جام شہادت نوش فرما کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انتقال سے پہلے اپنے فرزند امام جعفر صادقؑ کو غسل و کفن وغیرہ سے متعلق وصیتیں فرمائیں اور خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت فرمائی کہ میرے مال میں سے ۸۰۰ درہم میری عزاداری کے لیے مخصوص کر دیے جائیں اور دس سال تک حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں میرا غم منایا جائے۔ چونکہ اس تاریخ کو عام طور سے حجاج اس علاقہ میں رہتے ہیں اور سارا عالم اسلامی حج بیت اللہ کے لیے اکٹھا ہوتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو حکام وقت کے مظالم اور آل محمدؐ کے فضائل و کمالات اور ان کے احکام و تعلیمات کا علم ہوتا رہے گا اور یہ دین کی ترویج کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس واقعہ سے عزاداری کے اہتمام اور اس کے اخراجات پر بھی واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔

نقش انگشتر

العزۃ للّٰہ   یا العزّۃُ للّٰہ جمیعًا

ایک انگشتری اپنے جد بزرگوار امام حسینؑ سے حاصل کی تھی جس کا نقش تھا ان اللّٰہ بالغ امرہ۔

دلائلِ امامت

اعترافات

● امام محمد باقرؑ عبادت، علم اور زہد وغیرہ میں اپنے پدر بزرگوار امام زین العابدینؑ کی مکمل تصویر تھے۔ (صواعق محرقہ)

● آپ علم، زہد، تقویٰ، طہارت، صفائے قلب اور دیگر محاسن میں اس درجہ پر فائز تھے کہ ان محاسن کو آپ کی ذات گرامی سے امتیاز حاصل ہوا۔ (مطالب السئول)

● آپ تابعین کے تیسرے طبقہ میں سے تھے اور بہت بڑے عالم، عابد اور ثقہ تھے۔
(ابن شہاب زہری، امام نسائی)

● کسی کے سامنے علماء اتنے چھوٹے نہیں دکھائی دیے جتنے آپ کے سامنے دکھائی دیے۔ حد یہ ہے کہ حکم جیسا عالم بھی آپ کے سامنے سپر انداختہ تھا۔ (ارجح المطالب)

● امام محمد باقرؑ کے فضائل لکھنے کے لیے ایک مکمل کتاب درکار ہے۔ (روضۃ الصفاء)

● آپ عظیم الشان امام اور مجمع جلال و کمال تھے۔ (فصل الخطاب)

● علم دین، احادیث، علم سنن اور تفسیر قرآن کے جتنے ذخیرے آپ سے ظاہر ہوئے ہیں، اتنے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی اولاد میں کسی سے نہیں ظاہر ہوئے۔ (نور الابصار)

● آپ کے علمی فیوض و برکات و کمالات سے بے بصیرت اور دیوانے کے علاوہ کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ (ابن حجر مکی)

● آپ علامۂ دوراں اور سید کبیر الشان تھے۔ علوم میں متبحر اور وسیع الاطلاع تھے۔ (وفیات الاعیان)

● آپ بنی ہاشم کے سردار تھے اور تبحر علمی کی بنا پر باقر کے لقب سے مشہور ہوئے کہ علوم کی تہہ تک پہنچ کر اس کے حقائق کو نکال لیتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی)

● آپ کے علمی تذکرے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور مالک جہنی نے آپ کی شان میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ (الاتحاف شبراوی)

● امام ابو حنیفہ کے معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادقؑ کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ (سیرۃ النعمان)

آپ سے انسانوں کی طرح جنات بھی علمی استفادہ کیا کرتے تھے جیسا کہ راوی نے بارہ افراد کو دیکھ کر حضرت سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اصل میں جنات ہیں۔ (شواہد النبوۃ)

علمی کمالات

● علامہ شبراوی کا بیان ہے کہ آپ نے امام ابو حنیفہ سے پوچھا کہ اگر آپ قیاس سے شریعت طے کر لیتے ہیں تو ان سوالات کے جوابات دیجیے:

۱۔ پیشاب زیادہ نجس ہے یا منی؟ انھوں نے کہا، منی ـــ فرمایا، پیشاب صرف دھونے سے کیوں پاک ہو جاتا ہے اور منی میں غسل کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

۲۔ قتل بڑا جرم ہے یا زنا؟۔ کہا قتل۔ فرمایا پھر قتل میں دو گواہ کیوں کافی ہیں اور زنا میں چار گواہوں کی ضرورت کیوں ہے؟۔

۳۔ نماز کی عظمت زیادہ ہے یا روزہ کی؟۔ کہا نماز کی۔ فرمایا پھر حائضہ عورت پر روزہ کی قضا کیوں واجب ہے اور نماز کی قضا کیوں واجب نہیں ہے؟۔

امام ابو حنیفہ نے جہالت کا اعتراف کر لیا اور جواب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں جواب بتائے دیتا ہوں لیکن آئندہ دین خدا میں قیاس سے کام نہ لیجیے گا۔ یاد رکھیے کہ پیشاب کا تعلق صرف مثانہ سے ہوتا ہے اور منی پورے جسم کی طاقت کا نچوڑ ہے اس لیے منی میں پورے جسم کا غسل واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح قتل میں ایک مجرم ہوتا ہے اور ایک مقتول، تو دو گواہ کافی ہیں لیکن زنا میں دو مجرم ہوتے ہیں لہذا چار گواہ درکار ہیں۔

حائضہ کو روزہ سے صرف ایک مہینہ میں دوچار ہونا پڑتا ہے لہذا اس کی قضا آسان ہے اور نماز ہر ماہ ترک ہوتی ہے لہذا اس کی قضا مشکل ہے۔ پھر روزہ کے ساتھ زندگی کے دوسرے

کام ہو سکتے ہیں لیکن نماز کے ساتھ دوسرے کام نہیں ہو سکتے ہیں۔ (اتحاف)

● علامہ شبلنجی کا بیان ہے کہ علا ابن عمر بن عبید نے آپ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے کہ زمین و آسمان جڑے ہوئے تھے ہم نے دونوں کو الگ کر دیا اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دونوں کے راستے بند تھے۔ جب کھول دیے گئے تو آسمان سے پانی برسنے لگا اور زمین سے غلہ پیدا ہونے لگا۔ (نور الابصار)

● طاؤس یمانی نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کا تھوڑا حلال ہے اور زیادہ حرام۔؟ فرمایا وہ نہر طالوت کا پانی تھا جو صرف ایک چلّو تک حلال تھا اور زائد حرام۔ پوچھا وہ کون روزہ تھا جس میں کھانا پینا جائز تھا؟ فرمایا جناب مریم کا روزہ تھا جس میں صرف بات کرنے کی پابندی تھی۔

پھر دریافت کیا کہ وہ کون سی شے ہے جو کم ہوتی ہے بڑھتی نہیں ہے؟ فرمایا وہ عمر ہے۔ پوچھا وہ کون سی شے ہے جو بڑھتی ہے گھٹتی نہیں؟ فرمایا وہ سمندر کا پانی ہے۔ کہا وہ کون سی چیز ہے جو صرف ایک مرتبہ فضا میں بلند ہوئی؟ فرمایا وہ کوہ طور ہے جو بنی اسرائیل کے سروں پر مسلط کیا گیا تھا۔ عرض کی وہ کون لوگ ہیں جن کی سچی گواہی بھی جھوٹ قرار پائی۔؟ فرمایا وہ منافقین ہیں جو رسولؐ کو رسول کہتے تھے لیکن خدا نے انھیں جھوٹا قرار دیا ہے۔ پوچھا عالم انسانیت کا ¼ حصہ کب ہلاک ہوا؟ فرمایا کبھی نہیں البتہ ¼ حصہ اس دن ختم ہوا ہے جس دن قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا کہ اس وقت صرف چار افراد کی آبادی تھی ـــ کہا انسانی نسل کس طرح آگے بڑھی؟ فرمایا کہ جناب حوا کے بطن سے جناب شیثؑ پیدا ہوئے اور انہیں سے نسل آدمؑ آگے بڑھ گئی۔!

کرامات

● ایک شخص نے دروازہ پر دق الباب کیا اور کنیز دروازے کے پاس آئی تو اس کی طرف سبقت کرنا چاہی۔ آپ نے اندر سے آواز دی۔ خبردار! دیوار ہمارے درمیان حجاب نہیں بنتی ہے۔ خوف خدا پیدا کرا اور ایسے اقدامات مت کیا کر۔

● ایک شخص نے اپنے بالوں کی سفیدی کا شکوہ کیا تو آپ نے دست شفقت پھیر دیا اور سارے بال سیاہ ہو گئے۔

● ابو بصیر آپ کے نابینا صحابی تھے۔ انھوں نے بصارت کی درخواست کی تو آپ نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر بینا بنا دیا۔

● ایک کوفی نے کہا کہ آپ کے پاس فرشتے آتے ہیں جو دوست و دشمن کا پتہ بتا دیتے ہیں فرمایا تیرا کام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ گندم فروشی۔ فرمایا غلط ہے۔ اس نے کہا کبھی کبھی جَو بھی بیچتا ہوں۔ فرمایا یہ بھی غلط ہے تو صرف خرمہ کا کاروبار کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔ فرمایا اسی فرشتہ نے بتایا ہے جو دوست اور دشمن کا پتہ بتاتا ہے اور دیکھ تین دن کے بعد تو اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

● ایک دن آپ نے فرمایا کہ اگلے سال یہاں مدینہ پر نافع بن ازرق حملہ کرے گا اور تم لوگ دفاع نہ کر سکو گے اور ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

● آپ نے جناب زید کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ کوفہ میں قیام کریں گے اور بالآخر قتل کیے جائیں گے اور ان کے سر کی تشہیر ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (شواہد النبوۃ۔ نور الابصار)

● ہشام بن عبدالملک نے آخر دور حکومت میں حج کیا تو اتفاق سے وہاں امام باقرؑ اور امام صادقؑ بھی موجود تھے۔ امام صادقؑ نے فضائل آل محمدؐ کے بارے میں خطبہ پڑھا تو وہ سخت ناراض ہوا اور واپس جا کر آپ کو شام طلب کر لیا۔ دونوں حضرات تشریف لے گئے تو تین دن دربار میں حاضری کا موقع نہیں دیا۔ چوتھے دن تشریف لے گئے تو کہا کہ تیر اندازی کیجیے۔ امام باقرؑ نے فرمایا کہ میں ضعیف ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کہ یہ کام تو کرنا ہی ہے۔ چنانچہ آپ نے تیر کمان لے کر ٹھیک نشانے پر تیر لگا دیا اور فرمایا کہ ہم آل محمدؐ کا مقابلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ حضرات اس قسم کے دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ آپ کے جد حضرت علیؑ بھی علم غیب کے مدعی تھے۔ فرمایا اس میں حیرت کیا ہے۔ سارا خشک و تر قرآن مجید میں موجود ہے اور قرآن امام مبین کے سینے میں رکھا گیا ہے اور وہ امام مبین تھے۔ (جلاء العیون)

● ہشام نے اہل دربار سے کہا کہ میں محمد باقرؑ کو ذلیل کروں گا اور جب میں خاموش ہو جاؤں

تو تم لوگ تذلیل کرنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب سب اپنی حرکتیں کر چکے تو آپ نے فرمایا کہ: بادشاہ ہم کو خدا نے عزت دی ہے اور جس کو خدا عزت دیتا ہے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا ہے۔ آخرت بہر حال صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے۔ یہ سُن کر ہشام کو غصہ آگیا اور اس نے آپ کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ قید خانہ میں پہونچ کر آپ نے قیدیوں کے درمیان ایسی تقریر کی کہ اس کی گونج باہر تک سُنائی دی اور لوگوں نے ہشام سے کہا کہ یہ اس علاقہ میں رہے تو انقلاب برپا ہو جائے گا تو اس نے آپ کو مدینہ روانہ کر دیا اور حکم دے دیا کہ راستہ میں کھانا پانی نہ دیا جائے۔ آپ راستہ طے کرتے ہوئے مدین پہونچے۔ وہاں بھی لوگوں نے سامان دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے پہاڑ پر جا کر بد دعا کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے قوم کو پکار کر کہا کہ اس جگہ جناب شعیب نے بد دعا کی تھی۔ خبردار! اب عذاب نازل ہونے والا ہے تو لوگوں نے گھبرا کر سامان دے دیا اور آپ آگے بڑھ گئے۔ (جلاء العیون)

● شام کی قید سے رہا ہونے کے بعد آپ مدینہ جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک مقام پر مجمع کثیر دکھائی دیا۔ آپ اُدھر بڑھ گئے اور حالات دریافت کیے۔ لوگوں نے کہا کہ آج عالم نصاریٰ کی زیارت کا دن ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ راہب دیر سے برآمد ہوا اور حضرت کو دیکھ کر مدہوش ہو گیا۔ پوچھا کہ آپ کا تعلق کس امت سے ہے؟ فرمایا امت مرحومہ سے۔ کہا اس کے عالموں میں ہیں یا جاہلوں میں؟ ۔ فرمایا میں جاہل نہیں ہوں۔ کہا کیا کوئی سوال کرنے آئے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ تو پھر میں سوال کر سکتا ہوں؟ ۔ فرمایا بے شک!

اس نے کہا کہ شب و روز میں کون سا وقت ہے جس کا شمار ساعات دنیا میں نہیں ہے؟ فرمایا وہ طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان کا وقفہ ہے جس کا شمار دن و رات دونوں میں ہوتا ہے۔ یہ جنت کا وقت ہے جس وقت بیمار کو سکون مل جاتا ہے، رات بھر کے جاگے کو نیند آجاتی ہے اور اہل آخرت میں ذوق بندگی بیدار ہو جاتا ہے۔

اس نے کہا کہ آپ حضرات کا عقیدہ ہے کہ جنت کی غذاؤں کے استعمال کے بعد بھی پیشاب پائخانہ کی ضرورت نہ ہو گی تو کیا دنیا میں اس کی کوئی مثال ہے؟ فرمایا کہ بچہ شکم مادر میں غذا کھاتا ہے اور ان ضروریات سے بے نیاز رہتا ہے ۔ پھر دریافت کیا کہ جنت کی نعمتیں

استعمال سے کم نہ ہوں گی اس کی کوئی مثال ہے؟ فرمایا کہ ایک چراغ سے لاکھوں چراغ جل جاتے ہیں اور روشنی میں کمی نہیں آتی ہے۔ کہا وہ دو شخص کون سے ہیں جو ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ایک ساتھ مرے لیکن ایک کی عمر ۵۰ سال تھی اور دوسرے کی ۱۵۰ سال۔ فرمایا وہ عزیز و عزیر تھے جن میں عزیر کو خدا نے درمیان میں سو سال کے لیے مُردہ بنا دیا پھر زندہ کر دیا اور اب دونوں بھائی ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے تو عمر میں سو سال کا فرق تھا۔ راہب یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا اور کہا کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے اور نہ میں اب کسی کے سوال کا کوئی جواب دوں گا اور یہ کہہ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ (جلاء العیون مجلسیؒ)

ازواج و اولاد

شیخ مفیدؒ وغیرہ کے بیان کے مطابق آپ کی سات اولاد تھی۔

امام جعفر صادقؑ اور عبداللہ۔ اور ان دونوں کی والدہ جناب فاطمہ ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر تھیں۔

ابراہیم اور عبداللہ۔ ان دونوں کی والدہ ام حکیم بنت اسد بن مغیرہ الثقفی تھیں۔

علی، زینب۔ ان دونوں کی والدہ ام ولد تھیں۔

ام سلمہ۔ ان کی والدہ بھی ام ولد تھیں۔

بظاہر آپ کی اولاد صرف امام جعفر صادقؑ سے آگے بڑھی ہے۔ اگرچہ تاریخوں میں عبداللہ کے ایک فرزند اسماعیل کا بھی ذکر ہے جنھیں امام صادقؑ کے اصحاب میں شمار کیا گیا ہے، اور ایک دختر تھیں جنھیں ام خیر کہا جاتا تھا۔ اور علی بن باقر کی ایک صاحبزادی فاطمہ کا ذکر بھی ہے جن سے امام موسیٰ بن جعفرؑ نے عقد فرمایا تھا، اور ام سلمہ کے ایک فرزند اسماعیل بن محمد ارقط کا ذکر بھی ہے جنھوں نے ابوالسرایا کے ساتھ خروج کیا تھا۔ واللہ اعلم

اصحاب و تلامیذ

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایات اخذ کرنے والوں میں صحابہ میں جناب جابر بن عبداللہ

انصاری۔ تابعین میں جابر بن یزید الجعفی، کیسان السجستانی۔ فقہاء میں ابن المبارک، زہری، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، اوزاعی، زیاد بن المنذر اور بہت سے مورخین اور مفسرین کا نام آتا ہے۔ لیکن آپ کے واقعی اصحاب اور تلامذہ میں یہ حضرات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

جابر بن عبداللہ انصاری، جابر بن یزید الجعفی، زرارہ، عامر بن عبداللہ بن شریک العامری، فضیل بن یسار البصری، سلام بن المستنیر، برید بن معاویہ، حکیم بن ابی نعیم، محمد بن مسلم الثقفی، عبداللہ بن ابی یعفور، زیاد بن المنذر ابوالجارود، زیاد بن ابی رجاء ابوعبیدہ الحذاء، زیاد بن سوقہ، زیاد بن ابی زیاد المنقری، زیاد الاحلام، ابوبصیر یحییٰ بن ابی القاسم مکفوف (اسحاق)، حمران، بکیر، عبدالملک، عبدالرحمان بن اعین، محمد بن اسماعیل بن بزیع، عبداللہ بن المیمون القداح، محمد بن مروان الکوفی، اسماعیل بن الفضل الہاشمی از اولاد نوفل بن الحارث، ابوہارون المکفوف، ظریف بن ناصح، سعید بن الاسکاف الدولی، اسماعیل بن جابر الخثعمی الکوفی، عقبہ بن بشیر الاسدی، اسلم المکی، ابوبصیر لیث بن البختری المرادی، کمیت بن زید الاسدی، ناجیہ بن عمارہ الصیداوی، معاذ بن مسلم النحوی۔ بشیر الرجال وغیرہ۔

ان میں سے محمد بن اسماعیل بن بزیع کے بعد کے تمام افراد کا شمار اصحاب امام صادقؑ میں بھی ہوتا ہے اور ان حضرات نے دونوں ائمہؑ سے استفادہ کیا ہے۔

ذیل میں مذکورہ بالا اصحاب میں سے بعض کے اجمالی حالات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ جابر بن عبداللہ الانصاری

رسول اکرمؐ کے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے سلام کے حامل تھے۔ آپ کے ہمراہ بدر اور دیگر معارک میں شریک رہے ہیں۔ ان کے والد بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ دوسری بیعت عقبہ میں جابر خود بھی شریک تھے۔ امیرالمومنینؑ کے مخلصین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ روز اربعین ۶۱ھ امام حسینؑ کے سب سے پہلے زائر یہی ہیں جن کی زیارت اربعین کا تذکرہ کتب مقاتل و زیارات میں موجود ہے۔

۲۔ ابوبصیر لیث بن البختری المرادی

نہایت درجہ ثقہ اور معتبر تھے۔ امام صادقؑ کا ارشاد ہے کہ میرے باپ کی فقہ کو چار افراد نے محفوظ رکھا ہے۔ ابوبصیر، زرارہ، محمد بن مسلم اور برید بن معاویہ العجلی۔

۳۔ابوبصیر عبداللہ بن محمد الاسدی

یہ اُن چھ اصحاب میں ہیں جنھیں افقہ کہا گیا ہے۔ ابوبصیر اسدی، محمد بن مسلم، فضیل بن یسار، برید العجلی، زرارہ اور ابوبصیر المرادی۔

۴۔ابوبصیر یحییٰ بن القاسم الاسدی

باپ کا نام اسحاق تھا۔ خود نابینا تھے اور نہایت درجہ ثقہ اور مرد فقیہ تھے۔ بعض حضرات نے چھ فقہاء میں ان کا شمار کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ امام صادقؑ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا تھا۔

۵۔زرارہ بن اَعیَن

نہایت درجہ مرد دانا، فقیہ، متکلم، ادیب اور ثقہ تھے۔ ایک مرتبہ امام صادقؑ کی بزم میں ان کا ذکر آیا تو آپ نے اس انداز سے تذکرہ کیا جس سے پہلوئے ذم نکلتا تھا۔ انھیں اطلاع ملی تو اپنے فرزند کو حضرت کی خدمت میں دریافت حال کے لیے بھیجا۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرے واقعی دوست ہو لیکن کیا کروں دنیا میرے دوستوں کی دشمن ہے۔ لہٰذا میں اس طرح ذکر کرتا ہوں کہ میری دوستی کا اظہار نہ ہو، اور اس طرح میرے چاہنے والے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں۔

واضح رہے کہ زرارہ چار بھائی تھے۔ زرارہ، حمران، بکیر، عبدالرحمان۔ اور یہ سب کے سب نہایت درجہ مخلص قسم کے شیعہ تھے اور کسی کے بارے میں انحراف کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

۶۔محمد بن مسلم ثقفی کوفی

امام باقرؑ و صادقؑ کے نہایت مخلص صحابی تھے۔ امام باقرؑ سے تیس ہزار اور امام صادقؑ سے ۱۶ ہزار حدیثیں اخذ کی ہیں۔ امام باقرؑ نے ایک مرتبہ تواضع و انکساری کا حکم دے دیا تو خرمہ فروشی شروع کر دی اور اس کے بعد آٹا پیسنے لگے جس کی بنا پر انھیں طحان بھی کہا جاتا ہے۔

ابوکہمش کا بیان ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ قاضی ابولیلیٰ نے محمد بن مسلم کی شہادت کو رد کر دیا ہے۔ تم کوفہ جانا تو ابولیلیٰ سے مل کر تین سوال کرنا اور کہنا کہ شرط یہ ہے کہ جواب حدیثِ رسولؐ سے ہو:

۱۔ فرض نماز کی پہلی دو رکعتوں میں شک ہو تو کیا کرنا چاہیے۔؟
۲۔ بدن یا کپڑا پیشاب سے نجس ہو جائے تو کس طرح پاک کیا جائے۔؟
۳۔ رمی جمرات میں سات میں سے ایک کنکری گر جائے تو کیا کیا جائے۔؟

ابوکہمش نے امامؑ کے قول پر عمل کیا اور جب ابولیلیٰ جواب نہ دے سکا تو کہا کہ یہ سوالات امام صادقؑ نے تعلیم فرمائے ہیں اور فرمایا ہے کہ جب تجھے سنت رسولؐ کا علم نہیں ہے تو محمد بن مسلم کی شہادت کے رد کرنے کا کیا حق ہے۔ ابولیلیٰ سخت نادم ہوا اور محمد بن مسلم کی گواہی کو نافذ کر دیا۔

● دوسری مرتبہ امامؑ کے دو نمائندے شریک قاضی کے پاس گئے اور دو سوالات کیے، قصر کی مسافت کیا ہے اور جمعہ کی شرط کیا ہے۔؟ اور جواب حدیث سے مانگا اور جب وہ جواب نہ دے سکا تو کہا کہ ہم سے محمد بن مسلم نے امام باقرؑ کے واسطے سے یہ حدیث رسولؐ بیان کی ہے کہ قصر دو برید (نامہ بر) کی مسافت پر واجب ہوتا ہے اور جمعہ پانچ افراد کے اجتماع پر واجب ہوتا ہے جن میں ایک امام ہوتا ہے۔ شریک اس جلالت علمی کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

۷۔جابر بن یزید الجعفی

کوفہ کے رہنے والے تھے لیکن امام باقرؑ کی خدمت میں آکر مدینہ میں رہ گئے تو حضرت نے فرمایا کہ اپنے کو کوفہ کا مت کہنا مدینہ کا بتانا ورنہ لوگ اذیت کریں گے۔ عرض کی کہ یہ غلط بیانی تو نہیں ہے؟۔ فرمایا ہرگز نہیں! جب تک تم مدینہ میں ہو مدینہ کے رہنے والے ہو۔ اس میں غلط بیانی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نعمان بن بشیر راوی ہیں کہ ایک شخص نے جابر کو ایک خط لا کر دیا۔ انھوں نے آنکھوں سے لگایا اور کھول کر پڑھا اور افسردہ ہوئے اور کوفہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہونچ کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگے کہ ایک لکڑی پر گھوڑے کی طرح سوار ہو کر بچوں کے ساتھ دوڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ جابر دیوانے ہو گئے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہشام بن عبدالملک کا فرمان کوفہ کے حاکم کے پاس آیا کہ جابر کو قتل کر کے ان کا سر بھیج دو۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مرد فقیہ تھے لیکن فی الحال پاگل ہو گئے ہیں۔ انھیں قتل کرنے سے کیا فائدہ

ہے؟۔ چنانچہ اس نے اپنی رائے بدل دی اور امامؑ کے خط کی مصلحت سامنے آگئی اور یہ معلوم ہوگیا کہ ائمہ طاہرینؑ کس طرح اپنے چاہنے والوں کی زندگیوں کا تحفظ کیا کرتے تھے اور محبان آل محمدؐ کے لیے عرصۂ حیات کس قدر تنگ ہوگیا تھا۔ جابر کا انتقال ۱۲۸ھ میں ہوا ہے یعنی امام محمد باقرؑ کے چودہ سال کے بعد۔

اقوال حکیمانہ

بہترین امتزاج یہ ہے کہ علم کو حلم کے ساتھ ملا دیا جائے۔

مکمل کمال دین میں فقاہت، مصائب پر صبر اور معیشت کی تقدیر یعنی آمد و خرچ کے توازن کا حساب رکھنا ہے۔

بیس سال کی ہمراہی قرابت کا درجہ پیدا کر لیتی ہے۔

تین چیزیں دنیا اور آخرت کے مکارم میں ہیں: ظلم کرنے والے کو معاف کر دینا، قطع تعلقات کرنے والوں سے صلۂ رحم کرنا، اور جاہلوں کی جہالت کو برداشت کرنا۔

جو خود اپنے نفس کو موعظہ نہ کر سکے اسے دوسروں کا موعظہ فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

کتنے لوگ ایسے ہیں جو لوگوں سے خوشامد میں کہتے ہیں کہ خدا تمھارے دشمن کو ذلیل کرے حالانکہ ان کا دشمن خود خدا ہی ہوتا ہے۔

جس عالم کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے وہ ستر ہزار عابدوں سے بہتر ہے۔

واضح رہے کہ ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات میں علماء کے مراتب پر بے حد زور دیا گیا ہے اور ان کی مصاحبت اور ان سے علمی استفادہ کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ جنازہ میں شرکت کرنا افضل ہے یا مجلس عالم میں؟ فرمایا کہ اگر جنازہ اٹھانے والے موجود ہیں تو مجلس عالم میں شرکت افضل ہے ہزار جنازوں میں شرکت، ہزار مریضوں کی عیادت، ہزار شب کی نماز، ہزار روز کے روزے، ہزار درہم صدقہ اور ہزار حج مستحب سے۔

عالم کے ساتھ غیر جامع مسجد میں نماز ہزار رکعت کے برابر ہے اور مسجد جامع میں ایک لاکھ رکعت کے برابر۔

عالم کو صدقہ دینا سات ہزار گنا ثواب رکھتا ہے۔

نوزائیدہ رئیسوں سے حاجت طلب کرنا سانپ کے منھ سے درہم نکالنا ہے کہ ضرورت بھی ہے اور خطرہ بھی ہے۔

نیکیوں کے چار خزانے ہیں: (۱) حاجت کا پوشیدہ رکھنا۔ (۲) صدقہ کا چھپا کر دینا۔ (۳) درد کا اظہار نہ کرنا۔ (۴) مصیبت کا بیان نہ کرنا۔

مجموعہ ورام کی روایت ہے کہ احنف نے اپنے چچا صعصعہ سے درد دل کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا، فرزند! اپنے حالات کی شکایت مت کیا کرو کہ دوست سے کہو گے تو رنجیدہ ہوگا اور دشمن سے کہو گے تو خوش ہوگا۔ پھر ان لوگوں سے کیا کہنا ہے جو خود اپنے درد کا علاج نہیں کر سکتے ہیں۔ کہنا ہے تو اس سے کہو جس نے درد دیا ہے اور وہی رفع کرنے پر قادر ہے۔ دیکھو میری ایک آنکھ چالیس سال سے کام نہیں کر رہی ہے لیکن میں نے آج تک اپنی زوجہ سے بھی اس کی شکایت اور فریاد نہیں کی ہے۔

خبردار! کسل مندی اور بے قراری سے دور رہنا کہ کسل مند آدمی کسی کے حقوق نہیں ادا کر سکتا ہے اور بے قرار آدمی حق پر صبر نہیں کر سکتا ہے۔

اس مقام پر ایک دلچسپ حکایت ابوالحجاج اقصری کے بارے میں مشہور ہے کہ اس سے پوچھا گیا کہ آپ کا استاد کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ ابوجعران۔ (ابوجعران وہ کیڑا ہے جو غلاظت کو ڈھکیل کر سوراخ تک لے جاتا ہے)۔ لوگوں نے حیرت زدہ ہو کر کہا کہ مذاق نہ کیجیے۔ انھوں نے کہا کہ میں حقیقت کہہ رہا ہوں اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک رات میں نے اس کیڑے کو ایک چراغ کے اسٹول پر چڑھتے دیکھا۔ لیکن اس کے چکنے ہونے کی بنا پر بار بار گر جاتا تھا۔ میں تا دیر دیکھتا رہا اور یہ دیکھا کہ اس نے سات سو مرتبہ کوشش کی اور ناکام رہا یہاں تک کہ میں نماز صبح کے لیے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کو روشنی کے قریب اسٹول کے اوپر پایا اور یہ طے کر لیا کہ کسل مندی سے کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے اور مسلسل کوشش ایک دن بہرحال کامیابی سے ہمکنار بنا دیتی ہے۔

● تواضع یہ ہے کہ محفل میں اپنے مرتبہ سے کم تر جگہ پر بیٹھے۔ جو سامنے آجائے اُسے سلام

کرے اور حق بجانب ہونے کے باوجود بحث و مباحثہ نہ کرے۔

● حیا اور ایمان ایک ہی رشتہ کے دو گوہر ہیں۔ ایک رخصت ہوجاتا ہے تو دوسرا بھی اسی کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام نے حیا و غیرت پر بے حد زور دیا ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اسلام برہنہ ہے اور اس کا لباس حیا و غیرت ہے۔ جس کے پاس حیا نہیں ہے اس کے پاس دین بھی نہیں ہے۔ قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک بچوں اور عورتوں کی حیا ختم نہ ہوجائے۔

● امام رضاؑ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک منافق نے آپ پر طنز کردیا کہ آپ کے بعض دوست شراب پیتے ہیں تو آپ فرطِ حیا و غیرت سے پسینہ میں ڈوب گئے۔

کاش! امامؑ سے تمسک رکھنے والے اور ان کی محبت کا دعویٰ کرنے والے اس صورت حال کا صحیح احساس کرتے اور اپنی بداعمالیوں سے امامؑ کو شرمندہ نہ کرتے۔ امام رضاؑ کا دور گذر چکا ہے تو ابھی زمانہ کا ایک امامؑ زندہ موجود ہے اور وہ ہمارے اعمال کو برابر دیکھ رہا ہے، اور اس طنز و طعن کو بھی برابر سُن رہا ہے جو دشمنانِ اہلبیتؑ کی طرف سے ہماری بداعمالیوں اور بے عملیوں کی بنا پر ائمہ معصومینؑ پر وارد کیے جا رہے ہیں۔

● صبح سویرے صدقہ دینا شیطان کے شر کو دور کرتا ہے اور سلطان کے شر سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

● جابر بن یزید جعفی سے فرمایا کہ کیا ہماری محبت کے لیے فقط دعوائے محبت کافی ہے؟ ہرگز نہیں۔ واللہ ہمارا شیعہ وہ نہیں ہے جو خدا کی اطاعت نہ کرے اور تقویٰ اختیار نہ کرے۔ جابر! ایک زمانہ تھا جب ہمارے شیعہ تواضع و انکسار، ذکر خدا، نماز و روزہ، خبرگیری ہمسایہ، اعانت فقرا و مساکین و ایتام، تلاوت قرآن سے پہچانے جاتے تھے۔

جابر نے عرض کی کہ حضور آجکل کے دور میں تو ایسے افراد نظر نہیں آتے ہیں۔ فرمایا جابر! بہرحال ہماری محبت کی علامت یہی ہے ورنہ کوئی شخص رسول اکرمؐ سے زبانی محبت کرے اور ان کی سیرت پر عمل نہ کرے تو وہ محبت بھی کارآمد نہیں ہے اگرچہ رسول اکرمؐ کا مرتبہ امیرالمومنینؑ سے بالاتر ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

نقشِ
حیاتِ امام جعفر صادقؑ

ولادت: ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ

شہادت: ۲۵ شوال ۱۴۸ھ

نقشِ حیات امام جعفر صادقؑ

ولادت: ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ

شہادت: ۲۵ شوال ۱۴۸ھ

نقشِ زندگانی امام جعفر صادق علیہ السّلام

● ماہ ربیع الاول ۸۳ھ کی ۱۷ تاریخ تھی جب تاریخ عصمت کا دوسرا "آفتابِ صداقت" مطلع انسانیت پر ظہور کر رہا تھا جس طرح کہ آج سے تقریباً ۱۲۰۵ سال پہلے اسی تاریخ کو سرکارِ دو عالم کی ولادت باسعادت کے طفیل میں اس کائنات کو پہلے "آفتاب صداقت" کے مطلع انوار بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

● گویا نگاہِ قدرت میں ماہ ربیع الاول کی ۱۷ تاریخ صداقت کے لیے راس آگئی اور قدرت نے ہر صادق کو بھیجنے کے لیے اسی مبارک تاریخ کا انتخاب کیا اور اس طرح دادا اور پوتے کی تاریخ صداقت بھی متحد ہو گئی اور چوں کہ مسلک آلِ محمدؐ ذاتی افکار کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدائی اخبار کا مجموعہ ہے اور اخبار کا دارومدار مخبر کی صداقت ہی پر ہوا کرتا ہے لہذا مذہب کی حقانیت کا انحصار مخبر صادق کی صداقت پر قرار پاتا ہے اور اس طرح بہترین مذہب وہ مذہب قرار پائے گا جس کے اصول کا بیان نبی صادقؐ کے ذریعہ ہو، اور تشریحات و تفصیلات کے بیان کا کام امام صادقؑ سے متعلق کر دیا جائے۔

آپ کے والد کا اسم مبارک امام محمد باقر علیہ السلام تھا اور والدہ گرامی جناب ام فروہ تھیں جو جناب قاسم بن محمد بن ابی بکر کی صاحبزادی تھیں اور جن کے بارے میں خود امام صادقؑ کا بیان ہے کہ ان کا شمار ان افراد میں تھا جو صاحبان ایمان، نیک کردار اور پرہیزگار تھے اور جن سے اللہ نے محبت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ آپؑ کی تربیت جناب قاسم کی آغوش میں ہوئی جن کو مدینہ کے سات عظیم فقہاء میں شمار کیا جاتا تھا اور ان کی پرورش اس محمد کی آغوش میں ہوئی جن کے بارے میں امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا کہ یہ اگرچہ ابوبکر کے صلب سے ہیں لیکن درحقیقت میرے فرزند کہے جانے کے قابل ہیں اور اس علیؑ کی فرزندی کا نتیجہ تھا کہ حاکم شام نے انھیں اتنی سخت سزا دی کہ گدھے کی

کھال میں بند کر کے زندہ جلوا دیا۔

● جناب ام فروہ کی ذاتی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے بائیں ہاتھ سے حجر اسود کو مس کیا تو کسی شخص نے اعتراض کر دیا کہ یہ خلافِ سنت ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ انا لاغنیاء من علمك (ہم اس گھر کے افراد ہیں جو تیرے جیسے افراد کے علم سے مستغنی اور بے نیاز ہیں۔)

● امام صادقؑ کا اسم گرامی جعفر تھا جس کے معنی نہر کے ہیں اور جو جنت میں ایک وسیع نہر کا نام بھی ہے جس سے قدرت کی طرف سے یہ اشارہ مقصود تھا کہ آپ کے علوم و کمالات سے ایک عالم سیراب ہونے والا ہے اور آپ کے علوم کی وسعتیں جنت کی نہروں جیسی ہیں اور آپ سے واقعی فیض حاصل کرنے والا گویا اہل جنت میں ہے۔

● کنیت ابو عبد اللہ تھی اور القاب صابر، فاضل اور صادق وغیرہ تھے جن میں صادق کا لقب رسول اکرمؐ نے اس تذکرہ میں عطا فرمایا تھا جس میں اپنے بعد کے وارثوں اور جانشینوں کا تذکرہ فرمایا ہے تھے اور فرمایا تھا کہ میرے اس وارث کا لقب صادق ہوگا۔ (جلاء العیون) اور اس کا ایک راز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اولادِ رسولؐ میں ایک شخصیت جعفر کذاب کی بھی پیدا ہو گئی جنھوں نے غلط دعویٔ امامت کر کے امام زمانہ سے مقابلہ کیا اور کذاب قرار پائے۔ اس لیے اس اشتباہ سے بچنے کے لیے آپ کو مسلسل صادق کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اگرچہ دوسرے جعفر بھی بعد میں تواب قرار پاگئے لیکن عام طور سے ان کا تعارف اسی لقب سے ہوتا ہے جس سے اُن کے غلط دعویٰ پر روشنی پڑتی ہے چاہے بعد میں گناہ معاف ہی کیوں نہ ہو جائے۔

● آپ کے بارے میں آپ کی والدہ ماجدہ کا بیان ہے کہ شکم اقدس میں برابر ماں سے کلام کیا کرتے تھے اور ولادت کے بعد بھی سب سے پہلے زبان مبارک پر کلمہ شہادتین جاری کیا اور ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا کہ امام اسلام لاتا نہیں ہے اسلام لے کر آتا ہے۔

آپ کی انگشتری کا نقش "اللہ ولیّ وعصمتی من خلقه"۔ "اللہ خالق کل شئی"۔ "انت ثقتی فاعصمنی من الناس"۔ "ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ استغفر اللہ"۔ (باختلاف روایات)

● آپ کی تاریخ ولادت کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ تاریخ سال کے ان چار اہم دنوں میں شامل ہے جس دن روزہ رکھنے کا بے حد ثواب قرار دیا گیا ہے اور جن میں ۱۷ ربیع الاول کے علاوہ

۲۵ ذی قعدہ، ۲۷ رجب اور ۱۸ ذی الحجہ روز غدیر خم جیسی اہم تاریخیں بھی شامل ہیں۔

● آپ کی ولادت عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں ہوئی جس کا سلسلہ تقریباً ۸۶ھ تک رہا۔ اس کے بعد ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک ولید بن عبدالملک کا دور رہا۔ ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک چند دنوں کے لیے حاکم بنا۔ پھر تھوڑے عرصہ تک عمر بن عبدالعزیز کی حکومت رہی ۱۰۱ھ میں یزید بن عبدالملک برسر اقتدار آیا۔ پانچ سال کے بعد ہشام بن عبدالملک کا دور شروع ہوا جو تقریباً ۲۰ سال باقی رہا۔ ۱۲۵ھ میں ولید بن یزید بن عبدالملک نے حکومت سنبھالی اور اس کے فوری خاتمہ پر ۱۲۶ھ میں یزید ناقص برسر اقتدار آیا اور چند دنوں کے بعد ابراہیم بن الولید کو حکومت مل گئی اور اس کے بعد مروان الحمار برسر اقتدار آیا جس کے خاتمہ سے بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ابوالعباس سفاح نے ۱۳۲ھ میں تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور عباسی دور حکومت کا آغاز ہو گیا۔ ابوالعباس سفاح کی چار سالہ حکومت کے بعد منصور دوانیقی کو اقتدار مل گیا اور اس کا سلسلہ ۱۵۸ھ تک جاری رہا جس میں ۱۴۸ھ میں اس نے امامؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔

تاریخ حکومت اموی و عباسی کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت یا خلافت کا ایمان اور کردار سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وراثت یا طاقت کے زور پر سارا کاروبار چل رہا تھا۔ چنانچہ اس کا سب سے زیادہ دلچسپ اور عبرتناک ثبوت یہ ہے کہ خلفاء اسلام کی فہرست میں یزید ناقص، ولید فاسق، ابوالعباس سفاح، منصور دوانیقی اور مروان الحمار جیسے نام ملتے ہیں جن کے نام ہی سے ان کے ناقص، فاسق، خوں ریز و سفاک، پیسے پیسے پر مرنے والا اور گدھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور ان تمام اوصاف و کمالات کے بعد بھی سب خلیفۃ المسلمین تھے اور اسی اسلامی ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک مسلمان حکومتوں کے حکام بے دین، جاہل و شرابی، جواری اور عیاش نظر آ رہے ہیں اور عالم اسلام انھیں اولی الامر قرار دے کر ان کے احکام کی اطاعت کو سرمایۂ دین و ایمان قرار دے رہا ہے۔ بھلا کیا مقابلہ ہے اس بے دین اور بدکردار تاریخ کا۔ اس معصوم اور فنا فی اللہ تاریخ سے۔ جس کی کوئی فرد صاحب علم ہے تو کوئی صاحب اخلاق، کوئی صبر کا مجسمہ ہے تو کوئی عبادت کا نمونہ، کوئی وسعت علوم کا ذمہ دار ہے تو کوئی صداقت کا شاہکار، کسی نے تحمل و کظم غیظ کا مظاہرہ کیا ہے تو کسی نے راضی برضائے الٰہی رہنے کا، کسی کا تقویٰ شہرۂ آفاق

بنا ہے تو کسی کی طہارت قلب، کوئی عسکری طاقت کا مرقع ہے تو کوئی اصلاح عام کا ذمہ دار،

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

● عبدالملک کے دور حکومت کے خاتمہ تک امام کی عمر صرف تین سال تھی لہٰذا اس حکومت سے کسی خاص سابقہ کا سوال نہیں ہے۔ سلیمان بن عبدالملک، ولید بن یزید بن عبدالملک، یزید ناقص، ابراہیم بن الولید اور مروان الحمار خود ہی چند روزہ حاکم تھے لہٰذا ان کا تذکرہ کرنا ہی بیکار ہے۔

● امامؑ کے دور زندگانی میں ابتدائی طور پر حکومت کرنے والے افراد میں دس سال ولید بن عبدالملک کا دور حکومت ہے اور درمیان میں ۲۰ سال ہشام بن عبدالملک کا زمانہ ہے اور آخر میں تقریباً ۲۰-۲۲ سال منصور دوانیقی کا دور حکومت ہے ــــ لیکن ان ادوار میں بھی ولید کا پورا دور حکومت اور ہشام کا نصف دور حکومت امام محمد باقرؑ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ۱۱۴ھ میں آپ کی شہادت کے بعد امامؑ کا دور قیادت شروع ہوا جس کا ابتدائی مقابلہ ہشام بن عبدالملک سے رہا اور آخری مقابلہ منصور دوانیقی سے۔ لیکن پھر بھی تاریخ خلافت کے تعارف کے لیے بعض افراد کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

● امامؑ کی ابتدائی زندگی کا حاکم وقت ولید بن عبدالملک تھا جس کے فسق و فجور کا یہ عالم تھا کہ خود اپنی حسین و جمیل بیٹی سے زنا کیا اور جب کسی نے اعتراض کیا کہ اس طرح بڑی بدنامی ہوگی تو اُس نے صاف کہہ دیا کہ لوگوں کی ملامت کا خیال کرنے والے کبھی اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

● ایک مرتبہ ظالم نے خانۂ کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب پینے کا منصوبہ بنایا تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ اسلام میں خلیفہ کے وقار کے علاوہ کسی شے کا نہ کوئی وقار ہے نہ احترام۔ اس نے قرآن مجید سے جنگ میں جانے کے لیے فال نکالی اور آیت خلاف منشا نکل آئی تو قرآن کو تیروں کا نشانہ بنا کر کہہ دیا کہ روز قیامت اپنے خدا سے کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔

یہ ہے مسلمانوں کا ایمان بالقرآن کہ ایسے افراد کو بھی خلیفۃ المسلمین تسلیم کرنے کے بعد محبان اہلبیتؑ پر یہ طنز کرتے ہیں کہ ان کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہے۔ بے شک اگر ایمان بالقرآن کے لیے اس مشق تیراندازی کی بھی شرط ہے تو اللہ ہر مسلمان کو ایسے ایمان سے محفوظ

رکھے۔

● ولید کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اذان کی آواز سُن کر کنیز سے جماع کرنے میں مصروف ہوگیا اور جب مسلمان نماز پڑھانے کے لیے بلانے کے لیے آئے تو اسی کنیز کو اپنا لباس پہنا کر بھیج دیا اور مخلص مسلمانوں نے نہایت ہی "خضوع و خشوع" کے ساتھ کنیز کے پیچھے نماز پڑھ لی، اور یہ بات پھر واضح ہوگئی کہ بنی امیہ کے پرستاروں میں نہ اونٹ اور اونٹنی کی تمیز ہے اور نہ مرد اور عورت کی۔ یہ ہر کس و ناکس کو اپنا امام اور راہنما تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ جو جس قدر بے دین ہوگا اتنا ہی بڑا خلیفۃ المسلمین اور ولی امرامت ہوگا۔

● امام جعفر صادقؑ کے چچازاد بھائی جناب یحییٰ بن زید کو اسی ظالم نے قتل کرایا تھا اور پھر ان کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا تھا اور آخر میں ایک مُدّت کے بعد سولی سے اتروا کر نذر آتش کرا دیا تھا ــــ اور اس طرح خلافت اسلامیہ کی بھی حقیقت واضح ہوگئی تھی اور خلیفۃ المسلمین کے حسد کی آگ بھی بُجھ گئی تھی۔

● ہشام بن عبدالملک کا دورِ حکومت آپ کی جوانی کا دورِ زندگی تھا جب آپ ہشام کی طرف سے وارد ہونے والے مصائب کا باقاعدہ مشاہدہ کر رہے تھے بلکہ بعض اوقات ان کا نشانہ بھی بن رہے تھے۔ ہشام انتہائی چالباز، کنجوس، سخت مزاج، خودسر، بداخلاق، لالچی اور شکی قسم کا انسان تھا۔ ذرا ذرا سے شبہ پر افراد کو تہ تیغ کرا دیا کرتا تھا۔ آل رسولؐ کا قتل عام اس کا خاص مشغلہ تھا چنانچہ اس نے ۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک خالد بن عبداللہ قسری کو عراق کا گورنر بنا کر رکھا جس نے ایک عام تباہی مچادی اور اس قدر بے دینی پھیلائی کہ ہشام کو رسول اکرمؐ سے بہتر قرار دے دیا۔ (تاریخ کامل)

● ہشام نے حج کے موقع پر امام زین العابدینؑ کی عظمت کا مشاہدہ کیا تو جل کے رہ گیا۔ اور جب فرزدق نے آپ کی شان میں قصیدہ پڑھا تو انھیں مقام عسفان میں قید کرا دیا اور سخت سزا دی۔

● اسی شخص نے جناب زید کو شہید کرایا۔ ان کی لاش کو چار سال سولی پر لٹکا کر رکھا اور آخر میں لاش مبارک کو نذر آتش کرا دیا۔

● اسی ظالم نے امام باقرؑ کو جبراً مدینہ سے شام طلب کیا اور انھیں بے حد اذیت دی اس وقت امام صادقؑ بھی آپ کے ہم سفر تھے اور راستہ میں مرد راہب سے ملاقات کر کے اپنے کمالات کی بنیاد پر اسے مسلمان بنا لیا تھا۔

● اسی ہشام نے جناب زید کو کنیز زادہ کہہ کر طنز کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ جناب اسماعیل جو خود پیغمبر خدا تھے اور سرکار دو عالمؐ کے جد بزرگوار تھے وہ بھی تو جناب ابراہیم کی کنیز جناب ہاجرہ کے بطن سے تھے تو کیا ان کا مرتبہ کچھ کم ہوگیا یا وہ نبوت کے لائق نہیں رہ گئے۔

● منصور دوانیقی۔ بنی عباس کا دوسرا حکمراں تھا جس کی تدبیر اور تنظیم مملکت کے چرچے بہت ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جملہ مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ شخص انتہائی سفاک اور قاتل تھا اور یہی اس کا کمال تدبیر ہے کہ شبہات پر قتل کر دیا کرتا تھا یہاں تک کہ بنی ہاشم اور علویین کا کیا ذکر ہے۔ امام مالک کو صرف اس جرم میں کوڑے لگوا دیے کہ انھوں نے کسی وقت سادات کی حمایت کر دی تھی اور امام ابوحنیفہ کو جناب زید کی بیعت کی بنا پر قید کرا دیا اور آخر میں ۱۵۰ھ میں زہر دلوا دیا۔ سادات کو قتل کر دینا، دیواروں میں زندہ چنوا دینا، تعمیرات میں ان کے خون کا گارا استعمال کرنا تو منصور کے روزمرہ میں شامل تھا۔ اس ظالم کے ظلم کی انتہا تھی کہ سادات قیدخانہ میں مر جاتے تھے تو ان کی لاش بھی باہر نہ نکلواتا تھا اور اس طرح قیدخانہ کی فضا اور مکدر ہو جاتی تھی اور زندگی مزید دوبھر ہو جاتی تھی۔ لیکن سادات کرام نے ان حالات میں بھی زندگی گذاری اور تلاوت قرآن کے ذریعہ اوقات نماز کا تعین کر کے عبادت الٰہی میں زندگی بسر کرتے رہے۔

امام حسنؑ کی اولاد کا وجود منصور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا چنانچہ جناب عبداللہ محض کے احتجاج کی بنا پر پہلے انھیں قید کر لیا۔ اس کے بعد ان کے دونوں فرزندوں کو قتل کرا دیا۔ جب نفس زکیہ نے منصور کے مظالم کو ناقابلِ برداشت قرار دے کر کوفہ میں قیام کیا اور ابراہیم نے مصر میں احتجاج کا پرچم بلند کیا تو ابتدا میں بعض لوگوں نے ساتھ بھی دیا اور ایک فوج بھی تیار ہوگئی لیکن آخر میں مقابلہ کی سختی میں فوج کام نہ آسکی اور دونوں اپنے لشکر کے درمیان قتل کر دیے گئے۔ سادات کرام کے حوصلے اس کے بعد بھی بلند رہے چنانچہ جناب عبداللہ محض

جنھوں نے صحرائیوں کی زندگی اختیار کرلی تھی اور ایک موقع پر اپنے بیٹوں سے ملاقات کر کے انھیں وصیت کی تھی کہ ذلّت کی زندگی سے عزّت کی موت بہتر ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر ان حضرات نے قیام کیا تھا۔ جب جناب عبداللہ محض کے سامنے ان کے فرزند محمد نفس زکیہ کا سر رکھا گیا اور انھوں نے نماز تمام کر کے اپنے فرزند کے سر کو دیکھا تو فرمایا شاباش! تو نے خدائی عہد کو پورا کیا اور تیری تلوار نے تجھے دنیا کی ذلّت سے بچالیا اور تیرے تقویٰ نے تجھے آخرت کے عذاب سے محفوظ کرلیا۔ اور یہ کہہ کر سر لانے والے سے فرمایا کہ منصور سے کہہ دینا کہ ہمارا کام تمام ہوچکا ہے۔ اب اس کے بعد تیری باری ہے اور انصاف بہرحال خدا کی بارگاہ میں ہوگا۔ اس کے بعد ایک ایسی سانس لی کر دم نکل گیا اور اپنے بچوں کی قربانی پیش کر کے ان کے ہمراہ بارگاہ احدیت میں حاضر ہو گئے۔

● منصور کے وہ مظالم جن کی بنا پر ان حضرات نے قیام کو ضروری قرار دے لیا تھا۔ ان کا ایک معمولی منظر یہ تھا کہ اس نے مدینہ سے تقریباً ۷۰ حسنی سادات کو گرفتار کرایا اور ان کے گلے میں طوق اور پاؤں میں دُوہری زنجیریں ڈال کر انھیں مدینہ سے باہر نکالا جس کی خبر پا کر امام صادقؑ اس مقام تک آئے اور اس منظر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ زار و قطار رونے لگے اور فرمایا کہ اب حرم خدا و رسولؐ کی حرمت بھی محفوظ نہیں رہ سکتی اور اس کے بعد ۲۰ دن تک بخار میں مبتلا رہے۔ آپ نے یہ بھی چاہا کہ اپنے چچا حضرت عبداللہ محض کے پاس جا کر انھیں اس حادثہ کی تعزیت پیش کریں لیکن ظالموں نے نہ جانے دیا اور اس طرح ایک دوسرے کے غم میں شرکت بھی نہ کرسکے۔

ظاہر ہے کہ ایسے ظالم اور جلّاد بادشاہ کی نگاہ میں جب سادات حسنی کے عام افراد کی زندگی ناقابل برداشت تھی تو امام جعفر صادقؑ تو بہرحال امام اور مجسمہ کمالات تھے اور ان کی شخصیت قوم کی نگاہ میں بے حد معزز اور محترم تھی۔ ان کا وجود منصور کی نگاہ میں کس طرح قابل برداشت ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بار بار آپ کو زہر دینے کی کوشش کی اور متعدد بار دربار میں اس قصد سے طلب کیا کہ آپ کی تذلیل کی جائے اور آخر کار قتل کر دیا جائے لیکن جب تک مصلحت الٰہی حیات سے وابستہ ہے کوئی کسی کی زندگی کا خاتمہ نہیں کرسکتا ہے اور جسے خدا عزّت دینا چاہتا ہے اسے کوئی ذلیل نہیں کرسکتا ہے۔

منصور نے ایک مرتبہ بغرض تذلیل طلب کیا تو دربار میں ایک مکھی بار بار منصور کی ناک پر

بیٹھ جاتی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر سوال کیا کہ آخر خدا نے اسے کیوں پیدا کر دیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دنیا کے ظالم و جابر بادشاہوں کو ذلیل کرنے کے لیے تاکہ انھیں اپنی اوقات کا اندازہ ہوجائے اور یہ سمجھ لیں کہ ایسی ناتوانی اور بے کسی کے باوجود سارے عالم پر کس طرح ظلم و ستم کر رہے ہیں۔

دوسری مرتبہ حضرت کو طلب کیا تو کثیر تعداد میں جادوگر اکٹھا کرلیے جن کا مقصد یہ تھا کہ اپنے جادو سے امامؑ کی توہین و تذلیل کریں لیکن قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ آپ نے شیر قالین کی طرف اشارہ کر دیا اور اس نے مجسم ہو کر تمام جادوگروں کو نگل لیا جس کے بعد منصور نے آپ سے جادوگروں کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر موسیٰؑ کے عصا نے جادوگروں کو واپس کر دیا ہوتا تو میں بھی واپس کر دیتا لیکن اب نہیں ہوسکتا ہے۔ (دمعہ ساکبہ)

گویا یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ ہم وارث موسیٰ ہیں اور تو وارثِ فرعون۔ تو جو کل موسیٰ سے مقابلہ کرنے والوں کا حشر ہوا تھا وہ آج کے جادوگروں کا ہوا ہے، اور جو کل کے فرعون کا انجام ہوا تھا وہ عنقریب تیرا انجام ہونے والا ہے۔

● بعض اوقات تو منصور نے یہاں تک طے کیا کہ آپ کے گھر میں آگ لگا دی جائے تاکہ تمام افراد خانہ گھر کے اندر جل کر مر جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور گھر میں آگ لگ گئی۔ اصحاب نے بجھانے کی پوری کوشش کی لیکن حضرت نے کوئی توجہ نہ کی اور آخر میں آگ سے خطاب کر کے فرمایا کیا تجھے نہیں معلوم ہے کہ انا ابن ابراھیم الخلیل (میں ابراہیم خلیل کا فرزند ہوں)۔ تیری کیا مجال ہے کہ مجھے یا میرے گھر والوں کو جلا سکے۔ چنانچہ آگ تھم گئی اور آپ نے دامن قبا کی ہوا دے کر اسے گلزار بنا دیا۔ (تذکرۃ المعصومین)

● منصور نے ایک مرتبہ سو جاہل اور گنوار افراد کو دربار میں اکٹھا کیا کہ حضرت صادقؑ کے آتے ہی ان پر حملہ کر دیں اور ان کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن قدرت کا انتظام کہ جب حضرت تشریف لائے تو سب تلواریں پھینک کر قدموں پر گر پڑے اور منصور نے خطرہ کا احساس کر کے آپ کو راتوں رات وطن واپس کر دیا اور پھر زہر دلوا دیا۔ (دمعہ ساکبہ)

ایک مرتبہ منصور نے حضرت سے یہ تقاضا کیا کہ آپ مجھ سے خوف زدہ کیوں نہیں ہوتے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہ میرے پاس دنیا ہے جس کا خوف ہو اور نہ تیرے پاس آخرت ہے جس کی امید ہو۔

اس نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہیں اور نصیحت کرتے رہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جسے آخرت عزیز ہوگی وہ تیرے ساتھ نہ رہے گا اور جسے دنیا عزیز ہوگی وہ تجھے نصیحت نہ کرے گا۔ (حیاۃ الامام موسیٰ کاظمؑ)

● منصور کے بار بار دربار میں طلب کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ امام قوم کے سامنے آتے رہے اور لوگ ان کے حالات اور کمالات سے باخبر ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے حضرت کو ایک ہندی طبیب کی موجودگی میں طلب کیا اور اس نے رعب جمانے کے لیے تقریر شروع کردی۔ آپ نے فرمایا کہ میں طب تجھ سے بہتر جانتا ہوں مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کر۔ اس نے کہا کہ آپ کیا جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ طب کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ مرض کا علاج اس کی ضد سے کرو۔ گرمی کا علاج سرد چیزوں سے اور سردی کا علاج گرم چیزوں سے۔ اس کے بعد امراض کا مرکز معدہ ہے لہٰذا پہلے اس کی اصلاح کرو اس کے بعد کسی علاج کی فکر کرو، اور تیسری بات یہ ہے کہ بہترین علاج پرہیز ہے۔

طبیب ہندی نے آپ کی بات کی تائید کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ علم کتاب نہیں ہے، یہ عطائے پروردگار ہے۔ اس کے بعد آپ نے طبیب سے حسب ذیل سوالات کیے:

(۱) آنسوؤں اور رطوبتوں کی جگہ سر میں کیوں ہے؟ (۲) بال سر پر کیوں ہیں؟ (۳) پیشانی پر بال کیوں نہیں ہیں؟ (۴) پیشانی پر شکن کیوں ہے؟ (۵) دونوں پلکیں آنکھوں کے اوپر کیوں ہیں؟ (۶) ناک دونوں آنکھوں کے درمیان کیوں ہے؟ (۷) آنکھیں بادامی شکل کی کیوں ہیں؟ (۸) ناک کا سوراخ نیچے کی طرف کیوں ہے؟ (۹) منہ پر دو ہونٹ کیوں بنائے گئے ہیں؟ (۱۰) سامنے کے دانت تیز اور داڑھ چوڑی کیوں ہے اور ان دونوں کے بیچ میں لمبے دانت کیوں ہیں؟ (۱۱) دونوں ہتھیلیاں بالوں سے خالی کیوں ہیں؟ (۱۲) مردوں کے داڑھی کیوں ہوتی ہے؟ (۱۳) ناخن اور بال میں جان کیوں نہیں ہوتی ہے؟ (۱۴) دل صنوبری شکل کا کیوں ہے؟ (۱۵) پھیپھڑے کے دو حصے کیوں ہوئے اور وہ اپنی جگہ کیوں حرکت کرتا ہے؟ (۱۶) جگر کی شکل محدب کیوں ہے؟ (۱۷) گردے کی شکل لوبیے کے دانے کی طرح کیوں ہے؟ (۱۸) گھٹنے آگے کو کیوں جھکتے ہیں پیچھے کو کیوں نہیں جھکتے؟ (۱۹) دونوں پاؤں کے تلوے بیچ سے خالی کیوں ہیں؟

طبیب ہندی ان سوالات کو سن کر مدہوش ہوگیا کہ ان کا تعلق فن طب سے نہیں ہے بلکہ

اسرار خلقت اور رموز کائنات سے ہے اور رموز کائنات کو نمائندہ خالق کائنات کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے امامؑ سے ان سوالات کے جوابات کا تقاضا کردیا۔ اور آپ نے بالترتیب اس طرح جوابات بیان فرمائے:

(۱) سر آنسوؤں اور رطوبتوں کا مرکز نہ ہوتا تو گرمی کی شدت سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔

(۲) بال سر پر نہ ہوتے تو تیل وغیرہ جڑوں تک نہ پہونچ سکتا اور دماغ سردی اور گرمی سے محفوظ نہ ہوسکتا۔ (۳) پیشانی بالوں سے اس لیے خالی ہے کہ اس جگہ سے آنکھوں تک نور پہونچتا ہے۔ (۴) پیشانی پر شکنیں اس لیے ہیں تاکہ آنکھیں پسینہ وغیرہ سے محفوظ رہیں۔ (۵) پلکیں اس لیے بنائی گئی ہیں تاکہ تمازت آفتاب بقدر ضرورت اثر کرسکے اور سونے میں بھی سہولت ہو۔

(۶) ناک دونوں آنکھوں کے درمیان اس لیے ہے تاکہ نور دو حصوں میں تقسیم ہوکر آنکھوں تک پہونچے۔ (۷) آنکھیں بادامی شکل کی اس لیے ہیں کہ سرمہ وغیرہ کا استعمال آسانی سے ہوسکے۔

(۸) ناک کا سوراخ نیچے کی طرف اس لیے ہے تاکہ رطوبتیں آسانی سے خارج ہوجائیں۔ (۹) ہونٹ اس لیے بنائے گئے ہیں کہ اوپر سے آنے والی رطوبتیں دہن کے اندر نہ جانے پائیں اور منھ میں غذا رک سکے۔ (۱۰) ڈاڑھی مردوں کو اس لیے دی گئی تاکہ مرد اور عورت میں امتیاز قائم ہوسکے۔ (۱۱) اگلے دانت اس لیے تیز ہیں تاکہ چیز کا کاٹنا آسان ہو، اور ڈاڑھ اس لیے چوڑی ہے تاکہ غذا کا پینا آسان ہو، اور دونوں کے درمیان کے دانت اس لیے لمبے ہیں کہ دونوں کو سنبھال کر رکھیں۔ (۱۲) ہتھیلیوں پر بال اس لیے نہیں ہیں تاکہ چھونے میں اور سختی اور نرمی کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو۔ (۱۳) بال اور ناخن میں جان اس لیے نہیں ہے کہ انھیں بار بار کاٹنا پڑتا ہے۔

(۱۴) دل صنوبری شکل کا اس لیے ہے کہ پھیپھڑے میں بآسانی داخل ہوسکے اور اس کی ہوا سے ٹھنڈک پاتا رہے۔ (۱۵) پھیپھڑے کے دو حصے اس لیے ہیں تاکہ دل ان کے درمیان رہے۔

(۱۶) جگر محدب اس لیے ہے تاکہ باقاعدہ معدے کے اوپر رہے اور اپنی گرانی اور گرمی سے غذا کو ہضم کرتا رہے۔ (۱۷) گردہ لوبیے کی شکل کا اس لیے ہے کہ منی پشت کی جانب سے اس میں آتی ہے اور اس کے پھیلنے اور سکڑنے سے آہستہ آہستہ نکلتی ہے۔ (۱۸) گھٹنے پیچھے کی طرف اس لیے نہیں جھکتے ہیں کہ چلنے میں آسانی ہو ورنہ آدمی چلتے وقت گر پڑتا۔ (۱۹) دونوں پیروں

کے تلوے اس لیے خالی ہیں تاکہ دونوں کناروں پر بوجھ پڑنے سے پیر آسانی سے اُٹھ سکیں، ورنہ سارے بدن کا بوجھ اُٹھانا مشکل ہو جاتا۔

طبیب ہندی نے ان جوابات کو سُننے کے بعد حیرت سے پوچھا کہ آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے جد بزرگوار سے، اور انھوں نے رسول اکرمؐ سے لیا ہے اور انھوں نے رب العالمین سے حاصل کیا ہے۔

یہ سُننا تھا کہ اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور اسلام قبول کرنے کے بعد کہا کہ بے شک آپ تمام اہل زمانہ سے زیادہ علم کے مالک ہیں۔

اخلاق امامؑ

آپ کے اخلاق کریمانہ کا ایک نمونہ یہ ہے کہ آپ نے ایک غلام کو کسی کام کے لیے بھیجا۔ جب واپسی میں تاخیر ہوئی تو اس کی تلاش میں نکلے۔ دیکھا ایک مقام پر سو رہا ہے۔ آپ نے جگانے کے بجائے اس کے سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھُل گئی تو بے حد پشیمان اور پریشان ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ دن کام کرنے کے لیے اور رات سونے کے لیے ہے۔ آئندہ اس کا خیال رکھنا۔ (مناقب)

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ جب غلاموں نے قحط کے آثار دیکھ کر غلہ جمع کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ غلہ فروخت کر دیا جائے اور جس طرح سب زندگی گذاریں اسی طرح زندگی گزاری جائے، اور اس کے بعد فرمایا کہ جَو اور گندم ملا کر روٹی پکائی جائے تاکہ دوسرے افراد کے درد و غم میں شرکت کرنے کا موقع ملے۔

باغ میں غلاموں کے ساتھ خود بھی کام کرتے تھے اور جب کسی نے منع کیا تو فرمایا کہ طلب معاش میں زحمت برداشت کرنا عیب نہیں ہے باعث اجر و ثواب ہے۔

دلائلِ امامتؑ

اعترافات

حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے افضل اور اکمل ہونے کی بنا پر اپنے پدر بزرگوار کے جانشین قرار پائے ــــ (ابن حجر مکی)

آپ سادات اہلبیتؑ میں تھے اور آپ کی فضیلت کسی بیان کی محتاج نہیں ہے۔ (ابن خلکان)

آپ اپنے آبا و اجداد کی طرح معصوم اور محفوظ تھے ــــ (سید علی ہمدانی)

آپ نے ابتدا سے انتہا تک کوئی گناہ نہیں کیا ہے اور اسی لیے آپ کو معصوم کہا جاتا ہے۔ ــــــ (دراسات اللبیب)

آپ اہلبیتؑ کی عظیم ترین فرد تھے اور مختلف علوم کے مکمل ماہر تھے۔ قرآنی مطالب کا سرچشمہ تھے اور بحرِ علم اور مظہر عجائب تھے ــــ (ابن طلحہ شافعی)

آپ بارہ اماموں میں بڑے ثقہ، فقیہ اور حافظ تھے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے شیخ حدیث ہیں ــــ (علامہ وحید الزماں حیدر آبادی)

آپ سے یحییٰ بن سعید، ابن جریج، امام مالک، امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابوحنیفہ، ایوب جیسے ائمہ حدیث نے حدیث اخذ کی ہے ــــ (علامہ شبلنجی)

ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادق علیہ السلام کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے، جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابوحنیفہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے معاصر اور ہم عصر تھے اس لیے

ان کی شاگردی کیوں کر اختیار کرتے لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادقؑ سے کیا نسبت۔ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھروں سے نکلے ہیں اور صاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔

(علامہ شبلی سیرۃ النعمان)

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں آئندہ اور گزشتہ کا علم اور الہام کی صلاحیت اور ملائکہ کی باتیں سُننے کی طاقت دی گئی ہے۔ (شواہد النبوۃ جامی)

استاد اعظم جابر بن حیان بن عبداللہ کوفہ میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر میں طبیعیات کی تعلیم اچھی طرح حاصل کر لی اور امام جعفر صادقؑ ابن امام محمد باقرؑ کے فیض صحبت سے خود امام ہو گیا۔

(انسائیکلو پیڈیا آف اسلامک ہسٹری)

حضرت امام جعفر صادقؑ کے مقالات علم کیمیا اور علم جفر و فال میں موجود ہیں اور آپ کے شاگرد تھے جابر بن حیان صوفی طرسوسی جنھوں نے ہزار ورق کی ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں حضرت امام جعفر صادقؑ کے پانچ سو رسالوں کو جمع کیا تھا۔ (وفیات الاعیان ابن خلکان)

جابر بن حیان نے امام جعفر صادقؑ کے پانچ سو رسائل کو جمع کر کے ایک کتاب ہزار صفحہ کی تالیف کی تھی۔ (دائرۃ المعارف القرآن الرابع عشر علامہ فرید وجدی)

○ مختصر یہ ہے کہ تمام ائمہ طاہرینؑ کے اصحاب کی مجموعی تعداد تقریباً ساڑھے چار ہزار ہے جس میں سے چار ہزار صرف امام صادقؑ کے اصحاب ہیں جن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے اور اس طرح اصحاب ائمہؑ میں مصنفین کی تعداد تقریباً تیرہ سو ہے جن میں سے اکثریت امام صادقؑ کے اصحاب کی ہے۔ آپ کے چار سو اصحاب نے چار سو اصول تیار کیے تھے جن کو بعد میں جوامع حدیث میں یکجا کر دیا گیا اور پھر ایک ایک صحابی نے متعدد کتابیں تالیف کی ہیں۔ مثال کے طور پر فضل بن شاذان نے ۱۸۰ کتابیں تالیف کی ہیں اور یہ صدر اسلام کے قریب کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو اصحاب ائمہ نے جمع کیا ہے اور جس کی مثال کسی فرقہ یا مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

○ مصنفین کے علاوہ حافظین احادیث میں جناب جابر جعفی ۷۰ ہزار احادیث کے حافظ تھے۔ ابان بن تغلب کوفی کو ۳۰ ہزار حدیثیں حفظ تھیں، اور اسی طرح دیگر اصحاب کا عالم تھا جن کے بارے

میں امام صادقؑ نے فرمایا تھا کہ یہ چار افراد نہ ہوتے تو میرے باپ کی فقہ ختم ہو جاتی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ قریب والوں سے زیادہ استفادہ دور والوں نے کیا اور جس طرح رسول اکرمؐ کی صحبت میں فارس سے آنے والا سلمان تمام اصحاب پر سبقت لے گیا۔ اسی طرح امام صادقؑ کے اصحاب میں زرارہ بن اعین کی حیثیت ہے۔ جن کے دادا بلاد روم کے ایک مقدس راہب تھے اور انھوں نے امام کی خدمت میں آکر بے پناہ عظمت حاصل کر لی اور مختلف کتابوں کے مصنف بھی قرار پا گئے۔

یہ بات بھی انتہائی افسوسناک ہے کہ ان تمام فضائل و کمالات اور معلومات و اعترافات کے باوجود امام بخاری نے آپ کی حدیثوں کو اپنی کتاب بخاری میں جگہ نہیں دی جب کہ اس میں مروان اور عمران بن حطان خارجی جیسے افراد کی روایتیں موجود ہیں اور انھیں ثقہ کا درجہ دیا گیا ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ یحییٰ بن سعید قطان نے یہاں تک گستاخی کر دی ہے کہ میرے دل میں امام جعفر صادقؑ کی طرف سے کچھ شبہ ہے اور میری نظر میں مجالد ان سے زیادہ محبوب ہے جب کہ بقول علامہ وحید الزماں "امام صادقؑ کے مقابلہ میں مجالد کی کیا حیثیت ہے اور ان کو امامؑ سے کیا نسبت ہے۔ درحقیقت ایسے ہی گستاخانہ بیانات سے اہلسنت بدنام ہوتے ہیں کہ ان کو ائمہ اہلبیتؑ سے کچھ محبت اور عقیدت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ امام بخاری پر رحم کرے کہ مروان اور عمران بن حطان اور کسی خوارج سے تو انھوں نے روایت کی ہے اور امام جعفر صادقؑ سے جو ابن عم رسول اللہ ہیں ان کی روایت میں شبہ کرتے ہیں۔" (انوار اللغۃ طبع حیدر آباد دکن)

● ابوحنیفہ، محمد بن الحسن آپ کے شاگرد، ابویزید طیفور آپ کے سقاء اور ابراہیم بن ادہم اور مالک بن دینار جیسے افراد آپ کے غلام تھے۔

کرامات

آپ کے کرامات دو طرح کے ہیں۔ بعض کا تعلق علم و معرفت سے ہے جن کا ظہور مناظروں اور مباحثوں کی شکل میں ہوا ہے اور بعض کا تعلق عملی دنیا اور ظہور عجائب و غرائب سے ہے جنھیں عرف عام میں معجزہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امامؑ کی زندگی میں دونوں طرح کے

کرامات بے مثل و بے نظیر ہیں جن کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر علمی اعتبار سے۔

● عبدالملک بن مروان کے دربار میں ایک قدری عالم آیا جس کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہے اور خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس نے اپنے دعویٰ پر ایسے دلائل پیش کیے کہ تمام اہل علم عاجز رہ گئے۔ آخر میں عبدالملک نے مدینہ سے امام باقرؑ کو طلب کیا۔ آپ نے امام صادقؑ کو بھیج دیا۔ عبدالملک نے اعتراض کیا کہ یہ ان کے بس کا کام نہیں ہے۔ آپ نے اُس شخص سے خطاب کر کے فرمایا کہ تجھے سورۂ حمد یاد ہے۔ اس نے تلاوت شروع کر دی۔ جب ایاك نعبد وایاك نستعین پر پہونچا تو آپ نے فرمایا کہ اگر خدا کے اختیار میں کچھ نہیں ہے تو اس سے مدد مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سننا تھا کہ وہ قدری مدہوش ہو گیا اور مجلس مناظرہ برخاست ہو گئی۔ (تفسیر برہان)

● ابو شاکر دیصانی نے آپ سے وجود خدا پر دلیل طلب کی تو آپ نے ایک انڈے کا حوالہ دیا کہ یہ ایک بند قلعہ ہے جس کے اندر دو متضاد قسم کی چیزیں ہیں لیکن ایک دوسرے کو متاثر نہیں کرتی ہیں اور پھر کسی کے داخلہ کے بغیر اس کے اندر سے بچے بھی نکل آتے ہیں تو اگر کوئی خدا نہیں ہے تو ان بچوں کا خالق کون ہے اور انڈے کی اس حیثیت کا محافظ کون ہے۔ (اصول کافی)

● ابو حنیفہ نے اپنے کمال علم کا اظہار کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ آنکھ میں نمک، کان میں تلخی، ناک میں رطوبت اور لبوں میں شیرینی کیوں ہے؟

پھر وہ کون سا کلام ہے جس کی ابتدا کفر ہے اور انتہا اسلام؟

پھر عورت کے یہاں حیض اور حمل جمع کیوں نہیں ہوتے ہیں؟

ابو حنیفہ نے اپنی عاجزی کا اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا کہ آنکھ میں نمکینی نہ ہوتی تو حدقۂ چشم بہہ جاتا۔ کان میں تلخی نہ ہوتی تو کیڑے مکوڑے داخل ہو جاتے اور ناک میں رطوبت نہ ہوتی تو سانس کی آمد و رفت مشکل ہو جاتی اور خوشبو اور بدبو کا احساس نہ ہو سکتا، لبوں میں شیرینی نہ ہوتی تو کسی شے کے ذائقہ کا احساس نہ ہوتا۔

وہ کلام جس کی ابتدا کفر ہے اور انتہا اسلام ہے وہ کلمۂ توحید ہے کہ اس میں لا الٰہ کفر ہے اور الا اللہ اسلام۔

عورت کے یہاں حیض و حمل کا اجتماع اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ خون کا رخ بچہ کی طرف پھیر دیا جاتا ہے اور اسی سے اس کی غذا فراہم کی جاتی ہے۔

عملی کرامات

آپ کے اظہار عجائب و غرائب سے متعلق کرامات کی چند مثالیں یہ ہیں:

● ایک شخص نے آپ سے بیان کیا کہ حکیم ابن عیاش کلبی آپ کی ہجو کرتا ہے اور اس نے اپنے اشعار میں زید شہید کو بُرا بھلا کہا ہے اور عثمان کو حضرت علیؑ سے بہتر قرار دیا ہے۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ خدایا! اس پر کسی جانور کو مسلط کر دے۔ چنانچہ ایک شیر نے اس کا خاتمہ کر دیا اور حضرت نے خبر پاتے ہی سجدۂ شکر ادا کیا کہ خدا نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا۔ (شواہد النبوۃ)

● ابو بصیر حمام کی طرف غسل کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک جماعت کو دیکھا جو حضرت کی زیارت کے لیے جا رہی تھی۔ سوچا کہ پہلے زیارت کر لیں اس کے بعد غسل کریں گے۔ جیسے ہی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا کہ نبی اور امام کے گھر میں ایسی حالت میں نہیں جانا چاہیے (غسل مقدم ہے جو آداب زیارت میں بھی شامل ہے)۔

● یونس بن ظبیان سے آپ نے فرمایا کہ زمین و آسمان کے خزانے ہمارے اختیار میں ہیں اور یہ کہہ کر ایک ٹھوکر ماری اور زمین سے ایک ڈبہ سونے سے بھرا ہوا نکال دیا۔ یونس نے کہا کہ حضور ان اختیارات کے باوجود چاہنے والے پریشان رہتے ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے یہ دنیا نہیں ہے جنت ہے۔

● ۱۱۳ھ میں آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو دیکھنے والے نے دیکھا کہ آپ کوہ ابو قبیس پر بیٹھے ہوئے بارگاہ احدیت میں محو مناجات ہیں یا حی یا حی، یا رحیم یا رحیم، یا ارحم الراحمین یا ارحم الراحمین۔ اور یہ سب کہنے کے بعد عرض مدعا کیا کہ خدایا! مجھے غذا کے لیے انگور چاہیے اور لباس کے لیے ایک چادر درکار ہے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک انگور کی ٹوکری اور ایک چادر کا نزول ہوا تو میں نے کہا کہ میں نے آپ کی دعا پر آمین کہی تھی لہٰذا میرا بھی حق ہے تو آپ نے مجھے بھی شامل کر لیا۔ اور خدا گواہ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسے

انگور نہ دیکھے تھے۔ چادر کے لیے میں نے عرض کی کہ مجھے ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے بعد جب مقام سعی کی طرف بڑھے تو ایک سائل نے چادر کا سوال کر لیا اور آپ نے اسے بھی دے دیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون صاحب کرامت بزرگ ہیں؟ — تو اس نے کہا یہ حضرت جعفرؑ بن محمدؐ الصادقؑ ہیں۔ (کشف الغمہ۔ مطالب السؤول)

● ایک شخص نے آپ سے معجزہ جناب ابراہیم کے بارے میں سوال کیا کہ انھوں نے کن طیور کو ذبح کر کے زندہ کیا تھا تو آپ نے طاؤس، غراب، باز اور کبوتر کو آواز دی اور جب سب اکٹھا ہو گئے تو انھیں ذبح کر دیا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے اجزاء کو منتشر کر دیا اور پھر آواز دی تو سارے ٹکڑے یکجا ہو گئے اور آپ نے واضح کر دیا کہ ہم ابراہیم خلیلؑ کے وارث ہیں۔ رب العالمین نے ہمیں بھی اسی کمال سے سرفراز فرمایا ہے۔ (شواہد النبوۃ)

● ایک شخص نے حج میں جاتے ہوئے حضرت کو دس ہزار درہم دیے کہ میری واپسی تک میرے لیے ایک مکان کا بندوبست کر دیجیے گا۔ آپ نے واپسی پر اسے بتایا کہ میں نے جنت میں انتظام کر دیا ہے اور حدود اربعہ لکھ کر دے دیے۔ اس نے اس پرچہ کو قبر میں رکھنے کی وصیت کر دی مرنے کے بعد دوسرے دن قبر پر وہی پرچہ دیکھا گیا جس میں دوسری طرف لکھا تھا کہ حضرت جعفرؑ بن محمدؐ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

شہادت

یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ آپ کی شہادت زہر دغا سے ہوئی ہے اور آپ کو منصور دوانیقی نے زہر دلوایا ہے جس کی کوشش متعدد بار کی گئی۔ لیکن جب وقت آگیا تو زہر نے اپنا اثر کر دیا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگرچہ بعض مورخین نے منصور کو بری کرنے کے لیے یوں تحریر کیا ہے کہ آپ کی شہادت منصور کے زمانہ میں ہوئی ہے۔

بہر حال ماہ شوال کی ۱۵ تاریخ ۱۴۸ھ دوشنبہ کا دن تھا جب آپ اس عالم فانی سے رخصت ہوئے اور جنۃ البقیع میں سپرد خاک کیے گئے۔ عمر مبارک ۶۵ سال تھی جو دنیا سے رخصت ہو جانے والے تمام معصومین میں سب سے طویل ترین عمر ہے۔ اس کے بعد امام زمانہؑ کے علاوہ کسی کی طویل عمر

نہیں ہے۔ وہ بحکم پروردگار زندہ ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا عدل و انصاف سے معمور نہ ہو جائے۔

● آپ کے آخر وقت کا یہ واقعہ قابل توجہ ہے کہ آپ نے تمام اہل خانہ اور اعزاء و اولاد کو جمع کر کے یہ وصیت فرمائی کہ "ہم اہلبیتؑ کی شفاعت نماز کو ہلکا اور معمولی سمجھنے والے تک نہیں جا سکتی ہے"۔ جو نماز کی اہمیت، آل محمدؐ کے اہتمام بندگی، شفاعت کے واقعی مفہوم، تشیع کے مکمل تعارف اور کردار سازی کے بہترین سامان کی حیثیت رکھتی ہے۔

ازواج و اولاد

شیخ مفید علیہ الرحمہ کے بیان کے مطابق آپ کی اولاد دس تھی:

اسماعیل، عبداللہ، ام فروہ — ان تینوں کی والدہ جناب فاطمہ بنت حسینؑ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب تھیں۔

اسحاق، محمد، امام موسیٰ کاظمؑ — ان حضرات کی والدہ حمیدہ مصفاۃ تھیں جنھیں رب العالمین نے تمام عیوب سے پاک و پاکیزہ رکھا تھا۔

عباس، علی، اسماء، فاطمہ — ان سب کی والدہ الگ الگ ام ولد تھیں جنھیں ان کی والدہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

ایک وضاحت

آپ کے سب سے بڑے فرزند جناب اسماعیل تھے جو آپ کی نظر میں بے حد عزیز اور محترم تھے اور انھیں اسباب کی بنا پر بہت سے افراد کا یہ خیال تھا کہ آپ کے بعد امامت انھیں کا حصہ ہے لیکن ان کا انتقال حضرتؑ کی زندگی ہی میں ہو گیا اور آپ نے اس حادثہ پر بے حد رنج و غم کا اظہار کیا اور جنازہ کو مدینہ لا کر بقیع میں دفن کرایا۔ خود جنازہ کے ہمراہ پا برہنہ چلے اور مختلف مقامات پر جنازہ کو روک کر لوگوں کو اسماعیل کی زیارت کرائی تاکہ کسی کو ان کی وفات میں شبہ نہ رہ جائے۔ اور دفن کے بعد بھی بعض لوگوں کو رقم دی کہ اسماعیل کی طرف سے حج نیابت کریں

تاکہ یہ بھی ان کی وفات کا ایک ثبوت بن جائے۔ لیکن ان تمام تاکیدات کے باوجود عالم اسلام میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اسماعیل کی امامت کے قائل ہیں اور ان کے بعد سلسلۂ امامت کو امام موسیٰ کاظم کی طرف واپس کرنے کے بجائے اسماعیل کی اولاد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسماعیل کے انتقال کے بعد ان کے فرزند محمد امام ہوئے اور یہ سلسلہ ان کی نسل میں ابھی تک باقی ہے۔۔۔ اور بعض افراد خود جناب اسماعیل کی زندگی کے قائل ہیں۔

دیار مغرب میں جن فاطمی سلاطین کی حکومت قائم ہوئی ان کا تعلق بھی نسل اسماعیل ہی سے تھا اور ان کے پہلے بادشاہ کا نام عبیداللہ محمد بن عبداللہ بن احمد بن محمد بن اسماعیل بن الامام جعفر الصادقؑ تھا اور ان کا لقب مہدی باللہ تھا۔ ان حضرات نے بنی عباس کے دور میں ۲۷۰ سال حکومت کی ہے جس کا سلسلہ معتمد اور معتضد کے دور سے شروع ہوا تھا جو تقریباً غیبت صغریٰ کا زمانہ تھا۔ ان بادشاہوں کی تعداد چودہ ہے اور انھیں اسماعیلیہ یا عبیدیہ کہا جاتا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری کا ارشاد ہے کہ قرامطہ اسماعیلیہ کے علاوہ ایک جماعت ہے۔ بعض بنی عباس کے نمک خواروں اور ہوا خواہوں نے فاطمیین کو بدنام کرنے کے لیے قرامطہ کو بھی اسماعیلیہ میں شامل کر دیا ہے حالانکہ دونوں کا کوئی ربط نہیں ہے۔

امیر المومنینؑ نے اپنے خطبوں میں غیب کے اخبار بیان کرتے ہوئے عبیداللہ کی مغرب میں حکومت کا ذکر فرمایا تھا اور انھیں صاحب بدار کی اولاد میں قرار دیا تھا۔ صاحب بدا سے مراد جناب اسماعیل تھے جن کی امامت کے بارے میں بدار واقع ہوا تھا یعنی لوگوں کا خیال تھا کہ امامت ان کا حق ہے۔ لیکن ان کے انتقال سے امامت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی طرف منتقل ہو گئی زیر کردہ واقعتاً امام تھے اور بعد میں خدا کی رائے بدل گئی اور اس نے انھیں معزول کر کے یا موت دے کر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو امام بنا دیا۔ اس قسم کا بدار بندوں کے علوم اور اعمال میں تو ہو سکتا ہے لیکن خدا کے علم و عمل میں اس قسم کے بدار کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ امور کائنات میں بدار کی وہی حیثیت ہے جو احکام میں نسخ کی ہوتی ہے کہ جس طرح خدا احکام کو منسوخ کر دیتا ہے تو اس کا مطلب رائے کی تبدیلی یا پشیمانی نہیں

ہوتا ہے بلکہ حکم کی میعاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح جب مسائل کائنات میں بدار واقع ہوتا ہے تو اس کا مطلب حقائق کی تبدیلی نہیں ہوتا ہے بلکہ حقائق کا اظہار ہوتا ہے جن کا تصور قبل سے لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتا ہے اور لوگ اس کے خلاف کا تصور یا عقیدہ رکھتے ہیں اور بعد میں حقیقت کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اصحاب کرام

امام جعفر صادقؑ کے مدرسہ تربیت کے طلاب کی تعداد چار ہزار (۴۰۰۰) سے بھی زیادہ ہے اور اس میں بڑے بڑے ائمہ امت کے نام بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ اصحاب کہ جنھوں نے امامؑ سے باقاعدہ کسب فیض کیا ہے اور آخر دم تک جادۂ حق پر قائم رہے ہیں ان کی تعداد اس سے یقیناً کم ہے۔ اگرچہ یہ تعداد بھی بہت بڑی ہے اور اس میں بعض نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان قابل ذکر افراد میں بھی بعض وہ افراد ہیں جن کا شمار امام محمد باقرؑ کے اصحاب میں بھی ہوتا ہے، بلکہ وہ انھیں کے اصحاب میں شمار کیے جاتے ہیں اور بعض کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ امام صادقؑ کے اصحاب میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف دوسری قسم کے چند نمائندہ اسماء گرامی کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ ابان بن تغلب

کوفہ کے رہنے والے تھے۔ قبیلہ بکر بن وائل سے تعلق رکھتے تھے اور انتہائی ثقہ قسم کے انسان تھے جو علم قرأت میں ان کا اپنا ایک مقام تھا اور ان کی اپنی ایک قرأت تھی جو قرّاء کے درمیان مشہور ہے۔ انھوں نے امام سجادؑ سے بھی کسب فیض کیا ہے لیکن امام باقرؑ نے انھیں اپنے دور میں حکم دیا تھا کہ مسجد میں بیٹھ کر فتویٰ دیں کہ میں اپنے اصحاب میں ان جیسے افراد کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے امام جعفر صادقؑ سے تیس ہزار حدیثیں حفظ کی تھیں امام کی طرف سے مناظرہ کرنے پر بھی مامور تھے تاکہ احقاق حق کا سلسلہ برقرار رہے۔ ۱۴۱ھ میں وفات پائی اور امام صادقؑ نے ان کی وفات پر انتہائی حزن و الم کا اظہار فرمایا۔ روایات میں ہے کہ ابان مدینہ آجاتے تھے تو مسجد مدینہ طالبانِ علوم و روایات کے مجمع سے پُر ہو جاتی تھی اور ہر شخص ابان کی زبان سے

احادیث سننے کا مشتاق رہا کرتا تھا۔

۲۔ اسحاق بن عمار صیرفی کوفی

شیوخ احادیث میں شمار ہوتے تھے اور انتہائی درجہ کے مرد ثقہ تھے۔ ان کے بھائی یونس، یوسف، اسماعیل، قیس اور ان کے بھتیجے علی و بشیر فرزندان اسماعیل بھی سب محدثین کے درمیان نمایاں افراد میں شمار ہوتے تھے۔

ابتدائی دور کے علماء رجال انھیں فطحی المذہب کہا کرتے تھے اور ان کی روایت کو صحیح کے بجائے موثق کا درجہ دیا کرتے تھے۔ لیکن شیخ بہائیؒ نے تحقیق فرمائی ہے کہ اس نام کے دو راوی ہیں۔ اسحاق بن عمار بن حیان جو امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اور مرد معتبر تھے اور اسحاق بن عمار بن موسیٰ جو فطحی المذہب تھے لیکن موثق تھے۔ اول الذکر کا ذکر رجال نجاشی میں ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا ذکر رجال شیخ میں ہے۔ اور شیخ بہائی کی یہ تحقیق ایک مدت تک رائج رہی لیکن آخر میں علامہ طباطبائی بحرالعلومؒ نے یہ تحقیق فرمائی کہ اسحاق بن عمار صرف ایک ہی شخص کا نام ہے اور وہ امامی المذہب اور مرد معتبر تھے۔ لہذا ان کی روایت کو صحیح کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔

۳۔ بُرید بن معٰویہ العجلی الکندی

ابوالقاسم کُنیت تھی۔ وجوہ اصحاب ائمہؑ میں شمار ہوتے تھے اور امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے حوارین میں تھے۔ امام صادقؑ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ دین کے پرچم چار ہیں: محمد بن مسلم، بُرید بن معٰویہ، لیث بن البختری ابو بصیر، زرارہ بن اَعین۔ یہ حضرات نہ ہوتے تو فقہ اہلبیتؑ مٹ کر رہ جاتی۔ انھوں نے سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی اور ان کے فرزند قاسم بن بُرید بھی رواۃ اصحاب امام صادقؑ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۴۔ ابوحمزہ الثمالی

امام صادقؑ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ تمھیں دیکھ کر میرے دل کو سکون ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ان کی لڑکی گر پڑی اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو جرّاح کو علاج کے لیے لایا گیا۔ اور وہ بیٹی کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ قدرت کو اس انداز پر اس قدر رحم آگیا کہ ہاتھ خود بخود درست ہوگیا اور جرّاح شکستگی کے آثار تلاش کرتا رہ گیا۔ یہ امام سجادؑ کی خدمت میں بھی حاضر رہے اور اکثر زیارت امیرالمومنینؑ کے

لیے حاضر ہوا کرتے تھے تو فقہاء شیعہ کا مجمع لگ جاتا تھا اور لوگ ان سے علمی استفادہ کیا کرتے تھے، سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

۵۔ حریز بن عبداللہ سجستانی

اصلاً کوفہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن بغرض تجارت سجستان جایا کرتے تھے۔ اس لیے سجستانی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ ان کی کتاب الصلوٰۃ علماء کے درمیان کافی شہرت کی مالک ہے۔

۶۔ حُمران بن اعیَن شیبانی

زرارہ کے بھائی تھے۔ امام باقرؑ نے انھیں شیعہ ہونے کی سند دی تھی اور ان کی وفات پر فرمایا تھا کہ ایک مرد مومن کا انتقال ہوگیا۔ حمران نے ایک مرتبہ امام صادقؑ سے عرض کی کہ آپ کے شیعوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ایک بکری کا گوشت بھی ختم نہیں کر سکتے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ تعجّب خیز بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد امیرالمومنینؑ کے واقعی مخلصین صرف سلمان، ابوذر اور مقداد تھے اور عمار بھی ان میں شامل ہوگئے تھے۔

۷۔ زُرارہ بن اعیَن

امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے فیض بن مختار سے فرمایا تھا کہ زرارہ نہ ہوتے تو میرے پدر بزرگوار کی حدیثیں ختم ہوجاتیں۔ یونس بن عمار نے امام صادقؑ کے سامنے زرارہ کے حوالہ سے امام باقرؑ کی ایک حدیث نقل کی تو آپ نے فرمایا کہ زرارہ نے نقل کیا ہے تو یقیناً صحیح ہوگی۔ جمیل بن دُرّاج نے کہا کہ ہم لوگ زرارہ کے سامنے طفل مکتب نظر آیا کرتے تھے۔ امام صادقؑ نے فرمایا کہ تمھارا نام فہرستِ اہل جنت میں بغیر الف کے لکھا ہے تو عرض کی کہ میرا اصلی نام عبدربہ ہے۔ زرارہ تو بعد میں مشہور ہوگیا ہے۔ امام صادقؑ کے انتقال کے دو ماہ کے بعد انھوں نے بھی انتقال کیا لیکن اپنے پیچھے اولاد کا ایک سلسلہ چھوڑ گئے جو اہلِ علم و فضل اور مروجین دین و مذہب تھے۔

۸۔ صفوان بن مہران جمّال اسدی کوفی

کوفہ کے رہنے والے تھے اور اونٹوں کو کرایہ پر چلانے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا کہ تم اپنے اونٹ ہارون کو کرایہ پر دیتے ہو؟ تو عرض کی کہ فقط راہ مکہ میں اپنا

فرمایا کہ جب تک وہ واپس آجائے تم یہ آرزو رکھتے ہو کہ وہ واپس آجائے تو میرے اونٹ اور میرا کرایہ مل جائے؟ عرض کی بے شک! فرمایا کہ ظالم کی بقا کی آرزو کرنے والا بھی روزِ قیامت انھیں کے ساتھ محشور ہوگا۔ تو صفوان نے یہ سُن کر سارے اونٹ بیچ ڈالے اور ہارون کو یہ معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ اگر تمھارا اچھا سابقہ نہ ہوتا تو میں تمھیں قتل کرا دیتا۔

زیارت وارثہ، زیارت اربعین اور دعائے علقمہ کی روایت صفوان ہی سے وارد ہوئی ہے اور یہی ایک مدت تک امام صادقؑ کو مدینہ سے کوفہ لاتے رہے اور خود بھی بیس سال تک برابر قبر امیرالمومنینؑ کے قریب جاکر نماز ادا کرتے رہے۔

۹۔ عبداللہ بن ابی یعفور

امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے حواریین میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت پر مکمل ایمان واعتماد رکھتے تھے اور حضرت نے بھی بار بار ان کے حق میں دعاے رحمت کی ہے۔ امام صادقؑ کی زندگی ہی میں طاعون میں انتقال فرمایا تو حضرت نے مفضل بن عمر کے خط میں بے حد مدح و ثنا فرمائی، اور فرمایا کہ میں نے ان سے زیادہ خدا و رسولؐ و امامؑ کی اطاعت کرنے والا نہیں دیکھا ہے۔

۱۰۔ فضیل بن یسار البصری

ابوالقاسم کنیت تھی۔ جلیل القدر اصحاب امام صادقؑ میں تھے اور اصحاب اجماع میں شمار ہوتے تھے یعنی ان کی روایت کی صحت پر تمام علماء کا اجماع و اتفاق تھا اور امام صادقؑ فرمایا کرتے تھے کہ جسے اہلِ جنت کو دیکھنا ہو وہ فضیل کے چہرہ کو دیکھ لے۔

۱۱۔ فیض بن المختار الکوفی

امام باقرؑ و صادقؑ و کاظمؑ کے اصحاب اور رواۃ میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اپنے وصی کا تعارف کرائیے تو آپ اندر تشریف لے گئے اور فیض کو بھی بلا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ ہاتھ میں تازیانہ لیے ہوئے وارد ہوئے تقریباً پانچ سال کی عمر تھی۔ امام صادقؑ نے وصی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ فرزند! یہ تازیانہ کیسا ہے؟ عرض کی کہ میرا بھائی علی اس سے سب کو مار رہا تھا تو میں نے اس سے چھین لیا ہے۔ فرمایا فیض! یہ ہے میرا وصی اور جانشین۔ عرض کی مولا! کچھ اور وضاحت فرمائیں؟ فرمایا

کہ صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ رسول اکرمؐ سے وراثت میں مجھ تک پہونچے ہیں اور میں نے اس فرزند کو وارث بنا دیا ہے۔ عرض کی مولا! کچھ اور وضاحت فرمائیں؟ فرمایا کہ میرے پدر بزرگوار دعا کیا کرتے تھے تو میں آمین کہتا تھا اور میں دعا کرتا ہوں تو یہ فرزند آمین کہتا ہے۔ عرض کی مولا! مزید ارشاد فرمائیں؟ فرمایا کہ پدر بزرگوار آرام فرمانا چاہتے تھے تو میں اپنے بازوؤں کو تکیہ بنا دیا کرتا تھا اور میں آرام کرنا چاہتا ہوں تو یہ سہارا دیتا ہے لہٰذا اس کی امامت کا اقرار کرو اور اپنے مخصوص اصحاب تک اس امر کی اطلاع پہونچا دو۔ فیض نے امام موسیٰؑ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پلٹ کر یونس بن ظبیان سے اس واقعہ کو بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ میں خود امامؑ کی زبان سے اس کی تصدیق کراؤں گا۔ یہ کہہ کر درِ دولت پر حاضر ہوئے تو حضرت نے اندر سے پکار کر فرمایا کہ یونس! تحقیق مت کرو جو کچھ فیض نے بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

۱۲۔ لیث بن البختری

ابو بصیر کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا شمار بھی ان نیک کردار افراد میں ہوتا ہے جنھیں جنت کی بشارت دی گئی ہے اور جنھیں اصحاب اجماع میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کی روایات کی صحت پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

ابو بصیر کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تم علباء بن دراع الاسدی کے وقت آخر موجود تھے تو انھوں نے کیا کہا تھا! میں نے عرض کی کہ انھوں نے بتایا تھا کہ آپ نے ان کے بارے میں جنت کی ضمانت لی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سچ کہا ہے تو میں نے گریہ شروع کر دیا کہ کاش یہ شرف مجھے بھی حاصل ہو جاتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں تمھارا بھی ضامن ہوں۔ میں نے عرض کی کہ اپنے آباء و اجداد سے بھی سفارش فرما دیجئے۔ فرمایا کہ وہ بھی ضامن ہیں۔ عرض کی کہ رب العالمین سے بھی شفاعت کر دیں۔ فرمایا کہ وہ بھی ضامن ہے اور جو شخص بھی اہلبیتؑ کی محبت میں راسخ اور صاحب کردار ہوگا آل محمدؐ اس کی جنت کے ذمہ دار ہوں گے۔

۱۳۔ محمد بن علی بن نعمان کوفی

ابوجعفر کنیت تھی اور کوفہ میں طاق المحامل میں دکان رکھے ہوئے تھے اس لیے مومن طاق

کے لقب سے مشہور تھے اور دشمن ان کی حاضر جوابی سے عاجز آکر انھیں شیطان طاق کہا کرتے تھے۔ علم کلام اور مناظرہ کے ماہر تھے۔ مختلف کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ابو حنیفہ سے بارہا مناظرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ابو حنیفہ نے عقیدۂ رجعت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ مجھے پانچ سو اشرفی قرض دے دو رجعت میں لے لینا۔ ابو جعفر نے کہا کہ میں حاضر ہوں لیکن تم ضمانت لے آؤ کہ رجعت میں تم انسان ہی کی شکل میں آؤ گے ورنہ بندر کی شکل میں آگئے تو میں کس سے مطالبہ کروں گا۔

● امام صادقؑ کی وفات کے بعد ابو حنیفہ نے یہ طنز کیا کہ اب تو تمھارے امام مر چکے ہیں؟ تو ابو جعفر نے برجستہ کہا کہ تمھارا امام تو وقت معلوم تک زندہ رہے گا تمھیں کیا فکر۔

● ایک دن ابو حنیفہ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے دور سے ابو جعفر کو آتے دیکھا تو کہا کہ دیکھو شیطان آرہا ہے۔ ابو جعفر نے اس جملہ کو سُن لیا اور فوراً قرآن مجید کی آیت کی تلاوت کردی کہ "ہم نے شیاطین کو کافرین کی طرف بھیج دیا ہے تاکہ وہ ہمیشہ انھیں اذیت دیتے رہیں"۔

● کوفہ میں ایک مرد خارجی ضحاک نامی تھا، اپنے کو امیر المومنین کہا کرتا تھا اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیا کرتا تھا۔ ایک دن مومن طاق اس کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے تمھارے عدل و انصاف کی بہت تعریف سُنی ہے لہٰذا میں تمھارے اصحاب میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے موقع غنیمت جان کر خوش آمدید کہا اور اصحاب میں شامل کر لیا۔ مومن طاق نے کہا کہ آپ حضرت علیؑ کے مخالف کیوں ہیں؟ اس نے کہا کہ انھوں نے صفین میں حکم قبول کر لیا تھا اور یہ اسلام کے خلاف ہے۔ مومن طاق نے کہا کہ میں آپ سے اس موضوع پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے اپنی بات ثابت کردی تو آپ کے مرتبہ کا قائل ہو جاؤں گا لیکن بحث میں فیصلہ کون کرے گا، بغیر ثالث کے فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ ضحاک نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو حَکم بنا دیا۔ مومن طاق نے تجویز کو منظور کرتے ہوئے کہا کہ ایہا الناس! اس شخص نے حکم منظور کر لیا ہے لہٰذا یہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ لوگوں نے اسے اس قدر مارا کہ بے دم ہو گیا۔

۱۴۔ محمد بن مسلم بن رباح الطحان الثقفی الکوفی

بزرگانِ اصحابِ امام باقرؑ و صادقؑ میں تھے۔ ان کی روایات کی صحت پر علماء کا اجماع و اتفاق ہے۔ مدینہ میں چار سال قیام کر کے ۳۰ ہزار حدیثیں امام باقرؑ سے اور ۱۶ ہزار حدیثیں امام صادقؑ

سے حاصل کی تھیں۔

عبداللہ بن ابی یعفور نے امام صادقؑ سے دریافت کیا کہ اگر آپ تک رسائی ممکن نہ ہو تو احکام دین کو کس سے اخذ کیا جائے؟ فرمایا کہ محمد بن مسلم میں کیا خرابی ہے، وہ تو میرے پدر بزرگوار کے نزدیک بھی محترم تھے۔

● محمد بن مسلم کا بیان ہے کہ ایک رات ایک عورت نے میرے دروازہ پر دقّ الباب کیا اور یہ مسئلہ دریافت کیا کہ اگر عورت مر جائے اور شکم میں بچہ زندہ ہو تو کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ امام محمد باقرؑ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ شکم کو چاک کر کے بچہ کو نکال لیا جائے۔ مگر میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں تجھے میرا پتہ کس نے بتایا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مسئلہ ابو حنیفہ کے سامنے پیش آیا تھا۔ انھیں جواب نہیں معلوم تھا تو مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ دوسرے دن میں مسجد میں وارد ہوا تو دیکھا کہ ابو حنیفہ اس مسئلہ کو اپنے نام سے بیان کر رہے ہیں۔ میں نے اشارہ کیا کہ میں یہاں موجود ہوں تو گھبرا کر کہا کہ ایک لمحہ تو زندہ رہنے دو۔

● تواریخ کی بنا پر محمد بن مسلم ایک دولت مند انسان تھے۔ امام باقرؑ نے انھیں نصیحت کی کہ تواضع سے کام لیا کرو، تو سارا کاروبار چھوڑ کر کھجور بیچنے لگے۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ یہ کام آپ کے شایان شان نہیں ہے تو آٹا پیسنے کی چکی لگالی اور اسی بنا پر انھیں طحان کہا جانے لگا۔

۱۵۔ معاذ بن کثیر الکسائی الکوفی

شیوخ اصحاب امام صادقؑ میں شمار ہوتے ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی نص کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کرباس فروشی کا کام کرتے تھے۔ جب کاروبار بند کیا تو امام صادقؑ نے فرمایا کہ کاروبار کا بند کر دینا کار شیطانی ہے۔ کاروبار کے بند کر دینے سے دو تہائی عقل معطل ہو جاتی ہے۔

● ایک مرتبہ عرفات کے میدان میں بے پناہ مجمع دیکھ کر امامؑ سے عرض کی کہ امسال حجاج بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے قریب بُلا کر فرمایا کہ یہ تو مجمع ہے ورنہ اصل حاجی تم لوگ ہو، اور خدا تمھارے ہی جیسے افراد کے اعمال کو قبول کرتا ہے۔

۱۶۔ معلیٰ بن خنیس بزاز کوفی

ان کا شمار بھی اولیاء اللہ اور اہل جنت میں ہوتا ہے۔ امام صادقؑ نے اپنے گھر کے امور کا نگراں

مقرر کر دیا تھا اور آپ پر بے حد اعتماد فرماتے تھے بلکہ داؤد بن علی نے اسی محبت اور اعتماد کی بنا پر انھیں قتل کر دیا تھا۔ تو جب امام صادقؑ کو حادثہ کی اطلاع ملی تو مکہ سے تشریف لے آئے اور داؤد بن علی کے پاس جا کر فرمایا کہ تو نے اس شخص کو قتل کیا ہے جو خدا کی بارگاہ میں تجھ سے یقیناً بہتر تھا۔ تو یاد رکھنا کہ معلیٰ کی منزل جنت الفردوس ہے۔ اس نے معذرت کی کہ میں نے نہیں قتل کیا ہے بلکہ انھیں سیرافی نے قتل کیا ہے۔ تو آپ نے سیرافی سے انتقام لیا اور اسے قتل کرا دیا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے آخر شب سر سجدہ میں رکھ کر داؤد بن علی کے حق میں بد دعا کی تو تھوڑی دیر کے بعد اس کے گھر سے گریہ وزاری کی آوازیں بلند ہو گئیں اور معلوم ہوا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

۱۷۔ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی

ابو المنذر کنیت تھی۔ علم الانساب کے ماہر تھے۔ ایک عارضہ کی بنا پر حافظہ خراب ہو گیا تھا اور سب بھول گئے تھے تو امام صادقؑ سے فریاد کی آپ نے ایک جام عنایت فرمایا اور اسے پی لیا تو پورا حافظہ واپس آ گیا۔ حضرت ان سے بے حد محبت فرماتے تھے اور علم الانساب میں مشہور نساب کلبی انھیں کا نام ہے۔

۱۸۔ یونس بن ظبیان کوفی

بعض علماء رجال نے ان کے بارے میں تشکیک کی ہے لیکن محدث نوریؒ نے خاتمہ مستدرک میں ان کی وثاقت کے دلائل تحریر فرمائے ہیں اور امام صادقؑ کی طرف سے دعائے رحمت ــــ بلکہ بشارتِ جنت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے مرویات میں امام حسینؑ کی ایک زیارت، نجف اشرف میں زیارت امیرالمومنینؑ کے بعد کی دعا "اللّٰھم لابد من امرك" وغیرہ جیسی مشہور زیارتیں، اور دعائیں بھی شامل ہیں۔ فجزاھم اللّٰہ عنا وعن الاسلام خیر الجزاء۔!

اقوالِ حکیمانہ

۱۔ اے حمران بن اعین! ہمیشہ ان لوگوں پر نگاہ رکھو جو دولت اور طاقت میں تم سے کم ہوں اور انھیں مت دیکھو جو تم سے بالاتر ہوں کہ اس طرح قناعت بھی پیدا ہوتی ہے اور بارگاہِ احدیت سے اضافہ کا استحقاق بھی پیدا ہوتا ہے۔

یاد رکھو کہ یقین کے ساتھ تھوڑا عمل بھی بے یقینی کے عالم میں کثیر عمل سے بہتر ہوتا ہے۔

بہترین تقویٰ یہ ہے کہ انسان محرمات سے پرہیز کرے، مومنین کو اذیت نہ دے اور غیبت نہ کرے۔ اور بہترین زندگی یہ ہے کہ بہترین اخلاق کا مالک ہو اور نافع ترین مال کا نام قناعت ہے اور بدترین جہالت خود پسندی ہے۔

● ۲۔ حمران! اگر ممکن ہو کہ گھر سے باہر نہ نکلو ــــ کہ باہر آنے میں اپنے کو غیبت، جھوٹ، حسد، ریا، تصنع وغیرہ سے محفوظ رکھنا پڑتا ہے اور یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ بہترین صومعہ انسان کے لیے اس کا گھر ہے جہاں ہر شر سے محفوظ رہتا ہے۔

واضح رہے کہ اس حدیث کے انداز بیان ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی گئی ہے بلکہ ترک معصیت کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہر انسان یہ جانتا ہے کہ گھر میں بیٹھنا ممکن نہیں ہے اور ہزاروں دینی اور دنیاوی ضروریات کے لیے بہرحال باہر آنا پڑتا ہے لہٰذا اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے کہ جب لوگوں سے ملاقات کرے تو ان گناہوں میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

● ۳۔ جب بلاؤں پر بلاؤں کا اضافہ ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلاؤں سے عافیت نصیب ہو گئی۔ یہ قرآن کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے کہ "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" (ہر تنگی کے ساتھ سہولت بھی ہے اور کوئی شے بھی جب اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو اس کی ضد کا آغاز ہو جاتا ہے۔

● ۴۔ جب دنیا کسی شخص کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو دوسرے کی خوبیاں بھی اسی کے حساب میں لکھ دیتی ہے اور جب منھ پھیر لیتی ہے تو اس کی خوبیاں بھی دوسروں کے حساب میں ڈال دیتی ہے۔ (دنیا کی بے اعتباری اور بے اعتمادی کی اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی ہے جس کا نقشہ صبح و شام دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔)

● ۵۔ ایک شخص کو وصیت فرمائی کہ اپنا زادِ آخرت خود مہیا کرو۔ اپنا سامان پہلے سے خود روانہ کرو اور اپنے وصی خود بنو۔ خبردار! اپنے ضروریات کے بارے میں دوسروں پر یہ اعتماد مت کرنا کہ وہ مرنے کے بعد روانہ کر دیں گے۔

● ۶۔ عبداللہ بن جندب کو نصیحت فرمائی کہ "بہترین زندگی کے لیے ضروری ہے کہ رات میں سونا کم کرو اور دن میں باتیں کم کرو۔" (رات میں کم سونے کا فائدہ اعمال آخرت کی شکل میں

ظاہر ہوتا ہے اور دن میں کم بات کرنے کا فائدہ محنت و مشقت اور کسب معاش کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔

● ۷۔ احتیاط میں سلامتی ہے اور جلدبازی میں شرمندگی۔ ناوقت کام شروع کرنے والا نتیجہ بھی ناوقت ہی حاصل کرتا ہے۔

ہم اہلبیتؑ ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو عاقل، بافہم، فقیہ، حلیم، خوش اخلاق، صابر، صادق اور باوفا ہوتے ہیں کہ یہ سب صفات انبیاء و مرسلین کے ہیں، اور جس کے پاس یہ صفات ہوں اسے شکر خدا کرنا چاہیے اور جو ان صفات سے محروم ہو اُسے رو رو کر دعا کرنا چاہیے کہ رب العالمین ان صفات سے آراستہ بنا دے۔

● ۸۔ کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ مروّت کے معنی کیا ہیں؟ تو فرمایا مروت کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تمھیں وہاں نہ دیکھے جس جگہ سے منع کیا ہے اور وہاں سے غائب نہ پائے جس جگہ دیکھنا چاہتا ہے۔

● ۹۔ جو شخص معمولی ذلت کے مقابلہ میں جزع و فزع شروع کر دیتا ہے وہ آخر میں بڑی ذلت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(یہ ارشاد گرامی ایک مخصوص موقع پر فرمایا گیا ہے جہاں امامؑ کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ظالموں کی طرف سے توہین کو برداشت کر لیں یا پھر احتجاج کریں اور اس کے نتیجہ میں قتل وغیرہ جیسے خطرات سامنے آجائیں اور ان کے دفع کرنے کے لیے زیادہ دشوارگذار مراحل کا سامنا کرنا پڑے۔)

● ۱۰۔ ابلیس کے پاس غصہ اور عورت سے زیادہ طاقتور کوئی لشکر نہیں ہے۔

(ابلیس انسان کو تباہ کرنے کے لیے کبھی غصّہ کو ذریعہ بناتا ہے اور کبھی عورت کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غصّہ کوئی ذلیل صفت ہے یا عورت کوئی حقیر مخلوق ہے۔ غصّہ اپنے موقع پر ایک انتہائی ضروری صفت ہے کہ یہ نہ ہوگا تو انسان بے غیرت اور بے حیا ہو جائے گا اور اسی طرح عورت اپنے مقام پر ایک انتہائی حسین مخلوق ہے جس کے بغیر انسان کی زندگی ادھوری رہ جاتی ہے لیکن ابلیس اسے گمراہی کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنے کو وسائل ابلیس کے طور پر استعمال ہو کر اپنی حیثیت کو تباہ و برباد نہ کرے اور مرد کا بھی فرض ہے کہ جب وہ وسائل ابلیس کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس سے پرہیز کرے۔)

فقہ جعفری کیا ہے؟

اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ سے پہلے اس شخصیت کی زندگانی کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کے انتساب سے اس قانون اسلام کو فقہ جعفری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا اسم گرامی جعفر ہے جس کے معنی وسیع نہر کے ہیں۔ آپ کی شخصیت نگاہِ قدرت میں ایک دریائے علم ہے جس سے امت اسلامیہ کے تشنگانِ علم و معرفت کو سیراب ہونا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ دریا اپنے پیاسوں کو سیراب کرنے کے لیے کسی گھاٹ اور کنارے کی شرط نہیں رکھتا ہے جو جس وقت آجائے اور جس نیت سے آجائے دریا بہرحال سیراب کرے گا۔ اب کوئی اپنی شرارت سے خود ہی ڈوب جائے تو اس کی ذمہ داری دریا پر نہیں ہے۔

صادق آپ کا مشہور ترین لقب ہے جس سے دوست اور دشمن دونوں نے آپ کو یاد کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صادق کے صحیح معنی بھی یہی ہیں کہ جان کے دشمن اور خون کے پیاسے بھی صداقت کا انکار نہ کر سکیں جیسا کہ حضور سرور کائناتؐ کی حیاتِ طیبہ میں دیکھا گیا ہے کہ آپ کے شدید دشمن بھی آپ کو صادق و امین کے لقب سے یاد کرتے تھے اور آپ کی صداقت کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔

قدرت کا بھی عجیب انتظام تھا کہ تاریخ عصمت کے دو مشہور ترین صادق دونوں کو ایک ہی تاریخ میں اس دنیا میں بھیجا۔ رسول اکرمؐ کی تاریخ ولادت ۱۷ ربیع الاول اور امام جعفر صادقؑ کی

تاریخ ولادت بھی ۱۷ ربیع الاول ہے۔

گویا ۱۷ ربیع الاول کی تاریخ وہ مبارک تاریخ تھی کہ کائنات کا ہر مژدۂ صداقت اسی تاریخ کو سنایا گیا اور دنیا کے مانے ہوئے صادقین اسی تاریخ کو دنیا میں تشریف لائے تو اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ "کونوا مع الصادقین" تلاش کرنا چاہتے ہو تو ۱۷ ربیع الاول کی سحر پر نظر کرو صداقت کے نمونے نظر آجائیں گے اور پھر اسی معیار پر باقی صادقین کو تلاش کر لینا۔

نقشۂ زندگانی

امام صادق علیہ السلام کی ولادت ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ کو ہوئی اور آپ کی شہادت کی تاریخ ۱۵ شوال ۱۴۸ھ ہے۔ یعنی آپ نے اس دنیا میں تقریباً ۶۵ سال گذارے ہیں، جو تمام معصومینؑ میں سب سے زیادہ عمر ہے کہ اب تک جو معصومینؑ دنیا سے جا چکے ہیں ان میں امام صادقؑ سے زیادہ کوئی اس دنیا میں نہیں رہا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی معصوم اپنی طبیعی موت سے اس دنیا سے رخصت نہیں ہوا اور جسے جس قدر زندہ رہنے کا موقع دیا گیا وہ اسی قدر اس دنیا میں زندہ رہا اور جب زہرِ دغا یا شمشیرِ جفا کا نشانہ بنا دیا گیا تو رضائے الٰہی پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امام زمانہؑ کی طولِ عمر کا راز بھی یہی ہے کہ آپ اہلِ دنیا کی دسترس سے دور ہیں ورنہ یہ اہلِ زمانہ آپ کو بھی زندہ نہ رہنے دیتے۔ قدرت کو حجتِ آخر کو باقی رکھنا تھا اس لیے آپ کو حجابِ غیب میں بچا کر رکھا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ہم جسے بچانا چاہتے ہیں اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ ہم فرعون کے قصر میں موسیٰؑ کو بچا سکتے ہیں اور فراعنۂ عصر کے درمیان حجت آخر کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام نے زندگی کے ۱۲ سال اپنے جدِ بزرگوار امام زین العابدینؑ کے ساتھ گذارے۔ ۹۵ھ میں امام زین العابدینؑ کی شہادت ہو گئی تو آپ اپنے والدِ محترم کے ساتھ رہے۔ ۱۱۴ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت ہو گئی تو امت مسلمہ کی مکمل ذمہ داری آپ کے سر عائد ہو گئی اس وقت آپ کی عمر مبارک ۳۰ برس کے قریب تھی اور بنی اُمیہ اور بنی عباس کی جنگ اقتدار شروع ہو چکی تھی۔ ۱۳۲ھ میں بنی اُمیہ کا چراغ گل ہوا اور بنی عباس "حمایت حقِ آلِ محمدؐ" کے نام پر برسرِ اقتدار آگئے۔ امامؑ کی زندگی کے منصبی دور میں ۱۸ سال بنی امیہ کی حکومت رہی اور ۱۵ سال بنی عباس کا اقتدار رہا۔ اور پوری زندگی کا حساب لگایا جائے تو آپ کی حیات میں دس بنی اُمیہ کے بادشاہوں نے حکومت کی اور دو بنی عباس کے بادشاہ رہے۔ ایک سفاح جو ختم ہو گیا اور دوسرے منصور جس نے آپ کو زہرِ دغا سے شہید کیا۔

امامت اور سیاست

امامت کی زندگی کا یہ قابلِ لحاظ مرقع ہے کہ آپ کی زندگی میں حکومت نے بارہ پلٹے کھائے اور اس طرح کہ ایک مکمل اقتدار کا تاج و تخت پامال ہو گیا اور دوسرے کے سر پر تاج رکھ دیا گیا اور سب کی کوشش یہی رہی کہ کسی طرح آپ کو شکست دے دی جائے اور آپ کو ذلیل و رسوا کر دیا جائے لیکن بارہ قلابازیاں کھانے کے بعد بھی حکومت اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکی اور امامت اپنے خدمات میں مصروف رہی اور دنیا کو آواز دیتی رہی۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام سیاست سے بے خبر ہوتا ہے۔ آئیں اور آکر دیکھیں کہ اہلِ سیاست کس طرح شکست کھا رہے ہیں اور امامت کس طرح فتح مبین حاصل کر رہی ہے۔

حکومتوں کے ان انقلابات میں ایسے مواقع بھی آئے جب امام کو تخت و تاج کی پیش کش کی گئی اور بنی عباس کے کمانڈر ان چیف نے چاہا کہ حمایت آلِ محمدؐ کے دعویٰ کی توثیق کے لیے امام کو ساتھ لے لیا جائے لیکن آپ نے واضح لفظوں میں انکار کر دیا اور بتا دیا کہ میں انجام کار سے باخبر اور نیتوں سے آگاہ ہوں۔ مجھے حکومت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر خاندان میں کوئی شخص قیادت کے لیے تیار بھی ہوا تو اسے بھی متنبہ فرما دیا کہ اس انقلاب کا انجام اچھا نہیں ہے اس سے کنارہ کش رہنا ہی مناسب ہے۔

ایسے ہی مواقع کو دیکھ کر اکثر سادہ لوح افراد یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ آلِ محمدؐ کا ملکی سیاست سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور انھوں نے ہمیشہ اپنے کو حکومت دنیا سے الگ رکھ کر فقط فکر آخرت کی ہے اور عبادتوں میں زندگیاں گذاری ہیں۔ استعماری طاقتوں نے اس خیال کو اور بھی راسخ بنا دیا ہے تاکہ آلِ محمدؐ کے باشعور پرستار حکومت سے غافل ہو جائیں اور استعمار کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کا موقع مل جائے، حالانکہ تاریخ کا ادنیٰ مطالعہ بھی اس بات کا گواہ ہے کہ مرسل اعظمؐ یا ان کے اہل بیت طاہرینؑ

نے کبھی حکومت سے کنارہ کشی نہیں کی اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم ہوجائے اور تباہی کے راستے پر جانے والی دنیا سیاست الٰہیہ کے راستے پر چل پڑے۔ اسلام میں پہلی حکومت سرکار دو عالمؐ ہی نے قائم کی ہے جہاں مکمل طور پر سرکار ہی کے احکام چلتے تھے اور آپ ہی پوری مملکت کا انتظام فرماتے تھے اس کے بعد مولائے کائنات نے بھی مختصر سے وقفہ میں ملنے والے موقع کو نظرانداز نہیں کیا اور اپنے امکان بھر حکومت الٰہیہ کے قیام کی کوشش کرتے رہے اور خود ہی ارشاد فرمایا کہ "ہماری حکومت کا مقصد قیام حق اور دفاع باطل ہوتا ہے ہم اہل ہوس نہیں ہیں لیکن حکومت سے الگ ہونا بھی نہیں چاہتے"۔ ہاں جب آلِ محمدؐ نے دیکھا کہ حکومت ہمارے نام کو استعمال کرنا چاہتی ہے اور ہم اس کی روش کو تبدیل نہیں کرسکتے ہیں تو علیٰحدگی اختیار کرلی اور عدم تعاون کی مکمل پالیسی کا اعلان کردیا تاکہ ان کے نام کا غلط استعمال نہ ہوسکے اور ان کی شرکت کو حکومت کے اسلامی ہونے کی دلیل نہ بنایا جاسکے۔

قیامِ حکومت امامت کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ جب بھی اس کے حالات پیدا ہوجائیں گے امام حکومت ضرور قائم کرے گا اور سیاسی مسائل کو اپنے ہاتھوں میں لے لے گا اور جب اس کے حالات سازگار نہ ہوں گے تو بھی کنارہ کش ہوکر حجرہ میں نہیں بیٹھے گا بلکہ اس کی پالیسیوں کی کڑی نگرانی کرتا رہے گا اور حتی الامکان اس کی رہنمائی، تنقید یا مقاطعہ سے کنارہ کشی نہیں کرے گا۔ امام زین العابدینؑ نے اپنے گریۂ مسلسل کے درمیان تنقید سے کام لیا۔ امام محمد باقرؑ نے بھی تنقید فرمائی۔ امام جعفر صادقؑ اور اس کے بعد کے ائمہ معصومینؑ نے واضح طور پر مقاطعہ کی پالیسی اختیار کی اور حکومت کی ملازمت بلکہ اس کے ہاتھ سامان کرایہ پر دینے کی بھی ممانعت کردی اور امام موسیٰ کاظمؑ نے صفوان جمال سے یہاں تک فرمادیا کہ جب تم اپنے اونٹ حکومت کو کرایہ پر دیتے ہو تو تمھارا دل چاہتا ہے کہ کرایہ دار اس وقت زندہ رہے کہ اونٹ مع کرایہ کے واپس آجائیں ۔ یاد رکھو ظالم کے لیے حیات کی تمنا کرنا یہ بھی اعانت ظلم ہے اور میں اپنے چاہنے والوں کے لیے اتنی مقدار میں اعانت بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی کنارہ کش کا اندازہ نہیں ہے یہ ایک "ناقد بصیر" کا کردار ہے جو امام موسیٰ کاظمؑ نے انتہائی سختی کے دور میں بھی اختیار فرمایا۔ اور اس سے پہلے امام محمد باقرؑ نے فرمایا تھا کہ جب بھی کوئی روز عید آتا ہے تو ہم آلِ محمدؐ کے حزن و غم میں اضافہ ہوجاتا ہے کہ ہم اپنے حق کو غیروں کے ہاتھوں میں دیکھتے ہیں اور منبر رسولؐ پر نا اہلوں کے خطبوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہ ارشادات و اقوال اس بات کی دلیل ہیں کہ امامت کے فرائض سیاست سے الگ نہیں ہیں اور ہر امام نے اپنے دور میں بقدر امکان سیاسی مسائل میں مداخلت کی ہے اور جہاں حالات سازگار نہیں رہے وہاں بھی تنقید سے کنارہ کشی نہیں فرمائی ۔ امامت کو سیاست سے الگ کردینے کی پالیسی استعمار کی ہے جو اہلِ دین و دیانت کو حکومت سے بے دخل کرکے اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں جو کام کل کے حکام بزور طاقت کررہے تھے وہ آج کے استعماری ذہن بزور فلسفہ انجام دے رہے ہیں۔

حقیقتِ فقہ

اس تمہید کے بعد فقہ سے متعلق گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔

فقہ کے معنی عربی زبان میں فہم اور سمجھ کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے ''لکن لا تفقھون تسبیحھم'' کائنات کی ہر شے تسبیح پروردگار کررہی ہے لیکن تمھیں ان کی تسبیح کا فقہ و فہم نہیں ہے۔

علماء کی اصطلاح میں فقہ، دین کے مسائل کے تفصیلی اور استدلالی علم کا نام ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: فقہ اکبر جسے آج کی زبان میں علم کلام کہا جاتا ہے۔ اور فقہ اصغر جسے علم فقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علم فقہ اسلام کے فروعی احکام کے تفصیلی دلائل سے جاننے کا نام ہے اور فقہ عرف عام میں انھیں احکام کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔

فقہی مدارک

اسلام کے مکاتب فقہ میں دو بنیادیں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب خدا اور ایک سنت رسولؐ کہ انھیں کسی نہ کسی شکل میں ہر مسلمان نے احکام کا مدرک تسلیم کیا ہے۔ قرآن کی تفصیل و تاویل میں لاکھ اختلاف ہو سنت کی تعبیر و تشریح میں کسی قدر اختلاف کیوں نہ ہوں لیکن

کتاب وسنت مدرک احکام ہیں۔ اس کے بعد بنیادی مسئلہ یہ ہے اگر کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔

ایسے مسائل بے شمار ہوسکتے ہیں اس لیے کہ حضور سرورِ کائنات کے دور میں زندگی محدود اور سادہ تھی اس وقت اس قدر پیچیدہ مسائل پیدا نہیں ہوئے تھے۔ آپ کے بعد فتوحات اور توسیع دائرہ حکومت کے زیرِ اثر اور دیگر اقوام کے اختلاط کے نتیجے میں بے شمار مسائل پیدا ہوگئے اور زندگی کا انداز بالکل تبدیل ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہوگا اور ان کے بارے میں کیا قانون بنایا جائے گا۔؟

اس سلسلے میں ایک مدرسۂ فکر یہ ہے کہ سرورِ کائنات کو ان حالات کا علم تھا اور آپ جانتے تھے کہ امت میں ایسے مسائل پیدا ہوں گے اور امت کو ان مسائل کے حل کی ضرورت پڑے گی۔ اسی لیے آپ نے جاتے جاتے امت کو قرآن اور اہلِ بیتؑ کے حوالے کر دیا تاکہ نئے مسائل قرآن مجید میں نہ مل سکیں تو ان کو حل کرنے کے لیے اہلِ بیتؑ موجود رہیں اور پروردگار نے اہلِ بیتؑ کے سلسلہ کو دائمی اور ابدی بنا دیا کہ کوئی دَور ایسا نہ آئے۔ جب مسائل پیدا ہوں اور حلّالِ مسائل نہ ہوں مشکلات ہوں اور کوئی مشکل کشا نہ ہو۔

لیکن دوسرے مکتبِ فکر نے اس راستہ کو اختیار نہیں کیا اور حضورؐ کے سامنے "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اپنے کو اہلِ بیتؑ سے الگ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسبنا کام نہ آیا اور ایسے مسائل پیدا ہوگئے جن کا حل قرآن مجید بلکہ سنت پیغمبرؐ میں بھی نہیں مل سکا، ایسے وقت میں تمام لوگ مجبور ہوئے کہ قیاس کا دامن پکڑا جائے اور اپنی عقل کے سہارے احکام سازی کا کام شروع کیا جائے۔

مولانا شبلی نے اس طرزِ عمل کو امتِ اسلامیہ پر حضرت عمر کا بہت بڑا احسان قرار دیا ہے کہ انھوں نے اس راستہ کی طرف راہنمائی کر دی ورنہ امت کے پاس مسائل کا کوئی حل نہ ہوتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ کام انھیں کو کرنا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بھی انھوں نے دیا تھا اور اہلِ بیتؑ سے کنارہ کشی کی بنیاد بھی انھوں نے ڈالی تھی۔

فرق یہ ہے کہ مدینہ میں "مدرسۂ قیاس" زیادہ کامیاب نہ ہوسکا کہ وہاں کی زندگی پھر بھی سادہ

تھی اور مسائل زیادہ نہ تھے وہاں کے لوگوں نے زیادہ حصہ کام احادیث سے چلایا اور وہاں کے مدرسہ کو اہلِ حدیث کا مدرسہ کہا گیا۔ اس کے برخلاف عراق کے مسائل عجم کی فتوحات کی بنا پر بے حد پیچیدہ ہوگئے تھے اور وہاں قیاس کی بے حد ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عراق کا مدرسہ فکر "مدرسہ رائے اور قیاس" ہوگیا۔ ادھر حکومتوں کی کش مکش کا بھی آغاز ہوگیا۔ بنی عباس کی جنگ نے قومیت کا روپ دھار لیا۔ بنی امیہ کی پشت پر عرب رہے اور بنی عباس کی حمایت عجم نے کی اور اہلِ حدیث و اہلِ قیاس کا جھگڑا حجاز و عراق میں تبدیل ہوگیا۔ حجاز اہلِ حدیث کے ہاتھوں میں چلا گیا اور عراق اہلِ قیاس کے ہاتھوں میں آگیا امام مالک کو اہلِ حدیث کا امام کہا جانے لگا اور امام ابوحنیفہ کو اہلِ قیاس کا امام بنا دیا گیا۔ حالانکہ علماء کے اعداد و شمار کے مطابق امام مالک کے یہاں قیاس کی مقدار امام ابوحنیفہ سے بھی زیادہ ہے لیکن سیاسی تقسیم میں وہ حجاز کے حصہ میں آئے اور یہ عراق کے حصے میں آگئے۔

ایک ایسے معرکہ آرا دور میں جب اہل حدیث اور اہلِ قیاس ۔ بنی امیہ و بنی عباس۔ اور حجاز و عراق کی جنگ چل رہی تھی امام جعفر صادقؑ نے ایک تیسری آواز بلند کی اور امت کو ایک نئے راستہ کی ہدایت کی۔ اسی راستہ کو فقہ جعفری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام علیہ السلام نے اس ہنگامی دور میں ضروری سمجھا کہ اپنی آواز کو حجاز و عراق دونوں جگہ عام کیا جائے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا درسِ فقہ مدینہ میں بھی تھا اور کوفہ میں بھی ۔ کوفہ میں تو آپ کا مدرسہ اتنا عظیم تھا کہ اس میں چار ہزار افراد زیرِ تعلیم تھے اور یہ معمولی صلاحیت کے لوگ نہیں تھے بلکہ بڑے بڑے جیّد علماء تھے جن میں سے بہت سے بعد میں مدعیِ امامت بھی ہوگئے۔ علی بن محمد وشاء کا بیان ہے کہ میں نے مسجد کوفہ میں ۹۰۰ حلقے دیکھے جن کے اساتذہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ علوم حضرت جعفرؑ بن محمدؑ کی دین ہیں اور ہم سے انھوں نے بیان کیے ہیں۔

ایسے حالات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد فقہ جعفری کی برتری کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ فقہ "اہلِ بیت کرامؑ" کی فقہ ہے۔ امام صادقؑ کی طرف انتساب تو صرف حالات کی بنا پر ہے کہ جس قدر احکام آپ نے بیان فرمائے ہیں اتنا موقع کسی دوسرے امامؑ کو نہیں مل سکا ہے۔ ورنہ اس فقہ میں تمام معصومینؑ کے ارشادات شامل ہیں اور اہلِ بیت کرامؑ سے تمسک اپنی پسند کا معاملہ نہیں ہے بلکہ حکمِ خدا اور رسولؐ ہے جسے "کونوا مع الصادقین" اور "حدیث ثقلین" میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے نبی کو نبی اس لیے نہیں مانا کہ انھوں نے اپنے کو نبی کہا ورنہ ہر مدعیِ نبوت کو نبی تسلیم کر لیتے۔

ہم نے نبی کو نبی اس لیے مانا ہے کہ جس خدائے وحدہٗ لاشریک کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے اس نے انھیں نبی بنایا تھا اور یہ فرمادیا تھا کہ جو رسولؐ تمھارے حوالے کردے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ رسولؐ کے بعد اہل بیت اطہارؑ کو بھی ان کے دعویٰ کی بناپر تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ حدیث ثقلین کی بناپر تسلیم کیاہے۔ اعلانِ غدیر کی بناپر تسلیم کیاہے۔ رسول اکرمؐ کے قول وعمل کے اشاروں کی بناپر تسلیم کیاہے تو اب فقہ اہلِ بیتؑ کا تسلسل یہ ہے کہ تقاضائے عقل وفطرت کی بناپر خدا کو مانا اور حکم خدا کی بناپر رسولؐ کو مانا اور حکم رسولؐ کی بناپر اہلِ بیتؑ کو مانا۔ تو جب سلسلۂ اطاعت ومذہب اوپر سے چلا تو بھی اہل بیتؑ پر آکر رکا۔ ان کے علاوہ مرسل اعظمؐ نے کسی فقیہ یا امام مذہب کو واجب الاطاعت نہیں قرار دیا اور نہ اس کے قول وفعل کی ضمانت لی ہے۔۔۔ اور یہی سلسلہ جب نیچے سے امت کی طرف سے چلا تو ساری امت میں چار فقیہ برتر قرار دیے گئے کہ ان کا علم، ان کی فقاہت اور دینی بصیرت کا جواب نہیں ہے اور جب ان چاروں کا جائزہ کیا گیا تو امام حنبل، امام شافعی کے تابع نظر آئے۔ امام شافعی، امام مالک کا اتباع کرتے ہوئے دکھائی دیے اور امام مالک وامام ابوحنیفہ جو اہلِ حدیث اور اہلِ قیاس کی جماعت کے سربراہ اور حجاز وعراق کے مرجعِ مسلمین تھے دونوں امام جعفر صادقؑ کے شاگرد نظر آئے تو ہم نے فیصلہ کرلیا کہ استاد کی فقہ کے ہوتے ہوئے شاگرد کی فقہ پر اعتماد کرنا تقاضائے دانش مندی نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ امام مالک اور ابوحنیفہ کے ایسے استاد تھے کہ امام مالک کی نظر میں ان سے بڑا کوئی فقیہ نہیں تھا اور امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر دو سال امام جعفر صادقؑ کی شاگردی نہ کی ہوتی اور ان سے استفادۂ علمیہ نہ کیا ہوتا تو نعمان ہلاک ہوجاتا۔"

ہلاکت سے بچانے والے جعفرؑ بن محمدؑ ہی ہیں اور علوم سے مستفیض کرنے والے اہلِ بیت اطہارؑ ہی ہیں، ایسے حالات میں ایسے قابل استاد کو چھوڑ کر شاگرد کی فقہ پر اعتماد کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔؟

بعض متعصب اہلِ نظر نے اس قول کی صداقت میں شبہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ امام جعفر صادقؑ سے تین برس بڑے تھے اور ان کے باقاعدہ ہم عصر تھے۔ لہٰذا ان کی

شاگردی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

ان بےچاروں نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ استادی سن وسال سے نہیں طے ہوتی ہے علم اور قابلیت سے طے ہوتی ہے۔ جناب آدمؑ نے ملائکہ کو وہ سب کچھ بتادیا جو انھیں نہیں معلوم تھا حالانکہ ملائکہ جناب آدمؑ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔

امیر المومنینؑ نے خلفائے وقت کو اتنا بتایا اور سکھایا کہ خود حضرت عمر نے فرمایا "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہوجاتا" حالانکہ وہ عمر میں جناب امیرؑ سے بڑے تھے۔ استفادۂ علمیہ کے لیے سن وسال کا حساب نہیں کیا جاتا۔ صلاحیت اور قابلیت دیکھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ علامہ شبلی نے اس مقام پر نہایت حسین بات فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے شبہات صرف تعصب کی پیداوار ہیں اور دیانت وانصاف کے خلاف ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ نہایت درجہ لائق وقابل ودانش مند تھے لیکن وہ جعفر بن محمد جیسے نہیں ہوسکتے۔ امام ابوحنیفہ باہر کے آدمی ہیں اور امام جعفر صادقؑ اہلِ بیتؑ میں ہیں اور اہل بیتؑ گھر کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔

اس مقام پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النعمان میں جو کچھ امام جعفر صادقؑ اور حضرت ابوحنیفہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اسی نکتہ کی روشنی میں صدر اسلام کا فیصلہ کیوں نہیں کیا اور مذکورہ معاملہ میں اس نکتہ کو کس طرح فراموش کرگئے کہ حضرت ابوبکر باہر کے آدمی ہیں اور جناب فاطمہؑ دختر پیغمبرؐ ہیں۔ پیغمبرؐ کی حدیث کو جس طرح وہ جان سکتی ہیں ذوسرا کوئی نہیں جان سکتا ہے۔

بہرحال امام جعفر صادقؑ سے ارتباط اور فقہ جعفریہ سے تمسک دونوں قسم کی "سیر علمی" کا نتیجہ ہے۔ تلاشِ علم میں اوپر سے چلیں تو امام جعفر صادقؑ اہلِ بیت کے فرد کی حیثیت سے نبی اکرمؐ کے مقرر کردہ مرجعِ مسلمین قرار پاتے ہیں اور تلاش ہدایت میں ادھر سے چلیں تو امام جعفرؑ باقی ائمہ مذاہب کے استاد نظر آتے ہیں اور استاد کے ہوتے ہوئے شاگرد پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

یہ امتِ اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ ارباب حدیث نے ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے

بھی امام جعفر صادقؑ سے انحراف کیا اور امام بخاری نے عمران بن حطان خارجی کی روایت کو درج کرنے کے باوجود امام جعفرؑ کی روایت کو بخاری میں جگہ دینے کے قابل نہیں سمجھا۔ کیا یہ صریحی ظلم اور علمی خیانت نہیں ہے اور جب خواص ایسی خیانت کر سکتے ہیں تو عوام سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ تو اتنی بڑی کتابِ حدیث میں امامؑ کا نام بھی نہیں دیکھتے انھیں کیا معلوم کہ امامؑ کی شخصیت اور ان کی علمی جلالت کیا ہے۔

فقہ جعفری کے امتیازی مدارک

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم اور سنتِ پیغمبرؐ کو تمام امت اسلامیہ نے اپنی فقہ کے لیے مدرک قرار دیا ہے۔ اس کا انداز کچھ بھی رہا ہو اور تاویل و تشریح و تعبیر میں کتنی دھاندلی کی گئی ہو قرآن و حدیث کی سندی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا گیا اور کسی نہ کسی شکل میں ان دونوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔

تسلیم کی آخری حد یہ ہے کہ دنیا کی ہر عیاری، مکاری سلاطین زمانہ کی ہر خیانت و جنایت کے لیے آیاتِ قرآنی اور سنتِ پیغمبری کا سہارا لیا گیا ہے۔ تاریخ ملوک و سلاطین کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ سلاطینِ زمانہ نے کس طرح مذہب کا مذاق اُڑایا ہے اور درباری علماء نے کس طرح آیات و احادیث کی تعبیر و تفسیر میں مذہب کا ستیاناس کیا ہے۔

کبھی "لاتقربوا الصلوٰۃ" کو نماز سے روکنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ کبھی "ویل للمصلین" کو نمازیوں کی مذمت کی دلیل قرار دیا گیا اور کبھی "اضعافاً مضاعفۃ" کو معمولی سود کے جواز میں پیش کیا گیا۔ غرض دنیا کی ہر مکاری و عیاری کے لیے قرآن حکیم کو سہارا بنایا گیا اور تاویل کے زور پر ۷۳ فرقے بنا ڈالے گئے۔ حکیم اُمت نے انھیں حالات کو دیکھ کر فریاد کی تھی:

"خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

قرآن و حدیث کے بعد جب تیسرے مدرک کا سوال اٹھا تو امتِ اسلامیہ نے اپنی جہالت کا علاج علم کے زور پر کیا اور اپنی عقل سے احکامِ دین وضع کرنا شروع کر دیے۔ جہاں ایک قانون نظر آیا وہاں اس کے جیسے دوسرے مواقع پر بھی وہی قانون نافذ کر دیا اور حکم الٰہی کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ حوصلہ اتنا بلند ہوا کہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث پر بھی اپنے قیاس کو

مقدم کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ نے پیغمبر اکرمؐ کے اس ارشاد پر کہ "میدانِ جہاد کے مالِ غنیمت میں پیدل جہاد کرنے والے کا ایک حصہ ہے اور سوار کے دو حصے ہیں — یہ نوٹ لگا دیا کہ میں اپنی عقل سے اس حدیث اور اس قانون کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس قانون میں گھوڑے کا درجہ مسلمان کے برابر قرار دیا گیا ہے اور میں مسلمان کی ایسی توہین برداشت نہیں کر سکتا — یعنی پیغمبر اسلامؐ ایسی غلطی کر سکتے ہیں تو کریں میں ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔

یہ قیاس کی حدِ آخر ہے کہ اس نے مسلمانوں کے حوصلے اس قدر بلند کر دیے کہ احکام سازی میں قولِ خدا و رسولؐ بھی پیچھے رہ گیا اور اُمت نے شریعت سازی کا کام شروع کر دیا۔ وہ اسلام جس نے پیغمبرؐ کو بھی شریعت کے حلال و حرام میں دخل دینے کا حق نہیں دیا تھا اور ان کا کام بھی صرف اتباعِ حکمِ خدا قرار دیا تھا۔ اس کے ماننے والے اُمت کے فقہاء کے لیے اس حق کے بھی قائل ہو گئے۔ اور قیاس کی برکت سے ایک نیا اسلام معرضِ وجود میں آ گیا۔ اور علامہ شبلی جیسے مورخین و محققین نے اسے خلیفۂ دوم کے احسانات و کرامات میں شمار کر لیا۔

امام جعفر صادقؑ اس صورت حال کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ آپ نے تحفظِ دینِ اسلام کی خاطر ہر طرح کی زحمت برداشت کر کے اس قیاس کا مقابلہ کیا — اور خود مکتبِ قیاس کے سربراہ ابوحنیفہ سے بارہا یہ فرمایا کہ خبردار شریعت میں قیاس نہ کرنا۔ قیاس ابلیس کا کام ہے۔ ابلیس کی گمراہی کا واحد راز یہ ہے کہ اس نے حکمِ خدا میں قیاس سے کام لیا اور آگ اور خاک کا جھگڑا اُٹھا کر حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ قیاس ایک ابلیسی حربہ ہے جو حکمِ خدا کی بربادی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن حکومتِ وقت کی امداد اور ہوسِ جاہ و منصب نے ان تمام ہدایات پر عمل نہ کرنے دیا اور بالآخر اسلام نذرِ قیاسات ہو گیا۔

امام جعفر صادقؑ نے جن جن مقامات پر ابوحنیفہ کو قیاسات سے روکا ہے اس کی مثالیں تاریخ میں یوں ملتی ہیں:

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ — اگر تم عقل سے احکام طے کر لیتے ہو تو ذرا اپنی عقل سے سوچ کر یہ بتاؤ کہ پروردگار نے آنکھ میں نمکینی زبان میں شیرینی اور کان میں تلخی کیوں رکھی

ہے؟ ابوحنیفہ نے سکوت اختیار کیا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ جب تم اپنی خلقت کو نہیں سمجھ سکتے ہو تو اللہ کی شریعت کو کیا سمجھو گے۔ یاد رکھو کہ آنکھوں میں نمکینی اس لیے ہے کہ یہ چربی کا ڈبہ ہے، اس میں نمک نہ ہوتا تو پگھل جاتا۔ کانوں میں تلخی اس لیے ہے کہ جانور اندر جا کر زندگی کے درپے نہ ہو جائیں۔ زبان میں حلاوت اس لیے ہے کہ اشیا کا ذائقہ معلوم ہو سکے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ وہ کون سی شے ہے جس کی ابتدا کفر ہے اور انتہا اسلام۔ امام ابوحنیفہ نے جواب سے معذوری ظاہر کی تو آپ نے فرمایا،

"بڑے افسوس کی بات ہے تمھیں کلمۂ اسلام کی بھی خبر نہیں ہے جس کا لا الٰہ کفر ہے اور الا اللہ اسلام ہے۔"

اس کے بعد فرمایا، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں ہرن کے سامنے کے چار دانت جنھیں رباعیہ کہتے ہیں، توڑ ڈالے تو اس کا کفارہ کیا ہوگا؟ ابوحنیفہ نے کہا یہ مسئلہ بھی معلوم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا، تمھیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہرن کے ایسے دانت ہوتے ہی نہیں ہیں۔

امام علیہ السلام نے اس موقع پر ایک سوال انسان کے بارے میں کیا۔ ایک حیوان کے بارے میں اور ایک ایمان کے بارے میں اور سربراہ رائے و قیاس تینوں سے عاجز رہے تو امامت نے آواز دی کہ جسے انسان حیوان اور ایمان کی خبر نہیں ہے اسے دین الٰہی میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یاد رکھو! سنت میں قیاس کیا جائے تو دین بدنام ہو کر رہ جائے گا۔ خبردار! اسلام میں قیاس سے کام نہ لینا۔ اسلام دین الٰہی ہے اس میں بشری عقل کا دخل نہیں ہے۔

اس قسم کا ایک دوسرا واقعہ علامہ دمیری نے حیوٰۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ ابوحنیفہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے قیاس کی تردید کرتے ہوئے چند مسائل کو از روئے قیاس حل کرنے کی دعوت دی۔

فرمایا کہ یہ بتاؤ قتل بڑا گناہ ہے یا زنا؟ ابوحنیفہ نے کہا قتل۔ فرمایا، پھر کیا وجہ ہے کہ قتل میں دو گواہ درکار ہیں اور زنا میں چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابوحنیفہ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔

پھر فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ نماز کی زیادہ اہمیت ہے یا روزہ کی؟ عرض کی نماز زیادہ اہم ہے۔ فرمایا، پھر کیا وجہ ہے کہ عورت ایام حیض میں نماز، روزہ دونوں چھوڑ دیتی ہے اور بعد میں روزہ کی قضا واجب ہوتی ہے لیکن نماز کی قضا واجب نہیں ہوتی ہے۔ ابوحنیفہ نے سکوت اختیار کیا۔

فرمایا۔ بتاؤ پیشاب زیادہ نجس ہے یا منی؟ عرض کی پیشاب کہ اسے دو مرتبہ دھونا پڑتا ہے۔ فرمایا، پھر کیا وجہ ہے کہ پیشاب کے بعد صرف عضو کی طہارت کی جاتی ہے اور منی خارج ہونے کے بعد غسل کرنا پڑتا ہے؟ ابوحنیفہ نے معذرت کی۔ فرمایا، دیکھا تم نے کہ دینِ خدا میں قیاس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یاد رکھو، یہ احکام بھی خلافِ عقل نہیں ہیں۔ اسلام کا ہر قانون عقل کے مطابق ہے اگرچہ تمھاری عقل کی ایجاد اور پیداوار نہیں ہے۔

قتل اور زنا کا فرق یہ ہے کہ زنا میں مجرم دو ہوتے ہیں اور قتل میں ایک۔ اس لیے وہاں چار گواہ درکار ہیں اور یہاں صرف دو۔

نماز اور روزہ کا فرق یہ ہے کہ روزہ سال میں ایک مہینے میں ترک ہوتا ہے اور نماز ہر مہینے میں۔ پھر روزہ کی قضا میں کاروبارِ حیات پر اثر نہیں پڑتا ہے اور نماز کی قضا سے سارا کاروبار معطل ہو جاتا ہے اس لیے روزہ کی قضا واجب کر دی گئی ہے اور نماز کی قضا معاف کر دی گئی۔

پیشاب اور منی میں فرق یہ ہے کہ پیشاب مثانہ سے خارج ہوتا ہے اس میں صرف عضو کی طہارت کافی ہے۔ اور منی سارے جسم کی طاقت کا نچوڑ ہے جس کا مادہ ہر حصۂ جسم سے اخذ کیا جاتا ہے اس لیے اس میں غسل ضروری ہے۔

امام علیہ السلام نے ابوحنیفہ کی ناواقفیت کے اظہار کے ساتھ اسلامی احکام کے ان مصالح کی طرف بھی اشارہ کر دیا جن کی طرف عام انسانوں کے عقل و شعور کی توجہ کے امکانات نہ تھے اور آخری جواب میں یہ بھی واضح کر دیا کہ جب منی سارے جسم کے نچوڑ کا نام ہے تو انسان کا فرض ہے کہ عورت سے جنسی تعلقات قائم کرتے وقت اس نکتہ کو ذہن میں رکھے اور جسم کے کسی حصے کو بھی کسی اور کام میں مصروف نہ ہونے دے ورنہ اُس طرف سے آنے والی طاقت کمزور ہو جائے گی اور اس کا اثر آنے والی نسل پر پڑے گا۔ ماں باپ کی ایک لمحہ کی غلطی اولاد کے لیے پوری زندگی کا مسئلہ بن جائے گی۔

یاد رہے کہ بعض علماء نے مذکورہ بالا واقعہ کو امام محمد باقرؑ کے حالات میں لکھا ہے لیکن مجھے اس موضوع سے کوئی بحث نہیں ہے میرا مقصد تو صرف یہ گزارش کرنا ہے کہ دینِ الٰہی میں عقلِ بشر کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ مسلمان کا کام احکام پر عمل کرنا ہے احکام بنانا نہیں ہے۔ احکام کے سلسلے میں پروردگار نے رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے ذریعہ دین کو کامل کر دیا ہے اور اب کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل اسلام کے دامن میں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ علماء تشیع نے آج تک قیاس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور استنباطِ احکام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کے پاس اہلبیت طاہرینؑ کے ارشادات کا ذخیرہ موجود ہے اور اہلبیتؑ اس دور میں بھی جب مرسل اعظمؐ کے بعد نئے نئے مسائل پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے سارے مسائل کا حل بیان کر دیا ہے اب کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل ارشادات معصومینؑ میں موجود نہ ہو۔

تمسک دامن اہلبیتؑ ہی کا نتیجہ ہے کہ علماء امامیہ کو قیاس و استحسان جیسے مدارک کی ضرورت نہیں پڑی اور انھوں نے ساری زندگی احکام الٰہیہ کے سایہ میں گزار دی ہے۔

فقہ جعفری اور عقل

اس مقام پر یہ توہم نہ ہو کہ اسلام دینِ عقل ہے تو فقہ جعفری نے عقل کی اس قدر شدید مخالفت کیوں کی ہے۔ فقہ جعفری نے عقل کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس کو اپنے دائرہ میں رکھا ہے۔

دینِ جعفری میں اصولِ دین کا پورا کاروبار عقل ہی کے حوالے ہے۔ توحید سے لے کر قیامت تک کا عقیدہ عقل کے ذمہ ہے اور ہر مقام پر عقل ہی کو فیصلہ کرنا ہے۔ اس محاذ پر نبیؐ اور امامؑ کو بھی بولنے کا حق نہیں ہے وہ صرف راہ نمائی کر سکتے ہیں حکومت نہیں کر سکتے یہ میدان عقل کا میدان ہے اور کسی شخص کو دوسرے کے میدان میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے جس طرح کہ شریعت کا میدان نبیؐ اور امامؑ کا میدان ہے اس میں عقل دخل اندازی نہیں کر سکتی ہے۔

شریعت میں عقل کا کام فقط احکام کا تلاش کرنا اور اس کی تعمیل کے راستے ہموار کرنا ہے اور بس۔ احکام بنانا اس کا کام نہیں ہے ورنہ عقل اس اہم کام کو انجام دے سکتی تو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر ان کے اوصیاء اور اتنی کتابوں اور صحیفوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی عقل کے مطابق اپنی زندگی کا قانون مرتب کر لیتا اور اس کے مطابق زندگی گزار لیتا جس طرح کہ دنیا کے دوسرے نظاموں میں یہی صورت حال ہے کہ انسان ہی قانون بناتے ہیں اور انسان ہی عمل کرتے ہیں۔ مذہب اور دنیاوی نظام کا فرق ہی یہ ہے کہ مذہب کا قانون آسمان سے آتا ہے اور دنیا کا قانون انسان بناتے ہیں اب اگر مذہب کی قانون سازی بھی انسانوں کے حوالے کر دی گئی تو مذہب کا نام مذہب کیوں رہ جائے گا اس کا شمار بھی دنیا کے دوسرے عام قوانین میں ہو جائے گا۔

فقہ جعفری میں عقل بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کا کام تعمیل احکام کی راہیں ہموار کرنا ہے احکام سازی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر شریعت میں وجوب یا حرمت کا قانون نہ مل سکے تو آزادی کا فیصلہ عقل ہی کرے گی اور یہ کہے گی کہ اب آپ پر عمل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر شریعت میں یہ چیز واجب یا حرام ہوتی تو اس کے بیان کی ذمہ داری صاحب شریعت پر ہوتی اور صاحبِ شریعت کے بیان نہ کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہ شے واجب یا حرام نہیں ہے اور اب آپ کو مکمل اختیار ہے کہ جس کے واجب ہونے کا شبہ ہو رہا ہے اسے ترک کر دیں اور جس کے حرام ہونے کا شبہ ہے اسے اختیار کر لیں۔

اسی طرح اگر قانون شریعت میں اجمالی طور سے معلوم ہو جائے کہ سفر کی ایک منزل پر پہونچنے کے بعد نماز بہر حال واجب رہتی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ اس منزل پر نماز قصر ہو جاتی ہے یا نہیں۔ تو یہ فیصلہ عقل ہی کرے گی کہ ایسے مقامات پر دونوں طرح کی نمازیں پڑھنا چاہئیں تاکہ یقین ہو جائے کہ جو ذمہ داری ہمارے سر آئی تھی ادا ہو گئی اور اب کوئی فریضہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔

قانون کی منزل میں شریعت سند ہے اور تعمیل کی منزل میں عقل۔ حکم دینا شریعت کا کام ہے اور عمل کی راہیں ہموار کرنا عقل کا کام ہے۔ اہل قیاس نے اس فرق کو محسوس نہیں کیا اور انھوں نے شریعت میں بھی عقل کی دخل اندازی کو مباح کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوانین شریعت تماشا بننے لگے اور ہر شخص اپنی عقل، اپنی فکر اور اپنے خیال کے مطابق شریعت میں تحریف و ترمیم کرنے لگا۔

فقہ جعفری کی حقیقت

فقہ جعفری کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل نکات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر اس فقہ

کا امتیاز اور اس کی عظمت سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔

۱۔ فقہ جعفری صرف امام جعفر صادقؑ کی فقہ نہیں بلکہ تمام اہلبیت کرامؑ کے احکام کا مجموعہ ہے۔

۲۔ اس فقہ کے اعلم، امام جعفر صادقؑ ائمہ مذاہب کی طرح مجتہد نہیں تھے بلکہ پروردگار کی طرف سے احکام واقعی کے بیان کرنے والے تھے۔

۳۔ اہلبیت کرامؑ سے تمسک صرف ان کی ذاتی صلاحیت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ حکم رسول اکرمؐ کی بنا پر ہوتا ہے جس نے اس تمسک میں نجات کی ذمہ داری لی ہے۔

۴۔ امام جعفر صادقؑ حضرت مالک و ابو حنیفہ کے استاد تھے اور استاد کی فقہ کے ہوتے ہوئے شاگرد سے تمسک کرنا خلاف عقل و انصاف ہے۔

۵۔ فقہ جعفری کا مدرک قرآن حکیم، سیرت پیغمبر اور ارشادات اہلبیتؑ طاہرین ہیں جنھیں قرآن کے ساتھ مفسر قرآن بنا کر پیغمبرؐ اسلام چھوڑ گئے

۶۔ فقہ جعفری میں قیاس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۷۔ فقہ جعفری میں عقل کا کام تعمیل احکام کی راہیں تلاش کرنا ہے، احکام سازی نہیں ہے۔

۸۔ ائمہ معصومینؑ نے ہر دور میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی کوشش کی ہے اور اس وقت تک خاموش نہیں ہوئے جب تک کہ اس عمل کو ناممکن یا عارضی طور پر نامناسب نہیں خیال کیا۔

۹۔ فقہ جعفری میں قیاس کی ضرورت اس لیے نہیں پڑتی کہ نبی اکرمؐ کے بعد نئے مسائل پیدا ہوئے تو حل کرنے والے اہلبیت طاہرینؑ موجود تھے اور وہ گھر کے حالات سے بہتر طور پر واقف تھے۔

۱۰۔ فقہ جعفری کے اہم مدارک میں حدیث کے چار مجموعہ ہیں:

۱۔ کافی محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ ــــــ ۱۶۱۹۰ حدیثیں

۲۔ مَن لایحضرہ الفقیہ۔ محمد بن علی بابویہ متوفی ۳۸۱ھ ــــــ ۵۹۶۳ حدیثیں

۳۔ تہذیب۔ محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ ــــــ ۱۳۵۹۰ حدیثیں

۴۔ استبصار۔ محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ ــــــ ۵۵۱۱ حدیثیں

اس کے علاوہ احادیث کے اور مجموعہ بھی ہیں جن کے ہوتے ہوئے جدید ترین مسائل میں بھی قیاس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، قیاس کی ضرورت ان مسلمانوں کو پڑتی ہے جن کے صحاح ستہ

میں سے مکرر احادیث نکال دینے کے بعد صحیح مسلم میں چار ہزار کے قریب اور صحیح بخاری میں اس سے بھی کم حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے مختصر مجموعے سے اتنے اہم مسائل حل نہیں کیے جاسکتے اور پھر اگر ان میں سے بھی ضعیف اور غیر معتبر روایتیں الگ کر دی جائیں تو شریعت کی دنیا میں قیاس کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

فقہ جعفری اور ہم

فقہ جعفری کے خصوصیات، امتیازات اور اس کی حقانیت و برتری کا جائزہ لینے کے بعد ایک نظر اپنے حال زار پر ڈالنا بھی ضروری ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ جس فقہ جعفری کی بقاء کے لیے ہم نے قربانیاں دی ہیں اور جس کی نسبت سے قوموں کے درمیان ہم نے اپنا امتیاز قائم کیا ہے۔ اس سے ہمارا رشتہ کیا ہے۔؟

یاد رکھیے فقہ قانون بندگی و زندگی کا نام ہے۔ فقہ رضائے الٰہی کی تحصیل کا ذریعہ ہے۔ فقہ انسانی زندگی کا نظام ہے۔ کوئی انسان اپنی اسلامی زندگی علم فقہ کے بغیر نہیں گذار سکتا ہے اور کسی شخص کے لیے رضائے الٰہی کی تحصیل فقہ کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ تو کیا ہم اپنی پوری زندگی کا جائزہ لے کر بتا سکتے ہیں کہ ہم نے دین کے حلال و حرام، واجب و مستحب، جائز و ناجائز، طاہر و نجس کو دریافت کرنے کے لیے زندگی کا کتنا وقت صرف کیا ہے اور اس راہ میں کتنا سرمایہ خرچ کیا ہے؟

فقہ جعفری ہم سے دعوت و اجتماع اور جلسہ و جلوس کا مطالبہ نہیں کرتی۔ احکام خدا کے مطابق زندگی گذارنے کا مطالبہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہماری کارکردگی صفر کے برابر ہے۔ ہم نے گھر کی تعمیر، فرنیچر کی فراہمی، دیواروں کے رنگ و روغن، عورتوں کے زیورات، راحت پسند زندگی، ریڈیو، ٹی۔وی، وی۔سی۔آر جیسے مہملات پر لاکھوں کا سرمایہ خرچ کیا ہے اور کسی ایک عالم کو بٹھا کر اپنی عبادات کی تصحیح، اپنے اعمال کی صحت کے لیے دس روپے بھی خرچ نہیں کیے ہیں۔ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرس معین کرنے کا تصور بھی نہیں کیا ہے اور اگر کبھی سوچا ہے تو صرف یہ کہ بچوں کو قرآن شریف اور دینیات کی پہلی کتاب پڑھا دی جائے، فقہ آل محمدؐ کا حق ادا ہو جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین کے جملہ عبادات، معاملات، تجارت، زراعت و ملازمت، سیاست،

اقتصادیات، اجتماعیات، اخلاقیات سب دینیات کی پہلی کتاب میں موجود ہیں۔ یا دین آلِ محمدؐ صرف آٹھ ورق کی کتاب کا نام ہے کہ ہر شخص اپنے بچوّں کو ایک کتاب پڑھا کر خوش ہوگیا کہ اس نے فقہ جعفری کا حق ادا کر دیا ہے اور دس پیسے میں جنت خرید لی ہے جیسا کہ خود اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ اصولِ دین اور فروعِ دین کو زبانی یاد کرلیا اور فقہ آلِ محمدؐ کا حق ادا ہوگیا۔

یاد رکھیے ہماری ساری زندگی مہمل، بے کار اور بے مصرف ہے۔ اگر ہم نے زندگی کے ایک ایک قدم کے لیے قانونِ شریعت دریافت نہیں کیا اور اس کے مطابق زندگی نہیں گذاری۔

صادقؑ آلِ محمدؐ کی نظر میں دینی احکام کا معلوم کرنا اس قدر اہم ہے کہ آپ نے فرمایا اگر کوئی شخص میرے اصحاب کو کوڑے مار کر انھیں علم دین حاصل کرنے پر آمادہ کرے تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مجھے بے خبر اور بے عمل قسم کے چاہنے والے درکار نہیں ہیں، مجھے مولا اور آقا کہنے والوں کی ضرورت نہیں ہے مجھے باعمل مخلصین درکار ہیں اور صاحبانِ معرفت اصحاب۔

علامہ طبرسیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ امام زمانہؑ کے ظہور کے بعد حضرت جو طرزِ حکومت اختیار فرمائیں گے اس کا انداز یہ ہوگا کہ اگر کوئی بیس سال کا جوان علم دین اور احکام شریعت سے بے خبر پایا گیا تو اسے فی الفور تہ تیغ کر دیں گے۔ اس وقت مدرسہ قائم کر کے پڑھانے کا سلسلہ نہ ہوگا بلکہ بے خبری کی سزا کا سلسلہ قائم ہوگا۔ زمانۂ غیبت زمانۂ مہلت ہے جسے ہوش میں آنا ہے وہ آجائے۔ اس کے بعد انجام بہت خراب ہے۔ انھیں اس بات کی فکر نہ ہوگی کہ ہم انھیں کیا کہتے ہیں اور کیا مانتے ہیں۔ انھیں صرف اس بات کی فکر ہے کہ ان کے دین، مذہب، مقصد اور احکام کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے اور ان کی فقہ کو ہم نے کس قدر دریافت کیا ہے اور کس طرح عمل کیا ہے۔ ہمارے نوجوان جو صبح سے شام تک اپنے خیال میں مولاؑ کے خوش کرنے کا انتظام کرتے ہیں اور طریقۂ وضو و غسل اور انداز نماز سے بھی باخبر نہیں ہیں۔ کیا یہ نہیں سوچتے کہ آنے والا خوشامد پسند اور شہنشاہ نہیں ہے وہ دین کا ذمہ دار ہے۔ اسے نام کی فکر نہیں ہے کام کی فکر ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہے بندۂ پروردگار ہے۔ کیا یہ نوجوان اس ذوالفقار حیدری کا احساس نہیں رکھتے جو امامؑ کے ساتھ ایسے تمام بے خبر اور بے عمل افراد کا فیصلہ کرنے آرہی ہے۔

عزیزو! موقع غنیمت ہے۔ وقت باقی ہے۔ غیبت کے زمانہ کو اک مہلت کا زمانہ تصوّر

کرو اور اپنے دین کا علم حاصل کرو، اپنی نسل کو ان کا دین سکھاؤ۔ راحت طلب زندگی کا اثاثہ فروخت کر کے علم دین پر صرف کرو۔ قبر میں صوفہ سیٹ، زیورات اور ٹی۔وی نہیں جائے گا۔ قبر میں علم دین ہی کام آئے گا۔ مرکری لائٹ یہاں کے لیے ہے وہاں کے لیے صرف احکام دین کی روشنی کام آنے والی ہے۔

ربِّ کریم سے التماس ہے کہ ہمیں اور ہماری بے خبر اور بے عمل قوم کو علم و عمل کی توفیق عنایت فرمائے اور ہمیں یہ موقع عطا کرے کہ ہم امام عصرؑ کی ذوالفقار سے قتل ہونے کے بجائے ان کے انصار میں شامل ہوجائیں۔ والسّلام علیٰ مَن اتبع الھُدیٰ۔

نقشِ

حیاتِ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ

ولادت: ۷ر صفر ۱۲۸ھ

شہادت: ۲۵ر رجب ۱۸۳ھ

نقشِ زندگانی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام

ماہ صفر ۱۲۸ھ کی ساتویں تاریخ تھی۔ امام جعفر صادقؑ مع اپنی اہلیہ محترمہ جناب حمیدہ خاتون حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور واپسی میں مکہ و مدینہ کے درمیان مقام ابواء میں مقیم تھے کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی ولادت باسعادت ہوئی جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ائمہ طاہرینؑ ایسے اوقات میں بھی سفر حج کو نظر انداز نہیں فرماتے تھے جب گھر میں ولادت میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے تھے اور سفر بھی اُس دور کا سفر تھا جب آج جیسے وسائل یقیناً فراہم نہیں تھے اور تقریباً ۵۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ اونٹوں کے ذریعہ طے کرنا ہوتا تھا اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جس قدر اس سفر اور عمل کی اہمیت ائمہ طاہرینؑ کی نگاہ میں تھی اسی قدر ان کی ازواج مطہرات کی نگاہ میں بھی تھی ورنہ ان حالات کا لحاظ کر کے معذرت کر لیتیں اور سفر کو آئندہ سال کے لیے ملتوی کر دیتیں جو دور حاضر کا عام طریقہ کار ہے۔

بلکہ یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ ازواج ائمہ معصومینؑ بھی حج بیت اللہ کے لیے جاتی تھیں یا نہیں اور اس فریضہ کا تعلق صرف مردوں سے ہے یا عورتوں سے بھی ہے۔ یقیناً حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں تین طرح کی استطاعت کی شرط ہے۔ مالی استطاعت، بدنی استطاعت اور راستہ کی استطاعت۔ اگر بعض ازواج مطہرات کی زندگی میں حج کا تذکرہ نہیں ہے تو عین ممکن ہے کہ یہ ان کی عدم استطاعت کا نتیجہ ہو جس طرح کہ بے شمار مومنین مخلصین عدم استطاعت کی بنا پر اس سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس کا کوئی تعلق مرد اور عورت کے فرائض کی تفریق سے نہیں ہوتا ہے ورنہ استطاعت اور وجوب کے بعد حج نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

جناب حمیدہ کا بیان ہے کہ میرے فرزند نے ولادت کے بعد رُخ آسمان کی طرف کیا اور زبان پر کلمۂ شہادتین جاری کیا جو اس سے پہلے کے معصومینؑ کے آغاز حیات کا طریقۂ کار

رہا ہے اور آپ کے داہنے بازو پر یہ آیت کندہ تھی،

"تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا"

آپ کا اسم گرامی موسیٰ قرار پایا اور مشہور لقب کاظم ہوا جس کے معنی غصہ کو پی جانے والے کے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس لقب کی ایک مصلحت یہ بھی ہو کہ پیغمبرانِ اولوالعزم میں جس موسیٰؑ کا ذکر آتا ہے ان کی صفت قرآن مجید نے "غضبان" بیان کی ہے تو قدرت نے چاہا کہ ایک موسیٰ کاظمؑ بھی پیدا ہو جائے تاکہ دونوں طرح کے الٰہی کردار سامنے آجائیں اور تاریخ نبوتؑ و امامت سے یہ فرق بھی واضح ہو جائے کہ اگر قہر و جلال کا مرقع دیکھنا ہو تو نبی موسیٰؑ کو دیکھو اور اگر حلم و تحمل پروردگار کا نمونہ دیکھنا ہو تو امام موسیٰ کو دیکھو۔

نام موسیٰ میں ایک مصلحت الٰہی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کے قاتل کا نام ہارون تھا تو قدرت نے روز اول واضح کر دینا چاہا کہ انسان ناموں کے فریب میں نہ آئے اور کردار پر مکمل نگاہ رکھے۔ ورنہ یہی ہارون ایک وقت میں موسیٰؑ کا ہمراز و دمساز، معاون و مددگار بھی ہوسکتا ہے اور دوسرے وقت میں ایک موسیٰ کا قاتل بھی ہوسکتا ہے۔ اصلی اور نقلی، حقیقی اور جعلی میں یہی واقعی فرق ہے اور شاید یہی راز تھا کہ جناب موسیٰؑ نے جناب ہارون کے وزیر بنانے کی درخواست پروردگار سے کی تھی کہ پروردگار ہارون کو وزیر بنائے گا تو وہ ہارون صاحب ایمان اور نیک کردار ہوگا اور انسان کسی ہارون کو بادشاہ اور خلیفہ بھی بنا دے گا تو وہ نالائق اور نا اہل ہی رہے گا۔ حقیر نے ایک موقع پر اس مضمون کو اس طرح نظم کیا تھا:

دنیا کا امن لوٹ کے مامون بن گئے ۔۔۔ دولت سمیٹی اتنی کہ قارون بن گئے
ان بندگانِ زر کی سیاست تو دیکھیے ۔۔۔ موسیٰؑ کو زہر دے کے بھی ہارون بن گئے

آپ کے دوسرے القاب میں عبد صالح، صابر، امین اور باب الحوائج وغیرہ زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ کنیت ابوالحسن الاول، ابوابراہیم، ابوالحسن الماضی، ابوعلی، ابواسماعیل وغیرہ۔

باب الحوائج کی تفسیر یوں بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے روضۂ مبارک سے برابر آج تک معجزات اور کرامات کا ظہور ہو رہا ہے اور بعض اہل قلم نے تو ان واقعات کو جمع کر کے مکمل کتابیں بھی تالیف کر دی ہیں اور عینی مشاہدین کے بیان کے مطابق ان کرامات کو جمع کیا ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ

بغداد میں ان خوں ریز واقعات کے بعد جن میں دجلہ کا پانی کئی دن تک رنگین رہا۔ مذہب تشیع کا باقی رہ جانا بھی امام موسیٰ بن جعفرؑ کی ایک زندہ کرامت ہے جس سے کسی قیمت پر انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مصائب تو آپ کی زندگی میں بھی آتے ہی رہے لیکن جس طرح کل کے مصائب سے سلسلۂ امامت نہیں منقطع ہوسکا تھا اسی طرح بعد کے مصائب سے سلسلہ مذہب اہلبیتؑ پر کوئی اثر نہیں پڑسکا اور امام شافعی کا یہ ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ قبر موسیٰ کاظمؑ ایک تریاق مجرب ہے۔

آپ کی ولادت مروان الحمار کے دور حکومت ۱۲۸ھ میں ہوئی۔ تین سال کے بعد اس کی آبائی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور بنی عباس کا پہلا بادشاہ سفاح تخت نشین ہوا۔ ۱۳۲ھ سے ۱۳۶ھ تک اس کا دور حکومت رہا۔ ۱۳۶ھ میں منصور دوانیقی حاکم بنا جس نے ۱۴۸ھ میں امام جعفر صادقؑ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا اور ۲۰ سال کی عمر سے امام موسیٰ کاظمؑ کا دور قیادت شروع ہوا۔ ۱۵۸ھ میں منصور کی جگہ پر مہدی عباسی آیا جس نے دس سال حکومت کی اور ۱۶۹ھ میں اس کی جگہ ہادی کو ملی جو ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا اور پھر ۱۷۰ھ میں ہارون تخت نشین ہوگیا۔ جس نے ۱۸۳ھ میں امام موسیٰ کاظمؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا جس وقت آپ کی عمر مبارک ۵۵ سال کی تھی جس میں سے ۲۰ سال والد بزرگوار کے زیر سایہ گزرے اور ۳۵ سال اپنے دور میں قیادت امت کے ذمہ دار رہے۔

● آپ کے بچپن کے کمالات میں ایک واقعہ یہ ملتا ہے کہ صفوان جمال نے آپ کو گھر سے اس عالم میں نکلتے دیکھا کہ ہاتھ میں بکری کے بچے کے کان تھے اور اس سے سجدۂ رب کا تقاضا کر رہے تھے اور گویا صفوان کو متوجہ کر رہے تھے کہ ہم اہلبیتؑ کی شان یہ ہے کہ جانور بھی ہماری طرف منسوب ہو جاتے ہیں تو ہم ان سے سجدۂ رب کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے بغیر اپنا بنانا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ صفوان نے عرض کی کہ اگر آپ اس سے سجدہ کرا سکتے ہیں تو اسے مرنے کا حکم بھی دے سکتے ہیں! آپ نے فرمایا کہ صفوان موت و حیات خدا کے اختیار میں ہے۔ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ گویا آپ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ انسان کو اپنے فرائض کی فکر کرنی چاہیے۔ امور خداوندی میں دخل اندازی شان عبدیت کے خلاف ہے اور اس سے انسان کسی وقت بھی مورد عتاب ہوسکتا ہے۔ یہ واقعہ آپ کی تین برس کی عمر کا ہے۔ (بحار)

● عمر مبارک پانچ برس تھی جب ابوحنیفہ امام جعفر صادقؑ سے مسئلہ جبر و اختیار پر بحث کرنے کے

لیے آئے تو آپ نے والد بزرگوار سے پہلے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں کہ یا تو عمل بندوں کے اختیار سے ہوتا ہے یا خدائی جبر سے وقوع پذیر ہوتا ہے یا دونوں کی شرکت رہتی ہے۔ اگر عمل بندوں کے اختیار سے ہوتا ہے تو یہ آپ کے نظریہ کے خلاف ہے، اور اگر خدائی جبر یا شرکت سے ہوتا ہے تو قانونی طور پر اسے عذاب کا بھی ذمہ دار یا شریک ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے تو اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بندہ خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور خدا پر ان اعمال کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ (بحار۔ امالی سید مرتضیٰ)

حقیقت امر یہ ہے کہ عقیدہ جبر جابر سلاطین کی ایک ایجاد ہے جو ایسے عقائد کے ذریعہ اپنے جرائم کی پردہ پوشی کرنا چاہتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام ہمیں مجبور محض سمجھ کر ہم سے ہمارے جرائم کا محاسبہ نہ کریں ورنہ ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

حضرت ابو حنیفہ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں اپنی توہین کا احساس ہو گیا اور اس کے انتقام کی فکر میں لگ گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام موسیٰ کاظم کو اسی زمانہ میں ایسی جگہ نماز پڑھتے دیکھ لیا جہاں سامنے سے لوگ گذر رہے تھے تو فوراً امام جعفر صادقؑ سے شکایت کر دی۔ آپ نے فرزند سے شکایت کو بیان کرکے جواب کا مطالبہ کیا۔ امام کاظمؑ نے عرض کی کہ میرا خدا رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے۔ لہٰذا راہ گیر میرے اور اس کے درمیان حائل نہیں ہو سکتے ہیں۔ (مناقب)

یہ جواب درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ جب انسان کا ذہن جلال و جمال پر مرکوز نہیں ہوتا ہے اور توجہ کے ہٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو ایسے مقامات پر نماز کا پڑھنا مکروہ ہو سکتا ہے لیکن اگر خدا رگ گردن سے زیادہ قریب تر ہو جائے اور نگاہ میں جلوۂ ربوبیت کے علاوہ کوئی جلوہ نہ سما سکے تو ایسی نماز میں کوئی کمزوری نہیں ہے اور یہی امت اور امامت کی عبادتوں کا نمایاں فرق ہے۔

● دوسرے موقع پر ابو حنیفہ امام صادقؑ سے ملنے کے لیے آئے اور اس فرزند کو دیکھ لیا تو عملی طور پر شکست دینے کے لیے ایک عجیب و غریب قسم کا سوال کر لیا کہ اگر کوئی مسافر آپ کے شہر میں آجائے تو قضائے حاجت کے لیے کہاں جائے؟ فرمایا کہ مکان کی دیواروں کی پشت

کا سہارا لے، ہمسایہ کی نگاہوں سے اپنے کو بچائے۔ نہروں کے کنارے سے پرہیز کرے۔ جن مقامات پر درختوں کے پھل گرتے ہیں وہاں نہ بیٹھے۔ مکانوں کے صحن سے الگ، شاہراہوں اور راستوں سے الگ، مسجدوں کو چھوڑ کر، قبلہ کے استقبال اور استدبار سے بچ کر اور اپنے کپڑوں کو سنبھال کر جہاں چاہے بیٹھ سکتا ہے۔ ابو حنیفہ یہ سن کر مبہوت ہو گئے اور ان کے ساتھی عبداللہ بن مسلم نے کہا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ خاندان رسالت کے بچے بھی عام بچوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ (بحار۔ مناقب)

● اسی دور کمسنی میں امام صادقؑ نے چاہا کہ لوگوں کے سامنے اپنے فرزند کے کمالات کو نمایاں کردیں تو آپ نے ایک مرتبہ فرمایا بیٹا! ذرا اس مصرع پر مصرع تو لگاؤ،

تَنَحَّ عَنِ الْقَبِیْحِ وَلَا تُرِدْهُ

آپ نے عرض کی: وَمَنْ اَوْلَیْتَهُ حَسَنًا فَزِدْهُ

پھر آپ نے فرمایا کہ: سَتَلْقیٰ مِنْ عَدُوِّكَ كُلَّ كَیْدٍ

عرض کی: اِذَا كَادَ الْعَدُوُّ فَلَا تَكِدْهُ

حقیر نے ان مصرعوں کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

امام صادقؑ — برائیوں کا نہ ہرگز کبھی ارادہ کرو۔

امام کاظمؑ — کرو جو خیر تو کچھ اور بھی زیادہ کرو۔

امام صادقؑ — یہ مانا دیکھو گے تم دشمنوں کے مکر و فریب۔

امام کاظمؑ — نہ اختیار مگر تم کبھی یہ جادہ کرو۔

● ۱۴۸ھ میں امام صادقؑ کی شہادت سے آپ کے دور قیادت و مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔ امام صادق علیہ السلام کو معلوم تھا کہ مجھے زہر دینے والا منصور میری اولاد کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔ چنانچہ آپ نے اپنے اموال کے بارے میں ایک وصیت نامہ تیار کیا جس میں پانچ افراد کو ذمہ دار قرار دیا: (۱) منصور دوانیقی (۲) سلیمان حاکم مدینہ (۳) عبداللہ افطح فرزند امام صادقؑ (۴) امام موسیٰ کاظمؑ اور (۵) جناب حمیدہ۔

امامؑ کی شہادت کے بعد منصور نے حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ ان کے وصی کو گرفتار کرکے قتل

کردو۔ اس نے وصی کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وصیت نامہ میں اس کا اور منصور کا نام بھی ہے تو اس نے معذرت کرلی اور امام کی سیاست الٰہیہ کا پہلا مرقع منظر عام پر آگیا۔

● اس کے بعد مہدی عباسی نے بہ ارادۂ قتل آپ کو مدینہ سے طلب کیا تو راستہ میں منزل زبالہ پر ابو خالد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گرفتاری کا منظر دیکھ کر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں فلاں تاریخ کو واپس آؤں گا۔ چنانچہ جب حمید بن قحطبہ کو قتل پر مامور کیا گیا تو مہدی نے جناب امیرؑ کو خواب میں دیکھا کہ اسے قتل کردینا چاہتے ہیں اور اس نے بیدار ہو کر فوراً حمید کو قتل سے روک دیا اور آپ حسب وعدہ مقررہ تاریخ پر زبالہ واپس پہونچ گئے اور فرمایا کہ ابو خالد اس کے بعد جب دوبارہ گرفتار کیا جاؤں گا تو واپسی کا کوئی امکان نہ ہوگا اور میری قبر بغداد ہی میں بنے گی۔ اسی مہدی بن منصور نے بطور ردّ مظالم فدک کی واپسی کا ارادہ کیا تھا، تو آپ نے پورے ملک اسلامی کے حدود بیان کردیے تھے کہ فدک باغ نہیں ہے یہ اسلامی حکومت کا استعارہ ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی رائے بدل دی کہ ظالم کرسی نہیں چھوڑ سکتے ہیں بلکہ دین و دنیا سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں۔

ہارون رشید اگرچہ علم دوست مشہور ہوگیا ہے لیکن انتہائی عیاش اور دشمن سادات تھا۔ عیاشی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے باپ کی مدخولہ کنیز سے جماع کیا اور ابو یوسف نے یہ فتویٰ بھی دے دیا کہ اگر وہ اپنے کو مدخولہ کہتی ہے تو اس کے بیان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

دوسری کنیز سے خریدنے کے بعد فوراً جماع کرنا چاہا تو کسی نے اعتراض کردیا کہ شریعت پیغمبرؐ میں ایک حیض تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ اس نے امام ابو یوسف کو ایک لاکھ درہم دے کر یہ فتویٰ حاصل کرلیا کہ یہ قانون خریداری کا ہے۔ آپ اپنے فرزند کو ہبہ کرکے پھر دوبارہ اس سے ہبہ کرالیں۔ ہبہ میں انتظار کی ضرورت نہیں ہے اور اس طرح ابو یوسف کو دولت کی لذت مل گئی اور ہارون کو عورت کی لذت حاصل ہوگئی اور شریعت پیغمبرؐ آنسو بہاتی رہ گئی۔

سادات کشی کا یہ عالم تھا کہ ۱۷۶ھ میں نفس زکیہ کے بھائی عبداللہ کو زندہ دیوار میں چنوادیا۔ قبر حسینؑ پر جو بیری کا درخت تھا اسے کٹوادیا جس کے بارے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ خدا بیری کا درخت کاٹنے والے پر لعنت کرے۔ (جلاء العیون)

● طوس میں حمید بن قحطبہ طوسی کو قتل سادات کا حکم دے دیا اور اس نے ایک وقت میں ساٹھ

سادات کو تہ تیغ کردیا۔

● ۱۷۳ھ میں حج بیت اللہ کے بہانے مکہ و مدینہ کا سفر کیا اور دو مرتبہ امام کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کیے لیکن ناکام ہوگیا۔ ایک مرتبہ حضرت سے فرزند رسولؐ ہونے کی دلیل کا مطالبہ کیا جب کہ عام طور پر اولاد بیٹوں کے ذریعہ چلا کرتی ہے تو آپ نے ایک طرف جناب عیسیٰؑ کے ذریت ابراہیمؑ میں ہونے کا حوالہ دیا اور دوسری طرف آیت مباہلہ کی تلاوت کی اور ہارون قتل کا بہانہ نہ تلاش کرسکا۔

● دوسری مرتبہ مدینہ میں قبر پیغمبرؐ کو یا ابن العم کہہ کر سلام کیا تو امام نے یا ابتہ کہہ کر سلام کردیا جس پر حکومت سے مقابلہ کرنے کے جرم میں گرفتار کرکے بغداد لے آیا لیکن خواب میں جناب امیرؑ کو غضب ناک شکل میں دیکھ کر آزاد کرکے مدینہ واپس کردیا اور قتل نہ کرسکا۔

ان تدبیروں سے عاجز آکر قید خانہ میں ایک حسین و جمیل عورت کو بھیج دیا تاکہ زنا کا الزام لگا کر قتل کراسکے لیکن جب نگراں افراد نے قید خانہ کا جائزہ لیا تو عورت کو سجدہ میں پایا اور پھر اس نے بیان کیا کہ میں یہاں آئی تو میں نے دیکھا کہ یہ محو مناجات ہیں اور ادھر سے لبیک کی آوازیں آرہی ہیں تو میں نے سوچا کہ عبادت کا اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا ہے چنانچہ اب مجھے صرف سجدہ ہی میں لطف آتا ہے۔ (مناقب)

● اپنی زندگی کے تحفظ کے ساتھ امام علیہ السلام حتی الامکان دوستوں کی زندگی کا بھی تحفظ کرتے رہے۔ چنانچہ اسی پروگرام کے تحت اپنے ایک مخلص علی بن یقطین کو ہارون کا وزیر بنوادیا اور جب انھوں نے خلعت شاہی امامؑ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجا تو اسے واپس کردیا اور فرمایا کہ تمھیں اس کی ضرورت پڑسکتی ہے اور یہی ہوا کہ جب لوگوں نے ہارون سے شکایت کی کہ یہ سارا سامان امام موسیٰ کاظمؑ کو بھیج دیتے ہیں تو اس نے فوراً تلاشی لی اور خلعت مل گیا تو علی بن یقطین کو انعام دیا اور شکایت کرنے والے کو ہزار کوڑوں کی سزا دی جس میں پانچ سو کوڑوں ہی میں وہ واصل جہنم ہوگیا۔ (نور الابصار)

● دوسرے موقع پر علی بن یقطین نے پیروں کے مسح کے بارے میں سوال کیا کہ اوپر سے نیچے ہو یا نیچے سے اوپر ہو۔ تو آپ نے پورا اہلسنت کا طریقۂ وضو لکھ کر بھیج دیا اور ابن یقطین نے اسی طرح وضو شروع کردیا یہاں تک کہ لوگوں نے پھر ہارون سے شکایت کی کہ یہ شیعہ ہیں اور

اس نے چھپ کر ابن یقطین کا وضو دیکھا تو انھیں انعام دیا اور دشمنوں کو سخت سزا کا حکم دے دیا۔ جس کے دو روز کے بعد حضرت کا حکم آیا کہ تقیہ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب اسی طرح وضو کرو جس طرح واقعاً امر خداوندی ہے۔ (مناقب)

ہارون تمام تدبیروں سے عاجز ہوگیا تو اپنے وزیر یحییٰ برمکی کے مشورہ سے محمد بن اسماعیل کو مدینہ سے بغداد طلب کیا کہ ان کے ذریعہ امام کے قتل کا انتظام کرے۔ محمد، امام سے اس لیے بدظن تھے کہ ان کے والد اسماعیل کی امامت نہیں چل سکی تھی چنانچہ مدینے سے رخصت ہوتے وقت امام سے ملنے کے لیے آئے تو آپ نے چار سو دینار اور ۱۵۰۰ درہم دے کر فرمایا کہ میں تمھارے قرضہ کو ادا کر سکتا ہوں اور تمھاری کفالت کر سکتا ہوں۔ بغداد جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر جاتے ہو تو خبردار! میرے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین نہ کرنا۔ لیکن اس کے بعد بھی محمد نے بغداد پہونچ کر ہارون سے شکایت کی کہ مدینہ میں موسیٰ کاظمؑ کی حکومت چل رہی ہے اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں ہو سکتیں۔ جس پر ہارون نے محمد کو دو لاکھ درہم بطور انعام دیے اور انھیں رخصت کر دیا لیکن قدرت کا یہ انتظام اور انتقام تھا کہ محمد دوسرے ہی دن دنیا سے چل بسے اور وہ دینار کام نہ آسکے بلکہ اس کے برخلاف آتشِ جہنم کا انتظام ہوگیا۔

ہارون ان خبروں سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً حج کا ارادہ کر لیا اور مدینہ پہونچ کر حضرت کو ۲۰ شوال ۱۷۹ھ کو عین حالت نماز میں گرفتار کرا لیا اور گھر والوں سے رخصت بھی نہ ہونے دیا اور بصرہ روانہ کر دیا۔ ایک ماہ ۱۷ روز کے طویل سفر کے بعد ۷ ذی الحجہ کو حضرت بصرہ پہونچے اور آپ کو وہاں قید کر دیا گیا اور ایک سال قید میں رکھا گیا۔ امیر بصرہ ہارون کا چچا زاد بھائی عیسیٰ بن جعفر تھا اس نے سفارش لکھی کہ یہ بندۂ خدا صرف عبادت میں مصروف رہتا ہے اسے آزاد کر دے تو اس نے امامؑ کو بغداد طلب کر کے فضل بن ربیع کے قید خانہ میں رکھ دیا۔ وہاں فضل بھی حضرت کے کردار سے متاثر ہوگیا تو سندی بن شاہک ملعون کو نگراں بنا دیا اور اس نے زہر سے حضرت کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اس حالت میں کہ آپ طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھے اور اس کے بعد جنازہ بھی حمالوں کے حوالے کر دیا۔ لیکن جسرِ بغداد پر سلیمان نے تعرض کیا اور جنازہ کو احترام سے دفن کرا دیا۔ امام علی رضاؑ نے باعجاز مدینہ سے بغداد آکر امام کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے۔ امامؑ کی شہادت ۲۵ رجب ۱۸۳ھ

کو واقع ہوئی ہے۔ آپ کو بغداد میں وہیں دفن کیا گیا ہے جسے دورِ حاضر میں کاظمین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ازواج و اولاد

آپ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں علماء کرام کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔
ابن شہر آشوب نے ان کی کل تعداد تیس بتائی ہے۔
صاحب عمدۃ الطالب نے اسے بڑھا کر ساٹھ بنا دیا ہے جن میں ۳۷ لڑکیاں ہیں اور ۲۳ لڑکے۔
شیخ مفید کا ارشاد ہے کہ ان کی کل تعداد ۳۷ ہے۔ ۱۸ فرزند اور ۱۹ لڑکیاں۔ ان سب کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت علی بن موسیٰ الرضاؑ، ابراہیم، عباس، قاسم، اسماعیل، جعفر، ہارون، حسن، احمد، محمد، حمزہ، عبداللہ، اسحاق، عبیداللہ، زید، حسین، فضل، سلیمان، فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ، رقیہ، حلیمہ، ام ابیہا، رقیہ صغریٰ، کلثوم، ام جعفر، لبابہ، زینب، خدیجہ، آمنہ، حسنہ، بریہہ، عباسہ، ام سلمہ، میمونہ، ام کلثوم۔

آپ کی نسل مبارک کا سلسلہ تیرہ اولاد سے جاری ہوا ہے جن میں چار کی اولاد سب سے زیادہ ہے امام علی رضاؑ، ابراہیم، محمد عابد، جعفر۔ آپ کے چار بیٹے ایسے ہیں کہ جن کی اولاد نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم ہے۔ زید النار، عبداللہ، عبیداللہ، حمزہ (احسن المقال جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ سطر ۶)
پانچ فرزندوں کی اولاد قدرے کم تھی۔ عباس، ہرون، اسحاق، حسین، حسن۔

واضح رہے کہ سید شریف رضیؒ جنھوں نے مولائے کائنات کا کلام نہج البلاغہ کی شکل میں جمع کیا ہے اور سید شریف مرتضیٰ جو علم الہدیٰ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور اپنے دور کے بہترین متکلم اور مناظر تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی اولاد میں ہیں اور ان کی قبریں بھی کاظمین ہی میں ہیں۔

شیراز میں حضرت شاہ چراغ سید احمدؒ جن کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے اور لوگ برابر زیارت کے لیے آتے ہیں اور اپنی مرادیں حاصل کرتے ہیں یہ بھی امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی اولاد میں ہیں جو حضرت کی نگاہ میں بے حد عزیز اور محبوب تھے اور جنھوں نے راہِ خدا میں ایک ہزار غلام آزاد کیے تھے۔ ان کی

قبر مخفی تھی لیکن بادشاہ وقت تلاش میں نکلا تو ایک روشنی دکھائی دی جس کو دیکھ کر لوگوں نے توجہ دلائی کہ "شاہ! چراغ" نظر آ رہا ہے شاید کوئی آبادی ہے جس کی بنا پر ان کا لقب شاہ چراغ ہوگیا۔ انھیں کے روضہ کے قریب ان کے ایک بھائی سید محمد کا روضہ بھی ہے جنھیں کثرت عبادت کی بنا پر سید محمد عابد کہا جاتا تھا۔

تہران میں شاہ عبدالعظیم کے روضہ کے برابر جناب حمزہ کا روضہ ہے جن کی زیارت خود حضرت شاہ عبدالعظیم بھی اپنے دورِ حیات میں کیا کرتے تھے اور وہ بھی امام موسیٰ کاظمؑ کے ایک فرزند تھے اور نہایت درجہ صاحب کرامت تھے۔

آپ کی صاحبزادیوں میں جناب فاطمہ کا مرتبہ نہایت درجہ بلند ہے جنھیں معصومۂ قم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۲۰۰ھ میں مامون نے امام رضاؑ کو مدینہ سے مرو طلب کر لیا تو ایک سال کے بعد آپ بھائی کی زیارت کے اشتیاق میں مدینہ سے روانہ ہوگئیں، راستہ میں بیمار ہوئیں حضرات قم آپ کو قم لے آئے۔ موسیٰ بن خزرج کے مکان میں قیام فرمایا اور تکان سفر یا فراق برادر کے صدمہ سے ۱۷ روز کے بعد دنیا سے انتقال فرما گئیں۔ اشراف قم نے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور ارض بابلون پر سپرد خاک کر دیا جہاں آج آپ کا روضۂ مبارکہ پایا جاتا ہے۔

صاحب تاریخ قم نے تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جب جنازہ تیار ہوگیا تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ سرداب میں کون اتارے گا؟ تو ایک بزرگ کا انتخاب کیا گیا اور انھیں طلب کیا گیا۔ لیکن ان کے آنے کے بعد دیکھا گیا کہ ریگستان کی طرف سے دو سوار آ رہے ہیں جنھوں نے جنازہ کے قریب پہونچ کر سواری سے اُتر کر نماز جنازہ ادا کی اور اس کے بعد سرداب میں جنازہ کو سپرد خاک کرکے فوراً چلے گئے اور کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ کون افراد تھے۔ اس کے بعد موسیٰ بن خزرج نے قبر مطہر پر ایک سائبان بنا دیا اور اس کے بعد زینب بنت امام جوادؑ نے قبّہ کی تعمیر کرائی جو آج انتہائی ترقی یافتہ شکل میں پایا جا رہا ہے اور مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔

۱۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ کی اولاد کے برکات و خیرات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ہمارے دور کے دو عظیم اعاظم علماء جو علم و معرفت اور جہاد و سیاست کے میدان میں تاریخ اسلام میں بے مثل و بے نظیر ہیں یعنی آیۃ اللہ العظمیٰ السید ابوالقاسم الخوئیؒ اور

رہبر انقلاب اسلامی آیۃ اللہ العظمیٰ روح اللہ الخمینی یہ دونوں حضرات بھی امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی اولاد میں ہیں اور ان حضرات کا وجود امامؑ کی زندگی کے دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کر رہا ہے کہ اگر آپ کے علمی خدمات کو دیکھنا ہے تو ان کے ایک فرزند کو دیکھو، اور اگر ان کے جہاد راہ خدا کا اندازہ کرنا ہے تو ان کے دوسرے فرزند کے جہاد کو دیکھو جس نے انتہائی پریشانی اور غریب الوطنی کے عالم میں وہ کار نمایاں انجام دیا ہے جس سے قیدخانۂ بغداد میں اپنے جد بزرگوار کے مجاہدہ کی یاد تازہ کرا دی جہاں دو سطروں کے خط سے قصر ہارون کی چولیں ہلا دیں کہ "اے ہارون! ہر جانے والا دن ایک دن تیری راحت میں کم کرتا ہے اور ایک دن میری مصیبت میں۔ اس کے بعد ہم دونوں بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے والے ہیں جہاں اپنے اپنے حسابات کو دیکھنے والے ہیں۔

شواہد امامت امام موسیٰ بن جعفرؑ

۱۔مفضل بن عمر الجعفی

ایک معتبر ترین بزرگ ہیں۔ آپ نے امام صادقؑ سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد کا امام کون ہے جس کی امامت کا اعتراف کیا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرا فرزند موسیٰ۔ (بحار ج ۱۱ ص ۲۳۴)

۲۔یزید بن سلیط

ایک صاحب ورع وعلم بزرگ ہیں۔ حج بیت اللہ کو جاتے ہوئے راستہ میں امام صادقؑ سے ملاقات ہوگئی تو عرض کیا کہ "میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ حضرات ائمہ اطہار ہیں لیکن موت سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ تو اگر یہ حادثہ پیش آگیا تو آپ کے بعد ذمہ دار دین کون ہوگا؟"

آپ نے اپنے فرزند موسیٰ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے پاس علم، حکمت، فہم، سخاوت، معرفت احکام، حسن اخلاق، حسن جوار جیسے تمام فضائل موجود ہیں۔ یہ ایک دروازۂ رحمت ہے اور اس کے پاس ان سب سے ماوراء ایک فضیلت اور بھی ہے۔!

راوی نے عرض کی کہ وہ کیا ہے؟

فرمایا کہ اللہ اس کی نسل سے اس شخص کو پیدا کرے گا جو اس امت کا مددگار، فریادرس، اس کی ہدایت کا پرچم، نورمجسم اور بہترین انسان ہوگا۔ اس کے ذریعہ اللہ زندگیوں کا تحفظ کرے گا، اختلافات کی اصلاح کرے گا، پراگندگی اور انتشار کو دور کرے گا۔ برہنہ کو لباس اور بھوکے کو غذا، خوف زدہ کو امن حاصل ہوگا، باران رحمت کا نزول ہوگا۔ وہ بہترین فرزند اور بہترین بزرگ ہوگا۔ اس کا قول قول فیصل اور اس کی خاموشی علم وحکمت ہوگی۔ (بحار ج ۱۱ ص ۲۳۴)

۳۔داؤد بن کثیر

عرض کرتے ہیں کہ فرزند رسولؐ۔ آپ سے پہلے تمام لوگ دنیا سے جا چکے ہیں اور اب اگر یہ حادثہ پیش آگیا تو کس کی طرف رجوع کیا جائے گا؟۔ فرمایا میرا فرزند موسیٰؑ۔

۴۔فیض بن المختار

امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امام موسیٰؑ کے بارے میں باتیں کرنے لگے کہ اتنے میں آپ بیت الشرف سے واپس ہوئے اور امام صادقؑ نے فرمایا کہ فیض! یہی وہ ہے جس کے بارے میں تم سوال کر رہے تھے، اٹھو اور اس کے حق کا اقرار کرو۔ فیض نے امامؑ کے دست اقدس اور پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر سوال کیا کہ مولا کیا اس کی اطلاع دوسروں کو دی جا سکتی ہے؟۔ فرمایا بےشک اپنے اہل وعیال اور رفقاء کو باخبر کر دینا لیکن یہ خبر عام نہ ہونے پائے کہ زمانہ انتہائی خطرناک خراب ہے اور حکومت وقت ہر وقت حجت خدا کی زندگی کے درپے ہے۔ (بحار ج ۱۱ ص ۲۳۴) اصول کافی

۵۔ابراہیم کرخی

امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ تشریف لے آئے، ابراہیمؒ نے تعظیم کی. آپ نے فرمایا کہ ابراہیم! میرے بعد تمہارا امام یہی ہے اس کے بارے میں ایک قوم ہلاک ہو جائے گی اور ایک نیک بخت ہوگی۔ خدا اس کے قاتل پر لعنت کرے اور اس کے عذاب کو دوچند کرے۔ اس کے صلب سے بہترین اہل زمانہ پیدا ہوگا جو دنیا سے ظلم اور ظالمین کا خاتمہ کرے گا.... اس کی نسل سے وہ بارہواں امام ہوگا جس کا اقرار کرنے والا رسول اکرمؐ کے ساتھ جہاد کرنے والے کے برابر ہوگا۔

گفتگو یہاں تک پہونچی تھی کہ کوئی اجنبی شخص آگیا اور امام خاموش ہوگئے یہاں تک کہ ابراہیم چلے گئے اور دل میں گفتگو کے نامکمل رہ جانے کا صدمہ رہ گیا۔ دوسرے سال پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ وہ انتہائی تنگی اور دشواری اور جزع وخوف کے بعد شیعوں کے حالات کی اصلاح کرے گا اور ان کے رنج والم کو دور کرے گا۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو اس کی خدمت میں حاضری دے ۔ ابراہیم یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ امام کی گفتگو مکمل ہوگئی۔ (بحار ۱۱ ص ۲۳۵)

۶۔عیسیٰ العلوی

امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آگیا تو آپ

کے بعد امام کون ہوگا؟ ۔ فرمایا میرا فرزند موسیٰ! عرض کی کہ اس کے بعد؟ ۔ فرمایا، اس کا فرزند!
عرض کی اگر اس کے وارثوں میں ایک بھائی اور ایک فرزند ہو تو وارث کون ہوگا؟ فرمایا اس کا
فرزند! ۔ عرض کی کہ اگر میں اسے نہ پہچان سکوں؟ فرمایا بس اسی قدر ایمان رکھو کہ پروردگارا! جو
اس کے بعد تیری حجت ہے وہی میرا امام ہے ۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۳۰۹ ۔ بحار ج ۱۱ ص ۲۳۵)

۷۔ معاذ بن کثیر

امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ جس
طرح اپنے پدر بزرگوار کی جگہ آپ کو یہ مرتبہ دیا ہے۔ آپ کی اولاد میں بھی ایسا صاحب مرتبہ پیدا کرے۔
فرمایا کہ اللہ اسے پیدا کر چکا ہے اور یہ کہہ کر اپنے فرزند موسیٰ کی طرف اشارہ کیا جو اس وقت آرام فرما رہے
تھے ۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۳۰۸)

۸۔ منصور بن حازم

امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ عرض کی کہ کسی کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگر کوئی
حادثہ پیش آگیا تو آپ کے بعد امام کون ہوگا؟ فرمایا یہ میرا فرزند موسیٰ! (جن کی عمر اس وقت صرف
پانچ سال کی تھی)۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۳۰۹

۹۔ سلیمان بن خالد

ایک جماعت کے ساتھ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھے کہ امام موسیٰ آگئے تو آپ نے فرمایا
کہ میرے بعد یہی تمہارا امام اور ولی ہوگا۔

۱۰۔ اسحاق بن جعفر

کہتے ہیں کہ میں والد محترم کی خدمت میں حاضر تھا کہ عمران بن علی نے آپ سے سوال کیا کہ
آپ کے بعد ذمہ دار دین کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا جو سب سے پہلے یہاں حاضر ہوگا۔ اتنے میں امام موسیٰ
بزم میں داخل ہوئے جن کی عمر صرف چند برس کی تھی ۔ (ارشاد ص ۲۷۵، کشف الغمہ ص ۲۴۴)

۱۱۔ علی بن جعفر

کہتے ہیں کہ میرے والد محترم نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت سے فرمایا کہ میرے فرزند موسیٰ
کے ساتھ بہترین برتاؤ کرنا کہ وہ بہترین خلائق ہے اور میرے بعد میرا جانشین ہوگا۔

۱۲۔ زرارہ بن اعین

کہتے ہیں کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا جہاں حضرت موسیٰ بن جعفر بھی موجود تھے اور
ایک جنازہ بھی رکھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میرے اصحاب میں سے حمران، ابو بصیر اور داؤد رقی کو طلب
کرو۔ میں نے سب کو حاضر کیا اور اتفاق سے مفضل بن عمر اور دیگر افراد بھی آگئے تو آپ نے اسماعیل کے رُخ
سے چادر کو ہٹا کر فرمایا کہ داؤد یہ زندہ ہیں یا مُردہ؟ عرض کی یہ تو انتقال کر چکے ہیں۔ آپ نے سب کو گواہ
بنایا اور اس کے بعد غسل و کفن کا سلسلہ شروع کیا۔ غسل و کفن کے بعد آپ نے دوبارہ سب کو چہرہ
کی زیارت کرائی کہ یہ اسماعیل ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد آپ نے دفن کا حکم دیا۔ جب
جنازہ قبر میں اُتارا گیا تو آپ نے پھر سب کو چہرہ دکھلایا اور پوچھا کہ دفن ہونے والا کون ہے؟ سب
نے عرض کی "اسماعیل"۔ آپ نے اپنے فرزند موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ یہ امام برحق ہے اور حق اس
کے ساتھ ہے اور اس کی نسل میں رہے گا۔

ان تمام تصریحات کا مقصد صرف یہ تھا کہ قوم کو اسماعیل کی موت کے بارے میں کوئی
شبہ نہ رہ جائے اور امام موسیٰؑ کی امامت کا یقین ہو جائے۔ اس لیے کہ ایک طبقہ کو حضرت اسماعیل کی
امامت کا خیال بہر حال پیدا ہو چلا تھا ۔ اور ایک قوم آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے جس
کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اعترافات

آپ علم و معرفت، فضل و کمال میں امام جعفرؑ کے وارث اور جانشین تھے اور دنیا کے سب سے
بڑے عبادت گذار، عالم اور سخی تھے ۔ (ابن حجر مکی)

آپ انتہائی قدر و منزلت کے مالک اور عظیم الشان مجتہد تھے، عبادات و طاعت میں
مشہور زمانہ اور کرامات میں شہرۂ آفاق تھے۔ تمام رات عبادات میں بسر کرتے تھے اور دن میں
صدقہ و صیام انجام دیا کرتے تھے ۔ (ابن طلحہ شافعی)

آپ بڑی قدر و منزلت والے منفرد امام تھے اور عظیم الشان حجت خدا تھے۔ نمازوں کی
وجہ سے تمام رات جاگتے تھے اور دن میں روزہ رکھتے تھے ۔ (علامہ شبلنجی)

آپ اپنے دَور کے سب سے بڑے عالم، عبادت گزار، سخی اور بلند نفس انسان تھے۔
______ (ابن صباغ مالکی)

آپ عابد ترین اہلِ زمانہ اور کریم ترین دوراں تھے۔ آپ کے فضائل و کمالات بے شمار ہیں ____ (حسین واعظ کاشفی)

آپ قدر و منزلت کے اعتبار سے بزرگ ترین اہل عالم تھے اور اپنے پدر بزرگوار کی نص کے مطابق ولیِ امر امامت قرار پائے تھے ____ (روضۃ الاحباب)

کرامات

● شقیق بلخی جو صوفیوں میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں ۱۴۹ھ میں حج بیت اللہ کے لیے نکلا تو مقام قادسیہ پر ایک شخص کو ایک مجمع کے درمیان دیکھا اور حلیہ سے اندازہ کیا کہ کوئی صوفی ہے جو قوم کے سر پر بار بننا چاہتا ہے۔ میں آگے بڑھا کہ اسے تنبیہ کروں، تو اس نے میرا نام لے کر آواز دی کہ خبردار! بدگمانی مت کرو تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کوئی عبد صالح ہے۔

میں ان کی تلاش میں آگے بڑھا تو دوسرے مقام پر وادیٔ فضہ میں پھر مشغول عبادت دیکھا اور ارادہ کیا کہ معافی طلب کروں کہ میں نے بدگمانی کیوں کی تھی۔ قریب پہونچا تو اس شخص نے آواز دی کہ خدا توبہ کرنے والے کے گناہ کو بخش دیتا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کوئی ابدال میں سے ہے لیکن وہ پھر آگے بڑھ گیا۔ منزل زبالہ پر میں نے پھر دیکھا کہ کنویں سے پانی بھرنا چاہتا تھا کہ پیالہ کنویں میں گر گیا اور اس نے خدا سے مناجات کی کہ پیالہ کے بغیر میرا کام نہیں چل سکتا ہے اور نکالنے کا کوئی وسیلہ بھی نہیں ہے تو پانی کنویں میں بلند ہوا اور اس نے بھرا ہوا پیالہ نکال لیا اور وضو کر کے چار رکعت نماز ادا کی اور ایک مٹھی ریت پیالہ میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے قریب جا کر بھوک کی شکایت کی تو مجھے بھی عنایت فرما دیا اور میں نے دیکھا کہ بہترین ستو ہے جس کو کھانے کے بعد پورے سفر میں مجھے پھر کبھی بھوک نہیں لگی۔ مکہ مکرمہ میں میں نے پھر دیکھا کہ ایک ٹیلہ پر بیٹھے ہوئے محو عبادت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہا۔ پھر انھوں نے طواف کیا اور ان کے گرد بے شمار افراد تھے جو ان کا بے حد احترام کر رہے تھے تو میں نے کسی شخص سے

پوچھا کہ یہ صاحب کرامات کون ہیں؟ تو اس نے بتایا کہ یہ فرزند رسولؐ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ اس قسم کے کرامات اس گھرانے کے علاوہ اور کسی مقام پر ممکن نہیں ہیں۔

(نورالابصار، شواہد النبوۃ)

● عیسیٰ مدائنی حج بیت اللہ کے لیے گئے اور مکہ میں ایک سال رہنے کے بعد مدینہ چلے گئے، وہاں بھی ایک سال قیام کا ارادہ تھا تو کرایہ پر مکان لیا اور امام موسیٰ کاظمؑ کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ ایک رات امام کی خدمت میں حاضر تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ آپ نے فرمایا کہ جلدی جاؤ تمھارا مکان منہدم ہو گیا ہے۔ وہ دوڑ کر پہونچے تو کیا دیکھا کہ لوگ سامان نکال رہے ہیں۔ دوسرے دن امامؑ کی خدمت میں پہونچے تو آپ نے دریافت کیا کہ کوئی چیز گُم تو نہیں ہوئی ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ صرف ایک طشت گُم ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے لوگوں نے سامان نکالنے میں گُم کر دیا ہے۔ فرمایا کہ اسے تم انہدام سے پہلے بیت الخلاء میں رکھ کر بھول گئے تھے۔ اب جا کر مالک کی لڑکی سے دریافت کرو، وہ لا کر دے دے گی۔ عیسیٰ مدائنی نے واپس آکر دریافت کیا تو امامؑ کے ارشاد کے مطابق طشت مل گیا۔ (نورالابصار)

● ایک شخص نے ایک صحابی کے ہمراہ ۷۰ دینار روانہ کیے۔ اس نے مدینہ پہونچ کر سوچا کہ اسے پاک کر لیا جائے۔ پاک کرنے کے بعد گنا تو ایک کم تھا۔ اس نے ایک دینار اپنے پاس سے ملا دیا، اور حضرت کی خدمت میں تھیلی پیش کر دی تو آپ نے فرمایا کہ اسے زمین پر اُنڈیل دو۔ اس نے اُنڈیل دیا تو آپ نے اس کا دینار یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ صاحب مال نے وزن کے اعتبار سے بھیجا تھا اور عدد میں اس کی تعداد ۶۹ ہی تھی، لہٰذا تمھیں اپنے پاس سے ملانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(شواہد النبوۃ)

● ایک شخص کا بیان ہے کہ علی بن یقطین نے میرے ذریعہ سوالات روانہ کیے۔ میں نے حضرت کو لفافہ دے دیا۔ آپ نے اسے کھولے بغیر اپنی آستین میں سے ایک خط نکال کر دیا اور فرمایا کہ اسے علی بن یقطین کو دے دینا اور کہنا کہ یہ تمھارے سوالات کے جوابات ہیں۔ (شواہد النبوۃ)

ابو حمزہ بطائنی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سفر حج میں ایک شیر نظر آگیا اور اس نے حضرت کے پاس آکر کچھ کہا اور آپ نے اسی کی زبان میں جواب دے دیا تو چلا گیا۔ میں نے اس کرامت کا راز

دریافت کیا تو فرمایا کہ اس کی شیرنی کو کوئی تکلیف تھی۔ اس نے دعا کی التماس کی تھی تو میں نے دُعا کردی اور وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ (تذکرۃ المعصومینؑ)

اخلاقیات

یوں تو ائمہ معصومینؑ کی ساری زندگی مجسمہ اخلاق و تہذیب ہوا کرتی تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں اور تبلیغی میدان میں آپ حضرات نے ایسے ایسے اخلاق فاضلہ کا اظہار کیا ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ایک سنگ دل اور بدبخت ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ حلیؒ نے منہاج الکرامہ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ جب آپ بغداد میں انتہائی پریشانی کی زندگی گذار رہے تھے تو ایک دن ایک راستہ سے گذر رہے تھے دیکھا کہ گھر کے اندر رقص و رنگ کی محفل جمی ہوئی ہے اور باہر گانے کی آواز آ رہی ہے۔ اسی اثنا میں گھر کی کنیز کوڑا پھینکنے کے لیے باہر آگئی۔ آپ نے اُس سے پوچھا کہ یہ مکان کسی بندہ کا ہے یا آزاد کا؟ اس نے فوراً جواب دیا کہ آزاد کا۔ آپ نے فرمایا کہ بے شک اگر بندہ ہوتا تو اپنے مالک کی اطاعت کرتا، اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ کنیز گھر کے اندر واپس آئی تو صاحب خانہ بُشر نے تاخیر کا سبب پوچھا۔ اُس نے واقعہ بیان کیا۔ بُشر کے دل پر واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ ننگے پیر دوڑ پڑے اور حضرت سے ملاقات کر کے بارگاہ احدیت میں استغفار کیا اور تمام عمر اس واقعہ کی یاد میں ننگے پیر چلے۔ اور جب بعض افراد نے سوال کیا کہ اس پا برہنگی کا راز کیا ہے؟ تو کہا کہ پروردگار نے زمین کو بساط اور فرش سے تعبیر کیا ہے اور یہ بندہ کی مجال نہیں ہے کہ مالک کے فرش پر جوتا پہن کر چلے۔

ایک مختصر سے جملہ سے انسان کے کردار میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دینا کہ شراب و کباب سے تقویٰ اور طہارت کی منزل تک آجائے، امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی زندگی کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس کی مثال اولیاء اللہ کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی ہے۔ اُدھر قید خانہ میں ہارون کی بھیجی ہوئی عورت سے سجدہ کرا لینا اور اسے راہ عبادت پر لگا دینا امام کی عملی تبلیغ کا بہترین نمونہ ہے۔ جس کے بعد یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ بدترین حالات میں اپنے کردار کا بچا لینا مصر کے معصوم جناب یوسفؑ کا کارنامہ تھا اور آئی ہوئی عورت کو اپنے راستہ پر لگا دینا بغداد کے قیدی امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کا کارنامہ ہے۔

بُشر حافی کے کردار میں اس قدر انقلاب پیدا ہو گیا کہ ان کے حالات میں حسب ذیل حکیمانہ کلمات بھی نقل کیے گئے ہیں:

- آخرت کو اپنا راس المال اور سرمایہ قرار دو تاکہ دنیا میں جو کچھ مل جائے اسے فائدہ شمار کرو۔
- تمہارے موعظہ کے لیے یہی کافی ہے کہ بعض افراد خود مر چکے ہیں۔ لیکن ان کے تذکرہ سے دلوں کو زندگی مل رہی ہے اور بعض افراد خود زندہ ہیں لیکن ان کے دیکھنے سے قساوت قلب اور سنگ دلی پیدا ہوتی ہے۔
- حدیثوں کی بھی زکوٰۃ ادا کیا کرو کہ کم از کم دو سو حدیثوں میں سے پانچ پر تو عمل کر لیا کرو۔
- محمد بن نعیم نے حالت مرض میں موعظہ کی فرمائش کی تو فرمایا کہ اس گھر میں ایک چیونٹی تھی جو گرمی میں دانے اکٹھا کرتی تھی تاکہ سردی میں استعمال کرے کہ اچانک ایک دن دانہ لے کر نکلی تو ایک چڑیا نے چھین لیا اور نہ جمع کیا ہوا کام آیا اور نہ وہ مقصد حاصل ہوا جس کا ارادہ کیا تھا۔ یہی حال انسان کا بھی ہے تو اسے چیونٹی ہی کے حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ (الکنیٰ والالقاب)

نقشِ انگشتر

آپ کی انگشتری کا نقش تھا "حسبی اللّٰہ" جو آپ کے دور کے حالات کی مکمل ترجمانی اور مظالم کے مقابلہ میں آپ کے توکل علی اللہ کا واضح اعلان تھا۔

عبادت

امام موسیٰ کاظمؑ کا انداز عبادت بھی دنیا کے دوسرے افراد سے بالکل مختلف تھا۔ آپ قید خانہ کی زندگی میں بھی اس بات پر شکر خدا کرتے تھے کہ عبادت کے لیے بہترین ماحول نصیب ہو گیا ہے اور اسی بات پر حکومت وقت کے ہوش و حواس اُڑ جاتے تھے کہ ان بدترین حالات میں بھی ان کے ذہن میں اضطراب اور پریشانی کی کیفیت نہیں ہے جب کہ حکومت ان کے عدم اضطراب سے مضطرب ہے۔

آپ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ صبح کی نماز کے بعد سر سجدہ معبود میں رکھتے تھے تو ظہر کے

ہنگام سر اٹھاتے تھے اور عصمت کے باوجود یہ مناجات کرتے تھے کہ "پروردگار! تیرے بندہ کے گناہ بہت عظیم ہیں لہٰذا تیری بخشش بھی اسی اعتبار سے ہونی چاہیے۔" جو اس بات کی علامت ہے کہ امامؑ کو اپنی قوم سے کس قدر ہمدردی تھی اور ان کی شفاعت کے بارے میں کس قدر اہتمام فرمایا کرتے تھے کہ آپ کو روایات میں "حلیف السجدة الطویلة" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

خود ہارون رشید نے بھی یہ شانِ عبادت دیکھ کر داروغۂ زنداں سے کہا تھا کہ یہ بندۂ خدا اس قید کا حق دار نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اسے قیدی بنائے بغیر اپنی حکومت نہیں چل سکتی ہے۔

اسی شانِ عبادت و بندگی کا اثر تھا کہ جس قید خانہ میں رہے داروغۂ زنداں اور ملازمین آپ کے ہمدرد بن گئے اور حکومت کے اصرار کے باوجود زہر دینے یا ایذا پہونچانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ سندی بن شاہک ملعون نے زہر بھی دیا تو ضمیر کی ملامت اور عوام کی بغاوت کے خوف سے اشتی افراد کو جمع کر کے ان سے شہادت طلب کی کہ امامؑ کو زہر نہیں دیا گیا ہے اور یہ بالکل صحیح و سالم حالت میں ہیں جس پر آپ نے ان لوگوں کو گواہی دینے سے منع کیا اور فرمایا کہ میں تین دن کے بعد اس زہر کے اثر سے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ خبردار! تم لوگ اپنے ہاتھوں کو اس خون ناحق سے رنگین نہ کرو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ظالم سندی بن شاہک نے چادر کے اندر آپ کو اس طرح لپیٹنا شروع کیا جس طرح کپڑا نچوڑا جاتا ہے اور اس کے زیر اثر آپ کی شہادت واقع ہو گئی۔ جس کے بعد پھر جنازہ کو دکھلا کر لوگوں سے گواہی طلب کی گئی کہ کسی زخم وغیرہ کا نشان نہیں ہے اور یہ اپنی موت سے دنیا سے گئے ہیں۔ جو ظالم کے احساس ظلم اور امام کی فتح مبین کی بہترین علامت ہے۔ ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون۔

حقائقِ زندگی اور امام موسیٰ بن جعفرؑ

زندگی اور بندگی کے حقائق کو بے نقاب کرنے میں ائمہ معصومینؑ نے جو کردار ادا کیا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی انھیں ائمہ اہلبیتؑ کی ایک فرد تھے، لہٰذا آپ کا دور اگرچہ شدت مصائب و آلام کا دور تھا لیکن آپ نے اپنے فرضِ منصبی کو ادا کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی اور مسلسل حقائق مذہب کو بے نقاب کرتے رہے۔

ذیل میں صرف چند موضوعات کے بارے میں آپ کے ارشاداتؑ کو نقل کیا جا رہا ہے جنھیں مختلف علماء و مصنفین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور جن سے امامت کے افکار و نظریات کا مکمل اندازہ ہو سکتا ہے:

ایمان:

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ بہترین عمل کون سا ہے؟

آپ نے فرمایا کہ جس کے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہ ہو سکے۔

عرض کی وہ کیا ہے؟

فرمایا کہ ایمان! جو سب سے بلند ترین اور شریف ترین منزل عمل و کردار ہے۔

عرض کی ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا صرف قول بلا عمل کا؟

فرمایا کہ ایمان کل کا کل عمل ہے۔ قول تو اس کا ایک جزء ہے جس کی وضاحت کتاب عزیز نے خود ہی کر دی ہے۔

عرض کی، ذرا کچھ اور وضاحت فرمائیں کہ ہم لوگ سمجھ سکیں۔

فرمایا کہ ایمان کے درجات و حالات و طبقات و منازل ہیں۔ ایمان انتہائی کامل بھی ہوتا ہے اور انتہائی ناقص بھی اور نسبتاً کامل بھی۔

عرض کی کیا ایمان میں زائد و ناقص ہوتا ہے۔؟

فرمایا، بے شک!

عرض کی کس طرح؟

فرمایا، اللہ نے ایمان کو انسان کے اعضاء و جوارح پر تقسیم کر دیا ہے اور ہر عضو کو ایمان کی ایک ذمہ داری سپرد کی ہے۔ کچھ ذمہ داریاں دل کی ہیں جن کا خلاصہ سمجھنا اور تعقل کرنا ہے۔ وہ جسم کا امیر و رئیس ہے اس کی رائے کے بغیر کوئی عضو حرکت نہیں کر سکتا اور کچھ ذمہ داریاں ہاتھوں، پیروں، آنکھوں، کانوں اور شرمگاہوں کی ہیں۔ دل کا فرض زبان سے مختلف ہوتا ہے اور زبان کا فرض آنکھوں سے۔ آنکھوں کا فرض کانوں سے مختلف ہوتا ہے اور کانوں کا فرض ہاتھوں اور پیروں سے اور ہاتھوں پیروں کا فرض شرمگاہوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دل کا فرض یہ ہے کہ اقرار، معرفت، تصدیق، تسلیم و رضا اور عقیدہ سے کام لے اور یہ سمجھے کہ خدا وحدہ لاشریک ہے۔ اس کا کوئی فرزند و ہمسر نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں وغیرہ . . . . (اصول کافی ج ۲ ص ۲۸)

عِلم:

مورخین نے نقل کیا ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ مسجد پیغمبرؐ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ لوگ ایک شخص کے گرد جمع ہیں اور اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ بہت بڑا عالم ہے!

فرمایا کہ یہ بڑا عالم کیا ہوتا ہے۔ عرض کی کہ یہ تمام عرب کے انساب اور واقعات و حادثات کا جاننے والا ہے۔

فرمایا۔ یہ وہ علم ہے جس کا جاننا مفید ہے اور نہ جاننا مضر نہیں ہے۔ اسے علم نہیں کہتے ہیں۔ علم کی تین قسمیں ہیں: آیت محکمہ، فریضہ عادلہ اور سنت قائمہ۔ اس کے علاوہ سب فضل ہے علم نہیں ہے۔

حقیقی علم یہ ہے کہ انسان چار باتوں کی اطلاع پیدا کرے۔ (۱) خدا کو پہچانے۔ (۲) یہ پہچانے کہ اس نے انسان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ (۳) یہ دریافت کرے کہ وہ بندے سے کیا چاہتا ہے (۴) یہ معلوم کرے کہ کون سی چیزیں انسان کو دین سے خارج کر دیتی ہیں۔

علم فقہ:

دینی معلومات کے بارے میں اپنے اصحاب کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"علم دین حاصل کرو کہ یہ بصیرت کی کلید، عبادت کی تکمیل، بلند منزلوں کا ذریعہ اور اعلیٰ مراتب دنیا و آخرت کا وسیلہ ہے۔ عابد کے مقابلہ میں عالم کا وہی مرتبہ ہے جو ستاروں کے مقابلہ میں آفتاب کا مرتبہ ہے۔ جو علم دین حاصل نہ کرے اللہ اس کے کسی عمل سے راضی نہ ہوگا۔"

"عالم سے مزبلہ پر بھی گفتگو کرنا جاہل سے فرش مخمل پر بات کرنے سے بہتر ہے۔"

"علماء رسولوں کے امانت دار ہیں جب تک کہ دنیا داری میں داخل نہ ہوں۔ یہی میرے جد بزرگوار کا بھی ارشاد ہے۔"

ایک شخص نے عرض کی کہ فرزند رسولؐ! آخر دنیا داری میں داخل ہونے کا مطلب کیا ہے؟

فرمایا کہ "سلاطین کی پیروی"، کہ ایسا کرنے والے علماء سے احتیاط کرنا بہرحال ضروری ہے۔

عمل:

ائمہ معصومینؑ نے عبادات کی طرح کسب معاش کے لیے بھی زحمتیں برداشت کی ہیں اور اہل دنیا کو یہ درس دیا ہے کہ یہ انسان کا ایک بہترین فریضہ ہے۔ امام جعفر صادقؑ ہاتھ میں کدال لیے پسینہ میں غرق محنت کر رہے تھے کہ ایک شخص نے گزارش کی کہ حضور یہ مجھے دے دیجیے، میں یہ کام کر دوں گا۔؟

فرمایا کہ "طلب رزق کے لیے آفتاب کی تمازت میں کام کرنا مجھے بے حد پسند ہے۔"

امام موسیٰ بن جعفرؑ اپنی زمین میں محنت کر رہے تھے کہ حسن بن علی بن ابی حمزہ کی نظر پڑ گئی عرض کی کہ آپ کیوں زحمت فرما رہے ہیں باقی لوگ کہاں چلے گئے؟ فرمایا کہ یہ کام مجھ سے بہتر افراد نے بھی انجام دیا ہے۔

عرض کی کہ وہ کون حضرات ہیں؟۔ فرمایا کہ مرسل اعظمؐ اور مولائے کائنات ۔۔۔ اور یہ تو جملہ انبیاء و صالحین کی سیرت رہی ہے۔ (من لا یحضرہ الفقیہ ج ۳ ص ۳)۔۔۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی اولاد کو سستی اور کسل مندی سے منع فرمایا کہ اس سے دنیا اور آخرت دونوں کا نصیب برباد ہو جاتا ہے ۔۔۔ سستی کرنے والا مُردوں کے حکم میں ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی فکر اور تدبیر نہیں ہوتی ہے۔

خدمت خلق:

اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"جس کے پاس کوئی برادر مومن مدد مانگنے کے لیے آئے اور وہ باوجود قدرت کے اسے رد کر دے تو گویا اس نے ولایت الٰہی کے رشتہ کو منقطع کر دیا ہے اس لیے کہ پروردگار نے قضاء حوائج مومنین کا حکم دیا ہے۔ اور مومن کا مدد مانگنے کے لیے آنا درحقیقت ایک رحمت پروردگار ہے۔ انسان نے اس کے مدعا کو پورا کیا تو گویا ہمارے رشتہ کا خیال رکھا اور وہی رشتہ پروردگار کا ہے۔ اور مومن کو رد کر دیا تو پروردگار اس کے اوپر آگ کے سانپ مسلط کر دے گا جو قبر میں بھی اسے اذیت پہونچاتے رہیں گے۔"

"روئے زمین پر ایسے بندگانِ خدا موجود ہیں جو لوگوں کی حاجت برآری کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ روز قیامت کے ہول سے محفوظ رہیں گے اور جو بھی کسی مومن کو خوش کرے گا، پروردگار روزِ قیامت اس کے دل کو خوش حال بنا دے گا۔" (وسائل الشیعہ باب الامر بالمعروف)

محاسبۂ نفس:

محاسبۂ نفس ایک انتہائی ضروری عمل ہے جس کی طرف ائمہ معصومینؑ نے اپنے چاہنے والوں کو برابر توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے بھی فرمایا:

"جو شخص اپنے نفس کا حساب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ محاسبۂ نفس کا فائدہ یہ ہے کہ نیکی کرنے والا نیکی میں اضافہ کرتا ہے اور بُرائی کرنے والا توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

تہذیب اخلاق

حضرت فرماتے ہیں کہ "نیکیاں زیادہ بھی ہوں تو انھیں زیادہ نہ سمجھو، اور بُرائیاں کم بھی ہوں تو انھیں کم نہ سمجھو کہ قلیل گناہ ہی بڑھ کر کثیر ہو جاتا ہے اور تنہائیوں میں خدا سے ڈرتے رہو تا کہ اپنے نفس کے ساتھ انصاف کر سکو۔"

"ماں باپ کے ساتھ بہترین برتاؤ کرو تا کہ جنت تک منحصر رہو اور بُرا برتاؤ نہ کرو کہ جہنم تک محدود ہو کر رہ جاؤ۔"

"اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کرنا شکر ہے اور اس کا ترک کر دینا کفرانِ نعمت ہے۔ نعمتوں کا سلسلہ شکر سے ملا دو اور اپنے اموال کا تحفظ زکوٰۃ کے ذریعہ کرو۔ بلاؤں کو دعاؤں کے ذریعہ رد کرو، اور یاد رکھو کہ دعا ردِ بلا کے لیے ایک سپر ہے۔" وما توفیقی الا باللہ۔

جہاد امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام

ائمہ معصومینؑ کی زندگی کے بارے میں یہ ایک عجیب و غریب تصور پایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ حکومت اور اقتدار سے بیزار رہے ہیں اور تنہائی کی زندگی پسند فرماتے رہے ہیں۔ ان کے سامنے جب بھی اقتدار کا مسئلہ آیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہم اہلِ آخرت ہیں، ہمیں دنیا کی حکومت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے تسبیح و تہلیل پروردگار ہی بہت کافی ہے اور ہم اسی سے اپنی عاقبت و آخرت کا انتظام کر لیں گے۔

یہ تصور اس قدر عام ہوا کہ صاحبانِ علم و فضل نے بھی اس مقولہ کو دلیل شرف بنا لیا کہ ہمیں دنیا کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اللہ والے ہیں، ہمارے لیے گوشہ نشینی اور عزلت گزینی ہی بڑی چیز ہے اور ہماری نجات کے لیے یہی زندگی کافی ہے۔

اربابِ اقتدار نے اس تصور کو اور بھی ہوا دی اور اس قدر عام کیا کہ اگر کسی صاحب علم و کمال نے اصلاحِ عالم کا ارادہ بھی کیا تو مخلص عوام نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آپ کا کام محراب میں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل الٰہی کرنا ہے۔ دنیا کا کام اہل دنیا سنبھال لیں گے آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل دنیا کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا اور اسلامی مقدسات، خدائی احکام، شعائرِ اسلام، شریعت اسلامیہ سب کھیل تماشہ بن گئے اور جس میں جس قدر تحریف و ترمیم کا امکان تھا اس میں اسی قدر دخل اندازی کی گئی اور حقیقت کے چہرہ کو مسخ کر دیا گیا کہ آج اسلام کی صحیح تصویر کو دین جدید تصور کیا جا رہا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ائمہ معصومینؑ ہمیشہ حکومت اور اقتدار ہی کی فکر میں رہے اور انھوں نے تسبیح و تہلیل کو معاذ اللہ بیکاری کا مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ ایسا تصور خود بھی ایک کفر کے مرادف ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ وہ حکومت و اقتدار سے الگ بھی رہے اور اس سے علیحدگی

کا اعلان بھی کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ قیام حکومت کی فکر بھی کرتے رہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد یا اختلاف بھی نہیں ہے۔

بات صرف یہ ہے کہ حکومت و سیاست میں دخل اندازی کے دو طریقے ہیں:

(۱) سیاست استقلالی (۲) سیاست اتباعی

سیاست استقلالی کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا نظام صاحبان ایمان کے ہاتھ میں ہو اور وہ جس طرح چاہیں اسلامی قوانین کی روشنی میں نظام حکومت کو چلائیں اور سارے معاملات و مقدمات کا خود فیصلہ کریں۔

سیاست اتباعی کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں رہے اور صاحبانِ ایمان جہاز حکومت میں شامل ہو جائیں اور حکومت کے اشاروں پر اسلام کو بھی چلاتے رہیں۔

اسلام جس سیاست کا شدید ترین مخالف ہے اور جسے مجبوری کے علاوہ کسی شکل میں بھی جائز قرار نہیں دیتا ہے وہ اتباعی سیاست ہے جس کا مطلب ہی درحقیقت اسلامی احکام کی بربادی ہے اور اس طریقۂ کار کو اسلام اس قدر قبیح قرار دیتا ہے کہ اس کے نظام میں ایک مستقل باب ہے "اعانت ظالم" اور "ولایت جائر" ـــــ جس کے سلسلہ میں اسلام نے ہر ایسے کام کو حرام قرار دے دیا ہے جس سے ظالمین کی مدد ہوتی ہو اور ان کے نظام حکومت کو تقویت حاصل ہوتی ہو۔ اس نے اس کام کو صرف صاحبانِ ایمان کو مصائب سے بچانے کے لیے جائز قرار دیا ہے ورنہ اسے بدترین تصور کیا ہے۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ کا علی بن یقطین کو اجازت دینا بھی اسی باب سے تھا کہ آپ صاحبانِ ایمان کے جان و مال کا تحفظ کرنا چاہتے تھے ورنہ علی بن یقطین کو یہ تصور بھی ہو جائے کہ میں امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بجائے حاکم وقت کو حاکم تصور کرتا ہوں تو عالم ایمان سے خارج ہو جائیں گے اور یہ ان کے حق میں ممکن بھی نہ تھا۔ ابن یقطین ہارون کو کسی قابل بھی سمجھتے ہوتے تو عہدہ پانے کے وقت امامؑ سے مسئلہ دریافت نہ کرتے اور حکومت کی طرف سے ملنے والے انعامات کو امام کی خدمت میں پیش نہ کرتے۔ یہ بات خود اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ سیاست اتباعی کا جواز صرف صاحبانِ ایمان کی جان و مال و آبرو کے تحفظ کے لیے ہے۔ اس کا قوم میں حیثیت پیدا کرنے، عوام کا استحصال کرنے اور حکومتوں سے سہولتیں حاصل کرنے یا مفت کی گاڑی میں سوار ہونے کے لیے کوئی جواز

نہیں ہے۔ یہ کام حرام تھا، حرام ہے اور حرام رہے گا۔ ظالمین سے کسی طرح کا تعاون بھی جائز نہیں ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ نے اس تعاون پر اتنی دور سے پابندی لگائی تھی کہ چاہنے والوں کے ذہن میں تعاون کے جواز کا تصور بھی نہ ہونے پائے ـــــ علی بن یقطین نے ابراہیم جمال سے ملاقات نہ کی تو امامؑ نے ابن یقطین کی ملاقات سے بھی انکار کر دیا کہ مبادا ابن یقطین کو عہدہ کا غرور پیدا ہو جائے اور "سیاست تحفظ" "سیاست اتباع" میں تبدیل ہو جائے۔

صفوان جمال سے یہ فرمانا کہ ظالموں کو اونٹ کرایہ پر دینا بھی محل خطر ہے کہ اس طرح ظالم کی حیات کی تمنا پیدا ہوتی ہے کہ وہ سفر سے زندہ واپس آئے اور کرایہ وصول ہو جائے ـــــ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ امامؑ اپنے اصحاب کو ہر طرح کے امکانی تعاون سے بھی دور رکھنا چاہتے تھے۔ خود امام علی رضاؑ کا ولی عہدی سے مسلسل انکار کرنا اور پھر مشروط طریقہ سے قبول کرنا ایک دلیل ہے کہ ائمہ معصومینؑ سیاست اتباع کے شدید ترین مخالف تھے اور اسلام کے دائرہ میں سیاست استقلال کے علاوہ اور کسی سیاست کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔

ارباب حکومت کی طرف سے عہدوں کی پیش کش سیاست اتباع تھی اور انقلابی جماعت کی طرف سے قیادت کی پیش کش سیاستِ ناکام۔ اسی لیے ائمہ معصومینؑ نے دونوں سے انکار کر دیا اور اس کے لیے بہترین عذر خدمتِ دین اور عبادت الٰہی جیسے مشاغل کو قرار دیا جو صحیح ترین عذر بھی تھا اور اس میں کسی طرح کے تقیہ اور توریہ کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لیے کہ واضح طور سے انکار کر دینا مقابلہ کو دعوت دینا تھا اور اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے ورنہ قیام ہی کیوں نہ فرماتے اور اس کے بعد بہترین عذر عبادت الٰہی ہی کا شغل تھا جس میں اپنی طرف سے حکومتوں کو مطمئن بھی کر دیا تھا کہ ہم سے کسی طرح کے انقلاب کا خطرہ نہیں ہے اور ایک طرح کی ہدایت بھی تھی کہ عبادت الٰہی کو ترک کر کے حکومت کرنا خلافِ اسلام ہے اور یہ حکومت عبادتِ الٰہی کے یقیناً منافی ہے ورنہ حکومت کا واضح جواب ہوتا کہ آپ اہل آخرت ہیں تو آخرت اور حکومت میں کوئی تضاد نہیں ہے یا عبادت اور حکمرانی میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن حکومت کو معلوم تھا کہ ہمارے نظام میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ جیسا کہ خود ائمہ معصومینؑ نے بھی مختلف مواقع پر واضح کر دیا تھا چنانچہ جب منصور نے امام صادقؑ سے کہا کہ آپ ہمارے دربار میں کیوں نہیں آتے ہیں

تو آپ نے فرمایا کہ نہ میرے پاس دنیا ہے کہ تیرا خوف پیدا ہو، اور نہ تیرے پاس آخرت ہے کہ اس کی طمع کی جائے۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ برائے نصیحت ہی آیا کیجیے تو آپ نے فرمایا کہ "جسے دنیا کی طلب ہوگی وہ تجھے نصیحت نہ کرے گا اور جسے آخرت کی طلب ہوگی وہ تیرے ساتھ نہ رہے گا۔"

ائمہ معصومینؑ کی حیات میں جس حکومت و سیاست سے کنارہ کشی کا ذکر ملتا ہے وہ اتباعی سیاست ہے ورنہ استقلالی سیاست اسلام کے اہم فرائض میں ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے امکان بھر حکومت اسلامی کے قیام کی کوشش کرے اور کم از کم سیاست ظلم اور نظام باطل کے خلاف آواز ہی بلند کرے تاکہ حق اور باطل کا امتیاز قائم ہو جائے اور عوام کو دھوکہ نہ ہونے پائے جیسا کہ ائمہ معصومینؑ کی حیات میں مسلسل نظر آتا ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی کے ساتھ ایک حادثہ یہ بھی رہا ہے کہ آپ کے جہاد پر ملوکیتوں نے اس شدت سے پردے ڈالے ہیں کہ اب وضاحت بھی مشکل ہو گئی ہے اور عوام الناس کے ذہن میں صرف یہی ایک تصور رہ گیا ہے کہ "مولا پہ انتہائی اسیری گزر گئی۔ زندان میں جوانی و پیری گذر گئی"۔ حالانکہ انتہائی مظلومیت کے بعد بھی امامؑ کی زندگی صرف ایسی نہیں تھی۔ آپ ۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور ۱۸۳ھ میں شہادت پائی ہے۔ مجموعی عمر ۵۵ سال ہے اور ۳۵ سال میں ہارون کی قید کا سلسلہ تقریباً ۱۴ سال رہا ہے تو باقی چالیس سال کی زندگانی تو قید میں نہیں رہی اس کے تو یقیناً کچھ اعمال، اشغال، خدمات اور مجاہدات ہوں گے اور ان کا تذکرہ تو تاریخ میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ تذکرہ اس "طویل زندگانی" کے اعتبار سے انتہائی مختصر ہے۔ زندگانی کو طویل اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ امام جوادؑ تو صرف ۲۵ سال ہی زندہ رہے ہیں اور امام عسکریؑ صرف ۲۸ سال زندہ رہے تو اس اعتبار سے ۵۵ سال کی عمر مظالم کے دور میں کچھ کم نہیں ہے لیکن تذکرہ بہرحال بہت مختصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مختصر تذکرہ کے درمیان بھی جہاد مسلسل کی جھلکیاں صاف نظر آجاتی ہیں۔

آپ نے زندگی کے بیس سال پدر بزرگوار کے زیر سایہ گذارے ہیں۔ اس کے بعد ۳۵ سال آپ کا اپنا دور امامت رہا ہے۔ دور امامت سے مراد منصب امامت نہیں ہے کہ وہ امام اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ دور امامت سے مراد ہدایت امت کی مستقل ذمہ داری کا دور ہے، اور اس ۳۵ سال میں چار حکام بنی عباس گذرے ہیں۔ دس سال منصور دوانیقی کا دور رہا ہے۔ دس سال

اس کے فرزند مہدی کا دور رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ سال مہدی کے فرزند ہادی کا دور رہا ہے اور پھر تیرہ چودہ سال ہارون رشید کا دور رہا ہے۔ اور یہ چاروں حکام اپنے وقت کے انتہائی ظالم، جابر، دشمن اہلبیت اور جلاد مشہور تھے اور امام نے ان کے دور حکومت میں بھی بقدر امکان جہاد کیا ہے اور کسی وقت سیاست اتباع کو رائج نہیں ہونے دیا ہے

ان حکام وقت کا مختصر تعارف یہ ہے:

منصور: ایک ایک دانق (پیسہ) کے بخل کی وجہ سے دوانیقی کہا جاتا تھا — ایسا دشمن اہلبیتؑ تھا کہ اس کے مرنے کے بعد جب اس کا خزانہ کھولا گیا ہے تو اس میں صرف سادات اور محبانِ اہلبیتؑ کے سروں کا ذخیرہ تھا اور سب پر شہیدوں کا نام اور ان کا شجرہ لکھا ہوا تھا۔ اس ظالم نے حسنی سادات کو دیواروں اور ستونوں میں زندہ چنوا دیا تھا جس کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایک بچہ کو زندہ دیوار میں چنوایا تو اس نے فریاد کی اور معمار نے ہوا کے لیے ایک سوراخ چھوڑ دیا اور رات کو آکر باہر نکال دیا۔ بچہ نے منت کی کہ میری والدہ کو میرے گھر جا کر میری رہائی کی اطلاع کر دینا ورنہ وہ بہت پریشان ہوں گی۔

مہدی: اس سے بھی بدتر حاکم تھا۔ ابتدا میں اس نے نرمی کا برتاؤ کیا لیکن اس کے بعد امامؑ کو بار بار مدینہ سے بغداد طلب کیا کہ قتل کر دیا جائے۔ لیکن بفضل الٰہی کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی نے امامؑ کو فدک واپس کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن آپ نے فرمایا کہ اس کے حدود تمام مملکت اسلامیہ کے حدود ہیں، اور فدک خلافت کی ایک تعبیر ہے۔ اسلامی حکومت کے بغیر باغ کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ یہ باغ درحقیقت اسلامی حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہے اور اس کے بغیر ہماری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ فدک صرف ایک باغ ہو یا جاگیر ہو، ہم سب کو اسلام کی راہ میں صرف کرنا چاہتے ہیں اور یہی ہمارے جد بزرگوار اور جدہ ماجدہ کا مقصد تھا جس کے لیے انھوں نے قیام فرمایا تھا۔

ہادی: یہ باپ سے بھی بدتر تھا اور اس نے حکومت پاتے ہی قتل امامؑ کے منصوبہ کا اعلان کر دیا لیکن حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ خود پہلے اپنی خیر منائے اس کے بعد مجھے قتل کریگا۔ چنانچہ منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ہی واصل جہنم ہو گیا۔

ہارون: علماء اسلام نے اس کے فضائل کے دفتر کھول دیے ہیں حالانکہ یہ ایک انتہائی عیاش شخص تھا اور علماء کو اپنے سے قریب حسب خواہش فتویٰ حاصل کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھا۔

اس نے امامؑ کو بغداد لانے سے پہلے حج کا سفر کیا تاکہ مکہ یا مدینہ میں امام کے حالات کا جائزہ لے اور مسجد الحرام میں امام سے بحث بھی کی۔ جب حضرت نے لاجواب کر دیا تو پھر مدینہ جا کر باقاعدہ ملاقات کی اور یہ طے کر لیا کہ ان کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا جائے۔

نقوشِ سیاست

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی کے سیاسی نقوش حسب ذیل ہیں:

۱۔ علی بن یقطین کو وزیر مملکت بنوا دیا تاکہ مومنین کے جان و مال و آبرو کا تحفظ ہو سکے اور حکومت کے ارادے بھی واضح ہو سکیں کہ حتی الامکان ان کو تکمیل سے روکا جا سکے۔

۲۔ علی بن یقطین کے ذریعہ اتنا خراج فراہم ہوتا رہے کہ فقراء مومنین کی کفالت ہو سکے اور ایتام آل محمدؐ تباہ و برباد نہ ہو سکیں۔

۳۔ اصحاب کو ہر طرح کے تعاون سے باز رکھا تاکہ حکومت سے بیزاری کی فضا قائم رہے اور عوام میں یہ احساس بیدار ہو کہ ایسے افراد ملک خدا میں حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

۴۔ حکومت کے مطالبات پر مدینہ سے بغداد اور بغداد سے مدینہ کا سفر کرتے رہے کہ اس طرح ہر مقام کے لوگوں سے رابطہ قائم ہوگا اور انھیں اسلام کا مفہوم سمجھایا جا سکے گا۔ چنانچہ سندی بن شاہک جیسے ملعون کی قید میں بھی رہ کر اس کے بعض گھر والوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس کی نسل میں ایک پورا خاندان محبانِ اہلبیتؑ کا پیدا ہو گیا۔

۵۔ حج کے موقع پر مسجد الحرام میں بیٹھ کر مسائل بیان کرتے رہے اور لوگوں کو اسلام کی عظمت اور اہلبیتؑ کی جلالت سے باخبر کرتے رہے یہاں تک کہ ہارون نے مسئلہ پوچھنا چاہا تو فرما دیا کہ باادب کھڑے ہو کر سوال کرو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ہارون جاہل ہے اور جاہل کو حاکم مسلمین بننے کا حق نہیں ہے۔

ہارون نے مدینہ میں قبر پیغمبرؐ سے خطاب کر کے سلام کیا اور کہا "السلام علیک

یا ابن العم" تاکہ اپنی قرابت کا اظہار کرے۔ تو آپ نے فوراً سلام کیا، "السلام علیک یا اَبَۃ" تاکہ قوم کو اندازہ ہو سکے کہ وہ قرابت دار ہے تو ہم فرزند رسولؐ ہیں۔

۶۔ فدک کے حدود بیان کر کے واضح کر دیا کہ ہمارا حق ایک علاقہ کا نہیں ہے۔ ہمارا حق پورے عالم اسلام پر ہے جس پر ظالموں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

اس کے علاوہ بھی امامؑ کی زندگی میں تبلیغ دین، خدمت اسلام اور تربیت اصحاب کے بے شمار مواقع پائے جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام موسیٰ بن جعفر کا کام گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نہیں تھا بلکہ وہ حقیقتاً امام وقت تھے اور امامؑ نظام اسلام کا ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ اپنے امکان بھر قیام اسلام کے لیے جہاد کرتا رہتا ہے۔ اب اس جہادِ مسلسل کا آخری نتیجہ کب ظاہر ہوگا اور واقعی نظام عدل و انصاف کب قائم ہوگا اس کا علم پروردگار کو ہے۔

خدایا! ہم ایک ایسی حکومت کے طلب گار ہیں جس سے اسلام کو سرفرازی نصیب ہو اور نفاق کو ذلّت۔ ہم تیرے دین کی دعوت دیں اور تیری راہ کی قیادت کریں اور اس طرح دنیا اور آخرت کی کرامت اور عزت حاصل کر سکیں—!

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

جہاد باللسان

ائمہ معصومینؑ کی زندگی سراپا جہاد ہے۔ انھوں نے ہر میدان زندگی میں جہاد کیا ہے اور ہر محاذ پر دین اسلام کے تحفظ کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ راہ خدا میں گلا کٹوانا، جام شہادت نوش کرلینا اور قید خانوں میں زندگی بسر کرنا یہ سب جہاد کی مختلف قسمیں ہیں — لیکن ان سب مجاہدات کے ساتھ جہاد باللسان کا سلسلہ بھی جاری رہا اور حسب امکان مخالفین حق و حقانیت کو زیر کرکے دین اسلام اور حقائق مذہب کا تحفظ کرتے رہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید خانوں میں گذرا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب بھی موقع ملا ہے آپ نے اسلامی حقائق کو بے نقاب کرنے اور دشمنان حق و حقیقت کو خاموش کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے۔

تاریخ اسلام میں آپ کے مختلف مباحثات و مناظرات کا ذکر موجود ہے جن سے آپ کے علمی جہاد اور تحفظ دین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ نفیع انصاری نے آپ کو ہارون رشید کے دربار میں داخل ہوتے اور حاجب و دربان کو آپ کی غیر معمولی عزت کرتے دیکھ کر نہایت ہی معاندانہ لہجہ میں سوال کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟

اس نے کہا آپ نہیں پہچانتے ہیں۔ یہ آل ابوطالب کے بزرگ اور موسیٰ بن جعفرؑ ہیں۔

نفیع نے اہل دربار کو سرزنش کرنا شروع کردی کہ یہ لوگ ایسے شخص کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں جو کسی وقت بھی تخت و تاج پر قبضہ کرسکتا ہے۔ یہ باہر نکلے گا تو میں اسے ضرور شرمندہ کروں گا۔

عبدالعزیز نے منع کیا کہ آپ ایسا ارادہ نہ کریں یہ اہلبیت رسولؐ ہیں اور جو ان سے مقابلہ کرتا ہے وہ ضرور رسوا ہوتا ہے۔ لیکن نفیع نے ایک نہ سُنی اور جب آپ باہر تشریف لائے تو راستہ روک کر کہا کہ آپ کون ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ نسب کے بارے میں پوچھتے ہو تو حضرت محمد مصطفیٰؐ، حبیب خدا حضرت اسماعیل ذبیح اللہ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا فرزند ہوں، وطن کے بارے میں پوچھتے ہو تو وہاں کا ہوں جس کا حج تمام مسلمانوں پر واجب ہے اور تم بھی مسلمان ہو تو تم پر بھی واجب ہے۔ مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ میدان جنگ میں ہماری قوم کے مشرکوں نے تمھاری قوم کے مسلمانوں کو اپنے برابر کا نہیں سمجھا تھا اور میدان میں صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارے برابر کے افراد کو ہمارے مقابلہ کے لیے بھیجو — نفیع یہ سُن کر بے حد شرمندہ ہوا اور راستہ چھوڑ کر الگ کھڑا ہوگیا — (نزہتہ الناظر ص ۵۰۴)

۲۔ ہارون رشید نے ابویوسف کی قابلیت کو دیکھ کر انھیں حکم دیا کہ امام سے سخت ترین سوالات کریں تاکہ آپ جواب نہ دے سکیں تو مجمع عام میں آپ کی سُبکی ہوجائے۔ ابویوسف نے آپ سے دریافت کیا کہ حالت احرام میں سایہ کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ — فرمایا کہ حرام ہے — سوال کیا کہ اگر کوئی شخص خیمہ کے اندر چلا جائے تو کیا حکم ہے —؟ فرمایا یہ حلال ہے — عرض کی کہ دونوں میں فرق کیا ہے؟

فرمایا کہ حالت حیض میں عورت نماز اور روزہ دونوں چھوڑ دیتی ہے اور اس کے بعد روزہ کی قضا واجب ہوتی ہے اور نماز کی قضا واجب نہیں ہوتی ہے۔ تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

ابویوسف نے کہا کہ یہ حکم خدا ہے — فرمایا کہ وہ بھی حکم خدا ہے — چنانچہ ابویوسف شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا — (مناقب)

۳۔ ابوحنیفہ نے امام صادقؑ کی خدمت میں شکایت کی کہ آپ کے فرزند ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے جہاں سامنے سے لوگ گذر رہے تھے تو آپ نے سکوت اختیار فرمایا، اتنے میں امام موسیٰؑ بن جعفرؑ آگئے تو فرمایا کہ فرزند! ابوحنیفہ کو یہ شکایت ہے — فرمایا کہ میرا خدا گذرنے والوں سے زیادہ مجھ سے قریب تر ہے۔ لہٰذا کوئی میرے اور اس کے درمیان حائل نہیں ہوسکتا ہے۔

ابوحنیفہ یہ سُن کر خاموش ہوگئے اور حضرت نے اپنے فرزند کو گلے سے لگالیا۔ فرزند اے خزینہ اسرار الٰہی! میں تیرے قربان! — (بحار ج ۱۲ ص ۹۳)

۴۔ علماء یہود کا ایک وفد امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ نبوت حضرت محمدؐ کی دلیل کیا ہے؟ — آپ نے فرمایا کتاب اللہ اور وہ تمام احکام حلال و حرام، جو

پروردگار نے آپ کو عطا فرمائے ہیں۔

ان لوگوں نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ آپ جو فرما رہے ہیں وہ صحیح ہے ؟

اتفاق سے امام موسیٰ بن جعفرؑ کمسنی کے عالم میں محفل میں موجود تھے آپ نے فوراً فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ تم لوگ جو کچھ حضرت موسیٰ کے بارے میں کہتے ہو وہ سب صحیح ہے۔؟

ان لوگوں نے کہا کہ ان باتوں کو صادقین نے نقل کیا ہے۔

فرمایا کہ یہی کیفیت پیغمبر اسلامؐ کے کرامات کی ہے کہ ان کی گواہی بھی ایک ایسے بچے نے دی ہے جو بغیر تعلیم و تعلم کے تمہارے سامنے اتمام حجت کر رہا ہے۔ علماء یہود یہ سُن کر قانع ہوگئے اور مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ امامؑ نے اپنے فرزند کی پیشانی کا بوسہ دیا اور فرمایا کہ بے شک تم میرے بعد حق کے امین اور دین کے ذمہ دار ہو۔ (بحار ج ۴ ص ۱۴۸)

۵۔ بریہہ عیسائیوں کا ایک بہت بڑا عالم تھا اور ہمیشہ حق کی جستجو میں رہا کرتا تھا یہاں تک کہ کسی نے ہشام بن الحکم کا ذکر کیا تو وہ ان کے پاس سو علماء نصاریٰ کے ساتھ حاضر ہوا اور مختلف مسائل علم کلام پر گفتگو کی۔ اس کے بعد امام صادقؑ کی خدمت میں حاضری دی۔ وہاں امام موسیٰ کاظمؑ سے ملاقات ہوگئی۔ ہشام نے اپنی گفتگو کی داستان سُنائی۔ آپ نے بریہہ سے خطاب کرکے فرمایا تمہارا اپنی کتاب کے بارے میں کیا اندازہ ہے ؟ عرض کی کہ میں اس کا عالم ہوں۔

فرمایا تمھیں اس کی تاویل پر کتنا اعتبار ہے ؟

عرض کی مکمل اعتبار ہے۔

یہ سُن کر آپ نے انجیل کے فقرات کی تلاوت شروع کر دی اور بریہہ حیرت سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ آپ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں تقریباً ۵۰ سال سے ایسے ہی عالم کی تلاش میں تھا اور یہ کہہ کر مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

اس کے بعد امام صادقؑ کی خدمت میں حاضری دی۔ ہشام نے پورا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کمالات ذریت در ذریت چل رہے ہیں۔ بریہہ نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ آپ حضرات کو توریت و انجیل کا علم کہاں سے حاصل ہوگیا ؟

فرمایا کہ یہ ہمارے پاس صاحبان کتاب کی وراثت ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تلاوت کرتے

ہیں جس طرح خود وہ لوگ کیا کرتے تھے۔ پروردگار کسی ایسے کو حُجت نہیں قرار دیتا جو کسی مسئلہ میں ناواقفیت کا اعلان کر دے۔

بریہہ حضرت کی گفتگو سُن کر بے حد متاثر ہوا اور آپ کے اصحاب میں داخل ہوگیا۔ آپ کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں رہا اور آپ ہی کے دورِ حیات میں انتقال کیا۔

(بحار ج ۴ ص ۱۴۷)

۶۔ راہب نصرانی : شام کا رہنے والا ایک راہب نصرانی تھا جو اپنی قوم میں بے حد احترام کا مالک تھا اور سال میں ایک دفعہ قوم کے سامنے آتا تھا اور لوگ اس کی زیارت کے لیے جمع ہوتے۔ اتفاق سے اسی موقع پر امام کاظم علیہ السلام نے بھی اس سے ملاقات کی اور اس نے امام کو دیکھا تو فی الفور متوجہ ہوگیا۔

کیا آپ مرد مسافر ہیں ؟

فرمایا بے شک !

ہماری قوم سے ہیں یا ہمارے خلاف ؟

فرمایا تمہاری قوم سے نہیں ہوں۔

کیا امت مرحومہ سے تعلق رکھتے ہیں ؟

فرمایا بے شک!

اس کے علماء میں ہیں یا جہلاء میں ؟

فرمایا جہلاء میں سے نہیں ہوں۔

یہ بتائیے کہ درخت طوبیٰ کی اصل آپ کے نزدیک حضرت محمدؐ کے گھر میں ہے اور ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰ کے گھر میں ہے اور اس کی شاخیں ہر گھر میں ہیں۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے ؟

فرمایا، درخت طوبیٰ کی مثال آفتاب جیسی ہے جو اپنی منزل پر رہتا ہے۔ لیکن اس کی شعاعیں ہر جگہ موجود رہتی ہیں۔

یہ بتائیے کہ جنت کی غذائیں کھانے سے کیوں کر کم نہ ہوں گی ؟

فرمایا، اس کی مثال چراغ جیسی ہے کہ اس سے بے شمار چراغ جلا لیے جاتے ہیں تو

بھی روشنی میں کمی نہیں ہوتی ہے۔

جنت میں ایک طویل سایہ ہے وہ کیا ہے ؟

فرمایا، طلوع آفتاب سے پہلے کا وقت ظلِّ ممدود کہا جاتا ہے۔

اہل جنت غذائیں استعمال کریں گے تو بول و براز کی احتیاج کیوں کر نہ ہوگی ؟

فرمایا ان کا حساب شکم مادر میں بچہ جیسا ہے۔

جنت کے خدام بغیر امر و حکم کس طرح خدمت انجام دیں گے ؟

فرمایا، انسان کسی چیز کا مشتاق ہوگا تو اس کے اثرات ظاہر ہو جائیں گے اور خدام اس کی تعمیل کے لیے تیار رہیں گے۔

جنت کی کنجی سونے کی ہے یا چاندی کی ؟

فرمایا، جنت کی کنجی لا الٰہ الا اللہ ہے۔

آپ نے بالکل صحیح فرمایا — یہ کہہ کر اپنی قوم کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

(مناقب — حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ)

یاد رہے کہ ایسا ہی ایک واقعہ امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات کے ذیل میں بھی نقل کیا گیا ہے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام میں سب کا قول و عمل یکساں اور متحد ہوتا ہے، ان کے اول و آخر کے بیان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔

اصحاب و تلامذہ

۱۔ حماد بن عیسیٰ

انھوں نے امام سجادؑ سے امام جوادؑ تک کا دَور دیکھا ہے اور اصحاب اجماع میں شمار ہوتے ہیں۔ نقل روایات میں اس قدر محتاط تھے کہ امام صادقؑ سے نقل ہونے والی صرف ستّر روایات کو اخذ کیا اور ان میں سے بھی چھان پھٹک کے بعد صرف بیس کو اختیار کیا جس میں کسی طرح کے نقص و تغییر کا امکان نہیں تھا۔

امام کاظمؑ سے دعائے خیر کی التماس کی تو آپ نے مکان، زوجہ، فرزند، خادم اور پچاس

سال تک حج کی دعا دے دی اور امامؑ کی دعا کی برکت سے تمام نعمتیں حاصل ہوگئیں۔ لیکن پچاس حج کے بعد پھر حج کا ارادہ کیا تو غسل احرام کرتے وقت سیلاب کی نذر ہوگئے اور غریق جحفہ کا لقب پاگئے۔

۲۔ ابو عبداللہ عبدالرحمان بن الحجاج البجلّی الکوفی

صفوان بن یحییٰ کے استاد تھے اور امام صادقؑ و کاظمؑ کے اصحاب میں شمار ہوتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد راہ حق کی طرف آئے اور امام رضاؑ سے بھی ملاقات کی اور اسی زمانہ میں انتقال بھی فرمایا۔ امام علی رضاؑ نے انھیں جنّت کی بشارت دی ہے اور امام صادقؑ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ اہل مدینہ سے مناظرہ کرو، مجھے اپنے اصحاب میں تم جیسے افراد کی ضرورت ہے۔

ابوالحسن کی طرف سے یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ نے عبدالرحمان کے بارے میں فرمایا کہ وہ دل پر گراں تھے لیکن اس کا مفہوم علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ دشمنوں کے دل پر گراں تھے یا میرے دل میں گراں قدر تھے یا اس اعتبار سے گراں تھے کہ ان کا نام عبدالرحمان تھا اور ان کے باپ کا نام حجاج تھا اور صاحبانِ ایمان کے دلوں پر یہ دونوں نام گراں ہیں۔ جیسا کہ سبط ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن جعفر نے اپنے ایک فرزند کا نام معاویہ رکھ دیا تھا تو سارے بنی ہاشم نے ان سے ترک تکلم کر دیا کہ بنی ہاشم اس نام کو مصلحت کے طور پر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ عبداللہ بن جُندب بَجلی کوفی

اصحاب امام کاظمؑ و امام رضاؑ میں ثقہ جلیل القدر تھے اور حضرت کے وکیل بھی تھے۔ امام رضاؑ نے انھیں خدا اور رسولؐ کے راضی ہونے کی ضمانت دی تھی اور انھیں جنت کی بشارت بھی دی تھی۔

انھیں کے بارے میں یہ مشہور روایت ہے کہ میدان عرفات میں زار و قطار رو رہے تھے تو ابراہیم بن ہاشم نے کہا کہ میں نے اس شان کا وقوف تو کبھی نہیں دیکھا۔ تو فرمایا کہ خدا کی قسم میں نے اپنے حق میں کوئی دعا نہیں کی ہے اور ہر دُعا برادرانِ ایمانی کے حق میں کی ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا ہے کہ جو شخص برادرانِ ایمانی کے حق میں دُعا کرتا ہے رب کریم کی طرف سے

عرش اعظم سے آواز آتی ہے کہ تجھے اس کا ایک لاکھ گنٗ دیا جائے گا ـــــــــ تو میں نے نہیں چاہا کہ قدرت کی طرف سے ایک لاکھ گنٗ کا انکار کر دوں اور اپنی گناہ گار زبان سے اپنے حق میں صرف ایک دُعا کروں جس کے قبول ہونے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

انھیں عبداللہ بن جندب نے ایک مرتبہ امام رضاؑ کو خط لکھا کہ میں ضعیف العمر ہو گیا ہوں، لہذا ایسا کوئی وِرد تعلیم دیں کہ میرے علم و فہم میں اضافہ ہو جائے اور وہ میرے لیے سبب تقرب الٰہی ہو۔ تو آپ نے فرمایا کہ بکثرت یہ وِرد پڑھا کرو، "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔

۴۔ ابو محمد عبداللہ بن المغیرہ بجلیؒ کوفی

فقہاء اصحاب میں مردِ ثقہ تھے اور دین و ورع میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ اصحاب اجماع میں شمار ہوتے تھے اور تقریباً تیس کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں واقفیہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اتفاق سے حج کے لیے گیا تو دیوار کعبہ سے لپٹ کر گریہ کر کے دعا کی کہ خدایا! مجھے صحیح دین کی ہدایت فرما تو اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ امام رضاؑ سے ملاقات کروں۔ چنانچہ حج کے بعد مدینہ گیا اور حضرت کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اطلاع بھجوائی کہ ایک شخص عراق سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ ایک مرتبہ اندر سے آواز آئی کہ عبداللہ بن مغیرہ آجاؤ۔ میں حیرت زدہ رہ گیا اور میں نے فوراً حضرت کی امامت کا کلمہ پڑھ لیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جاؤ تمھاری دعا مستجاب ہو گئی، تو مجھے حضرت کی امامت کا مزید یقین کامل ہو گیا اور الحمدللہ کہ اسی عقیدہ پر قائم ہوں۔

۵۔ عبداللہ بن یحییٰ الکاہلی الکوفی

یہ اور ان کے بھائی اسحاق دونوں امام صادقؑ اور امام کاظمؑ کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں اور امام کاظمؑ ان پر خصوصی عنایت فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ علی بن یقطین کو نصیحت فرمائی تھی کہ کاہلی کا خاص خیال رکھنا اور اسی بنا پر وہ ان کے تمام مصارف کی کفالت کیا کرتے تھے اور سارے خاندان کا خرچ چلایا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک مرتبہ حج کے بعد امام کاظمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ عبداللہ! اب خیر زیادہ کرو کہ تمھارا وقت موت قریب آگیا ہے۔ عبداللہ نے رونا شروع کر دیا۔ فرمایا گریہ مت کرو، تمھارا شمار میرے شیعوں میں ہے اور تمھاری عاقبت بخیر ہے۔ یہ سُن کر

عبداللہ مسرور ہو گئے اور چند دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔

۶۔ علی بن یقطین

اصلاً کوفہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن قیام بغداد میں تھا۔ اجلاءِ اصحابِ امام کاظمؑ میں تھے اور حضرت کی خصوصی عنایات کا مرکز تھے۔ ۱۲۴ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے جس کے بعد ان کے والد مروان الحمار کے خوف سے وطن چھوڑ فرار کر گئے اور والدہ نے بھی مدینہ میں قیام کر لیا یہاں تک کہ مروان الحمار قتل ہو گیا اور بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی تو دونوں ظاہر ہوئے اور علی بن یقطین کے والد نے ۱۸۵ھ میں انتقال کیا اور علی بن یقطین امام کاظمؑ کی خدمت میں حاضر رہے یہاں تک کہ حضرت نے جہنم سے نجات کی ضمانت عطا فرمائی اور حضرت کے حکم سے بادشاہ کے وزیر مقرر ہو گئے۔ امام صادقؑ نے بھی بچپنے ہی میں انھیں دعائے خیر سے نوازا تھا اور علی بن یقطین نہایت درجہ صاحب خیرات تھے یہاں تک کہ ایک سال میں ایک سو پچاس افراد کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لیے روانہ کیا۔

علی بن یقطین کے واقعاتِ دورِ وزارت شہرۂ آفاق ہیں۔ امام کاظمؑ ان پر اس قدر مہربان تھے کہ ایک مرتبہ ابراہیم جمال سے ملاقات نہیں کی تو حضرت نے مدینہ میں ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ابراہیم کو راضی کرو اور پھر باعجاز ایک رات میں انھیں مدینہ سے کوفہ پہونچایا اور انھوں نے ابراہیم سے معافی مانگی اور پھر واپس حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

علی بن یقطین نے ۱۸۰ھ میں اس وقت انتقال کیا جب امام موسیٰ کاظمؑ قید خانہ میں تھے۔ بعض حضرات نے سن وفات ۱۸۲ھ قرار دیا ہے۔

۷۔ مفضل بن عمر کوفی جعفی

شیخ نجاشی اور علامہ نے ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے لیکن دیگر علماء رجال نے تعریف اور توثیق کی ہے اور نقل کیا ہے کہ امام صادقؑ اور امام کاظمؑ کے وکلاء میں تھے اور امام صادقؑ نے ان کے پاس ایک رقم رکھوا دی تھی کہ اس کے ذریعہ اصحاب کے درمیان کوئی اختلاف ہو جائے تو صلح کرائیں اور محمد بن سنان کی روایت ہے کہ امام کاظمؑ نے فرمایا کہ جس طرح مفضل میرے لیے باعثِ انس و راحت ہیں اسی طرح تم حضرت رضاؑ اور جوادؑ کے لیے باعثِ انس و راحت ہو گے۔ عبداللہ بن فضل ہاشمی راوی ہیں کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں تھا کہ مفضل بن عمر وارد ہو گئے۔ حضرت نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال کیا

اور فرمایا کہ خدا کی قسم میں تمھیں دوست رکھتا ہوں اور اے کاش کہ میرے کل اصحاب اتنے ہی صاحب معرفت ہوتے جتنے تم ہو۔ مفضل نے عرض کی مولا! اتنا بلند نہ کیجیے۔ فرمایا کہ میں نے تمھیں تمھارا مقام دیا ہے۔ عرض کی تو پھر جابر بن یزید کا کیا مقام ہوگا؟ فرمایا کہ جس طرح رسول اکرمؐ کے لیے سلمان فارسی تھے۔ عرض کی اور داؤد بن کثیر رقی؟ فرمایا کہ جس طرح مقداد بن الاسود تھے۔

اس کے بعد عبداللہ سے فرمایا کہ رب العالمین نے ہماری ارواح کو اپنے نور عظمت سے پیدا کیا ہے اور تمھاری ارواح کو ہماری ارواح سے۔ میرے پاس میرے تمام شیعوں کی فہرست موجود ہے مشرق و مغرب مل کر بھی نہ ایک فرد کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کمی۔ عبداللہ نے فہرست کا اشتیاق ظاہر کیا تو آپ نے صحیفہ نکال کر دکھلا دیا اور عبداللہ نے آخر میں اپنا نام دیکھ کر سجدہ شکر ادا کیا۔

۸۔ ابو محمد ہشام بن الحکم

کوفہ میں پیدا ہوئے۔ واسط میں پلے بڑھے اور آخر میں بغداد میں مقیم ہو گئے۔ وہیں ان کی تجارت کا سلسلہ تھا۔ اصحاب امام صادقؑ و امام کاظمؑ میں شمار ہوتے ہیں اور نہایت درجہ کے ذکی اور ہوشمند تھے۔ علم کلام اور مناظرہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ۱۷۹ھ میں کوفہ میں انتقال فرمایا تو امام رضاؑ نے ان کے حق میں دعائے رحمت فرمائی اور امام جوادؑ کے سامنے ان کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ خدا ان پر رحمت نازل کرے وہ ہم اہلبیتؑ کے حق سے بہترین دفاع کرنے والے تھے۔

عمیر بن یزید راوی ہیں کہ ہشام ابتدا میں جہمی مذہب کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ امام صادقؑ سے مناظرہ کی خواہش کی تو میں نے حضرت سے وقت لیا۔ ہشام حاضر ہوئے تو آپ نے ایک سوال کر دیا جس کا جواب نہ دے سکے اور چند روز کے بعد جواب لے کر آئے تو آپ نے دوسرا سوال کر دیا۔ پھر چند روز تک جواب تلاش کرتے رہے اور اب جو تیسری مرتبہ آئے تو حضرت کی ہیبت سے کلام کرنے کی ہمت نہ پڑی اور اسے توفیق پروردگار قرار دے کر ایمان لے آئے اور امام صادقؑ کی خدمت میں اس قدر ترقی کی کہ آپ نے حمران بن اعین، قیس، یونس بن یعقوب اور مومن طاق کی موجودگی میں انھیں صدر مجلس میں جگہ دی اور فرمایا "ھذا ناصرنا بقلبہ ولسانہ" اور پھر ہشام کو مناظرہ میں اتنا کامل بنا دیا کہ کوئی شخص بھی انھیں شکست نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ان کے دفاعِ حقِ اہلبیتؑ کا اثر تھا کہ ہارون نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور وہ روپوش ہو گئے یہاں تک کہ ان کے گھر والوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس اثنا میں جب وقتِ وفات قریب آیا تو

بشیر سے فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد مجھے غسل و کفن دے کر جنازہ کو کناسہ میں رکھ دینا اور ایک پرچہ لکھ دینا کہ یہ ہشام کا جنازہ ہے جس نے حکومت کے خوف سے انتقال کیا ہے تاکہ حکومت کو میرے مرنے کا یقین ہو جائے اور میرے گھر والے رہا ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور متعدد لوگوں کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ کو رہا کر دیا گیا کہ اب حکومت کو ہشام کے خطرہ سے نجات مل گئی ہے۔

۹۔ یونس بن عبدالرحمان

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی بھی زیارت کی ہے لیکن روایت کا شرف امام کاظمؑ سے حاصل کیا ہے۔ اصحاب اجماع میں بھی شمار ہوتے ہیں اور امام رضاؑ لوگوں کو مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب "یوم ولیلہ" بھی لکھی ہے جسے امام عسکریؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اول سے آخر تک پڑھ کر فرمایا کہ یہی میرا اور میرے آبا و اجداد کا دین ہے۔ یونس نے ۲۰۸ھ میں انتقال فرمایا اور امام رضاؑ نے تین مرتبہ انھیں جنت کی بشارت دی تھی اور انھیں مثل سلمان قرار دیا تھا کہ انھوں نے فرقہ واقفیہ کا شدت سے مقابلہ کیا اور لوگوں کو امام رضاؑ کی امامت کی طرف دعوت دی ورنہ بہت سے لوگوں نے امام کاظمؑ کے بعد امامت کے سلسلہ کو روک دیا تھا اور امام رضاؑ کی امامت کا انکار کر کے امام کاظمؑ کے سارے اموال اور حقوق پر قبضہ کر لیا تھا۔

۱۰۔ یونس بن یعقوب البجلی الدہنی

حضرت معاویہ بن عمار کے بھانجے تھے۔ ابتدا میں غالباً عبداللہ افطح کی امامت کے قائل تھے بعد میں امام کاظمؑ کی طرف رجوع کیا اور معتبر ترین اصحاب امامؑ میں شامل ہو گئے یہاں تک کہ آپ کے وکیل بھی ہو گئے۔ امام رضاؑ کے زمانے میں مدینہ میں انتقال فرمایا تو حضرت نے تجہیز و تکفین کا مکمل انتظام فرمایا اور تمام لوگوں کو جنازہ میں شرکت کا حکم دیا اور بقیع میں قبر کا انتظام فرمایا جس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ عراقی تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے چاہنے والے تھے لہذا اگر انھیں بقیع میں جگہ نہ دی گئی تو ہم بھی اپنے جنازے وہاں دفن نہ کریں گے۔ جس کے بعد انھیں قبر کی جگہ دی گئی اور حضرت نے متولی قبرستان کو ۴۰ دن قبر پر پانی چھڑکنے کا حکم دیا کہ یونس خدا کی نگاہ میں اس قدر عزیز ہیں کہ اس نے انھیں عراق سے جوارِ پیغمبرؐ تک پہونچا دیا ہے ۔۔۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

نقشِ
حیات امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ

ولادت: ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۸ھ

شہادت: ۲۳ ذی قعدہ ۲۰۳ھ

نقشِ زندگانی امام علی رضا علیہ السّلام

ماہ ذی قعدہ ۱۴۸ھ کی گیارہویں تاریخ تھی جب مدینہ منورہ میں پیغمبر اسلامؐ کے آٹھویں وارث اور سلسلۂ امامت کے آٹھویں امام کی ولادت باسعادت ہوئی اگرچہ بعض روایات میں ۱۱ ذی الحجہ ۱۵۳ھ ہے۔

● والد بزرگوار امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تھے اور والدہ ماجدہ جناب نجمہ خاتون جن کے بارے میں مرسل اعظمؐ نے خواب میں جناب حمیدہ خاتون کو نصیحت فرمائی تھی کہ نجمہ کا رشتہ میرے فرزند موسیٰ کاظمؑ سے کردو۔ اور خود ان کا بیان ہے کہ میں خواب میں اپنے شکم میں تسبیح و تہلیل کی آوازیں سُنا کرتی تھی۔ مجھے حمل میں کسی طرح کی گرانی کا احساس نہیں ہوا اور ولادت کے بعد میرے فرزند نے رُخ آسمان کی طرف کرکے زیرلب کچھ فقرات کہے جو میں نہ سمجھ سکی اور امام موسیٰ کاظمؑ سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرا فرزند حجت خدا ہے۔

● امام موسیٰ کاظمؑ نے کان میں اذان و اقامت کہی اور عقیقہ کا اہتمام کیا کہ امام ختنہ شدہ پیدا ہوتا ہے۔

● جناب نجمہ کے اسماء گرامی مختلف حالات و روایات یا زبانوں کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ تُکتم، اروی، سُکن، سمانہ، ام البنین، خیزران، صُقر، شقراء۔ اور امام علی رضاؑ کی ولادت کے بعد سے انھیں طاہرہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

● امام رضاؑ کا اسم گرامی علیؑ، کنیت ابوالحسن اور القاب صابر، فاضل، رضی، وفی، قرۃ عین المومنین، غیظ الملحدین وغیرہ تھے لیکن سب سے زیادہ مشہور لقب رضا ہے جو آپ کو آپ کے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰؐ عطا فرما کر گئے تھے یہ اور بات ہے کہ جب دنیا نے آپ کی حکومت کو پسند کرلیا تو اس لقب کی شہرت زیادہ ہوگئی اور اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ خدا کے پسندیدہ بندہ کو ایک نہ ایک دن

اہل دنیا کو پسند کرنا ہی پڑتا ہے چاہے وہ علی مرتضیٰؑ کی شکل میں ہو یا علی رضاؑ کی شکل میں۔

● آپ کی ولادت سے تقریباً ۱۵ دن قبل آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادقؑ کا انتقال ہو گیا تھا جن کی آرزو تھی کہ اپنے اس فرزند کو دیکھ لیتے جیسا کہ آپ نے اپنے فرزند امام موسیٰ کاظمؑ سے فرمایا تھا کہ عنقریب تمھارے یہاں ایک فرزند پیدا ہونے والا ہے جو عالم آل محمدؐ ہوگا کاش! میں اس کے زمانے کو درک کر لیتا۔

● آپ کے دور کے سلاطین میں وقت ولادت منصور دوانیقی کی حکومت تھی ۱۵۸ھ سے مہدی عباسی کا دور شروع ہوا ۱۶۹ھ میں ہادی تخت نشین ہوا اور ۱۷۰ھ سے ہارون کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴ھ میں امین تخت نشین ہوا اور ۱۹۸ھ سے مامون کی سلطنت کا آغاز ہو گیا۔ اسی ظالم نے ۲۰۳ھ میں حضرت کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔

منصور، مہدی، ہادی اور ہارون کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ امین و مامون ہارون رشید کے دو فرزند تھے۔ ایک عرب عورت سے تھا امین۔ اور ایک عجمی کنیز سے تھا مامون۔ امین انتہائی عیاش، بد قماش اور اوباش تھا اور مامون قدرے ہوشیار، علم دوست اور باہنر تھا لیکن عجمی ماں کی وجہ سے عرب اسے ولی عہد ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہارون امین کو جانشین بنانا نہیں چاہتا تھا کہ اس میں سلطنت کی تباہی اور بربادی کا خطرہ ہے لیکن قبائل کے دباؤ سے مجبور ہو کر سلطنت کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا۔ شام، حجاز اور یمن کے عربی علاقے امین کو دے دیے اور ایران، خراسان اور ترکستان کا علاقہ مامون کو دے دیا اور اس طرح ایک مصیبت سے تو نجات مل گئی لیکن دوسری مصیبت یہ آئی کہ دونوں فرزندوں نے اپنی اپنی حکومت سنبھال لی اور باپ لاوارث ہو کر رہ گیا۔ خلیفۃ المسلمین ہونے کے باوجود بیٹوں کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہا تھا اور وہ انتہائی معمولی غذا، معمولی لباس اور معمولی سواری پر زندگی گزارنا چاہتے تھے تاکہ دوبارہ اقتدار کا حوصلہ نہ پیدا ہو جائے اور حکومت واپس نہ ہو جائے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ غاصبانہ حکومت اور بے دین طرز اقتدار کا آخری انجام یہی ہوتا ہے اور اتنی سزا تو پروردگار ظالم حکمرانوں کو دنیا ہی میں دے دیتا ہے تاکہ انھیں آخرت کے انجام کا بھی اندازہ ہو جائے اور خود اپنے حالات سے بھی عبرت حاصل کر سکیں۔

● باپ کی زندگی سے شروع ہونے والی سرکشی اس کے مرتے ہی منظر عام پر آ گئی اور دونوں

بھائیوں کو فکر پیدا ہو گئی کہ پورے عالم اسلام پر بلاشرکت غیرے اقتدار قائم کر لیں۔ چنانچہ ایک طرف سے عرب کی حمایت اور دوسری طرف سے عجم کی حمایت کا زور شروع ہوا اور آخرکار فریقین میں جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عجمی فوج غالب آئی اور عرب شہزادے کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ایک مرتبہ پھر واضح ہو گیا کہ غیر اسلامی نظام میں نہ اخوت ہوتی ہے نہ ہمدردی، نہ قانون ہوتا ہے نہ قاعدہ۔

کس قدر فرق ہے اس دنیاداری میں اور اس دین داری میں کہ دنیاداروں کے دو بھائی ایک چھوٹے سے ملک میں متحد نہ رہ سکے اور قتل و خون کی نوبت آ گئی اور دین کے ذمہ داروں میں دو بھائی ملک عظیم یعنی جنت کے سردار بنا دیے گئے اور کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ پیدا ہو سکا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زمام حکومت سنبھالنے والوں کا کردار اور ہوتا ہے اور زلف رسولؐ سنبھالنے والوں کا طریقہ کار اور ـــــ

۱۸۳ھ تک اپنی زندگی کے ۳۰ یا ۳۵ سال والد گرامی کے زیر سایہ گزارے اور حالات کا برابر جائزہ لیتے رہے جس میں طویل سلسلہ قید و بند بھی شامل تھا اور شدید ترین سرکاری دباؤ بھی تھا یہاں تک کہ طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے زہر دے دیا گیا اور اسی انداز سے قید خانہ سے جنازہ نکالا گیا۔ بغداد کے پل پر امام الرافضہ کہہ کر جنازہ کو رکھ دیا گیا اور حمالوں کے ذریعہ جنازہ اٹھوا کر توہین و تحقیر کی آخری حسرت بھی نکال لی گئی۔

ظاہر ہے کہ اس دور میں امام رضاؑ نے مصائب کے ساتھ باپ کے طرز عمل کا بھی مشاہدہ کیا اور یہ دیکھتے رہے کہ اسلامی نظام کی ترویج میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جا رہا ہے اور کس حکمت الٰہیہ سے کام لیا جا رہا ہے۔ حکومت کے اعمال کی طرف سے غافل ہو جانا شان ہدایت کے خلاف ہے اور حکومت سے سیدھی ٹکر لینا بلا فائدہ قتل کو دعوت دینا ہے اور اپنی خاموشی سے حکومت کو تائید حاصل کرنے کا موقع دینا بھی باعث مواخذہ ہے ـــ امام موسیٰ کاظمؑ نے ایک درمیانی روش اختیار کی اور اپنے اصحاب میں سے بعض کو دربار میں وزیر مقرر کرایا تاکہ حکومت کے عزائم کی نگرانی ہوتی رہے اور چاہنے والوں کے جان و مال و آبرو کا تحفظ کیا جا سکے اور بعض کو اس قدر برات اور بیزاری کا درس دیا کہ اگر بادشاہ وقت کو اونٹ کرایہ پر دینے کے بعد یہ آرزو بھی پیدا ہو جائے کہ بادشاہ زندہ رہے اور کرایہ مل جائے تو یہ آرزو انسان کو ظالموں کے مددگاروں میں شامل کر دیتی ہے جس کا کھلا ہوا مفہوم یہ تھا کہ علی بن یقطین وزیر ہونے کے بعد بھی بادشاہ کی حیات کی آرزو نہیں کر سکتے تھے اور ان کے ذہن میں

اس قدر صلاحیت تھی کہ کرسی کی پرواہ کیے بغیر کام کر سکیں تو انھیں وزارت تک کا کام سپرد کر دیا گیا اور اس قدر درباری تقرب کی اجازت دے دی گئی اور صفوان جمال کے دل و دماغ میں اس قدر صلاحیت نہیں تھی تو ان کے لیے مصلحت یہی تھی کہ حکومتی نظام سے دور رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کرایہ کی خاطر سلاطین جور کی حیات کی آرزو پیدا ہو جائے اور عاقبت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔

اس کے علاوہ خود ہارون کو بھی مختصر خط کے ذریعہ تنبیہ فرمائی کہ ہر گذرنے والا دن تیری راحت کے دن کم کر رہا ہے اور میری مصیبت کے دن کم کر رہا ہے، اس کے بعد دونوں کو عادل حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور اپنے اپنے اعمال کا انجام دیکھنا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ ہم بیزار ہونے کے بعد بھی اپنے فریضۂ ہدایت سے غافل نہیں ہے اور آخر سانس تک ظالموں کو ان کے انجام سے اسی طرح باخبر رکھنا چاہتے ہیں جس طرح مولائے کائنات نے ابن ملجم کو بیدار کر کے نماز کی دعوت دی تھی حالانکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ ابن ملجم جیسے افراد کی نماز کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

انھیں حالات میں آپ نے ۳۰ یا ۳۵ سال کی عمر میں قیادت امت کی ذمہ داری سنبھالی اور یہ چاہا کہ اس کردار کو زندہ رکھا جائے جس کی مثال والد بزرگوار نے پیش کی ہے تاکہ کسی شخص کو یہ وہم و گمان نہ پیدا ہونے پائے کہ باپ کے مصائب و آلام کو دیکھ کر زندگی کی روش تبدیل کر دی ہے اور حکومت سے کسی طرح کی سازش قبول کر لی ہے۔ چنانچہ ۱۸۳ھ سے تقریباً ۱۰ سال تک اسی انداز پر گذارے جس طرح کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی زندگی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ امام کو قیدخانہ میں زہر دے کر شہید کر دینے اور آپ کے جنازہ کی بے حرمتی نے ہارون کے خلاف ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ اب اس میں مزید ظلم کرنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی ـــ اور اُدھر داخلی حالات نے بھی اسے حکومت تقسیم کر کے لاوارث اور بے بس ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا جس کی بنا پر امام رضاؑ کا یہ دور قدرے سکون سے گذر گیا اور آپ کو ان مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا جن مصائب سے آپ کے والد بزرگوار کو گذرنا پڑا تھا ـــ اور یہ آل محمدؐ کی تاریخ حیات کا عجیب و غریب سانحہ ہے کہ ہر امامؑ کو پہلے والے امامؑ کے مقابلہ میں تقریباً مختلف بلکہ متضاد حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ حکومت ایک حربہ کو آزمانے کے بعد ناکام ہو جاتی تھی تو وہ حربہ تبدیل کر دیتی تھی اور بعد والے امامؑ کو بالکل نئے قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، مثال کے طور پر معاویہ بن ابی سفیان نے مولائے کائنات سے صفین کے میدان میں انتہائی خوں ریز قسم کی جنگ

کی اور آپ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ سے صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ معاویہ نے امام حسنؑ سے صلح کی، اور یزید امام حسینؑ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

یزید نے خود جاناں بنی ہاشم کے درمیان رہنے والے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا اور کربلا کا عظیم سانحہ پیش آیا اور قیدیوں اور لاوارثوں کے درمیان رہنے والے طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے امام زین العابدینؑ سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا۔

امام زین العابدینؑ کی زندگی خاموشی، گوشہ نشینی اور عبادت میں گذر گئی اور امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کو میدان میں آکر کھل کر کام کرنا پڑا۔ امام جعفر صادقؑ نے اتنا کھل کر کام کیا کہ سارا مذہب مذہب جعفری ہو گیا اور امام موسیٰ کاظمؑ کو تقریباً ۱۴ سال قیدخانہ میں رہنا پڑا۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت بھی قیدخانہ میں ہوئی جب کہ آپ کا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور امام علی رضاؑ کو ولی عہد مملکت بنا دیا گیا۔ امام علی رضاؑ ولی عہد مملکت رہے اور امام محمد تقیؑ کو کوئی عہدہ نہ ملا اور انھیں دار الحکومت سے مدینہ جانا پڑا۔ امام محمد تقیؑ سرکاری داماد قرار دیے گئے اور امام علی نقیؑ قیدخانوں میں رہے۔

غرض تاریخ کا یہ متضاد سلسلہ اس امر کی واضح علامت ہے کہ حکومت وقت کو مسلسل اپنی شکست کا احساس تھا اور اس کے نتیجہ میں خود وہی حاکم وقت یا اُس کا وارث اپنی روش کو فوراً تبدیل کر دیتا تھا اور آل محمدؐ کو ایک نئی سیاسی چال کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آل محمدؐ کے پاس تقلیدی قسم کے وسائل یا وراثتی قسم کے اسالیب حیات نہیں تھے اور نہ وہ سابقہ تعلیم و تربیت کی بنا پر کام کیا کرتے تھے بلکہ وہ مرکز الہام و القاء خداوندی تھے اور اسی کے سہارے تمام جدید ترین اسالیب ظلم و ستم اور طریقہ ہائے مکر و فریب کا باآسانی مقابلہ کرتے رہتے تھے اور انھیں کسی طرح کی کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔

امام علی رضاؑ کو اس سلسلہ کے سب سے پہلے ظلم کا اس انداز سے سامنا کرنا پڑا کہ ہارون نے محمد بن جعفرؑ کے قیام کا بہانہ لے کر تمام سادات کے گھروں کی تباہی کا حکم دے دیا اور عیسیٰ جلودی نے لشکر یزید کی یاد تازہ کرا دی۔ مدینہ کی غارت گری کے دوران امام رضاؑ کے گھر کا بھی رُخ کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ نامحرم نہ گھر میں داخل ہو سکتے ہیں اور نہ خواتین کے جسم کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ میں

سارا سامان اور زیور خود ہی لاکر دئیے دیتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ نے جسم پر رہنے والے لباس کے علاوہ گھر کا سارا سامان لاکر دے دیا اور ظالم اس غارت گری پر خوش ہوگئے اور اسے اپنی فتح قرار دینے لگے۔

آپ کے طرز حیات کے بارے میں شیخ صدوقؒ نے ابراہیم بن عباش سے نقل کیا ہے کہ نہ آپ کو کبھی تند کلامی کرتے دیکھا گیا ہے اور نہ کسی کی بات کو کاٹتے دیکھا گیا ہے۔ ہر شخص کی حاجت روائی آپ کا فرض تھا۔ کسی کی طرف پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ کسی کے سامنے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے غلاموں کے ساتھ بھی سختی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے، بلند آواز سے قہقہہ نہیں لگاتے تھے، دستر خوان پر اپنے ساتھ تمام نوکروں اور غلاموں کو بھی بٹھلا لیا کرتے تھے۔ راتوں کو کم سوتے تھے اور اکثر راتوں میں شب بیداری فرماتے تھے۔ ہر مہینہ میں پہلی اور آخری جمعرات اور درمیانی بدھ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ رات کی تاریکی میں صدقات اور خیرات عطا فرمایا کرتے تھے۔ اندر معمولی کپڑا پہنتے تھے اور باہر کبھی کبھی ضرورت کے اعتبار سے اچھا لباس زیب تن فرما لیا کرتے تھے۔

- ایک شخص نے حمام میں آپ سے بدن ملنے کا مطالبہ کر دیا تو آپ نے فوراً قبول کر لیا اور درمیان میں کسی شخص کی نظر پڑ گئی اور اس نے متوجہ کیا تو وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور آپ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں ہے انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ (نورالابصار)
- کھانے کے وقت اگر کوئی شخص تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتا تھا تو منع فرما دیتے تھے کہ رزق خدا کا احترام ضروری ہے، کھانے کے وقت قیام نہیں کرنا چاہیے۔
- آپ کے خادم یاسر کا بیان ہے کہ ہم لوگ میوہ کھاتے وقت ایک حصہ کھاتے تھے اور ایک حصہ پھینک دیتے تھے تو آپ نے تنبیہ کی کہ رزق خدا کو ضائع مت کرو، جو ضرورت سے زیادہ ہو اُسے فقرا اور مستحقین کے حوالے کر دو۔
- عطریات اور خوشبو کا بڑا شوق رکھتے تھے اور سجدہ پروردگار آپ کا شعار تھا جس کا سلسلہ نماز صبح کے بعد سے ظہر تک بھی قائم رہ جاتا تھا۔
- اپنے شیعوں کو متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ تمام اعمال ہر روز شام کے وقت تمہارے امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ تمہارے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ (لہٰذا تم اپنے گناہوں سے ان کا دل مت

دُکھاؤ اور ایسے بن جاؤ جیسے کہ ان کے شیعوں کو ہونا چاہیے)۔

- ایک مرتبہ آپ نے روز عرفہ ۹ ذی الحجہ کو گھر کا سارا سامان راہ خدا میں لُٹا دیا اور فضل بن سہل کو یہ دیکھ کر خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس طرح کا کام ہم لوگ انجام نہیں دے سکتے ہیں تو فوراً اعتراض کر دیا کہ یہ تو ایک قسم کا خسارہ ہے۔ فرمایا کہ یہ خسارہ نہیں ہے بلکہ فائدہ ہے۔ رب کریم ایک کے بدلے میں دس عطا کرنے والا ہے۔

طبّ الرّضاؑ

دیگر علوم و کمالات کے علاوہ علم الابدان کے بارے میں بھی آپ کے ہدایات ہر دور میں صحت و عافیت کے بہترین نسخہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بنا پر آپ کے چند طبی ارشادات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

- ماں کے دودھ سے بہتر بچہ کی کوئی غذا نہیں ہے۔
- سرکہ بہترین غذا ہے۔ جس گھر میں سرکہ ہوگا اس کے اہل خانہ کبھی محتاج نہ ہوں گے۔
- انار میں ایک دانہ جنت کا ہوتا ہے۔

منقیٰ صفرا کو درست کرتا ہے، بلغم کو دور کرتا ہے، پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے اور نفس کو پاکیزہ بناتا ہے۔

- شہد میں شفا ہے اور شہد کا تحفہ واپس نہیں کرنا چاہیے۔
- گلاب جنت کے پھولوں کا سردار ہے۔
- بنفشہ کا تیل سر میں لگانے سے گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی کا فائدہ ہوتا ہے۔
- زیتون کا تیل استعمال کرنے والا چالیس دن تک شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔
- قرآن پڑھنے، شہد کھانے اور دودھ پینے سے حافظہ بڑھتا ہے۔
- گوشت کھانے سے شفا حاصل ہوتی ہے اور مرض دور ہوتا ہے۔ جو شخص چالیس دن گوشت نہ کھائے وہ بد اخلاق ہو جائے گا۔
- کھانے کی ابتدا نمک سے ہونی چاہیے اس سے ستّر امراض کا دفعیہ ہو جاتا ہے جن میں

جذام بھی شامل ہے۔

● مسور شتر انبیار کی غذا ہے۔ اس سے دل نرم ہوتا ہے اور آنسو پیدا ہوتے ہیں۔

● کھانا ٹھنڈا کر کے اور پیالے کے کنارے سے کھانا چاہیے۔

● اچھا کھانا، اچھا جُوتہ پہننا، قرض سے بچنا، کثرتِ جماع سے پرہیز کرنا مفید ہوتا ہے۔

● خدا سے روزی صدقہ دے کر طلب کرو۔

● بالوں کی سفیدی کا اگلے حصہ سے شروع ہونا سعادت مندی اور اقبال مندی کی علامت ہے اور رخساروں سے شروع ہونا سخاوت کی نشانی ہے، اور گیسوؤں سے شروع ہونا شجاعت ہے اور گدّی سے شروع ہونا نحوست ہے۔

اعترافات

● آپ تمام لوگوں میں جلیل القدر اور عظیم المرتبت تھے۔ (ابن حجر)

● آپ کی باتیں حکیمانہ، آپ کا عمل درست اور آپ کا کردار محفوظ عن الخطاء تھا۔ علم و حکمت میں کامل اور روئے زمین پر بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ (عبدالرحمٰن جامی)

● ابراہیم بن عباس کے بیان کے مطابق ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا گیا۔ علامہ عبیداللہ امرتسری)

● آپ اشرف مخلوقاتِ زمانہ تھے۔ (حبیب السیر)

● آپ کو وراثت میں علم ماکان ومایکون عطا ہوا تھا۔ (وسیلۃ النجاۃ)

● آپ ہر زبان اور ہر لغت میں داناترین مردم تھے اور ہر شخص کو اس کی زبان میں جواب دیا کرتے تھے۔ (روضۃ الاحباب)

● آپ بارہ اماموں میں تیسرے علیؑ تھے۔ کامل الایمان اور عظیم الشان، انتہائی کریم۔ اور صاحب فضائل و مناقب، آپ کے براہینِ شرف و امامت انتہائی روشن تھے۔ (مطالب السئول)

● آپ کے کمالات کے لیے یہی کافی ہے کہ مامون رشید جو ایک علم دوست انسان کہا جاتا ہے اور جس کا دربار اہل علم و فضل کا مرکز تھا۔ اس نے آپ کو صرف ولی عہدی نہیں بلکہ پوری سلطنت کی پیش کش کر دی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آپ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

● مامون کے دربار میں جس قدر بھی مناظرے ہوئے ہیں سب میں علمار یہود و نصاریٰ اور ملحد، بے دین و دہریہ قسم کے دانشوروں نے آپ کے بے پناہ علم و فضل کا اقرار کیا ہے۔

● محمد بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے آپ کے تحریری جوابات کو جمع کیا تو ان کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی۔

● جاثلیق نصرانی عالم تھا۔ ہر مسلمان سے یہ کہتا تھا کہ عیسیٰؑ کی شخصیت اتفاقی ہے اور تمہارے رسولؐ کی شخصیت اختلافی ہے۔ لہٰذا اتفاقی کو لے لیا جائے اور اختلافی کو چھوڑ دیا جائے۔ مسلمان عاجز تھے لیکن آپ کے سامنے یہ دلیل آئی تو آپ نے فرمایا کہ اتفاق اُس عیسیٰؑ پر ہے جو ہمارے رسولؐ کی بشارت دینے آئے تھے اور بندگی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی آخری رسول یا خدا قسم کے عیسیٰ ہیں تو ان کی شخصیت ہم مسلمانوں کو تسلیم نہیں ہے۔

کرامات

● حج کے موقع پر ہارون حضرت کو دیکھ کر دوسرے دروازہ کی طرف جا رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ لاکھ دور بھاگے قبریں ایک ہی جگہ پر ہوں گی جو بالآخر ہو کر رہیں۔

● ایک شخص خراسان کے ارادہ سے نکلا، اس کی لڑکی نے ایک حلہ دیا کہ اسے فروخت کر کے فیروزہ خرید لینا۔ راستہ میں مقام مرو پر امامؑ کے ایک دوست کا انتقال ہو گیا۔ آپؑ نے کفن کے لیے کپڑا طلب کیا۔ اس نے انکار کر دیا کہ میرے پاس کپڑا نہیں ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ تیری لڑکی نے ایک حلہ تجھے دیا ہے۔ اس نے اقرار کر لیا اور حلہ دے دیا اور پھر یہ سوچا کہ یہ صاحب کرامات ہیں، ان سے مسائل دریافت کیے جائیں۔ چنانچہ قریب آیا تو مجمع لگا ہوا تھا۔ منتظر کھڑا رہا۔ آپ نے ایک لفافہ عنایت فرما دیا کہ اس میں تیرے سوالات کے جوابات ہیں۔

● ریان بن صلت آپ کی خدمت میں ایک جامہ اور چند سکے مانگنے آئے جن پر آپ کا اسم گرامی کندہ ہو تو آپ نے سوال سے پہلے دو جامے اور تیس سکے عنایت فرما دیے۔

● ابو اسماعیل نے شکایت کی کہ مجھے عربی زبان نہیں آتی ہے تو آپ نے لبوں پر دست مبارک پھیر کر اسے عربی میں گویا بنا دیا۔

● جعفر بن صالح سے فرمایا کہ تیرے یہاں جوڑواں بچے پیدا ہوں گے تو لڑکے کا نام علی اور لڑکی کا نام ام عمر رکھنا۔ اس کے یہاں ولادت ہوگئی تو اپنی ماں سے کہا کہ حضرت نے یہ نام تجویز فرمایا ہے لیکن ام عمر عجیب نام ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تمھاری دادی کا نام ہے اور حضرت نے انھیں کے نام پر نام رکھ دیا ہے۔

● امین اور مامون کو دیکھنے کے بعد فرمایا کہ عنقریب مامون امین کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

● ایک شخص نے حج کے بارے میں بہت سے سوالات کیے تو آپ نے سب کے جوابات دینے کے بعد فرمایا کہ تم جس لباس کے بارے میں پوچھنا بھول گئے تھے اس میں احرام درست ہے۔

● چڑیوں کے ایک جھنڈ نے شور مچانا شروع کیا تو آپ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ ایک سانپ ان کے بچوں کو اذیت دے رہا ہے جاؤ اسے قتل کر دو۔ انھوں نے جا کر سانپ کو دیکھا اور اسے ختم کر دیا۔ (شواہد النبوۃ)

● ایک زمینداری کے علاقہ کی طرف جاتے ہوئے اصحاب کو حکم دیا کہ بارش کا سامان لے لیں۔ لوگوں نے عرض کی کہ آجکل تو گرمی کا زمانہ ہے بارش کہاں ہے؟ فرمایا کہ میری بات پر عمل کرو۔ چنانچہ لوگوں نے عمل کیا اور وہاں پہونچتے ہی بارش شروع ہوگئی۔ (اعلام الوریٰ)

● محمد بن عیسیٰ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اکرمؐ میرے شہر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور میں نے ان کی خدمت میں حاضری دی تو ان کے سامنے خرمہ کا ایک طشت رکھا تھا۔ میں نے خرمے طلب کیے تو آپ نے ایک مٹھی خرمے دے دیے جن کی تعداد اٹھارہ تھی۔ میں سمجھا کہ اب میری زندگی میں ۱۸ سال باقی رہ گئے ہیں۔ چند روز کے بعد خبر ملی کہ امام رضاؑ تشریف لائے ہیں۔ میں اشتیاق ملاقات میں وارد مسجد ہوا تو بعینہٖ ایسا ہی منظر دیکھا اور حضرت سے خرمہ کا مطالبہ کیا۔ آپ نے ایک مٹھی خرمے دے دیے جن کی تعداد اٹھارہ تھی تو مجھے سخت حیرت ہوئی اور میں نے عرض کی یا بن رسول اللہ! کچھ اور عنایت فرمائیے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ نے زیادہ دیے ہوتے تو میں بھی زیادہ عنایت کر دیتا جس کو دیکھ کر ابن عیسیٰ اور حیرت زدہ رہ گئے اور نبوت و امامت کا اتحاد عمل و کردار منظر عام پر آ گیا۔ (صواعق محرقہ۔ نور الابصار۔ ارجح المطالب)

نقش انگشتر

آپ کے پاس دو انگشتریاں تھیں۔ ایک ذاتی تھی جس کا نقش تھا "ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ"۔ اور دوسری وراثت میں ملی تھی جس کا نقش تھا "حسبی اللہ"۔

عزاداری

یہ ایک تاریخی بات ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے حالات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے طرز تبلیغ کو ہمیشہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا ہے اور ان کا اصول تبلیغ یہی تھا کہ بات کو حالات کے مطابق ہونا چاہیے ورنہ بے اثر ہو جائے گی بلکہ بسا اوقات مضر اور نقصان دہ بھی ثابت ہوگی جیسا کہ ان حضرات کے ارشادات میں تقیہ پر زور دینے اور اسے اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا دین قرار دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں حالات کا تقاضا تھا کہ کبھی خطبہ کی زبان اختیار کی اور کبھی دعا کی۔ واقعہ کربلا کے بعد تبلیغ کی ایک اور زبان ایجاد ہوگئی جس کا نام تھا عزاداری۔

عزاداری درحقیقت ائمہ معصومینؑ کے تبلیغی مشن کے ایک انتہائی محتاط عنصر کا نام تھا جہاں بظاہر اپنے حالات اور اپنے گھر والوں پر گذرنے والے مصائب پر گریہ کیا جاتا تھا جس سے عام طور پر ہر شخص کو ہمدردی ہو جاتی ہے اور کوئی شخص اس کی مخالفت نہیں کرتا ہے لیکن پھر اس کے زیر اثر دین کے اس عظیم پیغام کو نشر کیا جاتا ہے جس کے نشر کرنے ہی کے نتیجہ میں یہ حالات پیش آئے تھے۔ یعنی شہادت کے قبل اور شہادت کے بعد تبلیغ دین کا سلسلہ ایک ہی رہتا ہے صرف اس کا عنوان اور اس کی زبان بدل جاتی ہے۔ چنانچہ امام سجادؑ سے لے کر آخری امام تک جب کسی قدر حالات نے اجازت دی ائمہ معصومینؑ نے تبلیغ دین کے اس عنصر پر زور دیا اور فرش عزا بچھا کر ایک طرف تو لوگوں کو اس سبب کے تلاش کرنے کا جذبہ دیا جس کے باعث یہ حالات اور مصائب پیش آئے تھے اور اس طرح اس دین تک پہونچنے کا موقع فراہم کیا جس کی تبلیغ کے لیے یہ مصائب برداشت کیے گئے تھے اور دوسری طرف ذکر مصائب کے ذیل میں ان تبلیغات کا بھی انتظام کیا گیا جو ائمہ طاہرینؑ کی زندگی اور ان کے منصب کا لائحہ عمل اور نصب العین تھا جس کا ایک پر تو آج تک

مشاہدہ میں آرہا ہے کہ فرش عزا کے طفیل میں تفسیر، حدیث، تاریخ، احکام، عقائد سب کا تذکرہ ہوجاتا ہے اور عنوان عزاداری ہی رہتا ہے۔ حالانکہ عزاداری کا حرفی مفہوم تو صرف غم منانا اور سامان صبر و سکون فراہم کرنا ہے جس سے ان مسائل کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ عام مصائب کے موقع پر تو کوئی ان باتوں کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا ہے جیسا کہ خود عزاداری کے بعض مواقع پر ایسا انداز دیکھنے میں آتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ اور امام علی رضاؑ کا دور قدرے فرصت اور مہلت کا دور تھا لہذا ان حضرات نے اس تبلیغی عنصر کو بھی کافی فروغ دیا، فرش عزا بچھایا، لوگوں کو جمع کیا، شاعر یا خطیب سے ذکر مصائب کا مطالبہ کیا اور سامعین کو بلند آواز سے گریہ کرنے پر زور دیا تاکہ ذکر مصائب عام ہو اور لوگ اس کی بنیادیں تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

امام علی رضاؑ کے دربار میں ابو علی دعبل بن علی بن رزین خزاعی حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کی ولی عہدی کا دور ہے۔ مرو میں آپ کا قیام ہے۔ دعبل نے قصیدہ پیش کرنے کی خواہش کی۔ امامؑ نے فرش بچھوادیا۔ پس پردہ خواتین کو طلب کرلیا اور اس کے بعد دعبل سے قصیدہ سنانے کی فرمائش کی۔ دعبل نے پورا قصیدہ سُنا دیا تو آپ نے ایک شعر کے اضافہ کی خواہش فرمائی اور اس میں خود اپنی شہادت کا ذکر فرمایا اور قبر کی طرف اشارہ فرمایا۔ دعبل نے عرض کی کہ مولا! یہ کس کا ذکر ہے؟ فرمایا کہ یہ میری شہادت اور میری قبر کی طرف اشارہ ہے۔ (شواہد النبوۃ)

اس کے علاوہ آغاز محرم کے ساتھ ہی سوگواری کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی بات پر بھی رونا آئے تو میرے جد بزرگوار پر آنسو بہاؤ اس لیے کہ انھیں بھوکا پیاسا شہید کیا گیا ہے۔ ان تمام الفاظ اور کلمات سے امت اسلامیہ کو ان حالات کی طرف متوجہ فرمایا کرتے تھے جن کے پیش نظر یہ عظیم واقعہ پیش آیا تھا اور جس واقعہ نے اسلام کو بقا کی ضمانت فراہم کی تھی۔

واضح رہے کہ اس واقعہ کے بعد امامؑ نے دعبل کو ایک سو اشرفی کا انعام بھی عطا فرمایا۔ جس پر حضرت کا اسم گرامی کندہ تھا کہ خدمت اہلبیتؑ کا مطلب مفت کام کرنا نہیں ہے۔ خدمت کرنا امت کا کام ہے اور انعام دینا اہلبیتؑ کی اپنی ذمہ داری ہے۔ دعبل نے معذرت کی کہ میں نے یہ قصیدہ درباری داری کے عنوان سے نہیں لکھا ہے بلکہ اخلاص محبت کی بنا پر لکھا ہے۔ فرمایا اس کا

اجر الگ ہے۔ دعبل نے ایک جبہ کا مطالبہ کیا جو آپ نے عنایت فرمادیا اور جب راستہ میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا تو اسی جبہ کی برکت سے سارے قافلہ کو نجات مل گئی بلکہ ان ڈاکوؤں نے باصرار تمام اس جبہ کو ایک ہزار دینار میں خرید لیا کہ یہ امام رضاؑ کا عطا کیا ہوا ہے۔

شہادت

۲۳ر ذی قعدہ ۲۰۳ھ کو مامون نے زہر دلوا کر حضرت کو شہید کرا دیا جس کے بارے میں آپ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہی شخص قتل کرے گا (دمعہ ساکبہ) اور پھر اس کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی اور اس دن بھی جس دن مامون نے طلب کیا تھا ابو الصلت سے فرما دیا تھا کہ اگر میرے سر پر چادر ہو تو مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا اور سمجھ لینا کہ میری زندگی کا آخری وقت آگیا ہے حضرت دربار میں تشریف لے گئے۔ مامون نے زہر آلود انگور جنھیں سوئی کے ذریعہ زہر میں بجھایا گیا تھا پیش کیے۔ آپ نے انکار فرمایا جو حفاظت خود اختیاری کا بنیادی فریضہ تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ اس سے بہتر انگور آپ کو نہیں ملیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ جنت میں اس سے اچھے انگور ہیں۔ اس نے اصرار کیا کہ آپ کو میری نیت پر شبہ ہے؟ آپ نے دیکھا کہ اب قتل یقینی ہوگیا ہے اور انکار میں بھی سوء ظن کا مجرم قرار دیا جاؤں گا اس لیے چند دانے نوش فرمالیے اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مامون نے پھر پوچھا کہ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا جہاں تو نے بھیجا ہے وہاں جا رہا ہوں۔۔ یہ کہہ کر بیت الشرف میں تشریف لے آئے۔ ابو الصلت نے حالات سے اندازہ کر لیا اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں اندر سے آہٹ محسوس ہوئی۔ دیکھا کہ امام کے پہلو میں ایک کمسن فرزند موجود ہے۔ پوچھا آپ کس طرف سے آگئے، دروازہ تو بند ہے اور آپ کون ہیں؟ فرمایا کہ میں ان کا فرزند محمد بن علی ہوں۔ مجھے خدا نے مدینہ سے یہاں پہونچایا ہے اور اسی نے اندر تک پہونچا دیا ہے، ہمارے لیے فاصلے اور در و دیوار حائل نہیں ہوتے، ہم اہلبیتؑ میں جب کوئی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا وارث اس کے پاس رہتا ہے اور اس سے تمام امانتیں اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حضرت کا انتقال ہوگیا اور اس شہزادے نے غسل و کفن دے کر نماز ادا کر کے جنازہ تیار کر دیا تو کہا کہ اب اعلان کر دو۔ چنانچہ اعلان ہوگیا۔ حکومت نے مظالم کی پردہ پوشی کے لیے سرکاری سوگ کا اعلان

کردیا اور دوبارہ غسل وکفن کے بعد نہایت ہی اہتمام کے ساتھ ہارون کے سرھانے دفن کردیا گیا۔ (شواہد النبوۃ)

علامہ شبلی نے اس امر میں شبہ ظاہر کیا ہے کہ آپ کو مامون نے زہر دیا ہو کہ یہ مامون کے مزاج اور اس کی علم دوستی کے خلاف ہے۔ حالانکہ جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہیں کرسکتا ہے اس سے امامؑ کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ مامون کے زہر دینے کا تذکرہ حسب ذیل کتابوں میں موجود ہے، روضۃ الصفا، شواہد النبوۃ، کامل، مروج الذہب، نور الابصار، الفخری، مطالب السئول، حبیب السیر، الانساب سمعانی، تذہیب تہذیب الکمال، مختصر اخبار الخلفاء وغیرہ جس کے بعد یہ کہنا انتہائی زیادتی ہے کہ مامون کے زہر دینے کا تذکرہ علماء اہلسنت کی کتابوں میں نہیں ہے اور یہ صرف شیعوں کی طبع زاد روایت ہے جو مامون کی عداوت میں وضع کی گئی ہے۔

پھر اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ مامون نے زہر دینے کا انتظام نہیں کیا ہے تو سوال یہ پیدا ہے کہ ایک ولی عہد مملکت اور سرکاری داماد کے زہر دغا سے شہید ہونے کے بعد مامون نے سرکاری طور پر قاتلوں کا پتہ لگانے اور انھیں سزا دینے کا کیا انتظام کیا اور تاریخ میں آجتک ان قاتلوں کا سراغ کیوں نہیں مل سکا؟ بنی امیہ تو ایک عثمانؓ کے قتل پر متعدد بار امیر المومنین علیہ السلام کو مورد الزام قرار دے کر ان سے جنگ کریں اور بنی عباس کا "خلیفۂ عادل" اپنے ولی عہد مملکت اور داماد کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کرے اور صرف تجہیز وتکفین کے ظاہری اور رسمی کاروبار پر مسئلہ کو تمام کردے۔ کیا یہ بات مولانا شبلی کے علاوہ بھی کسی انسان کی عقل میں آسکتی ہے اور کیا اس غفلت یا تغافل کے جرم سے مامون رشید کو معاف کیا جاسکتا ہے اور کیا ایسی غیر رشید حرکت کے بعد بھی مامون کو رشید کہا جاسکتا ہے۔

واضح رہے کہ بعض روایات میں تاریخ شہادت ۲۰، صفر اور بعض میں آخر صفر بھی ذکر کی گئی ہے لیکن سن شہادت سب نے ۲۰۳ھ ہی ذکر کیا ہے۔

ازواج واولاد

علماء کے نزدیک آپ کی اولاد کے بارے میں قدرے اختلاف ضرور پایا جاتا ہے کہ بعض حضرات نے دو فرزندوں کی نشان دہی کی ہے امام محمد تقیؑ اور موسیٰ اور بعض نے ایک کا اور

اضافہ کیا ہے۔ نور الابصار نے پانچ فرزند اور ایک دختر کا ذکر کیا ہے جن کے اسماء یہ ہیں: امام محمد تقیؑ، حسن، جعفر، ابراہیم، حسین، عائشہ۔ لیکن اس بات پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ آپ کی نسل کا سلسلہ امام محمد تقیؑ ہی سے آگے بڑھا ہے جس کی بنا پر شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے یہ تصریح کی ہے کہ آپ کے صرف ایک فرزند امام محمد تقیؑ تھے اور بس۔ اور یہی بات شیخ طبرسی نے اعلام الوریٰ میں درج کی ہے اور صاحب عمدۃ الطالب نے بھی نقل کی ہے۔ جس کے بعد یہ کہنا آسان ہے کہ سادات رضوی درحقیقت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں لیکن چونکہ امام رضاؑ اپنی ولی عہدی کی بنیاد پر ایک عام شہرت کے مالک تھے اور آپ کے خاندان کے تمام افراد جو دو پشت بعد پیدا ہوئے وہ بھی ابن الرضا ہی کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اس لیے سادات تقوی نے بھی اپنے کو رضوی ہی کہنا شروع کردیا اور یہ سلسلہ آجتک جاری ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے رضوی، تقوی اور جوادی یہ سب ایک نسل کے افراد ہیں جن کا سلسلہ براہ راست امام محمد تقی جوادؑ سے شروع ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ امام علی رضاؑ تک پہونچتا ہے اور اس سلسلہ کو امام رضاؑ تک اس لیے بھی پہونچایا جاسکتا ہے کہ جن ائمہ کی دو طرح کی اولاد تھی معصوم اور غیر معصوم، ان کے یہاں غیر معصوم اولاد کی نسل کو اسی امام کی طرف منسوب کیا گیا اور معصوم فرزند کی نسل کو فرزند کی طرف منسوب کیا گیا لیکن امام رضاؑ کی دو طرح کی اولاد نہیں تھی لہذا آپ کی تمام نسل کو آپ ہی کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور یوں بھی ائمہ طاہرینؑ ایک ہی شجرہ طیبہ کے ثمرات ہیں لہذا کسی کی اولاد کو دوسرے بزرگ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اس میں کسی طرح کی قباحت نہیں ہے۔ سب اولاد رسولؐ اور اولاد زہراؑ ہیں اور سب کا وجود وعدۂ کوثر کی محسوس اور مشاہدہ میں آنے والی تائید ہے جس کے ذریعہ خدا نے اپنے حبیب کو اطمینان دلایا ہے اور جس کا سلسلہ صبح قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

آپ کے ازواج میں صرف ایک زوجہ محترمہ کا ذکر ملتا ہے جن کا نام خیزران تھا اور انھیں سبیکہ بھی کہا جاتا تھا۔ ان کا تذکرہ سرکار دو عالمؐ نے اپنی حدیث میں بھی فرمایا تھا کہ ان کے فرزند پر میری جان قربان۔ ان خاتون کا سب سے بڑا امتیاز ذاتی کمالات کے علاوہ یہ تھا کہ یہ جناب ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تھیں، اور ماریہ قبطیہ سرکار دو عالمؐ کی نگاہ میں ایک محترم زوجہ تھیں، جنھیں جناب ابراہیمؑ کی والدہ بننے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا اور جن کا فرزند امام حسینؑ کا فدیہ قرار پاگیا تھا کہ اس طرح

اس ہستی کو زندہ رکھا جائے جس کی بقا سے دین اسلام کی بقا اور جس کی شہادت سے عقیدۂ توحید کی زندگی وابستہ ہے۔

ایک خصوصیت

امام رضاؑ کے امتیازات میں ایک یہ بات بھی ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے مدینہ چھوڑتے وقت ۱۶ افراد کو جمع کر کے ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا اور اس پر ۶۰ افراد سے گواہی حاصل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ میرا وارث میرا فرزند علی رضاؑ ہے۔ اس لیے کہ آپ کو معلوم تھا کہ اب میں مدینہ واپس نہ آؤں گا اور وقت آخر بھی بظاہر میرا فرزند میرے پاس نہ ہوگا کہ میں اس کی جانشینی کا اعلان کر سکوں۔ ایسے واقعہ کی مثال دوسرے ائمہ طاہرینؑ کے حالات میں نہیں ملتی ہے۔

اصحاب و تلامذہ

۱۔ دِعبل بن علی الخزاعی

اپنے وقت کے عظیم ترین شاعر اور ادیب تھے۔ ان کا قصیدہ تاریخ ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام رضاؑ کی شان میں قصیدہ لکھنے کے بعد خراسان کا رُخ کیا کہ سب سے پہلے حضرت کو سنائیں گے۔ حضرت نے سن کر بے حد تعریف کی اور فرمایا کہ اسے ہر ایک کو مت سنانا۔ لیکن جب قصیدہ کی شہرت زیادہ ہوئی تو مامون نے دربار میں طلب کر کے قصیدہ کی فرمائش کی۔ دعبل نے اسے ٹال دیا تو اس نے امام رضاؑ کو طلب کر کے آپ سے سفارش کرائی اور دعبل نے امامؑ کے حکم پر قصیدہ سنا دیا تو مامون نے ۵۰ ہزار درہم انعام دیے اور امامؑ نے بھی اسی قدر دعبل پر عنایت فرمائی۔ دعبل نے عرض کی کہ مولا! مجھے مال دنیا درکار نہیں ہے مجھے اپنا جبہ عنایت فرما دیجیے جو آخرت میں میرے کام آئے گا۔ آپ نے اسے بھی عنایت فرما دیا اور فرمایا کہ اسے محفوظ رکھنا یہ کبھی کام آئے گا چنانچہ راستہ میں ڈاکوؤں کے حملہ کے وقت وہی جبہ سارے قافلہ کے کام آیا اور اسی کی برکت سے ڈاکوؤں نے سارے قافلہ کا مال واپس کر دیا۔

بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ دعبل نے اپنے قصیدہ میں بغداد میں ایک قبر کا ذکر کیا تو

امامؑ نے فرمایا کہ اس میں دو اشعار کا اور اضافہ کر لو تاکہ قصیدہ مکمل ہو جائے اور یہ کہہ کر آپ نے طوس کی قبر کے بارے میں دو شعر ارشاد فرمائے۔ دعبل نے عرض کی مولا! یہ کس کی قبر ہے؟ فرمایا یہ میری قبر کا ذکر ہے اور جو شخص بھی عالم غربت میں میری زیارت کرے گا وہ روز قیامت میرے ساتھ محشور ہوگا۔ اور یہ کہہ کر سو دینار رضوی بھی عنایت فرمائے جن پر حضرت کا اسم گرامی کندہ تھا اور دعبل نے اسے بطور تبرک محفوظ کر لیا۔

۲۔ حسن بن علی بن زیاد الوشار البجلی الکوفی

امام رضاؑ کے مخصوص اصحاب میں تھے اور ان کے نانا الیاس صیرفی امام صادقؑ کے نمایاں اصحاب میں شمار ہوتے تھے اور انھوں نے وقت آخر امام صادقؑ کی اس روایت کا ذکر کیا تھا کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ جس کے دل میں ہم اہلبیتؑ کی واقعی محبت ہو گی اسے آتش جہنم مَس نہیں کر سکتی ہے۔

شیخ طوسیؒ نے احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی سے نقل کیا ہے کہ میں طلب احادیث میں قم سے کوفہ گیا تو وہاں حسن بن علی بن الوشار سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ علاء بن رزین اور ابان بن عثمان کی کتابوں کو روایت کرنے کا اجازہ مرحمت فرمایئے تو انھوں نے کہا کہ پہلے آپ کتابیں نقل کر لیں پھر میں سُن لوں گا تو میں نے کہا کہ آپ ابھی سُنا دیں اس لیے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے تو حسن بن علی بن الوشار نے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگوں میں حدیث کا اس قدر شوق ہے تو میں احادیث کا ذخیرہ اکٹھا کر لیتا اس لیے کہ میں نے اسی مسجد کوفہ میں ۹۰۰ ایسے شیوخ کو دیکھا ہے جو امام جعفر صادقؑ کی حدیثیں بیان کر رہے تھے۔

ابن شہر آشوب کا بیان ہے کہ حسن بن علی بن الوشار کو امام رضاؑ کی امامت میں قدرے تردد تھا تو ایک مرتبہ مسائل کا ایک ذخیرہ تیار کر کے حضرت کی خدمت میں بغرض امتحان وارد ہوئے یہ ابھی دروازہ ہی پر تھے کہ ایک خادم نے آکر پوچھا کہ تم میں حسن بن علی بن الوشار کون ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں ہوں۔ تو خادم نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ اس میں تمہارے سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ یہ سنا تھا کہ ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا اور انھوں نے حضرت کی امامت کا یقین کامل پیدا کر لیا۔

۳۔ حسن بن علی بن فضّال تَیمُلی کوفی

امام رضاؑ کے مخصوص اصحاب اور راویان احادیث میں تھے۔ فضل بن شاذان کا بیان ہے کہ میں مسجد میں درس قرأت حاصل کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کسی ایسے شخص کا تذکرہ کر رہے ہیں جو دامن کوہ میں رہتا ہے اور مسلسل عبادت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جانوران صحرا بھی اس سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس کے پہلو میں چرتے ہیں اور وہ سجدہ کو اس طرح طول دیتا ہے جیسے کوئی انسان دنیا سے گذر چکا ہو۔ میں حیرت میں تھا کہ ایسا انسان کون ہو سکتا ہے کہ اتنے میں ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور میرے والد نے بڑھ کر استقبال کیا اور نہایت درجہ احترام کا برتاؤ کیا تو اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ حسن بن علی بن فضال تھے۔ میں نے کہا کہ یہ وہی عابد معروف ہیں؟ —— وہ تو پہاڑ پر رہتے ہیں۔ فرمایا کہ ہاں آج اُتر کر آئے ہیں اور میرے پاس اکثر آتے رہتے ہیں۔ میرے دل میں ان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ میں اکثر ان کے پاس جا کر ابن بکیر وغیرہ کی کتابیں سُنا کرتا تھا اور اکثر میرے پاس خود آ کر سنایا کرتے تھے اور یہ صرف ان کا جذبہ دین داری تھا ورنہ ایک سال سپہ سالار مامون طاہر بن الحسین الخزاعی حج کر کے کوفہ واپس آیا تو اس نے بار بار حسن بن علی بن فضال سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ حسن کی وفات ۲۲۴ھ میں واقع ہوئی ہے۔

۴۔ حسن بن محبوب السرّاد البجلی الکوفی

اپنے دور کے ارکان اربعہ اور اصحاب اجماع میں شمار ہوتے تھے۔ عام طور سے لوگ انھیں زرّاد کہتے تھے لیکن امام رضاؑ نے فرمایا کہ سرّاد کہا کرو کہ لفظ سرد زرہ سازی کے بارے میں قرآن میں استعمال ہوا ہے اور امت اسلامیہ کو الفاظ قرآن کو اہمیت دینا چاہیے۔

ان کے والد نے ان کی تربیت کا اس قدر اہتمام کیا تھا کہ علی بن رئاب کی ایک ایک حدیث حفظ کرنے پر ایک ایک درہم انعام دیا کرتے تھے۔ حسن بن محبوب کا انتقال ۲۲۴ھ کے اواخر میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ہوا ہے۔

۵۔ زکریا بن آدم بن عبداللہ بن سعد اشعری قمیؒ

امام رضاؑ کے مخصوص اصحاب اور مقربین بارگاہ میں تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سے عرض کی کہ میں

اپنے گھر والوں سے الگ ہونا چاہتا ہوں کہ ان میں احمق بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ فرمایا ایسا ہرگز مت کرنا کہ رب العالمین تمھارے ذریعہ ان سے اسی طرح بلاؤں کو دفع کرتا ہے جس طرح کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی قبر کے طفیل میں اہل بغداد کی بلاؤں کو دفع کرتا ہے۔

علی بن المسیب الہمدانی نے امام رضاؑ سے عرض کی کہ میری منزل بہت دور ہے اور میں ہمیشہ آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا ہوں تو احکام دین کس سے حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا زکریا بن آدم قمی جو میری نظر میں دین و دنیا دونوں میں مامون و محفوظ ہیں۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھیں یہ سعادت بھی حاصل تھی کہ ایک سال امام رضاؑ کے ساتھ حج میں گئے تو مدینہ سے مکہ تک حضرت کے ساتھ ایک ہی محمل میں سوار رہے۔ علامہ مجلسیؒ نے تاریخ قم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اشعری خاندان کے بارے میں دعا فرمائی تھی کہ خدایا ان کے صغیر و کبیر کی مغفرت فرما۔

زکریا بن آدم کی قبر قم کے قبرستان شیخان کبیر میں مشہور ہے اور انھیں کے پہلو میں ان کے چچا زاد بھائی زکریا بن ادریس بن عبداللہ بن سعد اشعری کی قبر ہے۔

۶۔ صفوان بن یحییٰ ابو محمد بجلی کوفی

اپنے دور کے معتبر ترین راویوں میں شمار ہوتے تھے۔ امام رضاؑ اور امام جوادؑ کے اصحاب میں تھے بلکہ حضرت کے وکیل بھی تھے۔

علامہ کشی نے انھیں بھی اصحاب اجماع میں شمار کیا ہے اور بعض مورخین نے نقل کیا ہے کہ صفوان عبداللہ بن جندب اور علی بن نعمان کے ساتھ شریک تجارت تھے اور تینوں حضرات پابندی کے ساتھ روزانہ ۵۱ رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور انھوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ جو بعد میں رہ جائے گا وہ دوسروں کی طرف سے بھی عمل کرے گا۔ چنانچہ صفوان اپنے دونوں ساتھیوں کے انتقال کے بعد روزانہ تین مرتبہ ۵۱ رکعت نماز پڑھتے تھے اور سال میں تین ماہ کے روزے رکھتے تھے اور اپنے مال کی زکوٰۃ تین مرتبہ ادا کرتے تھے اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کرایہ پر اونٹ لے کر کوفہ جا رہے تھے تو کسی شخص نے دو دینار کوفہ پہونچانے کے لیے دے دیے تو اس وقت تک اونٹ پر سوار نہیں ہوئے جب تک مالک سے اس قدر بار کے اضافہ کی اجازت نہیں لے لی۔ اگرچہ مومنین کرام کی حاجت برآری کا یہ جذبہ تھا کہ صاحب دینار

سے انکار بھی نہیں کیا کہ میں نہیں لے جا سکتا ہوں۔

صفوان نے امام صادقؑ کے اصحاب میں سے چالیس افراد سے روایت بیان کی ہے اور ۲۱۰ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا ہے جہاں امام جوادؑ نے کفن اور حنوط وغیرہ کا انتظام کیا اور اسماعیل بن موسیٰ کو حکم دیا کہ ان کی نماز جنازہ ادا کریں۔

۷۔ محمد بن اسماعیل بن بزیع

مرد ثقہ اور اخص اصحاب امام رضاؑ میں تھے۔ امام جوادؑ کا زمانہ بھی درک کیا ہے۔ ان کا شمار وزراء میں بھی ہوتا تھا اور علی بن نعمان نے ان کے بارے میں وصیت کی تھی کہ میری ساری کتابیں محمد بن اسماعیل بن بزیع کو دے دی جائیں۔ انھوں نے امام جوادؑ سے کفن کے واسطے پیراہن بھی طلب کیا تھا تو آپ نے اسے ارسال فرما دیا اور فرمایا کہ اس کے تکمے نکال دیے جائیں۔ راہ مکہ میں مقام فَید میں انتقال فرمایا جس کے بارے میں محمد بن احمد بن یحییٰ اشعری کا بیان ہے کہ میں نے علی بن بلال کے ساتھ ان کی قبر کی زیارت کی تو انھوں نے ان کے حوالے سے امام رضاؑ کی یہ حدیث نقل کی کہ اگر کوئی شخص قبر پر ہاتھ رکھ کر سات مرتبہ سورہ انا انزلناہ پڑھ دے گا تو پڑھنے والا اور مُردہ دونوں ہول قیامت سے محفوظ ہو جائیں گے۔

محمد بن اسماعیل کی جلالت قدر کے بارے میں یہ واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ علامہ طباطبائی بحر العلوم کے والد ماجد جناب سید مرتضیٰؒ نے علامہ کی ولادت کی رات خواب میں دیکھا تھا کہ امام رضاؑ نے محمد بن اسماعیل کو ایک شمع دے کر میرے گھر میں بھیجا ہے اور انھوں نے وہ شمع روشن کر دی تو ساری فضا منور ہو گئی۔

یقیناً علامہ بحر العلومؒ کا وجود ایک شمع فروزاں کی حیثیت رکھتا تھا جس نے پورے عالم علم و تقویٰ کو روشن اور منور کر دیا تھا لیکن یہ محمد بن اسماعیل کا مرتبہ تھا کہ اس شمع فروزاں کی بشارت دینے کے لیے امام رضاؑ نے ان کا وسیلہ اختیار فرمایا کہ گویا یہ شمع علم محمد بن اسماعیل کی روایات اور ان کے برکات کے واسطے سے روشن ہو گی اور یہ بات دونوں حضرات کے شرف و کمال اور فضل و اجلال کے لیے کافی ہے۔

۸۔ نصر بن قابوس

امام صادقؑ، امام کاظمؑ اور امام رضاؑ تینوں حضرات سے روایت نقل کی ہے اور ۲۰ سال تک

امام صادقؑ کے وکیل رہے ہیں۔ امام کاظمؑ کے مخصوص اصحاب میں تھے اور ان سے امام رضاؑ کی امامت کی نص کی روایت کی ہے۔

● شیخ کشی نے ان کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک حجرہ تک لے گئے جہاں امام رضاؑ مشغول مطالعہ تھے اور فرمایا کہ نصر اس فرزند کو پہچانتے ہو؟ عرض کی کہ یہ علی بن موسیٰ الرضاؑ ہیں۔ فرمایا اور یہ کتاب؟ عرض کی آپ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ کتاب جفر ہے جسے صرف انبیاء اور اوصیاء پڑھ سکتے ہیں۔ جس کے بعد حضرت کی امامت کا یقین اور کامل ہو گیا۔

● دوسرے موقع پر نصر نے امام موسیٰ کاظمؑ سے عرض کی کہ میں نے آپ کے والد سے ان کے وصی کے بارے میں دریافت کیا تھا تو انھوں نے آپ کا نام بتایا تھا۔ اب آپ کا وصی کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرا فرزند علی بن موسیٰ۔!

اقوال حکیمانہ

۱۔ ہر شخص کا واقعی دوست اس کی عقل ہے اور اس کا واقعی دشمن اس کی جہالت ہے۔

(یقیناً عقل ہی ایک ایسا دوست ہے جسے نادان دوست نہیں کہا جا سکتا ہے اور جہالت ہی ایک ایسا دشمن ہے جسے دانا دشمن نہیں کہا جا سکتا ہے)۔

۲۔ پروردگار تین چیزوں کو سخت ناپسند کرتا ہے: بے جا بحث و مباحثہ، مال کا ضائع کرنا اور زیادہ سوال کرنا۔

(رسول اکرمؐ نے بھی فرمایا ہے کہ چار چیزوں سے دل کی موت واقع ہو جاتی ہے: مسلسل گناہ کرنا، عورتوں سے زیادہ گفتگو کرنا، احمق آدمی سے بحث و مباحثہ کرنا اور بدحواس دولت مند کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا)۔

۳۔ ہم اہلبیتؑ وعدہ کو ایک قرض سمجھتے ہیں اور اس کی ادائیگی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(حقیقت امر یہ ہے کہ ہماری دنیا و آخرت کی تمام بھلائی اہلبیت طاہرینؑ کے وعدۂ دادرسی اور وعدۂ شفاعت سے وابستہ ہے اور اس یقین سے متعلق ہے کہ وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے ہیں)۔

۴۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جب عافیت کے نو حصے گوشہ نشینی میں ہوں گے اور ایک حصہ

سکوت میں ہوگا۔

(بے شک ایسا دور ہر انسان کی زندگی میں آسکتا ہے۔ لیکن انسان کا فرض ہے کہ گوشہ نشینی اور سکوت دونوں صورتوں میں اپنے فرائض سے غافل نہ رہے کہ فرائض کی ادائیگی عافیت طلبی سے بہرحال زیادہ ضروری ہے ورنہ جناب آدمؑ جنت ہی میں رہ جاتے اور آل محمدؐ عرش اعظم ہی پر رہ جاتے)۔

۵۔ کسی شخص نے دریافت کیا کہ فرزند رسولؐ! آپ نے کس عالم میں صبح کی؟ تو آپ نے فرمایا کہ چار مصیبتوں کے درمیان۔ عمر کم ہوتی جارہی ہے، اعمال محفوظ ہوتے جارہے ہیں، موت تعاقب میں لگی ہوئی ہے اور جہنم اپنی تاک میں ہے۔

(کاش ہم گناہ گاروں کو ان حقائق کا احساس ہوجاتا جن کی طرف امام معصومؑ نے توجہ دلائی ہے)۔

۶۔ بنی اسرائیل میں کوئی شخص اس وقت تک عابد نہیں شمار ہوتا تھا جب تک دس سال تک سکوت نہ اختیار کرے۔

(بے شک عابد بننے کے لیے سکوت ضروری ہے۔ لیکن عالم بننے کے لیے تکلم بھی لازم ہے اور عالم کا مرتبہ بقول معصومینؑ عابد سے بہرحال بہتر ہے)۔

۷۔ جو انسان خدا کے مختصر رزق پر راضی ہوجاتا ہے خدا اس کے مختصر عمل پر بھی راضی ہوجاتا ہے۔

(کاش انسان اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوجاتا کہ جس طرح وہ خدا سے رزق کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح خدا نے اس سے عمل کا مطالبہ کیا ہے۔ تو اگر وہ کم رزق پر راضی نہیں ہوتا ہے تو خدا سے کس طرح تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کے کم عمل پر راضی ہوجائے)۔

۸۔ دنیا کے تمام مصائب میں سب سے بڑی مصیبت علماء کی موت ہے۔

۹۔ روز عرفہ آپ نے سارا مال راہ خدا میں لٹا دیا تو فضل بن سہل نے اعتراض کیا کہ یہ تو ایک بڑا خسارہ ہے!۔ فرمایا کہ یہ خسارہ نہیں بلکہ فائدہ ہے۔ نقصان اسے نہیں کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں اجر و کرامت حاصل ہوجائے۔

۱۰۔ انسان خیر کے عالم میں ہو تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیے بلکہ پروردگار سے برابر دعا کرنی چاہیے کہ خدایا! اس خیر کو سلامت رکھنا اور اسے منزل تمام و کمال تک پہونچا دینا۔

(درحقیقت ہر کار خیر ہمیشہ انھیں دونوں خطرات سے دوچار رہتا ہے۔ کبھی ریاکاری اور منت گزاری

وغیرہ کا جذبہ شامل ہوجاتا ہے تو عمل صحیح و سالم نہیں رہ جاتا ہے اور اجر و ثواب کے بجائے عذاب و عقاب کا استحقاق پیدا کرادیتا ہے اور کبھی اس جہت سے صحیح و سالم رہ جاتا ہے لیکن اس کے مکمل ہونے کی نوبت نہیں آتی ہے اور درمیان ہی میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ امام علی رضاؑ نے اسی نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اپنے کار خیر پر مغرور ہونے کے بجائے ان دونوں باتوں کی فکر کرے جن پر اجر و ثواب کا دارومدار ہے اور جن کے بغیر کوئی کار خیر، کار خیر کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ رب کریم ہر مرد مومن کو خیر کی توفیق دے اور پھر اس کو ہر عیب و نقص سے محفوظ رکھتے ہوئے درجہ تمام و کمال تک پہونچانے کی سعادت عنایت فرمائے۔!)

مسئلہ ولی عہدی

امام علی رضا علیہ السلام کی زندگی کے تمام واقعات میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ ولی عہدی کو حاصل ہے اسی لیے علماء اعلام نے عام طور سے اس مسئلہ کو قابل بحث قرار دیا ہے اور اس کے اسباب پر اجمالی یا تفصیلی طور پر روشنی ڈالی ہے۔

یہاں اس مقام پر بحث کے تفصیلات میں داخل ہونے سے پہلے ایک امر کی طرف توجہ دلانا بے حد ضروری ہے جس کو عام طور سے نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ معصومین علیہم السلام کی زندگیوں میں چند مواقع اور مراحل ہیں جن کے بارے میں دور قدیم سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے اور آج تک اس سلسلہ کی بحث جاری ہے جب کہ ٹھیک اسی قسم کے دوسرے مسائل ہیں جن کو زیر بحث نہیں لایا گیا ہے حالانکہ ان کی اہمیت بھی زیر بحث مسائل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ، صلح امام حسنؑ، جنگ بندی صفین، تعدد ازواج امام حسنؑ، عدم قیام امام صادقؑ، ولی عہدی امام رضاؑ وغیرہ سے برابر بحث کی جاتی ہے اور اس کے متوازی مسائل غزوات پیغمبر اسلامؐ، قیام امام حسینؑ، مجاہدات مولائے کائنات جیسے مسائل کو اس قدر اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اور شاید اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ معصومینؑ کے بارے میں ایک عام عقیدہ تمام عالم اسلام بلکہ عالم انسانیت میں یہ پایا جاتا ہے کہ یہ باطل سے برسرپیکار تو ہوسکتے ہیں لیکن باطل سے اتفاق رائے نہیں کرسکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جہاں پیکار اور اختلاف کا ذکر آتا ہے وہاں بحث رک جاتی ہے کہ یہ کام مطابق اصول انجام پایا ہے

اور جہاں اتحاد و اتفاق کی بُو آتی ہے وہاں بحث شروع ہو جاتی ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے کفار سے کیونکر صلح کر لی اور امام حسنؑ کا حاکم شام سے کس نقطہ پر اتفاق ہو گیا یا مولائے کائنات نے تحکیم کا فیصلہ کس طرح تسلیم کر لیا یا امام حسنؑ جیسے مرد باخدا نے متعدد شادیاں کس طرح کر لیں (بر فرض صحت روایت) یا امام جعفر صادقؑ نے حالات کے سازگار ہوتے ہوئے بھی اپنے حق کا اعلان کیوں نہیں کیا، یا امام علی رضاؑ نے ایک ظالم اور بے دین حکومت کا عہدہ کس طرح قبول کر لیا۔ اور یہ بات درحقیقت ائمہ طاہرینؑ کی عظمت کردار کی ایک نشانی ہے کہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ عام ہے کہ وہ باطل سے برسرپیکار ہو سکتے ہیں ہم رنگ اور ہم آہنگ نہیں ہو سکتے ہیں اور خود امام رضاؑ نے بھی ولی عہدی کے موقع پر اسی نکتہ کو نگاہ میں رکھا تھا کہ اس سے وہ عام جذبہ یا عقیدہ مجروح ہوگا جو اہلبیتؑ کے بارے میں پایا جاتا ہے اور جو واقعاً ہماری عصمت اور عظمت کا راز ہے۔ لہذا آپ نے ولی عہدی پانے کے فوراً بعد اظہار مسرت اور شکر خدا کرنے کے بجائے بارگاہ احدیت میں معذرت کی کہ پروردگار! جس طرح یوسفؑ نے حالات کے پیش نظر عزیز مصر کا عہدہ قبول کر لیا تھا اسی طرح میں نے اس ولی عہدی کو قبول کیا ہے ورنہ میں کسی ظالم کا عہدہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور یہ میرے امکان کی بات نہیں ہے۔

واضح رہے کہ ولی عہدی کی بحث میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ مامون کے طرفدار ہیں تو انھیں مامون کے کردار کی صفائی دینا ہے اور بعض لوگ امام رضاؑ کے عقیدتمند ہیں تو انھیں امامؑ کے اقدام کی بنیاد تلاش کرنا ہے۔

مامون پرست لوگوں میں عصر حاضر کے مشہور مؤرخ احمد امین وغیرہ نے اس واقعہ کے بعض اسباب کو یوں واضح کیا ہے کہ:

۱۔ مامون امام رضاؑ کو منظر عام پر لا کر ان کی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا کہ ائمہ اہلبیتؑ سماج سے الگ رہتے ہیں تو ان کے چاہنے والوں کو ان کی عظمت و عصمت اور ان کے تقویٰ اور تقدس کے بارے میں پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ ان کی شخصیت کو بے مثل و بے نظیر بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مامون نے چاہا کہ انھیں منظر عام پر لے آیا جائے تاکہ لوگ ان کی حقیقت سے باخبر ہو جائیں اور انھیں بھی اندازہ ہو جائے کہ نظام حکومت سنبھالنے کے بعد انسان اس تقدس کی زندگی

نہیں گذار سکتا ہے۔

۲۔ فضل بن سہل جیسے افراد خراسانی ہونے کی بنا پر امام رضاؑ اور عام اہلبیتؑ سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور مامون کو یہ خطرہ تھا کہ یہ افراد کسی وقت بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ لہذا انھیں خوش کرنے کے لیے امام رضاؑ کو ولی عہدی کا عہدہ دے دیا گیا۔

۳۔ مامون معتزلی عقیدہ کا آدمی تھا اور اعتزال بڑی حد تک تشیع سے قریب تر ہے لہذا اس کے افکار میں تشیع سرایت کر گیا اور اس نے امام الشیعہ کو ولی عہد مملکت بنا دیا۔

اس کے بعد خود مامون کے تشیع پر حسب ذیل دلائل قائم کیے گئے ہیں:

ا۔ مامون حضرت علیؑ کی افضلیت کا قائل تھا اور وہ اس سلسلہ سے لوگوں سے بحث بھی کیا کرتا تھا۔

ب۔ مامون امام رضاؑ سے لوگوں کے مناظرے کراتا رہتا تھا تاکہ ان کا فضل و شرف ظاہر ہو سکے اور لوگ ائمہ اہلبیتؑ کی افضلیت کے قائل ہو جائیں اور اسی بنیاد پر کمسنی کے باوجود امام محمد تقیؑ کا مناظرہ یحییٰ بن اکثم جیسے شہرۂ آفاق عالم اور قاضی سے کرا دیا۔

ج۔ مامون قرآن کو مخلوق تسلیم کرتا تھا اور یہی ائمہ اہلبیتؑ کا عقیدہ تھا۔

د۔ مامون متعہ کو جائز سمجھتا تھا اور یہ بات مذہب شیعہ کے خصوصیات میں ہے۔

ھ۔ مامون نے فدک کی واپسی کا اعلان کر دیا تھا جو فدک کے حق زہراؑ تسلیم کرنے اور خلیفہ اول کے غصب کرنے کے مترادف تھا۔

و۔ مامون نے ایک بیٹی کا عقد امام رضاؑ سے کر دیا اور دوسری کا عقد امام جوادؑ سے کر دیا جو اس بات کی علامت ہے کہ اسے ائمہ اہلبیتؑ سے خاص عقیدت حاصل تھی۔

ان دلائل کے تفصیلی جائزے کے لیے ایک مکمل کتاب درکار ہے۔ اجمالی طور پر صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مامون کی طرف سے ولی عہدی کی پیش کش خود تشیع کی بنیاد کے خلاف ہے کہ تشیع ائمہ طاہرینؑ کی حکومت اور مولائیت کے اعتراف کا نام ہے۔ تشیع میں دوسرے کے حاکم اور ان کے ولی عہد ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جو خود امام رضاؑ نے بھی فرمائی تھی کہ یہ عہدہ تجھے خدا نے دیا ہے تو دوسرے کو دینے کا حق نہیں ہے اور بندوں سے ملا ہے تو میرے لینے کا کوئی جواز نہیں ہے

اس لیے کہ میں بندوں کو اس امر کا مجاز نہیں سمجھتا۔ اور اس کے بعد جب تک مامون نے مجبور نہیں کیا اور قتل کا اشارہ نہیں دیا اس وقت تک آپ نے قبول نہیں فرمایا۔

مناظروں کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے مامون اپنے فضل و شرف کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ میرے دربار میں ایسے ایسے افراد پائے جاتے ہیں اور اس کا امام رضاؑ کے فضل و شرف سے کوئی تعلق نہیں ہے، ورنہ اس فضل و شرف کے اعتراف کا واقعی ماحصل تو یہ تھا کہ خود دستبردار ہو کر حق کو حق دار کے حوالے کر دیتا۔

خلق قرآن یا متعہ کا مسئلہ اصل تشیع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ ایسے جزئی مسائل میں دو مذاہب کے افراد میں اتفاق رائے ہو سکتا ہے جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ متعہ کو وہ افراد بھی جائز جانتے تھے جن کا مذہب شیعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور آج بھی رسل جیسے لوگ اگر اسے زندگی کے مسائل کا لازمی حل قرار دیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے مذہب شیعہ قبول کر لیا ہے۔ مذہب شیعہ ایک مکمل مذہب ہے۔ اس کا ایک دو احکام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مامون جیسے افراد نے تو ان مسائل کو بھی صرف عوام کی توجہ کو سیاسی مسائل کی طرف سے ہٹانے کے لیے ایجاد کیا تھا ورنہ عوام کو ان مسائل سے کیا تعلق ہے اور ان میں قرآن کے مخلوق یا قدیم ہونے کے بنیادی فرق کے محسوس کرنے کی کس قدر صلاحیت پائی جاتی ہے اس کا اندازہ ہر صاحب علم و اطلاع کر سکتا ہے۔

تزویج کے مسئلہ کا بھی عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی صورت حال تمام تر سیاسی ہے جس کی مثالیں سرکار دو عالمؐ کی زندگی میں بھی مل سکتی ہیں کہ ابوسفیان کی بیٹی کا عقد حضور اکرمؐ سے اس وقت ہوا تھا جب وہ واضح طور پر کفر کی صفوں میں شامل تھا اور کسی نفاق کا بھی سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا۔

پھر ایک گھر کی دو بیٹیوں کا باپ اور بیٹے سے عقد کرنا اور وہ بھی سن و سال کے بے پناہ تفاوت کے ساتھ یا شادی کی عمر کا لحاظ کیے بغیر خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اقدام ایک سیاسی حیثیت کا مالک ہے اور اس کا عقیدہ یا عقیدت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسئلہ فدک کا اٹھانا بھی ایک سیاسی اقدام تھا ورنہ اسے امام کی احقیت کا خیال ہوتا تو امام

رضاؑ کے بعد امام جوادؑ کے ولی عہد مملکت ہونے کا اعلان کرتا جب کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ خود امام رضاؑ ہی کا وجود برداشت نہ ہو سکا۔ امام جوادؑ کے بارے میں ایسی فکر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہاں زہر دینے کے جرم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے فرزند کو داماد ضرور بنا لیا گیا — جو دور قدیم سے تاریخ میں ہوتا چلا آ رہا تھا اور ظالم اپنے ظلم اور اپنی شقاوت کی پردہ پوشی کے لیے بڑی شخصیتوں کو اپنا داماد بنا لیا کرتے تھے اور اس طرح عوام کو کھلا ہوا دھوکہ دیا کرتے تھے۔

فضل بن سہل کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس نے اپنے امکان بھر مامون کو اس اقدام سے روکا تھا اور اس کے محرک ولی عہدی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

حقیقی اسباب ولی عہدی

بات صرف یہ ہے کہ حالات نے مامون کو اس موڑ پر پہونچا دیا تھا جہاں بنی ہاشم کا راضی کرنا ضروری ہو گیا تھا اور امام رضاؑ کی شخصیت کا سہارا لیے بغیر اس کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا اس لیے اس نے اس قسم کا سیاسی قدم اٹھایا اور اس کے حسب ذیل اسباب محرک قرار پائے:

۱۔ امام رضاؑ کو اپنے زیر نظر رکھا جائے تاکہ عوام سے زیادہ قریب نہ ہونے پائیں اور اس طرح ان کی عوامی شخصیت کے خطرہ سے اپنا تحفظ کر لیا جائے ورنہ ان کی شخصیت کسی وقت بھی حکومت کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور امامؑ نے ولی عہدی سے فائدہ اٹھا کر عوامی رابطہ بڑھایا اور اس سے بہت کچھ فائدہ حاصل کر لیا جس کی تفصیل نتائج ولی عہدی کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

۲۔ امامؑ کی ملاقاتوں کو دشوار تر بنا دیا جائے تاکہ ان کے علوم و احکام کی اشاعت نہ ہو سکے جو ہر دور کے حکام جور کا اہل علم کے ساتھ برتاؤ رہا ہے کہ بظاہر اعزاز و احترام کے نام پر عوام سے رابطہ توڑ دیا جائے اور عوام کو ان کے صحیح نظریات و تعلیمات سے آگاہ نہ ہونے دیا جائے اور اس طرح حکومت کو ان کے تعلیمات کی خود ساختہ ترجمانی کا موقع مل جائے۔

۳۔ عوام میں امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے زیر اثر پیدا ہونے والے جذبات کا علاج کیا جائے کہ حکومت اہلبیتؑ کی دشمن نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ہاتھ امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت میں ہے۔

۴۔ امام رضاؑ کی وزارت سے حکومت کی عظمت میں اضافہ کیا جائے کہ جس دربار کے وزراء میں امام رضاؑ جیسے افراد شامل ہوں اس کے سلطان وقت کی صلاحیتوں کا کیا عالم ہوگا اور اس حکومت کو کس طرح غیر شرعی کہا جاسکتا ہے جس کی وزارت کا کام فرزند رسولؐ حضرت علیؑ بن موسیٰؑ انجام دے رہے ہوں۔

۵۔ عوام کے خیالات کو ایک نئے موضوع کی طرف موڑ دیا جائے اور ہر گھر میں ایک نئی بحث ایجاد کر دی جائے جس کا تصور بھی قوم کے ذہن میں کبھی نہ رہا ہو اور اس طرح بہت سے بنیادی مسائل کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹا دی جائے جن سے حکومت کو سخت قسم کے سیاسی خطرات لاحق ہیں۔

۶۔ عوام میں یہ احساس پیدا کرا دیا جائے کہ حکومت مصالح امت کے بارے میں اس قدر مخلص ہے کہ اپنے بھائی کو قتل کرا کے باہر کے افراد کو ولی عہد بنانے کے لیے تیار ہے جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مامون اپنے گھر میں حکومت نہیں رکھنا چاہتا ہے۔ امت اور ملت کو فائدہ پہونچانا چاہتا ہے، چاہے وہ گھر کے افراد سے حاصل ہو یا باہر کے افراد سے۔

۷۔ علویین کی طرف سے اٹھنے والی انقلابی آوازوں اور تحریکوں کا دبانا اس امر پر موقوف ہوگیا تھا کہ ان کے سربراہ کو حکومت میں شامل کر لیا جائے اور انھیں یہ باور کرا دیا جائے کہ حکومت نے اپنا طرز عمل تبدیل کر دیا ہے اور اب وہ انھیں ان کا مکمل حق دینے کے لیے تیار ہے لہٰذا انھیں کسی قسم کے اقدام کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بعد ان کا ہر اقدام خود ان کی نفسانیت اور جاہ طلبی پر محمول کر دیا جائے۔

۸۔ مامون کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ کسی قدر اقتدار کا مالک کیوں نہ ہو جائے اور اس کی حکومت میں کسی قدر وسعت کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ حکومت کی شرعی حیثیت بہرحال اس بات پر موقوف ہے کہ رسول اکرمؐ کے خاندان کی عظیم ترین شخصیت اس حکومت کی تائید کرے — اور وہ نظام حکومت میں شامل ہو جائے ورنہ فرزند رسول اکرمؐ کی تائید کے بغیر کوئی اس حکومت کو صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا اور مامون کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس کی حکومت کو شرعی حکومت کہا جائے۔ وہ اُس قسم کا عیاش اور اوباش بادشاہ نہیں تھا جو بہرحال کرسی پر قابض رہنا

چاہتا ہو چاہے اس کی حیثیت کتنی ہی غیر شرعی کیوں نہ ہو کہ اس طرح کی حکومت کسی وقت بھی اسلامی جذبات کا شکار ہو سکتی ہے اور یہ احساس درحقیقت وہی احساس تھا جو ابتداء سے خلفاء اسلام کے ذہن میں رہا ہے اور جس کی بنا پر مولائے کائنات اور امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس کے بغیر حکومت شرعی کہے جانے کے قابل نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے پہلے والوں نے بیعت کا مطالبہ کیا تھا اور وہ اس کا حشر دیکھ چکے تھے اس لیے مامون نے اس مطالبہ کو ایک حسین شکل دے دی کہ انھیں غلام بنانے کے بجائے حاکم یا شریک حکومت بنا لیا جائے کہ اس طرح مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور آل رسولؐ کو غلام بنانے کا الزام بھی عائد نہیں ہوگا۔

امام علی رضاؑ نے اسی نکتہ کے پیش نظر ولی عہدی میں یہ شرط رکھ دی تھی کہ میں امور مملکت میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کروں گا اور کوئی کام میرے نام پر نہیں ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھ سے کوئی مشورہ لیا جائے گا تو میں صحیح مشورہ ضرور دوں گا کہ یہ تاریخ امامت میں ہر علیؑ کا طریقہ کار رہا ہے اور اس اصول حیات سے کوئی بھی متدین انسان انحراف نہیں کر سکتا ہے۔ شخصیت سے اختلاف الگ ایک چیز ہے اور اسلامی مقاصد کا تحفظ ایک الگ چیز ہے۔ پہلے محاذ پر تائید خلاف شرع ہو سکتی ہے لیکن دوسرے محاذ پر تائید عین اسلام اور عین تدین ہے۔

۹۔ مامون بنی فاطمہؑ کو حکومت میں شریک کر کے ایک طرف اپنی حکومت کو علویین کے انقلابات اور ان کے احتجاجی اقدامات سے بچانا چاہتا تھا اور دوسری طرف بنی عباس کے خون کا تحفظ کرنا چاہتا تھا کہ ملک میں احتجاجی تحریکات تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور علویین کے انقلابات روز افزوں ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ اس طرح اگر اختلاف برقرار رہا تو بنی عباس حکومت کی حمایت کرنے پر مجبور ہوں گے اور اس کے نتیجہ میں علویین کی تلواروں کا نشانہ بن جائیں گے اس لیے کہ ہر شخص سرکاری حفاظتی انتظامات میں نہیں رکھا جا سکتا ہے اور ہر شخص کے لیے حفاظتی دستے نہیں فراہم کیے جا سکتے ہیں اور نہ وہ خود اپنے دفاع کی طاقت رکھتا ہے۔

۱۰۔ مامون بنی عباس کو بھی متوجہ کر دینا چاہتا تھا کہ اگر امین کی حمایت کے نام پر کوئی آواز اٹھائی گئی اور آپس میں اختلاف پیدا کیا گیا تو میں علویین کو اپنے ساتھ لے کر ان کا قلع قمع بھی کر سکتا ہوں اور آخر میں حکومت علویین کے حوالے بھی کر سکتا ہوں جس کے بعد بنی عباس قیامت تک اقتدار

کے خواب ہی دیکھتے رہیں گے۔

ان تمام اسباب کے پیش نظر مامون نے یہ طے کر لیا کہ امام علی رضاؑ کو حکومت میں شامل کر لیا جائے اور بیک وقت ان تمام فوائد کو حاصل کر لیا جائے اور اسی بنیاد پر اس نے امام رضاؑ کو مدینہ سے مرو طلب کیا۔ امام علیہ السلام بھی ان تمام سرکاری مصالح سے بخوبی واقف تھے اور آپ کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے کسی عمل سے بھی کسی ظالم کو ادنیٰ فائدہ پہونچ سکے کہ اس طرح اپنا شمار بھی ظالموں کے معاونوں اور مددگاروں میں ہو جائے گا جس کی جواب دہی روز قیامت انتہائی شدید ہے۔ چنانچہ آپ نے بھی "مکروا ومکر اللہ" کی پالیسی کے پیش نظر اپنا لائحہ عمل طے کر لیا اور یہ چاہا کہ جس راستہ سے ظالم وار کرنا چاہتا ہے اسی راستہ سے اس کے مکر کو اس کی گردن پر ڈال دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے سفر تو منظور کر لیا لیکن اس سفر کا پہلا فائدہ یہ قرار دیا کہ تمام راستہ میں اپنے کمالات اور اسلام کے حقیقی تعلیمات کو واضح کرتے رہے تاکہ امت پر اتمام حجت بھی ہوتا رہے اور اسلام کی تبلیغ کا کام بھی انجام پاتا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ذاتی اور انفرادی قسم کے سفر میں نہیں ہو سکتی تھی اس لیے کہ عوام الناس کسی دور میں بھی کمال کے پرستار نہیں ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اقتدار کے پرستار ہوتے ہیں اور اہل اقتدار ہی کی روش پر نظر رکھتے ہیں. نا اہل انسان بھی نظام حکومت میں شامل ہو جائے تو سڑکوں پر اس کے مشتاقانِ دید کی بھیڑ لگ جاتی ہے، گیٹ بنائے جاتے ہیں، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، نعرے لکھے جاتے ہیں اور اہل انسان محفل میں بھی داخل ہو جائے تو کوئی مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کرتا ہے۔ امام رضاؑ ان تمام حقائق اور حالات سے خوب واقف تھے اس لیے آپ نے سفر ولی عہدی کو بہترین موقع تصور کیا۔ مذہب کے حقائق کو عام کرنے اور امت کو اپنی صلاحیت اور اپنے کمالات و کرامات سے آگاہ کرنے کا۔ چنانچہ آپ نے سفر کے دوران حسب ذیل کمالات و کرامات کا مظاہرہ فرمایا جن کی مثال شائد انفرادی سفر میں نہ مل سکتی۔ لیکن اس سرکاری سفر میں ان حقائق کا اظہار ضروری تھا لہٰذا آپ نے اپنے فریضۂ شرعی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی اور نہ کسی تکلف اور انکسار سے کام لیا۔ انکسار کی جگہ ذاتی اخلاق ہے۔ مذہبی احکام و تبلیغات میں انکسار سے کام نہیں لیا جا سکتا ہے۔

● ا۔ آپ نیشاپور پہونچے تو بے شمار افراد اشتیاق زیارت میں جمع ہو گئے اور ۲۴ ہزار محدثین قلم و دوات لے کر آ گئے کہ آپ سے حدیث سُن کر نقل کریں گے۔ اوّلاً آپ سے زیارت کا مطالبہ کیا گیا اور آپ نے پردۂ محمل ہٹا دیا تو مجمع نے زیارت کی اور شور گریہ بلند ہو گیا۔ گویا قوم نے سرکار دو عالمؐ کا جمال بہار دیکھ لیا۔ زیارت کے بعد حدیث کا تقاضا کیا گیا تو آپ نے اپنے آبا و اجداد کے حوالے سے رب العالمین کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا کہ "کلمہ لا الٰہ الا اللہ میرا ایک قلعہ ہے اور جو اس قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔"

اس طرح ایک طرف تو اسلام کے بنیادی مسئلہ اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا کہ نجات کا واحد راستہ قلعہ توحید میں داخل ہو جانا ہے۔ شرک میں بہر حال نجات نہیں ہے چاہے اس کا تعلق بُتوں سے ہو یا شخصیتوں سے یا درہم و دینار سے اور اس کے بعد اس حقیقت کا بھی اعلان فرما دیا کہ یہ کلمہ بھی تنہا نجات کا ضامن نہیں ہے اس کے بھی اپنے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک میں بھی ہوں، اور اس طرح اصول اسلام کا مکمل اعلان فرما دیا کہ اول مرحلہ پر توحید ہے اور اس کے بعد شرطہا میں نبوت ہے اور اس کے بعد "شروطہا" میں امامت ہے جس کی ایک فرد میں بھی ہوں کہ اس سلسلہ پر ایمان اختیار کیے بغیر نجات کا کوئی امکان نہیں ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کسی اخروی فائدہ کا وسیلہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اعلان ایک ایسی شخصیت کی طرف سے جسے ولی عہد مملکت بنایا جا رہا ہے سرکاری اعتبار سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور امام علیہ السلام نے راستہ ہی میں واضح کر دیا کہ میری امامت کے اقرار کے بغیر کوئی اسلام مکمل نہیں ہے چاہے امت اور عوام کے دل میں ہو یا حکام اور خلفا اسلام کے دل میں۔

دوسری طرف امامؑ نے قوم پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میرے اسلامی معلومات ان راویوں کے ممنون کرم نہیں ہیں جن پر امت نے اعتماد کیا ہے اور جن کے ذریعہ قوم نے اسلامی احکام حاصل کیے ہیں، اس لیے کہ یہ تمام راوی غیر معصوم ہیں اور ان میں بہر حال خطا اور غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ میرا سلسلہ، عصمت کا سلسلہ ہے جو میرے آبا و اجداد کا سلسلہ ہے، اور اس کی انتہا سرکار دو عالمؐ پر اور پھر ان کے ذریعہ جبریل و میکائیل، لوح و قلم سے گزرتا ہوا رب العالمین تک پہونچ جاتا ہے، اور ایسے سلسلہ کے ہوتے ہوئے انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ قوم ایک غیر معصوم سلسلہ روایت پر اعتماد کرے اور معصوم سلسلہ کو نظر انداز کر دے۔

● ب۔ خراسان پہونچ کر آپ نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا۔ قوم کے پاس پانی موجود نہیں تھا تو آپ نے ایک چشمہ جاری فرما دیا جس کا سلسلہ مدتوں تک جاری رہا۔ اور یہ بھی قوم کے لیے ایک

انتباہ تھا کہ ایسی صاحب کرامت شخصیت کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص اسلامی حکومت واقتدار کا اہل نہیں ہوسکتا ہے۔

● ج۔ شہر طوس میں نزول اجلال فرمایا تو دیکھا کہ وہاں کے لوگ سنگ تراشی کا کام کررہے ہیں اور انھیں پتھر توڑنے میں بے حد زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو آپ نے رب العالمین کی بارگاہ میں التماس کی اور پتھر نرم ہوگیا جس کے بعد قوم کے کاروبار میں سہولت ہوگئی اور آپ کی کرامت نقش کالحجر بن گئی۔

● د۔ قریہ سناباد میں قبر ہارون کے قریب جاکر ایک خط کھینچ کر فرمایا کہ یہ میری قبر کی جگہ ہے اور وہاں نماز بھی ادا فرمائی اور قوم پر واضح فرمادیا کہ رب العالمین نے مجھے علم غیب سے بھی نوازا ہے اور میں مستقبل کے حالات سے بھی باخبر ہوں۔ میرے لیے کوئی شے پردۂ راز میں نہیں ہے اور میرا قیاس مامون جیسے افراد پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

● ھ۔ مرو وارد ہونے کے بعد مامون نے حکومت پیش کی، آپنے انکار فرمادیا کہ کوئی بھی علیؑ حکومت کا خواہش مند نہیں ہوتا ہے اور دنیا کے ہر اقتدار سے بے نیاز ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ولی عہدی کی پیش کش کی تو آپ نے فرمایا کہ جسے حکومت پسند نہیں ہے وہ ولی عہدی کو لے کر کیا کرے گا لیکن اس نے کہا کہ اسے تو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ تو آپ نے حالات کے خطرہ کو دیکھ کر رضامندی کا اظہار فرمادیا اور اس موقع پر دو تین حقائق کا اعلان بھی فرمادیا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں امور حکومت میں دخل نہیں دوں گا اور نصب و عزل کی ساری ذمہ داری خود مامون پر ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر مجھ سے کوئی مشورہ لیا جائے گا تو مشورہ ضرور دوں گا تاکہ حکومت مجھے کنارہ کش قرار دے کر مشوروں سے بے نیاز نہ بن جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ولی عہدی کی ایک تحریر بھی ہونی چاہیے جس کا مضمون یہ ہوگا کہ چونکہ مامون نے ان حقوق کو تسلیم کرلیا ہے جن کا اقرار اس کے آباء و اجداد نے نہیں کیا تھا لہذا میں ولیعہدی کو قبول کیے لیتا ہوں اگرچہ علم جفر و جامعہ کا تقاضا یہ ہے کہ یہ امر منزل اتمام کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس دستاویز پر آپ نے فضل بن سہل، یحییٰ بن اکثم، عبداللہ بن طاہر، ثمامہ، بشر بن معتمر اور حماد بن نعمان جیسے نمایاں افراد سے دستخط بھی کرالیے۔ (نورالابصار)

● و۔ ۷ر رمضان ۲۰۱ھ کو جلسہ ولی عہدی منعقد ہوا۔ ۳۲ ہزار افراد نے امام کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حکومت کا لباس بنی ہاشم کے احترام میں سبز کردیا گیا، سکہ پر امام علی رضاؑ کا نام کندہ کرادیا گیا، مامون نے ام حبیب کا عقد امامؑ سے کردیا اور اس طرح ولی عہدی کو ہر نہج سے مستحکم بنادیا اور کوئی سیاسی حربہ اس کے استحکام کے بارے میں نظر انداز نہیں کیا اور امامؑ بھی اس بات پر مطمئن رہے کہ اس طرح قوم پر میری عظمت کا اظہار ہو رہا ہے اور لوگ حق و باطل کو نہایت واضح طور پر پہچان سکتے ہیں۔

● ز۔ ولی عہدی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ امامؑ کی آمد و رفت دربار میں شروع ہوگئی اور آپ جب بھی آتے دربان نہایت درجہ احترام سے پیش آتے اور پردہ اٹھا کر امامؑ کو اندر لے آتے۔ لیکن ایک دن بنی عباس نے طے کیا کہ ان کا احترام نہ کیا جائے گا ورنہ لوگ تمام تر علویین کے ساتھ ہوجائیں گے چنانچہ اب جو حضرت تشریف لے آئے تو کسی نے حجاب در اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ اُدھر قدرت نے یہ انتظام کیا کہ ایک تیز ہوا چلی اور پردہ خود بخود اُٹھ گیا، آپ اندر داخل ہوگئے۔ اور باہر جاتے وقت پھر دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس سے قوم پر پھر نئے سرے سے حجت تمام ہوگئی اور سب مثل سابق خدمت پر آمادہ ہوگئے۔ (شواہد النبوۃ)

● ح۔ چند دنوں کے بعد عید کا موقع آگیا۔ مامون نے ولی عہدی کو مزید واضح کرنے کے لیے حضرت سے نماز عید پڑھانے کی خواہش کی۔ آپ تیار ہوگئے اور بیت الشرف سے بالکل اُس انداز سے برآمد ہوئے جس طرح سرکار دو عالمؐ برآمد ہوا کرتے تھے۔ نہایت سادگی کا انداز، بندگی پروردگار کا عزم نمایاں، تکبیر کی آواز زبان مبارک پر اور آپ کی آواز پر در و دیوار سے تکبیروں کی آواز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شور محشر بپا ہوگیا اور فضل بن سہل نے فوراً مامون کو اطلاع دی کہ اگر آج نماز اور خطبہ مکمل ہوگیا تو حکومت تیرے ہاتھ سے نکل جائے گی اور مامون نے فوراً کہلا بھیجا کہ فرزند رسولؐ آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے آپ واپس تشریف لے آئیں، میں نماز پڑھا دوں گا۔ امامؑ واپس چلے آئے لیکن ولی عہدی کا واقعی فائدہ حاصل ہوگیا کہ اس کے طفیل در دولت پر مسلمان جمع ہوگئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے سرکار دو عالمؐ کا انداز بندگی دیکھ لیا جس کے بعد یہ موازنہ

انتہائی آسان ہوگیا کہ اہل سیاست کا طرز بندگی کیا ہوتا ہے اور اہل دین و مذہب کا طریقۂ عبادت کیا ہوتا ہے۔

● ط۔ ولی عہدی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مامون دربار میں آنے والے مختلف مذاہب کے علماء سے مناظرہ کرانے لگا اور ہر موقع پر حضرت کو طلب کرنے لگا کہ آپ ان لوگوں کے جوابات عنایت فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے کبھی جاثلیق عالم نصاریٰ سے مناظرہ فرمایا اور کبھی راس الجالوت عالم یہود سے اور کبھی عالم مجوس سے اور سب کو شکست دے کر اسلامی تعلیمات وعقائد کا تحفظ بھی کیا اور قوم پر یہ بھی واضح کردیا کہ تخت وتاج پر قبضہ کرلینا آسان ہے لیکن بساط علم وفضل پر قدم رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ صرف علیؑ کا حصہ ہے جو روز ازل سے قدرت نے ان کے ساتھ وابستہ کردیا ہے اور ان کا کام امت کی مشکل کشائی اور اسلام کے وقار کا تحفظ ہے۔

● ی۔ دربار میں آمد ورفت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑا تو عوام نے مجبور ہوکر آپ کو دعا کے لیے طلب کیا۔ آپ نے دعا فرمائی اور بارش ہوگئی تو بنی عباس آگ بگولہ ہوگئے کہ اگر روزانہ اسی طرح ان کے فضل وشرف کا اظہار ہوتا رہا تو بنی عباس کی جگہ کہاں رہ جائے گی۔ چنانچہ حمید بن مہران نامی ایک شخص نے طے کرلیا کہ حضرت کی توہین کرے گا چنانچہ اس مرتبہ آپ دربار میں داخل ہوئے تو اس نے گستاخانہ انداز سے کہا کہ آجکل لوگ آپ کو صاحب کرامت کہہ رہے ہیں اور آپ کے بارے میں طرح طرح کے فضائل نشر کیے جا رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض افراد تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ پانی برسا دیتے ہیں، آخر ان کرامات کی انتہا کہاں ہوگی؟

آپ نے فرمایا کہ میں نے کسی سے ایسے امور کی نشر واشاعت کے بارے میں نہیں کہا ہے اور نہ میں اس طرح سے شخصیت بنانا چاہتا ہوں اور یہ بارش بھی فضل خداوندی سے ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دعا میں نے کی تھی جو بندہ کا کام ہے۔ اس کے بعد پروردگار نے اسے قبول کرلیا ہے تو یہ اس کا فضل وکرم ہے۔ میں اس کے فضل وکرم کو تو نہیں روک سکتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ کو صاحب کرامت ہونے کا خیال ہے تو اس قالین کے شیر کو حکم دیں کہ وہ مجسم ہوکر مجھے کھا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا کام نہیں ہے لیکن تیرا یہی حوصلہ ہے تو میں یہ بھی کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ کہہ کر شیر کی طرف اشارہ فرمایا۔ قالین کے دونوں شیر مجسم ہوگئے اور اس ظالم کا خاتمہ کردیا۔ مامون یہ دیکھ کر بیہوش ہوکر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو اس نے عرض کی کہ

فرزند رسولؐ! اب شیر کو واپس کردیجیے۔ آپ نے پھر حکم دیا اور شیر تصویر کی صورت میں قالین کی طرف واپس ہوگیا۔ (شرح عیون اخبار الرضا)

اس واقعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ امام علیہ السلام نے ولی عہدی کو اظہار حقائق کا بہترین وسیلہ قرار دے لیا تھا اور اس سلسلہ میں کوئی موقع فروگذاشت نہیں فرماتے تھے۔ شیر قالین کو حکم دے کر اور حمید کا خاتمہ کرا کے آپ نے مامون پر واضح کردیا تو نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں ایک موسیٰ کا فرزند ہوں اور موسیٰ کے سامنے کسی فرعون کا کوئی حربہ چلنے والا نہیں ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم ہے کہ جب فرعون نے سارے شہر کے جادوگر اکٹھا کرلیے تھے اور ان کے ذریعہ جناب موسیٰ کا مقابلہ کرنا چاہا تھا، تو موسیٰؑ نے ایک عصا سے سارے سانپوں کا خاتمہ کردیا تھا اور فرعون کے اقتدار کی حقیقت کو بے نقاب کردیا تھا۔ اب میں ایک موسیٰ کا وارث ہوں۔ میرا باپ بھی موسیٰ بن جعفرؑ ہے اور میرے جد بزرگوار رسول اکرمؐ نے بھی اپنے کو ایک موسیٰ قرار دیا ہے، لہٰذا میرے سامنے کسی فرعون کا اقتدار یا کسی سامری کا جادو نہیں چل سکتا ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے اس ولی عہدی کو قبول نہ فرمایا ہوتا تو ان فوائد کا حاصل کرنا ناممکن تھا اور اگر ان میں سے کوئی واقعہ پیش آبھی جاتا تو خود حکومت اور اس کے کارندے اس کی پردہ پوشی کرتے اور کسی کو نہ ان کمالات وکرامات کا اندازہ ہوسکتا اور نہ ان بیانات اور تعلیمات کی اطلاع ہوسکتی۔ ولی عہدی کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا کہ جس سے پردہ پوشی کا خطرہ تھا اسی نے نشر واشاعت کا کام شروع کردیا کہ اب یہ امام علی رضاؑ کے کرامات کا اعلان نہیں ہے ایک ولی عہد مملکت کے کرامات اور خلیفۃ المسلمین کے حسن انتخاب کا اعلان ہے اور اس کی اشاعت بہرحال حکومت کی ذمہ داری ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو کام امام حسنؑ نے معاویہ بن ابی سفیان کو حکومت دے کر لیا تھا کہ چور کو پہرہ دار بنا دیا تھا۔ وہی کام امام علی رضاؑ نے ولی عہدی کو لے کر انجام دیا ہے کہ مخالف طاقت ہی کو فضائل وکمالات اور احکام وتعلیمات کے نشر واشاعت کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ اور یہ امامت کی مخصوص سیاست الٰہیہ ہے جس کا مطالعہ کرنا، اس پر غور وفکر کرنا اور اس کے اسرار ورموز کا پتہ لگانا ہر صاحب بصیرت کی ذمہ داری ہے تاکہ صحیح اسلامی اقدامات وتحریکات کا اندازہ کیا جاسکے۔

نقشِ
حیات امام محمد تقیِ جوادؑ

ولادت: ۱۰ رجب ۱۹۵ھ

شہادت: ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ

نقشِ زندگانی امام محمد تقی علیہ السلام

ماہ رجب ۱۹۵ھ کی دسویں تاریخ تھی جب امام رضاؑ کو پروردگار نے وہ فرزند عطا فرمایا جسے ان کے جملہ کمالات کا وارث اور ان کے منصب کا جانشین قرار دیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک کے تقریباً ۴۰ سال گذر چکے تھے اور لوگ کبھی آپ کی امامت میں شک کرتے تھے کہ آپ کا کوئی فرزند نہیں ہے اور کبھی آپ کو طعنے دیتے تھے کہ رب العالمین نے آپ کو لاولد قرار دیا ہے یہاں تک کہ ایک شخص نے آپ کو خط لکھ دیا کہ آپ لاولد ہیں لہذا آپ کی امامت مشکوک ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ عنقریب مجھے پروردگار ایسا فرزند عنایت کرے گا جو میرا وارث ہوگا اور حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرنے والا ہوگا۔ (اصول کافی)

واضح رہے کہ امام علی رضا علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ ایک مامون رشید کی بیٹی تھی جس کا عقد باپ نے سیاسی مصالح کے تحت آپ سے کر دیا تھا اور ایک جناب سبیکہ تھیں جنھیں امام رضاؑ خیزران اور ریحانہ کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے اور جو جناب ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تھیں اور ان کی کنیت ام الحسن تھی۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام تھا کہ اس نے آپ کے وارث کو ایک عجم خاتون کے بطن سے پیدا کیا اور "سرکاری بیٹی" کو اس شرف سے محروم رکھا کہ اس طرح منصب الٰہی کی غلط تقسیم کا تصور نہ پیدا ہونے پائے اور یہ طریقۂ قدرت کا اس پہلے بھی رہا ہے کہ اس نے سیاسی اور مصلحتی شادیوں کو روا رکھا ہے لیکن ان رشتوں کو بار آور نہیں ہونے دیا کہ کسی طرح کی غلط فہمی کو رواج نہ دیا جا سکے۔

● آپ کی عمر مبارک ۳ یا ۴ سال کی تھی کہ امام رضاؑ نے بعض افراد کے جواب میں اس امر کی تصریح فرمادی تھی کہ یہ میرا فرزند میرے منصب کا وارث ہے اور یہی امام وقت ہے اور اس کی امامت پر تعجب کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خداوند عالم نے بچپنے ہی میں جناب یحییٰ کو نبی قرار دیا ہے۔

اور یہ اس کی اپنی مصلحت ہے کہ کسی کے منصب کا اعلان گہوارہ میں کرادیتا ہے اور کسی کا اعلان ۴۰ سال تک روک لیا جاتا ہے۔ (اصول کافی)

خراسان آنے کے بعد بھی خیرانی کے والد کا بیان ہے کہ میں نے حضرت سے پوچھا کہ آپ کا وارث کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ابوجعفر۔ میں نے عرض کی کہ وہ تو ابھی کمسن ہیں؟ فرمایا کہ مالک کائنات نے اس سے زیادہ کم عمر میں جناب عیسیٰ کو نبی و صاحب کتاب اور صاحب شریعت بنادیا تھا، لہذا یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے۔ (اصول کافی)

● آپ کی کنیت ابوجعفر الثانی تھی اس لیے کہ امام محمد باقرؑ کو بھی ابوجعفر کہا جاتا تھا، اور آپ کے مشہور القاب میں قانع، مرتضیٰ، نجیب، تقی اور جواد وغیرہ ہیں جن میں آخرالذکر کی شہرت خود کاظمین وغیرہ کے علاقہ میں زیادہ ہے اگرچہ لفظ تقی سے آپ کو ہمارے علاقوں میں بآسانی پہچان لیا جاتا ہے۔

● بادشاہانِ وقت میں وقت ولادت ہارون رشید کے فرزند امین کی حکومت چل رہی تھی۔ ۱۹۸ھ میں اسے اس کے بھائی مامون نے قتل کرادیا تو وہ تخت نشین ہوگیا اور ۲۱۸ھ تک اس کا دور حکومت رہا۔ اس کے انتقال کے بعد معتصم عباسی خلیفہ ہوگیا اور اسی نے ۲۲۰ھ میں ۲۵ سال کی عمر میں آپ کو زہر دے کر شہید کرادیا۔

● امام رضاؑ کی شہادت ۲۰۳ھ میں ہوئی ہے لیکن آپ کو مدینہ سے دوسری صدی کے خاتمہ سے پہلے ہی طلب کرلیا گیا تھا، اور اس طرح آپ اپنے والد محترم کے سایہ عاطفت سے نہایت ہی کمسنی میں محروم ہوگئے اور پھر بظاہر دونوں میں ملاقات بھی نہیں ہوسکی یہاں تک کہ آپ خراسان باعجاز تجہیز و تکفین کے لیے تشریف لے آئے اور اس وقت بھی آپ کی عمر ۷-۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔

● امام جوادؑ کی عمر تمام ائمہ طاہرینؑ میں سب سے کم رہی اور آپ نے دار دنیا میں صرف ۲۵ سال گذارے ہیں لیکن کمالات و فضائل اور نشر علوم و احکام میں کسی طرح کی کمی یا کوتاہی نہیں ہوئی اور ایک ایک جلسہ میں ۳۰ ہزار سوالات کے جوابات عنایت فرمادیے ہیں جس جلسہ کا سلسلہ تین روز تک مسلسل قائم رہا تھا۔

امام علی رضاؑ کو زہر دینے کے بعد اور سر دربار امامؑ کے اس اعلان کے بعد کہ جہاں تو نے بھیجا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ مامون کے سارے تانے بانے ایک مرتبہ پھر بکھر گئے تھے کہ اب تک تو صرف عباسیوں کو شکایت تھی کہ ہمارے ہوتے ہوئے علویین میں ولی عہدی کیونکر چلی گئی اور اب علویین کو بھی شکایت پیدا ہوگئی کہ زہر ہی دینا تھا تو ولی عہدی کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر سرکاری داماد بنانے کا کیا کام تھا چنانچہ اس طرح مامون ایک عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہوگیا اور اسے تمام تر فکر اپنے مظالم کی پردہ پوشی کی ہوگئی۔ چنانچہ پہلا پروگرام یہ بنایا کہ امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے دارالخلافہ بغداد طلب کرلیا جائے اور ان کی عظمت اور ان کے تقرب کا اعلان کردیا جائے تاکہ علویین میں یہ احساس پیدا ہوجائے کہ اگر اس نے باپ کو زہر دیا ہوتا تو بیٹے کے ساتھ اس طرح کا احترام کا برتاؤ نہ کرتا۔ چنانچہ آپ کو طلب کرلیا گیا اور آپ مدینہ سے بغداد پہونچ گئے۔ خدا برا کرے سیاست دنیا کا کہ یہ انسان کو طرح طرح کے حربے سکھاتی رہتی ہے اور عام طور سے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کا زور دکھلانے کے لیے بڑی شخصیتوں کو دیر تک دربار میں اذن باریابی نہیں دیتے ہیں کہ اس طرح دربار کی عظمت کا اظہار ہوجائے گا اور ہر شخص کو معلوم ہوجائے گا کہ بادشاہ سلامت کے اذن کے بغیر کوئی دربار میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ امام محمد تقیؑ کو بھی کسی مقام پر ٹھہرا دیا گیا۔

اتفاق وقت کہ ایک دن بادشاہ کی سواری برآمد ہوئی اور آپ ایک راستہ میں کھڑے ہوئے بچوں کا کھیل دیکھ رہے تھے کہ کس طرح سماج کے بچے بے تربیت ہونے کی بنا پر اپنا وقت کھیل کود میں ضائع کر رہے ہیں اور کس طرح سلاطین زمانہ امت کی تربیت و تعلیم کی طرف سے غافل ہوگئے ہیں۔ کہ اچانک بادشاہ کی سواری آگئی اور بچے بھاگ گئے کہ حکومت نے انھیں صرف شاہی آداب اور سلطنتی احترام کی تربیت دی تھی، کھیل کود کے بارے میں انھیں کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی۔

امام جوادؑ کا طرز عمل بچوں سے بالکل مختلف رہا۔ جب وہ سب کھیل رہے تھے تو آپ دیکھ رہے تھے اور جب وہ سب بھاگ گئے تو آپ اپنی جگہ پر کھڑے رہے یہاں تک کہ سواری قریب آگئی اور بادشاہ نے اس جرأت پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ تم نے راستہ کیوں نہیں چھوڑا؟

آپ نے فرمایا کہ نہ راستہ تنگ تھا اور نہ میں گنہ گار تھا بھاگنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ صرف ایک ہی امکان تھا کہ تو ایسا ظالم ہو کہ بلا سبب بھی سزا دیتا ہو اور یہ میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ اس نے مزید حیرت کا اظہار کیا اور آگے بڑھ گیا۔ واپسی میں ایک مچھلی شکار کر کے لایا اور اسے مٹھی میں دبا کر آپ کا امتحان لیا کہ یہ کیا ہے؟ آپ نے نہایت تفصیل کے ساتھ مچھلی کی اصل تک بیان فرما دی کہ رب العالمین نے آسمان و زمین کے درمیان دریا پیدا کیے ہیں اور ان دریاؤں میں مچھلیاں پیدا کی ہیں اور سلاطین وقت کو شکار کا ذوق دیا ہے اور وہ اپنے بازوں کے ذریعہ ان مچھلیوں کا شکار کر کے خاندان نبوت کا امتحان لیا کرتے ہیں۔

مامون یہ سُن کر حیرت زدہ رہ گیا اور پوچھا کہ ذرا اپنا تعارف تو کرائیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں محمد بن علی بن موسیٰ الرضاؑ ہوں۔ اس نے فوراً گلے سے لگا لیا اور اس طرح اپنے فضل و کمال کے سہارے دربار تک رسائی ہو گئی۔

مامون نے پہلے بھی آپ کے کمالات کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور اب تو معلومات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے دربار میں آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنی بیٹی ام الفضل کا عقد اس فرزند سے کرنے والا ہوں۔ عباسیوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ کل علی رضاؑ کو داماد بنایا تھا اور اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور آج پھر دوبارہ یہ غلطی کی جا رہی ہے۔ لوگوں نے دبے الفاظ میں اعتراض بھی کیا۔ کہ ایسا ہی ارادہ ہے تو پہلے بچہ کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیجیے اس کے بعد عقد کریں ورنہ بڑی بدنامی ہو گی کہ خلیفۃ المسلمین نے اپنی اچھی خاصی لڑکی کو ایک کمسن اور اَن پڑھ بچہ کے حوالے کر دیا ہے اور یہ بات حکومت کے حق میں انتہائی معیوب اور مضر ثابت ہو گی۔

مامون نے کہا کہ میں اپنا ارادہ تبدیل نہیں کر سکتا ہوں اور یہ بچہ اَن پڑھ نہیں ہے۔ اس کا نام محمد ہے اور یہ تمھارے علماء سے زیادہ علم رکھتا ہے، تمھیں یقین نہ ہو تو ابھی امتحان کر کے دیکھ لو تمھیں خود ہی اپنے علم و فضل کا اندازہ ہو جائے گا۔

لوگوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر یحییٰ بن اکثم کو تلاش کیا جو اس دور کا قاضی القضاۃ اور سب سے بڑا عالم تھا کہ یہ امام محمد تقیؑ سے بحث کر کے ان کی علمی حقیقت کو آشکار کرے۔ یحییٰ نے وارد

ہوتے ہی سوال کی اجازت طلب کی اور اسلامی فقہ کا سب سے مشکل مسئلہ کفارات کا چھیڑ دیا کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کر لے تو اس کا کفارہ کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا کہ آپ کا سوال ناقص ہے، پہلے سوال کو مکمل کریں اس کے بعد جواب دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ سوال میں کیا نقص ہے؟ فرمایا کہ اس مسئلہ کی ۲۲ صورتیں ہیں:

۱۔ شکار حل میں تھا یعنی حدود حرم سے باہر یا حرم میں؟

۲۔ شکار کرنے والا مسئلے سے باخبر تھا یا جاہل؟

۳۔ عمداً شکار کیا ہے یا دھوکہ سے شکار ہو گیا ہے؟

۴۔ شکار کرنے والا آزاد تھا یا غلام؟

۵۔ بالغ تھا یا نابالغ؟

۶۔ پہلی مرتبہ شکار کیا تھا یا بار بار شکار کر چکا تھا؟

۷۔ شکار پرندہ تھا یا کوئی اور جانور؟

۸۔ چھوٹا تھا یا بڑا؟

۹۔ شکاری اپنے عمل پر نادم تھا یا مُصر؟

۱۰۔ شکار رات کے وقت کیا گیا ہے یا دن میں؟

۱۱۔ احرام حج کا تھا یا عمرہ کا۔؟

آپ نے ان میں سے کس صورت کے بارے میں سوال کیا ہے؟

یحییٰ مبہوت ہو کر رہ گیا اور مامون نے حضرت سے خطبۂ عقد پڑھنے کی خواہش کر دی۔ آپ نے خطبہ پڑھا اور ام الفضل سے آپ کا عقد ہو گیا۔ حکومت کی طرف سے تمام حاضرین کو انعامات تقسیم کیے گئے اور جلسہ تقریباً برخاست ہو گیا کہ ایک مرتبہ مامون نے کہا کہ فرزند رسولؐ! اب آپ مہربانی کر کے ان سوالات کے جوابات بھی عنایت فرما دیں تاکہ درباری افراد مستفید ہو سکیں۔

آپ نے فرمایا:

۱۔ اگر حالت احرام میں حدود حرم سے باہر شکار کیا ہے اور شکار پرندہ ہے اور بڑا بھی ہے تو کفارہ ایک بکری ہے۔

ب۔ اگر یہی شکار حدود حرم کے اندر ہوا ہے تو دو بکریاں۔

ج۔ اگر پرندہ چھوٹا تھا تو دنبہ کا بچہ جو ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہو۔

د۔ اور اگر یہ شکار حرم میں ہوا ہے تو اس پرندہ کی قیمت اور ایک دنبہ۔

ھ۔ اگر شکار چوپایہ ہے تو اگر وحشی گدھا ہے تو کفارہ ایک گائے اور شتر مرغ ہے تو کفارہ ایک اونٹ اور ہرن ہے تو ایک بکری۔

و۔ اور یہی شکار حدود حرم میں ہوا ہے تو کفارہ دوگنا۔

ز۔ احرام عمرہ کا ہے تو کفارات کو خانہ کعبہ تک پہونچانا ہوگا اور قربانی مکہ میں ہوگی، اور اگر احرام حج کا ہے تو قربانی منیٰ میں ہوگی۔

ح۔ کفارات کے بارے میں واقف اور ناواقف میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کو کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

ط۔ قصداً شکار کرنے میں کفارہ کے علاوہ گناہ بھی ہوگا، دھوکے کے شکار میں گناہ نہیں ہے۔

ی۔ آزاد کا کفارہ خود اس کے ذمہ ہوگا اور غلام کا کفارہ مالک کو ادا کرنا ہوگا کہ غلام خود بھی مالک کی ایک ملکیت ہی شمار ہوتا ہے، وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے۔

ک۔ بالغ پر کفارہ واجب ہے نابالغ پر کسی طرح کا کفارہ نہیں ہے۔

ل۔ پشیمان انسان آخرت کے عذاب سے بچ جائے گا اور اصرار کرنے والے کو اس عذاب کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد مامون نے یحییٰ سے کہا کہ آپ کے سوالات کے جوابات تو ہو گئے اب ابوجعفر آپ سے سوال کریں گے اور آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ یحییٰ جو اپنے ہی سوال کی تفصیل سے عاجز تھا وہ امام کے سوال کا جواب کیا دے گا لیکن "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے طور پر تیار ہو گیا اور حضرت نے یہ سوال کر دیا کہ بتائیے وہ عورت کون سی ہے جو صبح کے وقت ایک مرد پر حرام تھی، دن چڑھے حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت پھر حرام ہو گئی عصر کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت پھر حرام ہو گئی عشا کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ آدھی رات کو پھر حرام ہو گئی۔ اور صبح کے وقت

پھر حلال ہو گئی۔

یحییٰ اس سوال کو سن کر بدحواس ہو گیا اور اپنی عاجزی کے اقرار پر مجبور ہو گیا اور آخرکار حضرت ہی سے جواب کا مطالبہ کر دیا۔

آپ نے فرمایا کہ یہ کسی شخص کی کنیز تھی جو غیر مالک کے لیے حرام تھی۔ پھر اس نے خرید لیا تو حلال ہو گئی۔ پھر آزاد کر دیا تو دوبارہ حرام ہو گئی، پھر عقد کر لیا تو دوبارہ حلال ہو گئی، پھر صیغہ ظہار پڑھ کر اسے اپنی ماں جیسا کہہ دیا تو پھر حرام ہو گئی۔ پھر کفارہ دے دیا تو پھر حلال ہو گئی۔ اس کے بعد طلاق دے دی تو پھر حرام ہو گئی اور پھر رجوع کر لیا تو پھر حلال ہو گئی۔ اس طرح ایک ہی عورت ایک ہی مرد کے لیے چار مرتبہ حلال ہوئی اور چار مرتبہ حرام۔ اور یہ کوئی معمہ نہیں ہے یہ شریعت اسلام کا کھلا ہوا مسئلہ ہے جس کے ادراک کے لیے شریعت پر مکمل عبور درکار ہے جو شرف رب العالمین نے صرف خانوادۂ رسالت کو عنایت فرمایا ہے۔ (صواعق محرقہ، نور الابصار، شرح ارشاد وغیرہ)

عقد کے بعد حکومت کی طرف سے حاضرین کی حلوہ اور عطریات سے تواضع کی گئی اور محفل عقد برخاست ہو گئی۔ مامون کا دعویٰ صحیح ثابت ہوا اور عباسیوں کو ذلت آمیز شکست نصیب ہوئی کہ آل محمدؐ کسی تعلیم اور تربیت کے محتاج نہیں ہیں، یہ اپنے علوم و کمالات اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اور کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے ہیں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ام الفضل کو امام محمد تقیؑ کے گھر میں وہ سکون و آرام اور وہ سامان عیش و نشاط نہیں فراہم ہو سکتا تھا جس کی مامون کے گھر میں فراوانی تھی اور جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ یہ بات ام الفضل پر بھی واضح تھی اور مامون کو بھی یہ معلوم تھا کہ جس بچہ کے باپ کو زہر دے کر شہید کرا چکا ہے اور جو کسی بنیاد پر کچھ کاروبار کرنے کے قابل بھی نہیں ہے، وہ مادی نقطۂ نظر سے یقیناً اپنی زوجہ کو وہ آرام نہیں پہونچا سکتا ہے جس کا ماحول اس کو اپنے والدین کے گھر میں حاصل تھا اور اس بنیاد پر مامون کو ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا اور ام الفضل کو بھی بروقت انکار کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عقد برائے عقد ہو تو ان امور کا لحاظ کیا جاتا ہے اور جب عقد برائے سیاست ہو تو اس میں سن و سال یا مال و منال کی رعایت نہیں کی جاتی ہے۔ ایسے عقد میں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس مصلحت کے تحت رشتہ کیا جا رہا ہے

اس مصلحت کا حصول ممکن ہے یا نہیں۔ باقی معاملات پر نظر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مامون کی نظر میں سیاسی فائدہ یقینی الحصول تھا اور اسی بنیاد پر اس نے ام الفضل کو بھی راضی کر لیا تھا اور شاید یہ بھی سمجھا دیا ہو کہ تمھیں شوہر کے گھر نہیں رہنا ہے لہذا اس کے حالات سے کیا تعلق ہے۔ تمھارا باپ خلیفۃ المسلمین ہے اور تمھارے راحت و آرام کے لیے یہ خلافت ہی کافی ہے شوہر کے وسائلِ آمدنی پر نظر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حالات بالکل برعکس ثابت ہوئے کہ چند روز کے بعد امام محمد تقیؑ مدینہ جانے اور ام الفضل کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس مقام پر یہ کہنا مشکل ہے کہ مامون نے کن حالات کی بنا پر آپ کو جانے کی رضا مندی دے دی اور اس نے اپنی بیٹی کی دل جوئی کے لیے جبراً آپ کو کیوں نہیں روکا جب کہ یہ بات اس کے اختیار میں تھی۔ شائد اس کی ایک مصلحت یہ بھی رہی کہ چند دنوں کے اندر امام محمد تقیؑ کے جس قدر کمالات سامنے آچکے تھے وہ کسی وقت بھی مامون کے لیے خطرہ بن سکتے تھے اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ کر امام محمد تقی کی طرف ہو سکتی تھی لہذا اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان کو مدینہ کے لیے رخصت کر دیا جائے لیکن یہ بات ام الفضل کے مصالح اور اس کے مزاج کے بالکل برخلاف تھی لیکن "مرتا کیا نہ کرتا" بالآخر شوہر کی اطاعت ضروری تھی اور ابھی بغاوت کے اعلان کا مناسب وقت نہیں آیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی امام علیہ السلام کے ساتھ مدینہ جانے پر رضا مند ہو گئی اور حضرت، ام الفضل کو لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ پہونچ کر غربت، پریشانی، سادگی اور تقدس کا ماحول اور پھر عیش و عشرت کے ماحول سے دوری جیسے سب مصائب تو ام الفضل کی جان کے لیے تھے ہی کہ اُدھر امام محمد تقیؑ نے نسل امامت کے قیام کی خاطر جناب سمانہ خاتون سے عقد کر لیا جو جناب عمار یاسر کے خاندان سے تھیں اور اس رشتہ سے ان کا سماجی احترام بھی مامون کی بیٹی سے کم نہ تھا۔ عقد ثانی کی خبر ام الفضل کے دل پر بجلی بن کر گری جو عام طور سے تمام عورتوں کا حال ہوتا ہے چہ جائیکہ خلیفۃ المسلمین کی بیٹی۔ اس کی موجودگی میں دوسری عورت کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کا وجود شوہر کے لیے اطمینان بخش یا وجہِ سکونِ حیات نہیں ہے اور یہ اس کی نظر میں اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ چنانچہ اس نے فی الفور اپنے باپ کو اس حادثہ کی اطلاع دی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دو میں سے ایک رشتہ کو فی الفور ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن مامون ایسی کش مکش میں گرفتار تھا کہ اس کے امکان میں فی الفور کچھ نہ تھا، اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال

کیا ہے میں اسے کس طرح حرام کر سکتا ہوں۔ اور شائد مامون کو ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اگر اس مسئلہ میں امام محمد تقیؑ سے باز پرس کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ ان کی طرف سے خود میرے حرم کے بارے میں آواز اُٹھ جائے اور میں اس بھیڑ بھاڑ کی کوئی صفائی نہ دے سکوں جو ہر وقت میرے حرم میں لگی رہتی ہے۔ لہذا اس نے اس مسئلہ سے اعراض اور کنارہ کشی ہی کو مسئلہ کا بہترین حل قرار دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مامون کی سیاست زوجیت کے مزاج سے بالکل مختلف شے تھی اور دنیا کا ہر مسئلہ سیاسی مصالح سے طے نہیں ہو سکتا ہے اس لیے ام الفضل اپنے مقام پر پریشان رہی اور وہ کسی طرح گلو خلاصی کے بارے میں سوچتی رہی۔

۲۰۳ھ سے ۲۱۸ھ تک یہی صورت حال برقرار رہی اور ام الفضل باپ کو شکایت نامے لکھتی رہی لیکن مامون اس کا کوئی نوٹس نہ لے سکا۔ البتہ اس کے گھر والے دل ہی دل میں مچلتے رہے اور ان کی خواہش تھی کہ مامون کوئی ایکشن لے اور اپنی بیٹی کے مسئلہ کو بہانہ بنا کر امام محمد تقیؑ سے گلو خلاصی حاصل کر لے۔ لیکن مامون کے حالات کسی طرح قابو میں نہ آسکے اور وہ کوئی نیا سیاسی قدم نہ اٹھا سکا۔ یہاں تک کہ ۲۱۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور خلافت اس کے بھائی معتصم کے ہاتھ میں آگئی۔ ام الفضل کو اپنے چچا کا مزاج معلوم تھا اور اسے یہ توقع تھی کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم ضرور اٹھائے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً شکایت نامہ روانہ کر دیا۔ اور پھر شکایتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ ایک سال کے بعد ہی معتصم نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا اور آپ اس عالم میں اپنے وطن سے جدا کیے گئے کہ نہ اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لا سکے اور نہ اپنے فرزند امام علی نقیؑ کو۔!

بغداد آنے کے بعد آپ کو قید کر دیا گیا اور یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک قائم رہا یہاں تک کہ ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ کو آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا جس کا اقرار اکثر مورخین و محدثین اسلام نے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن حجر مکی (صواعق)، ملا حسین واعظ کاشفی (روضۃ الشہداء) ۔ ملا جامی (شواہد النبوۃ)، شبلنجی (نور الابصار)۔

امام محمد تقیؑ کی نظر میں ام الفضل کی یہ خیانت اس قدر شدید جرم کی حیثیت رکھتی تھی کہ آپ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی اور وہ ایک ایسے ناسور میں مبتلا ہو گئی کہ زندگی بھر لذتِ حیات

سے محروم رہی اور دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ کی حقدار ہو گئی۔

آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً ۷۔۸ سال امام رضاؑ کی زندگی میں گذارے اگرچہ باپ سے ان کی شہادت کے تین سال قبل ہی جُدا ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے آپ کے اپنے دور قیادت کا آغاز ہوا تو آپ نے مامون ہی کو برسر اقتدار دیکھا۔ اگرچہ اس سے پہلے باپ کے زیر سایہ رہ کر ان تمام حالات کو دیکھ چکے تھے جو عالم اسلام میں پیش آرہے تھے اور جہاں ۱۹۷ھ میں مامون نے امین کی حکومت کا تختہ الٹنے کا پروگرام بنا لیا تھا اور سارے بغداد کا محاصرہ کر لیا تھا اور ایسی خوں ریز جنگ ہوئی تھی کہ بالآخر امین مارا گیا اور ۱۹۸ھ میں مامون باقاعدہ طور پر پورے عالم اسلام کا خلیفہ ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف صرف تین سال کی تھی لیکن اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر آپ نے باقاعدہ طور پر مامون کی ذہنیت اور اس کے مزاج کا جائزہ لے لیا کہ وہ اقتدار کی خاطر اپنے حقیقی بھائی کا خون بھی بہا سکتا ہے اور اس کی اس حکومت پر قبضہ کر سکتا ہے جو اس کے باپ نے خود اسے عنایت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے سفاک انسان سے بنی ہاشم اور علویین کے بارے میں کس نیک برتاؤ کی توقع کی جاسکتی ہے اور اس کے بارے میں کس شرافت کا تصور کیا جاسکتا ہے ــ اور اسی بنا پر امام محمد تقیؑ کو نہ اس دامادی سے کوئی مسرت ہوئی اور نہ اس درباری تقرب سے۔ خصوصیت کے ساتھ جب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ دامادی کے ساتھ ولی عہدی کا مرتبہ دینے کے بعد بھی مامون نے پدر بزرگوار کو زہر دے کر شہید کرا دیا ہے۔ اس کے باوجود آپ اپنے فرائض منصبی کی طرف باقاعدہ طور پر متوجہ رہے اور مصائب کے خوف سے ترویج شریعت کا کام نظرانداز نہیں کیا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی شہادت کی خبر پانے کے بعد ہی آپ مسجد پیغمبرؐ میں منبر پر تشریف لے گئے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایہا الناس! میں محمد بن علیؑ رضا ہوں، میں جواد ہوں، اور صلب پدر میں لوگوں کے نسب کا جاننے والا ہوں اور تمھارے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوں، میں تمام مخلوقات کے حالات کو خلقت کے قبل سے آسمان و زمین کے فنا ہونے کے بعد تک بخوبی جانتا ہوں۔ لیکن افسوس کہ اپنے بزرگوں کی طرح ان حالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔" (بحار الانوار)

امام علیہ السلام نے اس خطبہ میں جن نکات کی طرف توجہ دلائی ہے، ان پر انتہائی

دقت نظر کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے کمالات میں اپنے جود و کرم کا حوالہ دیا ہے اور پھر لوگوں کے نسب سے واقفیت کا ذکر کیا ہے۔ خدا جانے کہ اس علم الانساب سے کس نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے تھے اور اپنے جود و کرم کا تذکرہ کیوں ضروری خیال فرمایا تھا۔ کاش خطبہ کا پورا پس منظر نگاہوں کے سامنے ہوتا تو ان فقرات کی بلاغت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا تھا اور ان کی روشنی میں ظالموں کے قدیم و جدید حالات کا پتہ لگایا جاسکتا تھا۔

امام محمد تقیؑ کو بغداد طلب کیا گیا تو آپ نے اپنی روانگی سے پہلے امام علی نقیؑ کی جانشینی کا اعلان کر دیا جیسا کہ اسماعیل بن مہران کی روایت میں ہے کہ جب حضرت پہلی مرتبہ بغداد جا رہے تھے تو میں نے پوچھا کہ خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو امت کا وارث کون ہوگا؟ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ مطمئن رہو میں واپس آؤں گا۔ لیکن جب دوسری مرتبہ معتصم کے بلانے پر تشریف لے گئے، تو فرمایا کہ اب اس خطرہ کا وقت آگیا ہے اور یہ کہہ کر گریہ فرمایا، اور فرمایا کہ میرا وارث میرے بعد میرا فرزند علیؑ ہوگا۔ (اصول کافی)

واضح رہے کہ اسماعیل بن مہران ایک مرد معتبر ہیں جو ابان بن جناح، ابو جمیلہ، مفضل بن صالح، احمد بن محمد، علی بن ابی حمزہ، محمد بن سلیمان اور محمد بن منصور الخزاعی وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے روایت کرنے والے افراد میں ابو زکریا، ابو الحسین الرازی، الحسن بن خرداد اور الحسن بن موسیٰ وغیرہ جیسے افراد ہیں۔

شہادت

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ امام کی شہادت زہر دغا سے ہوئی ہے اور یہ بات بھی مسلمات میں ہے کہ آپ کو زہر معتصم نے دلوایا ہے۔ اب اس امر میں بعض حضرات نے تشکیک کر دی ہے کہ ذریعہ خود ام الفضل کو قرار دیا گیا تھا یا کسی دوسرے وزیر کو جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ اس نے دعوت میں بلا کر زہر دے دیا تھا۔ بہرحال امام مظلومیت کی زندگی گذار کر اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں پہونچ گئے لیکن زہر دینے کا فوری محرک یہ واقعہ ہوا کہ ایک چور کی سزا کے بارے میں قاضی شہر نے کلائی سے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا کہ یہی حصہ وضو میں دھویا جاتا ہے لیکن

جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ ہتھیلی اعضاء سجدہ میں ہے اور اعضائے سجدہ اللہ کے لیے ہیں انھیں قطع نہیں کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا صرف انگلیاں کاٹ دی جائیں۔ جس فیصلہ کو بروقت تو معتصم نے پسند کرلیا لیکن بعد میں گھر جاکر قاضی نے فریاد کی کہ اس طرح سرکاری ملّا کا وقار ختم ہو جائے گا اور ان کی امامت کا عقیدہ مضبوط ہو جائے گا جو حضور کی حکومت کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے جس شکایت کو سن کر معتصم کو غصہ آگیا اور تین روز کے بعد ہی آپ کو زہر سے شہید کرادیا۔

(جلاء العیون)

آپ کی تاریخ شہادت آخر ذی قعدہ ۲۲۰ھ ہے اور مقام دفن وہ جگہ ہے جسے کاظمین کہا جاتا ہے اور جہاں آپ کے جد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ کی بھی قبر ہے۔ تجہیز و تکفین کے امور امام علی نقیؑ نے باعجاز آکر انجام دیے جو ہر امام کے غسل و کفن کا طریقہ رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر نماز جنازہ واثق بن معتصم نے بھی ادا کی تھی۔

ازواج واولاد

گذشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امامؑ کی ازواج دو تھیں۔ جناب سانہ مغربیہ جو امام علی نقیؑ کی والدہ گرامی تھیں اور ام الفضل جو مامون رشید کی بیٹی تھی اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے۔

اولاد کی تعداد چار بتائی جاتی ہے دو پسر اور دو دختر۔ فرزندوں میں امام علی نقیؑ اور جناب موسیٰ مبرقع، اور دختران میں جناب فاطمہ اور امامہ۔

موسیٰ مبرقع ہی وہ بزرگ ہیں جن سے رضوی سادات کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام حضرات قانونی اعتبار سے تقوی یا جوادی ہیں اس لیے کہ قانون نسب یہ قرار دیا گیا ہے کہ جہاں سے امام کی نسل غیر امام کی طرف منتقل ہوتی ہے وہیں سے نسبت طے کر دی جاتی ہے اور امام رضاؑ کی اولاد کا تعلق غیر امام سے نہیں ہے بلکہ آپ کے تنہا فرزند امام محمد تقیؑ ہیں اور سلسلۂ نسب ان کے بعد غیر امام یعنی موسیٰ مبرقع کی طرف منتقل ہوتا ہے، لہٰذا ان سادات کرام کو اصطلاحی طور پر تقوی سادات ہونا چاہیے لیکن امام رضاؑ کی دنیاوی وجاہت یا ان کے الگ سلسلۂ نسب کے نہ ہونے کی بنا پر سلسلہ انھیں

کی طرف منسوب کر دیا گیا اور سب رضوی سادات کہے جانے لگے جن کی تعداد غالباً ان تمام سادات سے زیادہ ہے جن کا سلسلہ کسی بھی دوسرے امام سے مختلف اولاد کے ذریعہ ملتا ہے۔

جناب موسیٰ مبرقع کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اس قدر حسین یا مقدس تھے کہ چہرہ پر نقاب ڈال کر گھر سے نکلا کرتے تھے اور اسی بنیاد پر آپ کو مبرقع کہا جاتا تھا۔ آپ کا سلسلہ آپ کے فرزند جناب سید احمد سے بڑھا ہے اور سید احمد کی نسل محمد اعرج سے آگے بڑھی ہے جیسا کہ اکثر علماء انساب نے تحریر کیا ہے۔

جناب موسیٰ مبرقع ہی نے اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ڈاڑھی کا مونڈنا مُثلہ کرنا ہے اور مُثلہ کرنے والے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ (مستدرک الوسائل)

لہٰذا کم از کم رضوی اور تقوی سادات کے لیے تو ڈاڑھی کا منڈانا قطعاً مناسب نہیں ہے کہ یہ شرعی جُرم ہونے کے علاوہ ناخلف اولاد ہونے کی بھی علامت ہے۔ خدا جملہ اولاد معصومینؑ کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق کرامت فرمائے۔

واضح رہے کہ امام محمد تقیؑ کی ایک صاجزادی حکیمہ نام کی بھی تھیں جن کی قبر سامرہ میں ائمہ طاہرینؑ کی قبر کے ساتھ ہے اور انھوں نے چار اماموں کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے بلکہ امام زمانہؑ کی ولادت کے امور بھی انجام دیے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ علماء نے امام جوادؑ کی اولاد میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے اور سامرہ میں بھی ان کی مستقل زیارت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جس پر علامہ مجلسی اور بحر العلومؒ نے بھی اظہار تعجب فرمایا ہے۔

کرامات

محمد بن علی الہاشمی کا بیان ہے کہ میں ام الفضل سے عقد کے دوسرے دن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے بعض دواؤں کے استعمال کی بنا پر شدید پیاس لگی ہوئی تھی لیکن میں ان کے یہاں کا پانی نہیں پینا چاہتا تھا کہ آپ نے میرے مطالبہ کے بغیر پانی طلب کیا اور تھوڑا سا خود نوش فرماکر باقی مجھے عنایت فرمادیا جس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ شیعوں کے امام واقعاً لوگوں کے اسرار

د رموز سے باخبر ہوتے ہیں۔ (اصول کافی)

اس واقعہ سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ محبان آل محمدؐ کے گھر پانی نہ پینے کا سلسلہ نیا نہیں ہے بلکہ اس کا پروپیگنڈہ مامون رشید کے دور سے چلا آرہا ہے اور جب اس سے خود آل محمدؐ محفوظ نہیں رہ سکے تو چاہنے والے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔

● محمد بن ریان کہتے ہیں کہ مامون نے امام جوادؑ کو آزمانے کے لیے دو سو حسین وجمیل لونڈیاں آپ کے پاس بھیج دیں اور انھیں حضرت کو لُبھانے پر مامور کر دیا لیکن کردار امامت کی بلندی تھی کہ آپ نے کوئی توجہ نہیں فرمائی تو دربار میں بلا کر رقص و رنگ شروع کرا دیا جس پر آپ نے گویّے سے کہا کہ اے شیخ! خدا سے ڈر۔ اتنی لمبی ڈاڑھی اور یہ کاروبار۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساز اس کے ہاتھ سے گر گیا اور ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا۔ (اصول کافی)

● ایک شخص نے آپ سے آکر بیان کیا کہ ام الحسن نے آپ کا پُرانا لباس طلب کیا ہے تاکہ کفن میں بطور تبرک رکھے تو آپ نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وطن واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اس خاتون کا پندرہ دن پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

● ایک شخص نے حضرت سے سفر کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ نے منع فرما دیا۔ وہ رُک گیا لیکن اس کے ساتھی حماد بن عیسیٰ نے کہا کہ میں مکمل تیاری کر چکا ہوں۔ میں سفر ملتوی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ سفر پر روانہ ہو گیا اور راستہ میں ایک وادی میں قیام کیا جہاں ایسا سیلاب آیا کہ اس میں مع سامان کے بہہ گیا۔ (شواہد النبوۃ)

● معمر بن خلاد کا بیان ہے کہ مجھے ساتھ لے کر ایک وادی تک تشریف لے گئے اور وہاں مجھے روک کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو چہرہ اُداس تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں طوس سے آرہا ہوں۔ میرے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا ہے اور میں ان کی نماز جنازہ کے لیے گیا تھا۔

● قاسم بن عبدالرحمان کا بیان ہے کہ میں زیدی المذہب تھا اور حضرت کی تعریف سُن کر حیران تھا اور ملاقات کا مشتاق تھا کہ ایک مرتبہ آپ کا اس طرف سے گذر ہو گیا۔ میں نے دیکھ کر کہا کہ کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو اس بچہ کو اپنا امام مانتے ہیں۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آواز آئی قاسم بن عبدالرحمٰن! جو ہماری اطاعت سے انحراف کرے گا وہ جہنم کا حقدار ہوگا۔ میں حیرت میں پڑ گیا اور سوچا کہ شاید

انھیں جادو وغیرہ میں کوئی دخل ہے کہ دوبارہ آواز آئی۔ تمھارا خیال غلط ہے۔ اپنے عقیدہ کی اصلاح کرو۔ یہ سُننا تھا کہ قاسم بے چین ہو گیا اور فوراً خدمت اقدس میں حاضر ہو کر آپ کی امامت کا اقرار کر لیا۔

اعترافات

● آپ صغیر السن تھے لیکن قدر و منزلت کے اعتبار سے کبیر اور ذکر خیر کے اعتبار سے بلند ترین درجہ پر فائز تھے ــــــ محمد بن طلحہ شافعی (مطالب السئول)

● آپ کی منزلت نہایت درجہ بلند تھی ــــــ ملاحسین واعظ کاشفی (روضۃ الشہدا)

● کمال علم و فضل میں امام جوادؑ تک بڑے بڑے صاحبان علم و کمال بھی نہیں پہونچ سکتے تھے۔
ــــــ علامہ خاوند شاہ (روضۃ الصفا)

● آپ کے فضائل و مناقب بے شمار تھے اگرچہ آپ خود کمسن تھے ــــــ شبلنجی (نور الابصار)

● آپ نے ایک نشست میں تیس ہزار سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں اور اکثر سوالات کے وارد ہونے سے پہلے ہی جواب دے دیے ہیں ــــــ علی بن ابراہیم (کافی)

اقوال حکیمانہ

● "خدائے متعال پر اعتماد رکھنا ہی ہر قیمتی شے کی قیمت اور ہر بلندی کا ذریعہ ہے۔"
(حقیقت امر یہ ہے کہ خدائے کریم پر اعتماد سے بڑی کوئی دولت اور انسانی نفس کے اطمینان کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہر دولت فنا ہونے والی ہے لیکن یہ دولت فنا ہونے والی نہیں ہے۔ اور دور حاضر میں اعتماد علی اللہ نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام اور حکام سب حیران و سرگرداں نظر آرہے ہیں)۔

● "مومن کی عزت لوگوں سے بے نیازی میں ہے۔"
(انسان فاقوں میں گزار دے تو لوگوں کی نظر میں احترام رہ جاتا ہے لیکن ہاتھ پھیلائے تو وہ احترام بہر حال ختم ہو جاتا ہے چاہے مرغ مسلم ہی کیوں نہ نصیب ہو جائے)۔

● "ظاہر میں خدا کے دوست اور باطن میں اس کے دشمن نہ بنو۔"

دورحاضر میں عالم اسلام کی اکثریت اسی عالم میں ہے کہ کلمہ پڑھ کر سب اللہ کے دوست بن گئے ہیں۔ لیکن اپنے اعمال اور کردار کے اعتبار سے بالکل دشمن خدا ہیں، اور وہی سب منکرات انجام دے رہے ہیں جو دشمنانِ اسلام انجام دے رہے ہیں جو دشمنانِ خدا انجام دے رہے ہیں، ایسی صورت میں دعوائے محبت کا کیا فائدہ ہے ؟)۔

● "جس نے خدا کی راہ میں ایک دوست حاصل کر لیا گویا جنت میں ایک گھر حاصل کر لیا۔"

(دنیا داری اور لہو و لعب کے لیے دوستوں کا پیدا کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن راہِ خدا پر چلنے کے لیے اور دین خدا کی خدمت کے لیے ساتھی پیدا کر لینا بہت مشکل ہے ۔ انسان کے لیے جنت کے حصول کا سب سے اہم ترین ذریعہ یہی ہے کہ برادران دینی میں اضافہ کرے اور لوگوں کو اس برادری میں داخل کرے)۔

● "بھلا وہ کس طرح ضائع ہو سکتا ہے جس کا ذمہ دار خدا ہو، اور وہ کس طرح بچ کر جا سکتا ہے جس کا طلب گار خدا ہو۔ جو غیر خدا کا ہو جائے گا خدا اسے اسی کے حوالے کر دے گا اور جو بغیر علم کے عمل کرے گا اس کا فساد اصلاح سے کہیں زیادہ ہوگا۔"

(اس کلام کے چاروں جملے قابلِ توجہ ہیں۔ انسان خدا پر اعتماد کر لے تو اس کے ضائع ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ خدا جس کی ذمہ داری لے لے گا وہ کس طرح تباہ و برباد ہو سکتا ہے ۔ اور انسان یہ یقین کر لے کہ خدا سے بچ کر نہیں جا سکتا ہے تو اس کا کردار خود بخود سنور جائے گا۔ خدا کو چھوڑ کر غیر کی طرف جانے میں سب سے بڑا خطرہ یہی ہے کہ خدا اس کے حوالے کر دے گا تو پھر کوئی کام آنے والا نہ ہوگا اور بلا علم کے عمل کرنے میں فساد کا خطرہ زیادہ رہتا ہے کہ انسان واقعی مسائل سے باخبر نہیں ہے تو لوگوں کو حلال کے بجائے حرام کی تعلیم دے سکتا ہے اور انھیں محرمات کے بجائے واجبات سے بھی روک سکتا ہے)۔

● "غلط آدمی کی صحبت سے پرہیز کرو کہ اس کی مثال شمشیر برہنہ کی ہے کہ دیکھنے میں بہت چمک دار معلوم ہوتی ہے لیکن انجام بہت برا ہوتا ہے۔"

(ساتھی اور رفیق بنانے سے پہلے کردار کا جائزہ لے لینا انتہائی ضروری ہے ورنہ انسان فاسق و فاجر کی رفاقت اختیار کرے گا تو وہ ظاہری اعتبار سے تو انتہائی مخلص یا گرمی محفل کا سبب

بن جائے گا لیکن اس کا شر و فساد کسی وقت بھی نقصان پہونچا سکتا ہے)۔

● "خائن افراد کا امین ہونا خود بھی خیانت کار ہونے کے لیے کافی ہے۔"

(نیک صفت اختیار کرنے کے لیے اس کے محل اور موقع کا پہچاننا انتہائی ضروری ہوتا ہے ورنہ خیانت کار کی امانت داری میں خیانت کے علاوہ اور کیا ہاتھ آئے گا)۔

● "ہر مومن کو تین چیزوں کی ضرورت ہے: (۱) خدا کی توفیق (۲) اپنے نفس کی طرف سے موعظت (۳) دوسرے کی نصیحت کی قبولیت۔"

(جس انسان کو خدا کی توفیق حاصل نہ ہو اور اس کا ضمیر خود اسے نصیحت نہ کر سکتا ہو اور دوسروں کی نصیحت قبول کرنے کو بھی عار تصور کرتا ہو، وہ کسی اعتبار سے صاحب ایمان نہیں کہا جا سکتا ہے)۔

● "دل سے خدا کا قصد کرنا اعمال میں بدن کو تکلیف دینے سے زیادہ بہتر ہے۔"

(اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان سارے اعمال کو ترک کر کے خالی ذکر و فکر میں لگ جائے کہ یہ درحقیقت خدا کا تصور نہیں ہے بلکہ شیطان رجیم کا قصد اور اسی کا راستہ ہے۔ روایت کا صحیح ترین مفہوم یہی ہے کہ انسان صرف ظاہری اعمال پر بھروسہ نہ کرے اور توجہ قلب کی کوشش کرے کہ سارے اعمال کی روح اور جان یہی توجہ قلب ہے اور اس کے بغیر صرف بدن کے تھکانے اور اعضاء و جوارح کو حرکت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے)۔

● "جس نے خواہشات کا اتباع کیا اس نے دشمن کی تمنا پوری کر دی۔"

(انسان کا بدترین دشمن شیطان رجیم ہے اور اس کا بہترین پیغام خواہشات کا اتباع ہے کہ اس کے پاس گمراہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا جس شخص نے بھی شریعت کے بجائے خواہشات اور جذبات کا راستہ اختیار کر لیا اس نے گویا شیطان کی آرزو پوری کر دی اور اس کے راستہ پر چلا گیا)۔

● "ظلم بادشاہوں کے دور اقتدار کی آخری میعاد ہے۔"

(حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی بھی حکومت کفر و الحاد کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن ظلم و ستم کے ساتھ نہیں چل سکتی ہے۔ اور جب کسی حکومت میں ظلم داخل ہوتا ہے اور حکام رعایا پر ظلم کرنا

شروع کر دیتے ہیں تو رعایا میں بغاوت کا جذبہ شروع ہو جاتا ہے اور یہیں سے حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں اور ایک دن اسے عوامی انتقام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے بعد خاتمۂ اقتدار کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا ہے)۔

● "صبر پر تکیہ کرو، فقر کو گلے لگاؤ، خواہشات کو چھوڑ دو، ہوا و ہوس کی مخالفت کرو، اور یہ خیال رکھو کہ تم خدا کی نگاہوں سے غائب نہیں ہو سکتے ہو، تو اب فیصلہ کرو کہ اس کے سامنے کیسا رہنا چاہتے ہو۔؟"

(امام علیہ السلام کے پورے ارشاد کا آخری فقرہ ہی انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اگر انسان کو واقعاً یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ ہر وقت رب العالمین کی نگاہوں کے سامنے ہے اور صرف خدا کو حاضر و ناظر کہتا ہی نہیں ہے بلکہ اسے حاضر و ناظر سمجھتا بھی ہے تو اس کے سارے اعمال اور کردار کی اصلاح ہو سکتی ہے)۔

"اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں حاضر رہا اور اسے ناپسند کیا تو گویا حاضر نہیں تھا اور اگر کسی کام سے غائب رہا اور اسے پسند کیا تو گویا اس میں حاضر رہا۔"

(اس ارشاد کے دونوں حصے قابلِ توجہ ہیں کہ جو لوگ برائیوں کے مراکز یا اجتماعات میں مجبوراً موجود رہتے ہیں اور اپنی ناگواری کا اظہار کرتے رہتے ہیں وہ موجودگی کے مجرم نہیں ہیں لیکن جو لوگ غائب رہ کر بھی حسرتِ گناہ رکھتے ہیں وہ گویا اس گناہ میں شریک اور اس عملِ بد کے مجرم ہیں چاہے واقعاً عمل میں شریک نہ ہوں)۔

"تحفظ بقدرِ خوف ہوا کرتا ہے۔"

(اگر کوئی انسان گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے دل میں خوفِ خدا نہیں ہے ورنہ انسان کو جس قدر خوف ہوتا ہے اسی اعتبار سے اپنے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے۔ گناہوں سے بچاؤ کا انتظام نہ کرنا اور خوفِ خدا کا دعویٰ کرنا ایک دوسرا جرم ہے کہ انسان غلط بیانی سے بھی کام لے رہا ہے)۔

● "خواہشات کا ارتکاب کرنے والا لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔"

(انسان کے لیے لغزشوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ خواہشات کو کنٹرول میں رکھے

اور اس سے اپنے نفس کو محفوظ رکھے ورنہ اپنے کو خواہشات کے حوالے کر دینے میں لغزش کے علاوہ کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے)۔

● "جب قضا آجاتی ہے تو فضا تنگ ہو جاتی ہے۔"

(انسان کو یہ احساس بہرحال ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی قیمت پر دستِ قضا سے بچ کر نہیں جا سکتا ہے۔ وسیع ترین آفاق میں سیر کرنے والا بھی ایک دن دستِ اجل کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا انسان کو ہر وقت موت کا خیال رکھنا چاہیے اور موت کے بعد کی منزلوں کے لیے تیار رہنا چاہیے)۔

● "جو ظلم پر راضی ہو جائے اس کی ناراضگی میں کوئی نقصان نہیں ہے۔"

(انسان مخلوقات کی مرضی کا خیال کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ یہ شخص کس بات پر راضی ہوتا ہے اور کس بات سے ناراض ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ظلم و ستم ہی سے راضی ہوتا ہے تو اس کی ناراضگی کی ہرگز پرواہ نہ کرے بلکہ اس بات پر خوش ہو کہ میرا جادہ عدل و انصاف کا ہے اور اسی لیے ظلم پرور مجھ سے ناراض ہیں اور ناخوش ہیں۔ کاش! بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلامی حکام کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا اور وہ انھیں راضی کرنے کے بجائے رب العالمین کو راضی کرنے کی فکر کرتے کہ حکام جور و ستم صرف جور و ستم ہی سے راضی ہوتے ہیں، ان کی نگاہ میں عدل و انصاف کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

نقشِ انگشتر

"نعم القادر اللّٰہ"

اصحاب اور تلامذہ

۱۔ ابوجعفر احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی، کوفی

امام رضا علیہ السلام کے اصحاب میں تھے اور امام محمد تقیؑ کے مخصوص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی وثاقت کا یہ عالم تھا کہ جو روایت ان سے نقل کر دی جاتی تھی اس کا سلسلۂ سند نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اسے صحیح تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ انھوں نے کسی غیر معتبر راوی سے کوئی روایت نقل ہی نہیں کی ہے، انھوں نے ۲۲۱ھ میں وفات پائی ہے۔

۲۔ ابو محمد فضل بن شاذان بن خلیل ازدی نیشاپوری

۱۸۰ کتابوں کے مصنف اور انتہائی معتبر انسان تھے۔ امام عسکریؑ نے ان کے حق میں دو یا تین مرتبہ دعائے رحمت فرمائی ہے۔ محمد بن ابی عمیر اور صفوان بن یحیٰی وغیرہ جیسے جلیل القدر حضرات کے ساتھ برسوں زندگی گذاری ہے اور ان کے بعد قوم میں ایک مرجع روایات کی حیثیت رکھتے تھے۔

۳۔ ابو تمام حبیب بن اوس الطائی

اپنے دور کے بہترین شاعر تھے۔ ایک قصیدہ میں امام جوادؑ تک تمام ائمہ کا ذکر کیا ہے کہ ان کا انتقال امام جوادؑ ہی کے دور میں ہوگیا تھا اور جاحظ نے ان کا شمار رؤسا رافضہ میں کیا ہے جو ان کے شیعہ ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ انھیں قصائد وغیرہ کے علاوہ چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد تھیں۔

حماسہ ان کی بہترین کتاب ہے جس کی ادبی دنیا میں ایک خاص حیثیت ہے، اگرچہ بعض متعصب دشمنانِ اہلبیتؑ ان کے اشعار کے پڑھنے اور لکھنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ ابو تمام کی وفات ۲۳۱ھ میں موصل میں ہوئی ہے اور وہیں ان کا مزار بنا ہوا ہے۔

۴۔ ابو الحسن علی بن مہزیار اہوازی

امام جوادؑ نے انھیں ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ میں نے نصیحت قبول کرنے، اطاعت کرنے، خدمت واحترام کرنے کے اعتبار سے تمھارا مکمل امتحان لے لیا ہے اور تمھیں فرائض کا مکمل طور پر ادا کرنے والا پایا ہے کہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم جیسا انسان نہیں دیکھا ہے تو شائد صداقت کے حدود کے اندر ہی رہوں گا۔

ان کے والد اگرچہ عیسائی تھے لیکن انھوں نے اس قدر کمال فقہ وفقاہت میں پیدا کر لیا کہ حضرت جوادؑ کے مخصوص اصحاب میں شامل ہوگئے اور بعض علاقوں میں حضرت کے وکیل بھی رہے، بلکہ آپ کے بعد امام علی نقیؑ کے بھی وکیل رہے۔

ان کے بھائی ابراہیم اور فرزند محمد بن علی کا شمار بھی معتبر اصحاب امام علی نقیؑ میں ہوتا ہے۔

۵۔ ثقۃ الاسلام محمد بن ابی عمیر بغدادی

ان کی وثاقت اور جلالت قدر کو دوست اور دشمن دونوں نے تسلیم کیا ہے اور بعض حضرات نے تو انھیں یونس بن عبدالرحمٰن سے بھی زیادہ افضل قرار دیا ہے جب کہ ان کے بارے میں یہ فقرہ مشہور ہے کہ ملتِ اسلام میں سلمان فارسی اور ان کے بعد یونس بن عبدالرحمٰن سے بڑا فقیہ کوئی نہیں پیدا ہوا ہے۔

مامون رشید کے حکم سے سندی بن شاہک نے انھیں تشیع کے جرم میں ۱۲۰ تازیانے لگائے اور قید خانہ میں ڈال دیا جس سے ایک لاکھ ۲۱ ہزار درہم دے کر رہائی حاصل کی کہ ابن ابی عمیر صاحب ثروت انسان تھے ورنہ شاید ساری زندگی قید خانہ ہی میں رہ جاتے۔ حکومت وقت کو اس قدر ٹیکس دینے کے بعد بالکل محتاج ہوگئے اور حکومت نے ان کی ساری املاک کو ضبط کر لیا۔ اتفاق سے ایک شخص نے ان سے دس ہزار درہم قرض لیے تھے، اسے حالات کا علم ہوا تو اپنا مکان فروخت کر کے دس ہزار لے کر آیا۔ ابن ابی عمیر نے پوچھا کہ یہ مال کہاں سے فراہم کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اپنا مکان فروخت کر دیا ہے۔ فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ، میرے مولا امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ قرض کی خاطر انسان کو اس کے گھر سے نہیں نکالا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس وقت مجھے ایک ایک درہم کی ضرورت ہے لیکن میں قانون شریعت سے انحراف نہیں کر سکتا ہوں۔

۶۔ محمد بن سنان ابو جعفر الزاہری

امام محمد تقیؑ نے ان کا ذکر خیر فرمایا ہے، اور فرمایا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اس لیے کہ میں ان سے راضی ہوں ـــــ انھوں نے نہ میری مخالفت کی ہے ـــــ اور نہ میرے پدر بزرگوار کی مخالفت کی ہے۔

اس آخری جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ مخالفت کی خبریں مشہور ہوگئی تھیں جن کی صفائی دینا امام علیہ السلام کی نظر میں ضروری تھا۔

ان کے حالات میں یہ بات بھی نقل کی گئی ہے کہ نابینا ہوگئے تھے تو امام تقی علیہ السلام نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر انھیں بینا بنا دیا، لہٰذا یہ مرکز اعتماد امام ہونے کے علاوہ مصدر معجزہ امامؑ بھی تھے، اور اتنی سی بات بھی ان کی عظمت و وثاقت کے لیے کافی ہے۔

۷۔ ایوب بن نوح بن دراج الکوفی

مرد ثقہ اور صاحب کتب تھے۔ امام رضاؑ اور امام جوادؑ کے وکیل بھی تھے۔ انتہائی محتاط اور متقی انسان تھے۔

۸۔ جعفر بن محمد بن یونس الاحول

امام رضاؑ اور امام جوادؑ دونوں کے اصحاب میں تھے اور مرد ثقہ تھے۔

۹۔ حسین بن سعید الاہوازی

امام رضاؑ، امام جوادؑ اور امام ہادیؑ کے اصحاب میں تھے اور تقریباً تیس کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

۱۰۔ علی بن اسباط بن سالم

امام رضاؑ اور امام جوادؑ کے اصحاب میں مرد ثقہ اور صاحب کتاب تفسیر تھے۔ آپ کی صداقت بیان شہرۂ آفاق تھی اور اپنے ساتھیوں کے لیے معلّم کی حیثیت رکھتے تھے۔

نقشِ
حیات امام علی نقی ہادیؑ

ولادت : ۵ رجب ۲۱۴ھ

شہادت : ۳ رجب ۲۵۴ھ

نقش زندگانی امام علی نقی علیہ السلام

ماہ رجب سنہ ۲۱۲ھ کی پانچویں تاریخ تھی جب امام محمد تقی علیہ السلام کے بیت الشرف میں ایک اور نورِ الٰہی جلوہ گر ہوا اور قدرت نے سلسلۂ امامت کے دسویں وارث پیغمبرؐ کو اس دارِ دنیا میں بھیج دیا۔

امام محمد تقیؑ کی زندگی اس دور میں نہایت درجہ کش مکش میں گذر رہی تھی۔ امام علی رضاؑ کی شہادت کے بعد مامون نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کر کے مصالح حکومت کے تحفظ کے لیے اپنا داماد بنا لیا تھا اور اس طرح آپ کی گھریلو زندگی بھی پریشانیوں کا شکار ہو گئی تھی۔ باہر کے مصائب اپنے مقام پر تھے گھر کے اندر بھی سکون نہ مل سکا۔ کہاں امامت کی سادہ اور پاکیزہ زندگی جہاں دل پر خوفِ خدا کی حکومت اور گھر میں تقویٰ اور تقدس کا ماحول ہو اور کہاں نعمتوں اور عشرتوں کی پروردہ خاتون جس نے آنکھ کھولنے کے بعد سے ایک دن بھی صحیح اسلامی ماحول نہ دیکھا ہو۔ قدم قدم پر زحمتیں، رکاوٹیں اور مصیبتیں

امام علیہ السلام نے ایک سال کے اندر مسئلہ کا یہ حل نکالا کہ مامون کے عشرت کدہ کو چھوڑ کر مدینہ کا شریعت کدہ آباد کیا جائے اور اس طرح آپ بغداد سے مدینہ چلے آئے لیکن یہاں بھی وہ مصیبت بہرحال ساتھ رہی اور ام الفضل حضرت کو پریشان کرنے کے علاوہ باپ کو برابر شکایتی خطوط لکھتی رہی اور حکومت میں حضرت کے خلاف زمین ہموار کرتی رہی یہاں تک کہ قدرت نے تسلسل امامت کو برقرار رکھنے کے لیے آپ کو عقد ثانی پر آمادہ کیا اور آپ نے جناب سمانہ مغربیہ سے عقد فرما لیا۔ عقد کرنا تھا کہ گھر میں قیامت آگئی اور ام الفضل نے سر پر آسمان اٹھا لیا۔ باپ سے فریاد، اعزا سے شکایت، حکومت کے اندر سازش اور نہ جانے کتنے فتنے۔ امام محمد تقیؑ ان تمام فتنوں اور سازشوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے کارِ ہدایت میں مصروف رہے اور گھریلو زندگی میں

ایک دن بھی یہ گوارا نہ کیا کہ شہزادی کو عام گھرانے کی خاتون پر مقدم کر دیا جائے جس کے سخت ترین نتائج کا اندازہ ہر وہ انسان لگا سکتا ہے جس نے ایسے حالات کا مشاہدہ کیا ہو۔ پھر قیامت بالائے قیامت یہ ہوئی کہ تھوڑے عرصہ کے بعد رب العالمین نے جناب سمانہ مغربیہ کو صاحب اولاد بنا دیا۔ ام الفضل کے لیے اولاد سے محرومی، زندگی کی سادگی، گھر میں دوسری بیوی کی موجودگی ہی کیا کم مصیبت تھی کہ اب ایک اور افتاد سامنے آگئی کہ میں صاحب اولاد نہ ہو سکی اور یہ خاتون صاحب اولاد ہو گئی۔

اسلام کی تاریخ میں لاولد خاتون کا صاحب اولاد خاتون سے حسد ایک قدیم ترین روایت ہے جس سے بڑی بڑی خواتین بھی محفوظ نہیں رہ سکیں تو ام الفضل تو کسی خاص اسلامی شخصیت کی مالک بھی نہیں تھی اور نہ عالم اسلام نے اس سے آدھا تہائی دین حاصل کیا ہے۔ نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا مگر قدرت جب کید کائدین اور مکر ماکرین کا جواب دینا چاہتی ہے تو فرعون کی لاکھوں کوششوں کے باوجود موسیٰ کو عالم وجود میں لے آتی ہے۔ چنانچہ امام علی نقیؑ اس دنیا میں آگئے اور عالم اسلام وایمان میں بہار آنے کے ساتھ ساتھ ام الفضل کے گلشن تمنا میں خزاں کا دور دورہ ہو گیا اور امام علی نقیؑ کی زندگی کا آغاز ایک عجیب و غریب حاسدانہ ماحول میں ہوا۔

● آپ کی والدہ ماجدہ جناب سمانہ مغربیہ تھیں جن کا نسبی رشتہ تو بہرحال غیر عرب ماحول سے تھا اور اس بنیاد پر عرب کسی انسان کو وہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے جو ان کی نگاہ میں خود عربوں کا ہوتا ہے اور اپنے علاوہ ہر ایک کے ساتھ غلام اور کنیز جیسا ہی برتاؤ کرتے تھے لیکن کردار کے اعتبار سے آپ کا مرتبہ تمام عرب خواتین سے بلند تھا اور اسی لیے ائمہ طاہرینؑ نے عرب کے شریف ترین قبیلہ سے تعلق رکھنے کے باوجود عجمی خواتین سے عقد کیا ہے کہ اسلام سے عرب و عجم کا تفرقہ اور عربوں کے نسبی غرور کا خاتمہ ہو جائے اور اسلام میں ایمان و کردار کی اہمیت کا بھی مظاہرہ ہو جائے۔ جناب سمانہ کی کم سے کم یہ تعریف کی گئی ہے کہ آپ تمام سال کے روزے کی پابندی کیا کرتی تھیں جسے صوم دہر کہا جاتا ہے اور روایات میں اس کی بے پناہ فضیلت وارد ہوئی ہے۔ بعض روایات میں صوم دہر نہ رکھ سکنے والے افراد کو اس کے ثواب کے حاصل کرنے کا ذریعہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر ماہ میں تین روزے رکھ لے تو وہ ثواب کے اعتبار سے کم سے کم ۳۰ کے برابر ہو جائیں گے اور پورے مہینے کے روزہ اجر مل جائے گا۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مجبوری کا علاج ہے کمالِ

اور چالاکی کا نسخہ نہیں ہے لہذا صاحبان استطاعت کو ثواب حاصل کرنے کے لیے ترکیبوں کے بجائے اعمال کا سہارا لینا چاہیے اور پھر اعمال کی قبولیت کے لیے اخلاص کا سہارا لینا چاہیے تاکہ عمل بارگاہِ الٰہی میں قابلِ قبول قرار دیا جاسکے۔

صوم دہر کے سلسلہ میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس میں وہ دن بہرحال معاف کر دیے جاتے ہیں جن میں شریعت کی طرف سے روزہ رکھنے پر پابندی ہے اور جن کے روزوں سے شریعت نے خود روک دیا ہے اس لیے کہ اسلام میں عمل کی بنیاد عبادت ہے عادت نہیں ہے۔ حکم الٰہی عمل سے متعلق ہوجائے تو عمل کرنا عبادت ہے اور حکم الٰہی ترک عمل سے متعلق ہوجائے تو عمل کا ترک کر دینا ہی عبادت خالق اور بندگی پروردگار ہے۔ اس میں کسی رسم و رواج اور جذبات و احساسات کی دخل اندازی کی گنجائش نہیں ہے اور نہ عبادت کا تعلق بندگانِ خدا کی تعریف یا تنقیص سے ہوتا ہے۔ عبادت نگاہ ربوبیت میں قابلِ تعریف ہوتی ہے اس میں نگاہ عبودیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

● آپ کا اسم گرامی علیؑ تھا اور القاب میں نجیب، مرتضیٰ، عالم، فقیہ، ناصح، امین، موتمن، طیب، نقی اور ہادی وغیرہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض روایات میں آپ کا ایک لقب متوکل بھی ہے لیکن آپ نے اپنے اصحاب کو اس لقب سے یاد کرنے سے منع فرما دیا تھا کہ اس طرح ظالم بادشاہ کو انتقام لینے کا ایک اور بہانہ مل جائے گا یا عوامِ امت پر کردار مشتبہ ہوجائے گا اور وہ ہر متوکل کو ایک ہی طرح کے کردار کا حامل تصور کرنے لگیں گے۔

● سامرہ کے محلہ عسکر میں قیام کی بنا پر آپ کو عسکری بھی کہا جاتا ہے اور آپ کے فرزند ارجمند کو بھی اسی لقب سے یاد کیا جاتا ہے بلکہ ان کا مشہور ترین لقب عسکری ہی ہے اس لیے کہ ان کا رابطہ اس محلہ سے زیادہ رہا ہے اور اس طرح دونوں اماموں کو ملا کر عسکریین کہا جاتا ہے جس طرح کہ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام جوادؑ کو کاظمین اور جوادین کہا جاتا ہے۔

● ولادت کی جگہ مدینہ سے کچھ دور صریا کے مقام پر ہے جہاں امام محمد تقیؑ اکثر قیام فرمایا کرتے تھے اور شاید آپ نے گھریلو اختلافات سے دور رہنے کے لیے جناب سمانہ کو اس مقام پر رکھ دیا ہو اور قدرت نے وہیں انھیں نعمت اولاد سے سرفراز فرما دیا ہو۔

● کنیت ابوالحسن الثالث تھی، اس لیے کہ اس سے پہلے امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کو

بھی اسی کنیت سے یاد کیا جاتا تھا اور بعض روایات میں آپ کو ابوالحسن الماضی بھی کہا گیا ہے۔

شاہان وقت میں سب سے پہلا نام مامون رشید کا آتا ہے جس کے دور حکومت میں ۲۱۴ھ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے۔ اس کے بعد ۲۱۸ھ میں معتصم باللہ خلیفہ ہوا۔ معتصم کے بعد ۲۲۷ھ میں واثق ابن معتصم نے حکومت سنبھالی، ۲۳۲ھ میں واثق کا خاتمہ ہوگیا تو متوکل کے ہاتھ میں زمام خلافت آگئی اور وہ ۲۴۷ھ تک تخت حکومت پر قابض رہا۔ اس کے بعد اس کی تین اولاد پے در پے حاکم بنتی رہی، ۲۴۷ھ میں منتصر بن متوکل، ۲۴۸ھ میں مستعین بن متوکل اور ۲۵۲ھ میں معتز بن متوکل، اور اسی معتز ظالم نے ۲۵۴ھ میں امام علی نقیؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔

ان تمام بادشاہوں میں سب سے بدتر کردار کا مالک متوکل تھا جسے بنی عباس کا یزید کہا جاتا ہے اور جس کی بے ایمانی اور بدکرداری کا یہ عالم تھا کہ اس کے محل میں چار ہزار کنیزیں تھیں اور سب اس کے تصرف میں رہا کرتی تھیں، شراب بے تحاشہ پیا کرتا تھا۔ ظلم کا یہ عالم تھا کہ سیکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں صاحبان ایمان اور سادات کا خون کیا ہے اور ابن السکیت جیسے صاحب کمال ادیب سے دریافت کیا کہ میرے دونوں فرزند بہتر ہیں یا حسنؑ و حسینؑ؟ اور ابن السکیت نے صاف صاف کہہ دیا کہ تیرے بیٹوں کا مقابلہ ان کے غلام قنبر سے نہیں ہو سکتا ہے ان کا کیا ذکر ہے تو اس کے نتیجہ میں ان کی زبان گدّی سے کھنچوالی جب کہ وہ دربار کے مقرب ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ قبر امام حسینؑ کے نشان کے مٹانے کا کام بھی متوکل ہی نے شروع کیا تھا جس میں بہ فضل خداوندی وہ کامیاب نہیں ہو سکا اور مزار مقدس سے آج تک آواز آرہی ہے:

بیا بیا متوکل ببیں مزارِ حسینؑ
زمین بلند شد و آب نہر شد حائر

● آپ کے انتہائی بچپنے کا زمانہ تھا جب ۲۱۹ھ میں معتصم باللہ نے آپ کے پدر بزرگوار کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا اور آپ اپنے پدر بزرگوار سے جدا ہوگئے جس کے بعد پھر دوبارہ ملاقات کی نوبت نہ آئی کہ امام محمد تقیؑ ۹ محرم ۲۲۰ھ کو بغداد پہونچے اور ظالم نے ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ کو آپ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا۔

باپ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت نہ پانے کی بنا پر بعض افراد کو ہمدردی کا خیال پیدا ہوا۔ اور

عمر بن فرج نے عبید اللہ جنیدی کو آپ کا معلّم قرار دے دیا لیکن چند دنوں کے بعد جب جنیدی سے بچہ کی رفتارِ تعلیم کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اسے تعلیم دیتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اس سے علم حاصل کرتا ہوں اور اس کا علم و فضل مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ واللّٰہ ھذا خیر اھل الارض۔ (اثبات الوصیۃ، دمعہ ساکبہ)

علم و کمالات

● ثقۃ الاسلام کلینیؒ ناقل ہیں کہ امام علی نقی علیہ السلام نے نوفلی سے فرمایا کہ پروردگارِ عالم کے تہتّر ۷۳ اسم اعظم ہیں جن میں سے ایک آصف بن برخیا کو عنایت ہوا تھا جس کے طفیل میں چشم زدن میں تختِ بلقیس کو ملک سبا سے حضرت سلیمان کی خدمت میں پہونچا دیا اور ہمیں ان میں سے بہتّر ۷۲ اسمار عطا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا ہمارے عجائب و غرائب کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ رب العالمین نے ایک اسم اعظم ہم سے بھی مخفی رکھا ہے کہ یہ اس کی ربوبیت کا خاصہ ہے۔

واضح رہے کہ علم کا کام انکشاف ہے۔ علم کا اقتدار سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن امام نقیؑ نے تختِ بلقیس کا حوالہ دے کر اس حقیقت کا انکشاف کر دیا ہے کہ اسم اعظم کا علم صرف انکشافِ حقائق تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک طرح کا اقتدار و اختیار بھی پایا جاتا ہے جس سے طی الارض کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ تو اگر ایک اسم اعظم میں اتنا بڑا اقتدار مخفی ہو سکتا ہے تو بہتّر ۷۲ اسم اعظم کا کیا عالم ہوگا، اور آصف بن برخیا سے بہتّر ۷۲ گنا اقتدار کتنے عظیم اقتدار کا اشاریہ ہوگا۔

● ۲۲۷ھ میں جب آپ کی عمر مبارک ۱۲۔۱۳ سال کی تھی تو آپ ابو ہاشم کے ساتھ سرِ راہ کھڑے تھے اور ادھر سے ترکوں کی فوج کا گذر ہو گیا تو آپ نے ایک سپاہی سے اس کی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ وہ حیران ہو کر قدموں پر گر پڑا اور بتایا کہ آپ نے جس نام سے پکارا ہے اس کا علم میرے باپ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی ولی خدا ہیں۔

● ابو ہاشم ہی کی روایت ہے کہ آپ نے ایک دن ہندی زبان میں گفتگو شروع کی تو میں نے عرض کیا کہ مولا! میں اس زبان سے بالکل واقف نہیں ہوں۔ آپ نے ایک کنکری اٹھا کر اس میں لعابِ دہن لگا کر میرے حوالہ کر دیا اور میں نے اسے زبان پر رکھا تو ۷۳ زبانوں کا ماہر ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ جب امامت کے لعابِ دہن کا یہ اثر ہے تو نبوت کے لعابِ دہن کا کیا اثر ہوگا، اور جب لعابِ دہن میں اس قدر تاثیر پائی جاتی ہے جو جسم کے فاضل رطوبات میں شمار ہوتا ہے تو خون میں کس قدر تاثیر ہوگی جو جسم کا اصلی جزء اور حیات کا اصلی رکن ہوتا ہے۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے بعد ہی رسول اکرمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی توضیح کی جا سکتی ہے کہ اہلبیتؑ کا خون میرا خون ہے اور ان کا گوشت و پوست میرا گوشت و پوست ہے۔

● شیخ طوسیؒ کتاب مصباح میں ناقل ہیں کہ اسحاق بن عبد اللہ حضرت کی خدمت میں ایک بحث کا فیصلہ کرانے کے لیے آئے تو آپ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ چاہے بحث کا فیصلہ چاہتے ہو تو سنو، سال کے اہم روزے چار ہیں: (۱) ۱۷ ربیع الاول روز ولادت پیغمبر اکرمؐ (۲) ۲۷ رجب روز بعثت پیغمبر اسلامؐ (۳) ۲۵ ذی قعدہ یوم دحو الارض، جس دن فرشِ زمین تیار کیا گیا اور (۴) ۱۸ ذی الحجہ جب اسلام کامل اور نعمتیں تمام ہو گئیں۔

● علامہ جامی ناقل ہیں کہ ایک چاہنے والے نے قاضی بغداد کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ اس شکایت کی کوئی ضرورت نہیں ہے دو ماہ کے بعد وہ خود ہی معزول ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا (اس لیے کہ حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتی ہے)۔ (شواہد النبوۃ)

● متوکل کو زہر دیا گیا تو اس نے نذر کر لی کہ اگر شفایاب ہو گیا تو مال کثیر غربار میں تقسیم کر دوں گا۔ شفا کے بعد فقہاءِ اسلام سے مسئلہ دریافت کیا تو ہر شخص نے الگ الگ مقدار بتائی اور کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آخرکار ایک شخص نے اجازت طلب کر کے امام علی نقیؑ سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ۸۰ درہم صدقہ دے دے۔ متوکل نے دلیل کا سوال کیا تو فرمایا کہ خدا نے اپنے رسولؐ کی کثیر مواقع پر مدد کی ہے اور یہ مواقع تاریخ میں ۸۰ ہیں جہاں رسول اکرمؐ نے کفار سے مقابلہ کیا ہے اور پروردگار نے ان کی مدد کی ہے۔ (مناقب)

● بادشاہِ روم نے خلیفۂ وقت کو خط لکھا کہ انجیل میں یہ عبارت درج ہے کہ ث، ج، خ، ز، ش، ظ، ف ان سات حروف سے خالی سورہ کی تلاوت کرنے والا جنت کا حق دار ہوگا تو آپ فرمائیں کہ وہ سورت کون سی ہے؟ خلیفہ نے علماءِ اسلام سے دریافت کیا سب عاجز رہ گئے تو امامؑ کو طلب کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ بات بالکل سامنے کی ہے اور وہ سورہ، سورۂ حمد ہے جس میں یہ حروف

نہیں ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ ث سے ثبور (ہلاکت)، ج سے جحیم (جہنم)، خ سے خیب وخسران، ز سے زقوم، ش سے شقاوت، ظ سے ظلمت اور ف سے فرقت وغیرہ کی طرف اشارہ ملتا ہے، لہذا رب العالمین نے اس سورۂ رحمت و برکت کو ان حروف سے خالی کر دیا ہے۔

واضح رہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس سورہ میں یہ حروف آجائیں وہ سورۂ رحمت و برکت نہیں ہے اس لیے کہ یہ حروف خود سورۂ رحمٰن اور سورۂ دہر میں بھی موجود ہیں جن کی بنیاد ہی بیانِ رحمت پر ہے، بلکہ یہ ایک خاص راز ہے جس کی طرف امامؑ نے اشارہ فرما دیا ہے، اور وہ راز بادشاہِ روم ہی کو معلوم تھا اور اسی لیے وہ مطمئن ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا اور تاحیات مسلمان رہا۔ (دمعہ ساکبہ)

ایسے ہی واقعات کو دیکھ کر علماء اعلام نے اس علمی قانون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ واقعات کلی قوانین کی نشان دہی نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے خصوصیات وابستہ ہوتے ہیں اور خصوصیات کے ہوتے ہوئے قوانین عامہ کا استنباط نہیں کیا جا سکتا ہے۔

● جبر و تفویض کے بارے میں عالم اسلام میں ہمیشہ دو طرح کے نظریات رہے ہیں۔ بعض افراد نے اپنے ظلم و ستم کی پردہ پوشی کے لیے عقیدۂ جبر کی ترویج کی ہے تاکہ ان پر کوئی الزام نہ آنے پائے اور ہر عمل کا ذمہ دار خدا کو بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہ محاورہ مشہور کر دیا گیا کہ حکم خدا کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا ہے تو بندہ کیا ہلے گا حالانکہ اس محاورہ میں دو کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے علم خدا کا ذکر کیا ہے حکم خدا کی بات نہیں کی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ پتہ کا شمار نباتات میں ہوتا ہے جس کے پاس شعور اور ارادہ کی دولت نہیں ہے۔ لہذا پتہ کا قیاس اس انسان پر نہیں کیا جا سکتا ہے جسے رب العالمین نے دولتِ ارادہ و شعور و اختیار سے نوازا ہے۔

دوسری طرف بڑی شخصیتوں کے مریدوں نے عقیدۂ تفویض کی اشاعت کی کہ بندہ مکمل طور پر صاحب اختیار ہے اور اس کے معاملات میں خدا کا بھی کوئی دخل نہیں ہے اور گویا اس نے سارے اختیارات ان افراد کو تفویض کر دیے ہیں۔ امام علی نقیؑ کے دور میں بھی اس مسئلہ کا شور اٹھا تو آپ نے وہی تاریخی فیصلہ کر دیا جو آپ کے بزرگ کرتے چلے آئے تھے، کہ اسلام میں نہ جبر ہے اور نہ تفویض، بلکہ "امر بین الامرین" یعنی معاملہ دونوں کے درمیان میں ہے کہ اختیارات رب العالمین کے دیے

ہوئے ہیں اور عمل کی ذمہ داری یا بالفاظ دیگر اختیارات کے استعمال کی ذمہ داری انسانوں پر ہے۔ نہ انسان خدائی اختیار سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ خدا انسان کے استعمال کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

● ۲۳۲ھ میں جب کہ آپ کی عمر مبارک تقریباً بیس سال کی تھی ایک مرد اسباطی عراق سے مدینہ پہونچا اور حضرت سے ملاقات کی۔ آپ نے اس سے حاکم واثق کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے خیریت بتائی۔ پھر ابن الزیات کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ آجکل سارا نظام حکومت اس کے ہاتھوں میں آگیا ہے اور عیش کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے معلومات ناقص ہیں۔ واثق مر چکا ہے۔ متوکل حاکم ہو گیا ہے اور ابن الزیات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اسباطی نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ واقعہ کب رونما ہوا ہے؟ فرمایا تمہارے عراق سے نکلنے کے چھ دن بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ چند دنوں کے بعد ان تمام واقعات کی تصدیق ہو گئی اور امام علی نقیؑ کا کمال علم منظر عام پر آگیا۔ (نور الابصار)

کرامات

● محمد بن فرج کا بیان ہے کہ امام علی نقیؑ نے مجھے خط لکھا کہ اپنا سارا سامان درست کر لو اور اسلحوں کو سنبھال لو۔ میں نے حضرت کے حکم کی تعمیل تو کر لی لیکن حیرت میں رہ گیا کہ اس حکم کا راز کیا ہے؟ چند روز کے بعد مصر کی پولیس نے میرے اوپر حملہ کر کے مجھے گرفتار کر لیا اور میرا سارا سامان ضبط کر لیا۔ میں آٹھ سال قید خانہ میں رہا۔ ایک دن حضرت کا خط آیا کہ خبردار! مغرب کے علاقہ میں مت جانا۔ میں حیران رہ گیا کہ میں تو جیل میں ہوں مشرق و مغرب سے میرا کیا تعلق ہے۔ چند روز کے بعد میری رہائی کا پروانہ آگیا اور میں نے حضرت کو خط لکھا کہ اب میرے سامان کی واپسی کی دعا کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ عنقریب واپس مل جائے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جیسا امامؑ نے فرمایا تھا حرف بحرف ثابت ہوا۔

● علی بن الحصیب کا بیان ہے کہ میں حضرت کے ساتھ چل رہا تھا، اتفاقاً میں آگے نکل گیا اور میں نے آپ کو بھی تیز رفتاری کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا کہ تمھیں آگے ہی جانا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چند دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

● ابو ایوب نے حضرت کو خط لکھا کہ میری زوجہ حاملہ ہے، دعا فرمائیں کہ مولود فرزند ہو۔ آپ نے

فرمایا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن اس کا نام محمد رکھنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور اس نے بچہ کا نام محمد رکھ دیا۔ اس طرح آلِ محمدؐ کے مقصدِ حیات کی بھی وضاحت ہوگئی کہ وہ ہر قدم پر نام پیغمبر اسلامؐ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور کسی طرح بھی اس نام کی فنا کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

● یحییٰ بن زکریا نے لکھا کہ میری زوجہ بھی حاملہ ہے اس کے حق میں بھی یہی دعا فرمادیں۔ فرمایا کہ بہت سی لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ اس طرح امامؑ نے صورتِ مولود کی اطلاع بھی دے دی اور اس غیر اسلامی تصور کی تردید بھی کردی کہ لڑکے کا مرتبہ بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ ایسا ہوتا تو پروردگارِ عالم اپنے پیغمبرؐ کو فرزند ہی کی نعمت سے نوازتا اور ان کی نسل کو بھی فرزند ہی کے ذریعہ آگے بڑھاتا۔ امامؑ کا جواب بعینہٖ وہی جواب تھا جو پروردگار نے مادرِ جناب مریمؑ کو دیا تھا اور یہ واضح کردیا تھا کہ بسا اوقات لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا ہے اور لڑکی کا مرتبہ تمام لڑکوں سے بہتر ہوتا ہے۔

● ابو ہاشم کا بیان ہے کہ میں نے حضرت سے اپنی غربت کا تذکرہ کرکے امداد کا مطالبہ کیا تو آپ نے ایک مٹھی ریت میرے دامن میں ڈال دی اور فرمایا کہ اسے فروخت کرکے اپنا کام چلاؤ، ابو ہاشم نے بغور دیکھا تو ریت سونے کی شکل اختیار کرچکی تھی اور چوتھے علیؑ کے ذریعہ پہلے علیؑ کے کمال کا اظہار ہوچکا تھا۔ (مناقب)

● ابو ہاشم ہی کا بیان ہے کہ حضرت سامرہ تشریف لائے تو میں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کی کہ میرا قیام بغداد میں ہے اور اس طرح میں روزانہ آپ کی زیارت نہیں کرسکتا ہوں، میرا جانور بھی ضعیف و ناتواں ہے تو آپ نے فرمایا کہ پروردگار تمھارے جانور کو طاقتور بنادے گا۔ چنانچہ حضرت کے اس ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ میں روزانہ نمازِ صبح بغداد میں، نمازِ ظہرین سامرہ میں، اور نمازِ مغربین پھر پلٹ کر بغداد میں ادا کیا کرتا تھا — جب کہ بغداد اور سامرہ میں سو میل سے زیادہ کا فاصلہ تھا۔

● علامہ شیخ عباس قمیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ بادشاہِ وقت کو امام علیہ السلام کے سامنے اپنے اقتدار کی نمائش کا شوق پیدا ہوا تو اس نے میدان میں ایک ٹیلہ تیار کرا کے پوری فوج کو صحرا میں جمع ہونے کا حکم دے دیا اور جب نوّے ہزار مسلح سپاہی اکٹھا ہوگئے تو حضرت کو اس بلندی پر لے جاکر اپنی طاقت کا زور دکھلانا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ اب میرا بھی اقتدار دیکھ لے۔ یہ کہہ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیا

تو صحرا میں تا حدِ نظر زمین سے آسمان تک فوجیں ہی فوجیں نظر آرہی تھیں۔ بادشاہ یہ دیکھ کر بیہوش ہوکر گر پڑا۔ حضرت اسے ہوش میں لے آئے اور فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ہم اہلبیتؑ اس خداداد طاقت کو اپنی ذات کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں اور نہ کبھی اپنے ظالموں سے کسی طرح کا انتقام لیتے ہیں۔

● علامہ عبدالرحمٰن جامی رقم طراز ہیں کہ متوکل ایک انتہائی سخت پھوڑے میں مبتلا ہوگیا اور کوئی علاج کارگر نہ ہوا تو اس کی ماں نے نذر کرلی کہ اگر اس مرض سے نجات مل گئی تو دس ہزار دینار ابن الرضاؑ کی خدمت میں نذر کرے گی۔ اُدھر فتح بن خاقان نے کہا کہ حضور اجازت دیں تو میں حضرت علی نقیؑ سے دریافت کروں۔ متوکل نے "مرتا کیا نہ کرتا" کے عنوان سے اجازت دے دی۔ آپ نے نسخہ تجویز کردیا اور اہلِ دربار سُن کر ہنس پڑے۔ وزیر نے تجربہ کی دعوت دی اور چند دنوں میں پھوڑا بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اہلِ دربار رُسوا ہوئے اور متوکل کی ماں نے دس ہزار دینار کی تھیلی حضرت کے پاس بھیج دی۔ (شواہد النبوۃ)

● عبدالرحمٰن مصری محبانِ اہلبیتؑ میں نہ تھا۔ ایک مرتبہ اس نے شہر میں اپنی محبت اہلبیتؑ کا اعلان کردیا تو لوگوں کو حیرت ہوئی اور اس اعلان کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں سامرہ گیا ہوا تھا وہاں یہ خبر سُنی کہ متوکل نے کسی سید علوی کے قتل کا حکم دے دیا ہے اور وہ عنقریب آنے والا ہے۔ میں اشتیاقِ دید میں سرِ راہ کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک شخص لایا جارہا ہے۔ مجھے اس کی شرافت و وجاہت کو دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ یہ شخص بلا گناہ قتل کیا جارہا ہے کہ ایک مرتبہ قریب آکر اُس شخص نے کہا کہ عبدالرحمٰن گھبراؤ نہیں میں قتل نہیں ہوسکتا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اس شخص کو میرا نام کہاں سے معلوم ہوگیا۔ چنانچہ میں ان کی امامت کا قائل ہوگیا اور انھوں نے میرے حق میں مال اور اولاد کی دعا کی اور بحمد اللہ آج میں دونوں سے مالا مال ہوں۔ (کشف الغمہ)

● متوکل کے دربار میں ایک ہندی جادوگر آیا اور اس نے اپنے جادو سے تمام دربار کو حیرت زدہ کردیا۔ تو متوکل نے اس کے فن کا بہترین مصرف یہ قرار دیا کہ امام علی نقیؑ کو ذلیل کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے امام کو طلب کرلیا اور جادوگر کو اس کی خواہش کے مطابق امام کے پہلو میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان لگ گیا اور کھانا شروع ہوگیا۔ جیسے ہی امامؑ نے روٹی کو ہاتھ لگانا چاہا اس نے جادو سے روٹی کو اُڑا دیا۔ آپ نے صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا اور اہلِ دربار میں قہقہہ لگ گیا۔ دوبارہ پھر

ایسا ہی واقعہ ہوا۔ یہاں تک کہ تین مرتبہ موقع دینے کے بعد آپ نے شیرِ قالین کو اشارہ کیا اور اس نے مجسم ہو کر جادوگر کو ہڑپ لیا۔ دربار میں ہلچل مچ گئی۔ متوکل بدحواس ہو گیا اور حضرت سے مطالبہ کیا کہ شیرِ قالین سے جادوگر کو واپس کرا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا موسیٰؑ کے عصا نے جادوگروں کو واپس کیا تھا اور یہ کہہ کر دربار سے باہر تشریف لے گئے۔ (شواہد النبوۃ)

● متوکل کے دورِ حکومت میں ایک عورت نے یہ دعویٰ کیا کہ میں زینب بنت علیؑ و فاطمہؑ ہوں اور دعائے رسولؐ کی بنا پر ہر ۴۰ ـ ۵۰ سال کے بعد جوان ہو جاتی ہوں۔ متوکل نے علماء سے اس دعویٰ کی تردید طلب کی لیکن کوئی جواب نہ دے سکا تو فتح بن خاقان نے ابن الرضاؑ کو طلب کیا۔ امام علی نقیؑ نے فرمایا کہ اللہ نے اولادِ رسولؐ کے گوشت کو درندوں پر حرام کر دیا ہے۔ تو اسے اپنے شیر خانہ میں بھیج دے ابھی حال معلوم ہو جائے گا۔ اہلِ دربار نے موقع غنیمت دیکھا اور کہا کہ امیر پہلے اس معیار کا تجربہ ہو جائے تاکہ استدلال مکمل رہے۔ متوکل نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت سے شیر خانہ میں جانے کا تقاضا کر دیا۔ آپ فوراً تیار ہو گئے اور بہ اطمینان تمام تشریف لے گئے۔ متوکل بلندی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ درندوں نے قدموں پر سر رکھ دیا اور آپ تا دیر ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔ اس کے بعد باہر تشریف لے آئے تو ہر طرف آپ کے کمال کا چرچا ہو گیا اور متوکل نے قیمتی انعامات پیش کیے، زینب کذابہ کی حقیقت واضح ہو گئی اور بروایتے اسے درندوں میں ڈال کر اس کی زندگی کا خاتمہ کرا دیا گیا۔ جس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بے بنیاد دعوائے سیادت کامیاب نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کے کردار میں آثارِ سیادت و نسبِ شریف نہ پائے جاتے ہوں اس کی سیادت زینب کذابہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔

واضح رہے کہ امام علیہ السلام کا بیان کردہ قانون صرف براہِ راست اولادِ رسولؐ کے لیے ہے جن کا مصداق حقیقی اولادِ زہراؑ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد سب انھیں کے طفیل اور صدقہ میں اولادِ رسولؐ کہے جاتے ہیں کہ واقعی اولادِ رسولؐ کی اولاد ہیں اور ان میں اسی نسبِ شریف کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

● یونس نقاش جو امام علیہ السلام کے ہمسایہ میں رہا کرتا تھا اور نگینوں پر نقاشی کا کام کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رئیسِ وقت نے اسے ایک نگینہ نقش کرنے کے لیے دیا جو انتہائی قیمتی تھا۔ اتفاقِ وقت

کہ عبارت کندہ کرتے وقت وہ نگینہ ٹوٹ گیا اور یونس امامؑ کی خدمت میں فریاد لے کر آ گیا کہ اب میری خیر نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں خدا بہتری کرے گا۔ یونس کو کسی حال قرار نہیں مل رہا تھا کہ اچانک سرکاری نمائندہ آیا اور اس نے یونس کو دربار میں طلبی کا پیغام سنایا، یونس نے پھر آ کر فریاد کی۔ آپ نے فرمایا کہ چلے جاؤ اللہ کریم ہے۔ یونس دربار میں حاضر ہوئے تو حاکم نے کہا کہ نقش تیار ہو گیا؟ یونس نے معذرت کی کہ ابھی کام مکمل نہیں ہو سکا ہے۔ حاکم نے کہا کہ بڑا اچھا ہوا میرے دونوں بیٹوں میں اختلاف ہو گیا ہے لہٰذا اب نگینہ کو توڑ کر دونوں کے نام الگ الگ کندہ کر دو۔ یونس نے تعمیلِ حکم کا وعدہ کر لیا اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہ گئی کہ امام علیہ السلام نے جس اطمینان کی دعوت دی تھی اس کا راز بھی یہی تھا جو بالآخر سامنے آ گیا۔

● ۲۳۴ھ میں خلافت پانے کے بعد ہی متوکل نے قوم میں ایک نیا فتنہ شروع کر دیا اور یہ چاہا کہ امت کو ایسے مسائل میں اُلجھا دیا جائے کہ وہ آپس میں دست و گریباں رہیں اور حکومت کے مظالم کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں جو ہر ماہرِ سیاست کا طریقہ کار ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے مسجدِ رصافہ میں ابوبکر بن شیبہ کو اور مسجدِ منصور میں اس کے بھائی عثمان کو امامِ جماعت مقرر کر کے انھیں اس بات پر مامور کر دیا کہ لوگوں کے درمیان صفاتِ الٰہیہ، رویتِ خداوندی اور خلقِ قرآن کے عقائد کی ترویج کریں اور امت کو اس اختلاف میں اُلجھا دیں۔ اُدھر مذہبِ معتزلہ کو ترک کر کے مذہبِ شافعی کے اختیار کرنے کا اعلان کر دیا اور دونوں فرقوں کے درمیان بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔

قوم کو اس فتنہ میں اُلجھانے کے بعد آثارِ اہلبیتؑ کے مٹانے کا کام شروع ہو گیا اور پہلے لوگوں کو زیارتِ قبرِ امام حسینؑ سے روکا گیا، اس کے بعد آثارِ قبر کو مٹا دینے کا کام ایک نو مسلم یہودی کے سپرد کیا گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ قبرِ مظلوم پر زراعت کی جائے لیکن کامیاب نہ ہو سکا کہ بہت سے جانوروں کو امامِ مظلوم کی معرفت نام نہاد انسانوں اور مسلمانوں سے کہیں زیادہ حاصل تھی۔ متوکل کے اس قسم کے مظالم کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے طبیعی حادثات بھی رونما ہوئے اور بعض تاریخوں کی بنا پر آسمان سے دس دس رطل کے پتھر تک برسے۔ یہ واقعہ ۲۳۶ھ کا ہے۔

● اُدھر متوکل سامرہ شہر کی آبادی میں بھی مصروف تھا جسے اُس دور کا عروس البلاد کہا جاتا تھا اور جس کی آبادی بعض روایات کی بنا پر اکیس ۲۱ میل تک پھیلی ہوئی تھی جہاں ایک ایک میدان میں ۹۰ ہزار

سپاہی جمع کر دیے جاتے تھے۔ تقریباً دس سال تک یہ کام جاری رہا اور اس میں آلِ محمدؐ کی نمایاں شخصیتوں پر مظالم کا سلسلہ رُکا رہا اور مظالم حدودِ عراق تک محدود رہے۔ اس کے بعد جب اس کام سے فرصت مل گئی تو مدینہ کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں پر ظلم ڈھانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ عبداللہ بن محمد کو حاکم بنایا اور اسے سادات پر ظلم ڈھانے کا حکم دے دیا۔ امام علی نقیؑ نے متوکل کو حالات سے باخبر رکھنے کے لیے حاکم مدینہ کی شکایت لکھی اور اس نے موقع کو غنیمت دیکھ کر حاکم کو معزول کرنے کے بجائے حضرتؑ کو مدینہ سے سامرہ طلب کر لیا کہ مدینہ میں آپ کو زحمت ہو رہی ہے اور حکومت کا نمائندہ آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ اس طرح متوکل کو براہِ راست ظلم کرنے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا اور حضرتؑ کو نگاہِ عوام سے الگ رکھنے کا بھی بہانہ مل گیا۔

● متوکل نے حضرتؑ کو طلب کرنے کے لیے خط بھیجنے کے بجائے تین سو افراد پر مشتمل ایک لشکر روانہ کیا جس کا انداز بظاہر یہ قرار دیا گیا کہ فرزندِ رسولؐ کو اعزاز و احترام کے ساتھ بلایا جا رہا ہے لیکن واقعاً مقصد یہ تھا کہ حضرتؑ کو گرفتار کر کے مدینہ سے باہر نکالا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرتؑ کو سارے گھرانے کو چھوڑ کر روضۂ رسولؐ سے جُدا ہونا پڑا۔ لیکن قدرت کا یہ انتظام کہ متوکل کو اس راہ میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور یحییٰ بن ہرثمہ کے بیان کے مطابق اس لشکر میں ایک محبِ اہلبیتؑ بھی تھا جسے تمام راستہ ستایا گیا اور ایک وادی میں پہونچنے کے بعد لوگوں نے کہا کہ تمھارے مولا نے فرمایا ہے کہ ایک ایک زمین سے ستّر ستّر مُردے نکالے جائیں گے یہاں تو کوئی آبادی نہیں ہے یہاں سے کون سا مُردہ اٹھایا جائے گا؟ اس نے کہا کہ میں ثابت تو نہیں کر سکتا ہوں لیکن جب میرے مولا نے فرمایا ہے تو غلط بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جب مدینہ میں حضرتؑ کو متوکل کا خط پیش کیا گیا تو آپ نے دو ایک دن کی مہلت طلب کی اور سردی اور برسات کا سامان تیار کرنے لگے جس پر لشکر والوں میں ایک کھلبلی مچ گئی کہ گرمی میں اس طرح کی تیاری کا کیا مقصد ہے۔ اور لوگوں نے پھر اس محبِ اہلبیتؑ کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تین دن کے بعد قافلہ روانہ ہوا اور جب اسی لق و دق صحرا میں پہونچا تو رات کے وقت اچانک تیز آندھی آئی اور موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ لوگ سردی سے اکڑنے لگے۔ حضرتؑ نے ساتھیوں کو برسات اور سردی کے کپڑے پہننے کا حکم دے دیا اور بقدرِ امکان یحییٰ کے لشکر کی بھی امداد کی لیکن صبح ہوتے ہوتے

اسّی ۸۰ افراد لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ پھر انھیں حضرتؑ کے حکم سے اسی صحرا میں سپردِ خاک کر دیا گیا اور مولائے کائنات کے اس ارشاد کی تصدیق ہو گئی جس پر دشمنانِ اہلبیتؑ ذلیل ہو گئے اور محبِ اہلبیتؑ سرخرو ہو گیا اور خود (یقولے) مسلکِ اہلبیتؑ کی طرف آ گیا۔

● سامرہ پہونچنے کے بعد آپ کو فقراء کے مرکز خان الصعالیک میں ٹھہرا دیا گیا تاکہ لوگ آپ کی شخصیت سے باخبر نہ ہونے پائیں۔ صالح بن سعید نامی ایک شخص نے آپ سے ملاقات کر کے افسوس کا اظہار کیا کہ یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے اور یہاں قیام آپ کے اوپر ایک صریحی ظلم ہے۔ آپ نے ایک اشارہ فرمایا اور صالح نے دیکھا کہ دنیا میں بہار باغِ جنت نظر آ رہی ہے۔ فرمایا کہ صالح! ہم اسی آخرت کے لیے اس دنیا کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر صالح کو قدرے اطمینان حاصل ہو گیا۔ (شواہد النبوۃ)

● کچھ دنوں کے بعد خان الصعالیک سے نکال کر ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا جہاں بظاہر نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا لیکن واقعاً آپ کو ایک مستقل روحانی اور ذہنی اذیت میں رکھا جاتا تھا۔
حکومت کی اسی ظاہرداری سے فائدہ اٹھا کر اہلِ ایمان امامؑ کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور آپ سے تمام مشکلات کا حل دریافت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک سائل دروازہ پر آیا اور آپ موجود نہیں تھے تو تلاش کرتا ہوا قریہ تک گیا۔ آپ نے دس ہزار قرضہ کی ادائیگی کے مطالبہ پر تیس ہزار کا ایک پرچہ لکھ دیا اور فرمایا کہ مجھ سے مجمعِ عام میں تقاضا کرنا۔ اس نے امام علیہ السلام کے حسبِ ہدایت عمل کیا اور قرض کے ادا کرنے کا بہ شدّت تقاضا کیا۔ آپ نے تین دن کی مہلت طلب کی۔ بادشاہِ وقت کو اطلاع ملی تو اس نے ظاہرداری کو برقرار رکھنے کے لیے تیس ہزار بھجوا دیے، اور آپ نے سائل کے حوالے کر دیے۔ اس نے عرض کی کہ میرے ذمہ قرض صرف دس ہزار درہم کا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ باقی بھی تیرے کام آ جائے گا۔ چنانچہ وہ پوری رقم لے کر خوش خوش چلا گیا اور یہ اعلان کیا کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا منصب کس کے حوالے کرے گا۔

(نور الابصار، صواعق محرقہ، شواہد النبوۃ، ارجح المطالب)

واضح رہے کہ حضرتؑ کے رقعہ کا مقصد یہ التزام تھا کہ میں فلاں شخص کو اس قدر رقم ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں اگرچہ میرے ذمہ اس کا کوئی قرض نہیں ہے اور اس طرح سے ادائیگی ایک

قانونی ذمہ داری بن جاتی ہے جس طرح کہ خود مالک کائنات نے تمام صاحبان ایمان و کردار سے جزاء کا وعدہ کرلیا ہے کہ اب اس جزا کا عطا کرنا اس کی حکمتی اور عدالتی ذمہ داری ہے، حالانکہ کسی بندہ کا اس کے ذمہ کوئی حق نہیں ہے اور نہ مخلوق کا خالق کے ذمہ کوئی حق ہوسکتا ہے۔

● نظربندی کے دوران ملاقات کی چھوٹ کی بنیاد پر لوگوں نے متوکل سے شکایت کی کہ چاہنے والے ان کے گھر میں اسلحے جمع کر رہے ہیں اور وہ عنقریب تیرے خلاف قیام کرنے والے ہیں' متوکل نے راتوں رات تلاشی کا حکم دے دیا۔ سپاہی گھر کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ آپ مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے تلاوتِ قرآن کر رہے ہیں۔ مصلیٰ سے اٹھا کر دربار میں لے آئے اور متوکل کو خبر کی کہ ان کے گھر میں کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ اس نے حسب عادت امامؑ کی ضیافت بھی جامِ شراب سے کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا کہ تجھے معلوم ہے کہ شراب آلِ محمدؐ کے گوشت و پوست میں جذب نہیں ہوئی ہے۔ اس نے شعر سنانے کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں شعر بہت کم پڑھتا ہوں۔ لیکن اس نے اصرار کیا تو آپ نے بے ثباتی دنیا پر یہ اشعار پڑھ دیے:

(ترجمہ): "زمانے کے رؤساء و سلاطین جنھوں نے پہاڑوں کی بلندیوں پر پہروں کے اندر زندگی گذاری تھی۔ ایک دن وہ آگیا جب اپنے بلند ترین مراکز سے نکال کر قبر کے گڑھے میں گرا دیے گئے جو ان کی بدترین منزل ہے' ان کے دفن کے بعد منادی غیب کی آواز آئی کہ وہ تخت و تاج و خلعت کہاں ہے اور وہ نرم و نازک چہرے کہاں ہیں جن کے سامنے بیش قیمت پردے ڈالے جاتے تھے؟ تو جواب میں قبر نے زبانِ حال سے پکار کر کہا کہ آج ان چہروں پر کیڑے رینگ رہے ہیں۔ ایک مدت تک مال دنیا کھاتے رہے اور اب کیڑے انھیں کھا رہے ہیں۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ متوکل بیہوش ہوکر گر پڑا، اور ہوش آیا تو محفل شراب کو برخاست کردیا اور امامؑ کو باعزت طریقہ پر رخصت کردیا۔ (وفیات الاعیان، نور الابصار)

● اس کے بعد بھی مظالم کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ دوبارہ پھر تلاشی کا حکم دیا گیا اور سعید حاجب کا بیان ہے کہ میں پشت بام کی طرف سے گھر میں وارد ہوا۔ گھر میں تاریکی کا ماحول تھا اور امام علی نقیؑ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو سیڑھی سے اترنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو فرمایا کہ ٹھہرو میں روشنی لے کر آرہا ہوں۔ میں بے حد شرمندہ ہوا۔ لیکن جب حسب الحکم گھر میں تلاشی لی تو وہاں ایک تلوار اور متوکل کی ماں کی بھیجی ہوئی ایک تھیلی کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ میں نے یہ سامان متوکل کے سامنے پیش کردیا۔ اس نے سامان واپس کردیا اور اپنی جگہ بے حد شرمندہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد بھی اذیت سے باز نہ آیا اور خانہ قید کرنے کے بجائے زندان کے حوالہ کردیا۔ پہلے زرافہ کی قید میں رکھا، اس کے بعد رزاقی کے حوالے کردیا اور اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ یکسر موقوف ہوگیا۔

● متوکل ظلم و ستم کے شوق یا اس کی عادت کی بنا پر مسلسل مائل اذیت و آزار رہا اور امام علیہ السلام پر عرصۂ حیات تنگ کرتا رہا، حالانکہ اس کے سیاسی حالات بھی قابلِ اطمینان نہیں تھے اور پورے ملک میں ظلم کے خلاف احتجاج کی لہر دوڑ رہی تھی، گھر میں بیٹا اور غلام دونوں مخالف ہوگئے تھے اور باہر بھی ایک ہنگامہ کی صورت تھی لیکن امام علی نقیؑ نے کبھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور حد یہ ہے کہ متوکل کے بعد حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ اس کے بیٹے تقریباً خلافت سے محروم کردیے گئے کہ مستعین کے دور میں یحییٰ بن عمر بن حسین بن زید علوی نے کوفہ میں خروج کیا، حسن داعی الحق نے طبرستان پر قبضہ کرلیا۔ دارالسلطنت میں ترکی غلاموں نے بغاوت کردی۔ مستعین کو سامرہ چھوڑ کر بغداد بھاگنا پڑا، اور وہاں قلعہ بند ہونا پڑا اور آخر میں معتز باللہ کے ہاتھوں قتل ہونا پڑا اور پھر معتز کو خود اپنے بھائیوں کی طرف سے بغاوت کا خطرہ محسوس کرکے موید کو قتل کرانا پڑا اور موفق کو بصرہ میں قید کرنا پڑا، اور حکومت میں ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوگئی کہ کوئی بھی ہوس اقتدار رکھنے والا بآسانی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند روز کے لیے تخت حکومت پر قبضہ کرسکتا تھا لیکن امام علی نقیؑ کی دور اندیشی اور ان کی روش کی اسلامیت نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ کسی موقع پرستی سے کام نہ لیں اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا ارادہ نہ کریں۔ حد یہ ہے کہ آپ نے کسی بغاوت میں بھی حصہ نہیں لیا اور اپنے کو ہر ہنگامی حالت سے الگ رکھ کر حالات کا جائزہ لیتے رہے تاکہ حفاظت اسلام اور نشر احکام کا کوئی موقع فروگذاشت نہ ہونے پائے، اور اس طرح اپنے جد بزرگوار کے دین کی خدمت کرتے رہے اور حکومت کی ظالمانہ روش پر مسلسل نگاہ رکھے رہے۔

● متوکل اپنی فطری شرارت کی بنا پر روزانہ نئے مظالم کے بارے میں سوچتا رہتا تھا چنانچہ جب

کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو سنہ ۲۳۶ھ میں دوبارہ قبر امام حسینؑ کے انہدام کا ارادہ کرلیا اور پہلے زیارت پر پابندی عائد کی، پھر زائرین کے ہاتھ کاٹنے اور آخر میں قتل کردینے کا حکم دے دیا۔ یہاں تک کہ یہ خبر عام ہوگئی تو عشق حسینؑ کے دو دیوانے دو علاقوں سے قربانی دینے کے لیے نکل پڑے مصر سے زید مجنوں چلے اور کوفہ سے بہلول دانا۔ پہلے دونوں نے مشترکہ پروگرام بنایا اور اس کے بعد روانہ ہوگئے۔ کربلا کے قریب پہونچے تو یہ منظر دیکھا کہ نہر علقمہ کا رُخ قبر امام حسینؑ کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور قبر اطہر کو بے نشان بنایا جا رہا ہے۔ لیکن منصوبہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے اور پانی قریب جاکر رُک جاتا ہے۔ دونوں حضرات تیزی سے آگے بڑھے۔ سرکاری نمائندہ نے سوال کیا کہ تم لوگ کون ہو، اور کیوں آئے ہو؟ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہم فرزند رسولؐ کی قبر کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اس نے کہا کیا تمھیں اس کی سزا نہیں معلوم ہے؟ فرمایا کہ معلوم ہے اور اس کا عزم لے کر آئے ہیں۔ وہ حیران ہوکر قدموں پر گر پڑا اور اپنے ارادہ سے باز آکر متوکل کے پاس گیا۔ متوکل نے سبب آمد دریافت کیا تو اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے اس شخص کو قتل کرکے لاش کو سولی پر لٹکا دیا اور پھر بازاروں میں رسی باندھ کر کھنچوایا تاکہ قوم میں عبرت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو ـــــــ جناب زید کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فوراً سامرہ پہونچے اور اس نگراں کی لاش کو دفن کرکے اس کے سرھانے قرآن مجید کی تلاوت کی کہ اس نے زائرین قبر حسینؑ کا احترام کیا تھا اور اس راہ میں اپنی جان دے دی تھی۔

چند دن گذرے تھے کہ زید نے ایک جنازہ کی خبر سنی اور باہر نکل کر دیکھا تو قیامت کا مجمع تھا۔ زید کا خیال ہوا کہ شاید متوکل دنیا سے رخصت ہوگیا ہے۔ لیکن دریافت حال پر معلوم ہوا کہ اس کی کنیز کا انتقال ہوگیا ہے اور یہ اس کی کنیز کا احترام ہے۔ زید نے اک آہ سرد کھینچی اور فرمایا کہ اللہ! متوکل کی کنیز کے جنازہ کا یہ احترام ہے اور فرزند رسولؐ کا جنازہ تین دن تک بے گور و کفن پڑا رہا اور اب اس کی قبر تک بے نشان بنائی جا رہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد چند اشعار لکھ کر متوکل کے پاس بھیجے۔ اس نے انھیں قید کرلیا لیکن رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی مرد مومن اسے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ تو گھبرا کر زید کو آزاد کردیا اور وہ اپنی خدمت دین کی مہم میں مصروف ہوگئے۔

• متوکل اپنے مظالم کی بنا پر اس قدر جری ہوگیا تھا کہ نہ زبان پر قابو رہ گیا تھا اور نہ اعضاء و جوارح پر۔ چنانچہ ایک دن اپنے بیٹے منتصر کے سامنے صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہ زہراؑ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کردیے تو اس نے فقہاء سے ایسے شخص کے بارے میں فتوی دریافت کیا۔ ان لوگوں نے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے دیا تو اس نے رات کو موقع پاکر خلوت میں اس کا خاتمہ کردیا۔ اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ لیے منتقم حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔ یہ واقعہ ۴ شوال سنہ ۲۴۷ھ کا ہے۔

شہادت

وطن چھوڑنے کے بعد امام علی نقیؑ کا قیام تقریباً ۱۱ سال تک سامرہ میں رہا اور اس درمیان مختلف قسم کی اذیتیں برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۲۵۲ھ میں متوکل کا بیٹا معتز باللہ خلیفہ ہوا اور اپنے باپ کے مظالم کی کسر کو پورا کرنے کے لیے ۳ رجب سنہ ۲۵۴ھ میں حضرت کو زہر دغا سے شہید کرادیا۔

آپ کے زہر دغا سے شہید ہونے کا تذکرہ، تذکرہ خواص الامہ، نور الابصار، صواعق محرقہ وغیرہ میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

انتقال سے قبل تمام انبیاء کی میراث آپ نے اپنے فرزند امام حسن عسکریؑ کے حوالے کردی، اور پھر انھیں حضرت نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا بلکہ باپ کے غم میں گریبان بھی چاک کیا جس پر کسی نے اعتراض کیا تو فرمایا یہ سنت انبیاء ہے۔ جناب موسیٰ نے جناب ہارون کے غم میں گریبان چاک کیا تھا۔

غالباً اس طریقہ کار کا مقصد یہ تھا کہ لوگ حکومت کے مظالم کی طرف متوجہ ہوجائیں اور نئی صورت حال دیکھ کر اس طرح کے اقدام کا سبب دریافت کریں اور امامؑ کو اس سبب کے بیان کرنے کا موقع مل جائے جو ہر دور میں صاحبان ایمان اور محبان اہلبیتؑ کے درمیان مراسم عزاداری کا فلسفہ رہا ہے اور اس کے ذریعہ مظالم بنی امیہ کی تشہیر ہوتی رہی ہے۔

واضح رہے کہ امام حسن عسکریؑ نے یہ تمام امور غائبانہ طور پر انجام دیے تھے ورنہ بظاہر وقت آخر آپ کے پاس کوئی نہ تھا اور آپ نے نہایت ہی غربت اور کسمپرسی کے عالم میں جان جان آفریں کے

حوالہ کی ہے۔

ازواج واولاد

آپ کی مختلف ازواج سے پانچ اولاد کی نشان دہی کی گئی ہے:

۱۔ امام حسن عسکریؑ ــ جو آپ کے بعد دین حق کے ذمہ دار اور رسول اکرمؐ کے گیارہویں وارث تھے۔

۲۔ سید محمد ــ جن کا روضہ عراق میں بغداد اور سامرہ کے درمیان بلد میں واقع ہے اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں بعض لوگوں کو امامت کا بھی خیال تھا

۳۔ جعفر ــ جنھوں نے امام عسکریؑ کے بعد امامت کا دعویٰ کیا اور ان کی نماز جنازہ پڑھانا چاہی جس پر امام زمانہؑ نے ان کا دامن کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا اور عام طور سے انھیں جعفر کذّاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض علمی حلقوں میں جعفر توّاب کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک دختر بریہہ کی شادی موسیٰ مبرقع کے فرزند محمد سے ہوئی تھی۔

۴۔ حسین ــ نہایت ہی عابد وزاہد قسم کے انسان تھے اور امام حسن عسکریؑ کی امامت کے معترف تھے۔ ان کی قبر ان کے والد گرامی کے پہلو میں ہے۔

۵۔ علیہ ــ جو آپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔

نقشِ انگشتر

آپ کی ایک انگشتری کا نقش تھا "اللہ ربي وهو عصمتي من خلقه" اور دوسری انگشتری کا نقش تھا، "حفظ العهود من اخلاق المعبود"۔

اصحاب

۱۔ حسین بن سعید بن حماد بن سعید بن مہران الاہوازی

ان کی اصل کوفہ سے ہے لیکن بعد میں اہواز منتقل ہو گئے تھے۔ امام رضاؑ، امام جوادؑ اور امام ہادیؑ

کے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔ قم میں انتقال کیا۔ تیسؐ کتابوں کے مصنف تھے اور ان کے بھائی حسن پچاس کتابوں کے مصنف تھے اور ان تیسؐ کی تصنیف میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ حسین بن سعید کی کتابوں کا امتیاز یہ ہے کہ انھیں دیگر افراد کی کتابوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی کتابیں مثل کتب حسین بن سعید ہیں۔ انھوں نے علی بن مہزیار، اسحاق بن ابراہیم حُضَینی اور علی بن ریّان کو امام رضاؑ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور ان تینوں کی ہدایت کا سبب بنے تھے۔

۲۔ خیران خادم امام رضاؑ

انھیں بھی تین اماموں کی خدمت کا شرف حاصل تھا اور اصحاب اسرار میں سے تھے۔ انھیں امام ہادیؑ نے اپنا وکیل بھی قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ معاملات میں اپنی فکر سے کام لیا کرو، تمھاری رائے میری رائے ہے اور تمھاری اطاعت میری اطاعت ہے۔

۳۔ ابوہاشم جعفری داؤد بن القاسم بن اسحاق بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ

امام رضاؑ سے امام زمانہؑ تک سب کی خدمت میں حاضر رہے اور امام زمانہ کے وکیل بھی رہے۔ انتہائی صاحب ورع وزہد وتقویٰ بزرگ تھے۔ سنہ ۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا اور بغداد میں دفن ہوئے۔

۴۔ عبدالعظیم بن عبداللہ بن علی بن الحسن بن زید بن الحسن بن علی بن ابی طالبؑ

اکابر محدثین، اعاظم علماء وعباد وزہاد میں شمار ہوتے ہیں۔ امام جوادؑ اور امام ہادیؑ کے اصحاب میں تھے۔ متعدد روایات کے راوی ہیں۔ ان کے امتیازات میں یہ ہے کہ انھوں نے امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے مکمل عقائد پیش کیے تھے۔ توحید خدا، عدم تجسیم، خالقیت ومالکیت کل کائنات، ختم نبوت پیغمبر اسلامؐ۔ شریعت دائمی حضرت خاتم المرسلینؐ۔ امامت ائمہ طاہرین حضرت علیؑ وحسنؑ وحسینؑ وعلیؑ بن الحسین ومحمد بن علیؑ وجعفر بن محمدؑ وموسیٰ بن جعفرؑ وعلی بن موسیٰ ومحمد بن علیؑ وعلی بن محمدؑ ــ یہاں تک آنے کے بعد عبدالعظیمؑ خاموش ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میرے بعد میرا فرزند حسن عسکریؑ اور ان کے بعد ان کا فرزند حجت آخر، جس کا نام قبل ظہور نہیں لیا جا سکتا۔ وہ صاحب غیبت ہوگا اور آخر میں ظہور

کرکے دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔

اس کے بعد حضرت عبدالعظیمؒ نے معراج، سوال قبر، جنّت، جہنّم، صراط، میزان، قیامت کے برحق ہونے کا ذکر کیا، اور پھر عقائد کے بعد اعمال میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض ہونے کا ذکر کیا۔ تو امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک یہ وہ دین ہے جسے خدا نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

۵۔ علی بن جعفر ہمیناوی

بغداد کے اطراف کے رہنے والے تھے اور امام ہادیؑ کے وکیل تھے۔ متوکل کو معلوم ہوا تو قید خانہ میں ڈال دیا اور قتل کا حکم دے دیا۔ انھوں نے امامؑ سے دعا کی درخواست کی اور حضرت نے دعا کی تو متوکل اچانک بیمار ہوگیا اور بطور کفارہ سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ یہ بحکم امام مکہ چلے گئے اور وہیں ساکن ہوگئے۔

۶۔ ابن السکیت بن یعقوب بن اسحاق اہوازی

امام جوادؑ اور امام ہادیؑ کے مخصوص اصحاب میں تھے اور علوم ادبیہ میں بے پناہ مہارت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ متوکل نے اپنے فرزندوں کا معلم بنا دیا تھا۔ ایک دن ظالم نے سوال کر لیا کہ میرے فرزند افضل ہیں یا حسنؑ و حسینؑ؟ تو ابن السکیت نے جواب میں پہلے حسنینؑ کے فضائل بیان کیے اس کے بعد فرمایا کہ ان کا غلام قنبر بھی تجھ سے اور تیرے فرزندوں سے بہتر ہے۔ جس پر اس نے گدّی سے زبان کھنچوالی اور اتنا مارا کہ شہید ہوگئے۔ عام طور سے خاموش رہنے کی بنا پر انھیں ابن السکیت کہا جاتا تھا۔

کلمات حکمت

● "جو شخص خود اپنی ذات سے خوش رہے گا اس سے ناراض ہونے والے زیادہ رہیں گے۔"

(انسان کو ہمیشہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اور کسی وقت اپنے اعمال کا غرور نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ خود پسندی کسی وقت بھی انسان کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔)

● "صبر کرنے والے کی مصیبت اکہری ہوتی ہے اور فریاد کرنے والے کی دُوہری۔"

(صبر کرنے والا صبر کرتا ہے تو مصیبت کے بعد اجر پا جاتا ہے اور صرف مصیبت ہی کا اثر رہ جاتا ہے اور فریاد کرنے والا اجر سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور دنیا و آخرت دونوں جگہ کی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے)۔

● "بیہودہ مذاق احمقوں کی تفریح ہے اور جاہلوں کا ہُنر۔"

(صاحبانِ علم و عقل اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں جن سے وقار و احترام نفس میں فرق آجاتا ہے۔

● "بیداری نیند کو لذیذ تر بنا دیتی ہے اور بھوک سے کھانے کا مزہ بڑھ جاتا ہے۔"

(یعنی انسان اچھی نیند اور خوش ذائقہ طعام پسند کرتا ہے تو پہلے بیدار رہے اس کے بعد سوئے اور جب بھوک لگ جائے تب کھانا کھائے)۔

● اس وقت آخر کو یاد کرو جب گھر والوں کے درمیان رہو گے لیکن نہ کوئی طبیب کام آئے گا نہ حبیب۔"

(کاش انسان زندگانی دنیا کے اس انجام کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس کے کردار میں عظیم انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اہلِ دنیا جیتے جی کام نہیں آتے ہیں تو مرنے کے بعد کیا کام آئیں گے)۔

نقشِ
حیات امام حسن عسکریؑ

ولادت: ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ

شہادت: ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ

نقشِ زندگانی امام حسن عسکری علیہ السّلام

ماہ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کی دسویں تاریخ تھی جب سلسلۂ امامت کا گیارہواں وارث پیغمبرؐ اس دارِ دنیا میں تشریف فرما ہوا اور مدینہ کی سرزمین نورِ جمالِ امامت سے منور ہوگئی۔

● اسم گرامی حسن قرار پایا اور القاب زکی، عسکری اور ابن الرضا قرار پائے۔ کنیت ابومحمد تھی، اور مادرِ گرامی کا نام حُدیثہ یا سلیل تھا جن کے بارے میں امام علی نقیؑ نے فرمایا کہ وہ جملہ عیوب و نقائص سے مُبرّا اور پاک و پاکیزہ خاتون ہیں۔ آپ کے وقت ولادت امام علی نقیؑ کی عمر شریف تقریباً سولہ سال چند ماہ کی تھی۔

● لقب عسکری کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کے محلہ کا نام عسکر تھا جہاں سامرہ میں آپ کا قیام تھا۔ اور شاید اسے عسکر اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ وہاں بادشاہِ وقت نے فوجی چھاؤنی بنا رکھی تھی، یا اس مقام پر متوکل نے اپنی فوجوں کی نمائش کی تھی جس کے ذریعہ امام علی نقیؑ کو مرعوب کرنا چاہا تھا لیکن جب آپ نے آسمانی فوجوں کا مشاہدہ کرا دیا تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

● انگشتر مبارک کا نقش "سبحان من له مقالید السمٰوٰت والارض" یا بقولے "انا للہ شہید" تھا۔

● بادشاہِ وقت واثق باللہ تھا۔ اس کے بعد ۲۴۷ھ تک متوکل کی حکومت رہی۔ ۲۴۷ھ میں منتصر بن متوکل حاکم ہوا، ۲۴۸ھ میں مستعین کی حکومت قائم ہوئی، ۲۵۲ھ میں معتز باللہ تخت نشین ہوا اور اسی نے امام علی نقیؑ کو زہر دغا سے شہید کرا دیا۔ پھر ۲۵۵ھ میں مہتدی اور ۲۵۶ھ معتمد علی اللہ کی خلافت قائم ہوئی اور اسی ظالم نے امام حسن عسکریؑ کو شہید کرایا۔

● عمر مبارک چار سال کی تھی جب ۲۳۶ھ میں امام علی نقیؑ کو مدینہ سے سامرہ طلب کیا گیا، اور پدر بزرگوار کے ہمراہ سامرہ آگئے۔ مدینہ سے رخصت ہونے سے پہلے امام علی نقیؑ نے بزرگانِ مدینہ کو

جمع کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ میرا وارث میرا یہ فرزند حسنؑ ہے اور اس پر متعدد افراد کو گواہ بھی قرار دے دیا۔

● سامرہ آنے کے بعد ایک روز آپ سرِ راہ کھڑے تھے اور بچے کھیل رہے تھے کہ ادھر سے بہلول دانا کا گزر ہوگیا۔ بہلول نے آپ کی تنہائی اور اداسی کو دیکھ کر عرض کی کہ فرزند اگر آپ کے پاس کھیل کا سامان نہیں ہے تو میں ابھی لائے دیتا ہوں، آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ نے فوراً آیت قرآنی کی تلاوت کی کہ ہم کھیل کود کے لیے نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ رب العالمین نے ہمیں ایک عظیم مقصد عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیں پلٹ کر اسی کی بارگاہ میں جانا ہے اور اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔

● حکام وقت کا برتاؤ آپ کے ساتھ اسی طرح رہا جس طرح آپ کے بزرگوں کے ساتھ تھا۔ متوکل تو عداوت آلِ محمدؐ میں خاص شہرت رکھتا تھا اور اس کے مظالم یزید بن معاویہ سے کسی طرح کم نہ تھے، منتصر بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔ مستعین نے متوکل ہی کو قید کرا دیا تو امام علیہ السلام کے بارے میں کس شریفانہ برتاؤ کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مہتدی نے صالح بن وصیف کی جیل میں رکھا اور اسے ہدایت کر دی کہ سخت ترین سلوک کیا جائے چنانچہ اس نے علی بن یارمش اور ایک اور شخص کو اس بات پر مامور کر دیا کہ آپ کو انتہائی تکلیف دی جائے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں شخص اعلیٰ درجہ کے مومن اور متقی ہو گئے ہیں لہٰذا انھیں طلب کر کے سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا قیدی دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا رہتا ہے ایسی حالت میں ہمارے پاس اس کو تکلیف دینے کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ بہترین موقع ہے کہ اس سے درسِ بندگی حاصل کیا جائے۔ بنی عباس نے صالح کا یہ بیان سُنا تو مایوس ہو کر چلے گئے۔

● مستعین کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک انتہائی سرکش گھوڑا خریدا جو کسی طرح سواری قبول نہ کرتا تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس پر حسن عسکریؑ کو سوار کر دو ان کا بھی کام تمام ہو جائے گا۔ مستعین نے اس رائے کو پسند کیا اور حضرت کو طلب کر لیا۔ آپ گھوڑے کے قریب گئے تو اس نے سر جھکا لیا اور آپ سوار ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک دوڑاتے رہے اور پھر اتر گئے،

اور فرمایا کہ اب مزید کوئی کام تو نہیں ہے۔ مستعین نے شرمندہ ہو کر وہ گھوڑا آپ کے حوالے کر دیا اس لیے کہ کوئی دوسرا اس پر سوار نہ ہو سکتا تھا اور اقتدارِ امامت کا اظہار حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔

● آپ کے ایک صحابی احمد بن محمد نے مہدی کے مظالم کی فریاد کی تو فرمایا کہ صبر کرو، پانچ دن کا معاملہ اور ہے۔ چنانچہ پانچ دن کے بعد مہدی واصلِ جہنم ہو گیا۔

● آپ کا عقد جناب نرجس سے ہوا جو قیصرِ روم کی پوتی اور جناب شمعون وصی حضرت عیسیٰ کی نواسی ہوتی تھیں اور انتہائی پاکباز اور مقدس خاتون تھیں، جنھیں رب العالمین نے آخری حجت پروردگار کی مادرِ گرامی بننے کا شرف عنایت فرمایا تھا۔

علوم وکمالات

● ملا جامی رقم طراز ہیں کہ ایک شخص نے اپنے والد کے ساتھ امام حسن عسکریؑ سے ملاقات کا قصد کیا اور ارادہ یہ تھا کہ حضرت سے ۸۰۰ درہم قرض کا مطالبہ کریں گے۔ اتفاق سے حضرت کا اس طرف سے گزر ہو گیا لیکن یہ دونوں آپ سے باخبر نہیں تھے۔ آپ خود ان کے قریب گئے اور انھیں ۸۰۰ درہم دے دیے جس پر ان دونوں کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ دلوں کے حالات سے کس طرح باخبر ہو گئے۔

● قید خانہ میں رہنے والے ایک قیدی نے آپ سے رہائی کی دعا کی درخواست کی اور غربت کا تذکرہ کرنے میں شرم محسوس کی تو آپ نے رہائی کے حق میں دعا فرمائی اور فرمایا کہ جس بات کا تم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس سلسلہ میں میں عنقریب سو دینار بھیج دوں گا۔

● ایک شخص نے آپ کو خط لکھا اور اس میں مشکوٰۃ کے معنی دریافت کیے اور اپنی حاملہ عورت کے سلسلہ میں فرزند نرینہ کی ولادت کی درخواست کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مشکوٰۃ سے مراد قلب مرسل اعظمؐ ہے اور خدا تجھے اولاد کے بارے میں صبر دے اور نعم البدل عطا کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ لڑکا مُردہ پیدا ہوا اور خدا نے اس کے بعد دوسرا فرزند عطا فرمایا۔

● حسن بن ظریف نامی شخص نے ظہورِ امام عصرؑ کا وقت دریافت کیا تو فرمایا اس کا تعلق مصلحتِ الٰہی

سے ہے اور تم نے بخار کے بارے میں سوال نہیں کیا تو اس کا علاج یہ ہے کہ يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا لکھ کر گلے میں لٹکا دو بخار زائل ہو جائے گا۔

● واضح رہے کہ تفسیرِ عسکریؑ براہِ راست امام حسن عسکریؑ سے متعلق نہ بھی ہو تو بھی اس کتاب سے اس امر کا ثبوت بہرحال مل جاتا ہے کہ امام علیہ السلام نے تفسیر کے بارے میں اس قدر تشریحات بیان فرمائی ہیں کہ ان کے مجموعہ سے ایک کتاب تفسیر تیار ہو سکتی ہے اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ نے قرآن کے ساتھ اہلبیت طاہرینؑ کو اسی لیے چھوڑا تھا کہ وہ قرآن کے معانی و مطالب اور حقائق و معارف کی تشریح و تفسیر کریں گے ورنہ اصل قرآن کے الفاظ تو امتِ اسلامیہ کے پاس کل بھی محفوظ تھے اور آج بھی محفوظ ہیں لیکن اس کے باوجود اسی قرآن سے ۷۳ فرقے پیدا کر لیے گئے ہیں اور آج تک تفرقہ پردازی کا سلسلہ جاری ہے اور ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ اس کا مسلک و مذہب اسی قرآن مجید سے ہم آہنگ ہے اور باقی سارے مذاہب قرآن حکیم سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

● امام حسن عسکریؑ کو دیگر ائمہ طاہرین کی طرح یہ تائیدِ الٰہی بھی حاصل تھی کہ آپ لکھتے لکھتے قلم کو رکھ دیتے تھے تو بحکمِ الٰہی قلم خود بخود حرکت کرتا تھا اور عبارت مکمل ہو جاتی تھی اور یہ بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، اس لیے کہ ائمہ طاہرینؑ سوائے مشیتِ الٰہی کے اور کوئی قصد و ارادہ نہیں رکھتے تھے تو پروردگار نے بھی انھیں محلِ مشیتِ الٰہی قرار دے دیا تھا۔ ایسی صورت میں وہ وہی لکھتے تھے جو خدا چاہتا تھا اور جب کام خدا کی مشیت کے مطابق ہی ہونا تھا تو قدرت کے لیے دونوں امکانات تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ امامؑ ہی کے دستِ مبارک کو ذریعہ قرار دے اور یہ بھی ممکن تھا کہ امامؑ کی نیتِ خالص پر اعتماد کر کے دیگر وسائلِ غیبی سے اس کے مقصد کی تکمیل کر دے کہ بالآخر ان کا مقصد بھی وہی ہے جو مقصد پروردگار ہے۔

● امام حسن عسکریؑ کے علم بالقرآن کے بارے میں یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ جب اس دور کے سرپھرے فلسفی اسحاق کندی نے تناقضات القرآن لکھنا شروع کی اور آیات کو یکجا کر کے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ قرآن مجید کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے اور وہ ایک مقام پر ایک بیان دیتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کے بالکل برعکس بولتا ہے جب کہ یہ بات شانِ تنزیل کے بالکل

خلاف ہے تو امام حسن عسکریؑ نے اسحاق کے ایک شاگرد سے فرمایا کہ تم اپنے استاد کو ایسی حرکت سے منع کیوں نہیں کرتے ہو۔ اس نے معذرت ظاہر کی تو آپ نے فرمایا کہ اچھا اس سے کم سے کم اتنا سوال تو کرو کہ یہ تضاد اور تناقض تمھارے سمجھے ہوئے معانی میں ہے یا مراد الٰہی میں ہے۔ اگر مراد الٰہی میں ہے تو مراد الٰہی کے سمجھنے کا ذریعہ کیا تھا اور اگر تمھاری سمجھ میں ہے تو صاحب کلام کسی کی سمجھ کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔

شاگرد نے ایک دن موقع پاکر اسحاق سے یہ سوال کر دیا اور وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس نے صرف یہ سوال کیا کہ یہ بات تمھیں کس نے بتائی ہے؟۔ اس نے کہا کہ یہ میرے ذہن کی پیداوار ہے۔ اسحاق نے کہا کہ جو بات تمھارے استاد کے ذہن میں نہیں آئی ہے وہ تمھارے ذہن میں کہاں سے آگئی ہے؟ صحیح صحیح مدرک کا پتہ بتاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ بات حضرت حسن عسکریؑ نے بتائی ہے۔ اسحاق نے کہا کہ "الآن جئت بہ" اب تم نے صحیح بات بیان کی ہے۔ اس قسم کی گفتگو اس گھرانے کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے سارے نوشتہ کو نذر آتش کر دیا۔ (مناقب ابن شہر آشوب، بحار الانوار)

اس واقعہ سے اس حقیقت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے بیانات کے واقعی اتحاد و اتفاق کا سمجھنا اس امر پر موقوف ہے کہ انسان واقعی مراد الٰہی سے باخبر ہو ورنہ اس کے بغیر تضاد و تناقض کا احساس بھی کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے اور اکثر مفسرین اسی مشکل میں گرفتار رہتے ہیں اور قرآن مجید کی آیتوں میں اتحاد و اتفاق ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کا ادراک ظاہری معانی سے آگے نہیں ہوتا ہے اور ظاہری معانی کے اعتبار سے بعض اوقات تناقض اور تضاد کا احساس بہر حال ہونے لگتا ہے۔

رسول اکرمؐ نے اتنی بڑی امت اسلامیہ اور اتنی کثیر صحابہ کرام کی جماعت کے باوجود عترت و اہلبیتؑ سے تمسک کا حکم اسی لیے دیا تھا کہ امت کے پاس تعلیم و تعلم کا علم ہے اور اس کا علم استاد اور مدرسہ کا مرہون منت ہے اور استاد و مدرسہ کا علم بہر حال ظاہری معانی تک ہی محدود رہتا ہے۔ اہلبیت طاہرینؑ وہ افراد ہیں جنھیں پروردگار عالم نے الہام و القاء کے ذریعہ حقائق و معارف سے آگاہ کیا ہے اور وہ مراد الٰہی سے باخبر ہیں لہٰذا ان کے بیان کردہ معانی میں تضاد اور اختلاف

کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اسحاق کندی مر گیا لیکن اس کے بعد بھی ہر دور میں کندی پیدا ہوتے رہے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے اور جب تک دنیا میں کندیوں کی پیداوار کا سلسلہ جاری رہے گا امت اسلامیہ اہلبیت طاہرینؑ کی تفسیر و تشریح سے بے نیاز نہیں ہو سکتی ہے اور اہلبیت طاہرینؑ کی ضرورت کا احساس بہر حال باقی رہے گا۔

کرامات

جعفر بن شریف جرجانی کا بیان ہے کہ میں حج بیت اللہ کے بعد حضرت کی خدمت میں سامرہ میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کی کہ اہل جرجان آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں کبھی ان چاہنے والوں کو بھی اپنی زیارت سے مشرف فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تم ۱۷۰ دن کے بعد بروز جمعہ ۳ ربیع الثانی کو وطن پہونچو گے اور اسی دن میں بھی پہونچوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جعفر کے اعلان کے تھوڑی دیر بعد بلا وہم و گمان حضرت کا نزول اجلال ہو گیا اور امامت کی معرفت اور کرامت دونوں کا بیک وقت اظہار ہو گیا۔ بلکہ ایک شخص نضر بن جابر نے اپنے نابینا فرزند کی بینائی کے بارے میں دعا کی درخواست کی تو آپ نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر اسے بینا بنا دیا اور پھر اسی روز واپس بھی تشریف لے گئے۔ (کشف الغمہ)

● ایک شخص نے آپ کو بغیر روشنائی کے خط لکھا تو آپ نے بھی اسی انداز سے خط کا جواب لکھ دیا اور لکھنے والے کا نام اور ولدیت کا بھی تذکرہ فرما دیا جس کے بعد وہ ایمان لائے بغیر نہ رہ سکا۔ (دمعۂ ساکبہ)

● ابو ہاشم کا بیان ہے کہ حضرت صحرا کی طرف تشریف لے جا رہے تھے تو میں بھی ساتھ چل دیا۔ راستہ میں خیال پیدا ہوا کہ میرے ذمہ جو قرض ہے اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اب میں کس طرح ادا کروں گا تو اچانک حضرتؑ نے جھک کر زمین پر ایک نشان لگا دیا اور فرمایا کہ ابو ہاشم اسے اٹھا لو اور قرض ادا کر دو۔ ابو ہاشم نے دیکھا کہ سونا ہے اور اسے حسب الحکم محفوظ کر لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پھر خیال پیدا ہوا کہ سردی قریب آگئی ہے، سردی کے کپڑے وغیرہ کا کیا ہوگا۔ تو آپ نے دوبارہ زمین پر تازیانہ مارا اور فرمایا کہ اسے بھی اٹھا لو۔ ابو ہاشم نے وہ سونا بھی لے لیا اور گھر آکر

حساب کیا تو پہلے کی مقدار بالکل قرض کے برابر تھی اور دوسرے کی مقدار بالکل ضروریات کے برابر تھی۔

● ایک مرتبہ ابو ہاشم سے واضح طور پر فرمایا کہ اپنی ضروریات بیان کرنے میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ ہم بحکم پروردگار انھیں پورا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ چاہنے والوں کے ضروریات کا خیال رکھیں۔

● اسماعیل بن محمد بن علی بن اسماعیل بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ میں سرِراہ بیٹھا تھا کہ امام حسن عسکریؑ کا گذر ہوگیا اور میں نے اپنی غربت کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ دوسو اشرفی دفینہ کرکے بھی غربت کا نام لیتے ہو۔ میں نے انکار کیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تو فرمایا جھوٹ مت بولو۔ میں تمھیں سو دینار دیے دیتا ہوں لیکن وہ دوسو تمھارے کام نہ آئیں گے۔ چنانچہ آپ نے سو دینار دے دیے اور انھوں نے لے لیے۔ اس کے بعد ایک عرصہ کے بعد جب پیسے کی ضرورت ہوئی اور دفینہ نکالنے گئے' تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اور بعد میں انکشاف ہوا کہ ان کے لڑکے کو اس دفینہ کا علم ہوگیا تھا اور اس نے نکال لیا تھا۔ اور اس طرح امام علیہ السلام کی کرامت کا بھی اظہار ہوگیا۔

● تاریخ اسلام میں ایک نمایاں شخصیت ام خانم کی ہے جسے صاحبۃ الحصاۃ کہا جاتا ہے۔ ان خاتون کا طریقہ تھا کہ ائمہ معصومینؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے امامت کا ثبوت طلب کیا کرتی تھیں اور سنگ ریزوں پر مہر لگوالیا کرتی تھیں اور یہی اس امام کی امامت کا ثبوت ہوا کرتا تھا۔ امام حسن عسکریؑ کے دور میں ان کا انتقال ہوچکا تھا تو ان کے ایک فرزند مجمع بن الصلت بن عقبہ بن سمعان بن خانم بن ام خانم نے امام عسکریؑ کو تلاش کرنا شروع کیا کہ ان سے ثبوت امامت حاصل کریں۔ اتفاق سے امامؑ کی نظر اس شخص پر پڑ گئی تو آپ نے فرمایا کہ لاؤ سنگ ریزے لاؤ تاکہ میں امامت کی مہر لگادوں۔ مجمع بن الصلت حیران رہ گئے کہ انھیں دل کے حالات کا کس طرح علم ہوگیا اور پھر مہر لگواکر اپنے دل کو مطمئن کرلیا۔ (اصول کافی۔ شواہد النبوۃ)

● ایک مرتبہ آپ کے دور میں قحط پڑا اور مسلمان بے حد پریشان ہوئے اور سب نے نماز استسقاء پڑھی اور دعائیں بھی کیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ایک عیسائی راہب میدان میں آیا اور اس نے

دعا شروع کی۔ دعا کے لیے ہاتھوں کا اٹھانا تھا کہ بارش شروع ہوگئی اور سارے مسلمان حیرت میں پڑ گئے' اور بہت سے افراد کا ایمان متزلزل ہوگیا کہ حق اس راہب کے ساتھ ہے۔ دوسرے روز پھر ایسا ہی ہوا تو لوگوں کا اعتماد راہب پر مزید بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ اس گمراہی کی خبر امام حسن عسکریؑ کو دی گئی، تو آپ نے فرمایا کہ جب سب میدان میں جمع ہوجائیں تو مجھے طلب کرلینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جیسے ہی راہب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ آپ نے اس کی انگلیوں کے درمیان دبی ہوئی استخوان کو نکال لیا اور آئے ہوئے بادل واپس ہوگئے۔ مجمع حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ کیا ہوا اور راہب بھی شرمندہ ہوگیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بارانِ رحمت راہب کی دعا کا اثر نہیں ہے۔ اس کے پاس ایک نبی خدا کی ہڈی ہے جس کی کرامت یہ ہے کہ جب زیر آسمان کھل جاتی ہے تو رحمت الٰہی کو جوش آجاتا ہے۔ اس کے بعد راہب زندگی بھر دعا کرے تو اس کی دعا سے بارش نہیں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت نے دعا کی اور باقاعدہ بارش ہوگئی جس کے ذریعہ امت اسلامیہ کو حضرت کے کمال علم کا بھی اندازہ ہوگیا اور کمال کرامت کا بھی۔ (صواعق محرقہ)

● یہ واقعہ امام علیہ السلام کے لیے نہایت سنگین نتائج کا حامل ہوگیا کہ حکومت وقت نے محسوس کرلیا کہ دنیا کو ان کی کرامت کا علم ہوگیا ہے اور اب ان کے ہوتے ہوئے اپنی حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ آپ کو قید خانہ کے حوالے کردیا گیا اور داروغۂ زندان کو یہ ہدایت کردی گئی کہ جس قدر ممکن ہو آپ کو اذیت دی جائے اور اسی اذیت کا اثر تھا کہ آپ ۲۸ سال سے زیادہ اس دار دنیا میں نہ رہ سکے اور ۲۶۰ھ میں زہر دغا کے زیر اثر دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوگئے۔

اقوال حکیمانہ

● "لوگوں سے بے جا بحث مت کرو کہ تمھاری آبرو ختم ہوجائے گی۔ اور زیادہ مذاق نہ کرو کہ لوگوں کو تم سے بات کرنے کی جرأت پیدا ہوجائے گی۔"

(یہ ایک عجیب و غریب نفسیاتی نکتہ ہے جس کا صبح و شام مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ زیادہ مزاح کرنے والے انسان کی کوئی ہیبت نہیں رہ جاتی ہے اور ہر شخص اس کا جواب دینے کی جرأت پیدا کرلیتا

ہے اور یہی حال جھگڑا کرنے والے کا ہوتا ہے کہ پھر اس کا حُسن و جمال ختم ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتا ہے۔)

● "تواضع کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جس شخص کے پاس سے گذرو اسے سلام کرو اور کسی مجلس میں جاؤ تو بلند ترین جگہ تلاش کرنے کے بجائے اس سے کمتر جگہ پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

(یہ انتہائی عظیم نکتہ ہے جس سے بڑے سے بڑے غرور اور تکبّر کا علاج کیا جا سکتا ہے اور اگر انسان اپنے نفس کی اصلاح کی طرف مائل ہو اور اپنے نفسانی حالات کو درست کرنا چاہتا ہو تو اس سے بہتر طریقۂ کار نہیں ہو سکتا ہے۔)

● "محتاط ترین انسان وہ ہے جو مشتبہ مقامات پر رُک جائے، اور عابد ترین انسان وہ ہے جو فرائض کی پابندی کرے، اور زاہد ترین انسان وہ ہے جو حرام کو ترک کر دے، اور سخت ترین جہاد کرنے والا وہ ہے جو تمام گناہوں کو ترک کر دے۔"

● "احمق کا دل اس کی زبان میں ہوتا ہے اور حکیم کی زبان اس کے دل میں ہوتی ہے۔"

(یعنی احمق انسان سوچنے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح زبان آگے آجاتی ہے اور دل پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور صاحب حکمت پہلے فکر کرتا ہے اس کے بعد زبان کھولتا ہے تو گویا اس کی زبان بھی دل کے اندر رہتی ہے اور دل کا دریچہ کھولے بغیر کلام کرنے کی طاقت نہیں ہو پاتی ہے۔)

● "جس رزق کی ضمانت دے دی گئی ہے وہ تمھیں اس عمل سے نہ روک دے جو تم پر فرض کر دیا گیا ہے۔"

(انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اپنے فرائض سے غافل ہو جاتا ہے جن کا ادا کرنا اس کی اپنی ذمہ داری ہے اور سارا وقت رزق کی جستجو میں صَرف کر دیتا ہے جس کی ضمانت پروردگار عالم نے لے لی ہے اور وہ بہر حال عطا کرنے والا ہے۔)

● "کسی غم رسیدہ کے سامنے خوشی کا اظہار کرنا ادب و تہذیب کے خلاف ہے۔"

(یہ بھی ایک اخلاقی نکتہ ہونے کے علاوہ ایک درد دل کا اظہار بھی ہے جس کا احساس اسی انسان کو ہو سکتا ہے جو ایسے حالات سے گذر رہا ہو جہاں اس پر مصائب کا ہجوم ہو اور دنیا

اس کے غم میں ہمدردی کرنے کے بجائے تفریحات میں مشغول ہو۔)

● "جاہل انسان کی تربیت کرنا اور کسی صاحب عادت کو اس کی عادت سے باز رکھنا کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔"

(اس حقیقت کا اندازہ بھی اسی انسان کو ہو سکتا ہے جس کے فرائض میں جاہل قوم کی تربیت اور بدترین عادات میں مبتلا انسانیت کو ان عادات سے الگ کرنے کی ذمہ داری شامل ہو۔ وہی یہ جانتا ہے کہ معجزہ میں کس قدر زحمت ہوتی ہے اور اس اخلاقی تربیت میں کن زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔)

● "کسی شخص کا احترام اُس بات کے ذریعہ نہ کرو جو اس کے لیے باعث زحمت ہو۔"

(اس نکتہ کا اندازہ بھی اس وقت ہوتا ہے جب مومنین کرام کسی بڑی شخصیت کا جلوس نکالنا چاہتے ہیں یا اس کی محفل میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو جاتے ہیں اور اسے سانس لینے کا موقع نہیں دیتے ہیں اور اسے انتہائے احترام کا درجہ دیتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عالم دین کے احترام میں اسے بہ شکل جلوس میلوں پیدل چلا دیتے ہیں اور اسے بھی انتہائی احترام ہی سمجھتے ہیں۔ امام حسن عسکریؑ نے ایسے ہی احترامات سے منع فرمایا ہے کہ احترام وہ ہے جو باعث آرام ہو نہ کہ باعث اذیت و آزار ہو۔)

● "جس شخص نے اپنے برادر مومن کو تنہائی میں نصیحت کی اس نے اسے آراستہ بنانے کی کوشش کی اور جس نے مجمع عام میں نصیحت کی اس نے اسے عیب دار بنا دیا۔"

(نصیحت ایک بہترین عمل ہے لیکن اس کے اسالیب و انداز اور نتائج پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجمع عام میں نصیحت لوگوں کو اس کے عیب سے باخبر کر دے اور اس طرح اصلاح کے بجائے اس کی توہین و تذلیل کا سامان فراہم ہو جائے۔)

● "جو اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے وحشت محسوس کرتا ہے۔"

(انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانوں سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ مصلّی پر خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہونے سے وحشت محسوس کرتا ہے اور لوگوں کی گفتگو کے مقابلہ میں کلام خدا کی تلاوت سے وحشت محسوس کرتا ہے۔ امام عسکریؑ نے اسی نکتہ کی طرف توجہ

دلائی ہے کہ لوگوں سے مانوس ہو کر خدا سے وحشت کرنے کے بجائے خدا سے انس پیدا کر دتا کہ اس کے مقابلہ میں ان انسانوں سے وحشت پیدا ہو جن کا خدا سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور جن کی یادِ یادِ خدا سے غافل بنا دیتی ہے۔ انس ہو تو ایسے انسانوں سے ہو جو خود بھی خدا کو یاد کر لیتے ہوں اور ان سے اُنس یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہو۔)

● "ہر شے کی ایک مقدار اور حد معین ہے جس سے زیادتی نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جود و کرم کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانے کے بعد انسان اسراف کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور احتیاط کی بھی ایک حد معین ہے جس سے تجاوز کر جانے کے بعد بزدلی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اقتصاد و اعتدال کی بھی ایک حد ہے جس کی زیادتی بخیل بنا دیتی ہے اور شجاعت کی بھی ایک مقدار ہے جس کی زیادتی تہور اور بے باکی پیدا کر دیتی ہے اور تہذیب نفس کا سب سے بہترین ذریعہ یہ ہے کہ جس چیز کو دوسرے کے لیے ناپسند کرے اسے اپنے لیے بھی ناپسندیدہ ہی قرار دے۔"

● "مومن کے کمال ایمان کی پانچ علامتیں ہیں: (۱) بلند آواز سے بسم اللہ کہے (۲) خاک پر سجدہ کرے (۳) داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنے (۴) دن رات میں ۵۱ رکعت نماز ادا کرے (۵) روز اربعین امام حسینؑ کی زیارت پڑھے۔"

اس روایت میں ان امور کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں عام طور سے امت اسلامیہ نے نظر انداز کر دیا ہے اور ان میں کوئی نہ کوئی تحریف ضرور کر دی ہے ورنہ ایمان کی علامتیں اس کے علاوہ بھی ہیں اور بہت سی ہیں جیسا کہ خود امام حسن عسکریؑ کی دوسری روایت میں پانچ مزید چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان علامات کے بارے میں مختصر گذارش یہ ہے کہ عالم اسلام نے بسم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیے ہیں۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ بسم اللہ کوئی آیت ہے یا نہیں۔

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اگر آیت ہے تو صرف سورۂ حمد کا جزء ہے یا باقی سوروں کے جزء کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ سورہ کا جزء ہے تو سورہ ہی کی طرح بلند آواز سے پڑھی جائے یا اسے خاص طریقہ سے آہستہ پڑھا جائے۔

ائمہ طاہرینؑ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور یہ ہر سورہ کا ایک جزء ہے (سورۂ توبہ کے علاوہ) اور اس کا بلند آواز سے پڑھنا بھی مستحب ہے چاہے نماز اخفاتی ہی کیوں نہ ہو اور اصل سورہ کو آہستہ ہی پڑھا جا رہا ہو اور یہ طریقہ دورِ پیغمبر اسلامؐ سے رائج تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب معاویہ نے بسم اللہ کی تلاوت نہیں کی تو مجمع میں ایک شور برپا ہو گیا کہ اس نے ایک آیت کی چوری کی ہے اور اسے غائب کر دیا ہے۔

خاک پر سجدہ کرنے کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ اگرچہ سجدہ خاک اور خاک سے اُگنے والی چیزوں پر ہو سکتا ہے اگر اسے کھانے اور پہننے میں استعمال نہ کیا جاتا ہو لیکن خاک کی فضیلت بہرحال اپنے مقام پر مسلم ہے اور اس میں خاک کربلا کی افضلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خاک پر سجدہ کرنا خاکساری کی علامت ہے اور خاک کربلا پر سجدہ کرنا بندگی کے استحکام کا ذریعہ ہے کہ یہ راہ عبودیت میں قربانی کی سب سے بڑی قربان گاہ ہے اور اس خاک میں وہ تمام یادیں جذب ہیں جو یادِ خدا کا بہترین ذریعہ ہیں۔

انگوٹھی کے بارے میں عالم اسلام میں اس کے پہننے کا استحباب تو موجود ہے لیکن بعض علماء اسلام نے اسے بائیں ہاتھ میں پہننے پر زور دیا ہے کہ داہنے ہاتھ میں پہننا شیعوں نے اپنا شعار اور طریقہ بنا لیا ہے تو اس کی مخالفت ضروری ہے، اگرچہ یہی طریقہ سنت پیغمبرؐ کے مطابق بھی ہے لیکن اس سنت کا ترک کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس طرح دیگر اقوام اور مذاہب سے مشابہت نہ ہونے پائے۔

امام حسن عسکریؑ نے صاحبانِ ایمان کو اسی نکتہ کی طرف متوجہ کیا کہ اگر دوسرے مذاہب کے لوگ صرف تمھاری ضد میں سیرتِ پیغمبرؐ کو ترک کر سکتے ہیں تو تمھارا بھی فرض ہے کہ تم سیرتِ پیغمبرؐ کا مکمل اتباع کرتے رہو اور اسی کو اپنا شعار بنائے رہو تاکہ سیرتِ پیغمبرؐ پر عمل کرنے والے اور سیرت سے اجتناب کرنے والے افراد کا فرق واضح ہو جائے اور حقیقی ایمان اور دعوائے ایمان و اسلام الگ الگ ہو جائے۔

انگوٹھی کے بارے میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ائمہ طاہرینؑ نے انگشتری کے ساتھ اس کے

نگینہ کے نقش کو بھی خاصی اہمیت دی ہے اور روایات میں ہر امام کی انگشتری کے نقش کا تذکرہ بھی موجود ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امام نے اسے بھی تبلیغ مذہب کا ایک ذریعہ بنالیا تھا اور ہر امامؑ نے وہی نقش اختیار کیا تھا جو اس دور کے لیے مناسب اور اس کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا جس کے تفصیلات کا اندازہ ہر امامؑ کے نقش انگشتری پر تحقیقی نظر ڈالنے ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

۵۱ رکعت نماز سے مراد ۱۷ رکعت فرض اور ۳۴ رکعت نوافل ہیں جنھیں فرائض کی تکمیل اور بندگی کی معراج کے لیے مستحب قرار دیا گیا ہے۔

روز اربعین زیارت امام حسینؑ میں سیرت امام سجادؑ کا اتباع بھی ہے اور بنی امیہ کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے کہ بنی امیہ کے مظالم نے اہلِ حرم حسینی کو امام حسینؑ کا چہلم بھی نہیں کرنے دیا اور سال تمام ہونے کے بعد جب انھیں قید شام سے رہا کیا گیا تو روز اربعین کربلا آکر امام حسینؑ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور گویا کہ پہلی مرتبہ وارثوں نے اپنے شہیدوں کی قبروں کا مشاہدہ کیا جب کہ ان کی شہادت کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کو دیکھنے کے بعد اس حقیقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام حسن عسکریؑ نے ایمان کامل کی علامتوں میں واجبات کا شمار نہیں کیا ہے بلکہ صرف مستحبات کا تذکرہ کیا ہے جو اس بات کی کھلی علامت ہے کہ واجبات کا تعلق کمال اسلام سے ہے اور مستحبات کا تعلق کمال ایمان سے ہے۔ مومن کامل وہ نہیں ہے جو فرائض اور واجبات سے غافل ہو جائے، بلکہ مومن کامل وہ ہے جو واجبات کے ساتھ مستحبات کا بھی خیال رکھے اور ان مستحبات کو بھی اپنے روزانہ اور سالانہ پروگرام میں شامل رکھے۔ زبان کے اعتبار سے بلند آواز سے بسم اللہ کہے، پیشانی کے اعتبار سے خاک پر سجدہ کرے، ہاتھ کے اعتبار سے داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہنے، یومیہ عمل کے اعتبار سے ۵۱ رکعت نماز ادا کرے اور سالانہ عمل کے اعتبار سے زیارت اربعین کی پابندی کرے۔

شہادت

یوں تو ائمہ معصومینؑ کی زندگیاں ہمیشہ حکام وقت کی طرف سے مصائب و مظالم کا نشانہ

رہی ہیں اور شائد ہی کوئی ایسا حاکم رہا ہو جس نے اپنی حکومت کا ایک اہم مقصد آل محمدؐ پر ظلم و ستم کو نہ قرار دیا ہو لیکن امام حسن عسکریؑ کی زندگی ایک عجیب و غریب مصیبت کا نشانہ رہی ہے جس کی مثال دیگر معصومینؑ کی زندگیوں میں بھی نہیں ملتی ہے اور اس کا اہم ترین راز یہ ہے کہ عالم اسلام نے دور پیغمبر اسلامؐ سے یہ بات سُن رکھی تھی کہ میرا بارہواں وارث وہ حجت پروردگار ہوگا جو ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کردے گا اور دنیا کے ہر نظام ظلم کا تختہ اُلٹ دے گا۔ اس بنا پر حکام وقت ہر دور میں اس نکتہ کی طرف متوجہ رہے کہ وہ مہدی دوراں منظر عام پر نہ آنے پائے ــــ امام حسن عسکریؑ کے دَور تک یہ اطمینان تھا کہ مہدی اولاد حسینؑ کا نواں ہوگا ــ اور ابھی اولاد حسینؑ کے آٹھ افراد پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن امام عسکریؑ کا دَور آنے تک ہر صاحب علم و خبر کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اب وجود مہدی کا دَور قریب آگیا ہے اور وہ انھیں کی اولاد میں ہوگا۔ چنانچہ امام عسکریؑ کی خصوصی نگرانی شروع ہوگئی اور آپ کے گھر کے ساتھ وہی سلوک طے کرلیا گیا جو فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ روا رکھا تھا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ فرزند دنیا میں آنے پائے جو فرعون کے تخت و تاج کو تباہ و برباد کردے گا۔

حکام زمانہ کا اب تک یہ طریقہ کار تھا کہ ائمہ طاہرینؑ کو قید خانوں میں رکھتے تھے اور اگر قوم میں بغاوت کا خطرہ پیدا ہوگیا یا نگران قید خانہ حکومت کے خیال میں کردار معصومینؑ سے متاثر ہوکر منحرف ہونے لگا تو امامؑ کو گھر میں نظر بند کردیا لیکن امام عسکریؑ کے ساتھ برتاؤ میں حکام کی پریشانی یہ بھی تھی کہ قید خانہ میں رکھیں تو وہی حشر ہوگا کہ تمام نگرانِ زندان امامؑ کے کردار سے متاثر ہوجائیں گے اور تقریباً سب ہی نے ظلم و ستم سے انکار بھی کردیا۔ اس کے بعد گھر میں نظر بند کرنا چاہیں تو یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح وہ آخری حجت پروردگار منظر عام پر آجائے گا جس سے اپنے تخت و تاج کو خطرہ ہے۔ چنانچہ ابتدا میں آپ کو قید خانہ میں رکھا گیا اور داروغہ زنداں کو خصوصی ہدایت دی گئی کہ امام علیہ السلام کو زیادہ سے زیادہ اذیت دے لیکن جب دیکھ لیا کہ اس تاکید کا کوئی اثر نہیں ہورہا ہے تو اپنے قصر کے ایک گوشہ میں نظر بند کردیا تاکہ اپنی نگرانی میں رہیں اور لوگوں میں کوئی حیثیت نہ پیدا کرنے پائیں لیکن جب یہ احساس پیدا ہوا کہ اس طرح قصر کے نگراں سپاہیوں کے بھی گرویدہ ہوجانے کا خطرہ ہے تو مجبور ہوکر حضرت کو ان کے گھر میں نظر بند کردیا گیا، اور

اس طرح خدائے موسیٰ نے ایک اور موسیٰ کی ولادت کا انتظام کر دیا اور ماہ شعبان کی پندرہویں تاریخ ۲۵۵ھ کو وہ حجت پروردگار اس دنیا میں آگیا جس کی خبر دورِ پیغمبر اسلامؐ سے برابر دی جا رہی تھی اور جس کا انتظار ہر دور کے مظلومین اور مستضعفین کر رہے تھے اور اس طرح ظالم حکومتوں کے لیے وہ خطرہ منظر عام پر آگیا جس کے تصور سے راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں۔

امام حسن عسکریؑ کے کردار کے بارے میں علامہ مجلسیؒ نے نہایت تفصیل کے ساتھ احمد بن عبید اللہ بن خاقان کا بیان نقل کیا ہے جو قم میں خلفاء اسلام کی طرف سے والیٔ اوقاف وصدقات تھا اور انتہائی درجہ کا دشمن اہلبیتؑ تھا۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ میں نے سامرہ میں حسن عسکریؑ سے زیادہ مومن، متقی، صالح، پاکباز اور مقدس انسان نہیں دیکھا۔ میرے والد کا طریقہ تھا کہ جب وہ دربار میں آجاتے تھے تو نہایت احترام سے انھیں صدر مجلس میں جگہ دیتے تھے اور یا ابن الرضا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ان کی نگاہ میں حسن عسکریؑ کا مرتبہ خلفاء اسلام سے بھی زیادہ بلند تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے تنہائی میں اعتراض کیا تو فرمایا کہ فرزند اس سے بہتر کوئی انسان دنیا میں نہیں ہے اور خلافت بنی عباس سے نکل سکتی تو اس کے علاوہ کوئی اس کا حق دار نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک دن ان کی موجودگی میں خلیفہ وقت آگیا تو جب تک انھیں دوسرے دروازہ سے رخصت نہیں کر دیا خلیفہ کی طرف توجہ بھی نہیں کی اور اس کا استقبال بھی نہیں کیا۔

میں نے ایک دن اتنا کہہ دیا کہ اگر یہ اولادِ رسولؐ میں ہیں تو ان کے بھائی جعفر بھی تو ایسے ہی ہیں، ان کا اس قدر احترام کیوں نہیں کیا جاتا؟ تو میرے والد نے بگڑ کر کہا کہ خبردار! ان کے ساتھ جعفر کا نام بھی نہ لینا وہ ایک انتہائی بدکردار شخص ہے اور یہ ایک انتہائی مقدس اور پاکیزہ کردار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا جعفر سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

خلفاء اسلام کو انھیں حالات سے پریشانی تھی یہاں تک کہ معتمد نے آپ کو زہر دلوا دیا اور جب یہ خبر عام ہوئی کہ امام علیہ السلام کی حالت غیر ہو رہی ہے تو فوراً اطباء کو علاج کے لیے طلب کر لیا اور زعماء مملکت کے ساتھ دس عدد علماء بھی جمع کر لیے جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ طبیعی بیماری کے اعتبار سے مریض ہیں اور انھیں زہر نہیں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے گواہی دے دی اور اس وقت تک وہاں حاضر رہے جب تک امامؑ کی شہادت نہیں واقع ہو گئی، اور

چونکہ آپ کے گھر میں صرف آپ کا غلام عقید اور آپ کی زوجہ جناب صیقل تھیں لہٰذا ان کا بھی شدت سے محاسبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ فرزند نہ پیدا ہو جائے جو تخت و تاج کو منقلب کرنے والا ہو۔ اور اس بات کی کسی کو اطلاع بھی نہ تھی کہ وہ حجت پروردگار چار برس پہلے ہی اس دنیا میں آچکا ہے۔

امامؑ کے انتقال کے بعد جنازہ تیار ہوا اور بظاہر نماز جنازہ بھی ادا کر دی گئی لیکن وارث کی تلاش برابر جاری رہی، یہاں تک کہ جعفر نے وراثت کا دعویٰ کیا اور میرے باپ کو دو لاکھ دینار رشوت دینے کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ امامت دولت سے نہیں ملا کرتی ہے اس کے لیے کردار ضروری ہوا کرتا ہے۔

● ابوالادیان کا بیان ہے کہ میں امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا اور آپ کے خطوط لوگوں تک پہونچایا کرتا تھا۔ جب آپ نے آخری مرتبہ خطوط دیے تو فرمایا کہ پندرہ دن کے بعد تم مدائن سے واپس آؤ گے تو اس گھر سے نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوں گی۔ میں نے عرض کی کہ آپ کا وارث کون ہوگا۔ فرمایا کہ جو خطوط کے جوابات طلب کرے اور میری نماز جنازہ ادا کرے اور تم سے تھیلی کا مطالبہ کرے۔

میں خطوط لے کر رخصت ہو گیا اور پندرہ دن کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ امام عسکریؑ کا انتقال ہو گیا ہے۔ در دولت کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ جعفر وارث بنے بیٹھے ہیں اور لوگوں سے پرسہ قبول کر رہے ہیں۔ میں ان کے کردار سے بخوبی واقف تھا لہٰذا مجھے ان کی امامت کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ جب جنازہ تیار ہو گیا اور وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک کمسن فرزند نے ان کا دامن کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا اور نماز جنازہ خود ادا کی اور پھر مجھ سے خطوط کے جوابات کا تقاضا کیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ اب زمانہ کے امام یہی ہیں۔ لیکن ابھی ایک علامت باقی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد خادم نے آکر کہا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ تمھارے پاس ایک تھیلی بھی ہے جس میں ہزار اشرفیاں ہیں اور ان میں سے دس پر صرف سونے کا ملمع ہے۔ میں نے فوراً طے کر لیا کہ امام حسن عسکریؑ کے وارث یہی ہیں اور ساری امانتیں ان کے حوالے کر دیں لیکن جعفر نے یہ صورت حال دیکھ کر معتمد کو خبر کر دی اور اس نے آپ کی اہلیہ محترمہ کو سخت نگرانی میں رکھا کہ اس فرزند کا پتہ بتائیں جو امام عسکریؑ کا وارث ہے اور چند سال قبل دنیا میں آچکا ہے۔

منزلِ اتمام تک پہونچانے والا ہے چاہے مشرکین کو کسی قدر ناگوار کیوں نہ ہو۔

آپ کی سیرت کے ذیل میں اولادِ رسولؐ کے احترام کے سلسلہ میں تاریخِ قم میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ابوالحسن حسین بن حسن بن جعفر بن محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادقؑ جو قم میں شراب خوری اور بداعمالیوں میں خاصی شہرت رکھتے تھے ایک مرتبہ کسی ضرورت سے احمد بن اسحاق اشعری کے پاس آئے جو قم میں وکیل اوقاف تھے اور ان سے کمک کا مطالبہ کرنا چاہا تو احمد بن اسحاق نے ان کے کردار کے پیش نظر ملاقات سے انکار کر دیا۔ اتفاق سے اسی سال احمد بن اسحاق نے حج کا ارادہ کیا اور ان کا گذر سامرہ سے ہوا۔ امام حسن عسکریؑ کی زیارت کے اشتیاق میں بیت الشرف کے دروازہ پر حاضر ہوئے، اذن باریابی طلب کیا تو حضرت نے انکار فرما دیا۔ انھوں نے بے حد گریہ کیا اور بہ مشکل تمام اجازت حاصل ہوئی اور عرض کی کہ سرکار آپ کی ناراضگی کا سبب کیا ہے؟ فرمایا کہ تم نے ایک سید کو اپنے یہاں داخلہ کی اجازت نہیں دی ہے۔ احمد بن اسحاق نے عرض کی کہ سرکار وہ شرابی آدمی ہے، میں نے اس کے کردار کی بنا پر انکار کر دیا تھا۔ فرمایا کچھ بھی ہو تمھیں نسبِ سیادت کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ احمد بن اسحاق نے معذرت کی اور اب جو وطن واپس آئے اور تمام لوگوں کے ساتھ حسین بن حسن بھی ملاقات کے لیے آئے تو سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ حسین نے حیرت زدہ ہو کر اس تعظیم کا سبب دریافت کیا۔ احمد نے کہا کہ یہ امام حسن عسکریؑ کا حکم ہے کہ اولادِ رسولؐ کا اس رشتہ کی بنا پر احترام کیا جائے چاہے ان کا کردار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بہرحال رسول اکرمؐ کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ حسین نے سر پیٹ لیا اور توبہ واستغفار کر کے تمام جام شراب توڑ کر پھینک دیے اور مسجد میں مستقل طور پر معتکف ہو گئے اور اسی عبادتِ الٰہی کے عالم میں انتقال کر گئے۔

ایسے واقعات سے اکثر افراد کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید نسبِ سیادت قانونِ شریعت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ اور سادات کی خاطر ان کے جد کی شریعت کو بھی پامال کیا جا سکتا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ واقعہ کی نوعیت خود ہی بتا رہی ہے کہ یہ ایک خصوصی واقعہ ہے جس میں امام حسن عسکریؑ کو یہ معلوم تھا کہ اس احترام کے بعد حسین بن حسن راہ راست پر آجائیں گے اور شراب خوری کو ترک کر دیں گے، اسی لیے آپ نے نسبت رسول اکرمؐ پر زیادہ زور دیا اور اسی نسبت کے احساس نے

حسین بن حسن میں انقلاب پیدا کر دیا۔

تو اس کا مطلب یہ تھا کہ عام افراد کا فرض ہے کہ وہ نسبتِ رسول اکرمؐ کی بنا پر سادات کا احترام کریں ــ اور خود سادات کا فرض ہے کہ اپنی مقدس نسبت کا لحاظ کر کے کوئی ایسا کام نہ کریں جو اس نسبت کے شایانِ شان نہ ہو اور رسول اکرمؐ کے لیے باعثِ توہین یا سبب بدنامی ہو۔

صحاب امام حسن عسکریؑ

۱۔ ابوعلی احمد بن اسحاق بن عبداللہ بن سعد بن مالک الاحوص الاشعری۔

انتہائی موثق اور معتبر انسان تھے۔ امام جوادؑ، امام ہادیؑ اور امام عسکریؑ کے اصحاب میں تھے۔ ان کے خاندان میں نہایت اعلیٰ درجہ کے محدث اور علما پیدا ہوئے ہیں، خود ان کے بارے میں بھی امام نے کافی تعریف فرمائی ہے۔ یہ امامؑ کے سفیر اور وکیل بھی تھے اور انھیں امام زمانہؑ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔

انھوں نے امام حسن عسکریؑ سے پارچہ کفن کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ گھبراؤ نہیں تمھیں مل جائے گا۔ چنانچہ کرمانشاہ کے راستہ میں جب انتقال کیا تو امامؑ نے اپنے خادم کافور کو کفن دیکر بھیجا اور اسے طی الارض کے ذریعہ وہاں پہونچا دیا جہاں اس نے عالم مسافرت میں کفن دیا اور اس کے بعد ساتھیوں نے نماز جنازہ ادا کر کے دفن کر دیا۔

۲۔ احمد بن محمد بن مطہر

انھیں امام عسکریؑ کا صاحب کہا جاتا ہے جو عام اصحاب اور تلامذہ سے بلند تر مرتبہ ہے اور ایک طرح کے مدار الہام کا مرتبہ ہے۔ چنانچہ امام عسکریؑ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی والدہ گرامی کو حج کے لیے روانہ کیا تو احمد بن محمد کو سفر کا نگراں قرار دیا ــ اور فرمایا کہ اگر پیاس کے خوف سے لوگ واپس بھی ہو جائیں تو تم اپنے سفر کو جاری رکھنا انشاء اللہ کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔

۴۔ ابو سہل اسماعیل بن علی بن اسحاق بن ابی سہل بن نوبخت۔

بغداد کے بزرگ ترین علماء علم کلام میں سے تھے اور ایک طرح کی وزارت کے منصب کے مالک تھے، مختلف کتابوں کے مولف بھی ہیں جن میں کتاب "الانوار فی تاریخ الائمہ الاطہارؑ" خاصی شہرت رکھتی ہے، انھیں امام زمانہؑ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اور جب منصور حلاج نے انھیں اپنی طرف دعوت دی کہ میں صاحب الامر کا وکیل خاص ہوں تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ اگر تمھیں یہ منصب حاصل ہے تو اس کا ایک ثبوت یہ دو کہ میری ڈاڑھی کے بال سیاہ ہو جائیں اور مجھے خضاب کی ضرورت نہ پڑے۔ منصور نے اس مسئلہ پر اپنی عاجزی کا احساس کر کے جواب سے گریز کیا لیکن ابو سہل نے اس واقعہ کو مسلسل محافل و مجالس میں نقل کر کے منصور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا اور اس کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہو گیا ورنہ بہت سے افراد کے گمراہ ہو جانے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

بنی عبّاس

تاریخ اسلام بنی امیہ کے مظالم سے بھری ہوئی ہے۔ مولائے کائنات کی شہادت سے کربلا کے سانحہ تک آل محمدؐ پر نازل ہونے والی کون سی مصیبت ہے جس میں بنی امیہ کا ہاتھ نہ رہا ہو، اور جس خون سے کسی نہ کسی اموی حاکم کے ہاتھ رنگین نہ ہوں ــــ لیکن ان تمام مظالم کے ہوتے ہوئے بھی شاعر نے بنی عباس کے مظالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"خدا کی قسم بنی امیہ کے مظالم بنی عباس کے مظالم کے مقابلہ میں عُشرِ عشیر بھی نہیں ہیں"۔

بنی امیہ نے زندہ افراد پر ظلم کیا ہے، مرنے کے بعد لاشوں کو پامال کیا ہے لیکن اس کے بعد مظالم کا سلسلہ روک دیا ہے اور بنی عباس نے تو قبروں کے نشان تک مٹا دینے کی مہم چلائی ہے اور ہر بعد کے آنے والے نے اپنے پہلے والے کے مظالم کو بھلا دیا ہے اور اپنا ظلم اس سے کوسوں آگے بڑھا دیا ہے۔

ابو العباس سفاح سے اس خوں ریزی کا سلسلہ شروع ہوا اور منصور کے دور میں منزل کمال کو پہونچ گیا۔ جس عباسی حاکم نے تخت حکومت پر قدم رکھا اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اولاد رسولؐ کو ستایا جائے اور ان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اولاد رسولؐ نے مجبور ہو کر صدائے احتجاج بلند کی تو مزید ستم کا نشانہ بنے انقلابات آئے لیکن کوئی انقلاب کامیاب نہ ہو سکا، اس لیے کہ قوم میں ان مظالم کے مقابلہ میں قیام کی طاقت نہ تھی اور یہ صرف اولاد علیؑ کا کلیجہ تھا کہ نشانۂ ستم بنتے رہے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔

ائمہ معصومینؑ نے ان سخت ترین مواقع میں اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت درجہ حکمت آمیز راستہ اختیار کیا۔ انھیں علم لدنی کے نتیجہ میں مستقبل کی ناکامیابی کا علم تھا لہذا وہ ان انقلابات کی ظاہری قیادت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن دوسری طرف مظلومین کی حمایت کا فرض بھی پیش نظر تھا، اس لیے انھیں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے، اس لیے

ظلم کے مقابلہ میں بالکل خاموش رہ جانا بھی خلاف اسلام ہے۔ چنانچہ آپ حضرات انقلابی جماعتوں کو ان کے انجام سے باخبر کرتے رہے لیکن انھیں ان کے اقدامات سے مکمل طور سے منع نہیں کیا، بلکہ جب بھی ان کے اوپر کوئی نیا ستم ہوا تو اس کے خلاف خود بھی احتجاج کی آواز بلند کی، اور انقلابی افراد کو تسکین قلب کا سامان فراہم کرتے رہے۔ چنانچہ عبداللہ بن الحسن پر منصور کے بے پناہ مظالم کے پیش نظر آپ نے انھیں ایک تاریخی تعزیتی خط لکھا ہے جو ہر دور کے مظلوم کے لیے بہترین سامان تسکین و تسلیت ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــ فرزند صالح اور ذریت طیبہ کے نام!

امابعد! اگر انقلابیوں کے درمیان آپ اور آپ کے گھر والوں نے اس قدر مصائب برداشت کیے ہیں تو اس رنج و غم اور درد و مصیبت میں آپ تنہا نہیں ہیں۔ مجھے بھی ایسے تمام مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن میں نے ہمیشہ حکم خدا کے مطابق صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ پروردگار نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صبر و تحمل کا حکم دیا ہے۔ اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ:

"اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کرو، تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو۔" (طور ۴۸)

"حکم رب پر صبر کرو اور یونس جیسے نہ ہو جاؤ۔" (قلم ۴۸)

"اگر ظالموں سے بدلہ لینا چاہو تو جس طرح انھوں نے ظلم کیا ہے اسی طرح انھیں سزا دو، اور اگر صبر کر لو تو صبر زیادہ بہتر ہے۔" (نحل ۱۲۶)

"اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر صبر کرو، ہم رزق کے طلب گار نہیں ہیں، رزق دینے والے ہیں اور عاقبت صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے۔" (طٰہٰ ۱۳۲)

"صابرین پر مصیبت پڑتی ہے تو انا للہ کہتے ہیں اور انھیں کے لیے صلوات و رحمت ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔" (بقرہ ۱۵۶)

"صابرین کو ان کے صبر پر بے حساب اجر ملے گا۔" (زمر ۱۰)

لقمان نے اپنے فرزند کو وصیت کی، "مصائب پر صبر کرو کہ یہ مستحکم امور میں سے ہے۔" (لقمان ۱۷)

جناب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور عاقبت بہرحال صاحبان تقویٰ کے لیے ہے۔" (اعراف ۸)

"فائدہ صاحبان ایمان کے لیے ہے جو عمل صالح کرتے ہیں اور حق و صبر کی وصیت و نصیحت کرتے ہیں۔" (عصر ۳)

"پھر ان صاحبان ایمان میں سے ہوتا جن کا کام صبر اور مرحمت کی وصیت کرنا ہے۔" (بلد ۱۷)

"ہم تمھارا امتحان بھوک، خوف، نقص اموال و نفوس و ثمرات سے کریں گے، اور صابرین کو بشارت دے دو۔" (بقرہ ۱۵۵)

"نبی کے ساتھ اللہ والوں نے جہاد کیا تو نہ راہِ خدا میں آنے والی مصیبتوں کے مقابلہ میں کمزور ہوئے اور نہ سستی کا مظاہرہ کیا اور اللہ صابرین کو دوست رکھتا ہے۔" (آل عمرآن ۴۶)

"صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں مغفرت اور اجر عظیم کی حق دار ہیں۔" (احزاب ۳۵)

"جب تک حکم خدا نہ آجائے صبر کرتے رہو کہ اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔" (یونس ۱۰۹)

میرے عم اور ابن عم! یاد رکھیے کہ پروردگار کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ اس کے ماننے والوں کو دنیا نے ستایا ہے کہ اس کی نگاہ میں اس کے مصائب و آلام سے زیادہ محبوب ترین کوئی شے نہیں ہے۔ اسے اس کی بھی فکر نہیں ہے کہ دنیا اس کے دشمنوں کو ناز و نعم میں رکھتی ہے کہ وہ اگر اپنے اولیاء کے ساتھ مصائب اور صبر کو پسند نہ کرتا تو دشمنانِ خدا کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اولیاءِ خدا کو قتل کر سکیں اور خود عیش و آرام سے حکومت کریں۔ وہ اولیاء کے لیے مصائب برداشت نہ کرتا تو زکریا اور یحییٰ کا قتل واقع نہ ہو سکتا، آپ کے جد علی بن ابی طالبؑ شہید نہ ہوتے،

کربلا کا عظیم سانحہ اور آپ کے چچا کی شہادت نہ ہوتی، اس نے ظالموں کو ڈھیل دی ہے، انھیں ظلم کا موقع دیا ہے کہ اپنا حوصلہ نکال لیں۔ سورۂ زخرف ۳۳ اور سورۂ مومنون ۵۵ میں اس حقیقت کا اعلان بھی فرما دیا ہے۔ صبر کے جوہر مصائب کی شدّت ہی میں کھلتے ہیں اور صبر اللہ کی محبوب ترین صفت ہے۔

احادیث میں بھی اس حقیقت کا اعلان ہوا ہے کہ:

"مومن کی اذیت کا خیال نہ ہوتا تو کافر کو کبھی دردِ سر بھی نہ ہوتا۔"

"یہ دنیا اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔"

"اگر مومن پہاڑ کی چوٹی پر بھی پناہ لے گا تو اللہ کافروں اور منافقوں کو اسے اذیت دینے کا موقع دے گا تاکہ اس کے صبر کے جوہر کھل سکیں۔"

"اللہ جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس پر بلاؤں کا مسلسل نزول ہوتا ہے کہ ایک غم سے نکلتا ہے اور دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔"

"بندۂ مومن کے لیے اس دنیا میں دو ہی گھونٹ محبوب ہیں۔ ایک غصہ کا پی جانا اور دوسرے مصیبت کو برداشت کر لینا صبر و تحمل کے ساتھ۔ اصحابِ رسولؐ اپنے ظالمین کے لیے طولِ عمر اور صحت بدن اور کثرتِ مال و اولاد کی تمنا کرتے تھے تاکہ اپنے امکان بھر ظلم ڈھا سکیں اور وہ اپنے صبر کا مظاہرہ کر سکیں۔"

لہٰذا عمِ محترم، ابن العم اور برادران! آپ سب صبر و رضا، تسلیم و تفویض کو اختیار کریں، قضائے الٰہی پر صابر رہیں، اطاعتِ خدا کرتے رہیں، احکام کی تعمیل کریں۔ اللہ ہم کو اور آپ کو صبرِ بے حساب عطا کرے اور انجام بخیر کرے اور اپنی قوت و قدرت سے ہر ہلاکت سے نجات دے۔ وہی سننے والا ہے اور وہی بندہ سے قریب تر ہے۔ اللہ اپنے مصطفیٰ بندے حضرت محمدؐ اور ان کے اہلبیتؑ پر رحمت نازل فرمائے۔" (بحار الانوار ۷، ۴)

اس خط سے اس صورتِ حال کا مکمل اندازہ کیا جا سکتا ہے جس سے اولادِ علیؑ گزر رہی تھی اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ائمہ معصومینؑ، مظلومین اور مستضعفین کے حالات سے بے تعلق

یا انقلابیوں سے بیزار نہیں تھے۔ حالات نے انھیں قیام کی اجازت نہیں دی تھی ورنہ وہ ہر ظالم سے بیزار اور ہر ظلم کے خلاف تحریک سے ہم آواز تھے بشرطیکہ اس کی بنیادیں دین و ایمان اور دیانت و اخلاص پر استوار ہوں۔

سوچیے بنی عباس کے آغازِ اقتدار میں مصائب کا یہ عالم تھا تو استحکامِ سلطنت کے بعد مصائب کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس کا اندازہ بھی انھیں حالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہارونؔ کا امام موسیٰ کاظمؑ کو مسلسل قید خانہ میں رکھنا اور قید و بند کے عالم میں شہید کرا دینا، مامون کا امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا اور پھر شہید کرا دینا، امام محمد تقی علیہ السلام کو داماد بنانا اور پھر نشانۂ ستم بنا کر معتصم کا آپ کو زہر دلا دینا، متوکل کا قبرِ امام حسینؑ کی بربادی کا سامان کرنا اور اس طرح کے بے شمار مظالم ہیں جو ائمہ معصومینؑ کے سامنے آتے رہے ہیں اور بنی عباس کے نمک حرام حکام جس کے نام پر برسرِ اقتدار آئے تھے اسی کے گھرانے کو بے نام و نشان بنانے پر تُلے رہے ہیں۔

امام حسن عسکریؑ کو ان مصائب میں سے ایک نیا حصہ ملا تھا کہ ظالمین کو معلوم تھا کہ پیغمبرِ اسلام کا بارہواں وارث ظلم کی بساط کو اُلٹ دے گا اور اس کے آنے کے بعد ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ ان کی نسل کے گیارہویں وارث ہیں لہٰذا مظالم کا تمام تر رُخ آپ کی ذاتِ مبارک کی طرف تھا اور ہر شخص کو فکر تھی کہ آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اپنی بدنامی بھی نہ ہونے پائے اور زندگی کا خاتمہ بھی ہو جائے۔ حکومت کے لیے یہ کام بہت آسان تھا۔ لیکن جسے پروردگار بچانا چاہے اسے کوئی نہیں مٹا سکتا ہے، چنانچہ ظالموں نے قتل کرنے کے بجائے اذیتوں کا راستہ اختیار کیا کہ نگاہِ قدرت میں اولیاء خدا کے صبر کے جوہر کھلنے کا یہ بہترین راستہ ہے۔ مظالم اپنی حد سے گزر گئے۔ قید و بند، خانہ نشینی، نظربندی اور اس طرح کے شدید ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس قصر میں ظالم آرام کرے اس کے گوشے میں امام کو قیدی بنا کر رکھا گیا کہ یہ آلِ رسولؐ کے ساتھ امت کی نگاہ میں بہترین برتاؤ تھا اور اس طرح ظالموں کی دنیا میں اجرِ رسالت ادا کیا جا رہا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ حجت آخر اس دنیا میں آ گیا اور اعلانِ پروردگار "جاء الحق و زھق الباطل" کا مصداق پیدا ہو گیا۔ مظالم کی رات آخر منزل پر آ گئی اور عدل و انصاف کا سورج طلوع ہو گیا۔

نقشِ

حیات حضرت ولیِّ عصرؑ

ولادت: ۱۵ر شعبان ۲۵۵ھ

عَجَّلَ اللّٰهُ فَرَجَهُ الشَّرِيف

نقشِ زندگانی حضرت صاحب الامر عجل اللہ فرجہ الشریف

ماہ شعبان ۲۵۵ھ کی پندرہویں تاریخ صبح جمعہ کی مسعود ترین ساعت تھی جب پیغمبر اسلامؐ کے آخری وارث اور سلسلۂ امامت کے بارہویں اور آخری امامؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بعض علماء نے سال ولادت ۲۵۶ھ سنہ نور لکھا ہے لیکن معروف ترین روایت ۲۵۵ھ ہی کی ہے۔

والد ماجد امام حسن عسکریؑ تھے جن کی عمر مبارک آپ کی ولادت کے وقت تقریباً ۲۲ سال تھی اور والدہ گرامی جناب نرجس خاتون تھیں جنھیں ملیکہ بھی کہا جاتا ہے۔

جناب نرجس خاتون دادھیال کے اعتبار سے قیصر روم کی پوتی تھیں اور ننھیال کے اعتبار سے جناب شمعون وصی حضرت عیسیٰ کی نواسی ہوتی تھیں۔ اس اعتبار سے امام زمانہ ننھیال اور دادھیال دونوں اعتبار سے بلند ترین عظمت کے مالک ہیں اور آپ کا خاندان ہر اعتبار سے عظیم ترین بلندیوں کا مالک ہے۔

جناب نرجس کے روم سے سامرہ پہونچنے کی تاریخ دو حصوں میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک حصہ سامرہ سے متعلق ہے اور ایک حصہ روم سے متعلق ہے۔ پہلے حصہ کے راوی جناب بشر بن سلیمان انصاری ہیں جو جناب ابوایوب انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور دوسرے حصہ کی راوی خود جناب نرجس ہیں جنھوں نے اپنی داستانِ زندگی خود بیان فرمائی ہے۔

پہلے حصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ امام علی نقیؑ کے خادم کافور نے بشر بن سلیمان تک یہ پیغام پہونچایا کہ تمھیں امام علی نقیؑ نے یاد فرمایا ہے۔ بشر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تم بردہ فروشی کا کام جانتے ہو۔ یہ ایک تھیلی ہے جس میں دو سو بیس اشرفی ہیں اسے لے کر میرے خط کے ساتھ جسر بغداد تک چلے جاؤ وہاں ایک قافلہ بردہ فروشوں کا نظر آئے گا۔ اس قافلہ میں ایک خاتون بشکل کنیز ہوگی جس کی خریداری کی تمام لوگ کوشش کر رہے ہوں گے لیکن وہ کسی کی خریداری سے راضی نہ ہوگی اور نہ

اپنے چہرہ سے نقاب اٹھائے گی۔ تم یہ منظر دیکھتے رہنا جب تمام لوگ قیمت بڑھا کر عاجز ہو جائیں اور مالک پریشان ہو اور کنیز یہ کہے کہ میرا خریدار عنقریب آنے والا ہے تو تم مالک کو یہ تھیلی دے دینا اور کنیز کو یہ خط دے دینا جو اسی کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ معاملہ خود بخود طے ہو جائے گا۔ جناب بشر بن سلیمان نے ایسا ہی کیا اور حرف بحرف امامؑ کی نصیحت پر عمل کیا یہاں تک کہ معاملہ طے ہو گیا اور دو سو بیس اشرفی میں اس خاتون کو حاصل کر لیا اور امام کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔

اس کے بعد جناب نرجس نے اپنی تاریخ زندگی یوں بیان کی ہے کہ میں ملیکہ قیصر روم کی پوتی ہوں۔ میری شادی میرے ایک رشتہ کے بھائی سے طے ہوئی تھی اور پورے اعزاز و احترام کے ساتھ محفل عقد منعقد ہوئی تھی۔ ہزاروں اعیانِ مملکت شریک بزم تھے۔ لیکن جب پادریوں نے عقد پڑھنے کا ارادہ کیا تو تخت کا پایہ ٹوٹ گیا اور تخت اُلٹ گیا، بہت سے لوگ زخمی ہو گئے اور اسے رشتہ کی نحوست پر محمول کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اس کے دوسرے بھائی سے رشتہ طے ہوا اور بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا جس کے بعد لوگ سخت حیران تھے کہ اس کے پس منظر میں کوئی بات ضرور ہے جو ہم لوگوں کی عقل میں نہیں آرہی ہے کہ رات کے وقت میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مقام پر حضرت رسول خداؐ اور حضرت مسیحؑ جمع ہیں اور ایسا ہی دربار آراستہ ہے جیسا کہ میرے عقد کے موقع پر اس سے پہلے ہوا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کا بے حد احترام کیا اور ان دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ ہم آپ سے آپ کے وصی کی صاحبزادی ملیکہ کا رشتہ اپنے فرزند حسن عسکریؑ کے لیے طلب کر رہے ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے بصد مسرت رشتہ کو منظور کر لیا اور میرا عقد ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اکثر خواب میں حضرت حسن عسکریؑ کو دیکھا اور ان سے مطالبہ کیا کہ آپ کی خدمت میں حاضری کا راستہ کیا ہوگا تو ایک دن انھوں نے فرمایا کہ تمھارے یہاں سے ایک فوج جنگ پر جا رہی ہے، تم اس میں شامل ہو جاؤ۔ عنقریب اس فوج کو شکست ہوگی اور اس کی عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے گا۔ تم ان قیدیوں میں شامل ہو جانا اور ان کے ساتھ بغداد تک آجانا اس کے بعد میں تمھاری خریداری کا انتظام کر لوں گا۔ چنانچہ واقعہ ایسا ہی ہوا اور امام علی نقیؑ نے خریداری کا انتظام کر دیا اور جناب نرجس اس گھر تک پہونچ گئیں۔ جس کے بعد انھوں نے اس واقعہ کی ایک کڑی کا اور ذکر کیا کہ میں اپنے عالم انوار کے عقد کے بعد مسلسل اس خواب کی تعبیر

کے لیے پریشان تھی اور نوبت شدید بیماری تک پہونچ گئی تھی تو ایک دن خواب میں جناب مریم اور جناب فاطمہ زہراؑ کو دیکھا اور ان سے فریاد کی کہ آخر آپ کے فرزند تک پہونچنے کا راستہ کیا ہوگا جن کی خدمت کا شرف آپ کے پدر بزرگوار نے عنایت فرمایا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ پہلے کلمۂ اسلام زبان پر جاری کرو اس کے بعد اس کا انتظام ہو جائے گا (اس لیے کہ مسیحی مذہب خاتون سے عقد تو ہو سکتا ہے لیکن رب العالمین نے جس مقصد کے لیے اس رشتہ کا انتخاب فرمایا ہے اس کی تکمیل دین اسلام کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے کہ نور الٰہی کسی غیر موحد رحم میں نہیں رہ سکتا ہے) چنانچہ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کیا اور آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ امام علی نقیؑ نے فرمایا کہ جس نوجوان نے تم سے سامرہ پہونچنے کا وعدہ کیا تھا اسے پہچان سکتی ہو؟ عرض کی بے شک! آپ نے امام حسن عسکریؑ کو پیش کیا۔ جناب نرجس خاتون نے فوراً پہچان لیا اور آپ نے ان کو عقد کرکے اپنے فرزند کے حوالے کر دیا۔

(اس واقعہ میں عقد کی لفظ دلیل ہے کہ جناب نرجس کنیز نہیں تھیں، ورنہ اسلام میں کنیزی کی حلّیت کے لیے عقد کی ضرورت نہیں ہوتی ہے تنہا کنیزی ہی اس کے حلال ہونے کے لیے کافی ہوتی ہے جیسا کہ ان متعدد آیاتِ قرآنی سے بھی ظاہر ہوتا ہے جن میں کنیزی کا تذکرہ ازواج کے مقابلہ میں کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ کنیزی الگ ایک شے ہے اور زوجیت الگ ایک شے ہے، اور ایک مورد پر دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے علاوہ اس کے کہ کنیز ایک شخص کی کنیز ہو اور دوسرے کی زوجہ ہو ورنہ ایک ہی جہت سے دونوں کا اجتماع ناممکن ہے)۔

اس کے بعد جناب حکیمہ بنت امام محمد تقی علیہ السلام بیان کرتی ہیں کہ ایک دن امام حسن عسکریؑ نے فرمایا کہ آج شب کو آپ میرے یہاں قیام کریں کہ پروردگار مجھے ایک فرزند عطا کرنے والا ہے۔ میں نے عرض کی کہ نرجس خاتون کے یہاں تو حمل کی کوئی علامت نہیں ہے ـــــ فرمایا کہ پروردگار اپنی حجت کو اسی طرح دنیا میں بھیجتا ہے، جناب مادرِ حضرت موسیٰ کے یہاں بھی آثارِ حمل نہیں تھے اور بالآخر جناب موسیٰ دنیا میں آگئے اور فرعونیوں کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں نے امامؑ کی خواہش کے مطابق گھر میں قیام کیا اور تمام رات حالات کی نگرانی کرتی رہی یہاں تک کہ میری نماز شب بھی تمام ہوگئی اور آثارِ حمل نمودار نہیں ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ نرجس نے

خواب سے بیدار ہو کر وضو کیا اور نماز شب ادا کی اور اس کے بعد دردِ زہ کا احساس کیا۔ میں نے دعائیں پڑھنا شروع کیں۔ امام عسکریؑ نے آواز دی کہ سورۂ انا انزلناہ پڑھیے۔ میں نے سورۂ قدر کی تلاوت کی اور یہ محسوس کیا کہ جیسے رحمِ مادر میں فرزند بھی میرے ساتھ تلاوت کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے اور نرجس کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا اور میں سخت پریشان ہو گئی کہ اچانک امام عسکریؑ نے آواز دی کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اب جو پردہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ ایک چاند سا بچہ روبقبلہ سجدہ ریز ہے اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کرکے کلمۂ شہادت زبان پر جاری کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ تمام ائمہ کی امامت کی شہادت دینے کے بعد یہ فقرات زبان پر جاری کیے: "خدایا! میرے وعدہ کو پورا فرما، میرے امر کی تکمیل فرما، میرے انتقام کو ثابت فرما اور زمین کو میرے ذریعہ عدل و انصاف سے معمور کر دے۔

دوسری روایت کی بنا پر ولادت کے موقع پر بہت سے پرندے بھی جمع ہو گئے اور سب آپ کے گرد پرواز کرنے لگے کہ گویا آپ پر قربان ہو رہے تھے۔ آپ کے داہنے شانہ پر "جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً" کا نقش تھا اور زبانِ مبارک پر یہ آیتِ کریمہ تھی: "ونرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین"۔

اس کے بعد امام عسکریؑ کی ہدایت کے مطابق ایک پرندہ فرزند کو اٹھا کر جانب آسمان لے گیا اور روزانہ ایک مرتبہ باپ کی خدمت میں پیش کرتا تھا اور عالم قدس میں آپ کی تربیت کا مکمل انتظام تھا۔ یہاں تک کہ چند روز کے بعد جناب حکیمہ نے دیکھا تو پہچان نہ سکیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھوپھی جان! ہم اہلبیتؑ کی نشو و نما عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ صاحبانِ منصبِ الٰہی کی نشو و نما ایک ماہ میں ایک سال کے برابر ہوتی ہے۔ چنانچہ جناب حکیمہ نے اس فرزندِ حسن عسکریؑ سے تمام صحف سماویہ اور قرآن مجید کی تلاوت بھی سنی ہے۔

(واضح رہے کہ وقت ولادت سورۂ انا انزلناہ کی تلاوت کا شاید ایک راز یہ بھی تھا کہ اس سورہ میں ہر شب قدر میں ملائکہ آسمان کے امرِ الٰہی کے ساتھ نازل ہونے کا ذکر ہے اور یہ علامت ہے کہ ہر دور میں ایک صاحب الامر کا رہنا ضروری ہے اور آج دنیا میں آنے والا اپنے دور کا

صاحب الامر ہے۔)

محمد بن عثمان عمروی راوی ہیں کہ صاحب الامر کی ولادت کے بعد امام عسکریؑ نے بطور عقیقہ متعدد جانور ذبح کرنے کا حکم دیا اور دس ہزار رطل روٹی اور اسی مقدار میں گوشت تقسیم کرنے کا حکم دیا اور میں نے اسی کے مطابق عمل کیا۔

(واضح رہے کہ عقیقہ میں ایک جانور کی قربانی بھی کافی ہوتی ہے اور صرف عقیقہ کے گوشت کی تقسیم بھی کافی ہوتی ہے لیکن امام عسکریؑ نے متعدد جانور ذبح کرنے کا حکم دیا اور کافی مقدار میں گوشت اور روٹی کی تقسیم کا بھی حکم دیا، جس سے حضرت صاحب الامر کی خصوصیت اور ان کے امتیاز کے علاوہ اس نکتہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ اس طرح آبادی کے ایک بڑے حصہ کو حضرت صاحب العصرؑ کی ولادت کی خبر ہو جائے گی اور اس کے بعد اگر لوگ ان کی زیارت نہ بھی کرسکیں تو ان کے وجود کا انکار نہ کرسکیں گے اور چند سال کے بعد جب میرا انتقال ہو جائے گا تو کوئی یہ نہ کہنے پائے گا کہ حسن عسکری لاولد دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ صاحب الامر کی ولادت کی خبر کا عام ہونا ضروری تھا کہ اس سے پوری کائنات کا مستقبل وابستہ تھا اور اسی کے سہارے سارے صاحبان ایمان کو زندہ و سلامت رہنا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کل حکام جور اس کے وجود کا انکار کر کے مطمئن ہو جائیں اور صاحبانِ ایمان شک اور شبہ میں مبتلا ہو جائیں۔

یہ کام اگرچہ امام حسن عسکریؑ کے لیے انتہائی مشکل تھا کہ حکومت وقت کی طرف سے آپ کے گھر کی سخت ترین نگرانی کی جارہی تھی اور تمام تر کوشش یہی تھی کہ آخری حجت پروردگار دنیا میں نہ آنے پائے اور قدرت نے اس کے مقابلہ میں غیبت کا مکمل اہتمام بھی کر دیا تھا اور آپ نے بھی ولادت سے پہلے انتہائی راز داری سے کام لیا تھا لیکن اس کے باوجود جب صاحب الامر کو پرندہ (روح القدس) نے اپنی تحویل میں لے لیا اور ظالموں کے شر سے محفوظ ہو گئے تو آپ نے دوسرے فریضہ کو انتہائی اہم قرار دیا کہ قوم میں ان کی ولادت کا اعلان ہو جائے اور دنیا کو آخری وارث پیغمبرؐ کے نزولِ اجلال کا علم ہو جائے چاہے اس کے نتیجہ میں حکومتِ وقت کی طرف سے کسی قدر بھی مشکلات اور مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے اور اس راہ میں کسی قدر آفات و شدائد کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔

آپ کا اسم گرامی محمد اور کنیت ابوالقاسم ہے اور یہ آپ کے امتیازات میں سے ہے کہ

رسول اکرمؐ نے آپ کو اپنے نام اور کنیت دونوں کا وارث قرار دیا ہے ورنہ دونوں کا اجتماع عام طور سے ممنوع ہے جس طرح کہ اکثر علماء نے دور غیبت کبریٰ کو آپ کو اس نام گرامی "محمد" کے ساتھ یاد کرنے کی سخت ممانعت کی ہے اور بعض روایات میں اس نام سے یاد کرنے کو حرام تک قرار دیا گیا ہے۔

آپ کے معروف القاب و خطابات یہ ہیں جن کے ذریعہ یاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے:

۱۔ بقیۃ اللہ ۔۔ روایات میں وارد ہوا ہے کہ جب وقتِ ظہور آپ دیوارِ کعبہ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوں گے تو آپ کے گرد ۳۱۳ اصحاب کا مجمع ہوگا، تو سب سے پہلے اس آیت کی تلاوت کریں گے "بقیۃ اللہ خیر لکم ان کنتم مومنین" اگر تم لوگ صاحب ایمان ہو تو تمہارے لیے خیر اور بھلائی بقیۃ اللہ میں ہے جسے پروردگار نے اس دن کے لیے بچا کر رکھا ہے۔

۲۔ حجّت ۔۔ یہ لقب اگرچہ دیگر ائمہ معصومینؑ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور انھیں بھی حجۃ اللہ کہا جاتا ہے لیکن عام طور سے حضرت حجت سے آپ ہی کی ذات گرامی مقصود ہوتی ہے اور شاید اس کا ایک راز یہ بھی ہو کہ آپ کے ذریعہ پروردگار مادی اور معنوی دونوں اعتبار سے اپنی حجت تمام کر دے گا اور شاید اسی لیے آپ کی انگشتریٔ مبارک کا نقش بھی "انا حجۃ اللہ" ہے۔

۳۔ خلف یا خلف صالح ۔۔ یہ لقب بھی آپ کے بارے میں اکثر ائمہ طاہرینؑ کی حدیثوں میں وارد ہوا ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ آپ تمام انبیاء و مرسلین کے جانشین اور ان کے کمالات کے وارث ہیں جیسا کہ حدیث مفضل میں وارد ہوا ہے کہ وقت ظہور دیوار کعبہ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوں گے اور فرمائیں گے کہ جو شخص بھی آدم، شیث، نوح، سام، ابراہیم، اسماعیل، موسیٰ، یوشع، شمعون، رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی زیارت کرنا چاہے وہ مجھے دیکھ لے کہ میں سب کے کمالات کا وارث اور سارے انبیاء و اولیاء کا خلف صالح ہوں۔

۴۔ شرید (دور افتادہ) اس لقب کا راز غالباً یہ ہے کہ زمانہ نے بے معرفتی کی بنیاد پر آپ کو سماج سے دور کر دیا ہے اور آپ نے مصلحت الٰہی کی بنا پر اپنے کو معاشرہ سے دور رکھا ہے جیسا کہ خود آپ نے فرمایا تھا کہ میرے والد بزرگوار نے وصیت فرمائی ہے کہ اپنے کو سماج سے دور رکھنا کہ ہر ولیِ خدا کے دشمن ہوتے ہیں اور رب العالمین تمھیں باقی رکھنا چاہتا ہے۔

۵۔ غریم (قرض دار یا قرض خواہ) ۔۔ اس لقب کا راز یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کا امت اسلامیہ

کے ذمہ قرض ہے اور آپ پر احکام اسلامیہ کا قرض ہے جسے ادا کرنے کے لیے آپ کو باقی رکھا گیا ہے اور جس کے لیے آپ اسی طرح بے چین رہتے ہیں جس طرح ایک قرض دار اپنے قرض کی ادائگی کے لیے بے چین رہا کرتا ہے۔

روایات میں اس لقب کی ایک مصلحت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس طرح مومنین اپنے حقوق کو مختلف افراد کے ذریعہ امامؑ تک پہونچا دیا کرتے تھے اور کسی بھی شخص کو مال دیتے ہوئے اس لقب کا استعمال کیا کرتے تھے اور کہتے تھے ہمارے قرض خواہ تک پہونچا دینا اور یہ بات سو فیصد صحیح بھی تھی کہ امت کے ذمہ امامت کے بے شمار حقوق ہیں جنکی ادائگی کی ذمہ داری امت کے لیے ضروری ہے۔

۶۔ قائم۔ اس لقب کا راز یہ ہے کہ اصلاح عالم کی خاطر آخری قیام اور انقلاب آپ ہی کے ذمہ رکھا گیا ہے جیسا کہ ابو حمزہ نے امام باقرؑ کی روایت میں نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ جب آپ سب ہی حق کے ساتھ قیام کرنے والے ہیں تو صرف آخری حجت کو قائم کیوں کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ شہادت امام حسینؑ کے بعد ملائکہ نے بارگاہ احدیت میں عرض کی کہ تیرے پیارے نبیؐ کا پیارا فرزند شہید ہو گیا اور ہم اس کی کمک بھی نہ کر سکے تو ارشاد احدیت ہوا کہ تمھیں آخری وارث حسینؑ کی کمک کے لیے باقی رکھا گیا ہے اور اس کے بعد جملہ انوار ائمہؑ کو ظاہر کیا گیا تو آخری نور مشغول نماز تھا۔ ارشاد قدرت ہوا کہ یہی قائم ایک دن قیام کرنے والا ہے اور اس کے ذریعہ دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ امامؑ کے القاب میں اس لقب کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جب آپ کے اس لقب کا تذکرہ کیا جائے تو انسان کو کھڑا ہو جانا چاہیے جیسا کہ علامہ عبد الرضا بن محمد نے اپنی کتاب "تاجیج نیران الاحزان فی وفاۃ سلطان خراسان" میں نقل کیا ہے کہ جب دعبل خزاعی نے اپنے قصیدہ میں امام کا ذکر کیا تو امام رضاؑ سرو پا کھڑے ہو گئے اور آپ نے اپنا ہاتھ اپنے سر مبارک پر رکھ لیا اور ظہور امامؑ میں عجلت کی دعا فرمائی۔ اور اس کے بعد یہ طریقہ شیعوں میں رائج ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ اس کا مقصد صرف عظمت امام کا اظہار نہیں ہے ورنہ یہ طریقہ کار ہر امامؑ کے ذکر کے ساتھ ہونا چاہیے تھا بلکہ بزرگوں کے ذکر کے ساتھ بطریق اولیٰ ہونا چاہیے تھا لیکن صرف امام عصرؑ

کے ذکر کے ساتھ یہ طریقۂ کار علامت ہے کہ اس طرح امت اسلامیہ کو تربیت دی جا رہی تھی کہ جب امامؑ کے قیام کا ذکر آئے تو فوراً کھڑے ہو جائیں تاکہ اس کے بعد جب واقعاً قیام کی منزل سامنے آجائے اور یہ خبر نشر ہو کہ انھوں نے مکہ سے قیام فرما لیا ہے تو فوراً نصرت کے لیے کھڑے ہو جائیں اور سر پر ہاتھ رکھ کر سر تسلیم خم کر دیں کہ اب اس سر کو بھی آپ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے حاضر ہیں۔ (منتہی الآمال)

۷۔ مہدی۔ اس لقب کا ذکر روایات مرسل اعظمؐ میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے اور اسی لیے تمام عالم اسلام میں آپ کو عام طور سے اسی لقب کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اور اس کے بارے میں روایت میں وارد ہوا ہے کہ جو مہدی کے قیام اور خروج کا انکار کر دے اس نے پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والے تمام احکام کا انکار کر دیا ہے۔ پیغمبرؐ کے تمام احکام اور تعلیمات کا دار و مدار قیام مہدی پر ہے اور اس سے انحراف کے معنی سارے احکام و تعلیمات سے انحراف کے ہیں۔

۸۔ منتظر۔ یہ آپ کی واضح ترین صفت ہے کہ تمام صاحبانِ ایمان کو مسلسل آپ کا انتظار ہے اور روایات معصومینؑ میں برابر اس انتظار کی تاکید کی گئی ہے اور اسے افضل اعمال قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ انتظار کے افضل اعمال ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انتظار ایک عمل ہے، بے عملی اور کاہلی نہیں ہے اور زمانہ کو اس کے حالات پر چھوڑ کر بغیر کسی اصلاحی عمل اور حرکت کے صرف ظہور امام کی آس لگا کر بیٹھنا ایک طرح کی کاہلی اور سستی ہے انتظار نہیں ہے۔ انتظار کے لیے مقدمات کا فراہم کرنا اور حالات کا سازگار بنانا ایک بنیادی شرط ہے۔ کسی مجلس میں ذاکر کا انتظار کرنے والا فرش عزا بچھا دیتا ہے اور کسی مسجد میں امام جماعت کا انتظار کرنے والا صفیں درست کر لیتا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان امام حقیقی کے قیام کا انتظار کرے اور نہ صفیں منظم کرے نہ دیدہ و دل فرش راہ کرے۔ دنیا میں ہر اصلاحی عمل اور تحریک انتظار امامؑ کی اعلیٰ ترین فرد ہے جس سے بہتر انتظار کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ انتظار میں دو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انتظار اعتبار کی دلیل ہے کہ انسان کو جس کا اعتبار ہوتا ہے اسی کا انتظار بھی کرتا ہے اور جب اعتبار ختم ہو جاتا ہے تو انتظار بھی ختم کر دیتا ہے۔ انتظار امامؑ کی تاکید بقائے اعتبار ظہور امام کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ انتظار کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ انسان موجودہ حالات سے راضی نہیں ہے اور ایک بہترین مستقبل کا انتظار کر رہا ہے گویا اس تعلیم کے ذریعہ اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کو مال، دولت، خزانہ اور اقتدار کچھ بھی کیوں نہ حاصل ہو جائے اسے اپنے دور کے نظام کو آخری سمجھ کر مطمئن نہ ہو جانا چاہیے بلکہ دین و مذہب کی ابتر حالت کا لحاظ رکھ کر اُس عظیم مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے اور اس کے لیے زمین ہموار کرنا چاہیے جو دین و مذہب، اور احکام و تعلیمات الٰہیہ کے لیے سکون و اطمینان کا دور ہوگا۔ انسان کا اپنا سکون و اطمینان کوئی قیمت نہیں رکھتا ہے اگر دینِ الٰہی کو سکون و اطمینان حاصل نہ ہو سکے۔

۹۔ ماءِ معین (چشمہ جاری) ــ اس لقب میں قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "اگر پروردگار پانی کو زمین میں جذب کر دے تو چشمۂ جاری کو کون منظرِ عام پر لا سکتا ہے؟"۔ یعنی دنیا میں جس قدر آبِ جاری نظر آ رہا ہے سب رحمتِ الٰہی کا کرشمہ ہے۔ اسی طرح جب رحمتِ الٰہی کا تقاضا ہوگا تو چشمۂ جاریِ علوم و کمالاتِ آلِ محمدؐ بھی منظرِ عام پر آ جائے گا اور تمام دنیا اس کے فیوض و برکات سے استفادہ کرے گی اور یہ زمینِ دل کو اسی طرح زندہ کر دے گا جس طرح آبِ رحمتِ عام مُردہ زمینوں کو زندہ بنا دیا کرتا ہے۔

۱۰۔ غائب ــ یہ امام کی واضح ترین صفت ہے اور اس کی طرف ائمہ طاہرینؑ نے لفظی اشارات کے علاوہ عملی اشارات بھی فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر آخری دور کے ائمہ معصومینؑ اکثر حالات میں قوم سے ملاقات نہیں فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ غیبت کے عادی ہو جائیں اور غیبت کی بنیاد پر وجودِ امامؑ کا انکار نہ کرنے پائیں۔ خود امام عصرؑ کی زندگی کا ابتدائی دور بھی اسی عالم میں گزرا ہے کہ جناب حکیمہ جنھوں نے ولادت کے موقع پر سارے فرائض انجام دیے ہیں انھیں بھی ہفتہ عشرہ یا بعض اوقات چالیس دن کے بعد ہی زیارت نصیب ہوتی تھی اور یہی حال دیگر اصحاب اور اہل خاندان کا تھا کہ اکثر افراد نے ولادت کے بعد صرف اس وقت دیکھا جب آپ پدر بزرگوار کی نمازِ جنازہ کے لیے تشریف لائے اور جعفر کو ہٹا کر نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ اس کے بعد پھر آپ نے اپنی غیبت کے دو حصے رکھے:

غیبتِ صغریٰ جس کا سلسلہ تقریباً ۷۰ سال تک جاری رہا اور اس میں مختلف سفراء کے ذریعہ خط و کتابت اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا تاکہ لوگ غیبت پر ایمان کے عادی ہو جائیں اور

یہ اعتقاد راسخ ہو جائے کہ غیبت کے ذریعہ فیوض و برکات کا سلسلہ موقوف نہیں ہوتا بلکہ ہدایت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۷۰ سال کی اس تربیت کے بعد غیبتِ کبریٰ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک اعلانِ عام ہو گیا کہ اس کے بعد سوالات کے جوابات براہ راست نہیں ملیں گے بلکہ ہمارے محفوظ تعلیمات کے ذریعہ حاصل کرنا ہوں گے اور ان تعلیمات سے استنباط و استخراج کا کام وہ علمائے اعلام انجام دیں گے جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے بچانے والے، اپنے دین کو خطرات سے محفوظ رکھنے والے، اپنے مولا کے احکام کی اطاعت کرنے والے اور اپنے خواہشات کی مخالفت کرنے والے ہوں گے۔ یہی حجتِ امامؑ ہوں گے اور انھیں کے ذریعہ امت کی ہدایت کا کام انجام دیا جائے گا۔ یہ احکام کو کتاب و سنت سے بھی حاصل کریں گے اور ملاقاتِ امامؑ کے ذریعہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ وقتِ ظہور تک ملاقات کرنے والوں کی فہرست نہیں بتائی جا سکتی ہے اور فہرست میں بھی ہر شخص کے اپنے ہی اوپر منطبق کر لینے کا خطرہ ہے لہٰذا یہ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ اگر کوئی شخص غیبتِ کبریٰ میں مشاہدہ اور ملاقات کا دعویٰ کرے اور امامؑ کی طرف سے کوئی ایسی خبر لے کر آئے جو عام تعلیمات کتاب و سنت سے ہم آہنگ نہ ہو تو خبردار اس کی تصدیق نہ کرنا اور اسے افترا پرداز سمجھ کر اس کی بات رد کر دینا ورنہ نئی شریعت سازی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اصلی دین تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

یہ روک تھام اور پابندی بھی دورِ غیبت میں فرضِ ہدایت کے انجام دینے کا ایک راستہ ہے کہ اس طرح گمراہی کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ختم کر دیا جائے اور مذہب میں کوئی نیا کاروبار نہ قائم ہو سکے۔

واضح رہے کہ غیبتِ امامؑ کے بارے میں دو طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں:

(۱) غیبتِ شخص اور (۲) غیبتِ شخصیت

غیبتِ شخص کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خود انسان نگاہوں سے غائب رہے اور ایسے مقام پر محفوظ اور مستور ہو جائے کہ کوئی نگاہ اسے دیکھ نہ سکے جو عام طور سے غیبت کا مفہوم سمجھا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے کسی انسان کو غائب کہا جاتا ہے۔

اور غیبتِ شخصیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان نگاہوں کے سامنے موجود رہے لیکن اس کی شخصیت

نگاہوں سے غائب رہے جس طرح کہ جناب موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں واضح طور پر یہ بات نظر آتی ہے کہ جناب موسیٰ فرعون کے قصر میں اور اس کی آغوش میں رہے لیکن وہ آخر دم تک ان کی شخصیت کا اندازہ نہ کرسکا اور برابر یہی کہتا رہا کہ کہیں یہ وہی بچہ تو نہیں ہے جس کے بارے میں منجمین نے خبر دی ہے کہ وہ میری سلطنت کے لیے ایک عظیم خطرہ بن کر اُبھرنے والا ہے۔

روایات اور واقعات پر دقت نظر سے کام لیا جائے تو امام زمانہؑ کی غیبت کا یہی مفہوم منظر عام پر آتا ہے اور اسی غیبت کی بنیاد پر ان سارے واقعات کی توجیہ کی جاسکتی ہے جن میں ملاقات امامؑ کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن آپ کی شخصیت کا اندازہ نگاہوں سے غائب ہوجانے کے بعد ہوا اور بروقت یہ احساس بھی نہ پیدا ہوسکا اور اسی مفہوم کی بنیاد پر ان روایات کی توجیہ بھی کی جاسکتی ہے جن میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ آپ کے ظہور کے وقت بہت سے افراد اس بات کے دعویدار ہوں گے کہ ہم نے آپ کو مختلف مقامات پر دیکھا ہے اور مناسک حج کے موقع پر آپ کی زیارت کا باقاعدہ شرف حاصل کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت اس امر کا اندازہ نہیں تھا کہ آپ امام زمانہؑ ہیں اور آج باقاعدہ ظہور کے بعد اس حقیقت کا بھی اعلان ہوگیا ہے۔

غیبت کا پہلا مفہوم بھی بعض اعتبارات سے صحیح ہے اور عام طور سے لوگ آپ کے جمال مبارک کی زیارت سے محروم ہیں لیکن مکمل طور پر غیبت کے باوجود ملاقاتوں کا سلسلہ دوسرے ہی مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ بہرحال غیبت، امام عصرؑ کے ان خصوصیات میں ہے جن کے اعتبار سے آپ کو مظہر اوصاف الٰہیہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا آپ کو پروردگار نے دیگر صفات جمال و کمال کی طرح اپنی غیبت کا مظہر بھی قرار دیا ہے یہ اور بات ہے کہ غیبت الٰہیہ میں کسی طرح کے مشاہدہ کا امکان نہیں ہے اور غیبت امامؑ میں بہرحال مشاہدہ کا امکان بلکہ یقین پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے غیبت امامؑ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غیبت اسلام کے تمام غیب کے درمیان سب سے آسان ترین غیبت ہے جس پر انسان بآسانی ایمان پیدا کرسکتا ہے۔

جب مرد مسلمان اس غیبت الٰہیہ پر ایمان لاچکا ہے جس میں نہ ماضی میں مشاہدہ تھا اور نہ مستقبل میں مشاہدہ کا امکان ہے اور اس غیبت رسول پر ایمان لاچکا ہے جس میں ماضی میں مشاہدہ تھا لیکن مستقبل میں اس دنیا میں عام اسلامی عقائد کی بنیاد پر مشاہدہ کا امکان نہیں ہے اور اس آخرت پر ایمان

رکھتا ہے جس کا ماضی میں کوئی مشاہدہ نہیں تھا اور صرف مستقبل میں مشاہدہ کا یقین ہے اور وہی اس دنیا کی آخری انتہا ہے، تو اس غیبت امامؑ پر ایمان لانے میں کیا تکلف ہے جس میں ماضی اور مستقبل دونوں طرف مشاہدہ پایا جاتا ہے اور صرف دور حاضر غیبت کا دور کہا جاتا ہے اور اس کے علاوہ مستقل غیب کا کوئی سوال نہیں ہے۔

امامؑ کی غیبت ہی سے ظہور کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے ظہور کا مفہوم بھی کسی گمنام مقام یا جزیرہ سے منتقل ہوکر کسی خاص مقام پر نمایاں ہوجانا نہیں ہے بلکہ نگاہوں سے اس پردہ کا اُٹھ جانا ہے جو آج امت اور امامؑ کے درمیان حائل ہے، یا شخصیت کے اس ابہام کا ختم ہوجانا ہے جو مصلحت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہے اور جس کی بنا پر شخصیت کا باقاعدہ تعارف نہیں ہو رہا ہے اگرچہ امکان ہے کہ وہ ہمارے مشاہدہ میں برابر یا کبھی کبھی آرہا ہو اور شاید اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مالک کائنات نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

"ہمارے کسی بندہ کو حقیر نہ سمجھ لینا کہیں وہ ہمارا کوئی ولی نہ ہو"۔ ہم اپنے ماحول کی کمزوریوں کی بنا پر شخصیت کو لباس اور ظاہری آرائش و زیبائش سے پہچانتے ہیں اور اولیاء خدا کا انداز اس سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے لہٰذا اس کا امکان بہرحال رہتا ہے کہ ہم کسی انسان کو معمولی سمجھ کر اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھیں اور بعد میں وہ ولی خدا ثابت ہو، اور ہم کو ولی خدا کی توہین کا جواب وہ ہونا پڑے جس کے بارے میں روایت میں وارد ہوا ہے کہ جس نے میرے ولی کی توہین کی اس نے مجھے دعوت جنگ دے دی اور میرے مقابلہ پر کھڑا ہوگیا۔ میں اپنے ولی کی عزت کو اپنی عزت اور اس کی توہین کو اپنی توہین تصور کرتا ہوں، صاحبانِ ایمان کی عزت، عزت الٰہیہ سے وابستہ ہے اور ان کی توہین بھی توہینِ پروردگار کے مرادف ہے۔

واضح رہے کہ امام عصرؑ کے بارے میں تین طرح کے موضوعات زیر بحث آتے ہیں:

(۱) غیبت (۲) ظہور (۳) انتظار

دو کا تعلق ان کی ذات مبارک سے ہے اور ایک کا تعلق ہمارے فرائض سے ہے۔

غیبت، ظہور اور انتظار کے مفاہیم کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ان سے متعلق تین موضوعات باقی رہ جاتے ہیں جن کی وضاحت بہرحال ضروری ہے۔

غیبت کے سلسلہ میں فرائض دورِ غیبت، انتظار کے سلسلہ میں علامات ظہور، اور ظہور کے بارے میں خصوصیات طرزِ حکومت اور اس امر کی وضاحت کہ امام زمانہؑ ظہور کے بعد کیا امور انجام دیں گے اور کس طرح ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

فرائض دورِ غیبت

علامہ شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے دورِ غیبت امامؑ میں آٹھ طرح کے فرائض کا تذکرہ کیا ہے جو احساس غیبت امامؑ اور انتظار امامؑ کی حقیقت کے واضح کرنے کے بہترین وسائل ہیں اور جن کے بغیر نہ ایمان بالغیب مکمل ہو سکتا ہے اور نہ انسان کو منتظرین امام زمانہؑ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔
ان آٹھ فرائض کی مختصر تفصیل یہ ہے:

۱۔ محزون و رنجیدہ رہنا۔۔ حقیقت امر یہ ہے کہ انسان کو غیبت امامؑ کی حقیقت اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات کا اندازہ ہو جائے تو اس کی زندگی سے مسرت و ابتہاج ناپید ہو جائے زمانہ کے بدترین حالات، اہل زمانہ کے بے پناہ ظلم و ستم، نظام اسلامی کی بربادی تعلیمات الٰہیہ کا استہزاء اور اس طرح کے بے شمار معاملات ہیں جن سے غیبت امامؑ کے نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ان کا احساس ہی انسان کے آنسو بہانے کے لیے کافی ہے۔ پھر اگر یہ بات صحیح ہے کہ امامؑ انسان کی زندگی کی محبوب ترین شخصیت کا نام ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ محبوب نگاہوں سے اوجھل رہے اور عاشق کے دل میں اضطراب اور بے قراری نہ پیدا ہو اور وہ اپنے محبوب کی طرف سے اس طرح غافل ہو جائے کہ مخصوص تاریخوں اور مواقع کے علاوہ اس کے وجود اور اس کی غیبت کا احساس بھی نہ پیدا کرے۔

دعائے ندبہ میں انھیں تمام حالات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے اور اسی لیے اس دعا کو دعائے ندبہ کہا جاتا ہے کہ انسان اس کے مضامین کی طرف متوجہ ہو جائے اور غیبت امامؑ کی مصیبت کا صحیح اندازہ کر لے تو گریہ اور ندبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور شاید اسی لیے اس دعا کی تاکید ایامِ عید میں کی گئی ہے یعنی روز عید فطر، روز عید قربان۔ روز عید غدیر اور روز جمعہ جسے بعض اسلامی احکام کے اعتبار سے عید سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عید کا دن انسان کے لیے انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔

اور اس دن ایک محب اور عاشق کا فرض ہے کہ اپنے محبوب حقیقی کے فراق کا احساس پیدا کرے اور اس کی فرقت پر آنسو بہائے تاکہ اسے فراق کی صحیح کیفیت کا اندازہ ہو سکے جیسا کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی عید کا دن آتا ہے تو ہم آلِ محمدؐ کا غم تازہ ہو جاتا ہے کہ ہم اپنا حق اغیار کے ہاتھوں پامال ہوتے دیکھتے ہیں اور مصلحت الٰہیہ کی بنیاد پر کوئی آواز بھی بلند نہیں کر سکتے ائمہ معصومینؑ میں مولائے کائنات کے دور سے امام عسکریؑ تک ہر امامؑ نے غیبت کے نقصانات اور مصائب کا تذکرہ کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کائنات میں خیر صرف اس وقت نمایاں ہوگا جب ہمارا قائمؑ قیام کرے گا اور اس سے پہلے اس دنیا سے کسی واقعی خیر کی امید نہیں کی جا سکتی ہے تاکہ انسانِ مومن بدترین حالات سے بھی مایوس نہ ہو جائے اور پھر انھیں حالات سے راضی اور مطمئن بھی نہ ہو جائے کہ یہ اس کے نقص ایمان کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا۔

اس مقام پر سدیر صیرفی کی اس روایت کا نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ میں (سدیر) اور مفضل بن عمر اور ابو بصیر اور ابان بن تغلب امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خاک پر بیٹھے ہوئے بے تحاشہ گریہ فرما رہے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ میرے سردار! تیری غیبت نے میری مصیبت کو عظیم کر دیا ہے، میری نیند کو ختم کر دیا ہے اور میری آنکھوں سے سیلاب اشک جاری کر دیا ہے۔۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر عرض کی کہ فرزندِ رسولِ خدا آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے یہ گریہ کا کون سا انداز ہے اور خدانخواستہ کون سی تازہ مصیبت آپ پر نازل ہو گئی ہے؟۔۔ تو فرمایا کہ میں نے کتاب جفر کا مطالعہ کیا ہے جس میں قیامت تک کے حالات کا ذکر موجود ہے تو اس میں آخری وارث پیغمبرؐ کی غیبت اور طول غیبت کے ساتھ اس دور میں پیدا ہونے والے بدترین شکوک و شبہات اور ایمان و عقیدہ کے تزلزل کے حالات اور پھر شیعوں کے مبتلائے شک و ریب ہونے اور تغافل اعمال کا مطالعہ کیا ہے اور اس امر نے مجھے اس طرح بے قرار ہو کر رونے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس غیبت میں صاحبانِ ایمان کا کیا حشر ہوگا اور ان کا ایمان کس طرح محفوظ رہ سکے گا۔

عزیزانِ گرامی!۔ اگر ہمارے حالات اور ہماری بداعمالیاں سیکڑوں سال پہلے امام صادقؑ کو بے قرار ہو کر رونے پر مجبور کر سکتی ہیں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم اس دورِ غیبت میں ان

حالات اور آفات کا اندازہ کرکے کم ازکم روز جمعہ خلوص دل کے ساتھ دعائے ندبہ کی تلاوت کرکے اپنے حالات پر خود آنسو بہائیں کہ شاید اسی طرح ہمارے دل میں عشقِ امام زمانہؑ کا جذبہ پیدا ہوجائے اور ہم کسی آن ان کی یاد سے غافل نہ ہونے پائیں جس طرح کہ انھوں نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم کسی وقت بھی اپنے چاہنے والوں کی یاد سے غافل نہیں ہوتے ہیں اور نہ ان کی نگرانی کو نظر انداز کرتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اعتماد ہمارے اوپر رہے اور ان کی حفاظت و رعایت کی ذمہ داری بھی ہمارے ہی حوالے کی گئی ہے۔

۲۔ انتظار حکومت و سکون آل محمدؐ ۔ اس انتظار کو دورِ غیبت میں افضل اعمال قرار دیا گیا ہے اور اس میں اس امر کا واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ایک دن آل محمدؐ کا اقتدار ضرور قائم ہونے والا ہے اور مومنین کرام کی ذمہ داری ہے کہ اس دن کا انتظار کریں اور اس کے لیے زمین ہموار کرنے اور فضا کو سازگار بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔

اب یہ دور کب آئے گا اور اس کا وقت کیا ہے ؟ یہ ایک رازِ الٰہی ہے جس کو تمام مخلوقات سے مخفی رکھا گیا ہے۔ بلکہ روایات میں یہاں تک وارد ہوا ہے کہ امیرالمومنینؑ کے زخمی ہونے کے بعد آپ کے صحابی عمرو بن الحمق نے آپ کی عیادت کرتے ہوئے عرض کی کہ مولا! ان مصائب کی انتہا کیا ہے ؟ تو فرمایا کہ ۷۰ھ تک۔ عرض کی کہ کیا اس کے بعد راحت و آرام ہے ؟ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور غش کھا گئے۔

اس کے بعد جب غش سے افاقہ ہوا تو دوبارہ سوال کیا۔ فرمایا بے شک ہر بلا کے بعد سہولت اور آسانی ہے لیکن اس کا اختیار پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔

اس کے بعد ابوحمزہ ثمالی نے امام باقرؑ سے اس روایت کے بارے میں دریافت کیا کہ ۷۰ھ تو گزر چکا ہے لیکن بلاؤں کا سلسلہ جاری ہے؟ تو فرمایا کہ شہادت امام حسینؑ کے بعد جب غضب پروردگار شدید ہوا تو اس نے سہولت و سکون کے دور کو آگے بڑھا دیا۔

پھر اس کے بعد ابوحمزہ نے یہی سوال امام صادقؑ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ بے شک غضب الٰہی نے اس مدت کو دوگنا کر دیا تھا، اس کے بعد جب لوگوں نے اس راز کو فاش کر دیا تو پروردگار نے اس دور کو مطلق راز بنا دیا اور اب کسی کو اس امر کا علم نہیں ہو سکتا ہے، اور

ہر شخص کا فرض ہے کہ اس دور کا انتظار کرے کہ انتظارِ ظہور کرنے والا مر بھی جائے گا تو وہ قائم آل محمدؐ کے اصحاب میں شمار کیا جائے گا۔

۳۔ امام کے وجود مبارک کی حفاظت کے لیے بارگاہِ احدیت میں دست بدعا رہنا۔ ظاہر ہے کہ دعا ہر اس مسئلہ کا علاج ہے جو انسان کے امکان سے باہر ہو اور جب دورِ غیبت میں امامؑ کی حفاظت کسی اعتبار سے بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہے اور ہم خود انھیں کے رحم و کرم سے زندہ ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے وجود مبارک کی حفاظت کے لیے بارگاہِ احدیت میں مسلسل دعائیں کرتے رہیں اور کسی وقت بھی اس فرض سے غافل نہ ہوں۔ "اللھم کن لولیك الحجۃ بن الحسن" جسے عام طور سے اثنائے نماز قنوت یا بعد نماز وظیفہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ امام علیہ السلام کے وجود کی حفاظت، ان کے ظہور کی سہولت اور ان کی عادلانہ حکومت کے بارے میں جامع ترین دعا ہے، جس سے صاحبانِ ایمان کو کسی وقت غافل نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ امام کی سلامتی کے لیے صدقہ نکالنا۔ صدقہ درحقیقت خواہشِ سلامتی کا عملی اظہار ہے کہ انسان جس کی سلامتی کی واقعاً تمنا رکھتا ہے اس کے حق میں صرف لفظی طور پر دعا نہیں کرتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی دفع بلا کا انتظام کرتا ہے اور یہ انتظام صدقہ سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ دعا ان لوگوں کے لیے بہترین شے ہے جو صدقہ دینے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس یہ استطاعت پائی جاتی ہے وہ اگر صرف دعا پر اکتفا کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف لفظی کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور امامؑ کی سلامتی کے لیے چند پیسے بھی خرچ نہیں کرنا چاہتے ہیں جب کہ جو کچھ مالک کائنات سے لیا ہے وہ سب انھیں کے صدقہ میں لیا ہے اور جو کچھ آئندہ لینا ہے وہ بھی انھیں کے طفیل میں اور انھیں کے وسیلہ سے حاصل کرنا ہے۔

۵۔ امام عصرؑ کی طرف سے حج کرنا یا دوسروں کو حج نیابت کے لیے بھیجنا۔ جو دورِ قدیم سے شیعوں کے درمیان مرسوم ہے کہ لوگ اپنے امام زمانہ کی طرف سے نیابۃً اعمال انجام دیا کرتے تھے اور امام عصرؑ ان کے ان اعمال کی قدردانی بھی فرمایا کرتے تھے جیسا کہ ابومحمد دعلجی کے حالات میں نقل کیا گیا ہے کہ انھیں کسی شخص نے امام عصرؑ کی طرف سے نیابۃً حج کے لیے پیسے دیے تو انھوں نے

اپنے فاسق و فاجر اور شرابی فرزند کو حج نیابتِ امامؑ کے لیے اپنے ساتھ لے لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میدانِ عرفات میں ایک انتہائی نوجوان شخص کو دیکھا جو یہ فرما رہے ہیں کہ تمھیں اس بات سے حیا نہیں آتی ہے کہ لوگ تمھیں حج نیابت کے لیے رقم دیتے ہیں تو تم فاسق و فاجر افراد کو یہ رقم دے دیتے ہو قریب ہے کہ تمھاری آنکھ ضائع ہو جائے کہ تم نے انتہائی اندھے پن کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ راوی کہتا ہے کہ حج سے واپسی کے چالیس روز کے بعد ان کی وہ آنکھ ضائع ہو گئی جس کی طرف اس مردِ نوجوان نے اشارہ کیا تھا۔

۶۔ امام عصرؑ کا اسمِ گرامی آنے پر قیام کرنا۔ بالخصوص اگر آپ کا ذکر لفظ قائمؑ سے کیا جائے کہ اس میں حضرت کے قیام کا اشارہ پایا جاتا ہے اور آپ کے قیام کے تصوّر کے ساتھ کھڑا ہو جانا محبت، عقیدت اور غلامی کا بہترین مقتضیٰ ہے جس سے کسی وقت بھی غفلت نہیں کی جا سکتی ہے۔

۷۔ دورِ غیبت میں حفاظت دین و ایمان کے لیے دعا کرتے رہنا۔ امام صادقؑ نے زرارہ سے فرمایا تھا کہ ہمارے قائم کی غیبت میں اس قدر شبہات پیدا کیے جائیں گے کہ اچھے خاصے لوگ مشکوک ہو جائیں گے لہذا اُس دور میں ہر شخص کا فرض ہے کہ سلامتیٔ ایمان کی دعا کرتا رہے اور یادِ امامؑ میں مصروف رہے اور عبداللہ بن سنان کی امام صادقؑ سے روایت کی بنا پر کم سے کم "یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك" کا وِرد کرتا رہے کہ سلامتیٔ دین و ایمان کے لیے یہ بہترین اور مختصر ترین دعا ہے۔

۸۔ امام زمانہؑ سے مصائب و بلیات کے موقع پر استغاثہ کرنا۔ کہ یہ بھی اعتقاد کے استحکام اور روابط و تعلقات کے دوام کے لیے بہترین طریقہ ہے اور پروردگارِ عالم نے ائمہ طاہرینؑ کو یہ طاقت اور صلاحیت دی ہے کہ وہ فریاد کرنے والوں کی فریاد رسی کر سکتے ہیں جیسا کہ ابوطاہر بن بلال نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ پروردگار جب اہلِ زمین تک کوئی برکت نازل کرنا چاہتا ہے تو پیغمبر اکرمؐ سے امام آخرؑ تک سب کو وسیلہ قرار دیتا ہے اور ان کی بارگاہوں سے گزرنے کے بعد برکت بندوں تک پہونچتی ہے اور جب کسی عمل کو منزلِ قبولیت تک پہونچانا چاہتا ہے تو امام زمانہؑ سے رسولِ اکرمؐ تک ہر ایک کے وسیلہ سے گزار کر اپنی بارگاہ جلالت پناہ تک

پہونچاتا ہے اور پھر قبولیت کا شرف عنایت کرتا ہے بلکہ خود امام عصرؑ نے بھی شیخ مفیدؒ کے خط میں تحریر فرمایا تھا کہ تمھارے حالات ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں اور ہم تمھارے مصائب کی مکمل اطلاع رکھتے ہیں اور برابر تمھارے حالات کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔

علامہ مجلسیؒ نے تحفۃ الزائر میں نقل کیا ہے کہ صاحبانِ حاجت کو چاہیے کہ اپنی حاجت کو کسی کاغذ پر لکھ کر ائمہ طاہرینؑ کی قبور مبارکہ پر پیش کر دیں یا کسی خاک میں رکھ کر دریا یا نہر وغیرہ کے حوالہ کر دیں کہ امام زمانہؑ اس حاجت کو پورا فرما دیں گے۔ اس عریضہ کی ترسیل میں آپ کے چار وں نوابِ خاص میں سے کسی کو بھی مخاطب بنایا جا سکتا ہے۔ انشاء اللہ وہ اسی طرح امام کی بارگاہ میں پیش کریں گے جس طرح اپنی زندگی میں اس فرض کو انجام دیا کرتے تھے اور امام علیہ السلام اسی طرح مقصد کو پورا کریں گے جس طرح اُس دور میں کیا کرتے تھے۔

مَنْ اَنْکَرَ خُرُوْجَ الْمَهْدِیِّؑ

اسلامی روایات کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے اپنی زندگی میں قیامت تک پیش آنے والے بیشتر واقعات کی وضاحت کر دی تھی اور پروردگار کی طرف سے ترتیب پانے والے نظامِ ہدایت کی صراحت فرما دی تھی۔

آیتِ اولی الامر کی وضاحت کرتے ہوئے ان تمام افراد کے ناموں کا بھی تذکرہ کر دیا تھا جنھیں پروردگار کی طرف سے منصبِ ہدایت تفویض ہوا تھا اور جن کے ذمہ صبحِ قیامت تک ہدایتِ عالم کی ذمہ داری تھی۔

اس سلسلہ میں ایک عنوانِ "مہدی" بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس کی بار بار تکرار کی گئی ہے اور جس کے ذریعہ امت کو سمجھایا گیا ہے کہ کائنات کے لیے ایک مہدی کا وجود لازمی ہے، اور دنیا اس وقت فنا نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ مہدی منظرِ عام پر آ کر ہدایتِ عالم اور اصلاحِ امت کا فرض انجام نہ دے دے۔

لفظ "مہدی" کی تعبیر میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ تھا کہ وہ ایسا ہادی ہوگا جو اپنی رہنمائی میں کسی کی ہدایت کا محتاج نہ ہوگا بلکہ اسے پروردگارِ عالم کی طرف سے ہدایت حاصل ہوگی اور وہ دنیا کی ہدایت کا فرض انجام دے گا۔

یہ بات امتِ اسلامیہ میں اس قدر واضح تھی کہ ہر دور کے مسلمان کو ایک مہدی کی تلاش تھی اور بسا اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ خود ہی مہدی بن گئے یا سلاطینِ زمانہ نے اپنی اولاد کے نام مہدی رکھ دیے تاکہ امت کے درمیان جانے پہچانے لقب سے فائدہ اٹھایا جا سکے، اور انھیں یہ سمجھایا جا سکے کہ جس کی آمد کی خبر سرکارِ دو عالمؐ نے دی تھی وہ مہدی میرے گھر میں پیدا ہو چکا ہے۔

بالکل "مہدی" ہی کی طرح کا ایک عنوان "قائم" بھی تھا جس کا تذکرہ بار بار روایات میں وارد ہوا ہے اور اس کثرت سے وارد ہوا ہے کہ سلسلۂ امامت کے درمیانی دور ہی سے امت کو ایک "قائم" کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور جب بھی وہ حالات پیدا ہو گئے یا مظالم اُس منزل پر آ گئے جس منزل پر امت کے خیال میں "قائم" کا قیام ضروری تھا ایک "قائم" کی تلاش میں شدت پیدا ہو گئی اور لوگ بے چینی سے اس مصلحِ امت کا انتظار کرنے لگے جس کے قیام سے عالمِ انسانیت کی اصلاح ہو جائے گی اور دنیا کے حالات یکسر تبدیل ہو جائیں گے۔

بلکہ اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ ائمہ معصومینؑ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر برجستہ یہ سوال کرتے تھے کہ کیا سرکار ہی "قائم آلِ محمدؐ" ہیں؟ یا اپنے جس فرزند کی امامت کا اعلان کر رہے ہیں اور اس کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہیں یہی "قائم آلِ محمدؐ" ہے۔ یعنی امت کے ذہن میں "قائم" کا تصور اور "قائم" کے ساتھ بساطِ ظلم و جور کے فنا ہو جانے اور عدل و انصاف کے قائم ہونے کا تصور اس قدر راسخ تھا کہ جہاں حالات سے پریشانی پیدا ہوئی اور عدل و انصاف کی ضرورت محسوس ہوئی وہیں ایک "قائم" کی جستجو کا خیال صفحۂ ذہن پر اُبھر آیا اور چوں کہ مرسلِ اعظمؐ نے مصلحِ امت کا تصور اپنی ہی نسل اور اپنے ہی خاندان کے بارے میں دیا تھا اس لیے لوگ اسی خاندان میں تلاش کرنے لگتے اور اس کی ہر فرد سے اصلاح کی آخری امید وابستہ کر کے اسے "قائم" کے لقب سے یاد کرنے لگتے۔

آئمہ معصومینؑ نے بھی یہ اہتمام برقرار رکھا کہ ایک طرف یہ وضاحت کرتے رہے کہ ہم "قائم" نہیں ہیں یا ابھی آلِ محمدؐ کے قیام کا وقت نہیں آیا ہے۔ "قائم" اس کے بعد آنے والا ہے اور دوسری طرف جہاں بھی لفظ "قائم" زبان پر آیا وہیں سروقد کھڑے ہو گئے اور گویا کہ ایک طرح کا فرضِ تعظیم بجا لائے جس کا ظاہری تصور یہی تھا کہ "قائم" ایسی باعظمت شخصیت کا نام ہے جس کے تذکرہ پر اس کے آبا و اجداد بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور تعظیم و تکریم کا انداز اختیار کر لیتے ہیں جس طرح کہ عظمتِ زہراؑ کے اظہار کے لیے مرسلِ اعظمؐ قیام فرماتے تھے۔ لیکن حقیقی اعتبار سے اس کا ایک دقیق تر نکتہ یہ بھی تھا کہ آئمہ معصومینؑ اس طرزِ عمل کے ذریعہ قوم کے ذہن میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتے تھے کہ "قائم" کا کام تنہا قیام کرنا نہیں ہے کہ وہ اپنے قیام و جہاد کے ذریعہ سارے عالم کی اصلاح کرے اور امت خاموش تماشائی بنی رہے جس طرح کہ قومِ موسیٰؑ نے جنابِ موسیٰؑ سے کہا تھا کہ

آپ اور ہارون جاکر اصلاح کا فرض انجام دیں، ہم یہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ کو بنی اسرائیل کا یہ قعود اور ان کی بے حسی اس قدر ناگوار تھی کہ آپ اپنی قوم کو اس کے بالکل برعکس انداز میں تربیت دے رہے تھے کہ وہاں نبی خدا قیام کے لیے آمادہ تھا اور قوم بیٹھی ہوئی تھی اور یہاں قیام کی شان یہ ہے کہ ابھی صرف اس کے نام "قائم" کا ذکر آیا ہے اور ہم اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاکہ تمھارے ذہن میں یہ تصور راسخ رہے کہ جب وہ ظاہر بظاہر تمھارے سامنے آجائے اور قیام کے لیے آمادہ ہو جائے تو خبردار تم خاموش نہ بیٹھے رہ جانا اور تمھاری حیثیت ایک تماشائی کی نہ ہو جائے۔ بلکہ تمھارا فرض ہے کہ جیسے ہی وہ قیام کا ارادہ کرے تم بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اصلاح عالم کی مہم میں اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ ورنہ صرف کسی کے نام آجانے پر اس کے بزرگوں کا کھڑا ہو جانا کوئی دقیق توجیہ نہیں رکھتا ہے۔ صدیقہ طاہرہؑ کے لیے پیغمبر اسلامؐ کا قیام ان کی تشریف آوری پر ہوتا تھا ان کے نام پر نہیں۔ اور ائمہ معصومینؑ کا یہ قیام بھی باقی القاب و خطابات سے وابستہ نہیں تھا بلکہ صرف لفظ "قائم" سے وابستہ تھا جس کا کھلا ہوا مطلب یہ تھا کہ ان کے نام پر قیام مطلوب ہے اور اس شخصیت کے ساتھ شریک قیام و جہاد ہونا اسلامی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔

علماء اعلام کی تعلیم اور ان کا طریقۂ کار آج بھی یہی ہے کہ جب وارثِ پیغمبرؑ کا ذکر اس لقب کے ساتھ ہوتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور حضرت کی خدمت میں زبان حال سے عرض کرتے ہیں کہ ہم حضور کے ساتھ قیام کے لیے تیار ہیں۔ بس آپ کے ظہور و قیام کی دیر ہے اس کے بعد ہم آپ کی خدمت میں رہیں گے اور اصلاح عالم کی مہم میں آپ کی ہر امکانی مدد کریں گے۔

"مہدی" اور "قائم" یہ دو الفاظ دو مختلف لیکن باہم مربوط حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لفظ "مہدی" اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ دنیا کی اصلاح کسی خود ساختہ یا زمانہ ساز ہادی کے ذریعہ نہیں ہو سکتی ہے، اس کے لیے وہ شخص درکار ہے جس کی ہدایت کا انتظام قدرت کی طرف سے کیا گیا ہو، اور اسے پروردگار نے مہدی بنا کر ہدایت کا ذمہ دار بنایا ہو، اور "قائم" اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اصلاح عام کا کام گھر بیٹھے انجام نہیں پا سکتا ہے اس کے لیے قیام کرنا ہوگا، زحمتیں برداشت کرنا ہوں گی، مصائب اور طوفانوں کا مقابلہ کرنا ہوگا اور

ظلم و جور کے عالم گیر ہنگامہ سے ٹکرانا ہوگا۔

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ نے ہر دور میں طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے، ہر دور میں مصائب برداشت کیے ہیں اور بنی امیہ و بنی عباس کے فراعنہ و جبابرہ سے ٹکر لی ہے لیکن اس کے باوجود انھیں قائم کے لقب سے یاد نہیں کیا گیا۔

امام حسینؑ کا قیام کربلا میں، امام سجادؑ کا قیام یزید اور یزیدیت کے مقابلہ میں، امام باقرؑ و امام صادقؑ کا قیام بنی امیہ و بنی عباس کے مظالم کے سامنے، امام کاظمؑ و امام رضاؑ کا قیام ہارون و مامون کے ظلم و جور کے سامنے، امام جوادؑ و امام نقیؑ و امام عسکریؑ کا قیام سلاطین وقت کے مقابلہ میں کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ ان میں کے اکثر قیام مسلح نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ ائمہ کرامؑ نے اپنے کو حکومتوں کے سپرد کر دیا تھا اور نہ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ حالات سے بالکل الگ تھلگ رہے اور امت کی بربادی کا منظر دیکھتے رہے۔ انھوں نے اپنے اپنے ظاہری امکان بھر ہر موقع پر قیام کیا ہے اور حکومت کو اس کے ظلم و جور پر متنبہ کیا ہے بلکہ عوام کو بھی حکومتوں کے مظالم سے آگاہ کیا ہے۔ صفوان جمال سے یہاں تک فرما دیا تھا کہ ان حکام کو جانور کرایہ پر دینا بھی ان کی زندگی کی تمنا کے برابر ہے اور ظالم کی زندگی کی تمنا اس کے ظلم میں شرکت کے مرادف ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ان تمام مجاہدات کے باوجود ان معصومینؑ کو لفظ قائم سے نہیں یاد کیا گیا اور یہ حضرات خود فرماتے رہے کہ "قائم" اس کے بعد آنے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری "قائم" کے ذمہ جو کام رکھا گیا ہے وہ ان سب سے زیادہ اہم اور سنگین ہے اور اس کا انقلاب آخری اور دائمی ہوگا۔ اس کا فریضہ ظالم سے مقابلہ کرنا اور اسے فنا کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کا فریضہ ظلم و جور کا استیصال کرنا ہے۔ اس کے دور میں صرف کسی ایک ظالم حکومت کا سامنا نہیں کرنا ہوگا بلکہ اسلام و کفر کی تمام انحرافی قوتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ وہ منحرف مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں، عیسائیوں، کافروں، مشرکوں اور بے دینوں سے بیک وقت مقابلہ کرے گا اور ظاہر ہے کہ اتنے بڑے مقابلہ کے لیے اسی طرح کی توانائی کی ضرورت ہوگی اور اتنے بڑے جہاد کے لیے ایسا ہی حوصلہ درکار ہوگا۔

مثالی انداز سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اسلام کی غربت کے دور میں امام حسینؑ نے

تن تنہا اپنے مختصر ساتھیوں کے ساتھ پوری قوتِ ظلم و جور کے مقابلہ میں قیام کیا تھا اسی طرح یہ وارثِ حسینؑ ساری دنیا کے ظلم و جور کے مقابلہ میں اپنے چند مخصوص اصحاب کے ساتھ قیام کرے گا اور اس قیام کی عظمت وہی افراد پہچانیں گے جو قیام کربلا کی اہمیت سے آشنا ہیں، اور اس قائم کی ہمت و جرأت کی قدر وہی افراد کریں گے جو اصلاح و انقلاب و جہاد و قیام کے مفہوم سے آشنائی رکھتے ہیں۔ قدرت نے اس آخری حجت کو ایک عظیم کربلا کا ذمہ دار بنایا ہے تو مناسبت برقرار رکھنے کے لیے اور جہاد کی عظمت کا اعلان کرنے کے لیے اس کے آخری فرائض کی ذمہ داری حضرت امام حسینؑ ہی کے سپرد فرمائی ہے۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ آغازِ رجعت میں سب سے پہلے امام حسینؑ ہی کا ظہور ہوگا اور آپ ہی امام عصرؑ کی تجہیز و تکفین کا فرض انجام دیں گے تاکہ معصوم کے امور تجہیز و تکفین معصوم ہی انجام دے اور دنیا پر واضح ہو جائے کہ یہ آخری کربلا ہے جس کا فاتح آخری وارثِ حسینؑ بن علیؑ ہے۔

اسی لیے آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ امام عصرؑ کا تعارف روایات میں فرزند حسینؑ ہی کے نام سے کرایا گیا ہے اور امام حسینؑ کے بعد ائمہ معصومینؑ کو فرزندانِ حسینؑ سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں کے آخری فرزندِ حسینؑ کو امام زمانہؑ کہا گیا ہے۔

بہر حال ایک "مہدی" اور ایک "قائم" کا وجود اصلاح دنیا کی ضرورت، اعتبارِ پیغمبرؐ کی صداقت اور قدرت کے نظام ہدایت کی تکمیل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اب اگر مہدیؑ کا انکار کر دیا جائے گا تو گویا سارا نظامِ ہدایت ناقص اور سارا کلامِ پیغمبرؐ غیر صادق ہو جائے گا اور یہ بات مزاجِ اسلام کے خلاف ہے۔ اسی لیے روایت میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ جس نے خروج مہدیؑ کا انکار کر دیا گویا اس نے پیغمبر پر نازل ہونے والے تمام قانون کا انکار کر دیا جس طرح کہ پہلی منزل پر یہی اعلان غدیر خم میں ہوا تھا اور اب آخری منزل پر ظہور امام عصرؑ کے بارے میں ہو رہا ہے۔ اول با آخر نسبتے دارد۔ تاریخ آلِ محمدؐ برابر مربوط اور مسلسل ہے، یہاں اولنا محمدؐ و آخرنا محمدؐ و کلنا محمدؐ، ایک حقیقت ہے۔

علاماتِ ظہور:

امام عصرؑ کے ظہور کے بارے میں روایات میں جن علامات کا ذکر کیا گیا ہے۔۔۔ ان کی

دو قسمیں ہیں:

(۱) حتمی اور (۲) غیر حتمی

بعض علامتیں حتمی ہیں جن کا وقوع بہرحال ضروری ہے اور ان کے بغیر ظہور کا امکان نہیں ہے۔ اور بعض غیر حتمی ہیں جن کے بعد ظہور ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اس امر کا واضح امکان موجود ہے کہ ان علامات کا ظہور نہ ہو اور حضرتؑ کا ظہور ہو جائے اور اس امر کا بھی امکان ہے کہ ان سب کا ظہور ہو جائے اور اس کے بعد بھی حضرتؑ کے ظہور میں تاخیر ہو۔

ذیل میں دونوں قسم کی علامتوں کا ایک خاکہ نقل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ان روایات کا صدور آج سے سیکڑوں سال پہلے ہوا ہے اور ان کے مخاطب اس دور کے افراد تھے اور ان کے متعلقات کا تعلق سیکڑوں سال بعد کے واقعات سے تھا جن کا سابقہ اُس دور کے افراد سے ہوگا اور اس بنا پر یہ طے کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ روایات میں استعمال ہونے والے الفاظ سے مراد کیا ہے اور یہ الفاظ اپنے لغوی معانی میں استعمال ہوئے ہیں یا ان میں کسی استعارہ اور کنایہ سے کام لیا گیا ہے۔

اگر روایات کا تعلق احکام سے ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ احکام کے بیان میں ابہام و اجمال بلاغت کے خلاف اور مقصد کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ روایات کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ واقع ہونے والے حادثات سے ہے اور ان کی تشریح کی کوئی ذمہ داری بیان کرنے والے پر نہیں ہے بلکہ شاید مصلحت اجمال اور ابہام ہی کی متقاضی ہو کہ ہر دور کا انسان اپنے ذہن کے اعتبار سے معانی طے کرے اور اس معنی کے واقع ہوتے ہی ظہورِ امامؑ کے استقبال کے لیے تیار ہو جائے ورنہ اگر واضح طور پر علامات کا ذکر کر دیا گیا اور انسان نے سمجھ لیا کہ ابھی علامات کا ظہور نہیں ہوا ہے تو ظہور امامؑ کی طرف سے مطمئن ہو کر مزید بدعملی میں مبتلا ہو جائے گا۔

یہ سوال ضرور رہ جاتا ہے کہ پھر اس قسم کے علامات کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ۔۔۔ لیکن اس کا بالکل واضح سا جواب یہ ہے کہ معصومین علیہم السلام نے جب بھی ان آنے والے واقعات کا اشارہ دیا اور فرمایا کہ ایک دور آنے والا ہے جب دنیا ظلم و جور سے بھر جائے گی لیکن یہ دنیا کا اختتام نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد ایک قائم آلِ محمدؐ کا ظہور ہوگا جو عالمی حالات کی اصلاح

کرے گا اور ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا، تو قوم کے ذہن میں دو متضاد تصورات پیدا ہوئے۔ ایک طرف ظلم و ستم کا حال سُن کر مایوسی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی اور دوسری طرف ظہور قائمؑ کی خوش خبری سن کر سکون و اطمینان کا امکان پیدا ہوا تو فطری طور پر یہ سوال ناگزیر ہوگیا کہ ایسے بدترین حالات تو ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے مظالم تو آج بھی نگاہ کے سامنے ہیں اور ابھی دنیا ظلم و جور سے مملو نہیں ہوئی ہے تو جب ظلم و جور سے بھر جائے گی تو اس وقت دنیا کا کیا عالم ہوگا اور اس کے بعد اس اضطراب کا سکون اور اس بے چینی کا اطمینان کب میسر ہوگا اس کے علامات کا معلوم ہونا ضروری ہے تا کہ مظلوم و ستم رسیدہ اور بیکس و بے نوا کو اُس حسین مستقبل کے تصور سے کچھ تو اطمینان حاصل ہو اور ائمہ معصومینؑ کی بھی ذمہ داری تھی کہ علامات کو ایسے کنایہ کے پیرایہ میں بیان کریں کہ ہر دور کا مظلوم سکون و اطمینان کو قریب تر سمجھ سکے اور اس کے لیے اطمینان کا راستہ نکل سکے ورنہ بے شمار صاحبان ایمان مایوسی کا شکار ہو جائیں گے اور رحمتِ خدا سے مایوسی خود بھی ایک طرح کا کفر اور ضلال مبین ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل مقصد کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علمائے اعلام نے سات قسم کی علامات کو حتمی قرار دیا ہے :

۱۔ خروج دجّال

جس کا تذکرہ تمام عالم اسلام کی کتب احادیث میں پایا جاتا ہے اور اس کی طرح طرح کی صفات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ گدھے پر سوار ہوگا۔ ایک آنکھ سے کانا ہوگا، دوسری آنکھ پیشانی پر ہوگی، انتہائی درجہ کا جادوگر ہوگا اور لوگوں کو بہترین نعمتوں کی ترغیب دے گا۔ اس کے لشکر میں ہر طرح کے ناچ گانے کا ساز و سامان ہوگا۔ وہ مختلف علاقوں کا دورہ کر کے لشکر جمع کرے گا اور لوگوں کو گمراہ کرے گا، یہاں تک کہ حضرت کا ظہور ہوگا اور آپ براہ راست یا آپ کی رکاب میں حضرت عیسیٰ بن مریمؑ اسے فنا کر دیں گے۔

ان روایات سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انسان کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ دجّال خود ایک صفت ہے اور اس کے معنی مکّار اور فریب کار کے ہیں اس لیے بہت سے علماء نے اس کے

کنائی معنی مراد لیے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ مکار اور فریب کار حکومتیں ہیں جن کے ساز و سامان دجّال والے ہیں اور جنھوں نے ساری دنیا کو مسحور کر رکھا ہے اور ان کی نظر سرمایہ داری یا مزدوری پر ہے کہ ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ایک آنکھ کو بند کر لیا ہے اور دیکھنے والی آنکھ کو اپنی پیشانی پر اتنا نمایاں کر لیا ہے کہ ہر شخص صرف اس کی چمک دمک دیکھ رہا ہے اور ان کی سواری کے لیے بے شمار انسان موجود ہیں جنھیں قرآن حکیم کی زبان میں بھی گدھا ہی کہا گیا ہے کہ گویا ایک پورا "خرصفت" سماج ہے جس کی پشت پر سوار ہو کر اپنے دجل و فریب کی ترویج کر رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

۲۔ ندائے آسمانی

اس سلسلہ میں روایات میں مختلف آسمانی آوازوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک سلسلۂ اصوات ماہ رجب میں ہے جس میں پہلی آواز ہوگی "ألا لعنة الله على الظالمين" دوسری آواز ہوگی "ازفة الآزفة" اور تیسری آواز قرص آفتاب سے بلند ہوگی کہ امیرالمومنینؑ دوبارہ دنیا میں انتقام کے لیے آ رہے ہیں۔

دوسرا سلسلہ ماہ مبارک رمضان میں ہوگا جہاں ۲۳ رمضان کو ظہور کی خوش خبری کا اعلان کیا جائے گا۔

اور تیسرا سلسلہ وقت ظہور قائم ہوگا جب قرص آفتاب سے حضرتؑ کے مکہ مکرمہ سے ظہور کا اعلان ہوگا اور پورے شجرۂ نسب کے ساتھ اعلان ہوگا اور اس اعلان کو شرق و غرب عالم میں سُنا جائے گا جس کے بعد صاحبانِ ایمان آپ کی بیعت اور نصرت کے لیے دوڑ پڑیں گے، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری شیطانی آواز بھی بلند ہوگی جو مثل جنگ احد بہت سے مسلمانوں کو گمراہ کر دے گی۔

۳۔ خروج سفیانی

اس شخص کا نام عثمان بن عنبہ ہوگا اور یہ یزید بن معاویہ کی اولاد میں سے ہوگا۔ پہلے دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور قنسرین پر حکومت قائم کرے گا اس کے بعد مختلف اطراف میں لشکر روانہ کرے گا جس کا ایک حصہ بغداد کی طرف جائے گا اور نجف و کربلا میں صاحبانِ ایمان کا

قتلِ عام کرے گا۔ دوسرا حصہ مدینہ کی طرف جائے گا اور وہاں قتل عام کرے گا اور پھر مکہ کا رُخ کرے گا لیکن مکہ تک رسائی نہ حاصل کر سکے گا۔ تیسرا حصہ بطرف شام روانہ ہوگا اور راستہ میں لشکر امام عصرؑ سے مقابلہ ہوگا اور اس حصہ کا ایک ایک شخص فنا کر دیا جائے گا۔ مکہ کی طرف جانے والا لشکر تین لاکھ افراد پر مشتمل ہوگا اور ایک صحرا میں دھنس جائے گا، صرف دو افراد باقی رہیں گے۔ ایک مکہ کی طرف جا کر امام عصرؑ کی فتح کی بشارت دے گا اور دوسرا شام کی طرف جا کر سفیانی کو لشکر کی ہلاکت کی اطلاع دے گا۔ اس کے بعد سفیانی خود کوفہ کا رُخ کرے گا اور پھر حضرتؑ کا لشکر تعاقب کرے گا اور وہ فرار کر جائے گا یہاں تک کہ بیت المقدس میں حضرتؑ کے لشکر کے ہاتھوں واصل جہنم کر دیا جائے گا۔

اس روایت میں بھی اگرچہ نام اور نسب کا ذکر موجود ہے لیکن یہ دونوں باتیں عرف عام میں کنایہ کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں جس طرح کہ حضرت عائشہ نے قتلِ عثمانؓ کی ترغیب دیتے وقت عثمانؓ کا نام نہیں لیا تھا بلکہ نعثل کہہ کر یاد کیا تھا کہ مشابہت کی بنا پر دوسرا نام بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی حال شجرۂ نسب کا بھی ہے کہ اس طرح کا قاتل وظالم انسان یزید بن معاویہ کے علاوہ کسی شخص کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ خود یزید کے باپ نے زیاد کو اتحاد کردار کی بنا پر اپنے شجرہ میں شامل کر لیا تھا۔

بہرحال ایسے انسان یا ایسی طاقت کا ظہور ضروری ہے اور خدا جانے کب انکشاف ہو جائے کہ موجودہ طاقت وہی طاقت ہے جسے سفیانی سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظہور امامؑ اور جہاد امامؑ کا وقت آگیا ہے، لہٰذا مومنین کرام کو ہر وقت اس جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے اور کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ قتل نفس زکیہ

یعنی اولاد رسول اکرمؐ میں ایک محترم اور پاکیزہ نفس انسان کو خانۂ کعبہ کے پاس رکن و مقام کے درمیان قتل کر دیا جائے گا اور اس کے بعد حضرتؑ کا ظہور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب روایت میں کسی تفصیل کا ذکر نہیں ہے تو کوئی بھی محترم کسی وقت بھی قتل ہو سکتا ہے اور اس کے بعد امام عصرؑ کا ظہور ہو سکتا ہے جب کہ حکومت وقت ہمہ وقت اولاد رسولؐ کے قتل وخون کی درپے رہتی ہے۔

۵۔ خروج سید حسنی

دیلم اور قزوین کی طرف سے ایک سید حسنی جن کا شجرۂ نسب امام حسن مجتبیٰؑ تک پہونچتا ہے خروج فرمائیں گے اور وہ نصرت امامؑ کے حق میں آواز بلند کریں گے جس پر طالقان کی ایک عظیم سپاہ آپ کے گرد جمع ہو جائے گی اور آپ کوفہ کا رُخ کریں گے اور راستہ میں ظالموں کا قلع قمع کرتے جائیں گے اور اس وقت یہ خبر نشر ہوگی کہ امام عصرؑ نے ظہور فرمایا ہے اور کوفہ تشریف لے آئے ہیں۔ سید حسنی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے دلائل امامت کا مطالبہ کریں گے تاکہ تمام لوگوں پر ان کی امامت کا اثبات ہو جائے اور اس کے بعد حضرت کی بیعت کریں گے۔ لیکن ان کے ساتھیوں میں چار ہزار افراد معجزات کو جادو کا نام دے کر نہروان کے خوارج کی طرح بیعت سے انکار کر دیں گے اور بالآخر سب کے سب تہ تیغ کر دیے جائیں گے۔

۶۔ وسط ماہ رمضان میں سورج گرہن اور آخر ماہ رمضان میں چاند گرہن کا واقع ہونا جو عام طور سے نہیں ہوتا ہے اور نہ قابل وقوع تصور کیا جاتا ہے۔

۷۔ آسمان میں ایک پنجہ کا ظاہر ہونا یا چشمۂ خورشید کے قریب سے ایک صورت کا ظاہر ہونا جو اس بات کی علامت ہے کہ آنے والا منظر عام پر آرہا ہے اور قدرت کا منشا ہے کہ ساری دنیا اس حقیقت سے باخبر ہو جائے اور کسی طرح کا ابہام نہ رہ جائے۔ اب اگر کسی انسان کو دن کا سورج بھی نظر نہ آئے تو ایسے بوم صفت اور شپرہ چشم انسان کا کوئی علاج نہیں ہے۔

چشمۂ آفتاب سے شکل وصورت کا ظہور غالباً اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ امامت کا اقتدار زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا ہے اور جس طرح پہلے امامؑ نے آفتاب کو پلٹا کر اپنی امامت اور بندگی کا ثبوت پیش کیا تھا اسی طرح آخری امامؑ بھی آفتاب ہی کے ذریعہ اپنے اقتدار کا اظہار کرے گا اور اپنے دلائل کو روز روشن کی طرح واضح کرے گا۔

آفتاب کے وسیلہ قرار دینے میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ زمین کا سارا نظام آفتاب کی گردش کا تابع ہے اور آفتاب کی گردش اشارۂ امامؑ کی تابع ہے۔ تو جو شخص بھی گردش آفتاب کو منقلب کر سکتا ہے اور ڈوبے ہوئے آفتاب کو مغرب سے نکال سکتا ہے وہ نظام عالم کو کیونکر منقلب نہیں کر سکتا ہے؟ اور ڈوبے ہوئے اسلام وایمان کو مغرب سے کیوں نہیں نمایاں کر سکتا

ہے ؟۔ "ان ھذا الاّ اختلاق"۔

غیر حتمی علامات

غیر حتمی علامات کی فہرست بہت طویل ہے اور بعض حضرات نے سیکڑوں سے گذار کر ان علامات کو ہزاروں کی حدود تک پہونچا دیا ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ان میں اکثر باتیں علامات نہیں ہیں، بلکہ دنیا کے ظلم و جور سے بھر جانے کی تفصیلات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان علامات میں ہر برائی کا تذکرہ موجود ہے جو دنیا کے ظلم و جور اور فسادات سے مملو ہو جانے کا خاصہ ہے۔ علامات کے طور پر حسب ذیل امور کا تذکرہ کیا جاتا ہے :

۱۔ مسجد کوفہ کی دیوار کا منہدم ہو جانا۔
۲۔ شطّ فرات سے کوفہ کی گلیوں میں نہر کا جاری ہو جانا۔
۳۔ شہر کوفہ کا تباہی کے بعد دوبارہ آباد ہونا۔
۴۔ دریائے نجف میں پانی کا جاری ہو جانا۔
۵۔ فرات سے نجف کی طرف نہر کا جاری ہو جانا۔
۶۔ ستارۂ جدی کے قریب دمدار ستارہ کا ظاہر ہونا۔
۷۔ دنیا میں شدید قسم کے قحط کا پیدا ہونا۔
۸۔ اکثر شہروں اور ملکوں میں زلزلہ اور طاعون کا پیدا ہونا۔
۹۔ مسلسل قتل و خون کا ہونا۔
۱۰۔ قرآن مجید کا زیورات سے آراستہ کرنا، مساجد میں سونے کا کام ہونا اور میناروں کا بلند ترین ہونا۔
۱۱۔ مسجد براثا کا تباہ ہو جانا۔
۱۲۔ مشرق زمین میں ایک ایسی آگ کا ظاہر ہونا جس کا سلسلہ تین روز یا سات روز تک جاری رہے۔
۱۳۔ سارے آسمان پر سُرخی کا پھیل جانا۔

۱۴۔ کوفہ میں ہر طرف سے قتل و غارت کا برپا ہونا۔
۱۵۔ ایک جماعت کا بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو جانا۔
۱۶۔ خراسان سے سیاہ پرچم کا برآمد ہونا۔
۱۷۔ ماہ جمادی الثانیہ اور رجب میں شدید قسم کی بارش کا ہونا۔
۱۸۔ عربوں کا مطلق العنان اور آوارہ ہو جانا۔
۱۹۔ سلاطین عجم کا بے آبرو اور بے وقار ہو جانا۔
۲۰۔ مشرق سے ایک ایسے ستارہ کا برآمد ہونا جس کی روشنی چاند جیسی ہو اور شکل بھی دونوں طرف سے کج ہو۔
۲۱۔ تمام عالم میں ظلم و ستم اور فسق و فجور کا عام ہو جانا جس کے بارے میں مولائے کائنات نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ "جب لوگ نماز کو مردہ بنا دیں گے، امانتوں کو ضائع کر دیں گے، جھوٹ کو جائز بنا لیں گے، سود کھائیں گے، رشوت لیں گے، عمارتوں کو انتہائی مستحکم بنائیں گے، دین کو دنیا کے عوض بیچ ڈالیں گے، احمقوں کو استعمال کریں گے، عورتوں کو مشیر بنائیں گے، اقربا سے قطع تعلق کر لیں گے، خواہشات کا اتباع کریں گے، خون کو سستا بنا لیں گے، تحمّل کو دلیل کمزوری اور ظلم کو باعث فخر سمجھ لیں گے، امرا فاجر ہوں گے، وزرا ظالم ہوں گے، عرفا خائن ہوں گے اور قرّا فاسق ہوں گے، جھوٹی گواہیوں کا زور ہوگا۔ فجور کو اعلانیہ انجام دیا جائے گا، قرآن مجید کو زیورات سے آراستہ کیا جائے گا، مسجدوں میں سنہرا کام ہوگا، مینارے طویل ترین ہوں گے، اشرار کا احترام ہوگا، صفوں میں اژدہام ہوگا اور خواہشات میں اختلاف ہوگا، عہد توڑے جائیں گے، عورتوں کو طمع دنیا میں شریک تجارت بنایا جائے گا، فسّاق کی آواز بلند ہوگی اور اسے سنا جائے گا، رذیل ترین آدمی سردار قوم ہوگا، فاجر سے اس کے شر کے خوف سے ڈرا جائے گا، جھوٹے کی تصدیق کی جائے گی، خائن کو امین بنایا جائے گا، ناچ گانے کا کاروبار عام ہوگا اور امت کا آخری آدمی پہلے آدمی پر لعنت کرے گا، عورتیں گھوڑوں پر سواری کریں گی، مرد عورتوں سے مشابہ اور عورتیں مردوں سے مشابہ ہو جائیں گی، لوگ زبردستی گواہی پیش کریں گے اور بغیر حق کو سمجھے ہوئے گواہی دیں گے، علم دین غیر دین کے لیے حاصل

کیا جلئے گا، عمل دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جائے گی، دل بھیڑیوں جیسے اور لباس بکریوں جیسے ہوں گے، دل مردار سے زیادہ بدبودار اور ایلوا سے زیادہ تلخ ہوں گے۔ اُس وقت بہترین مقام بیت المقدس ہوگا جس کے بارے میں لوگ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری منزل وہاں ہوتی۔

اس کے علاوہ اور بھی علامات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اس دور کی عکاسی ہوتی ہے جب ظلم و جور اور فسق و فجور کا دور دورہ ہوگا اور عدل و انصاف اور دین و ایمان دم توڑ دیں گے۔

خصائص وامتیازات امام عصرؑ

ان خصوصیات میں بعض کا تعلق آپ کی ذات مبارک سے ہے اور بعض کا تعلق آپ کے اضافی اوصاف و کمالات سے ہے اور بعض میں آپ کے انداز حکومت اور دورِ اقتدار کی امتیازی حیثیت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ان خصوصیات کی تعداد کا مختصر خاکہ علامہ شیخ عباس قمیؒ نے ۴۶ امور سے مرتب کیا ہے:

۱۔ آپ کا نورِ اقدس بھی انوارِ قدسیہ کے درمیان ایک مخصوص حیثیت کا حامل ہے جیسا کہ احادیث معراج سے ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ شرافتِ نسب، آپ کو جملہ ائمہ طاہرینؑ سے انتساب کے علاوہ قیصر روم اور جناب شمعون وصی حضرت عیسیٰؑ سے بھی انتساب حاصل ہے۔

۳۔ روزِ ولادت روح القدس آپ کو آسمانوں کی طرف لے گیا اور وہاں فضائے قدس میں آپ کی تربیت ہوتی رہی۔

۴۔ آپ کے لیے ایک مخصوص مکان بیت الحمد نام کا ہے جہاں کا چراغ روزِ ولادت سے روشن ہے اور روزِ ظہور تک روشن رہے گا۔

۵۔ آپ کو رسولِ اکرمؐ کا اسم گرامی اور کنیت دونوں کا شرف حاصل ہوا ہے ــــ یعنی "ابوالقاسم محمدؐ"۔

۶۔ دورِ غیبت میں آپ کو نام محمد سے یاد کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۷۔ آپ کی ذات گرامی پر وصایت کا عہدہ ختم ہوگیا ہے اور آپ خاتم الاوصیاء ہیں۔

۸۔ آپ کو روزِ اول ہی سے غیبت کا شرف حاصل ہوا ہے اور آپ ملائکہ مقربین کی تحویل میں رہے ہیں۔

۹۔ آپ کو کفار و مشرکین و منافقین کے ساتھ معاشرت نہیں اختیار کرنا پڑی۔

۱۰۔ آپ کو کسی بھی حاکم ظالم کی رعایا میں نہیں رہنا پڑا۔

۱۱۔ آپ کی پُشتِ مبارک پر رسولِ اکرمؐ کی مہرِ نبوت کی طرح نشانِ امامت ثبت ہے۔

۱۲۔ آپ کا ذکر کتب سماویہ میں القاب و خطابات کے ذریعہ ہوا ہے اور نام نہیں لیا گیا ہے۔

۱۳۔ آپ کے ظہور کے لیے بے شمار علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۴۔ آپ کے ظہور کا اعلان ندائے آسمانی کے ذریعہ ہوگا۔

۱۵۔ آپ کے دورِ حکومت میں سن و سال کا انداز عام حالات سے مختلف ہوگا، اور گویا حرکت فلک سُست پڑ جائے گی۔

۱۶۔ آپ مصحف امیرالمومنینؑ کو لے کر ظہور فرمائیں گے۔

۱۷۔ آپ کے سر پر مسلسل ابرِ سفید کا سایہ ہوگا۔

۱۸۔ آپ کے لشکر میں ملائکہ اور جنّات بھی شامل ہوں گے۔

۱۹۔ آپ کی صحت پر طولِ زمانہ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

۲۰۔ آپ کے دور میں حیوانات اور انسانوں کے درمیان وحشت و نفرت کا دور ختم ہو جائے گا۔

۲۱۔ آپ کی رکاب میں بہت سے مرجانے والے بھی زندہ ہوکر شامل ہوں گے۔

۲۲۔ آپ کے سامنے زمین سارے خزانے اُگل دے گی۔

۲۳۔ آپ کے دور میں پیداوار اور سبزہ زار اس قدر ہوگا کہ گویا زمین دوسری زمین ہو جائے گی۔

۲۴۔ آپ کی برکت سے لوگوں کی عقلوں کو کمال حاصل ہو جائے گا۔

۲۵۔ آپ کے اصحاب کے پاس غیر معمولی قوت سماعت و بصارت ہوگی کہ چار فرسخ سے حضرت کی آواز سُن لیں گے۔

۲۶۔ آپ کے اصحاب وانصار کی عمریں بھی طولانی ہوں گی۔

۲۷۔ آپ کے انصار کے اجسام بھی مرض اور بیماری سے بری ہوں گے۔

۲۸۔ آپ کے اعوان وانصار میں ہر شخص کو ۴۰ افراد کے برابر قوت عطا کی جائے گی۔

۲۹۔ آپ کے نور اقدس کے طفیل میں لوگ نور شمس وقمر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

۳۰۔ آپ کے دست مبارک میں رسول اکرمؐ کا پرچم ہوگا۔

۳۱۔ آپ کے جسم اقدس پر رسول اکرمؐ کی زرہ بالکل درست ہوگی۔

۳۲۔ آپ کے لیے ایک خاص بادل ہوگا جو آپ کو مختلف مقامات پر لے جایا کرے گا۔

۳۳۔ آپ کے دور میں تقیہ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور شوکت کاذبین وظالمین کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۳۴۔ آپ کی حکومت شرق وغرب عالم پر ہوگی۔

۳۵۔ آپ کے دور میں زمین عدل وانصاف سے بھر جائے گی۔

۳۶۔ آپ کے فیصلے علم امامت کے مطابق ہوں گے اور صرف ظاہری شواہد پر اکتفا نہ کی جائے گی۔

۳۷۔ آپ ان مخصوص احکام کو رائج کریں گے جو اس دور تک رائج نہ ہو سکے ہوں گے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بیس سال کا نوجوان احکام دین سے بے خبر ہوگا تو اسے تہ تیغ کر دیں گے اور زندہ رہنے کا حق نہ دیں گے کہ بلوغ کے بعد بھی پانچ سال کی مہلت دی جا چکی ہے۔

۳۸۔ آپ علوم کے ان ۲۵ حروف کا اظہار کریں گے جن کا اب تک اظہار نہیں ہو سکا ہے اور انبیاء کرام اور اولیاء عظام نے ۲۷ حروف میں سے صرف دو کا اظہار کیا ہے۔

۳۹۔ آپ کے اصحاب وانصار کے لیے آسمان سے تلواریں نازل ہوں گی۔

۴۰۔ آپ کے اصحاب وانصار کی جانور تک اطاعت کریں گے۔

۴۱۔ آپ کوفہ میں حضرت موسیٰ کے پتھر سے پانی اور دودھ کی دو نہریں جاری فرمائیں گے۔

۴۲۔ آپ کی مدد کے لیے آسمان سے حضرت عیسیٰ نازل ہوں گے اور آپ کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔

۴۳۔ آپ اس دجال ملعون کو قتل کریں گے جس سے ہر نبی نے اپنی امت کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے۔

۴۴۔ آپ کے علاوہ امیرالمومنینؑ کے بعد کسی کے جنازہ پر سات تکبیروں کا جواز نہ ہوگا۔

۴۵۔ آپ کی تسبیح ۱۸ تاریخ سے آخر ماہ تک ہے، یعنی تقریباً ۱۲ دن۔ جب کہ باقی معصومینؑ کی تسبیح بس ایک روز ہے یا دو روز۔

۴۶۔ آپ کی حکومت کا سلسلہ قیامت سے متصل ہوگا کہ آپ خود حکومت کریں گے یا ائمہ طاہرینؑ رجعت فرمائیں گے یا آپ کی اولاد کی حکومت ہوگی لیکن مجموعی طور پر یہ سلسلہ قیامت سے متصل رہے گا جیسا کہ امام صادقؑ فرمایا کرتے تھے:

لکل اناس دولة یرقبونها
ودولتنا فی آخر الدهر یظهر

آپ کے ذاتی دور حکومت کے بارے میں علماء اعلام کے اقوال میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور سات سال سے ۱۹ یا ۴۹ سال تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کی شہادت واقع ہوگی اور امام حسینؑ آپ کی تجہیز وتکفین کے امور انجام دیں گے اور ائمہ طاہرین کی ظاہری حکومت کا سلسلہ شروع ہوگا جو دور ظہور امام عصرؑ میں دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور ان کی نگرانی میں اولیاء صالحین اور اولاد امام عصرؑ حکومت کرے گی اور یہ سلسلہ قیامت تک مستمر رہے گا۔ لیکن آپ کے دور حکومت میں سال سے مراد کیا ہے اور سات سال یا ۱۹ سال کس مقدار زمانہ کی طرف اشارہ ہے اور رجعت کی صورت کیا ہوگی؟ تمام ائمہ کرام تشریف لائیں گے یا بعض کا ظہور ہوگا؟۔۔ اور رجعت میں گزشتہ ترتیب کا لحاظ ہوگا یا کسی اور ترتیب سے تشریف لائیں گے؟ اور حکومت بھی گزشتہ ترتیب امامت کے مطابق ہوگی یا کوئی اور طریقہ کار ہوگا؟ پھر اولیاء صالحین سے مراد یہی ائمہ طاہرینؑ ہیں یا ان کے مخصوص اصحاب مراد ہیں یا امام عصرؑ کی اولاد کے نیک کردار افراد مراد ہیں؟۔۔

یہ سارے امور ہیں جن کی تفصیل نہ واضح کی گئی ہے اور نہ کوئی شخص ان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکتا ہے۔ روایات میں بھی بے حد اختلاف پایا جاتا ہے اور علماء اعلام کا

استنباط و استنتاج بھی بالکل مختلف ہے۔ بنا بریں اتنا اجمالی ایمان ضروری اور کافی ہے کہ دورِ ظہورِ امام عصرؑ میں ائمہ طاہرینؑ کی رجعت ہو گی اور ان کی حکومت قائم ہو گی کہ رب العالمین نے آخرت سے پہلے صاحبانِ ایمان سے اس دنیا میں اقتدار اور حکومت کا وعدہ کیا ہے اور مظلومین کو ظالمین سے بدلہ لینے کا موقع دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا وجود اس لیے بھی ضروری ہے کہ امام عصرؑ کی شہادت کے بعد زمین حجتِ خدا سے خالی نہ ہو جائے اور یہ سلسلہ صبحِ قیامت تک برقرار رہے، دینِ خدا تمام ادیانِ عالم پر غالب آئے اور صاحبانِ ایمان و کردار کی حکومت قائم ہو۔ خوف امن سے تبدیل ہو جائے اور ساری کائنات پر اس دین کا پرچم لہرائے جسے غدیر کے میدان میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ عبادتِ الٰہی کا دور دورہ ہو اور شرک کا سلسلہ ختم ہو جائے اور ہر صاحبِ ایمان کی زبان پر ایک ہی فقرہ ہو "الحمد للہ رب العالمین" جیسا کہ دعائے ندبہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے۔

نوابِ اربعہ

یہ وہ حضرات ہیں جنھیں غیبتِ صغریٰ کے زمانہ میں نیابت کا کام سپرد کیا گیا ہے اور یہ درحقیقت سفارت کا کام انجام دیتے تھے، یعنی ان کا فریضہ مصادرِ شریعت کتاب و سنت سے احکام کا استنباط و استخراج کر کے قوم کے حوالے کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا کام صرف یہ تھا کہ قوم کے مسائل کو امام زمانہؑ تک پہونچائیں اور جو جواب حاصل ہو اُسے قوم کے حوالے کر دیں۔ یہ کام اگرچہ غیر معمولی علم و دانش اور قوتِ استنباط و استخراج کا متقاضی نہیں ہے اور ایک عام صلاحیت کا انسان بھی اس کام کو انجام دے سکتا تھا لیکن اس کے باوجود امام عصرؑ نے غیبتِ کبریٰ کی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کام کے لیے بھی اس دور کے انتہائی ذی علم اور صاحبانِ کردار کا انتخاب کیا تھا تاکہ قوم غیبتِ صغریٰ ہی سے اس نکتہ کی طرف متوجہ ہو جائے کہ نیابتِ امامؑ کا کام کوئی عام انسان انجام نہیں دے سکتا ہے اور اس نکتہ کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ جب اپنی قوتِ علم و دانش کو استعمال نہیں کرنا ہے اور نعوذ باللہ خیانت کریں تو اصلاح کرنے والا امامؑ موجود ہے اور اس کا رابطہ قوم سے قائم ہے تو اس قسم کے بلند مرتبہ افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ تو جب قوتِ اجتہاد و استنباط کے استعمال کا مرحلہ آئے گا اور اصلاح کرنے والے امامؑ کے بظاہر جملہ روابطِ سفارت منقطع ہو جائیں گے تو اس دور کے نواب اور وکلاء کے علمی اور عملی مراتب کا کس قدر بلند ہونا ضروری ہوگا اور اس نکتہ کی طرف ائمہ طاہرینؑ نے مختلف ادوار میں اپنے دور کے مروجین احکام کے صفات کے بیان کرنے میں واضح طور پر اشارہ کیا تھا۔

امام عصرؑ کے چار سفراء جن کو یکے بعد دیگرے سفارت کا منصب حاصل ہوا تھا۔ ان کی مختصر داستانِ زندگی یہ ہے:

۱۔ عثمان بن سعید عمروی

یہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں تھے اور ان کے وکیل خاص تھے۔ حالات کے تحت روغن فروشی کی دکان رکھ لی تھی تاکہ خریداروں کے بھیس میں آنے والوں سے حقوقِ امامؑ حاصل کر سکیں اور ان کے سوالات کے جوابات امامؑ سے حاصل کر کے ان کے حوالے کر سکیں اور اسی بنا پر انھیں سمّان بھی کہا جاتا ہے۔

احمد بن اسحاق قمی جو خود بھی ایک جلیل القدر عالم تھے ان کا بیان ہے کہ میں نے امام علی نقیؑ سے عرض کیا کہ بعض اوقات آپ تک پہونچنا مشکل ہو جاتا ہے تو آپ کے احکام حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ عثمان بن سعید کی طرف رجوع کرنا یہ جو کچھ کہیں وہ میرا قول ہے اور جو پیغام پہونچائیں وہ میرا پیغام ہے۔ اور آپ کے انتقال کے بعد میں نے یہی سوال امام حسن عسکریؑ سے کیا تو آپ نے بھی بعینہٖ یہی جواب دیا۔ بلکہ یمن سے آنے والی ایک جماعت کے بارے میں فرمایا کہ جاؤ ان سے جلد رقم حاصل کر لو کہ تم میرے معتمد ہو اور جب لوگوں نے سوال کیا کہ آپ نے ان کے مرتبہ کو بہت بلند کر دیا ہے تو فرمایا کہ عثمان بن سعید میرے وکیل ہیں اور ان کا فرزند میرے فرزند کا وکیل ہوگا۔

امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد امام عصرؑ نے بھی وکالت کا کام عثمان بن سعید ہی کے پاس رہنے دیا اور ائمہ طاہرین کی نیابت و وکالت کے طفیل میں ان سے اس قدر کرامات کا ظہور ہوتا تھا کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ صاحبانِ مال سے ان کے مال کی مقدار اور اس میں حلال و حرام کا فرق بغیر دیکھے بیان کر دیتے تھے اور اکثر سوال سنے بغیر جواب بتا دیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی طرف سے اس طرح کی سند کہ "ان کا قول میرا قول ہے اور ان کا پیغام میرا پیغام ہے" ایک ایسے مرتبہ کی نشان دہی کرتی ہے کہ جس کی بنا پر انھیں معصوم کا صحیح پیرو اور محفوظ عن الخطاء بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ کاش دنیا میں کسی بھی مدعی ایمان کو اس طرح کی سند زبان معصوم سے حاصل ہو جاتی۔ جناب عثمان بن سعید کا دور سفارت پانچ سال تک جاری رہا۔

۲۔ محمد بن عثمان بن سعید عمروی

انھیں بھی امام عسکریؑ ہی نے اپنے فرزند کا وکیل نامزد کر دیا تھا لیکن جب جناب عثمان بن سعید کا انتقال ہوا تو ان کے پاس امام زمانہؑ کا تعزیت نامہ آیا جس کا مضمون یہ تھا: "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون! ہم امر الٰہی کے سامنے سراپا تسلیم ہیں اور اس کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ تمھارے باپ نے نہایت ہی سعیدانہ زندگی گزاری ہے اور ایک قابل تعریف موت پائی ہے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے اور انھیں ان کے اولیاء اور آقاؤں سے ملحق کر دے۔ وہ امور ائمہ میں برابر قرب الٰہی کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ خدا ان کے چہرہ کو شاداب کرے اور ان کی لغزشوں کو معاف کرے اور تمھارے ثواب میں اضافہ کرے اور تمھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ مصیبت تمھارے لیے بھی مصیبت ہے اور میرے لیے بھی۔ اس فراق نے تمھیں بھی مضطرب بنا دیا ہے اور مجھے بھی۔ اللہ انھیں آخرت میں خوش رکھے۔ ان کی سعادت و نیک بختی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اللہ نے انھیں تمھارا جیسا فرزند عطا کیا ہے جو ان کا جانشین اور قائم مقام ہے اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرتا ہے۔ میں اس امر پر حمد خدا کرتا ہوں۔ پاکیزہ نفوس تم سے اور جو شرف خدا نے تمھیں دیا ہے اس سے خوش ہیں خدا تمھاری مدد کرے، تمھیں قوت عطا کرے اور توفیقات کرامت فرمائے۔ وہی تمھارا سرپرست، محافظ اور نگران رہے گا۔"

علامہ مجلسیؒ نے کتاب غیبت طوسی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جناب عثمان بن سعید کے انتقال کے بعد امام عصرؑ نے ان کے فرزند کے بارے میں یہ پیغام بھیجا کہ یہ فرزند اپنے باپ کے زمانہ ہی سے ہمارا معتمد تھا (خدا اس سے خوش رہے اور اسے خوش رکھے اور اس کے چہرہ کو روشن رکھے) اب ہمارے لیے یہ اپنے باپ کا نائب اور جانشین ہے۔ یہ ہمارے ہی حکم سے حکم دیتا ہے اور ہمارے ہی احکام پر عمل کرتا ہے، خدا اسے جملہ آفات سے محفوظ رکھے۔!

جناب محمد بن عثمان بن سعید کی دختر نیک اختر ام کلثوم کا بیان ہے کہ میرے پدر بزرگوار نے کئی جلد کتاب تالیف کی تھی جس میں امام حسن عسکریؑ اور اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کیے ہوئے علوم اور احکام کو جمع کیا تھا اور اپنے انتقال کے وقت سارا سامان جناب حسین بن روح کے حوالے کر دیا تھا۔

جناب محمد بن عثمان بن سعید ہی کی یہ روایت ہے کہ امام زمانہ ہر سال حج میں تشریف لاتے ہیں اور لوگوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں لیکن لوگ انھیں پہچان نہیں سکتے ہیں۔ بلکہ میری آخری ملاقات بھی حج ہی میں ہوئی ہے جب وہ خانۂ خدا کے قریب اس دعا میں مصروف تھے کہ "خدایا! میرے وعدہ کو پورا فرما"۔ اور پھر مستجار کے قریب پہونچ کر یہ دعا کرنے لگے۔ "خدایا! مجھے دشمنوں سے انتقام لینے کا موقع عنایت فرما"۔

انھوں نے چالیس سال سفارت کے فرائض انجام دیے ہیں۔

۳۔ جناب حسین بن روح

یہ محمد بن عثمان کے مخصوص اصحاب میں تھے۔ لیکن بظاہر ان کا مرتبہ جعفر بن احمد سے کمتر تھا اور لوگوں کا خیال یہ تھا کہ چوتھے نائب جعفر بن احمد ہی ہوں گے۔ چنانچہ جب محمد بن عثمان کا آخری وقت آیا تو جعفر بن احمد سرھانے بیٹھے اور حسین بن روح پائینتی۔ لیکن جیسے ہی محمد بن عثمان نے یہ پیغام امامؑ سنایا کہ حضرت نے نیابت کے لیے حسین بن روح کے بارے میں نصیحت فرمائی ہے تو فوراً ہی جعفر بن احمد نے انھیں سرھانے بٹھا دیا اور خود پائینتی بیٹھ گئے کہ امامؑ سے بہتر حالات اور مصالح کا جاننے والا کوئی نہیں ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم رکھیں۔

بعض روایات میں اس کا ایک راز یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان میں اسرار امامت کے چھپانے کی صلاحیت زیادہ تھی اور ان کا برتاؤ بغداد میں تمام مذاہب کے افراد کے ساتھ ایسا تھا کہ ہر شخص انھیں اپنا ہم خیال سمجھتا تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا کہ حسین بن روح ہماری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اُس دور کی سفارت و نیابت کے لیے کمال علم و دانش سے زیادہ اہمیت رازداری اور قوت برداشت کی تھی کہ ہزاروں مصائب کے بعد بھی امامت کا راز فاش نہ ہونے پائے اور انسان کسی بھی قیمت پر ان اسرار کا تحفظ کرے۔

حسین بن روح کے بارے میں امام عصرؑ کے الفاظ یہ تھے، "ہم انھیں پہچانتے ہیں۔ اللہ

انھیں تمام خیرات اور مرضات کی معرفت عطا کرے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق کرامت فرمائے۔ ہمیں ان کی کتاب ملی ہے اور ہمیں ان پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ ہمارے نزدیک ایسا مقام اور ایسی منزلت رکھتے ہیں جو باعثِ مسرت و اطمینان ہے۔ خدا ان کے بارے میں اپنے احسانات میں اضافہ کرے کہ وہ تمام نعمتوں کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے۔ ساری تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور صلوات و رحمت اس کے رسول حضرت محمدؐ پر اور ان کی آل طاہرینؑ پر اور اس کا سلام ان تمام حضرات کے لیے۔" ان کی سفارت کا سلسلہ اکیس سال تک جاری رہا۔

۴۔ ابوالحسن علی بن محمد سمری

انھیں جناب حسین بن روح نے حکم امامؑ سے نامزد کیا تھا اور برابر وکالت و سفارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور لوگوں کے اموال امامؑ تک پہونچا رہے تھے یہاں تک کہ ان کا وقتِ وفات قریب آیا تو لوگوں نے عرض کی کہ اب آپ کا نائب کون ہوگا؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ میرے اختیار کا کام نہیں ہے، خدا اپنے مصالح کو بہتر جانتا ہے اور امامؑ کی طرف سے اب یہ پیغام موصول ہوا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ علی بن محمد سمری! خدا تمھارے برادران ایمانی کو تمھارے بارے میں عظیم اجر عطا فرمائے کہ اب تمھارا وقتِ وفات قریب آگیا ہے تمھاری زندگی میں صرف چھ دن باقی رہ گئے ہیں۔ اپنے جملہ امور کو جمع کر لو اور خبردار اپنی جگہ پر کسی کو وصی مت بنانا اس لیے کہ اب مکمل غیبت کا آغاز ہو رہا ہے۔ اب ظہور اذنِ خدا کے بعد ہی ہوگا اور یہ ایک طویل مدت اور قساوتِ قلوب اور زمین کے ظلم و جور سے بھر جانے کے بعد ہوگا۔ عنقریب میرے شیعوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو میرے مشاہدہ کا دعویٰ کریں گے تو آگاہ ہو جاؤ کہ جو بھی ایسے مشاہدہ کا دعویٰ کرے سفیانی کے خروج اور ندائے آسمانی سے پہلے وہ جھوٹا اور افترا پرداز ہے۔ تمام طاقت اور قوت خدائے علی و عظیم کی توفیق سے وابستہ ہے۔"

جانشینی اور وصایت کی ممانعت کے ساتھ ادعائے مشاہدہ کا ذکر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مشاہدہ سے مراد ملاقات نہیں ہے۔ بلکہ مشاہدہ سے مراد وہ سفارت ہے جس میں برابر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور اِدھر کے پیغامات اُدھر جاتے رہتے ہیں۔ امامؑ نے اس قسم کے مشاہدہ کی تردید

کر دی ہے اور ایسی نیابت کے دعوے دار کو کذاب اور مفتری قرار دے دیا ہے۔ کہ اگر یک طرفہ ملاقات کی بات ہو اور کوئی شخص اپنی ملاقات کا تذکرہ کرے یا امام علیہ السلام سے کسی موقع پر کوئی بات دریافت کرے یا کسی مسئلہ میں مدد حاصل کرے اور اس کی رہنمائی ہو جائے تو یہ تمام باتیں حدود مشاہدہ سے خارج ہیں۔ مشاہدہ کا دعوے دار درحقیقت اس امر کا ادعا کرتا ہے کہ آپ حضرات اپنے مسائل اور اموال میرے حوالے کریں میں آئندہ ملاقات میں امامؑ کے حوالے کر دوں گا اور ان سے جوابات حاصل کر لوں گا اور یہ دعویٰ درحقیقت نیابت خاص کا دعویٰ ہے جس کا تعلق غیبتِ صغریٰ سے تھا اور غیبتِ کبریٰ میں نیابت خاصہ کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔

اس تشریح کے بعد ملاقات امام عصرؑ کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے لیکن دو باتیں بہرحال قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ انسان کو یہ یقین ہو کہ یہ امام عصرؑ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان امامؑ کے نام پر دھوکہ دیدے اور انسان اسی دھوکہ میں دنیا سے گذر جائے۔

۲۔ ملاقات کو اپنی ذات تک محدود رکھے اور لوگوں سے بیان نہ کرے اس لیے کہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا ہے اور اس طرح ہر شخص کو تردید کرنے کا حق ہو جاتا ہے اور یہ بعض اوقات تردید ملاقات یا توہینِ امام کا باعث بھی ہو سکتا ہے جس کی ذمہ داری ملاقات کے دعوے دار پر عائد ہو گی۔ تردید کرنے والے کو بہرحال حق رہے گا۔

ان کی سفارت صرف تین سال رہی اور اس کے بعد غیبتِ کبریٰ کا آغاز ہو گیا۔

زمانۂ غیبتِ کبریٰ کے روابط

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام عصرؑ کی غیبت کی دو قسمیں ہیں۔ غیبت صغریٰ جس کا سلسلہ ۲۶۰ھ سے شروع ہو کر ۳۲۹ھ ختم ہو گیا اور جس کے دوران مختلف نواب امام کی طرف سے قوم کے لیے رابطہ کا کام کرتے رہے۔ انھیں کے ذریعہ پیغامات اور سوالات جاتے تھے اور انھیں کے ذریعہ جوابات آیا کرتے تھے۔

جناب عثمان بن سعید، جناب محمد بن عثمان، جناب حسین بن روح اور جناب علی بن محمد سمری وہ معتمد اور مقدس افراد تھے جنھیں امام زمانہؑ نے اپنی نیابت اور سفارت کا شرف عطا فرمایا تھا اور انھیں کے ذریعہ ہدایت اور رہبری کے امور انجام پا رہے تھے۔

اس کے بعد جب غیبت کبریٰ کا دور شروع ہوا اور نیابت خاص کا سلسلہ ختم ہو گیا تو نیابت عام کا سلسلہ شروع ہوا اور اعلان عام ہو گیا کہ اس دور غیبت کبریٰ میں مخصوص صفات کے افراد مرجع ملین ہوں گے اور انھیں کے ذریعہ ہدایت امت کا کام انجام دیا جائے گا۔ امت اور اسلام کی حفاظت ان کے ذمہ ہو گی اور ان کی ہدایت و حفاظت ہماری ذمہ داری ہو گی۔

چنانچہ ظاہری نیابت و سفارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن حفاظت و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار مواقع پیش آئے جب امامؑ نے اپنے نائبین عام کی ہدایت و حفاظت کا فرض انجام دیا اور جہاں ان سے کوئی غلطی ہو گئی یا ان کا وجود خطرہ میں پڑ گیا اور اس کے ذریعہ اسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا تو ان کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیا۔ یہ اور بات ہے کہ موت برحق ہے اور کسی کو ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ اور بعض اوقات بعض افراد کا راہ حق میں قربان ہو جانا ہی اسلام کے لیے زیادہ مفید تھا تو اس وقت حفاظت و رعایت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ عمومی حالات میں انھوں نے ہمیشہ نگرانی فرمائی ہے اور حفاظت و صیانت کا کام

انجام دیتے رہے ہیں۔

غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ کی نیابت کا بنیادی فرق یہی ہے کہ غیبت صغریٰ میں نائبین کی شخصیت طے ہوئی تھی اور غیبت کبریٰ میں ان کے صفات و کمالات کا تعین کیا گیا ہے اور شاید اس طریقۂ کار میں بھی یہ مصلحت شامل تھی کہ روز اول ہی صفات کا تعین کر دیا جاتا تو ہر شخص اپنے آپ کو ان صفات کا حامل قرار دے لیتا اور دو چار اپنے مخلصین جمع کر کے نیابت کا دعویدار بن جاتا اس لیے آپ نے صفات کے بجائے شخصیات کا تعین فرمایا تاکہ لوگ ان افراد کو دیکھ کر ان کے حالات کا جائزہ لیں اور یہ اندازہ کر لیں کہ یہ کن صفات و کمالات کے حامل ہیں اور اس کے بعد یہ طے کریں کہ نیابتِ امام کے لیے کیسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور کس قسم کے صاحبانِ علم و فضل اور اربابِ عزم و ہمت درکار ہوتے ہیں جنھیں امام اپنی نیابت کا کام سپرد کرتا ہے کہ اس کے بعد جب صفات کا تذکرہ کیا جائے گا تو ہر کس و ناکس کو ان صفات کا حامل تصور نہ کیا جائے گا بلکہ اس کے کردار کو ان نائبین کے کردار سے ملا کر دیکھا جائے گا اور پھر اندازہ لگایا جائے گا کہ یہ شخص نیابت امامؑ کا حق دار ہے یا نہیں۔

امام کے صیانت و حفاظت کے شواہد میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو دور غیبت کبریٰ میں امامؑ کی طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں، جن میں آپ نے قوم کی حفاظت اور ذمہ داران قوم کی ہدایت کا تذکرہ فرما کر امت اسلامیہ کو مطمئن کر دیا ہے کہ ہم پردۂ غیب میں ہیں، دنیا سے رخصت نہیں ہو گئے ہیں۔ ہماری غیبت کا مفہوم تمھاری طرف سے غیبت ہے ہماری طرف سے غیبت نہیں ہے۔ ہم تمھاری نگاہوں سے غائب ہیں اور تم ہماری زیارت نہیں کر سکتے ہو لیکن تم ہماری نگاہ سے غائب نہیں ہو۔ ہم تمھیں برابر دیکھ رہے ہیں اور تمھارے حالات و کیفیات کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم تمھارے حالات سے غافل ہو جائیں تو تمھارا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے اور امامت بھی خطرہ میں پڑ جائے کہ امامؑ قوم کے حالات سے غافل نہیں ہو سکتا۔ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی قوم کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے اور روز قیامت بھی ان کے اعمال کا شاہد و شہید ہو گا، ہم زندہ موجود ہیں، ہمارے اور تمھارے درمیان صرف نگاہوں کا پردہ ہے ورنہ ہم نہ کسی دوسرے ملک میں رہتے ہیں اور نہ کسی دوسرے عالم میں۔ تمھارے ہی درمیان ہیں، تمھارے آلام و مصائب میں

شریک ہیں، تمھارے درد و رنج کو دیکھتے رہتے ہیں، موسم حج میں تمھارے ساتھ شریک مناسک رہتے ہیں، تمھارے آباد و اجداد کی زیارت میں تمھارے شانہ بشانہ زیارت پڑھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی مخصوص افراد کو زیارت پڑھا بھی دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دورِ غیبت کے اثرات کی بنا پر انھیں ہمارے وجود اور ہماری زیارت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے اور جب ہم امام زمانہؑ کی زیارت کے موقع پر جواب سلام دیتے ہیں تو ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کا واقعی احساس ہمارے چلے جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

ہماری حفاظت و ہدایت میں کسی طرح کا نقص نہیں ہے اور ہم ہر آن تمھاری نگرانی کرتے رہتے ہیں جس کا بہترین ثبوت وہ خطوط ہیں جو ہم نے غیبت کبریٰ کے باوجود اپنے مخلص خادمین دین کو لکھے ہیں اور ان میں ان تمام حقائق کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔

ذیل میں ان دو خطوط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو امام زمانہؑ نے علامہ شیخ مفید علیہ الرحمہ کے نام لکھے ہیں اور جن کے الفاظ سے شیخ کی عظمت اور امامؑ کی محبت و حفاظت و رعایت و صیانت کا مکمل اندازہ ہوتا ہے۔

ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں:

"برادر سعید اور محب رشید شیخ مفید ابی عبداللہ محمد بن محمد بن النعمان (خدا ان کے اعزاز کو باقی رکھے) کے لیے مرکز عہد الٰہی امام کی جانب سے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اے میرے مخلص دوست اور اپنے یقین کی بنا پر مجھ سے خصوصیت رکھنے والے محب تم پر میرا اسلام۔ ہم خدائے وحدہ لاشریک کی حمد کرتے ہیں اور رسول اکرمؐ اور ان کی آل طاہرینؑ پر صلوٰۃ و سلام کی التماس کرتے ہیں۔

خدا نصرت حق کے لیے آپ کی توفیقات کو برقرار رکھے اور ہماری طرف سے صداقت بیانی کے لیے آپ کو بہترین اجر عطا فرمائے۔ یاد رکھیے کہ ہمیں قدرت کی طرف سے اجازت ملی ہے کہ ہم آپ کو مراسلت کا شرف عطا کریں اور اپنے دوستوں کے نام پیغام آپ کے ذریعہ پہونچائیں۔ خدا ان سب کو اپنی اطاعت کی عزت عطا کرے، اور اپنی حفاظت و حراست میں رکھے۔ خدا بے دینوں کے مقابلہ میں آپ کی تائید کرے۔

آپ میرے بیان پر قائم رہیں اور جس جس پر آپ کو اعتبار و اعتماد ہو اس تک یہ پیغام پہونچا دیں۔ ہم اس وقت ظالمین کے علاقہ سے دور ہیں اور اللہ کی مصلحت ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں یہی ہے کہ ایسے ہی دور دراز علاقہ میں رہیں جب تک دنیا کی حکومت فاسقین کے ہاتھ میں رہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں تمھاری مکمل اطلاع رہتی ہے اور کوئی خبر پوشیدہ نہیں رہتی ہے۔ ہم اس ذلت سے بھی باخبر ہیں جس میں تم لوگ اس لیے مبتلا ہو گئے ہو کہ تم میں سے بہت سے لوگوں نے صالح بزرگوں کا طریقہ ترک کر دیا ہے اور عظمت الٰہی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے جیسے وہ اس عہد سے باخبر ہی نہ ہوں۔

ہم تمھاری نگرانی کے ترک کرنے والے اور تمھاری یاد کے بھلا دینے والے نہیں ہیں۔ ہم تمھیں نہ یاد رکھتے تو تم پر بلائیں نازل ہو جاتیں اور دشمن تمھیں جلا کر خاکستر بنا دیتے۔ خدا سے ڈرو اور فتنوں سے بچانے میں ہماری مدد کرو۔ فتنے قریب آگئے ہیں اور ان میں ہلاکت کا شدید اندیشہ ہے۔ یہ فتنہ ہماری قربت کی علامت ہے۔ خدا اپنے نور کو بہر حال مکمل کرنے والا ہے چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

تقیہ کو حفاظت کا ذریعہ قرار دو اور اموی گروہ کی جاہلیت کی آگ سے محفوظ رہو۔ جو اس جاہلیت سے الگ رہے گا ہم اس کی نجات کے ذمہ دار ہیں۔ اس سال جمادی الاولیٰ کا مہینہ آجائے تو حوادث سے عبرت حاصل کرو اور خواب سے بیدار ہو جاؤ اور بعد میں آنے والے واقعات کے لیے ہوشیار ہو جاؤ۔

عنقریب آسمان اور زمین میں نمایاں نشانیاں ظاہر ہوں گی سرزمین مشرق پر قلق و اضطراب ظاہر ہوگا۔ عراق پر ایسے گروہوں کا قبضہ ہوگا جو دین سے خارج ہوں گے اور ان کی بداعمالیوں سے روزی تنگ ہو جائے گی۔ اس کے بعد طاغوت کی ہلاکت سے مصیبت دفع ہو گی اور صاحبان تقویٰ اور نیک کردار افراد خوش ہوں گے۔

حج کا ارادہ کرنے والوں کی مرادیں پوری ہوں گی اور ہم ایک مرتب اور منظم طریقہ سے ان کی آسانی کا سامان فراہم کریں گے۔ اب ہر شخص کا فرض ہے کہ

ایسے اعمال انجام دے جو ہماری محبت سے قریب تر بنادیں اور ایسے امور سے اجتناب کرے جو ہمیں ناپسند ہیں اور ہماری ناراضگی کا باعث ہیں۔ ہمارا ظہور اچانک ہوگا اس وقت توبہ کا کوئی امکان نہ رہے گا اور نہ ندامت سے کوئی فائدہ ہوگا۔ خدا تمھیں ہدایت کا الہام کرے اور اپنی توفیق خاص عنایت فرمائے۔"

یہ خط علامہ شیخ مفید علیہ الرحمہ کی وفات سے تین سال قبل صفر ۴۱۰ھ میں واصل ہوا تھا، اور دوسرا خط بھی تقریباً اسی طرح کے مضمون کا حامل ہے لیکن ان خطوط کے مضامین سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تازگی ہر وقت برقرار ہے اور اس کا ایک ایک جملہ ابدی حیثیت رکھتا ہے۔

صاحبانِ ایمان کو ان خطوط کے حسب ذیل نکات پر خصوصی توجہ دینا چاہیے اور ہر وقت توفیق خیر کی دعا کرتے رہنا چاہیے:

۱۔ راہ حق میں جہاد کرنے والے اور دین اسلام کی خدمت کرنے والوں کو امام عصرؑ اپنے "برادر رشید" کا مرتبہ عنایت فرماتے ہیں۔

۲۔ امامؑ اپنی قوم سے ہر وقت رابطہ رکھتے ہیں۔ لیکن کوئی کام مرضیٔ پروردگار کے بغیر انجام نہیں دیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ خط بھی اسی وقت لکھتے ہیں جب حکم خدا ہوتا ہے۔

۳۔ امامؑ ظالموں کے علاقہ سے دور بھی رہتے ہیں اور صاحبانِ ایمان سے قریب بھی رہتے ہیں کہ اس طرح دونوں کی حفاظت بھی ہو رہی ہے اور کار دین بھی انجام پا رہا ہے۔

۴۔ قوم کی ساری پریشانیاں ان بے عمل اور بے دین افراد کی وجہ سے ہیں جنھوں نے سلف صالح کا طریقہ ترک کر دیا ہے اور عہد الٰہی کو نظر انداز کر دیا ہے۔

۵۔ امامؑ کسی وقت بھی قوم کی نگرانی سے غافل نہیں ہیں اور اس کا زندہ ثبوت خود قوم کا وجود ہے ورنہ اب تک ظالموں نے سب کو فنا کر دیا ہوتا۔

۶۔ تقیہ ایک بہترین عمل ہے۔ اس کا نظر انداز کر دینا ہلاکت کو دعوت دینا ہے لیکن اسی کے ساتھ خدمت اسلام کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔

۷۔ عراق کے حکام کی بے دینی عوام کی روزی کی تنگی کا باعث ہوگی۔ جس کا منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ ظالموں کی وجہ سے عوام فاقوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۸۔ عراقی طاغوت کا خاتمہ ہوگا اور صاحبانِ ایمان و تقویٰ کی مسرت کا سامان فراہم ہوگا، انشاء اللہ۔

۹۔ حج کے مشکلات ختم ہوں گے اور سہولتوں کا دور آئے گا اور امامؑ کی نگرانی میں نظام حج مرتب ہوگا، انشاء اللہ۔

۱۰۔ صاحبانِ ایمان کا فرض ہے کہ امام سے قریب رہنے والے اعمال اختیار کریں اور امامؑ کی ناراضگی سے بچتے رہیں۔ بے عملی، بے دینی، توہینِ احکام اسلام، غلط بیانی، افترا پردازی، تفرقہ بازی، ضمیر فروشی، محسن کشی، فرائض کا استخفاف، محرمات کی دعوت جیسے اعمال وہ ہیں جن سے امام زمانہؑ ناراض ہوتے ہیں اور جن کا محاسبہ ظہور کے بعد بہت سخت ہوگا۔ خدا ہم سب کو امام علیہ السلام سے قریب تر ہونے اور انھیں راضی رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زائرین قائمِ آل محمدؐ

امام عصرؑ کے زائرین کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بعض افراد وہ ہیں جنھوں نے زمانۂ غیبت صغریٰ میں آپ کی زیارت کی ہے۔

۲۔ بعض افراد وہ ہیں جنھوں نے غیبت کبریٰ میں یہ شرف حاصل کیا ہے۔

غیبت کبریٰ کے زائرین کا سلسلہ بحمد اللہ قائم ہے، لہٰذا ان کے اعداد و شمار کا مقرر کرنا ناممکن ہے اور جب تک ملاقاتوں اور زیارتوں کا یہ سلسلہ قائم رہے گا ان کے اعداد و شمار میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا جیسا کہ محدث نوری علیہ الرحمہ نے اس قسم کے ۱۰۰ واقعات کا ذکر کیا ہے اور شیخ قمی علیہ الرحمہ نے ان میں سے تقریباً صرف ایک چوتھائی کا ذکر کیا ہے اور باقی علماء و مولفین نے اور دوسرے واقعات کا ذکر کیا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ لہٰذا ان میں سے صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کیا جائے گا جن میں ملاقات کے علاوہ عمومی افادیت کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ غیبت صغریٰ کے چند زائرین کی اجمالی فہرست یہ ہے:

۱۔ نائب اول عثمان بن سعید عمروی

۲۔ نائب دوم محمد بن عثمان بن سعید عمروی

۳۔ نائب سوم حسین بن روح نوبختی

۴۔ نائب چہارم علی بن محمد سمری

۵۔ سفیر عام حاجز۔ بلال اور عطار بغدادی (غایۃ المقصود)

۶۔ عاصمی کوفی ″

۷۔ محمد بن ابراہیم بن فہریار اہوازی ″

۸۔ محمد بن صالح ہمدانی ″

۹۔ بسامی و اسدی رازی ″

۱۰۔ قم بن علار آذر بائجانی ″

۱۱۔ محمد بن شاذان نیشاپوری ″

۱۲۔ احمد بن اسحاق قمی ″

۱۳۔ ابوالادیان (قبل آغاز غیبت) ″

۱۴۔ ابوالقاسم بن رئیس ″

۱۵۔ ابوعبداللہ بن فروخ ″

۱۶۔ مسرور طباخ ″

۱۷۔ احمد و محمد بن الحسن ″

۱۸۔ اسحاق کاتب نوبختی ″

۱۹۔ صاحب الغرا ″

۲۰۔ صاحب الصرۃ المختومہ ″

۲۱۔ ابوالقاسم بن ابی جلیس ″

۲۲۔ ابوعبداللہ الکندی ″

۲۳۔ ابوعبداللہ الجنیدی ″

۲۴۔ محمد بن کشمرد و جعفر بن حمدان دینوری ″

۲۵۔ حسن بن ہراون و احمد بن ہراون اصفہانی ″

۲۶۔ زیدان قمی (غایۃ المقصود)

۲۷۔ حسن بن نصر، محمد بن محمد، علی بن محمد بن اسحاق، حسن بن یعقوب ازدی ″

۲۸۔ قسم بن موسیٰ، ابن قسم بن موسیٰ، ابن محمد بن ہارون، علی بن محمد (کلینی) ″

۲۹۔ ابوجعفر الرقاء (قزوین) ″

۳۰۔ علی بن احمد (فارس) ″

۳۱۔ ابن الجمال (قدس) ″

۳۲۔ مجروح (مرو) ″

۳۳۔ صاحب الالف دینار (نیشاپور) ″

۳۴۔ محمد بن شعیب بن صالح (یمن) ″

۳۵۔ فضل بن زید، حسن بن فضل، جعفری، ابن الاعجمی (مصر) ″

۳۶۔ صاحب المولودین، صاحب المال (نصیبین) ″

۳۷۔ ابومحمد بن الوجنا (اہواز) ″

۳۸۔ الحصینی

ان کے علاوہ نہ جانے کتنے خوش قسمت تھے جن کا تذکرہ کتابوں میں نہیں ہو سکا ہے، کسی دوسرے ذیل میں ہو گیا ہے جیسے کہ جناب حکیمہ کہ جو امام زمانہؑ کی سب سے پہلی زائرہ تھیں لیکن ان کا ذکر زائرین کے ذیل میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ خدمات ولادت کے ذیل میں کیا گیا ہے، یا دیگر افراد کہ جن کے سامنے خود امام حسن عسکریؑ نے اپنے فرزند کو پیش کیا ہے اور انھوں نے حضرتؑ کے جمال مبارک کی زیارت غیبت صغریٰ کے آغاز سے پہلے کی ہے۔

میں نے ان کے اسمائے گرامی کی طرف اس لیے اشارہ کر دیا ہے کہ اصل مقصد غیبت کے زائرین کی فہرست تیار کرنا نہیں ہے بلکہ ان افراد کی نشان دہی کرنا ہے جنھوں نے حضرت قائمؑ کی زیارت کی ہے اور جن کی شہادت کے بعد حضرت کے وجود اور ان کی ولادت کا انکار کرنا ایک سفسطہ اور مکابرہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

غیبت کبریٰ کے جن زائرین کی نشان دہی علامہ شیخ عباس قمیؒ نے کی ہے ان میں سے

بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔ اسماعیل ہرقلی۔ جن کا مرض لاعلاج ہوگیا تھا اور انھوں نے سید ابن طاؤس کے پاس حاضری دی اور اس کے بعد امام عصرؑ سے توسل کیا اور انھوں نے دست مبارک پھیر کر مرض کو بالکل ختم کر دیا جس کا نشان بھی باقی نہیں رہ گیا تھا اور پیروں میں ناسور کی جگہ پر باقاعدہ طبیعی جلد نظر آنے لگی تھی۔

۲۔ سید محمد جبل عاملی۔ جنھیں حکومت نے جبری فوج میں بھرتی کرنا چاہا تو لبنان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور پانچ سال کی دربدری کے بعد نجف اشرف وارد ہوئے۔ حالات سے پریشان ہو کر بہت دعائیں کیں لیکن وسعت رزق کا کوئی راستہ نہ نکلا تو بالآخر عریضہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور نجف سے باہر جا کر روزانہ صبح کو دریا میں عریضہ ڈالتے رہے۔ ۲۹ دن کے بعد راستہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس کا لباس عراقی تھا اور لہجہ لبنانی۔ اس نے دریافتِ حال کیا کہ ۲۹ دن سے کیوں عریضہ ڈال رہے ہو کیا امامؑ تمھارے حال سے باخبر نہیں ہے؟ میں نے حیرت زدہ ہو کر مصافحہ کا ارادہ کیا۔ مصافحہ کرنے پر ہاتھ کی لطافت سے محسوس کیا کہ یہ امام عصرؑ ہیں اس لیے کہ ان کے دست مبارک کے بارے میں ایسی ہی روایت سنی ہے۔ اب جو دست بوسی کا ارادہ کیا تو وہ غائب ہو چکے تھے (واضح رہے کہ اس واقعہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عریضہ بیکار ثابت ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عریضہ ہی کے زیر اثر ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔

۳۔ سید عطوہ حسنی۔ صاحب کشف الغمہ نے ان کے فرزندوں سے روایت کی ہے کہ میرے باپ زیدی مذہب تھے اور ہم لوگوں سے امامیہ مذہب کی بنیاد پر بیزار رہا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے شدت مرض کے عالم میں کہا کہ جب تک تمھارے صاحب مجھے شفا نہ دیں گے میں ایمان نہ لاؤں گا۔ تھوڑی رات کے بعد بلند آواز سے پکار کر کہا کہ دوڑو اپنے صاحب سے ملاقات کرو۔ ہم لوگ دوڑ پڑے لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ صرف باپ کا یہ بیان سنا کہ ایک بزرگ آکر دستِ شفا پھیر کر درد کو زائل کر گئے ہیں اور پھر ان کا یہ اطمینان دیکھا کہ انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

۴۔ علامہ حلیؒ نے منہاج الصلاح میں ابن طاؤس سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ سید رضی الدین محمد بن محمد بن محمد آوی کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ انھوں نے عاجز آکر امام زمانہؑ سے استغاثہ کیا تو حضرت نے دعائے عبرت پڑھنے کا حکم دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس دعا کا علم نہیں ہے۔ فرمایا کتاب مصباح میں ہے۔ انھوں نے عرض کی کہ میں نے نہیں دیکھی ہے۔ فرمایا کہ ہے۔ اب جو بیدار ہو کر دیکھا تو کتاب میں ایک رقعہ رکھا ہوا تھا۔ اس دعا کی تلاوت کی تو حاکم کی زوجہ نے خواب میں دیکھا کہ امیر المومنین فرما رہے ہیں کہ اگر میرے فرزند کو رہا نہ کیا تو تیرے شوہر کو فنا کر دیا جائے گا۔ اس نے بیدار ہو کر شوہر سے بیان کیا اور اس نے فوراً رہا کر دیا۔

۵۔ میر اسحاق استرآبادی۔ علامہ مجلسیؒ نے ان کا بیان یوں نقل کیا ہے کہ میں راہ مکہ میں قافلہ سے الگ ہو کر سخت پریشان تھا تو امام عصرؑ سے استغاثہ کیا۔ حضرت تشریف لائے اور حرز یمانی پڑھنے کا حکم دیا۔ میں پیاسا تھا مجھے پانی پلایا اور پھر میری تلاوت کی اصلاح کی اور اپنے ساتھ سواری پر سوار کر کے قافلہ سے ۹ روز پہلے مکہ پہونچا دیا اور اہلِ خانہ نے مشہور کر دیا کہ میں صاحب کرامات ہوں اور طی الارض کے ذریعہ مکہ آیا ہوں۔

۶۔ سید ابن طاؤس نے "فرج الہموم" میں ابوجعفر محمد بن ہارون بن موسیٰ تلعکبری کے حوالے سے ابوالحسین بن ابوالبغل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میرا ایک معاملہ ابومنصور بن ابوصالحان سے تھا اس میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا اور میں اس کے خوف سے روپوش ہوگیا۔ ایک دن امام موسیٰ کاظمؑ کے روضہ پر گیا اور ابوجعفر سے گزارش کی کہ آج حرم کے دروازے بند کر دینا میں حضرت سے تنہائی میں فریاد کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے دروازے بند کر دیے اور میں نے نماز، دعا، زیارت اور مناجات شروع کی کہ اچانک ایک جوان کو دیکھا جس نے زیارت میں امام زمانہؑ کے علاوہ سب کو سلام کیا۔ میں حیرت زدہ ہوگیا کہ یہ کون سا مذہب ہے۔ کچھ پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ فرمایا دعائے فرج پڑھو، اور پھر دعائے فرج کی تعلیم دی۔ "یا من اظھر الجمیل .... اور آخر میں یا محمد یا علی اکفیانی فانکما کافیان وانصرانی فانکما ناصران۔" میں اس عمل میں مشغول ہوگیا اور عمل تمام کرنے کے بعد اس جوان کو تلاش کیا تو کوئی نظر نہ آیا۔

ابوجعفر سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ دروازے بند ہیں۔ یہ تمھارے امام زمانہؑ تھے جو تمھاری مشکل کشائی کے لیے آئے تھے۔

واضح رہے کہ دعائے فرج کے نام سے مختلف دعائیں کتابوں میں پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک دعا یہ بھی ہے ورنہ یا عماد من لا عماد لہ کو بھی دعائے فرج ہی کہا جاتا ہے۔

۷۔ ابوراجح حمامی۔ علامہ مجلسیؒ نے ان کا واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ حلہ میں حمام کا کاروبار کرتے تھے۔ وہاں ایک حاکم مرجان صغیر تھا جو انتہائی درجہ کا ناصبی اور دشمنِ اہلبیتؑ تھا لوگوں نے اس کے پاس ابوراجح کی شکایت کردی کہ صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس نے طلب کر کے ان کی مرمت کا حکم دے دیا۔ سرکاری کارندوں نے اس قدر مارا کہ سارا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ سامنے دانت ٹوٹ گئے اور ناک میں نکیل ڈال کر کھینچتے ہوئے حاکم کے سامنے حاضر کیا۔ اس نے قتل کا حکم دے دیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ بوڑھا اپنی جان سے جارہا ہے اب قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے دربار سے باہر پھینکوا دیا۔ رات کو ابوراجح نے امام عصرؑ سے فریاد کی۔ اس وقت جب تمام گھر والے زندگی کے لمحات شمار کر رہے تھے ایک مرتبہ دیکھا کہ گھر نور سے معمور ہوگیا ہے اور ایک بزرگ نے آکر پورے جسم پر ہاتھ پھیر کر مکمل صحت عطا فرمادی ہے یہاں تک کہ سارے دانت بھی واپس آگئے ہیں اور بیس سالہ جوان معلوم ہونے لگے ہیں۔ صبح کو لوگوں میں یہ خبر مشہور ہوئی تو ابوراجح کو پھر حاکم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس ظالم نے اپنی آنکھوں سے اس کرامت کا مشاہدہ کر لیا لیکن راہ راست پر نہ آیا۔

۸۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں اس واقعہ کو بھی نقل کیا ہے کہ انگریزوں نے بحرین میں اپنا ایک نمائندہ معین کر دیا تھا جو انتہائی درجہ کا دشمنِ اہلبیتؑ تھا اور ہمیشہ محبانِ اہلبیتؑ کو اذیت پہونچانے کی فکر میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے وزیر نے دربار میں ایک انار پیش کیا جس پر خلفاء کے نام ثبت تھے اور حاکم سے کہا کہ یہ ہمارے مذہب کی حقانیت کی دلیل ہے لہذا اگر شیعہ اسے نہ تسلیم کریں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ ان کی عورتوں کو کنیز بنا لیا جائے اور ان کا مال بطور غنیمت لے لیا جائے۔ حاکم نے علماء شیعہ کو طلب کر کے انار دکھلایا سب پریشان ہوگئے اور جواب کے لیے تین دن کی مہلت طلب کی۔ آپس میں اجتماع کر کے دس مقدسین کا

انتخاب کیا اور پھر ان میں سے تین کا انتخاب کیا کہ امام عصرؑ سے استغاثہ کریں۔ پہلے دن استغاثہ کیا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دوسرے دن دوسرے مقدس نے استغاثہ کیا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تیسرے دن محمد بن عیسیٰ کی باری آئی۔ وہ مصروف استغاثہ تھے کہ ایک شخص کو دیکھا انھوں نے فرمایا کہ اپنی پریشانی بیان کرو میں مشکل کو حل کردوں گا۔ عرض کی کہ اگر آپ امام عصرؑ ہیں تو بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے پریشانی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ حاکم سے کہہ دو کہ وزیر نے اپنے گھر میں ایک سانچہ تیار کر رکھا ہے اور اس پر یہ نام کندہ کر دیے ہیں۔ کچے انار پر سانچہ چڑھا دیا تھا۔ جب انار بڑے ہوئے تو یہ نام ثبت ہوگئے۔ اور وہ سانچہ وزیر کے گھر کے فلاں حجرہ میں رکھا ہے۔ آپ اسے طلب کریں اور وزیر کو نہ جانے دیں۔ حاکم نے ابن عیسیٰ کے بیان پر سانچہ کو طلب کیا اور جب حقیقت واضح ہوگئی تو پوچھا کہ تمھیں کیسے معلوم ہوگیا۔ فرمایا کہ میرے مولاؑ نے بتایا ہے جو سلسلۂ امامت کے بارہویں امام ہیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ انار کو توڑا جائے ان ناموں کی برکت سے اندر سے راکھ کے علاوہ کچھ نہ نکلے گا۔ چنانچہ حاکم نے اس کا بھی تجربہ کیا اور جب حق بالکل واضح ہوگیا تو اس نے مذہب شیعہ کے قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور محمد بن عیسیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

۹۔ آقائی میرزا عبداللہ اصفہانی نے کتاب "ریاض العلماء" میں نقل کیا ہے کہ ابوالقاسم محمد بن ابوالقاسم حاسمی جو ایک باخبر شیعہ تھے اور رفیع الدین حسین جو ایک متعصب سنی تھے دونوں میں باقاعدہ دوستی تھی اور آپس میں نوک جھونک چلا کرتی تھی۔ ابوالقاسم رفیع الدین کو ناصبی کہتے تھے اور وہ انھیں رافضی۔ ایک دن ہمدان کی مسجد عتیق میں بیٹھے یہ بحث کر رہے تھے کہ علیؑ اور ابوبکرؓ میں کون افضل ہے؟ تو ابوالقاسم نے آیات و احادیث سے استدلال کیا۔ رفیع الدین نے قصۂ غار اور شرف خسریت پیغمبرؐ کا تذکرہ کیا۔ ابوالقاسم نے استدلال کو طویل تر بنا دیا اور کہا کہ علیؑ سے کسی کا کیا مقابلہ ہے۔ علیؑ حامل لواء پیغمبرؐ، دختر مرسل اعظمؐ کے شوہر، ہجرت کی رات بستر رسولؐ کی زینت، کعبہ میں بتوں کے توڑنے والے اور بیشتر انبیاء کے کمالات کے مظہر تھے۔ ان کے مقابلہ میں کسی کو کوئی شرف حاصل نہیں تھا۔ رفیع الدین نے عاجز آکر کہا کہ اب جو شخص بھی مسجد میں داخل ہوگا اس سے فیصلہ کرائیں گے اور اسی کی بات کو حرف آخر قرار دیں گے۔ ابوالقاسم نے اسے منظور کر لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جوان داخل ہوئے۔

رفیع الدین نے پورے شدومد کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کیا۔ اس جوان نے دو شعر پڑھ دیے جس کا مضمون یہ تھا کہ۔ "لوگ مجھ سے علیؑ کی افضلیت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ افضلیت کا بیان خود علیؑ کی توہین ہے۔ کیا تلوار کے لیے یہ بات باعثِ توہین نہیں ہے کہ اسے ڈنڈے سے زیادہ تیز کہا جائے۔ رفیع الدین یہ اشعار سُن کر حیرت زدہ ہو گیا اور اپنے اقرار کے مطابق مذہب آلِ محمدؑ قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

۱۔ آقائے سید محمد رضوی ہندی نے نجف اشرف کے دوسرے مجاور حرم شیخ باقر بن شیخ ہادیؒ کی زبانی اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ نجف اشرف میں ایک شخص حمام میں کام کرتا تھا اور نہایت درجہ مومن اور متقی تھا، اپنے ضعیف باپ کی بے پناہ خدمت کرتا تھا، یہاں تک کہ اٹھانا بٹھانا کھلانا پلانا سب اس کے ذمہ تھا، صرف شب چہار شنبہ مسجد سہلہ زیارت امام زمانؑ کے اشتیاق میں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک شب چہار شنبہ اتفاق سے تاخیر ہو گئی اور تنہا جا رہا تھا کہ اچانک راستہ میں ایک عرب کو دیکھا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ عنقریب میرے کپڑے تک اتروا لے گا۔ اس نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا کہ مسجد سہلہ! ۔ اس نے کہا کہ تمھارے جیب میں کچھ ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ نہیں ہے۔ کہا جو بھی ہے فوراً نکالو۔ میں نے پھر انکار کیا تو ڈانٹ کر کہا کہ فوراً نکالو۔ اب جو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ بچوں کے لیے کشمش خریدی تھی اور وہ رکھی رہ گئی ہے۔ میں نے کشمش پیش کر دی تو کہا کہ واپس جاؤ اور اپنے باپ کی خدمت کرو۔ مسجد سہلہ کی زیارت باپ کی خدمت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مردِ مومن کو یہ شرف باپ کی خدمت ہی سے حاصل ہوا ہے کہ اسے امام زمانہؑ کی زیارت نصیب ہو گئی اور جس مقصد کے لیے برابر آیا کرتا تھا وہ مقصد حاصل ہو گیا اور اسی لیے حضرت نے فرمایا کہ اب جا کر باپ کی خدمت کرو کہ اب دوسرا کوئی کام نہیں رہ گیا ہے ورنہ اگر مسجد سہلہ کی طرف جانا کوئی نامناسب کام ہوتا تو حضرتؑ روز اول ہی منع فرما دیتے۔

بہر حال والدین کی خدمت انتہائی اہم کام ہے۔ یہاں تک روایت میں وارد ہوا ہے کہ اگر ماں باپ شرکتِ جہاد سے روک دیں اور انھیں اس امر سے وحشت ہو تو ایک ساعت

ان کی خدمت کرنا ایک سال راہ خدا میں جہاد کرنے سے بہتر ہے۔ اور یہ بات امام صادقؑ نے رسول اکرمؐ سے نقل کی ہے جس سے واقعی اسلام و ایمان کے صحیح مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دورِ غیبت کبریٰ میں بھی ایک جہاد کا امکان باقی ہے اور وہ ہے خدمتِ والدین۔ رب کریم ہر مومن کو اس جہاد کی توفیق عطا فرمائے۔

خطوط و رسائل

علماء اعلام نے جہاں امام عصرؑ کی زیارت سے مشرف ہونے والے افراد کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان خطوط اور رسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے جو دورِ غیبت میں امام عصرؑ کی طرف سے صادر ہوئے ہیں اور جنھیں توقیعات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان رسائل میں بہت سے مسائل، احکام، دعاؤں اور زیارتوں کا بھی تذکرہ ہے اور بہت سے خصوصی خطوط بھی ہیں جو مختلف اسباب اور مصالح کے تحت ارسال کیے گئے ہیں۔

شخصی خطوط میں جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کے نام تین خطوط اور پیغامات ہیں۔ ایک میں انھیں "برادر سدید اور ولی رشید" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور دوسرے میں انھیں "ناصر حق اور داعی الی کلمۃ الصدق" فرمایا گیا ہے۔ پہلا خط صفر ۴۱۰ھ کا ہے اور دوسرا ۲۲ ذی الحجہ ۴۱۲ھ کا ہے۔ اس کے بعد ان کے انتقال پر حضرت نے کچھ اشعار بھی فرمائے ہیں جو شیخ مفیدؒ کی قبر پر کندہ ہیں۔

تیسرے خط کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مفیدؒ سے ایک حاملہ عورت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے تو اب بچہ کے بارے میں کیا کیا جائے؟ فرمایا کہ مع بچہ کے دفن کر دیا جائے۔ لوگ دفن کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک سوار نے آکر خبر دی کہ بچہ کو نکال لیا جائے اور عورت کو دفن کر دیا جائے۔ بچہ کو نکال لیا گیا اور بعد میں شیخ کو خبر ہوئی تو انھوں نے طے کر لیا کہ اب کسی مسئلہ میں فتویٰ نہیں دیں گے کہ آج اس سوار نے مسئلہ کی اصلاح نہ کر دی ہوتی تو ایک بچہ کا خونِ ناحق اپنی گردن پر آجاتا۔ یہ طے کر کے گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ حضرتؑ کی طرف سے پیغام آیا کہ تم نے بالکل غلط فیصلہ کیا ہے "علیك الافتاء وعلینا التسدید"

(فتویٰ دینا تمھارا کام ہے اور اصلاح کرنا ہمارا کام ہے۔)

اس واقعہ سے امام زمانہؑ کی امداد غیبی کے علاوہ اس حقیقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امامؑ کو اپنے چاہنے والوں سے کس قدر محبت ہے اور وہ انھیں کسی قیمت پر لاوارث نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں بلکہ حضرت کا منشا بھی یہ ہے کہ ہر دور میں ان کے مسائل کے حل کرنے والے علما رہیں، اور مسائل کو حل کرتے رہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی ایسی غلطی ہو گئی جس کا تعلق حق العباد اور خون ناحق سے ہوگا تو ہم اس کی اصلاح کر دیں گے ورنہ حق اللہ کے معاملہ کی خطاؤں کا معاف کرنے والا خود پروردگار موجود ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔ اگر ایک عام گنہگار بندے کی خطا کو معاف کر سکتا ہے تو اپنی راہ میں قربانی دینے والے اور زحمتیں برداشت کرنے والے اہلِ علم کی خطا کو کیوں معاف نہیں کرے گا۔

مسائل کے سلسلہ میں علامہ طبرسیؒ نے اس خط کا ذکر کیا ہے جو جناب اسحاق بن یعقوب کے نام لکھا گیا تھا اور جس میں مختلف سوالات کے جوابات درج تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر منکر کے بارے میں سوال کیا گیا ہے تو ہمارا منکر ہم میں سے نہیں ہے اور اگر جعفر جیسے لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا ہے تو ان کی مثال پسر نوح اور برادران یوسف جیسی ہے۔

(واضح رہے کہ بعض حضرات نے اس جملہ سے یہ استفادہ کیا ہے کہ پسر نوح اپنے باپ کے احکام کے اعتبار سے نالائق تھا اور ان کے راستہ پر نہیں چلا تھا لیکن برادران یوسف نے جب بھائی سے خیانت کی تو انھوں نے آخر میں انھیں معاف کر دیا اور اس طرح ظالم افراد تواب قرار پا گئے۔)

فقاع یعنی جَو کی شراب بہر حال شراب ہے اور حرام ہے ۔ خمس کا فریضہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ تمھارا مال حلال ہو جائے اور تمھیں نجات حاصل ہو جائے ورنہ قاعدہ کے اعتبار سے ساری کائنات امام کے لیے ہے اور ان کی مرضی کے بغیر کسی ذرۂ کائنات میں بھی تصرف جائز نہیں ہے۔

ظہور کا وقت پروردگار کے علم میں ہے اور ہم اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ اپنی طرف سے وقت معین کرنے والے جھوٹے ہیں اور ان کی تعین کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں ہماری احادیث کے بافہم راوی جو روایات کو

واقعات پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی طرف رجوع کرنا کہ وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور ہم اللہ کی طرف سے ان پر حجت ہیں اور ان کا رد کرنے والا درحقیقت ہمارے احکام کی تردید کرنے والا ہے۔

محمد بن عثمان میرے معتمد ہیں اور ان کا قول میرا قول، اور ان سے ملنے والا پیغام میرا پیغام ہے۔

محمد بن علی ہزیار اہوازی کا دل انشاء اللہ صاف ہو جائے اور انھیں کوئی شبہ نہیں رہ جائے گا۔

گانے والی عورت کی اجرت حرام ہے (حرام عمل کی اجرت بہر حال حرام ہوتی ہے۔ بدبخت وہ لوگ ہیں جن کی جیب سے اس راہ میں پیسہ نکل جاتا ہے۔ گانے والی تو پیسہ لے کر ہی مجرم بنتی ہے، دینے والا تو دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے خسارہ میں ہے۔)

محمد بن شاذان ہمارے شیعوں میں ہیں۔

ابوالخطاب محمد بن اجدب ملعون ہے اور اس کے ماننے والے بھی ملعون ہیں۔ ہم اور ہمارے آباء و اجداد سب اس سے بری اور بیزار ہیں۔

ہمارا مال کھانے والے اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔ خمس نہ دینے والوں کی طرف سے جو مال ہمارے شیعوں کو ملے اس میں کا حق خمس ہم نے اپنے شیعوں کے لیے حلال کر دیا ہے۔

زمانۂ غیبت میں میری مثال زیرِ ابر آفتاب کی ہے۔ میرا وجود اہلِ زمین کے لیے ویسے ہی وجہِ امان ہے جس طرح آسمان والوں کے لیے ستاروں کا وجود ہوتا ہے۔

غیبت اور ظہور کے بارے میں سوالات بند کر دو اور رب العالمین سے میرے ظہور کی دُعا کرو۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔ (اعلام الوریٰ۔ کشف الغمہ)

مسئلہ طول حیات

امام مہدیؑ کے بارے میں جہاں اور بحثیں کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک بحث طول عمر اور بقائے حیات کی بھی ہے اور درحقیقت یہ بحث ان شبہات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جو

مسئلہ مہدی کے گرد عالم اسلام میں اٹھائے گئے ہیں اور ان کا منشا عالم انسانیت کو ایک ایسے مصلح کی طرف سے غافل بنا دینا ہے جس کا کام بساط ظلم و جور کو اُلٹ کر نظام عدل و انصاف کا قائم کر دینا ہے اور جو اس عظیم کام کے لیے صبح و شام حکم الٰہی کا انتظار کر رہا ہے۔ ورنہ اس طرح کا سیاسی مقصد کارفرما نہ ہوتا تو ایک مسلمان کے لیے طول عمر اور بقائے حیات جیسی بحث کا اٹھانا خلاف شان اسلام و ایمان اور خلاف اعتقاد قرآن و سنت ہے۔

مسلمان اس حقیقت پر بہر حال ایمان رکھتا ہے کہ موت و حیات کا اختیار پروردگار کے ہاتھوں میں ہے اور وہی انسانوں کی عمروں کو طویل یا مختصر بناتا ہے۔ اس کے نظام مصلحت میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو شکم مادر ہی میں موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں اور ایسے افراد بھی ہیں جو بدترین حوادث میں بھی لقمۂ اجل نہیں بنتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس نے انسان کو موت دینا چاہی تو سلیمان جیسا صاحبِ اقتدار بھی اپنے لشکر کے سامنے دنیا سے رخصت ہو گیا اور باقی رکھنا چاہا تو موسیٰ قصر فرعون میں۔

ابراہیمؑ نار نمرود میں، یونسؑ بطنِ ماہی میں باقی رہ گئے۔ اس نے چاہا تو اصحابِ کہف کی نیند طویل ہو گئی اور اس کی مرضی ہوئی تو عُزَیر کو مُردہ بنا کر پھر زندہ کر دیا۔ ایسے نظام ربوبیت پر ایمان رکھنے والا انسان اگر ایک حجت پروردگار اور مہدیٔ دورانؑ کے بارے میں شبہات سے کام لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ قدرتِ پروردگار پر ایمان نہیں رکھتا ہے اور اس کی نظر میں گزشتہ دور کے جملہ واقعات و حوادث صرف اساطیر الاولین کی حیثیت رکھتے ہیں یا اسے وجود مہدیؑ سے کوئی خاص اختلاف ہے جس کی بنا پر اسے کسی نہ کسی شکل میں مشکوک بنا دینا چاہتا ہے۔

تاریخ میں جناب ذوالقرنین، جناب نوح، جناب سام بن نوح، جناب قینان، جناب مہلائیل، عوج بن عناق، نفیل بن عبداللہ، ربیعہ بن عمر، ارفخشد، درید بن زید، جناب سلمان، کعب بن جمجمہ، نصر بن رحمان، قیس بن ساعدہ، عمر بن ربیعہ، عمر بن دوسی، عمر بن طفیل جیسے افراد کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال عمر کا تذکرہ موجود ہے اور اس کا کوئی انکار کرنے والا نہیں پیدا ہوا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے جناب ادریسؑ و خضرؑ اور دجال و ابلیس لعین کا وجود بھی مسلمات میں شامل ہے جن کی عمریں ہزاروں سال سے متجاوز ہو چکی ہیں اور جناب عیسیٰؑ مستقل طور سے آسمان پر زندہ ہیں اور زمین پر اُترنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

ان حالات میں مسئلہ طول عمر پر بحث کرنا نہ عقائدی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے صحیح ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ تاریخ کے بے شمار شواہد کی بنا پر اور مرسل اعظمؐ کی سیکڑوں روایات کی بنا پر جن میں مہدیؑ اور اس کے خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے کہ مہدیؑ میرا بارھواں جانشین، اولاد فاطمہؑ میں، اولاد حسینؑ میں اور میرے فرزند حسینؑ کا نواں وارث ہوگا۔ اس مہدیؑ کا وجود بہر حال ہو چکا ہے اور ان خصوصیات کا انسان عالمِ وجود میں آچکا ہے، اور رسول اکرمؐ کی ناقابلِ تردید روایات کی بنا پر اس کا ظہور بھی بہر حال ہونے والا ہے اور عمر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو ربِ کریم اس دن کو طول دے گا یہاں تک کہ مہدی ظہور کرے اور ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔

ان دونوں مسلمات کے درمیان دو ہی احتمالات رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ مہدی انتقال کر جائے اور پھر وقتِ ظہور مُردہ سے زندہ ہو کر عالمی انقلاب برپا کرے یا زندہ اور موجود رہے اور طویل عمر کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتا رہے اور اپنے آخری انقلاب کے لیے زمین ہموار کرتا رہے۔

پہلا احتمال مذہبی اعتبار سے بھی غلط ہے اور علمی اعتبار سے بھی۔ مذہبی اعتبار سے یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا حجتِ خدا سے خالی ہو گئی ہے اور رسول اکرمؐ واضح طور پر فرما چکے ہیں کہ اگر دنیا حجتِ خدا سے خالی ہو جائے تو اس کی بقا محال ہے اور زمین اہلِ زمین سمیت دھنس جائے گی اور علمی اعتبار سے کسی شخص کا مر کر دوبارہ زندہ ہونا اور کسی تیاری اور آمادگی کے بغیر اتنا بڑا انقلاب برپا کر دینا ناقابلِ تصور عمل ہے اور اگر اس میں قدرتِ خدا کو شامل کر لیا جائے تو موت و حیات کے تصورات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو خدا کسی عظیم مقصد کے لیے ایک مُردہ کو زندہ بنا کر اس سے یہ کام لے سکتا ہے تو وہ

ہزار دو ہزار برس زندہ رکھ کر بھی یہ کام لے سکتا ہے۔ اس کی قدرت کے لیے کوئی شے امکان سے خارج نہیں ہے۔

بنا بریں اسلام کے تینوں تصورات کو جمع کرنے کے بعد کہ مہدیؑ کی ولادت بہرحال ہو چکی ہے اور اس کا ظہور بہرحال ہونے والا ہے اور زمین حجتِ خدا سے بہرحال خالی نہیں ہو سکتی ہے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ مہدی زندہ رہے اور حالات کا مسلسل جائزہ لے کر اپنے عالمی انقلاب کی منصوبہ بندی میں مصروف رہے۔ وقت ضرورت اپنے نائبین کی امداد بھی کرتا رہے اور اپنے ظہور کی زمین بھی ہموار کرتا رہے اور وقت ظہور کے لیے حکم الٰہی کا انتظار کرتا رہے اور جیسے ہی حکم پروردگار ہو جائے اپنا اصلاحی عمل شروع کر دے اور ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔ انشاء اللہ

روایاتؐ و اعترافات

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں ایک مہدی بھی ہوگا۔ (ابوسعید الخدری۔ صحیح ترمذیؒ)

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ میری عترت میں ایک شخص کو پیدا کرے گا جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ عبدالرحمٰن بن عوف (عقد الدرر)

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر عمر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو پروردگار اس دن کو طول دے گا یہاں تک کہ میرے اہلبیتؑ میں میرا ایک ہم نام آ جائے۔

— عبداللہ بن مسعود (ترمذی و سنن ابوداؤد)

اس امت کا مہدی عیسیٰ بن مریم کی امامت کرے گا۔ ابوسعید الخدری (عقد الدرر)

مہدی برحق ہے، وہ بنی کنانہ، قریش، بنی ہاشم اور اولاد فاطمہ سے ہوگا۔ قتادہ (عقد الدرر)

میں تمھیں مہدی کی بشارت دے رہا ہوں جو میری عترت اور قریش سے ہوگا۔ (صواعق محرقہ)

ہم سات اولاد عبدالمطلب سرداران جنت ہیں۔ میں، علی، حمزہ، جعفر، حسن، حسین، مہدی۔

— (سنن ابن ماجہ، معجم طبرانی، حافظ ابونعیم اصفہانی۔ عقد الدرر)

مہدی میری عترت میں اولاد فاطمہ میں سے ہوگا۔ روایت ام سلمہ (ابوداؤد)

اللہ دنیا کے آخری دن کو اس قدر طول دے گا کہ میری عترت اور میرے اہلبیتؑ سے ایک شخص آ جائے جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔ روایت ابوہریرہ (ترمذی)

علیؑ میری امت کے امام ہیں اور ان کی اولاد میں قائم منتظر ہوگا جو دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کر دے گا۔ روایت ابن عباس (مناقب خوارزمی)

مہدی اولاد حسینؑ سے ہوگا۔ روایت حذیفہ بن الیمان (حافظ ابونعیم)

حسینؑ! تم سید بن سید اور برادر سید ہو۔ تم امام، ابن امام اور برادر امام ہو۔ تم حجت بن حجت، برادر حجت اور نو حجتوں کے باپ ہو جن کا نواں قائم ہوگا۔ سلمان (ینابیع المودۃ)

مہدیؑ کا خروج بہرحال ضروری ہے اور یہ اس وقت ہوگا جب دنیا ظلم و جور سے بھر جائے گی۔
(الشیخ محی الدین در فتوحات مکیہ۔ الشیخ عبدالوہاب شعرانی در الیواقیت والجواہر)

امام مہدیؑ سامرہ میں پیدا ہوئے ہیں جو بغداد سے ۲۰ فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔
(محمد بن طلحہ شافعی در مطالب السؤول)

امام حسن عسکریؑ نے بادشاہِ وقت کے خوف سے اپنے فرزند کی ولادت کو مخفی رکھا۔
(علی بن محمد بن صباغ مالکی در الفصول المہمہ)

امام مہدیؑ سامرہ میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ولادت کو مخفی رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے والد بزرگوار کی حیات ہی سے غائب ہیں۔ (علامہ جامی در شواہد النبوۃ)

امام مہدی ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور سامرہ میں لوگوں کی نظر سے غائب ہو گئے۔ (علامہ جمال الدین در روضۃ الاحباب)

امام مہدی ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور انھیں امام حسن عسکریؑ نے اس خدا کے حوالہ کر دیا جس کی پناہ میں جناب موسیٰ تھے۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی در مناقب الائمہ)

امام مہدیؑ بطن نرجس سے ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے ہیں۔
(عبدالرحمٰن صوفی در مرآۃ الاسرار)

خلافت رسولؐ حضرت علیؑ کے واسطے سے امام مہدیؑ تک پہونچی ہے اور وہ آخری امام ہیں۔ (علامہ شہاب الدین دولت آبادی در تفسیر بحر مواج)

امام مہدیؑ بارہویں امام ہیں۔ (ملا علی قاری در شرح مشکوٰۃ)

امام مہدیؑ اولادِ فاطمہؑ سے ہیں۔ وہ بقولے ۲۵۵ھ میں پیدا ہو کر ایک عرصہ کے بعد غائب ہو گئے۔ (علامہ جواد ساباطی در براہین ساباطیہ)

امام مہدی پیدا ہو کر غائب ہو گئے ہیں اور آخری دور میں ظہور کریں گے۔ (شیخ سعد الدین در مسجد اقصیٰ)

آپ پیدا ہو کر قطب ہو گئے ہیں۔ (علی اکبر بن اسد اللہ در مکاشفات)

محمد بن الحسن کے بارے میں شیعوں کا خیال درست ہے۔ (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی در رسالہ نوادر)

امام مہدیؑ تکمیل صفات کے لیے غائب ہو گئے ہیں۔ (ملا حسین میبذی در شرح دیوان)

امام مہدیؑ ۲۵۶ھ میں پیدا ہو کر غائب ہو گئے ہیں۔ (تاریخ ذہبی)

امام مہدیؑ پیدا ہو کر سرداب میں غائب ہو گئے ہیں۔ (ابن حجر مکی در صواعق محرقہ)

امام مہدی کی عمر امام حسن عسکریؑ کے انتقال کے وقت پانچ برس کی تھی وہ غائب ہو کر پھر واپس نہیں آئے۔ (وفیات الاعیان)

آپ کا لقب القائم، المنتظر، الباقی ہے۔ (تذکرہ خواص الامۃ سبط بن جوزی)

آپ اسی طرح زندہ اور باقی ہیں جس طرح عیسیٰؑ، خضر اور الیاس وغیرہ ہیں۔ (ارجح المطالب)

امام مہدیؑ قائم و منتظر ہیں۔ وہ آفتاب کی طرح ظاہر ہو کر دنیا کی تاریکی کفر کو زائل فرمائیں گے۔ (فاضل ابن روزبہان ابطال الباطل)

امام مہدیؑ کے ظہور کے بعد حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔ (جلال الدین سیوطی در منثور)

خصوصیاتِ حکومتِ امام عصرؑ

۱۔ ابتدائے ظہور میں آپ کا طریقہ کار وہی ہوگا جو ابتدائے بعثت میں رسول اکرمؐ کا طریقہ کار تھا اس لیے کہ آپ کے دور تک اسلام اس قدر مسخ ہو چکا ہوگا کہ گویا از سرِ نو اسلام کی تبلیغ کرنا ہوگی اور جدید ترین نظام کے بارے میں شدید ترین مواخذہ نہیں ہو سکتا ہے۔ خود رسول اکرمؐ

نے فرمایا ہے کہ اسلام ابتدا میں بھی غریب تھا اور آخر میں بھی غریب ہو جائے گا، لہٰذا خوشحالی ان افراد کے لیے جو غرباء ہوں۔

۲۔ آپ کے فیصلے جناب داؤد کی طرح ذاتی علم کی بنیاد پر ہوں گے اور آپ گواہ اور بیّنہ کے محتاج نہ ہوں گے۔ آپ لوگوں کی شکل دیکھ کر ان کے جرائم کا اندازہ کر لیں گے اور اسی اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کریں گے۔

۳۔ آپ کی سواری کے لیے ایک مخصوص ابر ہوگا، جس میں گرج، چمک اور بجلی وغیرہ سب کچھ ہوگی جو بات حضرت ذوالقرنین کو بھی حاصل نہ تھی۔ آپ اس ابر پر سوار ہو کر مختلف اطراف کا دورہ کریں گے اور دین اسلام کی تبلیغ کر کے اس کا نظام قائم کریں گے۔

۴۔ آپ کے وجود مبارک کی برکت سے زمین اپنے سارے ذخائر کو اگل دے گی اور پیداوار میں اس قدر اضافہ ہوگا کہ جو شخص جس قدر مطالبہ کرے گا آواز آئے گی "لے لو، خزانۂ قدرت میں کوئی کمی نہیں ہے"۔ پیداوار کا یہ عالم ہوگا کہ اگر کوئی عورت عراق سے شام تک پیدل سفر کرے تو اس کے قدم سبزہ زار کے علاوہ کسی خشک زمین پر نہ پڑیں گے۔

۵۔ دنیا میں امن و امان کا وہ دور دورہ ہوگا کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان بھی کوئی وحشت اور نفرت نہ رہ جائے گی۔ بچے سانپ بچھو سے کھیلیں گے اور بھیڑ اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے یہاں تک کہ اگر کوئی عورت عراق سے شام تک سر پر سامان رکھ کر چلی جائے تو کوئی درندہ بھی اذیت نہ کرے گا اور نہ اسے کسی طرح کا خوف ہوگا۔

۶۔ آپ کے ظہور کی برکت سے مخصوص قسم کے خطرناک امراض کا خاتمہ ہو جائے گا ــــ اور صاحبان ایمان صحت و سلامتی کی زندگی گزاریں گے۔

۷۔ آپ پر مرورِ زمانہ اور تغیراتِ دہر کا کوئی اثر نہ ہوگا اور سیکڑوں سال کے بعد بھی بہ پہل کے جوان کی شکل میں ظہور فرمائیں گے جیسا کہ امام رضاؑ کی روایت میں وارد ہوا ہے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ کیا آپ ہی قائم ہیں۔ تو فرمایا کہ نہیں، تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس قدر ضعیف و نحیف ہو گیا ہوں اور قائم طویل ترین عمر کے باوجود ۴۰ سال جوان کی شکل میں ظہور کرے گا۔ وہ میری اولاد میں میرا چوتھا وارث ہوگا۔

۸۔ آپ کے پاس تمام انبیاء و اولیاء کی میراث ہوگی۔ لباس ابراہیمؑ، عصائے موسیٰؑ، انگشتری سلیمانؑ، زرہ پیغمبر اسلامؐ، عمامہ و نعلین و لباس رسول اکرمؐ اور ذوالفقار حیدر کرارؑ۔ اور جب سید حسنی آپ سے دلالت امامت کا مطالبہ کریں گے تو آپ ان تمام تبرکات کو پیش کر دیں گے۔

۹۔ آپ زیر آفتاب سفر کریں گے تو بھی جسم اقدس کا کوئی سایہ نہ ہوگا جس طرح کہ رسول اکرمؐ کے جسم اقدس کا سایہ نہیں تھا۔

۱۰۔ آپ کے نور مبارک سے زمین اس قدر روشن ہو جائے گی کہ آفتاب و ماہتاب کے بغیر بھی کاروبار حیات چل سکے گا۔

۱۱۔ آپ کے سامنے تمام دنیا ہتھیلی پر ایک درہم کے مانند ہوگی اور آپ بغیر کسی حائل و حاجب کے تمام دنیا کے حالات کا مشاہدہ کریں گے۔

۱۲۔ آپ کے دور میں صاحبان ایمان کمال علم و عقل و ذہانت و ذکاوت کی منزل پر فائز ہوں گے اور آپ جس کے سر پر دست شفقت پھیر دیں گے اس کی عقل بالکل کامل و اکمل ہو جائے گی یہاں تک کہ آپ مختلف ملکوں میں بھیجے جانے والے نمائندوں کو ہدایت کریں گے کہ اگر کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو اپنی ہتھیلی کو دیکھ لینا تمام علوم اور مسائل نقش نظر آجائیں گے۔

۱۳۔ مساجد میں جدید قسم کے مینار، حجرات اور نقوش جو دور مرسل اعظمؐ میں نہیں تھے انھیں محو کر دیا جائے گا اور مساجد کو ان کی اصلی اسلامی سادگی کی طرف واپس کر دیا جائے گا۔

۱۴۔ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ کی از سر نو اصلاح و ترمیم ہوگی اور جس قدر بھی بے جا تعمیرات ہوئی ہیں ان کی اصلاح کر دی جائے گی اور مقام ابراہیمؑ کو بھی اس کی اصلی منزل تک پلٹا دیا جائے گا۔

۱۵۔ آپ کا نور مبارک اس قدر نمایاں اور روشن ہوگا کہ ساری دنیا کے لوگ بآسانی آپ کی زیارت کر سکیں گے اور ہر شخص آپ کو اپنے سے قریب تر اور اپنے ہی علاقہ اور محلہ میں محسوس کرے گا۔

۱۶۔ آپ کا پرچم نصرت رسول اکرمؐ کا پرچم ہوگا جس کا عمود عرش الٰہی کا بنا ہوا ہوگا اور وہ جس ظالم پر سایہ فگن ہو جائے گا اسے تباہ و برباد کر دے گا۔ آپ کی فوج کے افراد لوہے کی چادروں

کی طرح سخت اور مستحکم ہوں گے اور ہر مومن کے پاس چالیس افراد کی طاقت ہوگی۔

۱۷۔ مومنین کی قبروں میں بھی ظہور کی خوشی کا داخلہ ہو جائے گا اور آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے اور بعض قبروں سے اٹھ کر نصرت امام کے لیے باہر آجائیں گے جیسا کہ دعائے عہد میں وارد ہوا ہے کہ "پروردگار! اگر مجھے ظہور سے پہلے موت بھی آجائے تو وقت ظہور اس عالم میں قبر سے اٹھانا کہ کفن دوش پر ہو، برہنہ تلوار ہاتھ میں ہو، نیزہ چمک رہا ہو اور زبان پر لبیک لبیک ہو۔"

۱۸۔ آپ اپنے تمام چاہنے والوں کے قرضوں کو ادا فرما دیں گے اور انھیں خیرات و برکات سے مالا مال کر دیں گے۔ بشرطیکہ قرضہ کا تعلق حرام مصارف سے نہ ہو ورنہ اس کا مواخذہ بھی کریں گے۔

۱۹۔ آپ جملہ بدعتوں کا قلع قمع کر دیں گے اور عالم انسانیت کو شریعت پیغمبر اسلامؐ کی طرف پلٹا کر لے آئیں گے یہاں تک کہ ہزاروں بدعقیدہ لوگ آپ کے واپس جانے کا مطالبہ کر دیں گے اور آپ سب کا خاتمہ کر دیں گے۔

۲۰۔ آپ کے جملہ روابط اور تعلقات صرف ان افراد سے ہوں گے جو واقعاً مومن مخلص ہوں گے اور کسی منافق اور ریاکار کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ دشمنان آل محمدؐ بنی امیہ و بنی عباس، قاتلان حسینؑ اور نواصب و خوارج سب کا خاتمہ کر دیں گے اور کسی ایسے آدمی کو زندہ نہ چھوڑیں گے جو گذشتہ افراد و اقوام کی بداعمالیوں اور ان کے مظالم سے راضی ہوگا۔

اللّٰھم عجل فرجہ وسھل مخرجہ واجعلنا من انصارہ واعوانہ۔

امام عصرؑ اور

سلام، دعا، نماز، زیارت، استغاثہ، طریقۂ زیارت و ملاقات

امیرالمومنینؑ کا ارشادِ گرامی تھا کہ گویا میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ مہدیؑ گھوڑے پر سوار وادی السلام سہلہ کی طرف روانہ ہے اور زبان پر یہ کلمات ہیں: لا الٰه الا اللّٰه حقاً حقاً لا الٰه الا اللّٰه ایماناً وصدقاً لا الٰه الا اللّٰه تعبداً و رقاً اللّٰهم معز کل مومن وحید ومذل کل جبار عنید.... الخ (بحار)

سلام

جابرؓ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ جو بھی قائمؑ کے دور تک رہ جائے اس کا فرض ہے کہ انھیں اس طرح سلام کرے: "السلام علیکم یا اهل بیت النبوة ومعدن العلم وموضع الرسالة۔" (غیبت طوسی)

محمد بن مسلم راوی ہیں کہ امام باقرؑ نے اس طرح سلام کرنے کا حکم دیا ہے:

"السلام علیك یا بقیه اللّٰه فی ارضه" (کمال الدین)

عمران بن داہر راوی ہیں کہ امام صادقؑ سے دریافت کیا گیا کہ قائمؑ کو امیرالمومنین کہہ کر سلام کیا جا سکتا ہے؟ تو فرمایا ہرگز نہیں۔ یہ لقب صرف حضرت علیؑ کے لیے ہے۔ قائمؑ کو بقیۃ اللہ کہہ کر سلام کرو۔ (بحار)

دعا

امام مہدیؑ ہی سے وہ مشہور و معروف دعا نقل کی گئی ہے جو مفاتیح الجنان اور دیگر

کتب ادعیہ میں مذکور ہے۔ اللّٰهم ارزقنا توفیق الطاعة وبعد المعصیة۔ (مصباح کفعمی)

آپ کی ایک دعا یہ ہے: "یا مالك الرقاب وهازم الاحزاب یا مفتح الابواب یا مسبب الاسباب سبب لنا سبباً لا نستطیع له طلباً..." (منہج الدعوات)

آپ ہی کی یہ مشہور دعا بھی ہے: "الٰهی بحق من ناجاك وبحق من دعاك..." (الادعیۃ المستجابات)

آپ ہی سے یہ دعا بھی نقل کی ہے: "الٰهی عظم البلاء وبرح الخفاء۔" (جنۃ الماویٰ)

آپ کے دورِ غیبت کے لیے شیخ عمروی نے ابوعلی بن ہمام کو یہ دعا تعلیم دی تھی: "اللّٰهم عرفنی نفسك فانك ان لم تعرفنی نفسك لم اعرف نبیك۔" (اکمال الدین)

نماز

امام عصرؑ ہی سے یہ نماز حاجت بھی نقل کی گئی ہے کہ شب جمعہ دو رکعت نماز ادا کرے اور ہر رکعت میں سورۂ حمد پڑھتے ہوئے "ایاك نعبد وایاك نستعین" کو سو مرتبہ دہرائے، اور رکوع و سجدہ کے تسبیحات کو سات سات مرتبہ ادا کرے۔ بعد نماز حاجت طلب کرے ان شاء اللہ پوری ہوگی۔ (کنوز النجاح طبرسیؒ)

استغاثہ

امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص راستہ بھول جائے اور پریشان حال ہو جائے تو اس طرح فریاد کرے: "یا صالح یا ابا صالح ارشدونا الی الطریق رحمکم اللّٰه۔" (النجم الثاقب)

رسول اکرمؐ نے ابوالوفا کی روایت میں فرمایا ہے جب مصیبت اس منزل پر آجائے کہ تلوار گردن کے قریب ہو تو یوں فریاد کرو: "یا مولای یا صاحب الزمان انا مستغیث

بلکہ "صاحب الزمان یقیناً تمھاری امداد کریں گے اور تمھاری مدد کو آئیں گے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امامت کے لیے ساری کائنات کے حالات کا جاننا اور طاقت کے اعتبار سے ہر ایک کے کام آنا اور اس کی مشکلکشائی کرنا ایک بنیادی شرط ہے جس کے بغیر کوئی انسان امام کہے جانے کے قابل ہے۔

امام عصرؑ نے ایک قیدی کو دعائے عبرات کی تعلیم دی جس کے طفیل میں اسے رہائی مل گئی اور امیرالمومنینؑ نے زوجۂ حاکم کے خواب میں آکر حاکم کو تہدید کی کہ اگر اسے رہا نہ کرے گا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ "اللّٰھم انی أسئلك یا راحم العبرات ویا کاشف الکربات ۔ ۔ ۔ ۔ یا رب انی مغلوب فانتصر ۔ ۔ ۔ ۔ (جنۃ الماویٰ)

نسخۂ شفا

شیخ ابراہیم کفعمیؒ نے البلد الامین میں نقل کیا ہے کہ امام مہدیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر اس دعا کو نئے برتن میں خاکِ شفا سے لکھ کر مریض کو پلا دیں تو شفا حاصل ہو جائے گی۔

"بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم ۔ بسم اللّٰه دواءٌ والحمد للّٰه شفاءٌ ولا الٰه الا اللّٰه کفاءٌ ھو الشافی شفاء وھو الکافی کفاء اذھب الباس برب الناس شفاءٌ لا یغادرہ سقم وصلی اللّٰه علی محمد وآلہ النجباء۔" (بحار)

زیارت

سید ابن طاؤسؒ نے جمال الاسبوع میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے روز یک شنبہ امام عصرؑ کو اس طرح زیارت امیرالمومنینؑ پڑھتے ہوئے دیکھا ہے: "السلام علی الشجرۃ النبویۃ والدوحۃ الھاشمیۃ المضیئۃ المثمرۃ ۔ ۔ ۔" (مکمل زیارت مفاتیح الجنان میں موجود ہے)۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ
